دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے　　　　عمر یافعی

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی ماہنامہ ہر ماہ ... جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہوں گے جن کا حجم کم سے کم پانچ جز ہوگا۔

ماہوار رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو بذریعہ ڈاک روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو مہربانی فرما کر مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (صہ) مع محصول ڈاک پیشگی، چھ ماہ کے لئے (عہ)، فی پرچہ ۶ آنے

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (دس) نصف صفحہ کے لئے ...

اور چوتھائی کے لئے ... اگر ... کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ فیصد تا ۲۵ فیصد تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین و جملہ خط و کتابت بنام منتظم مجلہ مکتبہ، مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجیے۔

رجسٹر لسانیہ سرکار آصفیہ
(۴۵۶)

رجسٹر لسانیہ سرکار انگلشیہ
(۱۰۰۰)

مجلۂ مکتبہ

جلد (۴) بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۳۹ف م جنوری سنہ ۱۹۳۰ء شمارہ (۴)

تصاویر

(۱) قطعہ دوم (۲) باغ عام کا ایک خوشنما منظر

فہرست مضامین

صفحہ

شذرات

"اسپ نرور" کے شہرۂ آفاق مدیر مسٹر گاروِن نے ایک دعوت میں جو مسٹر میکڈونلڈ اور مسٹر لائیڈ جارج کی طرف سے مدیر موصوف کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھی، اپنے چند مدیرانہ اصول کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ ان کو تمام ارباب صحافت جو اس پیشہ کو عزت اور کامیابی سے انجام کو پہنچانا چاہتے ہیں اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں۔ اس دعوت کے موقع پر قدیم اور جدید وزیر اعظم برطانیہ نے مسٹر گاروِن کے اصول کی بڑی مدح سرائی کی۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ "دوستی بڑی قابل قدر نعمت ہے۔ لیکن ایک مدیر جب ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہو تو اس کو ہر وقت دوستوں کے کھونے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ورنہ وہ خود گم ہو جائیگا۔ صحیفہ میں "کردار" کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے قائم کرنے کے لئے خود میں نے یہ کیا ہے کہ ہمیشہ میں طویل مقالے مضمون نگاروں سے اہم موضوعات پر لکھواتا جن کے خیالات بالکل آزاد اور غیر متعصبانہ ہوتے۔ اور لوگوں کے سامنے اُن چیزوں کو پیش کرتا تھا جو وہ نہیں طلب کرتے۔"



گذشتہ جلسہ عطائے اسناد کے موقع پر جامعہ آگرہ کے طلبا نین کو مخاطب کرتے ہوئے گنگا ناتھ جھا نے ہندوستانی ارباب تعلیم کی ذہنیت اور ہماری جامعات کے ایک تاریک گوشہ پر بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ انہوں نے نہایت شد و مد کے ساتھ حاضرین کو یہ محسوس کروانے کی کوشش کی کہ جب سے ہماری ہندوستانی جامعات وجود میں آئی ہیں، ہم ایک عجیب دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہماری تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہم ہندوستان کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہ جائیں۔ اس سے مقرر کا مقصد یورپی جامعات کے ہندی متعلمین کی تحقیر مقصود نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے تھے کہ "ہم کو کبھی اس قسم کے تعصبات میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ یورپ کی کسی جامعہ کا فارغ التحصیل ہر صورت میں ہندی جامعات کی پیداوار پر برتری رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری جامعات کی تذلیل ہوتی ہے۔ بلکہ ہم ایک بھاری مغالطے کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے علمی کاموں اور عدالتی اور دوسرے حکمراں عہدوں کے لئے اشخاص کو غیر ممالک میں بھیج کر کام سکھانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہم دوسرے ملک کے لوگوں کو اپنے ملک اور مقام کی ضروریات کے علم کے بغیر بھی اعلیٰ عہدوں پر ملازم کر لیتے ہیں اس کا بُرا نتیجہ ہم کو لازماً ہر روز دیکھنا پڑ رہا ہے۔

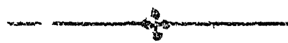


اس مہینے میں جامعہ عثمانیہ کے طلبا نین کو عطائے اسناد کے موقع پر ملک کے ایک بلند خیال عہدہ دار نواب

مرزا لیاقت جنگ بہادر نے ایک خط[بہ] دیا۔ اس خطبہ کے کئی اہم پہلوؤں میں سے ایک پہلو عربی و فارسی زبانوں کے مطالعے [...] سے متعلق بھی تھا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ کی وسیع ترین علمی [...] عربی و فارسی [...] کو محفوظ رکھنے کے لیے محفوظ کرنے کے علاوہ اور مغربی افواہ میں بیداری پیدا کرنے [...] ترقی کی تخم ریزی کرنے کے قطع نظر بھی عربی زبان کئی حیثیتوں سے اہم ہے۔ مسلمانوں کے تمدن اور کلچر کے علاوہ یونانی، رومی، ہندی، عربی اور ہسپانوی تہذیب کا بھی بیشتر حد تک نچوڑ ہے۔ ہر مورخ اور مفکر کے لیے جو اپنی تحقیقات کو قرون وسطیٰ ایرانی تک پہنچانا یا اس سے آگے بڑھانا چاہتا ہے [اس] زبان کے مطالعے کے بغیر چارہ نہیں۔

یہی حال فارسی کا بھی ہے۔ آٹھ نو سو سال پہلے اور گذشتہ صدی کے ختم تک بھی یہ زبان صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ وسط ایشیا کی حکمران زبان رہی ہے۔ مغلوں کے درخشاں عہد میں ان ممالک اور خصوصاً سارے ہندوستان کے لئے یہ مشترک الہام تھی۔ اپنے پیچھے قدیم ایرانی تمدن کی عظیم الشان عظمت زمین رکھتے ہوئے ہندوستان سے سفر کرتے کرتے اس نے کئی ایسی ہندی زبانیں تخلیق کیں جن کو پرورش کیا، سنوارا، مہذب بنایا اور آگے بڑھنے کا گر سکھا دیا۔ ہمارے مورخ، معلم تمدن اور ماہر لسانیات کے ذخیرہ میں اس کی کمی یقیناً گراں گزرتی ہے۔

ہم ایشیائی اس قدر احسان فراموش اور غیر منطقی نہیں ہو سکتے کہ ان زبانوں کے مطالعہ کی ہمت شکنی کا خیال دل میں لا سکیں۔



جرمنی ”تمدنی حیثیت“ سے ہندوستان سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کا ثبوت ”ڈی دوتاخ اکاڈمی“ کا قیام ہے۔ کچھ سالوں سے ہند جرمنی علمی ادارے ہندوستانی طلبہ اور محققین کو وظیفے بھی عطا کر رہے ہیں تاکہ وہ جرمنی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور ان دو بڑے ملکوں کے تعلقات کی ایک کڑی ثابت ہوں۔ ہم نے گذشتہ سال چار ہندوستانی طلبہ کو جرمن وظایف عطا ہونے کی تفصیل لکھی تھی۔ اس دفعہ بھی ہندی ادارہ ”ڈی دوتاخ اکاڈمی“ نے ہندوستانی طلبہ کے لئے تین وظایف کا اعلان کیا ہے۔ یہ زراعت، انجینیرنگ اور طبعیات کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے بہترین طلبہ کو عطا کئے جائیں گے۔ جنہیں جرمنی ہی میں رہ کر تعلیم پائی ہوگی۔ وظایف کی مقدار ۴۰۰ مارک یعنی ۳۰ پونڈ ماہانہ ہوگی جس سے صرف تعلیمی اخراجات کی کفالت ہو سکتی ہے۔ دوسرے مصارف طلبہ کو ادا کرنے ہونگے۔ جو زیادہ اہم نہیں ہیں۔ کیونکہ جرمنی میں ایک ہندوستانی کفایت شعار طالب علم ماہوار ۱۵۰ سے ۲۰۰ مارک یا ۸ سے ۱۰ پونڈ میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وظیفہ صرف ایک سال کے لئے عطا ہو رہا ہے۔ خاص صورتوں میں اس مدت کی توسیع بھی کی جا سکے گی۔ درخواست گذاری کے

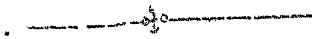
شرائط صرف اس قدر ہیں کہ امیدوار کسی ہندوستانی جامعہ کا طالبِ علم ہو۔ اور جرمن زبان جانتا ہو۔

ہمیں معلوم ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں سائنس کے طلبہ کو اس قسم کی ضرورتوں کے لئے نہایت خوبی کے ساتھ تیار کیا جا رہا ہے۔ انہیں جرمن زبان سے بھی فی الجملہ آگاہی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ ام، ایس، سی، کے طلبہ بھی ان وظائف کے لئے قسمت آزمائی کریں۔ اس میں روپیہ سے زیادہ ملک اور قوم کی وقعت ہمارے مدنظر ہے۔

درخواستیں ذیل کے پتہ پر اپریل ۱۹۳۰ء تک پہنچ جانی چاہییں۔



اس سال ادبیات کا نوبل پرائز جرمن کے ایک افسانہ نگار طامس مان کو ملا۔ طامس مان موجودہ جرمن مصنفین میں سب سے بلند پایہ مصنف ہیں۔ ان کے کئی ناول اور مختصر قصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مان کی شخصیت نہایت مطمئن، خاموش دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس خاموشی کی تہ میں طوفان پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔ مسٹر مان نے نہایت معمولی طور پر زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۸۷۵ء کو ریل لوبک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ میونچ گئے جہاں یہ ایک بیمہ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبیات اور انسانیت کا مطالعہ شد و مد کے ساتھ کیا۔ ۱۸۹۷ء میں ان کا پہلا ناول "گفالن" شائع ہوا۔ اس کی کامیابی نے انہیں ادبیات کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے "بڈن بروکس" "رائل ہائی نس" "ڈیتھ ان وینیس" "ٹونیو کراجر" اور کئی ایک ناول اور مختصر قصوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ مسٹر مان کی کردار نگاری بڑے اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔ اسلوب میں تھوڑی سی جھلک ظرافت کی بھی ہوتی ہے۔ انسان اور انسانیت کے وہ بڑے واقف کار ہیں۔ یہی امور ہیں جن کی وجہ سے وہ آج جرمنی کے چوٹی کے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔



افسوس ہے کہ ہندوستان اور اس کے کارناموں سے یورپ ابھی ذرا بھی روشناس نہیں۔ یورپی اقوام کی معلومات کا دائرہ ہندوستان کے متعلق اس قدر محدود ہے کہ وہ ہر ایک "انڈین" کو ہندی کے بجائے "ہندو" سمجھتے ہیں! ان کے ذہنوں میں اب تک ہندوستانیوں کا تخیل یہی ہے جو گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا اقوام کی تصویروں کو دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تعریف شاید وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتے کہ اس میں ایک نامہذب قوم، چند ہاتھی، درندے اور سانپ آباد ہیں! ان روشن خیال اقوام کے ذہنوں سے یہ تاریکی دور ہو تو ہمیں یقین ہے کہ اور بہت سے ہندی عالم اور ادیب اور شاعر نوبل پرائز کے مستحق تصور کئے جا سکیں گے۔ ہماری نظر میں اردو کے سر اقبال اور پریم چند شاید کسی بڑے ادیب سے کم رتبہ نہیں رکھتے۔



روز عیدکی دز ابرو دیب هلالا

قطعه دوم - روز عید

اورنگ زیب کی دکنی مہمات

از
(جناب احمد عبد الحی صاحب)

سرزمین دکن، قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اورنگ زیب سے قبل ان فیاضیوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا۔ اس لئے اورنگ زیب نے دکن کا عمدہ انتظام کر کے غیر آباد اور ویران علاقوں کو آباد کیا۔ کاشتکاروں کو ہمت دلائی اور ان کو کاشت کے لئے خزانہ سے روپیہ عطا کیا۔ اور عالمگیر نے محسوس کیا کہ خزانہ شاہی بغیر مالگزاری کے معمور نہیں ہو سکتا اس لئے زراعت میں خاص توجہ مبذول کی۔ چنانچہ مالگزاری کے انتظامات کے لئے دکن کے چار صوبوں کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ پہلا پائین گھاٹ اور دوسرا بالاگھاٹ۔ بالاگھاٹ کا انتظام مرشد قلی خاں کے سپرد کیا گیا۔ اس کی ذہانت و فراست سے مالگزاری میں ایک کثیر اضافہ ہوا۔ اس نے عالمگیر کو اس معاملہ میں خاص مدد دی اور محنت شاقہ اٹھا کر سلطنت اور خزانہ شاہی کی خیر خواہی کر کے عالمگیر کی خوشنودی کا باعث ہوا۔ اگر مرشد قلی خاں عالمگیر کا ٹوڈرمل کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ سنہ ۱۶۵۶ء میں دوسرا علاقہ بھی اسی کے حوالے کیا گیا۔ اس نے یہاں پر شمالی ہند کے بندوبست اور مالگزاری کے طریقے رائج کئے۔ اور متدین کفایت شعار راست باز اور ایماندار حکام کا انتخاب کیا عالمگیر کی خاص توجہ اور مرشد قلی خاں کے عملی تجربے کی وجہ سے محکمۂ مالگزاری میں ایسی نمایاں ترقی ہوئی کہ اکبر اعظم کے عہد سے شاہ جہاں تک عدیم المثال ہے اگر اکبر کے عہد میں مالگزاری[1] ایک کروڑ پونڈ اور شاہ جہاں کے عہد میں دو کروڑ ستائیس لاکھ پونڈ تھی تو عہد عالمگیر میں چار کروڑ پونڈ ہو چکی تھی۔ چنانچہ اورنگ آباد اور اس کے قرب و جوار میں تمام علاقے سرسبز اور شاداب دکھائی دیتے تھے۔ کاشتکاروں کی حالت قابل اطمینان ہوتے ہی مالگزاری میں اضافہ ہوا اور پیداوار کی زیادتی سے قیمتوں میں کمی ہو گئی جس سے دکن میں اطمینان اور سکون کی زندگی بسر ہونے لگی۔ لوگ روپیہ میں ڈھائی[2] من گیہوں اور دال خریدتے تھے دودھ اور دہی کی تو افراط تھی۔ اور گھی روپیہ میں چار سیر ملتا تھا۔

۱۔ "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" از مولانا شبلی صاحب۔ ۲۔ دیکھو سفرنامہ ڈاکٹر برنیر ۱۲۔

جب دکن میں تمول بڑھا تو تجارت کو فروغ ہوا۔ یہاں کے تجارتی جہاز دور دراز کے متمول ممالک تک جاتے تھے۔ یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں یہاں کا کپڑا زیب تن کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی شادیوں اور تہواروں میں ان ہی کپڑوں کی پوشاک پہنتے تھے۔ ملابار سے مچھلیاں جایا کرتیں۔ جو ممالک مغربیہ کی سرد آب و ہوا کے لحاظ سے کثیر مقدار میں فروخت ہوتی تھیں۔ حاصل جیسے اب سنگین لگائے جاتے ہیں پہلے ایسے نہ تھے۔ اس سے تجارت کی ترغیب ہوتی تھی۔ لوگوں کو اکتساب دولت کا ایک گونہ شوق ہوگیا تھا اسی طرح ایشیا۔ یورپ۔ پرتگال وغیرہ سے یہاں مال آتا تھا۔ فولاد کا کام نرتول میں ہوتا تھا۔ یہاں کے قالین اور دریاں دور دراز تک جاتی تھیں۔ مسولی پٹم کے بندرگاہ سے جہاز بنگال، سیام، چین جاتے تھے۔ ٹھٹھہ کو اور سندھ کی معقول تجارت ہوتی تھی جس سے ہندوستانی تاجروں کی دولت الیزبتھ کی اس جماعت سے کئی گنا زیادہ ہوگئی تھی جس کو اس نے ہندوستان جانے کی ترغیب دلائی تھی۔ دو آنے میں سو مچھلیاں بکتی تھیں، چند کوڑیوں میں سیر گوشت اور دیگر ضروریات کی چیزیں نہایت آسانی اور ارزانی سے خریدی جاتی تھیں ان واقعات سے عہد عالمگیر کی خوشحالی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ جب تجارتی جہاز ممالک مغربیہ کو جایا کرتے تو عموماً دریائی لٹیرے اُن کو لوٹ لیتے تھے جس سے تاجروں کو نقصان اُٹھانا پڑتا تھا۔ اسی لئے اورنگ زیب نے اُن کے انسداد کے لئے چالیس ہزار فوج کا دستہ سیدی خاں کے زیر نگرانی قائم کیا تاکہ اُن کی بوقت ضرورت سرکوبی کی جائے۔

مالگزاری کے انتظامات کے علاوہ فتوحات دکن کا اثر حکومت کے دوسرے شعبوں پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ چنانچہ ہر محکمہ سے کاہل اور نااہل عہدہ دار علیحدہ کردئے گئے۔ اُن کے معاوضہ میں محنتی، قابل اعتماد اور تجربہ کار لوگوں کو منتخب کیا گیا۔ علاوہ ازیں منصبداری کا پُرانا قاعدہ بند کردیا گیا۔ اور زیادہ تر جاگیروں کی عوض تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ اس سے جاگیرداروں اور منصبداروں کو پیر پھیلانے کا موقع نہ ملا۔

یہی عمل محکمۂ فوج میں کیا گیا اور اس محکمہ میں میر خلیل خاں سے خاص طور پر مدد ملی۔ اس نے فوجی قابلیت کے علاوہ اعلیٰ طبیعت بھی پائی تھی۔ جب عالمگیر نے اس کو توپ خانہ کا دارغہ مقرر کیا تو ایک قلیل عرصہ میں اس نے نمایاں ترقی کرکے تقریباً پچاس ہزار سالانہ کی بچت دکھلائی۔ ان اندرونی انتظامات سے دکن کی حالت بدل گئی۔ اس وقت دکن میں عام خوشحالی تھی اور لوگ نہایت سہولت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کو ایجاد و اختراع کا بھی شوق پیدا ہوا اور صنعت و حرفت کو عروج ہوا۔ دکن کا تمول تھوڑے ہی عرصہ میں انتہائی کمال کو پہونچ گیا۔ اورنگ آباد میں ہمرو کے تھان نہایت نفیس تیار

ہو کر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ فرانس، انگلستان، پرتگال تک جایا کرتے تھے۔ بیدریوں کو بیدری کام میں شغف تھا۔ وہاں نفیس اور رنگا رنگ کے گنڈیاں، ڈبیاں تھے، ڈبیاں غرض کہ مختلف چیزیں نہایت پختہ اور عمدہ تیار ہو کر دور دور تک بھیجی جاتی تھیں۔ گلبرگہ کا مصالحہ نہایت ہی خوشبودار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اس کے باہر بھی عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دکن کی ثروت کا اندازہ یہاں کی عالیشان اور بلند عمارتوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اورنگ آباد کا وہ مقبرہ جو تاج محل کی طرز کا ہے اور اورنگ آباد کی وہ بڑی مسجد جہاں اب بھی جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ غرض یہ تمام دکن کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کا اظہار زبان حال سے کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پانی کا انتظام جو مٹی کے مضبوط نلوں کے ذریعہ سے بہم پہونچایا گیا تھا اس قدر اعلیٰ تھا کہ اُن قدیم نلوں کی پختگی اور اُن کا سبدأ اور رسالہ معلوم کرنے میں آج کے روشن خیال انجنیر بھی قاصر ہیں۔

اندرونی انتظامات اور اصلاحات کے بعد عالمگیر نے بیرونی تعلقات کی طرف توجہ کی۔ اس وقت دکن میں خود مختار ریاستیں تھیں۔ ان میں آئے دن جھگڑے اور خانہ جنگیاں ہوتی تھیں۔ جس سے ملک میں امن و عافیت مفقود ہو چلا تھا۔ اورنگ زیب کے مقابل گولکنڈہ اور بیجاپور کی خود مختار ریاستیں تھیں۔ گولکنڈہ نہایت زرخیز مقام تھا۔ یہاں کا تمول بطور مثال پیش کیا جاتا تھا۔ تجارت فروغ پر تھی۔ بری اور بحری طاقت کچھ کم نہ تھی۔ مگر اس دولت کے ساتھ ریاست کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ انتظام کی خرابی سے کوئی سلطنت دیرپا نہیں رہ سکتی۔ والی ریاست کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یہاں کا وزیر میر جملہ اپنے ذاتی مفاد کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اپنے غیر معمولی اثرات کی وجہ سے کرناٹک کا علاقہ فتح کر کے اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ اس پر عبداللہ قطب شاہ نے اُس کے بیٹے اور ماں کو قید کر کے اس کا پورا مال ضبط کر لیا۔ میر جملہ کے اس طرز عمل پر بادشاہ سے خود اُس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور بجائے اِس کے کہ وزیر اور بادشاہ مل کر ریاست کے معاملات طے کرتے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ایسی حالت میں اورنگ زیب کو ہر طرح کوشش کے استعمال پر بھی خراج نہیں ملا۔ اسی اثنا میں میر جملہ نے مغلیہ سلطنت کی امداد چاہی۔ اس سے مغلوں کو مداخلت کا خاصہ موقع ملا۔ مگر قطب شاہ نے اورنگ زیب کی ہدایت کی تعمیل نہیں کی تو اورنگ زیب نے فوج کشی کر کے اُس کی خبر لی۔ چونکہ یہ اورنگ زیب کی شہزادگی کا زمانہ تھا۔ اس لئے مرکزی حکومت کے احکامات کی بنا پر مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ اسی طرح بیجاپور کی بدعنوانیوں کی تنبیہ کی گئی تو عادل شاہ نے افضل خاں کے

شورہ سے معافی چاہی۔ جب ایک کمسن لڑکا عادل شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا تو پھر بدامنی کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس لئے مغلیہ حکومت نے دوبارہ مداخلت کی۔ اس وقت اورنگ زیب نے جس کے ہمراہ میر جملہ تھا دہلی کے فرمان کی بنا پر صلح کر لی۔

۱۶۵۸ء میں شاہ جہاں کی علالت اور تخت نشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے اورنگ زیب دکن چھوڑ کر شمالی ہند روانہ ہوا۔ اور تخت نشینی کے بعد بھی ایک عرصے تک ذاتی طور پر اس علاقے کا ارادہ نہ کر سکا۔ گو بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں معاہدہ کے لحاظ سے مغلوں کی شہنشاہی قبول کر چکی تھیں۔ لیکن سلطنت کے کارپردازوں کی مصروفیت کی وجہ سے اُن کا خراج ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے علاقوں میں مرہٹے بھی زور پکڑ رہے تھے۔ یہ لوگ ملک عنبر کے اصول پر عمل پیرا ہو کر پیشہ کاشتکاری سے ترقی کر کے سپاہیانہ زندگی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ اور یہ بہمنیہ سلطنت کے درباروں اور ملک عنبر کی فوج میں رہکر قزاقانہ جنگ کے ہتھکنڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ یہ مردانہ وار حملہ نہیں کرتے بلکہ اچانک اور پیچھے سے چھاپے مارتے تھے اور تعاقب کے وقت وہ گھاٹیوں اور غیر مانوس مقاموں میں چھپ جاتے تھے اس طرح یہ لوگ مہاراشٹر کے پورے علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں اُن کو کافی فوجیں فراہم کرنی پڑیں۔ کیونکہ باہمی عناد کے علاوہ شمالی دشمنوں کا مقابلہ درپیش تھا۔ ملک عنبر کے انتقال کے بعد اُس کی مرتب کردہ فوجیں منتشر کر دی گئیں اور اس کی جاگیریں ساہو کو عطا کی گئیں۔ جب ملک عنبر کا لڑکا فتح خاں مغلوں سے جا ملا تو شہنشاہ نے اس کے باپ کی جاگیریں ساہو سے دلادیں۔ اس کے بعد اس نے والی بیجاپور کی ملازمت اختیار کی تو دربار بیجاپور نے اس کی خدمات کے صلہ میں پونا اور سوپا کی جاگیریں عطا کیں۔ مگر جب ساہو کا بیٹا سیوا عنفوان جوانی اور آغاز شباب کو پہونچا تو اُس کا عروج بر سر تنزل ہو گیا۔ یہ پوتے کے دادا جی کارکن کے زیر تعلیم و نگرانی رہا۔ اس کو فن سپہگری اور سیر و شکار کا طبعی ذوق تھا۔ پہاڑوں کے بھیل اور کولی اس کے ممد و معاون تھے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی جنگلوں اور گھاٹیوں میں گھومنے لگا۔ موقع پا کر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیجاپور کے آس پاس کے قلعوں پر چھاپا مارتا تھا۔ ان مقامات کے افسروں کے شور و فریاد پر حکومت کی طرف سے کوئی توجہ مبذول نہ کی جاتی تھی۔ اور عموماً یہ عمال کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا تھا۔ حکومت کی ان بے اعتنائیوں کی وجہ سے اُس کو نئے نئے گُل کھلانے کا موقع ملا۔ گو بیجاپور دکن میں زبردست حکومت تھی مگر اُس کی انتظامی حالت بدترین ہو گئی تھی۔ جس سے سیوا نے اپنی طاقت

بڑھائی۔ اس کے جھنڈے کے نیچے سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ جمع تھے۔ اس نے دکن میں لوٹ مار سے بدامنی پھیلائی۔ دکن کی سلطنتوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھا کر مرہٹوں نے مال غنیمت کے علاوہ مقبوضات بھی حاصل کئے۔ اس طرح انہوں نے ایک علیحدہ سلطنت قائم کرلی۔ سنبھا اپنے باپ سیوا کا جانشین ہوا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں پر بھی اُس کی بے رحمی اور بے دردی کا دست دراز تھا کیا ہندو کیا مسلمان غرض سب کے سب اُس کے حرکات قبیحہ کے شاکی تھے۔ اس نے باپ سے بغاوت کی۔ جب سیوا نے سخت مواخذہ کیا تو مغلوں کے سایۂ عاطفت میں آگیا۔ عنان حکومت ہاتھ میں آئے ہوئے کچھ عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ سنبھا نے برہان پور کے بیرونی مقامات کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ اب عالمگیر کو راجپوتوں کی مہم سے فراغت ملنے کی وجہ سے شمالی ہند سے اطمینان ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں برہانپور کے معزز طبقہ کا محضر موصول ہوا تو سنبھا کی گوشمالی اور اپنے مقامات کی حفاظت کی غرض سے وہ برہان پور ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہونچ گیا۔ شہزادہ معظم نے سنبھا کے تقریباً کل قلعے تباہ و تاراج کر دئے مگر موسم کی خرابی اور بارش کی کثرت سے لشکر میں وبا پھیل گئی تو معظم احمد نگر واپس ہوا۔

اسی زمانہ میں شہنشاہ نے بیجاپور کا رُخ کیا۔ چونکہ والی بیجاپور باوجود باجگزار اور ہم مذہب ہونے کے تخت تیموری الٹ دینے کے لئے ہمیشہ مرہٹوں کی مدد کرتا تھا۔ یہ اپنے وعدہ کا پابند نہ تھا اور نہ اس پر شاہی خطاب و عتاب کا کچھ اثر ہوتا تھا۔ اسی لئے شہزادہ معظم اس مہم کے لئے مقرر ہوا۔ مگر فوج کی کمی کی وجہ سے وہ محصور ہو گیا۔ تو اس کی کمک کے لئے فیروز جنگ کا انتخاب ہوا۔ اس بہادر سپہ سالار کی مدد سے بیجاپور کا محاصرہ کیا گیا۔ مگر اجناس کی فراہمی اور ساز و سامان کی فراوانی نے بیجاپوریوں کو ڈٹ کر لڑنے کا موقع دیا اسی اثنا میں شاہی فوج میں برگشتگی اور باہمی ناچاقی پیدا ہو گئی شہنشاہ نے کمال استقلال و متانت سے آکر اُن کو غیرت دلائی اور اُن کے دلیرانہ جذبات کو اکسایا۔ اس طرح اُن میں بہادری اور سرفروشی کی ایک روح دوڑا دی۔ الغرض ۱۰۹۷ھ میں غازی الدین سپہ سالار کی شجاعت کی بدولت ریاست بیجاپور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی۔

جب سیوا پنجہزاری کے خطاب سے ناراض ہو کر جشن سالانہ کو خیرباد کہا اور حیدرآباد آیا تو ابوالحسن والی حیدرآباد نے اُس کی ہمت بڑھائی، جنگی ساز و سامان اور مال و متاع سے مدد کی تو اُس کو کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔ اُس نے ایک مایوس اور محصور شخص کی اعانت کی جس کی دولت پہلے ہی

لٹ چکی تھی اور عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ غرض ابو الحسن کی وجہ سے سیوا کو ترغیب ہوئی کہ شاہی مقبوضات پر از سرنو چھاپہ مارے اور کمزوروں پر ظلم ڈھائے۔ ابو الحسن مرہٹوں کا بڑا حامی تھا اور ان ہی کے معاونت سے مغلیہ تخت و تاج کو تاراج کرنے کا درپے تھا۔ گویا اس کی بسر اسی خیال میں ہوئی تھی کہ مرہٹوں کو دولت اور لشکر سے مدد کر کے مغلوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔ تاناشاہ نے اپنے اس خیال کو کامیاب بنانے میں امکانی کوشش کی۔ یہ عیش و عشرت کا بندہ۔ کھیل تماشاؤں میں منہمک، خواہشات نفسانی و نفس پرستی میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور ہمیشہ نشہ میں مست اور سرشار عصیاں کاری و بدشعاری عین اس کا دستور غرور و نخوت کا نشہ ہمیشہ چڑھا رہتا تھا۔ غرض دنیا جہاں کی تمام برائیوں کا مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے زمانہ میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ان پر ہر طرح سے سختیاں اور پابندیاں عاید کردی گئی تھیں۔ حکومت مادنا پنڈت کی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو نقصان ہی نہیں پہونچایا بلکہ ظلم و تعدی سے کام لیا۔

سید مظفر کی اعانت اور کمال مستعدی سے ابو الحسن گولکنڈہ کے تخت و تاج کا مالک ہوا تھا۔ یہ نہایت ہی زیرک، اور خیر خواہ ریاست تھا۔ مگر ابو الحسن نے اس کو معزول کر کے مادنا کو وزارت کا منصب عطا کیا۔ سیوا نے ان امور کے تحت دربار شاہی سے فرار ہونے کے بعد ابو الحسن سے مدد لی اس کے علاوہ ابو الحسن نے والی بیجاپور کو ایک خط لکھ بھیجا کہ تم شاہی افواج کا نہایت شجاعت و استقلال سے مقابلہ کرو۔ میں ادھر سے سنبھا کی نگرانی میں چالیس ہزار فوج بھیجتا ہوں۔ اب عالمگیر کے عزم و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ ابو الحسن نے باوجود باجگزار ہونے کے خدام شاہی کے خلاف مرہٹوں کو مدد دی اور عین محاصرہ بیجاپور کے وقت سنبھا کو مغلوں کے خلاف اکسایا۔ اور کثیر افواج کے ساتھ مہم پر پہونچنے کی ترغیب دلائی۔

اس کے علاوہ کئی سال سے خراج بھی ادا نہیں کیا گیا تھا۔ سلطنت کو کسی طرح سے اس ریاست کے قول و فعل کا اعتبار نہ تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر مرہٹوں کا جادو پوری طرح چل گیا تھا۔

والیان قطب شاہی اہل تشیع سے تھے اور امرا و روساء عموماً اسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ شہزادہ معظم اسی فرقہ کا ہم خیال تھا۔ بادشاہی امرا بھی اس سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ مگر اس کی بداخلاقی اور مردم آزاری دربار سے نکل کر شہر میں خاص و عام ہو گئی تھی۔ اس کی تنگ ظرفی اور مغلوں سے مخاصمت چھپی ہوئی نہ تھی چونکہ ولی عہد کو اس سے محبت تھی۔ اس نے جنگ سے بچانے کے لئے پیغام

دیا کہ مادنا کو علیحدہ کرکے قید کردیا جائے۔ شاہی مقبوضات واپس کردیئے جائیں۔ اور خراج کی باقیات ادا کردی جائیں۔ گولکنڈہ سے اس کا جواب نہایت ہی سخت ملا۔ مقابلے کے لئے فوج بھیجی گئی۔ دکنی لشکر نے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مزید برآں شہزادہ معظم نے رعایت سے کام لیا۔ جس پر عالمگیر نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ اس پر بھی جیت عالمگیر کے ساتھ رہی۔ کئی مہینوں کی لڑائی کے بعد مغل فوجیں حیدرآباد میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوگئیں۔ تاناشاہ اور اس کے ساتھیوں نے قلعہ گولکنڈہ کو اپنا مقام امن وعافیت بناکر پہلی شرط کو مجبوراً تسلیم کرلیا۔ معظم نے خراج میں سالانہ اضافہ کرکے حیدرآباد کو خالی کردیا۔ اس نے پھر رعایت سے کام لیا۔ مگر ابوالحسن نے اپنے اس عہد کا ایفا نہ کیا بلکہ فوج مقابلے کے لئے بھیجی۔ تو اورنگ زیب نے گولکنڈہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ بیجاپور کے مقابل نہایت ہی بلند اور مستحکم تھا۔ یہاں کا تمول، یہاں کے لڑنے والے، یہاں کا جنگی ساز وسامان، بیجاپور سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اس کو کافی موقع ہاتھ آنے کی وجہ سے فوج کو عمدگی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ادھر شہنشاہ کے ایرانی ساتھی اس جنگ کے قطعاً خلاف تھے۔ معظم کو ابوالحسن سے دلی ہمدردی تھی۔ اس پر موسم کی خرابی، بارش کی کثرت، اشیاء مایحتاج کی قلت سے محاصرین کے بلند حوصلے پست ہوگئے۔ مگر عالمگیر اتنا مستقل ارادہ اور بلند حوصلہ تھا کہ ان عوائق اور موانع سے کبھی باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی دھن کا پکا اور خیال کا سچا تھا۔ معظم اپنی سازشوں کی وجہ سے حراست میں لے لیا گیا۔ اور بعض اہل سازش کو سزائیں ہوئیں۔ آخرالامر تاناشاہ کے رفیقوں نے مایوس ہوکر عالمگیر کی سیادت تسلیم کرلی۔ سپہ سالار فیروز جنگ نے انتہائی کمال اور استقلال سے دکنی فوج کا ایک عرصہ تک مقابلہ کیا۔ اور گولکنڈہ کی طرف سے عبدالرزاق نے نہایت ہی مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کے ساتھ قوم اور ملک کی حفاظت وحمایت کے لئے اپنی جوانمردی اور بہادری کے جوہر دکھلائے چنانچہ اس معرکہ میں اس کے بدن پر ستر سے زائد کاری زخم لگے۔ اس محاصرہ سے امرا تنگ آگئے اور قلعہ کے نگہبان سردار نے خود شہر پناہ کا دروازہ کھولکر مغلوں کی ہمت بڑھائی اب کیا تھا کہ محاصرین شہر میں گھس پڑے۔ گویا قطب شاہی سلطنت آٹھ مہینے دس دن کے محاصرہ کے بعد مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گئی۔

گو اس معرکہ قتال کی وجہ سے اورنگ زیب کو مرہٹوں کے سدباب کا موقع نہ ملا۔ مگر شہنشاہ کی قربت اور مصروفیت جنگ کی وجہ سے مرہٹوں کی مجال نہ ہوئی کہ پھر اس عرصہ میں کہیں اور ہاتھ ماریں۔ سنبھا نے اس ڈر کی وجہ سے امن کی زندگی بسر کرنی شروع کی مگر عالمگیر کے ادھر سے فارغ ہوتے ہی

فیروز جنگ نے بیجاپور کے وہ جنوبی مقامات اور مقبوضات جن پر ساہو قابض ہو گیا تھا چھین لئے۔ اور سنبھا کے مفسدانہ خیالات اور باغیانہ جذبات کے استیصال کے لئے مقرب خاں مامور کیا گیا۔ یہ بہادر کمال شجاعت سے سنبھا کے تعاقب میں نکلا اور خبر پاکر اس دشوار گزار گھاٹ کی طرف یلغار کرتا ہوا اچانک پہونچ گیا جہاں سنبھا اپنی دو تین ہزار فوج کے ساتھ محو عیش تھا۔ سنبھا کو سوائے جنگ کے بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ گو بادشاہی لشکر زیادہ نہ تھا مگر اس کے سامنے مرہٹوں کی فوج ٹھیر نہ سکی۔ اور سنبھا کسی مندر میں چھپ گیا۔ مقرب خاں بھلا اس کو کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کو اور اس کے بال بچوں کو گرفتار کر کے دربار شاہی میں لے آیا۔ سنبھا نے یہاں پہونچکر باوجود اس عالم مایوسی کے شہنشاہ کو مغلظات سنائیں اور معافی نہیں مانگی۔ اس لئے وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کی ماں اور بیٹے کے ساتھ خاص مراعات برتے گئے۔ سنبھا کے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت عالمگیر کے شاہانہ اور فیاضانہ سلوک کے ساتھ ہوتی رہی۔ اس کے بعد رام راج کے ہاتھ مرہٹوں کی عنان حکومت آئی۔ مگر مرہٹوں کی خود مختار ریاست قائم نہیں رہ سکی۔ چونکہ رام راج جو برار کے علاقوں میں چھاپہ مارتا اور آوارہ پھرتا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں مر گیا۔ اس لئے اس کی بیوی تارا بائی نے رہنمائی پر کمر باندھی۔ اس نے عالمگیر کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مرہٹہ فوج دو تین گروہوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ان کو گولکنڈہ اور بیجاپور کے مسخر ہونے کے پہلے کافی امداد پہنچتی تھی۔ اور وہاں کے امرا اور زمیندار ان کی بدنظمی اور کم توجہی سے متمرد اور سرکش ہو گئے تھے۔ الغرض مغلوں کے خلاف مرہٹوں کو مدد ملتی تھی۔ اور قدرت نے انہیں کچھ ایسے پہاڑ دے رکھے تھے کہ جس سے وہ قزاقانہ طریقہ سے لڑ بھڑ سکتے تھے۔ اس وقت مرہٹوں کے جرگے پریشان حال تھے۔ چونکہ ان کو لوٹ مار کے علاوہ جو مستقل آمدنی کا ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے انتہائی زمانہ پیری میں بھی اپنی استقامت اور بلند حوصلگی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اپنی وفات کے دو برس پہلے مرہٹوں کے تمام بلند اور سنگین قلعے مسخر کر کے محفوظ مقامات پر اپنا تسلط جمایا۔ بسنت گڑھ کی فتح سے کوکن ہی کی تسخیر مکمل ہو گئی۔ جس سے مرہٹہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب مرہٹوں کا کوئی مامن نہ تھا۔ یہ لوگ بے یار و مددگار ہو کر قزاقوں اور ڈاکوؤں کی طرح آوارہ گردی اور مردم آزاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہجہاں کے زمانہ میں ان کی قوت بڑھ چکی تھی۔ جب عالمگیر کا سابقہ پڑا تو ان کی طاقت انتہائی عروج پر تھی۔ مگر اورنگ زیب کی اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی سعی و اقبال نے بڑے بڑے

سورما اور علم بردار ان بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اس کی آخری زندگی تک مغلیہ سلطنت میں نئے مقبوضات شامل ہوتے رہے۔ جو حکومت کی رفعت اور استحکام کا ثبوت ہے۔

جس وقت دکن کی ریاستیں بدعنوانیوں کا گھر بن گئی تھیں اور جب کہ وہ بلندی سے پستی، اجالے سے تاریکی اور انتہائی ضلالت کی طرف جا رہی تھیں تو قانون قدرت کے مطابق اُن کی ماہیت عالمگیر کے زبردست ہاتھوں نے بدل دی۔ ایسی حالت میں اُن ریاستوں کا دم خم ٹوٹ گیا اور وہاں پر مغلیہ سلطنت کے صوبہ دار قائم ہوگئے۔ ان سے مرکزی حکومت دور ہوگئی خبریں ملنے میں کئی دن درکار ہوتے تھے۔ جنوبی ریاستوں پر مسافت کی وجہ سے حکومت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ اب چونکہ مرہٹوں کی کوئی مستقل حکومت باقی نہ تھی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کی طرح مختلف ٹکڑیوں میں منقسم ہوکر دور دور پھیل گئے تھے۔ اور موقع پاکر چھاپے مارتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے بعض بندرگاہوں کو بھی لوٹ لیا۔ ایسی حالت میں شہنشاہ نے نووارد انگریزوں اور پرتگالیوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کا حکم نافذ کیا۔ کیوں کہ حکومت ان کے نقصان کی ادائی سے زیر بار ہو چکی تھی۔ اور یہی سلسلہ ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا۔ اس طرح نووارد فرنگیوں کی خوب بن آئی اور ہندوستان میں اُن کی نئی طاقت پیدا ہوگئی جو آئندہ چلکر مغلیہ سلطنت کے تنزل کا بالواسطہ سبب بنی۔

چونکہ ابوالحسن شیعہ ریاست کا ڈوبتا ہوا آفتاب تھا۔ اس سے اہل تشیع کو خاص لگاؤ اور انست تھی۔ اُس کی سلطنت کا چراغ گل ہونے کے بعد اُس فرقہ کے تعصب کا نائرہ مشتعل ہوا۔ اور اُن کے غیظ و غضب کی آگ بھڑکی اور یہ بھی مغلیہ سلطنت کی خرابی کا ایک باعث ہوا۔

عالمگیر کی علمداری کے قبل دکن میں مختلف خود مختار راجدھانیاں تھیں۔ ہر راجدھانی کا قانون ہی نرالا تھا۔ مگر اس نصرت و فتح کی وجہ سے پورا دکن ایک ہی شہنشاہ کا مطیع و منقاد ہوگیا۔ ایک ہی قانون ہر گوشہ دکن میں رائج ہوگیا۔ ایک ہی عدالت تھی جو اہل دکن کی قسمت کا فیصلہ کرتی تھی۔ اور ایک ہی سکہ تھا جو دکن میں جاری تھا اور ان سب کا تعلق مغلیہ حکومت سے تھا۔ غرض ایک ہی چشمہ سے دکن کی کھیتی سرسبز ہوتی تھی۔ گو دکن کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں دیر سے ملتی تھیں، اس کے علاوہ راستہ دشوار گزار تھا تاہم عالمگیر نے مسافروں کی حفاظت کے لئے جابجا چوکیاں اور بدرقے رکھے تھے۔ اگر مسافروں کو کوئی گزند پہونچتا اور وہ لٹ جاتے تو بدرقوں سے اُس کا سخت

مواخذہ کیا جاتا تھا جس سے مسافروں کی آمد و رفت اور فرامین کے وصولی میں کوئی خوف و تامل نہ تھا۔ الغرض کسی طرح سے بادشاہی احکامات اور اس کے مروجہ قانون کی تعمیل یہاں عمل میں آتی تھی۔

ابتداً دکن کی ریاستوں میں فسق و فجور پھیلا ہوا تھا۔ اس کا انسداد اور نگرانی حکومت کی جانب سے خاطر خواہ نہ تھی۔ ادھر مرہٹوں کی لوٹ مار، جبر و تعدی اور ان کے قتل و غارتگری سے ملک میں طوفانِ بے تمیزی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ انصاف نام کو نہ تھا۔ مگر اورنگ زیب کے فتوحات کے بعد دکن میں امن و عافیت کی منادی کر دی گئی تمام سرکشوں اور باغیوں کا ایک سرے سے استیصال کیا گیا۔ کسی ملک کی بقا و حیات کا انحصار وہاں کے امن و عافیت پر ہے۔ عالمگیر اس نظریہ کے موافق رعایا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے اعتدال پسند احکام کے سامنے رعایا سر تسلیم خم کرتی تھی۔ گو اس وقت موجودہ زمانہ کی طرح ذرائع آمد و رفت سہل نہ تھے مگر فرامین کی تعمیل بروقت ہوتی تھی اور [illegible] بہت کم سنائی دیتی تھیں۔

اس کے علاوہ مذہبی آزادی عام تھی۔ اور حکومت ان پر بیجا تصرف اور وعدہ خلافی سے کام نہیں کرتی تھی۔ ہر قوم ہر طبقہ اور ہر انسان اپنے خیال میں آزاد تھا۔ چنانچہ غارہائے ایلورا جو اورنگ آباد کے دامن میں ہیں وہ برہنہ مورتوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہاں ہندو نہایت آزادی کے ساتھ تہوار مناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا مرکز اور جائے عبادت و قربانی اجنٹہ تھا۔ وہاں بھی غارہائے بوقلموں کی کثرت تھی اسی طرح بہت سے مندر تھے جہاں تیرتھ کے لئے دور دراز کے ہندو زائرین بغیر کسی پروانہ کے آتے تھے۔ اور عرصہ تک یہاں ان کا جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ہر انصاف پسند عالمگیر کا وجود دکن کے لئے باعث آزادی مذہبی و رواداری خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرزمین دکن ایک عظیم الشان وسیع ملک تھا۔ جہاں مختلف راج دھانیاں برسر اقتدار تھیں۔ آج بھی یہاں کے بڑے بڑے قلعے اور مندر گاہیں ان کے تمول اور مذہبی تخیل کا ثبوت دیتی ہیں۔ گو اورنگ زیب کا ان پر تسلط ہو چکا تھا مگر اس نے ان کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کی حمایت کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جنہوں نے بیدر، ورنگل اور گولکنڈہ وغیرہ کے قلعے دیکھے ہیں، ان پر انہوں نے قدیم مندر گاہوں کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ ان کو محفوظ دیکھ کر کوئی عقلمند خواہ وہ کسی مذہب کا ہو مذہبی رواداری کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب اورنگ زیب نے دکن کو فتح کیا تو اپنے ساتھ اپنا تمدن بھی لایا۔ یہ مذہبی حکومت کو اسلامی آئین و قوانین کے مطابق چلاتا تھا۔ اکبر کے عہد میں جو رسمیں رائج تھیں وہ کم و بیش شاہ جہاں کے دور تک جاری تھیں۔ اگر عالمگیر اسلامی شعار اختیار نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ تیموری سلطنت ہندو سلطنت سے مبدل ہو جاتی۔ سنہ شمسی جو اکبر کے عہد سے چلا آتا تھا اس کو سن قمری سے بدل دیا پوشاک اور درباری تمدن جو ہندوانی طرز لیا ہوا تھا اس میں بھی تبدیلی کر دی۔ اس نے تمام درباریوں اور عام باشندوں کو اسلامی مساوات کا سبق سکھلا کر بادشاہ پرستی کو مٹایا۔

ان فتوحات سے نہ صرف امور سلطنت اور فوجی معاملات میں استحکام ہوا بلکہ علم و سخن کا آفتاب بھی چمکا جس طرح سکندر کے حملوں سے ہند کو منجملہ اور چیزوں کے علمی اور ادبی ذخیرہ ہاتھ آیا اسی طرح اورنگ زیب کے ان فتوحات سے اردو زبان کی نشو و نما کے لئے راستہ کھل گیا۔ اس نے ولی[1] کی ہمت بڑھائی جس سے اس کا اردو کلام دار السلطنت میں قبولیت عام کی سند حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ اس سے دوسروں کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے شاعر پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک مجلس منعقد کی جس میں علماء، فضلا بلائے گئے تھے۔ ان کی مدد سے اورنگ زیب نے مختلف کتابوں سے مواد لے کر اسلامی قانون کی ایک جامع کتاب بنائی جس کو "فتاویٰ عالمگیری" کہتے ہیں اس کتاب کے اکثر قوانین آج بھی حکومت برطانیہ میں رائج ہیں۔ ہر موضع اور تعلقہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اور محنتی اور شوقین طلبا کو خزانہ شاہی سے وظائف مقرر کئے۔ ان کی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کو اچھی طرح پرورش کیا تا کہ وہ آئندہ اپنی زندگی، اپنے ملک اور سلطنت کی خدمت میں وقف کر سکیں۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسخر کرنے اور مرہٹوں کے استیصال کے لئے اورنگ زیب دکن میں ایک عرصہ تک رہا۔ اس کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں فاصلہ کی وجہ سے وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے زور پکڑا اور خاصی طاقت فراہم کر لی۔ جس سے انہوں نے پنجاب پر چھاپہ مارا۔ اس کے انسداد کے لئے عالمگیر کو اپنی توجہ صرف کرنی پڑی ان ہی اسباب کی بنا پر دکن بہت جلد فتح نہیں ہوا۔ گو حکومت کی جانب سے ان کا معقول انتظام کیا گیا تاہم انہوں نے اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں اپنی طاقت مستحکم کر لی تھی۔ جس سے حکومت کو خاص توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی۔

شمالی ہند سے فوجیں کئی مہینوں کے بعد دکن آتی تھیں جس سے مغلوں کو ایک بڑی رقم خرچ

[1] ولی دکنی شاعر۔ اورنگ آباد کا باشندہ جس کو دنیا نظم اردو کا آدم تسلیم کر چکی ہے ۱۲

کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ دکنی ریاستوں کا تمول کچھ کم نہ تھا۔ اس لحاظ سے مغلوں کا روپیہ بھی کافی صرف ہوتا تھا۔

غرض ان فتوحات سے دکن میں مستقل لڑنے والے سپاہی پیدا ہوئے۔ اور ایک اعلیٰ فوج مرتب ہوئی جس کا سپاہی تجربہ کار اور سخت جان سپاہی تھے ضرورت کے وقت وہ غنیم کا مقابلہ کرتی اور ملک میں اطمینان و سکون کا باعث ہوتی تھی۔ دشمنوں کا ایک ایک کرکے خاتمہ کیا گیا۔ مرہٹوں کی بڑی طاقت منتشر کردی گئی۔ اب ان کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ جب دکن میں امن و تنظیم قائم ہوگئی تو صنعت و حرفت نے اہل دکن نے ترقی کی اور اس میں اعلیٰ شغف حاصل کیا۔ کسی ملک کی ترقی اور عروج کا راز و دار و مدار وہاں کی صنعت پر ہے انگلستان کو لیجئے اس نے جو آج نمایاں ترقی کی وہ محض صنعت و حرفت کی بدولت ہے۔ صنعت کی ترقی تجارت پر ہے۔ اہل دکن کے جہاز دور دراز کے ممالک کو جایا کرتے جس میں ان کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس سے ان کے تعلقات وسیع اور اثرات قوی ہوتے گئے۔ زراعت کو نمایاں ترقی ہوئی۔ کیونکہ یہاں شمالی ہند کے وہ اصول اختیار کئے گئے جو وہاں کے اعلیٰ ترین اصول تھے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ دکن کا تمول بڑھا۔ اور حکومت کو کافی مالگزاری وصول ہونے لگی۔ دولت کی کثرت سے تکلف اور راحت کی چیزوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا اظہار عالیشان عمارتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا تمدن اور ان کا طرز معاشرت جنوبی ہند پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ چنانچہ اس وقت تک بھی مغلیہ تمدن کا اثر دکن میں زندہ ہے اور اس کے اثرات ہر شعبہ زندگی میں پائے جاتے ہیں۔

مصحفی کا تذکرۂ ہندی

(از:- عمر یافعی ــ)

مصحفی کے تذکرۂ ہندی کے معلومات کے لیے آب حیات (آزاد) تذکرہ شعرا (حسرت موہانی) مثنوی بحر المحبت (مرتبہ مولوی عبد الماجد) صحیفہ مصحفی (مرتبہ میر آفاق موسوی) مصحفی کا تذکرہ (مضمون مولوی عبد السلام ندوی در رسالہ معارف اگست ۱۹۲۳ء) دیکھنے کی ضرورت تھی، دیکھا، جس میں مولوی عبد السلام صاحب ندوی کے مضمون کے سوا مصحفی اور مصحفی کی شاعری ہی شاعری ہے جب آپ کا جی چاہے "آب حیات" میں:-

(مصحفی)

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

(انشا)

لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

پڑھ لیجیے!

اور زیادہ سے زیادہ مصحفی کے سات دیوان تھے یا ان کے اتنے شاگرد، مصحفی کے شاگردوں میں شیخ ناسخ بھی ہوں یا نہ ہوں اور مصحفی نے سات دیوان لکھے بھی یا نہیں؟ اس بحث سے اردو ادب اور تاریخ کو شاید اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکتا جتنا مصحفی کی تالیفات میں تذکروں کی تحقیقات سے پہنچ سکے گا۔ مصحفی کے "تذکرہ ہندی" کی تحقیق خود مصحفی کے تذکرہ کی روشنی میں کرنی زیادہ بہتر ہوگی، اس تحقیق سے پہلے مصحفی کی شخصیت کو بھی مصحفی کے قلم سے دیکھیے کہ وہ اپنے باب میں کیا کہتی ہے:-

(تذکرہ فارسی)

"مصحفی- مولف ایں مجموعہ- فقیر حقیر غلام ہمدانی کہ مصحفی تخلص میکند او را نیز لازم آمد کہ در ردیف میم اشعار خود را ہم زینت تذکرہ نماید تا بدیں واسطہ داخل حلقہ مجلس یاراں باشد۔"

(تذکرہ ہندی)

"مخفی نماند مولف ایں تذکرہ کہ غلام ہمدانی نام دارد و تخلص مصحفی میگذارد و بزرگانش ابا عن جدا نوکری خانہ بادشاہ کردہ اند از ایامے کہ تفرقہ شدیدے در سلطنت راہ یافتہ سلطنت خانہ ایں

رو سیاہ ہم بخاک سیاہ برابر شدہ۔ ہم از تمتع دنیا بہرہ داقی داشتند۔ ایں فقیر چونکہ بخت و طالع آنہا نداشت ناچار از آغاز شباب بہ اقتضاے موزونی طبع مصروف تحصیل علم بود۔ چنانچہ بفیض صحبت بزرگان اول از تکمیل نظم و نثر زبان فارسی و تحقیق محاورہ و اصطلاحات آں فراغت حاصل کردہ بہ مقتضاے رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف ریختہ گوئی داشتہ۔ برائے آنکہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ سبب ریختہ کم است۔ و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلائے فارسی رسیدہ بلکہ از رسپر گردیدہ چنداں مصروف فارسی نماندہ است۔ دوازدہ سال در شاہجہاں آباد بدور نجف خاں مرحوم گوشۂ عزلت خزیدہ۔ زبان ریختہ اردوے معلی کمال دریافت نمودہ۔ و ہرگز برائے تلاش معاش دراں شہر احیاء اموات بر در کس نرفتہ۔ اگرچہ بسبب فارسی گوئی در یاران مسلم الثبوت فارسی گو ہم شمردہ می شود اما نام برآوردہ بریختہ است۔ وآں چہ دریں مدت تصنیف و تالیف کردہ ایں است:۔

دو دیوان فارسی بزبان فصیح کہ یکے در جواب مولانا نظیری نیشاپوری ہنوز ناتمام داشت و یکے بطور خود تمام۔

دو دیوان ہندی۔

دو تذکرہ یعنی فارسی و ہندی۔

و یک دو جزو شاہنامہ ناتمام تا نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی وغیرہ

و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ۔

مع مسودہ دیوان فارسی اول کہ زبانش بطور جلال اسیر و ناصر علی بود پسند رفتہ محو است کہ کلام خود را آخر ہمہ صاحبان نویسند۔ اما حرف الیم برآں آورد کہ بردیف میم داخل باشد لہٰذا از شعر فارسی خود را اشعار ایں ہجریدہ کردہ شد تا بر صفحہ روزگار یادگار بماند:۔

(انتخاب)

شنا ہے مصحفی میں جب سے شعر عرفی کا | ہمیشہ ہات گریباں سے ہے مرا گستاخ
بہ ناعتے کہ کشائی قبا بسیاد آورد | کہ میکشا دکمے بند ایں قبا گستاخ

کہیں کے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا | خدا جانے کے بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

نہ خیال آسماں اس صورت تنزل ہو جائے گا — رفتہ رفتہ مجھکو سوجھے ہے جنوں ہو جائے گا
ان حنائی ہاتھوں کو پردے میں رکھو بہر خدا — مفت میں خالی کسی کا ورنہ خوں ہو جائے گا

کل میں بزم راہ میں اسے پہچان رہا تھا — پھر وہ بھی مجھکو دیکھ کے حیران رہ گیا
سمجھے وہ میرے چشمہ دہ اضطراب کو — سینہ میں جب کہ ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
شوخی تو دیکھ تیر کو سینہ سے کھینچ کر — کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

نظر آتے ہیں پردے تری آنکھوں کے گلابی — کہیں مے پی ہے تونے یا اٹھا ہو نیم خوابی سے

وہاں روزن دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں — تا سینہ کے روزن کوئی کھلانے نہ پائے

شعرائے دیوان دوم

قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد — چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار ہوا
صبا جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ — تو کہیو ہنس کے میں صدقے ترے نثار ہوا

مرض عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا — تو میں وہ چار برس تک کہیں ٹل جاؤں گا
مجھکو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہے — اور ظالم یہی کہتا ہے کہ "کل جاؤں گا"

آ گیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھو — میں نے رومال سمجھ دیدۂ گریاں پہ رکھا

پردہ اٹھا کے اس نے جو سینہ دکھا دیا — میں چاک کر کے اپنا گریباں اڑا دیا

قصد کرتا ہوں جو اس در سے کہیں جانے کا — دل یہ کہتا ہے کہ "تو جا میں تو نہیں آنے کا"
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام — کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

جو خط بھیجوں تو خدا کو آگ پر رکھدے ہے وہ ظالم | جو قاصد جائے تو قاصد کے وہاں پر پڑے نکلتے ہیں

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپالے منہ کو | اپنا دیدار ہمیں روز جزا دکھلا کر
خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجکو | مصحفی میں اسے حال اپنا چلا دکھلا کر

از دیوان سوم

جو دیکھے ہے نقشے کو ترے وہ یہ کہے ہے :- | "سارا بدن انسان کا چہرہ ہے پری کا"

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا | چوری کی نظر سے وہیں پہچان گیا تھا
کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے | یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا
جانے کا نہ لے نام شب وصل ہے پیارے | سن بات مری میں ترے قربان گیا تھا

کب میں یاروں کے تئیں دیکھ پکارا نہ کیا | پر کسو نے مری تربت پہ گذارا نہ کیا

مہندی ہے کہ قہر ہے خدا کا | ہوتا ہے یہ رنگ کب حنا کا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے تیری | کم بخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

کاغذ کا ورق یہ پاسے صورت (قطعہ) نقاش اسے بنائے صورت
چہرے پہ نظر نہیں ٹھہرتی | اللہ رے تری صفائے صورت

بیٹھا ہے جو کوئی اثر بہت پر فن کے برابر | اس دوست کو ہم سمجھے ہیں دشمن کے برابر
کیا جانئے اس تیغ کو کیا سوجھے ہے اس دم | پھر جائے ہے آ آ کے جو گردن کے برابر

مصحفی کے تذکروں کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ:۔

مصحفی نے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا لکھا اور دو تذکرے اردو شعرا کے لکھے،

گارساں دتاسی نے "ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف" کے عنوان سے جو رسالہ لکھا ہے اس میں مصحفی اور مصحفی کے تذکروں کی نسبت یہ تحقیق کی ہے کہ:۔

"اٹھارویں صدی کا آخری تذکرہ مصحفی کا ہے یہ بھی فارسی میں ہے سنہ تالیف ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) میں نے اس مصنف کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب تاریخ ادب میں لکھا ہے، اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں ایک تو یہ کہ خان بہادر کی رائے کے بموجب جو انھوں نے میری کتاب کے تبصرے میں ظاہر فرمائی ہے ان کے نام کا تلفظ (بہ فتح میم) کرنا چاہیے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ لائے قرآن یعنی مصحف سے نسبت ہے۔

شیفتہ کا قول ہے کہ مولف دہلی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ہندوستانی اور فارسی میں اپنے عہد کا استاد تھا شیفتہ سے اُن کی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیفتہ نیز کریم الدین کا بیان ہے کہ مصحفی نے ریختہ کے چھ دیوان لکھے ہیں۔ بہر حال فرح بخش (لکھنؤ) کے دیوان میں مصحفی کے قلمی نسخے میں صرف چار دیوان ہیں اور یہ چاروں ہندوستانی زبان میں ہیں۔ مصحفی نے فارسی میں بھی کئی دیوان لکھے ہیں اور فارسی شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہے اس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی لکھنا شروع کیا تھا جو ناتمام رہ گیا ۳۱ [illegible] میں شاہ عالم تک کے عہد کے واقعات منظوم کئے ہیں۔

مصحفی نے اپنا اردو شعرا کا تذکرہ میر مستحسن خلیق کی فرمائش سے لکھا جس میں محمد شاہ کے عہد سے لے کر اپنے وقت تک کے شعرا کا حال درج ہے اور جن کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے مولف نے [illegible] ہم عصروں کے حالات بیان کرنے میں عالی ظرفی کا اظہار کیا ہے۔

مصحفی نے بڑی عمر پائی تھی کیونکہ اُن کی وفات "گلشن بے خار" کے چھپنے سے [illegible] سال قبل یعنی ۱۸۳۲ء کے قریب ہوئی، لیکن کریم الدین اُن کی وفات کا سال ۱۸۱۸ء بتاتے ہیں۔ ان کی شہرت اُس دور کے آخر میں ہونی شروع ہوئی جس میں سودا، جرأت اور انشا کا دور دورہ تھا وہ حاتم کے بھی ہم عصر رہے ہیں جیسا کہ حاتم کے دیوان زادہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ قائم جو دلی کے مشاعروں میں موجود تھا، ان کے بہت سے اشعار نقل کرتا ہے۔ سرور نے کوئی ۲۰ صفحوں میں ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔"

(رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۲ء)

مصحفی کے فارسی تذکرہ اور ایک اردو تذکرہ کے وجود کا تو پتہ نہایت آسانی کے ساتھ چل جاتا ہے۔
لیکن بعض لوگ جہاں دیوانوں کی تعداد سات بتاتے ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔
"مصحفی نے اردو شعرا کے دو تذکرے بھی لکھے"

بقول مولوی عبدالسلام ندوی کہ :۔
اس تذکرہ کے بعد اگر مصحفی نے شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ لکھا ہے تو ہم کو اس کا حال معلوم نہیں"
میرا خیال یہ ہے کہ تذکرہ زیر مضمون کے خاتمہ کی عبارت سے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یقین ہو گیا ہو کہ مصحفی نے ایک اور تذکرہ بھی لکھا ہے، خاتمہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے :۔

خاتمہ

"بر ضمیر منیر آئینہ نظر مبصران گوہر معنی مخفی و محتجب نماند کہ مولف ایں کتاب تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابن درویش محمد کہ بہ مصحفی شہرت دارد از تشتت حواس و پریشانی خاطر ناسازی زمانہ کجا فرصت آں داشت کہ تتبع احوال واشعار شعرا سابق و حال پرداختہ نقشۂ ایں جریدہ را بروئے کار آرد۔ اما اکنوں کہ بہ پیروی بخت سعید دستور پر نور مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ بار یافتہ ہمیشہ مورد گوناگوں مہربانی آں مہر سپہر خلافت و جہانداری می باشد فرصت را غنیمت شمردہ مخشوش ایں تذکرہ ہا کہ از چند سال بطاق نسیاں افتادہ بود صاف نمودہ و درست ساختہ۔ احوال اکثرے درو بشرح و بسط مسطور است۔ واحوال بعضے از متقدمین و ہم چنیں کما ینبغی آگاہی بعضے بہ اوقات آنہا حاصل نشدہ بطور بیاض سمت تحریر یافتہ"
خاتمہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ (۱۲۰۹) ہجری سے پہلے مصحفی نے اس تذکرہ کو لکھا تھا مگر اپنے گوناگوں مصائب کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہ کر سکے، مرشد زادہ سلیمان شکوہ کی سرکار میں جب آئے تو انھیں اتنی فرصت مل گئی کہ نظر ثانی کر کے تذکرہ کو صاف کر لیا، اور جن شعرا کے حالات و واقعات نہیں معلوم ہو سکے ان کے کلام کو ایک بیاض کے طور پر الگ لکھ ڈالا، اگرچہ تذکرہ کی انتہا بیاض سے ہی ہوتی ہے لیکن بیاض اور تذکرہ دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں، بیاض کو کبھی تذکرے کے نام سے یاد نہیں کر سکتے، مصحفی کا یہ دوسرا تذکرہ اردو خواہ بیاض ہی کیوں نہ ہو جب تک ہمدست نہ ہو سکے اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ان کا یہی ایک تذکرہ بہت قابل قدر ہے۔ گارساں دتاسی نے مصحفی کے اس تذکرہ کے شعرا کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس بیان کی ہے۔ میرے پیش نظر تذکرے میں ایک سو نواسی شعرا کی تعداد ملتی ہے، مصحفی نے خاتمہ سے پہلے

پانچ شاعر عورتوں کا بھی حال ایک تمہید کے ساتھ لکھا ہی اگر ان کو بھی شریک کر لیا جائے تو ۱۹۴ کی تعداد ہو جاتی ہی چنانچہ فہرست سے ظاہر ہوگا۔

فہرست شعرا

نمبر شمار	تخلص	نام
	ا	
۱	آفتاب	شاہ عالم بہادر شاہ
۲	آصف	نواب وزیر آصف الدولہ
۳	آبرو	شاہ مبارک
۴	اوباش	شیخ امیر الزماں
۵	الہام	شاہ ملول
۶	اثر	محمد میر
۷	الم	صاحب میر
۸	امیر	نواب محمد یار خاں
۹	امجد	مولوی امجد
۱۰	اسد	میر امانی
۱۱	احسن	مرزا حسن علی
۱۲	آشفتہ	مرزا رضا علی
۱۳	امین	امین الدین خاں
۱۴	افسوس	میر شیر علی
۱۵	احقر	مرزا جواد علی
۱۶	اکبر	عرف ہجو
۱۷	انشا	میر انشاء اللہ خاں

نمبر شمار	تخلص	نام
۱۸	اختر	میر اکبر علی
۱۹	آشفتہ	بھورے خاں
۲۰	افسر	غلام اشرف
	ب	
۲۱	بیدار	میر محمدی
۲۲	بیان	خواجہ احسن الدین خاں
۲۳	بیتاب	
۲۴	بیجان	عزیز خاں
۲۵	بیباک	میر نجف علی
۲۶	بقا	بقاء اللہ خاں
۲۷	برق	میاں شاہ وجہی
۲۸	پروانہ	پروانہ علی شاہ
۲۹	پروانہ	راجہ جسونت سنگھ
۳۰	بشر	میر بشارت علی
	ت	
۳۱	تاباں	میر عبدالحی

۳۲	تجلی	عرف میاں حاجی
۳۳	تنہا	شیخ محمد عیسیٰ
۳۴	تصور	سید احسان حسین
۳۵	تسکین	سید سیادت علی
۳۶	تسلی	لالہ ٹیکا رام

ث

۳۷	ثنا	میر شمس الدین
۳۸	ثاقب	میاں شہاب الدین

ج

۳۹	جوشش	محمد عابد
۴۰	جوش	رحیم اللہ
۴۱	جہاندار	شاہزادہ ولیعہد
۴۲	جرات	قلندر بخش
۴۳	جوان	بہادر علی شاہ
۴۴	جوان	مرزا نعیم بیگ

ح

۴۵	حسن	میر حسن
۴۶	حیراں	میر حیدر علی
۴۷	حسن	خواجہ حسن
۴۸	حسرت	جعفر علی
۴۹	حجام	عنایت اللہ
۵۰	حزیں	———
۵۱	حیرت	میر مراد علی
۵۲	حاتم	شیخ ظہور الدین
۵۳	حشمت	محتشم علی خاں
۵۴	حیف	میر چراغ علی
۵۵	حضور	لالہ بال مکند
۵۶	حکیم	محمد پناہ خاں
۵۷	حقیقت	میر شاہ حسین

خ

۵۸	خاکسار	میر محمد یار
۵۹	خلق	میر احسن
۶۰	خلیق	میر مستحسن

د

۶۱	درد	خواجہ میر درد

ذ

۶۲	ذوقی	شاہ ذوقی

ر

۶۳	رضا	مرزا احسن رضا
۶۴	رافت	مرزا قاسم علی
۶۵	رنگین	سعادت یار خاں
۶۶	رفاقت	مرزا لکھن
۶۷	رضا	میر رضا علی
۶۸	رند	نواب مہربان خاں
۶۹	رسوا	مہتاب رائے
۷۰	راغب	مرزا سبحان قلی بیگ

ز

۷۰	زار	میر جیون
۷۱	زار	میر مظہر علی
۷۲	زماں	سید محمد زماں

س

۷۳	سائل	مرزا محمد یار بیگ
۷۴	سوز	محمد میر
۷۵	سعادت	میر سعادت علی
۷۶	سکندر	.
۷۷	سوزاں	مرزا احمد علی خاں
۷۸	سرسبز	مرزا زین العابدین خاں
۷۹	سلیمان	مرزا سلیمان شکوہ
۸۰	سلیم	میر سلیم پٹنوی
۸۱	سودا	میرزا رفیع
۸۲	سبقت	مرزا مغل

ش

۸۳	شیدا	.
۸۴	شرف	شیخ شرف الدین
۸۵	شگفتہ	مرزا سیف علی
۸۶	.	مرزا ابراہیم
۸۷	شکوہ	محمد رضائی
۸۸	شائق	میاں پیر محمد
۸۹	شہید	.
۹۰	شہرت	.
۹۱	شوق	.

ص

۹۲	صفدری	-
۹۳	صابر	.
۹۴	صادق	میر صادق علی

ض

۹۵	ضیا	میر ضیاء الدین

ط

۹۶	طپش	محمد اسمعیل
۹۷	طالب	طالب حسین خاں

ع

۹۸	عارف	محمد عارف
۹۹	عظیم	مرزا عظیم بیگ
۱۰۰	عاقل	عاقل شاہ
۱۰۱	عیش	مرزا حسین رضا
۱۰۲	عشقی	مراد آبادی
۱۰۳	عظیم	.
۱۰۴	عشق	شاہ گھسیٹا

غ

۱۰۵	غضنفر	غضنفر علی خاں
۱۰۶	غیرت	.
۱۰۷	غلامی	شاہ غلام محمد

ف

۱۰۸	فراق	ثناء اللہ خاں
۱۰۹	فیض	میر فیض علی
۱۱۰	فغاں	اشرف علی خاں
۱۱۱	فدوی	محمد محسن
۱۱۲	فدوی	لاہوری
۱۱۳	فدوی	عظیم آبادی
۱۱۴	فدوی	مرزا عظیم بیگ سوداگر
۱۱۵	فدا	مرزا فدا حسین

ق

۱۱۶	قدرت	مولوی قدرت اللہ
۱۱۷	قدرت	مولوی قدرت اللہ
۱۱۸	قیس	احمد علی بیگ
۱۱۹	قدرت	شاہ قدرت اللہ
۱۲۰	قائم	قیام الدین علی
۱۲۱	قسمت	نواب شمس الدولہ
۱۲۲	قبول	
۱۲۳	قاصر	مرزا ابر علی بیگ

ک

۱۲۴	کاتب	مرزا محمد علی
۱۲۵	کمال	شاہ کمال الدین حسینی
۱۲۶	کبیر	تکیہ سید علی
۱۲۷	کلیم	محمد حسین

گ

۱۲۸	گوہری	بداونی
۱۲۹	گرم	مرزا حیدر علی

ل

۱۳۰	لطیف	میر شمس الدین
۱۳۱	لطف	مرزا علی لطف

م

۱۳۲	مجذوب	مرزا غلام حیدر
۱۳۳	مظہر	مرزا جان جاناں
۱۳۴	میر	میر محمد تقی
۱۳۵	محبت	نواب محبت خاں
۱۳۶	محنت	مرزا حسین علی
۱۳۷	مایل	مرزا محمد یار بیگ
۱۳۸	مشتاق	عنایت احمد
۱۳۹	مشتاق	
۱۴۰	مشتاق	عبداللہ خاں
۱۴۱	منشی	میر محمد حسین
۱۴۲	مقتول	مرزا ابراہیم
۱۴۳	مضطرب	لالہ دوارکا پرشاد
۱۴۴	مضطر	ابوالاکبر حسین
۱۴۵	مرہون	رضا علی
۱۴۶	ماہر	میاں فخر الدین
۱۴۷	معلوم	میر فرزند علی

۱۴۸	مخزوں	عالم شاہ پیرزادہ
۱۴۹	محبت	۔
۱۵۰	مست	۔
۱۵۱	مقصود	۔
۱۵۲	مایل	میاں محمدی
۱۵۳	مایل	۔
۱۵۴	منت	میر قمر الدین
۱۵۵	محب	شیخ ولی اللہ
۱۵۶	منتظر	میاں نور الاسلام
۱۵۷	ممنون	۔
۱۵۸	محترم	خواجہ محترم خاں
۱۵۹	مصدر	میر ماشاء اللہ
۱۶۰	مضمون	میاں شرف الدین
۱۶۱	مزمل	شاہ مزمل
۱۶۲	معین	میاں معین الدین
۱۶۳	محشر	مرزا علی نقی
۱۶۴	معروف	الٰہی بخش خاں
۱۶۵	مروت	صغیر علی
۱۶۶	مصحفی	شیخ غلام ہمدانی

ن

۱۶۷	نثار	میر عبد الرسول
۱۶۸	نثار	محمد امان
۱۶۹	ناجی	محمد شاکر
۱۷۰	نظام	نواب عماد الملک
۱۷۱	نعیم	نعیم اللہ
۱۷۲	ندیم	مرزا علی قلی
۱۷۳	نالاں	میاں عسکری
۱۷۴	نصیر	میاں نصیر
۱۷۵	نحیف	۔
۱۷۶	نوا	۔
۱۷۷	نادر	۔

و

۱۷۸	واقف	شاہ واقف
۱۷۹	وحشت	۔
۱۸۰	والا	مظہر علی خاں
۱۸۱	وہم	میر محمد علی

ہ

۱۸۲	ہادی	میر جوان
۱۸۳	ہاشم	میر ہاشم علی
۱۸۴	ہاتف	مرزا محمد ہاتف
۱۸۵	ہدایت	ہدایت خاں
۱۸۶	ہوش	میر شمس الدین

ی

۱۸۷	یقین	انعام اللہ خاں
۱۸۸	یکرنگ	مصطفیٰ خاں
۱۸۹	یکرو	میاں یکرو

۱۹۰	دولہن بیگم	۱۹۲	زوجہ عماد الملک
۱۹۱	جینا بیگم زوجہ جہاندار شاہ	۱۹۳	زینت نازک
		۱۹۴	مونی

مستورات

مصحفی نے اس تذکرہ سے تقریباً دس بارہ برس پہلے فارسی کا تذکرہ (عقد ثریا) لکھا ہی جس کا تذکرہ اس تذکرہ میں جابجا آگیا ہی عقد ثریا میں ایسے بائیس شاعروں کا ذکر ہی جنھوں نے اردو میں خاصی شہرت حاصل کی ہی۔ ان میں سے میر محمدی بیدار، رائے جس ونت سنگھ پروانہ، مرشدزادہ جہاں دار شاہ جہاندار، شیخ ظہور الدین حاتم، خواجہ میر درد۔ درد میر سوز۔ سوز۔ میرزا رفیع سودا، اشرف علی خاں فغاں۔ محمد قیام الدین علی قایم چاندپوری۔ میرزا جان جاں مظہر میر محمد تقی میر، میر قمر الدین منت، عماد الملک نظام کے حالات ابھی اس تذکرہ میں ملتے ہیں، یہ شعرا مصحفی کے فارسی اور اردو تذکروں کے گویا مشترک شاعر ہیں، ان دونوں تذکروں کے مشترکہ شعرا کے حالات بالمقابل مطالعہ کرنے سے مصحفی کے تالیفی زور و ضعف کا اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ہی مولف ایک ہی شاعر کی نسبت دس بارہ برس پہلے کیا رائے رکھتا تھا اور اس کے بعد ماحول سے متاثر ہو کر کس حد تک اپنی تالیفی قوت کو ایک حال پر رکھنے میں کامیاب ہوا ہے

اس کے لئے ترتیب نقل یہ ہوگی کہ شاعر کا حال پہلے تذکرہ سے نقل کیا جائے گا اور اس کے بعد تذکرہ اردو سے انتخاب کلام کے ساتھ۔ فارسی کی علامت (الف) اردو کی (ب) ہی:-

بیدار

(الف) بیدار، میر محمدی۔ از مشاہیر شعرائے ریختہ گو است۔ گاہ گاہے فکر شعر فارسی ہم کردہ و میکند از دست ... (شعر ہیں ۲)

(ب) ... نام دارد ... میر محمدی بیدار مشہور است شاگرد مرتضی قلی بیگ فراق تخلص ... حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ دارد ... برسر ... از ... دنیا ... مدتے ... سرائے استقامت دارد دیوان ریختہ اش مشہور ... فارسی ہم میکند چنانچہ اشعار فارسی خود را نیز ... غزل، رباعی و دو سہ قصیدہ ... چہرہ ... پشت سرورق دیوان خود نوشتہ ... نقل ساختہ ... اتفاقاً جناب مولوی فخر الدین ...

[illegible]

بسیار دانشمند بود هرگاه که از عشرت سرائے[۱] در مدرسہ غازی الدین خاں برائے دیدن آں بزرگ می آمد گاه گاہی با فقیر هم اتفاق ملاقات می افتاد و صحبت شعر بہ میاں می آمد حالا میگویند که از چندے در اکبرآباد. وطن افراست دیوانش از نظر فقیر گذشت انتخاب اوست سه

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

گر یہی زلف کا ہی کھٹکا ہے
غارت دیر و حرم کیجیے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز
کہیے کس آن کرم کیجیے گا؟

گزرے ہے شب شباب ہوا روز شیب آخر
کچھ بھی خبر ہے قافلہ آگے نکل گیا

قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرائے
منزل ہے دور خواب سے اٹھ، دن تو ڈھل گیا

ہو گیا گرتے ہی میری چشم سے دامن کے پار
اشک تھا بیدار یا یہ آگ کا پرکالہ تھا

حیف ہے ایسی زندگانی پر
کہ فدا ہو نہ یار جانی پر

حال سن سن کے ہنس دیا میرا
کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ہے بعد مرگ گور میں شور جنوں ہنوز
ہیں کشمکش میں دست و گریباں کفن ہنوز

مقدور کیا مجھے کہ کہوں واں کہ یاں کا ہے
ہر چشم و دل مگر اس کے جہاں چاہ [illegible] ہے

نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا
محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے

بیدار لطف کھینچے ادھر چشم یار اودھر
حیراں ہے دل کہاں نہ رہے پر کہاں رہے

کیا ہوئے گلشن میں آکر اے عزیزاں شاد ہم
رو رہے ہر گل کے گلے لگ یار کو کر یاد ہم

قتل تو کرتا ہے آخر کھول دے آنکھیں ٹک اک
دیکھ لیویں تیری صورت پھر کہ اے جلاد ہم

قاصد اس کا پیام کچھ بھی ہے
یا دعا یا سلام کچھ بھی ہے

تو جو بیداریاں پھرے ہے خراب
پاس ناموس و نام کچھ بھی ہے؟

جان تک تو نہیں ہے تجھ سے دریغ
لے میں قربان کیوں تو برہم ہے؟

اٹھ کے لوگوں سے کنارے آئے
کچھ ہمیں کہنا ہے پیارے آئیے

---

[۱] غالباً عرب سرائے ہوگا ۱۲

کچھ تو کی تاثیر نالے نے جو بارے — آئے تم مدت میں بارے آئیے
نصیحت سے بیدار کیا فائدہ — جو ہو آپ ہی اُس کو سمجھائیے

سلام بھی ہی زمانہ میں اور دعا بھی ہے — ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے
جس دن تم آ کے ہم سے ہم آغوش ہو گئے — شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

جی میں بیدار تیرے ملنے کے — آہ کیا کیا خیال رکھتا ہے

یوں مجھ پر جفا ہزار کیجو — پر غیر کو تو نہ پیار کیجو

کہاں ہے طالع بیدار یہ کہ ایسا ہو — کہ سر دھرے مری زانو پہ یار سوتا ہو

صورت اُس کی سما گئی جی میں — آہ کیا آن جا گئی جی میں
تو جو بیدار یوں ہوا تارک — ایسی کیا بات آ گئی جی میں

ان کہنے کو نہ جا چھوڑ کے اس وقت مجھے — بات رہ جائیگی اور دن تو گزر جاتے ہیں

تیری ہم خاطر نازک سے خطر کرتے ہیں — ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدار — دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں
آ دوست پوچھ کہ کس طرح کٹی شب تجھ بن — صبح کی رو رو گلے لگ در و دیوار کے ساتھ
آئینہ دیکھ تو اس منہ سے تجھے ہے طوطی — دعوی ہم سخنی اُس لب و گفتار کے ساتھ

اُس آئینہ رو کے ہو مقابل — معلوم نہیں کدھر گئے ہم
اُس پری صورت بلا انگیز کو دیکھا نہیں — ناصحو معذور ہو کر مجکو سمجھاتے ہو تم
حالت بیدار اب کیا کیجیے آگے بیاں — وقت ہے اب بھی اگر تشریف فرماتے ہو تم

پروانہ

الف - پروانہ - اسمش رائے جسونت سنگھ است و والدش راجہ بینی بہادر نائب مختار سرکار علیین مکانی وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر بودہ و حالا در آوان دولت وزیر اعظم دستور معظم نواب آصف الدولہ بہادر دام اقبالہ در کنج انزوا نشستہ بالجملہ رائے مذکور در عمر کمی اکثر کتب فارسی تحصیل نمودہ و دواوین تذکرہ اساتذہ فراہم آوردہ قدرت شعر گوئی و دقت طبع بدرجہ بلیغ بہم رسانیدہ گوے سبقت از ہمراہان خود ربودہ و برائے



[...]خیال بدیگرے فنون غریبہ مثل طب و رمل و سیر کتب تواریخ و نوشتن
[...] میدارد۔ اصلاح شعر فارسی از رائے سراپ سنگھ دیوانہ گرفتہ۔
چوں از چندے خیال شعر ہندی ہم دامن گیر حالش شدہ دریں فن تعین استادے ندارد
و بقوت فارسی ریختہ را بخوبی بسرانجام میرساند۔ بقصاید ہم دست انداز است و ازیں
جہت است کہ جوشش بہ شعرائے ریختہ بیا دارد۔ دیوان فارسیش قریب دو ہزار بیت
بر بیاض دیدہ شد زبانش عاشقانہ شستہ و رفتہ است۔ از انتخاب اوست۔ (بہت سے
شعر نقل کیے ہیں)

ب۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ تخلص عرف کاکاجی پسر راجہ بینی بہادر کہ رکن رکین نواب شجاع الدولہ مرحوم
بود جوان خلیق و ذی شعور است۔ پیش ازیں شعر فارسی میگفت و از نظر رائے سرپ سنگھ دیوانہ میگذرانید۔ اینچہ
اشعار فارسیش پیش فقیر در شاہ جہاں آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند در ہماں ایام داخل تذکرہ شدند امادر
روزہائے کہ مولف از شاہ جہاں آباد بہ لکھنؤ رسید چوں غائبانہ ہمیشہ اشتیاق ملاقات می داشت خبر آمدن ایں خاکسار
شنیدہ بسیار بہ دلگرمی و تپاک پیش آمدہ و از ہماں ایام عطف عنان فکر شعر فارسی بہ طرف ریختہ کردہ خود را شب
روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا انیدم کہ عرصہ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا و پختہ گردیدہ
در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صد معنی ہائے تازہ بیت میگمارد و پیش از آمدن فقیر
کہ ہنوز آنہا از شوق او بود اعتقاد بہ ہمہ ساندہ مثل میر تقی و میر حسن و میاں ثناء اللہ وغیرہ داشت اکنوں از
تہ دل بہ فقیر رجوع کلی دارد و درستی اشعار درستش موقوف مشورہ ایں ہیچمداں باعتقاد افتادہ ایں ہم خوبی اوست
والا شاعریش از ہیچ صاحب طبیعتی کم نیست از دست۔ شعر

کھا تیغ نگہ جب تری گھایل کو غش آیا
گویا وہ دم نزع میں بسمل کو غش آیا

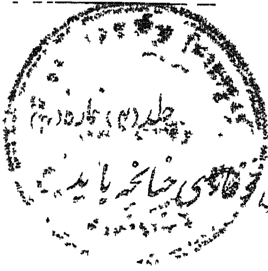
کرنے کو گیا قتل پہ خوں بہتے جو دیکھا
ٹھیرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غم خواری کرے
بے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے

دیکھتے ہی اس کو چہرہ پر بحالی آگئی
زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آگئی

جہاں دار

الف۔ جہاندار۔ مرشدزادہ جہاندار شاہ کہ جہاندار تخلص میفرماید از بسکہ در جمیع فنون یگانہ



روزگار و وحید زمان است بمقتضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی گاہی چنانچہ باید نمی کند از دست۔

ب۔ جہاندار تخلص شاہزادہ ولی عہد خورشید رکاب صاحب خطاب کہ از بس علو ہمت و سمو منزلت مرتبہ عالی جاہی خود را باوج افلاک رسانیدہ و دست در پاش ہنگامہ ابر نیساں را سر در ساختہ با وصف استغنائی مزاج کہ خاصہ با شانات خود را پے کسب علم و ہنر نیز مصروف داشتہ و کمالات بسیار در ذات بابرکاتش جمع آمدہ مہذا بمقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے خیال شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید از دست شعر

قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے — وضع نالہ کی مرے اس سے اڑائی نہ گئی

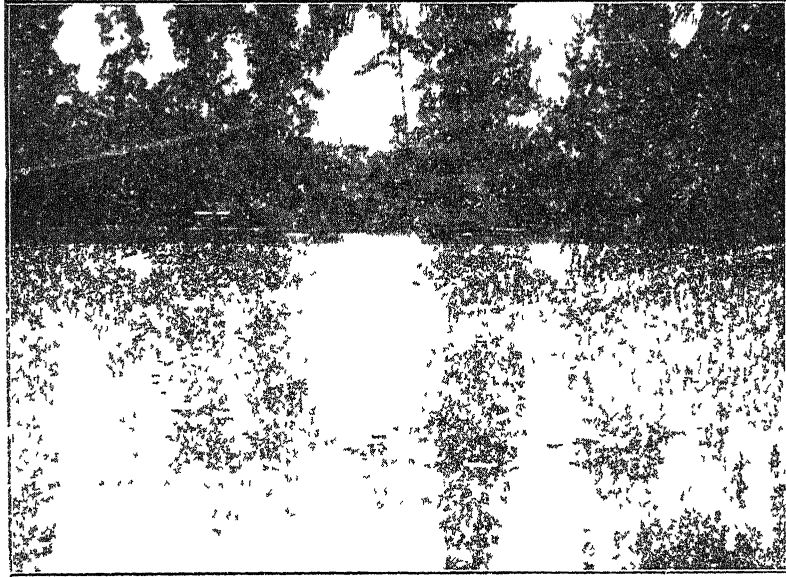
کہاں طالع جو پہنچیں اس کے در تک — رہے دوری سے ہم اس کو نگر تک

رسائی میرے نالہ اور دعا نے — کہاں پائی اجابت اور اثر تک

بجھاؤں شمع ساں کیا اب جہاندار — شرار عشق تو پہنچا جگر تک

ہر کس کے انتظار میں یہ بے اجل گیا — آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

(باقی)



باغ عام کا ایک خوشنما منظر

فرہادِ ثانی

ایک دردناک افسانہ

(طبع زاد جناب سید شبیر حسین قیس، متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

"فردوسِ ہند" کشمیر کی آبادی سے تقریباً دو فرلانگ پر ایک پر فضا مرغزار میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس کے اطراف مہندی کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ سامنے ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ اس کے گرد چند سبز پوش پہاڑیاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ایک حصار کھینچ دیا ہے۔ جو اس دلفریب منظر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہا ہے۔

شام کا وقت ہے سورج روپوش ہو چکا۔ کہیں کہیں سے تارے سیاہ ابروں میں سے چمک رہے ہیں ظلمتِ شب ترقی کر رہی ہے۔ معمول کے خلاف آج اس جھونپڑی میں اداسی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن بھی نظر نہیں پڑتے۔ آج بوڑھا جس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ چہرہ اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ عالمِ شباب میں وہ جوان رعنا ہوگا۔ ایک چھوٹا لڑکا جس کی عمر ۱۲ سال کی ہوگی بازو بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ وہ بار بار مریض کے منہ پر منہ ملتا ہے اور درد انگیز آواز میں کہتا ہے "پیارے ابا بات تو کیجئے"۔ لڑکے کے گریہ سے باپ چونک جاتا ہے اور تسلی دیتا ہے۔ اور اپنی مایوس نظریں دروازہ پر ڈال کر پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے لیکن افسوس اس موقع جانکاہ پر نہ کوئی پرسانِ حال اور نہ تعزیت دار۔

آٹھ بجے کا وقت تھا۔ مریض نے اپنی نحیف آنکھیں کھولیں۔ اس کی پتلیاں حلقۂ چشم میں گردش کرنے لگیں۔ اس نے خورشید کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بیٹا مت رو اللہ نگہبان ہے۔ جس کے تم گیت گایا کرتے ہو۔ لیکن افسوس — افسوس! آج زمیندار صاحب بھی نہیں آئے جن سے

میں کچھ کہہ لیتا . . . . . وہ شاید کسی کی چاپ نے اس کا قطع کلام کیا۔ اس نے گردن بلند کی۔ خورشید کی آنکھیں دروازہ پر جھک گئیں۔ بوڑھا کسان چلا اٹھا "میرے آقا" اور نقاہت سے اس کی گردن پھر تکیے سے جا لگی۔

اس نے زمیندار صاحب سے التجا کی کہ وہ خورشید کو اپنے سایۂ عاطفت میں رکھیں۔

زمیندار صاحب نے دلاسا اور اطمینان دلایا۔ بوڑھے کسان نے ہچکی لی۔ خورشید پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ دو گرم آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں میں آئے۔ اور اس نے آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

خورشید کا واویلا جھونپڑی کو ماتم کدہ بنا رہا تھا۔

دوسرے روز زمیندار صاحب تجہیز و تکفین کے بعد خورشید کو گھر لے آئے۔ اور اس کے لئے ہر چیز کا انتظام کر دیا۔

خورشید نوروز کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ نہایت تیز فہم اور پھرتیلا تھا۔ اس کی آنکھیں گول و سیاہ تھیں۔ رنگ گورا تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ لڑکا تھا۔ وہ ایک خوش الحان مغنی تھا۔ اس کی آواز میں ایک خاص درد تھا۔ وہ اکثر اپنے باپ کے سکھائے ہوئے گیت گاتا تھا۔ جس کو زمیندار بہت شوق سے سنا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ایک اچھا مغنی تھا۔ اس کی نغمہ سرائی میں عجیب کیفیت تھی — ایک وجدانیت۔

زمیندار نعیم خاں کو نوروز اور خورشید سے بہت محبت تھی۔ اور ہمیشہ ان کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک متقی اور باعزت شخص اور ایک بڑے زمیندار تھے۔

(۲)

خورشید کو ایک دوسری فضا میں داخل ہو چکا تھا۔ اور اس کو ہر قسم کا آرام مل رہا تھا۔ مگر باپ کا صدمہ رہ رہ کر ستاتا تھا۔ لیکن وہ بچہ تھا اس لئے وہ بہت جلد کھیلنے کودنے لگا۔ اس کا حسن اور بشاشت عود کر آئی۔ اور خورشید پھر وہی خورشید تھا۔

نعیم خاں نے اس کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے شروع کروا دی جو ان کی لڑکی مہ لقا کو پڑھایا کرتے تھے۔

مہ لقا نعیم خاں کی چہیتی لڑکی تھی۔ اس نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ وہ ایک حسین بچی تھی۔ اس کے بال جزر و مد کی طرح تھے۔ اس کی آنکھیں میخانۂ فطرت کے جام تھے۔ جو ہمیشہ مستانہ و مخمور رہتیں۔ اس کے ننھے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سرخ تھے۔ "وہ حسن کا حسین ترین نمونہ ہو گی۔

ف! اس کی کافر جوانی کس بلا کی ہوگی"۔ یہ تھے خیالات جو ہر شخص اس کو دیکھ کر قایم کرتا تھا۔ وہ ایک دوشیزہ تھی
رِ یا ناز۔ لعبتِ حسن تھی قابلِ الفت۔

مکان کے اندرونی حصہ میں ایک خوبصورت سا باغ لگا ہے۔ جس میں خورشید اور مہ لقا کھیلا
ا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حسن کی جیتی جاگتی مورتیں اچھل کود رہی ہیں۔

چھ سال اسی طرح گزر گئے ——

عالمِ طفلی گزر چکا۔ اب دونوں شباب کی مستیوں میں چور ہیں۔ اُن کے پیمانۂ دل محبت سے لبریز
ہیں۔ اُن کی آنکھیں الفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

(۳)

ایک روز خورشید شام کے وقت اپنے الگ کمرہ میں بیٹھا ایک رسالہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے
پہلے ورق کی سُرخی "افسانۂ محبت" دیکھی جو ایک مشہور افسانہ نگار کے قلم کا نتیجہ تھا۔ اس کی
میں لفظ محبت سے چمکنے لگیں۔ جب وہ اس حصہ مضمون پر پہونچا تو اس نے آنکھیں جما دیں ——

"اے محبت تو ایک پھول ہے جس کی خوشبوئے نشاط تمام جہان اور تمام قلوب کو مہکا رہی ہے۔
ہماری حیاتِ مستعار کو فرحت دینے والی شئے ہے۔ آہ تو ایک جذبہ ہے۔ بے پایان۔ کیف آور
ح پرور۔ تو ایک شمع ہے اور تیرے کئی پروانے۔ اے محبت تیری دنیا مختلف۔ تیری ادا نرالی۔ تیرے
نام لیوا جدا — اُن کے خیال اور — اُن کے رموز علیحدہ۔

لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، قیس و لبنیٰ غرض کئی تیرے شکار ہوئے۔ تو نے انہیں دربدر پھرایا
خستہ حال و بدنام کیا۔ تو نے انہیں دیوانہ بنایا ایک کو نجد کی گرم ریت میں تڑپایا اور مارا مارا پھرایا۔ دوسرے
کو تیشہ کا نشانہ بنایا۔ لیکن انہوں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا۔ اور مرتے دم تک تیرا ہی اے محبت دم
بھرتے رہے۔ اُن کا انجام حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں۔

اے محبت! اے قدرتی جذبے! اے مسرت زا لمعہ تو کس قدر ایک سہمی بلی کی طرح چپکے چپکے ان
معصوم ہستیوں کے قلوب میں جلوہ گر ہو جاتی ہے ——" یہاں پر خورشید رکا اس نے اپنی حالت پر
قابو لیا۔ اس کے جذبات اسے دریائے محبت میں ڈھکیل رہے تھے اس نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"اے محبت حیف تو تدریجی صورت میں معصوم دلوں میں بڑھتی ہے۔ تو انہیں رسوا کراتی ہے۔

عالمِ جوانی میں تو عشق کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو کبھی خوشی کے آنسو رُلاتی ہے۔ اور کبھی خون کے۔ تیرا دنیائے اسٹیج کمیڈی اور ٹریجڈی ہی کے دو ڈرامے پیش کرتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں ــــ اور وہ کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا ــــ دو منٹ گزر گئے۔ ہنوز اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کی پتلیاں اندر ہی اندر متحرک تھیں۔ اُس کے ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔ اُس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے منہ سے یک لخت نکلا "پیاری مہ لقا ــــ" وہ کچھ اور کہنے والا تھا۔ مگر وہ کہہ نہ سکتا تھا۔ اُس کی زبان رُک گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں۔ اُس کا چہرہ فق اور ساکت تھا۔ کیونکہ اس کے سامنے مہ لقا محبت بھری نگاہوں سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر ہلکی سی مسرت کی سرخی تھی۔ اُس کا انداز قابلِ پرستش تھا۔ دونوں کی نگاہیں محبت کی بہترین ترجمان بنی ہوئی تھیں۔ خورشید کے مرتعش ہاتھوں سے رسالہ نیچے گر پڑا۔ مہ لقا نیچے جھکی۔ اُس نے رسالہ اُٹھایا اور خورشید کی جانب بڑھا کر کہا۔ "بھیا میں ناحق دخل انداز ہوئی۔ آپ ــــ آپ پڑھیے میں جاتی ہوں" یہ کہکر وہ پلٹی۔ خورشید نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہ لقا اُس کی طرف مڑی۔ اور اُس نے دیکھا کہ خورشید گردن نیچی کیے کسی تذبذب میں ہے۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ اُس نے نہایت بیتابی سے مہ لقا کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ مہ لقا نے اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ وہ شرم سے سرنگوں تھی۔ اس کا دل اچھل رہا تھا خورشید نے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ مہ لقا نے اپنے ایک انداز میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ جس کو خورشید ہی کے دل نے خوب سمجھ لیا۔ اُس کی شرمگیں نگاہیں محبت پاشی کر رہی تھیں اور اُس کے ہونٹ خفیف سی مسکراہٹ سے جنبش کر رہے تھے۔ انہوں نے پُر محبت نظروں سے ایک دوسرے کو پیامِ محبت دیا۔ خورشید خوشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مہ لقا ــــ" مہ لقا نے ایک شوخ ادا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور وہ چوکھٹ تک تیزی سے چلی گئی۔ وہ چوکھٹ پر رُکی۔ اُس نے گردن پھیر کر خورشید کو دیکھا۔ وہ ہنسی۔ مگر یہ ہنسی زمانہ طفلی کی ہنسی سے جداگانہ تھی۔ اس ہنسی سے محبت کے پھول جھڑ رہے تھے خورشید دونوں ہاتھ پھیلائے اُس کی طرف بڑھا۔ مہ لقا نے اب کھڑا رہنا مناسب نہ سمجھا اور ہرنی کی طرح کلیلیں مارتی صحن میں بھاگ گئی۔ اور خورشید پر اس کے اس انداز نے ایک بجلی گرا دی اور وہ دروازہ سے چمٹا مہ لقا کو دور ہی سے دیکھتا کھڑا رہا۔

(۴)

دوسرے روز نعیم خاں اپنے کاروبار پر لاہور جانے والے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب کو تاکید کردی کہ خورشید کا خیال رکھیں اور اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور گھر پر اپنے چچیرے بھائی شاہد کو چھوڑ گئے۔

شاہد ایک سخت اور حاسد شخص تھا۔ اور اس کے یہ ضمیر میں تھا کہ کسی نہ کسی کو برباد کردے۔ جب سے کہ خورشید سن بلوغت پر پہنچا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں سہ لقا اس سے نہ بیاہی جائے وہ چاہتا تھا کہ اپنے لڑکے حامد سے جو کسی طرح سہ لقا کے قابل نہ تھا سہ لقا کی شادی ہو۔ نعیم خاں کی خورشید پر روز افزوں محبت اور عنایت جیسا کہ ان پر حق تھا اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ خورشید اپنی آئندہ زندگی اس گھر میں گزارے اس کے علاوہ وہ اُن کی نگاہوں سے تاڑ گیا تھا کہ اُن میں محبت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اکثر حامد کو نعیم کے پاس بھیجا کرتا تاکہ سہ لقا اور نعیم اس کو چاہنے لگیں۔ مگر سہ لقا دور ہی سے اُسے آتا دیکھ کر چیں بجبیں ہوجاتی اور کسی کام میں مشغول ہوجاتی۔ وہ حامد سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی کیونکہ وہ اول تو صورت کا اچھا نہیں تھا اور دوسرے اُس کے ڈھنگ بھی ناگوار تھے۔

خورشید نے اُردو فارسی میں کئی کتابیں ختم کرلی تھیں اور نعیم کا ارادہ تھا کہ خورشید کو بہت جلد اسکول میں داخل کرادینا چاہیئے۔ وہ ایک لڑکا تھا اور مولوی صاحب اُسے محبت سے پڑھاتے تھے۔ سہ لقا بھی ذہین تھی۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ تین چار روز سے اُن کو سبق اچھی طرح یاد نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ سخت اور تند مزاج تھے اس لئے انہوں نے خورشید کو تنبیہ کی۔ اور سہ لقا کو سمجھایا۔ مگر خورشید اب محبت کا پتلا بن گیا تھا۔ جب کبھی کتاب لیکر بیٹھتا تو فوراً سہ لقا کا خیال دماغ میں بندھ جاتا۔ اس لئے وہ سبق یاد نہ کرسکتا تھا۔ وہ بولنا کچھ چاہتا تھا لیکن اُس کی زبان سے کچھ اور نکلتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ملکۂ حسن سامنے رہتی تھی مولوی صاحب نے ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر اُسے دو تین چھڑیاں رسید کیں۔ خورشید جس نے کبھی اب تک مار نہ کھائی تھی اپنی موجودہ غیر معمولی تبدیلی پر رونے لگا۔ سہ لقا کے بھی آنسو نکل آئے اور وہ پانی پینے کے بہانے سے اُٹھ کر چلی گئی۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد شام کے وقت دونوں باغ میں ملے۔ دونوں اُداس تھے مگر یہ صرف تھوڑی دیر تک حالت رہی۔ سہ لقا نے خاموشی کو توڑا اور کہا "بھیّا اب یہ وقت تفریح کا ہے نہ کہ رنج کا"۔ اور اُس نے خورشید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ کھڑی ہوگئی۔ خورشید نہایت خوشی سے اُٹھا اور دونوں باغ میں ایک طرف ٹہلنے لگے۔

خورشید کو مہ لقا سے محبت تھی۔ مگر وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کون جذبہ چٹکیاں لے رہا ہے۔ کونسی شمع حسن ہے جو اس کے دل میں روشن ہے۔ وہ کونسی بوئے نشاط ہے جو اس کے دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ وہ کونسا منظر کا خیال ہمیشہ جو اس کے دل میں سوچیں مار رہا ہے۔ اس ہی لئے وہ جذبات کو مہ لقا پر افشا نہ کر سکا۔ لیکن [illegible] راز محبت کو جو اس کے دل و دماغ میں گدگدی کر رہا تھا۔

[illegible] خاموش ٹہل رہے تھے۔ مہ لقا بار بار اس کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر خورشید اس کے [illegible] متاثر تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ کس طرح اپنی محبت کو ظاہر کرے۔ وہ گہری سوچ میں پڑا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ عشق معشوق کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے۔ سچ ہے۔ عورت صبر و حیا کی دیوی ہر دور [illegible] کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ اس میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی محبت ایک پتھر کی [illegible] ہے۔ وہ اس راز کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اور جب یہ بار اس سے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے جذبات اپنے حسیات عریاں کر دیتی ہے۔ چاہے اسے معلوم ہو کہ اس کا انجام برا ہے۔ اس وقت اس کا دل قابو میں نہیں رہتا۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں کہتی کہ وہ کیا بک رہی ہے۔ جب وہ دل کھول کر کہہ ڈالتی ہے تو تب اس کے دل میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

مہ لقا کو خورشید سے کبھی کی محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ کسی موقع کی متلاشی تھی کہ اپنے راز محبت کو اس پر ظاہر کرے۔ اس نے بارہا خورشید کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ مگر خورشید جواب دینے سے قاصر رہا۔ لیکن اب خورشید اس کا پرستار بن چکا تھا۔ اور مہ لقا نے جب سے اس کی زبان سے "پیاری مہ لقا" سنا اسے معلوم ہو گیا کہ خورشید کو اس سے محبت ہو چلی ہے۔ مہ لقا اب اپنے جذبات کو روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے جذبات سیل بے پناہ کی طرح امنڈ رہے تھے۔ یہ اس کے لئے بہترین موقع تھا۔

وہ چلتے چلتے رکی اس جگہ جھاڑوں کا بہت جھنڈ تھا۔ اور شام کی ہلکی سی تاریکی سے اور اندھیرا ہو گیا تھا۔ خورشید بھی تھم گیا اور اس نے مہ لقا کی طرف دیکھا۔ اور مہ لقا نے اپنی نشیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ خورشید کا ایک ہاتھ مہ لقا کے مونڈھے پر تھا۔ اس کا دل اور مضبوط ہو گیا۔ "بہتا میں کئی دن سے چاہتی تھی کہ آپ سے اپنا راز دل کہوں۔ مگر ــــ مگر کوئی موقع نہیں ملا کہ بیان کرتی۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ خورشید آگے سننے کے لئے بیتاب تھا۔ وہ مہ لقا کے بالکل قریب ہوتا گیا۔ "آہ مجھے ...... آپ ... آپ سے محبت ہے۔" مہ لقا نے رکتے رکتے کہا اور وہ تڑپ کر خورشید کے

سینہ سے لگ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے حائل تھے۔ اس کی پیشانی پر چند پسینہ کے قطرے نمودار ہوگئے تھے اس کا سر خورشید کے سینہ پر تھا، زلفیں بکھری ہوئیں تھیں۔ اور آنکھیں بند۔ خورشید نے محسوس کیا کہ مہ لقا کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ اس کے سر پر رکھ دیا اس نے کہا "پیاری مہ لقا — میری شہزادی میں ایک غریب خاندان کا لڑکا اس قابل نہ تھا کہ تم محبت کرتیں۔ میں اس قابل ہوں کہ تیری راہ محبت میں اپنے کو مٹا دوں۔ خود کو قربان کردوں۔ تری شمع حسن پر جل مروں۔ میرے بدن کا رونگٹا رونگٹا تیری محبت کا گیت گاتا رہے گا۔ میں تیرا ہوں — بلکہ تیرا غلام۔ میں ہمیشہ تجھ سے محبت کروں گا۔ چاہے اس راہ میں کتنے ہی آفات کتنے ہی روڑے کیوں نہ ہوں" اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ برابر بولتا جارہا تھا۔ اس پر ایک کیفیت طاری تھی۔ معاً مہ لقا چونکی۔ اس نے درختوں میں سرسراہٹ کی آواز سنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "آہ! خورشید" اس نے چلایا۔ خورشید نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ شاہد سامنے کھڑا غضب آلود نگاہوں سے خورشید کو دیکھ رہا تھا۔ خورشید ہکا بکا ہو کر بھاگا۔ ہریالی پر پھسلا اور وہ زور سے زمین پر گر پڑا۔ اور اسے ہوش نہ تھا۔ مہ لقا دوسری روش سے اپنے کمرہ میں بھاگ گئی۔ اس نے دروازہ بند کرلیا۔ وہ شرم اور رسوائی سے پانی پانی ہو رہی تھی وہ روتے روتے نیم بیہوش ہوگئی۔

شاہد نے مہ لقا کی والدہ سے سب حال کہہ سنایا۔ اور وہ غصہ سے سرخ گئی۔ دونوں نے خورشید کو مکان سے باہر کردینے کا تہیہ کرلیا۔

(۵)

دوسرے دن صبح کو خورشید جب آنکھ کھلی تو اپنے کو اپنی پرانی جھونپڑی میں پڑا پایا۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ "مہ لقا — پیاری مہ لقا" اس نے چلایا۔ اس نے اپنے گرد دیکھا۔ اسے سناٹا سا ہوگیا۔ وہ وحشی کی طرح اپنے بال نوچ رہا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ شدت غم سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جس میں کہ وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جس جگہ اس نے اوائل زندگی مسرت و شادمانی سے گزاری تھی جس کی موجودگی باعث زینت تھی۔ آہ اب وہ خستہ حال بے یار و مددگار پڑا تھا۔ جھونپڑی کا ہر بوسیدہ حصہ ایک مہیب صورت اختیار کیا ہوا تھا۔ جس میں چڑیوں اور کوّں نے آشیانہ بنا رکھا تھا۔ خورشید کی حالت ناگفتہ تھی۔ وہ کبھی ہنستا ایک دیوانے کی طرح روتا ایک مظلوم کی طرح۔ وہ مظلوم جو محبت کے ہاتھوں تباہ ہوا ہو۔

اُس کے بال خاک آلود تھے۔

وہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس نے اب نعیم خاں کے مکان جانا باعثِ ذلت سمجھا۔ وہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بھوکا پیاسا چلا جا رہا تھا۔ راستہ چلنے والے اُس کو نہایت غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ مگر وہ گردن نیچی کیے چلا جا رہا۔ وہ تھک گیا۔ اُس کی جیب میں چند پیسے پڑے تھے۔ جن سے اُس نے اپنا پیٹ بھرا۔ اتفاقاً اُس کا گزر تھیٹر کی طرف ہوا۔ جہاں لوگ اُس دن کے پروگرام بورڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اُس نے مناسب سمجھا کہ وہ تھیٹر میں نوکر ہو جائے۔ وہ مجبور تھا کیونکہ دنیا میں اب اُس کا کوئی مددگار نہ تھا۔

دوسرے روز وہ تھیٹر میں نوکر ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد نعیم خاں لاہور سے واپس آ گئے۔ شاہد نے خورشید کے بابت تمام کہہ سنایا اور اس قدر بیچارے پر الزامات لگائے کہ نعیم اُس کی باتوں میں آ گئے۔ مگر وہ نہایت رحم دل تھے۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ خورشید کو اُس کی جھونپڑی میں دیکھ آئیں۔ کیونکہ انہیں اس سے ہمدردی اور محبت تھی۔

شام کو وہ جھونپڑی میں گئے۔ لیکن وہاں خورشید نہ تھا۔ جھونپڑی اُداس اور خالی تھی۔ نعیم کا دل پگھل گیا۔ انہیں خورشید کی دربدری کا خیال آیا اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ اور گھر واپس آئے۔

رعنا اب وہ رعنا نہیں رہی۔ وہ صورت دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ شرم کے مارے اپنے کمرہ ہی میں رہتی مگر خورشید کے لئے ہمیشہ تڑپتی۔ وہ دبلی ہو گئی تھی۔ اور کھانا پینا بھی کم ہو گیا تھا۔ والدین نے مناسب سمجھا کہ اس کی جلد شادی کر دی جائے۔ لہٰذا چند ماہ کے بعد اس کی زندگی اسی سے وابستہ کی گئی جس سے وہ بھاگتی تھی۔ جس کی صورت سے وہ بیزار تھی۔ جس دن سے اس نے سنا کہ اُس کی شادی حامد سے ہونے والی ہے وہ زار و قطار روتی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ عورتیں سمجھاتی ہیں مگر اس دُکھیا کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ روتی رہے۔ بلکہ مرتے دم تک کسی کی جوگن بنی رہے۔ لوگ سمجھتے کہ اُس کا رونا تھوڑے عرصہ کے لیے ہے جیسا کہ بیاہی لڑکیاں رویا کرتی ہیں۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ اُس کے آنسو اُس کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ اُس کی آہیں جلتے ہوئے قلب کے شعلے ہیں جو زندگی بھر جلتے رہیں گے اور اُس کا رونا اُس کی حسرتناک موت کے وقت سب کو خون کے آنسو رولائیگا۔ یہ شادی نہیں تھی کسی کی بربادی تھی کسی کے موت کا پیش خیمہ۔

حامد اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہ سماتا تھا۔ اور اُس نے بیشک رعنا کے آرام و آسائش کے لئے تمام چیزیں جو کچھ فراہم کر سکتا تھا فراہم کیں مگر رعنا ان سب سے بے اعتنا تھی۔ اس کا دل خورشید کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے

اس کے دن خورشید کی یاد میں اس کی راتیں ـــ بھیانک راتیں آہوں میں کٹتی تھیں۔ اس کی زبان پر "خورشید ۔ خورشید" تھا اس کے دماغ میں اسکی محبت بسی ہوئی تھی اس کا چاند سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ سسرال والوں میں سے کبھی نے اس کے بالوں میں تیل ڈالا تو ڈالا ورنہ وہ اپنی زیبائش سے بالکل لاپرواہ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ مسکراتی تک نہ تھی۔

سسرال والے کہا کرتے "عجیب منحوس لڑکی ہے کہ ہمیشہ روتی ہی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ کچھ کام کرتی ہے۔ مہ لقا طعنے سنتی رہتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ سرنگوں ہو کر آنکھوں پر ہاتھ لگا لیتی ہے۔ موت کو پکارتی ہے مگر موت نہیں آتی۔ چند دن بعد اس نے خود کو سنبھالا اور گھر کا دھندا کرنے لگی۔

(۶)

خورشید نے تھیٹر میں شریک ہوتے ہی اپنا نام فدا حسین سے بدل دیا۔ اس کی قدرتی آواز اور خداداد حسن نے اس کو بہت جلد لوگوں کی نظروں میں کھپا دیا اور وہ مشہور ہو گیا۔ وہ اکثر غمگین پارٹ لیتا اور اس خوبی سے ادا کرتا تھا کہ بہت سے لوگ رو دیتے۔ اس کی ایکٹنگ نہایت خوبصورت تھی۔

غزالہ ایک سترہ سالہ حسین ایکٹرس تھی۔ وہی تھیٹر کی جان تھی اور لوگ اس ہی کی وجہ سے زیادہ آیا کرتے تھے۔ وہ کشمیری حسن کا بہترین نمونہ تھی۔ جب سے اس نے خورشید کو دیکھا تھا اس وقت سے وہ اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ اسے حسن کا فرشتہ سمجھتی تھی۔ غزالہ چاہتی تھی کہ کسی طرح خورشید کو اپنے دام الفت میں پھانسے۔ مگر خورشید اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ اس کی نظروں میں اب تک مہ لقا تھی وہ مہ لقا کی محبت کو غزالہ کی محبت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ شام کے چار بجے ہوں گے اس دن کے ڈرامہ کا ریہرسل ختم ہو چکا۔ غزالہ ایک ریشمی ساڑھی میں ملبوس خورشید کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ خورشید کرسی پر گردن جھکائے کسی خیال میں غرق تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج خورشید پر اپنی محبت جتلائے گی۔ مگر خورشید کو اس کی چاپ تک نہ سنائی دی۔ وہ عالم طفلی کے تصور میں محو تھا۔ مہ لقا کی پیاری صورت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کا خیالی مجسمہ اس کی نظروں میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ واقعی مہ لقا سامنے ہے۔ "مہ لقا" وہ فرط خوشی سے چلایا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے غزالہ کو دیکھا۔ بلکہ غور سے دیکھا۔ غزالہ ساکت تھی۔ خورشید نے زور دیکر پوچھا۔

"غزالہ یہاں کیسی کھڑی ہو"

"بھیک مانگنے" اس نے تمنا بھری نظریں ڈال کر جواب دیا۔

"کاہے کی"

"محبت کی" اس کے ہاتھ ملے ہوئے تھے۔ گویا التجا کر رہے تھے۔

"کس سے؟" اُس نے ذرا برانگیختہ ہوکر سوال کیا۔

"آپ سے"۔ اور وہ نیچے دو زانو ہوکر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے۔ غزالہ یہ ناممکن ہے۔ غزالہ تم میرے پیچھے نہ پڑو۔ آہ میرے دل میں کسی اور کی محبت کے شعلے ہیں۔ یہ شعلے کسی طرح بجھ نہیں سکتے۔ جب میں مروں گا تو یہ شعلے میری خرمنِ ہستی کو آگ لگا دیں گے"۔

غزالہ خورشید کی نظروں میں زہریلی ناگن معلوم ہو رہی تھی۔ غزالہ نے چاہا کہ خورشید کے گلے میں باہیں ڈالے مگر خورشید نے ایک جھڑکی دیکر اُسے ہٹا دیا۔ اُسے غصہ آگیا اور اُس نے فوراً باہر چلے جانے کو کہا۔ غزالہ کا دل کینہ اور بغض سے لبریز ہوگیا۔ وہ کمرہ کے باہر چلی گئی۔

اُس نے سوچا چونکہ خورشید مہ لقا کا دیوانہ ہے اس لئے اُس کے متعلق ؟ کی بات سُننے کا یقین کریگا اُس نے خورشید کو برباد کرنے کی ٹھان لی۔ اور وہ واقعی میں زہریلی ناگن ثابت ہو رہی تھی اُس نے ایک چھوکرے کو الگ بلاکر کچھ کان میں کہا اور ایک روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ لڑکے نے سر ہلایا اور وہ چلا گیا۔

(۷)

تھیٹر کے پروگرام بورڈ کے پاس ایک جم غفیر ہے۔ لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ بورڈ پر "شیریں فرہاد" جلی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ سب اس کھیل کو دیکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اور خوش ہو رہے ہیں۔

تمام شہر میں آج کے پروگرام کی دھوم ہوگئی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ فدا کا اس ڈرامہ میں کام دیکھے۔ حامد نے بھی تہیہ کرلیا کہ آج وہ اور مہ لقا دونوں اس ڈرامہ کو دیکھیں گے۔

۹ بجے مہ لقا اور حامد تھیٹر ہال میں پہونچ گئے۔ اور مہ لقا زنانہ حصہ میں چلی گئی۔ جو اسٹیج سے قریب تھا۔ لوگ ہال میں کھچا کھچ بھرے تھے۔

حمد کے بعد کھیل شروع ہوا۔ فدا بجنسہ فرہاد معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہایت خوبی سے اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اُس کی آواز سوز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس کے آنسو واقعی میں جاری تھے۔ لوگوں کے دل پسے جا رہے تھے۔

مہ لقا نے خورشید کو پہچان لیا۔ اُس کے دل کو ایک گونہ خوشی حاصل ہوئی۔ "خورشید" اُس کی زبان سے خودبخود آہستہ نکل گیا۔ اگر اُسے اپنی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اسٹیج ہی پر جاکر خورشید سے ملتی۔ وہ خوشی سے بولی

ہو رہی تھی۔

آدھ گھنٹہ کا وقفہ ختم ہوا۔ اور پھر کھیل اسی خوبی سے ہونے لگا۔

کھیل کا آخری سین شروع ہونے والا تھا۔ کلائمکس ہو رہی تھی۔ اور فرہاد اپنے پارٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دکھ بھری آواز سے وہ چونکا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اُس کی طرف روتا آرہا ہے۔ لڑکے نے قریب آکر کہا "سہ لقا ــــ سہ لقا کو آپ جانتے ہیں۔ میں ــــ میں اُس کے خالو کے پاس نوکر ہوں۔ آہ سہ لقا کا آج صبح کو انتقال ہو ــــ ہو گیا" اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ خورشید نے سنا۔ اُس نے سچ سمجھ لیا۔ وہ دیوانوں کی طرح اسٹیج پر آیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کی زبان رک رہی تھی۔ اُس نے بسولہ اٹھایا "آہ سہ لقا" ایک بے ساختہ چیخ اُس کی زبان سے نکلی سہ لقا نے ایک خوفناک انتظار کی طرح سامنے کی چلمن توڑ دی۔ اور وہ اسٹیج کی طرف بے ساختہ بھاگی۔ مگر آہ اس درمیان میں خورشید نے بسولہ مار لیا تھا۔ تمام اسٹیج خون سے رنگین تھا۔ "خورشید ــــ پیارے خورشید" سہ لقا نے چلایا۔ وہ خورشید کے پاس پہونچی۔ خورشید نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ "سہ لقا" اُس نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ سہ لقا اس سے لپٹ گئی۔ اُس کی چیخوں سے تمام اسٹیج گونج رہا تھا۔ خورشید نے سہ لقا کو ایک مرتبہ اور دیکھا اور اُس کے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ باقی تھی۔ جو سہ لقا کو دیکھ کر اُس کے منہ پر ظاہر ہوئی تھی۔

سہ لقا نے بیہوشی کے عالم میں ایک چیخ ماری۔ اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور دونوں کی روحیں ــــ پاک روحیں ملکر پرواز کر گئیں۔

حامد نے اس خبر جانکاہ سے تمام عزیزوں کو مطلع کیا۔ نعیم سر پکڑ کر رہ گئے۔ اس ناقابل برداشت غم کی وجہ سے اُن کا دماغ خراب ہو گیا۔ دوسرے روز ایک پہاڑی دامن میں دونوں بازو بازو دفنائے گئے۔ لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ ان جوان موتوں پر لوگ رو رہے تھے۔

خورشید کی قبر پر "فرہاد ثانی" کندہ کیا گیا اور اُس کے سرہانے سرو، اور سہ لقا کے سرہانے گلاب کے درخت لگائے گئے۔

سنتے ہیں کہ ایک عجیب چڑیا دو گلاب کے پھول توڑ کر ان قبروں پر رکھ دیتی ہے۔ اور ایک غمناک گیت گا کر اڑ جاتی ہے۔ اُن کی قبور پر اس قدر حسرت چھائی رہتی ہے کہ چرواہے اور جانور تک دور سے نکل جاتے ہیں۔ اور نزدیک نہیں آتے۔

غزل

از

(جناب مولوی حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدرآبادی)

صبحدم تھا نالۂ بلبل غمِ پنہاں نما — گل بھی کرتا تھا چمن میں خندۂ دنداں نما

جلوۂ حیرت کا نقشہ ہے تری صورت کا عکس — ہائے کیا آئینہ اظہار ہے حیراں نما

آبلوں کے زخم جذبِ شوق میں پھٹنے لگے — کیا کشش ہے نوکِ خارِ دشت کی پیکاں نما

حشر برپا کر دیا وضعِ خرامِ ناز نے — ہے قیامت بھی ترے دامن سے اب داماں نما

بعد مدت کے ہوئے ہم قابلِ جور و ستم — یہ تمہارا ظلم بھی کیا کچھ نہیں احساں نما

پیرہن کو چھوڑ کر بھی قیدِ عریانی میں ہیں — ہو گیا ہے خانۂ تن ہم کو اب زنداں نما

ہے زباں دانوں کا مجمع جمع ہیں سب اہلِ فضل
حیدرآبادِ دکن اخگر ہے ہندستاں نما

خود اعانتی

از

(جناب مرزا ناظر علی بیگ صاحب بی - اے)

(بسلسلہ سابقہ)

دولت مند اشخاص بھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ مراتب اور اعزاز رکھتے ہوں اگر کوئی غیر فانی شہرت و ناموری حاصل کر سکتے ہیں تو وہ محض ذاتی محنت اور قابلیت کے ذریعہ کیونکہ گو انسان اپنی آبائی ملک یا کسی قدر زمین کا مالک بن سکتا ہے لیکن علم اور عقل و دانش کسی کی میراث نہیں۔ دولتمند آدمی دوسروں سے جو کچھ کام لیتا ہے اُن کی محنت کا معاوضہ ادا کر سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا دماغی کام کروا لے یا دوسروں کا دماغ خرید لے حقیقت میں یہ اصول کہ ہر شعبہ زندگی میں کمال محض محنت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے ایک دولتمند پر اسی طرح صادق آتا ہے۔ جس طرح کہ ڈرو اور گفرڈ پر جن کی درسگاہ ایک کفش دوزکی دوکان تھی نیز یہ اصول ہو یلر پر بھی صادق آتا ہے جس کا مدرسہ ایک پتھر کی کان تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ دولت اور عیش انسان کی اعلیٰ تربیت اور تعلیم کے لئے نہیں ہیں ورنہ دنیا ہر زمانہ میں ایسے اشخاص کی رہین منت نہ ہوتی جنہوں نے ادنٰے مدارج سے ترقی کی۔ آرام و آسائش کی زندگی انسانوں کو دشواریوں سے مقابلہ کرنا نہیں سکھاتی۔ نیز اس قسم کا احساس بھی پیدا نہیں کر سکتی جس کی کہ محنت اور عمل کے لئے سخت ضرورت ہے حقیقت میں مفلسی ایک مصیبت ہے لیکن انسان خود اعانتی کے ذریعہ اُس کو اپنے لئے باعث برکت بنا سکتا ہے اور جس کی وساطت سے ایک راست باز صداقت شعار اور مستقل مزاج انسان ترقی کر جاتا ہے۔ بیکن کا قول ہے کہ "لوگ دولت کا صحیح مصرف جانتے ہیں اور نہ اپنی قوت کا۔ دولت کو ضرورت سے زیادہ اور قوت کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ خود اعتمادی اور نفس کشی انسان کو اپنے پیالہ سے پینا۔ اپنی غذا کھانا۔ قوت بسری کے لئے کوشش کرنا اور حاصل شدہ نعمتوں کا بہترین استعمال سکھاتی ہے۔"

دولت سے آرام اور کاہلی کی بے حد ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور کاہلی کی جانب لوگ فطرتاً مائل نظر آتے ہیں۔ لیکن عزت و شہرت تو انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جو دولتمند گھرانوں میں یا متمول ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی نسل کی فلاح و بہبود میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور "تعیشات کو ٹھکراتے اور عملی زندگی بسر کرتے ہیں" اس ملک کے متمول افراد کے لئے یہ امر باعث فخر و عزت ہے کہ وہ کاہل نہیں بلکہ ریاست کے کاروبار اور خصوصاً اہم و نازک معاملات میں وہ خاص اور غیر معمولی حصہ لیتے ہیں۔ جنگ پنن سولا کے موقع پر ایک افسر نے جس وقت وہ کیچڑ اور دلدل میں سے اس کی رجمنٹ کے قریب سے گزر رہا تھا یہ الفاظ کہے :

اس زمانہ میں بھی سباسٹوپال کے سرد نشیب اور ہندوستان کی جلتی زمین اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارے ملک کے طبقہ شرفا نے بھی اسی قسم کی اعلیٰ نفس کشی اور عملی زندگی بسر کی ہے۔ اکثر دلیر اور عالی نسب ذی مرتبہ اور متمول افراد نے اپنے ملک کی خدمت کی انجام دہی میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور ذاتی اغراض کا ملکی مفاد پر ایثار کر دیا۔

متمول طبقوں نے بھی فلسفہ اور سائنس میں شہرت حاصل کی مثال کے طور پر فلسفہ جدید کے مورث بیکن [illegible] سائنس داں [illegible] وسٹر۔ بائل [illegible] اونڈش ٹالبیٹ اور راس قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کو طبقہ امرا کا زبردست [illegible] تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ دولتمند نہ ہوتا تو یقیناً ایک زبردست موجد ہوتا اس کی صنعتی قابلیت کا حال تھا کہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک صناع نے جس کو اس کے رتبہ کا علم نہ تھا۔ اس کو ایک موقع پر ایک بڑے کارخانہ کے فورمین کی خدمت قبول کرنے مجبور کیا تھا۔ اس کی ایجاد کردہ بڑی راس دوربین یقیناً اپنی نوعیت کا وہ نہایت غیر معمولی اور نادر آلہ ہے جو اس کے زمانہ تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

شعبہ سیاسیات اور ادبیات میں خصوصاً ہم اعلیٰ طبقوں کے اکثر جفاکش اشخاص کو پاتے ہیں ان شعبوں میں بھی دیگر شعبوں کی طرح محض محنت و مشق اور مطالعہ ہی کے ذریعہ ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے [illegible] لازمی طور پر جفاکش اشخاص میں سے ہونا چاہیئے۔ پامرسٹن ڈربی۔ رسل۔ ڈسرائیلی۔ اور گلاڈسٹن [illegible] قسم کے افراد تھے انہیں TEN HOURS BILL سے سابقہ نہیں پڑا انہوں نے پارلیمنٹ کی مصروفیت کے [illegible] شعبوں [illegible] کام کیا ہے۔ سر رابرٹ پیل کی ہستی بھی جانتے تھے اسی قسم کے محنتی ذی شان اشخاص ہو چکے ہیں جو بھی وہ مسلسل دماغی کام کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے اور اپنا کوئی وقت رائیگاں

نہیں کیا۔ اُن کی زندگی حقیقت میں اس امر کی ایک عجیب و غریب مثال تھی کہ ایک محدود اختیارات اور قویٰ والا شخص بھی اپنی انتھک محنت سے کس قدر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کی شرکت کے چودہ سال کے دوران میں وہ بے اندازہ مشقت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دیانت دار راستباز انسان تھے۔ انہوں نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا اُس کو عمدگی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اُن کے تمام تقاریر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ تحریری یا تقریری ہر معاملہ کے متعلق کافی مطالعہ اور غور و خوض سے کام لیا کرتے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ جفاکش تھے۔ اور تقریر کرتے وقت حاضرین کے گوناگوں طبایع کا انہیں خاص خیال رہتا تھا اور وہ اس بات کو مدنظر رکھ کر تقریر کیا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اُن کی ذات میں عملی کام کی صلاحیت۔ اُولوالعزمی۔ اور اپنی کوشش کے نتائج کے صحیح استعمال کی قابلیت بھی موجود تھی ایک لحاظ سے اُن کو اکثروں پر فوقیت حاصل تھی۔ ان کے اصول زمانہ کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتے گئے۔ اور بڑھاپے نے اُن کی طبیعت کو بجائے افسردہ کرنے کے بشاش بنانے کا کام کیا مرنے تک وہ نئے نقاط نظر کو تسلیم کرنے آمادہ رہتے تھے اور اگرچہ کہ اکثروں کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ محتاط تھے لیکن انہوں نے اپنی گذشتہ زندگی کی توصیف اسی طرح نہیں کی جس طرح کہ اُن کے لئے تعلیم یافتہ دماغوں کا خاصہ بلکہ مرض ہوا کرتا ہے۔

لارڈ بروہام کی ان تھک محنت قریب قریب ضرب المثل بن گئی ہے۔ اُن کی پبلک مصروفیتوں کا زمانہ (۶۰) سال سے بھی زائد رہا ہے۔ ... انہوں نے قانون۔ ادبیات۔ سیاسیات اور سائنس کے شعبوں میں عبور حاصل کیا۔ اور سب میں شہرت حاصل کی۔ یہ بات کہ یہ امتیاز انہیں کس طرح حاصل ہوا۔ اکثروں کے نزدیک ایک معمہ بنی رہی۔ ایک مرتبہ سر سیاسیول رومالی سے کسی نئے کام کی انجام وہی کی استدعا کیگئی تو اس نے عدیم الفرصتی کا عذر کرکے اس کام کے کرنے سے معافی چاہی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ”اس کام کو بروہام کے پاس لے جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہر کام کے لئے وقت ہے“۔ حقیقت یہ تھی کہ بروہام کا ایک منٹ بھی رائیگاں نہ جاتا تھا۔ علاوہ اس کے اس کی جسمانی قوت بہت زبردست تھی زمانہ پیری میں جبکہ اکثر اشخاص اپنی بدقت ہاتھ آئی ہوئی فرصت سے لطف اُٹھانے اور غالباً اپنا وقت آرام کرسی پر گزارنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں لارڈ بروہام نے قوانین نور کی کا ... تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے نتائج پیرس اور لندن کے مشہور سینٹفک حلقوں میں پیش کئے اسی زمانہ میں اُس کی قابل تعریف تصنیف (A FHRE EGUMIE LIEB OF IHEREIYNOEGEORYE III

کے مسودے زیر طبع تھے اور وہ دارالامراء کے قانونی معاملات اور سیاسی مباحثات میں پورا حصہ لیا کرتا تھا۔ سڈنی اسمتھ نے ایک مرتبہ بروہام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تین قوی آدمیوں کا کام انجام دیا کرے لیکن لارڈ بروہام کو محنت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ کوئی کام اُس کو مشکل اور دشوار نظر نہ آتا تھا یا بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کام کا شوق طبیعت ثانی بن گیا تھا اور ہر بات میں کمال پیدا کرنے کا شوق اس میں اس درجہ موجود تھا کہ اُس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اگر بروہام کفش دوز ہوتا تو جس وقت تک وہ انگلستان کا بہترین کفش دوز نہ بن جاتا اُس کو چین نہ آتا۔

اسی شعبہ کی دوسری جفاکش ہستی سر ای بلور لٹن کی ہے ایسے مصنفین جنہوں نے اس کے مساوی کام کیا بہت کم ملیں گے نیز کسی نے اس کے برابر مختلف شعبوں میں دستگاہ حاصل نہیں کی۔ لٹن نے ناول نگاری۔ شاعری۔ ڈرامہ نویسی۔ مورخی۔ مضمون نگاری۔ مقرری۔ اور سیاست میں شہرت حاصل کی بلور کو آن واحد میں ترقی حاصل نہیں ہو گئی بلکہ تدریجی طور پر حاصل ہوئی۔ آرام طلبی اور سہل انگاری سے اُس کو سخت نفرت تھی اور دوسروں پر سبقت لے جانے کا شوق اس کے دل میں ہمیشہ رہا کرتا تھا موجودہ انگریزی مصنفین میں بہت کم ایسے مصنف ہیں جنہوں نے اُس کے برابر تصنیفات لکھے اور اعلیٰ امتیاز حاصل کیا۔ بلور کی ذاتی محنت ہر تعریف کی مستحق ہے۔ شکار۔ نشان اندازی۔ عیش و آرام کی زندگی۔ کلبوں کی سیر و تفریح۔ تماشہ گھروں کا لطف و تفنن۔ موسم گرما میں لندن کے دلفریب مناظر کی سیر ہزاروں فرحت بخش ▪️، لطائف، غیر ممالک پیرس دیانا یا روم کا سفر یہ تمام چیزیں ایک خوش نصیب اور عیش پسند انسان کو اپنے طرف مائل کرتی ہیں اور وہ ہر قسم کے مسلسل کام کی انجام دہی پر مستعد و آمادہ ہو جاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں حاصل ہونے کے وجہ ممکن تھا کہ بلور اعلےٰ مدارج کے حصول اور ادبی زندگی سے انکار کر دیا ہوتا لیکن ان کے باوجود اس نے محنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بائرن کی طرح اس کی پہلی ادبی کوشش (گھاس اور خودرو پھول) کے عنوان کی ایک نظم تھی لیکن ناکامیاب ثابت ہوئی۔ دوسری کوشش فاکلینڈ نامی ناول کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن اس میں بھی بلور کو ناکامیابی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں ایک پست ہمت انسان انشا پردازی کا خیال ترک کر دیا ہوتا۔ لیکن بلور ایک مستقل مزاج اور عالی حوصلہ آدمی تھا کامیابی کا عزم کر کے اُس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ محنت سے کبھی جی نہ چراتا تھا کافی مطالعہ کے ذریعہ اُس نے وسیع معلومات حاصل کئے ناکامیوں ہی سے اُس کی ہمت بڑھتی گئی۔

اور اس کو ترقی حاصل ہوئی۔ ایک سال کے اندر فاک لینڈ کے بعد (پلہام) نامی کتاب شائع ہوئی اور
بلور کی باقی ماندہ ادبی زندگی کے تیس سال کے دوران میں کامیابیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مسٹر ڈسرائیلی کی ہستی بھی اس بات کی ایک مثال ہے کہ انسان محنت و جفاکشی کی بدولت اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس کی پہلی کوششیں بلور کی طرح ادبی تھیں اور اس نے کئی ناکامیوں کے بعد ہی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں نے ونڈرس ٹیل آف الرائے اور ریولوشنری ایپک نامی تصنیف کا مضحکہ اڑا دیا اور [illegible] تصور کیا گیا لیکن اس نے دوسرے شعبوں میں اپنی کوشش جاری رکھی اور اس نے [illegible] ۱۸۳۷ء میں آخرکار اس کی جفاکشی کا ثبوت میں پہلے پہل وہ دارالعوام میں ممبر کی حیثیت [illegible] پہلی ناکامی ہوئی اس کی تقریر کو ڈولفی کے ایک مضحکہ خیز نقل یا سوانگ سے [illegible] سمجھا گیا۔ اگرچہ کہ اس نے تقریر نہایت شاندار کی تھی لیکن ہر جملہ پر قہقہہ ہوتا [illegible] کیا جائے تو ہیملٹ بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہ تھی۔ [illegible] ختم کی جس میں ایک پیش گوئی مضمر تھی۔ جب اس کی فصاحت پر تبسم کیا گیا تو [illegible] اکثر [illegible] کام شروع کئے اور آخر کار ان میں کامیاب رہا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں لیکن ایک وقت ایسا آئیگا جب کہ آپ میری تقریر کو توجہ سے سنیں گے۔" یہ وقت [illegible] اور ڈسرائیلی نے پارلیمنٹ کی توجہ کو اپنے طرف مبذول کرانے میں کس طرح کامیابی حاصل کی [illegible] بتلاتا ہے کہ محنت اور مستقل مزاجی سے کیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ڈسرائیلی نے [illegible] صبر و تحمل اور محنت سے اعلیٰ رتبہ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد اکثر نوجوانوں کی طرح وہ پست ہمت ہو کر گوشہ نشین اور افسردہ دل نہیں ہو گیا بلکہ دلچسپی سے کام کرتا گیا۔ اس نے بڑی کوشش سے اپنے نقائص معلوم کئے۔ حاضرین کی طبائع کا مطالعہ کیا اور فن تقریر میں کافی مہارت حاصل کر کے اپنے دماغ کو پارلیمنٹ کے معلومات سے بھر دیا۔ اس نے تحمل کے ساتھ کامیابی کی امید پر اپنا کام جاری رکھا اور رفتہ رفتہ ترقی حاصل کی آخر میں اس نے پارلیمنٹ سے بجائے قہقہوں کے خراج تحسین حاصل کیا اس سے اس کی پہلی ناکامی کی تلافی ہو گئی اور بالاتفاق آزاد پارلیمنٹ کا ایک قابل اور موثر مقرر تسلیم کر لیا گیا۔

جس طرح ان مثالوں اور آئندہ صفحات پر دی ہوئی باتوں سے واضح ہوتا ہے اگر [illegible]

تنت اور کوشش سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا چاہئیے کہ سفر زندگی میں ہم کو دوسروں سے جو مدد ملتی ہے اس کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے شاعر جیمز رسل لوویل نے خوب کہا ہے کہ "دوسروں کی ماتحتی اور ذاتی آزادی و خود مختاری - دوسروں پر اعتماد اور خود اعتمادی" یہ دونوں چیزیں گو بظاہر متضاد نظر آتی ہیں لیکن ان پر چولی دامن کا ساتھ ہے ہر شخص تعلیم و تربیت کے بارے میں بچپن سے پیری تک دوسروں کا کم و بیش رہین منت ہوتا ہے اور عموماً اچھے اور زیادہ مستحق آدمی اس قسم کی مدد کو تسلیم کرتے بے اختیار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر الکیس ڈی ٹاکیولی کی طرز زندگی کو لیجئے وہ ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ فرانس کا ایک مشہور امیر تھا۔ اور اس کی ماں مالے شربنس کی پوتی تھی۔ صرف اکیس سال کی عمر میں بزبردست خاندانی اثرات کی وساطت سے وہ ورسائی میں جج آڈیٹر مقرر ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ اس نے ذاتی قابلیت سے یہ عہدہ حاصل نہیں کیا اس کو چھوڑنے اور اپنی ذاتی کوشش سے آئندہ ترقی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا بعض لوگ اس حرکت کو "ایک احمقانہ اور باطل خیال" تصور کریں گے لیکن ٹاکیولی نے مستقل مزاجی کے ساتھ اسی خیال کے مطابق عمل کیا چنانچہ اس نے ملازمت ترک کی اور ممالک متحدہ امریکہ کے سفر کی غرض سے فرانس سے روانہ ہونے کا سامان مہیا کیا اس کے سفر امریکہ کے تجربات اس کی مشہور تصنیف "جمہوریت امریکہ" کی شکل میں شائع ہوئے اس کے ہم سفر اور رفیق گسٹیو ڈی بیومنٹ نے اس کی ان تھک کوشش کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کیا ہے :-

وہ کہتا ہے کہ "ٹاکیولی کی فطرت کاہلی کے بالکل خلاف واقع ہوئی تھی اور خواہ سفر میں ہو یا حضر میں اس کا دماغ مصروف کار رہا کرتا تھا۔ جو دن بیکار گزرتا اس کو وہ بدترین تصور کرتا اور تھوڑے سے وقت کا نقصان بھی اس کو ناگوار گزرتا تھا" ٹاکیولی نے خود ایک دوست کو لکھا کہ "زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب کہ انسان کام سے بالکل بے نیاز ہو جائے کیونکہ پیری میں جوانی سے زیادہ نہیں تو قریب قریب اس کے مساوی محنت کی ضرورت ہے۔ میں انسان کو دنیا میں ایک ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہوں جو ایک سرد خطہ کی جانب سفر کرتا جا رہا ہو جس قدر بلندی پر وہ جاتا ہے اس کو چاہئے کہ رفتار تیز کرے کیونکہ روح کا بڑا مرض افسردگی ہے اور اس خطرناک نقص کو دور کرنے کے لئے انسان کو صرف مصروف دماغ کی امداد ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنا جنس

کی مدد کی بھی ضرورت ہے۔" ذاتی محنت اور خود اعتمادی کی ضرورت کے متعلق ٹاکیولی کی قطعی رائے جو کچھ ہو کوئی شخص بھی اس امانت کی قدر کو تسلیم کرنے کے لئے جس کے لئے تمام انسان دوسروں کے کم و بیش احسانمند ہوتے ہیں ٹاکیولی سے زیادہ تیار نہ ہوگا۔ ٹاکیولی اس کے دوست ڈی کرگور سے اور اسٹوفلس کے احسانات کا شکرگزاری سے اعتراف کرتا تھا کیونکہ اول الذکر سے دماغی اور آخر الذکر سے اخلاقی ہمدردی اور مدد حاصل ہوئی تھی اس نے ڈی کرگور سے کو لکھا "آپ ہی کی وہ ذات ہے جس پر مجھے اعتماد ہے اور جس کا اثر میری زندگی پر بہت گہرا اور اچھا پڑا ہے۔ میری زندگی پر اگرچہ کہ اکثر لوگوں کا اثر پڑا ہے لیکن اصولی خیالات کی ایجاد اور اخلاق پر جتنا اثر آپ کی ذات کا پڑا ہے اتنا کسی کا نہیں پڑا۔" ڈی ٹاکیولی نے اپنی بیوی میری کے ان خیالات کا بھی اعتراف کیا جس کی مدد سے اس کا دماغ صحیح و سالم رہا اور وہ اپنی تعلیم کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکا اس کا یقین تھا کہ ایک شریف اور نیک طینت بیوی اپنے شوہر کے اخلاق کو بتدریج اعلیٰ بنا سکتی ہے اور ایک بدطینت اور ذلیل الطبع عورت شوہر کے لئے یقیناً مخرب اخلاق ہوتی ہے

۴.۲ غرض انسانی کردار کے بنانے میں ہزارہا فطری اثرات کو دخل ہے اور مثال و پند و نصائح زندگی اور علم ادب۔ دوست آشنا و ہمسائے۔ ماحول اور آبا و اجداد کے جوش کا جن کے اعمال صالحہ اور اچھی باتیں ہم بطور ترکہ حاصل کرتے ہیں ہم پر خاصہ اثر پڑتا ہے لیکن یہ اثرات اگرچہ کہ زبردست ہوتے ہیں اور انہیں ہم تسلیم بھی کرلیں تاہم یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانوں کو اپنی خوشحالی اور فلاح و بہبود بذات خود حاصل کرنی چاہئے۔ اور یہ کہ عقلمند اور نیک آدمی دوسروں کی مدد کا خواہ کتنا بھی ضرورتمند کیوں نہ ہو اس کو چاہئے کہ اپنی مدد آپ کرے اور دوسروں کی مدد کا محتاج نہ ہو۔

سوال و جواب

از
جناب سید قادر حسین صاحب قادر

کہا: "تم ہو حسیں" بولے: "یہ مانا!" کہا: "ظالم" کہا: "کس طرح جانا؟"
کہا: "ہو درد دل" بولے: "کم ہو گا" کہا: "کیوں کر چھپے؟" بولے: "چھپانا!"
کہا: "مرتا ہوں" بولے: "کچھ سبب بھی؟" کہا: "فرقت میں" بولے: "مر جانا!"
کہا: "بے چین ہوں" بولے: "کہ قسمت!" کہا: "بیمار ہوں" بولے: "بہانا!"
کہا: "تم چاند ہو" بولے: "یہ دھبہ؟" کہا: "خورشید" بولے: "جل جانا!"
کہا: "ظالم ہو" بولے: "سب غلط ہے!" کہا: "کس طرح" بولے: "آزمانا!"
کہا: "تجھے چاہا" بولے: "اللہ الحمد!" کہا: "دشمن ہے" کہا: "مر گیا نا!"
کہا: "جیتے ہو؟" بولے: "کہاں ہوں!!" کہا: "کب سے ہے" کہا: "گزرا زمانا!"

کہا: "آؤں" تو بولے: "کون ہو تم؟"
کہا: "قادر" کہا: "ہرگز نہ آنا!"

اصنامِ خیالی

(از جناب عزیز احمد صاحب)

(۱)

تاریکیِ شب نے آفتاب کے رُخِ آتشیں پر ایک ہلکا سا نقاب ڈال دیا تھا۔ مگر چاند اس ظلمت کدۂ شب میں آفتاب کا سفیر بن کر اب بھی ظلمت کو نور میں، سوز کو ساز میں، اور خیالات کو احساسات میں تبدیل کر رہا تھا۔ بادل، بہت دور اُفق پر پَر پھیلائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔

اور اب آپ خیال کیجئے کہ شہر اور اُس کے جنوں خیز ہنگاموں سے دور، سبز پوش پہاڑوں میں سنسان ندی کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھ کر رات کی خاموشی، قمری کی دلاویزی، منظر کی خوبی سے محظوظ ہونا کتنی دلچسپ شغلہ ہے۔

کہنہ سال شاعر ندی کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندی کا شفاف اور سرد پانی اُس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ ایک طرف پہاڑوں کا سنسان اور ہیبتناک سلسلہ چلا گیا تھا، دوسری طرف میدان تھے جن میں بہت دور پر کچھ روشنیاں آبادی کا پتہ دے رہی تھیں۔ آسمان پر چند ستارے نظر آ رہے تھے یا یوں کہیئے کہ زمردیں سمندر کی تہ میں چند موتی چمک رہے تھے، چند آبدار موتی، جن کا جوہری اگر کوئی تھا تو شاعر کا دل۔

ندی کی روانی سے ایک ہلکی سی مبہم آواز نکل رہی تھی ـــــ گیت کی طرح نرم اور شیریں۔ شاعر کے دل سے بھی ایک آواز نکل رہی تھی، ایک نرم اور مسلسل گیت۔ جس میں وہی روانی تھی۔ ... دور، بہت دور کوئی ملّاح کشتی کھے رہا تھا۔ اُس کے گانے کی مبہم آواز۔ فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

شاعر نے ایک آہ بھری ایک سرد آہ۔ "کاش میرے نغموں میں بھی یہی سادگی ہوتی جو اس ملّاح کے نغموں میں ہے۔ کاش میرے نغموں میں بھی یہی جادو ہوتا۔" اور پھر اُس نے چاند کی طرف ایک نگہ نیم باز

سے دیکھا۔ اور مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی مسرت و الم کا ایک دلکش اجتماع تھی۔

اور پھر وہ گانے لگا۔ رسیلے [illegible] جیسے گیت۔ روح افزا نغمے۔ فضا میں پریشان گم کردہ آشیاں جانوروں کی طرح منڈلانے لگے۔ شاعر نے چاند کی طرف ایک رازدارانہ تبسم کے ساتھ نظر ڈالی۔ چاند اپنے ہالے میں اس طرح فروزاں تھا جیسے تخت پر کوئی بادشاہ ہو۔ شاعر نے اسی بادشاہ کو اپنے گیت سنائے

شاعر گا رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے نغموں سے طرب اندوز ہو رہا تھا۔ شاعر کائنات کے ذرے ذرے کا رازدار تھا۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ شاعر کے دل کا۔

شاعر کے نغمے وہ نغمے ہیں جن میں سرمدی رموز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جو کائنات کی دلی گہرائیوں کے رازدار ہوتے ہیں جو اس کے دل سے مچل مچل کر اُس کے [illegible] فضا کو اپنی شیرینی سے اپنی دل آویزی سے وجد میں لا سکتے ہیں۔ میرے دل پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ (ناظرین میں معافی چاہتا ہوں، کہ یہ کہنا بھول گیا کہ میں بھی ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھا ہوا۔ قدرت کے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا) میں اٹھا اور دبے پاؤں شاعر کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

غالباً شاعر نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی۔ مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اور بغیر کسی قسم کا استعجاب ظاہر کئے ہوئے کہنے لگا۔ "تم بھی غالباً میری طرح فطرت کی گلریزیوں سے دامن بھرتے آئے ہو"

میں نے سرسری طور پر سر ہلا دیا۔ مگر یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ شاعر کے دل میں بے پایاں مسرت کا ایک طوفان ہے۔

"ایک زمانہ میں میں بھی تمہاری طرح جوان تھا" شاعر کہہ رہا تھا۔ "اور جب میرا دل بھی جوان تھا۔ تب [illegible] میرا دل ایک شگفتہ پھول تھا جس میں حسن تھا اور مہک۔ مگر اب ـــــ اب کیا چند مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں اور بس"

میں ایک عجیب احساس [illegible] سے شاعر کی باتیں سن رہا تھا۔

"شباب دل کی امنگیں [illegible] کے ولولے اب سب ایک خواب و خیال معلوم ہوتے ہیں۔ شباب میرے لئے [illegible] یادگار [illegible] میں نے کسی سے محبت نہیں کی کسی عورت سے نہیں تاہم مجھے محبت تھی ہر شے سے [illegible] ہر چیز سے مجھے سخت محبت تھی۔ کائنات کی ہر شے سے مجھے محبت تھی اُس حیات سے جو کائنات کی زندگی کا باعث ہے اُسی ہستی سے جو کائنات کی رگ رگ میں

طاری و ساری ہے۔ مجھے محبت تھی۔ اور اب بھی ہے۔ اب بھی مجھے اُس جاودانی حسن سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ جاودانی حسن جو اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ ایک کانٹے میں بھی اسی طرح جلوہ فرما ہے جیسے کہ گلاب کے کسی تازہ، خوشبودار پھول میں۔ میں ایک نامعلوم ہستی کا عاشق ہوں۔ ایسی ہستی کا ––– جسے میں اب تک نہ جان سکا۔ آہ اُس کی محبت میں کس قدر لطف ہے جس کو ہم نہیں جانتے۔ مگر محبت ...... آہ محبت فانی نہیں۔ شباب رخصت ہوا۔ دل بجھ گیا۔ مگر محبت باقی ہے۔ جیسے کسی مرجھائے ہوئے پھول میں بھی حسن باقی رہتا ہے اسی طرح میرے شکستہ دل میں بھی محبت باقی ہے۔

اور اے اجنبی! میں اس رات کو اس دور دراز مقام پر محض اس لیے آیا ہوں کہ آرام اور اطمینان سے اُس نامعلوم حسن کی ایک جھلک دیکھ لوں"۔

شاعر بے خودی میں کہتا جا رہا تھا۔ اُس کے الفاظ۔ رات کے سناٹے میں بہت دلکش معلوم ہو رہے تھے۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

"اے اجنبی، تو میری محبت کی داستان کو دلچسپی سے سنے گا"؟ شاعر نے سوال کیا۔

میں نے متاثر لہجے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

شاعر کہہ رہا تھا:۔

(۲)

بہت دنوں، آہ بہت دنوں کی بات ہے کہ میرے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔ میرے خون میں حرارت تھی، میری آنکھوں میں کشش تھی۔ اور میری ہستی ایک برق تھی ––– برق جو میرے خیال میں ساری دنیا کو جلا دینے کے لیے کافی تھی۔ اسی طرح چاندنی میں بیٹھ کر میں شراب پیتا۔ تو ایک خاص لذت ایک خاص حظ، میرے دل میں اشتیاق کا ایک مجنونانہ جذبہ پیدا کر دیتی۔ ایک اشتیاق ––– ایک مجنونانہ اشتیاق۔ مجھے بے خود کر دیتا۔ مجھے ہر چیز حاصل تھی۔ دولت، عزت، شباب، حسن، طاقت تمام وہ چیزیں جن کی دوسرے تمنا کرتے رہ جاتے ہیں، مجھے میسر تھیں۔ میں مسرور تھا مطمئن تھا۔ مگر میرا دل ––– میرا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ دھڑکتا رہتا تھا۔ اُسے کسی چیز کی تمنا تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں میرے سکون و اطمینان کو ایک کاوش و اضطراب میں تبدیل کر دیتیں۔ میں بیتاب تھا ––– ہاں بے تاب اور بے قرار میرے پاس ایک چیز کی کمی تھی جس کے سامنے وہ تمام نعمتیں جو مجھے میسر تھیں

ہیچ نظر آتی تھیں۔ آہ اے اجنبی مجھے محبت کی تلاش تھی۔

فطرت نے میرے پہلو میں ایک حسّاس اور درد آشنا دل بنایا تھا۔ جو ایک نغمہ کو سن کر ایک پھول کو دیکھکر دھڑکنے لگتا۔ میرے دل کی تعمیر محبت سے ہوئی تھی اور وہ محبت کا جویا تھا۔ محبت، اے حقیقی محبت آہ تجھے پانا کسی قدر دشوار ہے۔ تیرا راستہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ لیکن تو خود کتنی بڑی نعمت ہے!۔

محبت! ایک فطری جذبہ ہے جو خدا نے ہر انسان کو ودیعت کیا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ یہ ایک کڑی ہے۔ جس میں ساری کائنات منسلک ہے۔ انسان کو دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے محبت ہی کا سبق دیا گیا۔ پہلے اس نے ماں سے محبت کی پھر وہ جوان ہوا اور اپنی محبوبہ سے محبت کی اور پھر بڈھا ہو گیا تو اپنی اولاد سے محبت کی۔ یہ تو عام محبتیں ہیں جو ہر شخص کے لئے بنائی گئی ہیں۔ مگر حقیقی محبت کچھ اور ہی ہے .... اے اجنبی حقیقی محبت وہ ہے جو حسن کے ساتھ کی جاتی ہے۔ بچہ کی محبت چراغ سے' یا بلبل کی محبت پھول سے' اس حقیقی محبت کی مثالیں ہیں۔ بچہ چراغ کی لو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ دنیا کیا ہے' وہ خود کیا ہے' اور چراغ کیا ہے۔ مگر وہ صرف چراغ میں ایک نور دیکھتا ہے ..... ایک حسین نور' اسے بیتاب کر دیتا ہے۔ اس کی روح بھی نور ہوتی ہے' اور چراغ کے نور کی ہم آہنگی سے وہ بیتاب ہو جاتی ہے۔ سچی محبت ہے۔ میں بھی اسی قسم کی حقیقی محبت کا خواہاں تھا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی راتیں میں نے اس الجھن میں اور کاوش میں کاٹی ہیں۔ میں محبت کرنا چاہتا تھا۔ میری رگ رگ میں محبت بسی تھی۔ مگر آہ میرا کوئی محبوب نہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے میں محبت کر سکتا۔

اور آخر کار میں نے محبت کے لئے ایک چیز انتخاب کر ہی لی۔ ایک حسین' اور بے چین ہستی.. یعنی عورت ....

ہاں اے اجنبی .... عورت ...... میں نے عورت کو اپنے دل کے معبد میں معبود بنا کر رکھا۔ آہ تو نہیں جانتا حسن کیا شئے ہے۔ ایک آگ .... ایک شرار ....

میں کہہ آیا ہوں کہ جوانی کے دنوں میں میرے خد و خال کافی دلکش تھے۔ عورتیں میری طرف محبت بھری اور مرد حاسدانہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ مگر میں ان معمولی باتوں پر مطلق غور نہ کرتا۔ میں اپنے کو ایسا انسان سمجھتا تھا جو سوسائٹی کے بندھنوں سے آزاد ہو۔

ندیم کے یہاں جلسۂ رقص تھا' اس نے مجھکو خاص طور پر مدعو کیا۔ گانا ہوا قہقہے لگائے گئے شراب کی بوتلیں خالی کی گئیں۔ میں بھی کسی قدر دلچسپی' کسی قدر تعجب' اور کسی قدر تنفر کے ساتھ لوگوں کی حرکتیں دیکھتا رہا۔

ندیم نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "ریاض' تم بڑے احمق ہی رہے۔ ان دلچسپیوں میں حصہ لو۔ مرد فطرۃً شاعر ہونے کا تو دعوے ہے' اور موسیقی سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا "تاثر' کا اظہار قہقہوں سے نہیں ہو سکتا۔"

مگر ندیم نے آہستہ سے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ مرد خدا۔ دنیا میں صرف چند شعر لکھ لینا یا سر ہلا لینا کافی نہیں۔ ذرا سامنے دیکھو۔ عورتیں تمہاری طرف کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ اگر تمہاری جیسی بڑی بڑی دلکش آنکھیں میری بھی ہوتیں تو پھر کیا تھا۔ افسوس ہے کہ حسن تمہارے قدموں پر گر رہا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔"

خیر میں نے اس دن سے سوسائٹی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اور آخر کار میں نے اپنے لئے ایک محبوبہ انتخاب کر لی۔ فرض کر لو کہ اس کا نام یاسمین تھا۔ ...... ہاں یاسمین۔ کیونکہ وہ یاسمین کی طرح نازک اور حسین تھی۔ اور اس کا اصلی نام' افسوس ہے میں نہیں بتا سکتا۔

اب میں اس کا مالک تھا۔ مجھے حسن مل گیا تھا جو خود میری پرستش کر رہا تھا۔ آہ وہ عورت۔ اس کا تبسم' اس کی آنکھیں۔ اب یہ سب چیزیں یاد آتی ہیں۔ خیر تو اے اجنبی۔ اب میرے پاس ایک عورت تھی ...... تم کو کبھی کسی عورت کے ساتھ محبت کا اتفاق ہوا ہے؟ حرارت کا وہ مرمریں مجسمہ اپنے اندر کس بلا کی دلکشی رکھتا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ بالکل سچ کہ اب بھی میں مطمئن نہ تھا۔ میرے دل میں کانٹا سا کھٹک رہا تھا اور برابر کھٹکتا رہا۔ عورت مرد کے جذبات کی تسکین کر سکتی ہے۔ عورت زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ مگر شاعر کا دل؟ کیا شاعر کا دل بھی حرارت کے اس مرمریں مجسمہ سے جس کی حرارت فی الاصل برودت ہے' تسکین پا سکتا ہے؟ آہ نہیں .... تو نہیں جانتا کہ شاعر کے دل میں کس بلا کی وسعت ہوتی ہے۔

اے اجنبی میں نے حسن پالیا تھا۔ مگر محبت نہیں پائی تھی۔ .... عورت میں حسن ہے؛ لیکن کامل نہیں۔ .... میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عورت کا حسن بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ پھول کا حسن۔ مگر اصلی حسن اور ہی چیز ہے۔ آہ میں نے حسن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ چراغ کا حسن اس کے خوبصورت فانوس میں نہیں بلکہ اس کی روشنی میں نہاں ہے۔ اس کا فانوس روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔ مگر خود روشنی نہیں۔ بس بالکل یہی حال دنیا کی تمام حسین چیزوں کا ہے۔

تو پھر حسن کیا ہے؟ .... ایک نامعلوم شئے۔ بچہ چراغ کے نور کو دیکھتا ہے۔ لیکن نہیں جانتا کہ یہ نور کیا ہے۔ تاہم وہ اس نور سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نور ہے جو کائنات میں نہاں ہے۔ مگر ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نور ایک رازِ عیاں ہے۔ جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔
میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اور صحیح نتیجہ پر پہونچا۔ اب میں اس نامعلوم نور سے محبت کرنے لگا۔ آہ .... ایسی چیز سے محبت کرنا، جس سے ہم ناواقف ہوں، کس قدر لطف رکھتا ہے۔

اور اسی نور کے رازِ عیاں کو معلوم کرنے میں میں نے ساری عمر گنوا دی۔ میری کمر جھک گئی۔ میرے بال سفید ہوگئے میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ مگر میں مطمئن ہوں۔ کیونکہ میرا دل محبت سے مالا مال ہے۔ میں نے محبت میں سرشار ہو کر اس رازِ عیاں کو معلوم کرنا چاہا۔ میرے نغمے سن سن کر، میرے شعر پڑھ پڑھ کر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مجھے کائنات کا راز معلوم ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کائنات کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ مگر .... اے اجنبی میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ اب تک میں اس نامعلوم حسن کا راز معلوم نہیں کر سکا۔ اور جس دن مجھے وہ راز معلوم ہو جائے گا مجھے دنیا میں رہنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر اے رازِ عیاں .... اے مقدس راز ...."

(۳)

شاعر خاموش ہو گیا۔

دور، بہت دور ستارے سرگوشی کر رہے تھے "شاعر نامعلوم حسن کے رازِ عیاں سے خبردار ہو چکا ہے، اسی لئے وہ اس قدر حیران اور پریشان ہے۔"
اور غالباً موجیں شاعر سے کہہ رہی تھیں "تو منزل پر ہے۔ مگر اپنے کو منزل سے دور سمجھ رہا ہے۔"

میں نے کہا "اے شاعر۔ تو کائنات کا حُسنِ قدیم کا رازداں ہے تو حُسنِ قدیم کا پیغام سُنانے والا ہے۔ اے میرے شاعر تو فطرت کی کائنات کی گہرائیوں کا رازدار ہے"
شاعر کے لب پر ایک دلگداز سا تبسم نمودار ہوا۔ جس کے بعد اُس کی روح بھی اس راز کو اور زیادہ اُلجھانے کے لئے نامعلوم حُسن سے ہمکنار ہو گئی
ستارے ایک ایک کرکے شاعر کے مُردہ جسم پر روشنی ڈالتے ہوئے رخصت ہونے لگے۔

غزل

از جناب ابوالشجاع صاحب محبت

شکایت ہم کو دل سے ہے نہ شکوہ کوئی دلبر سے
مگر ہاں کچھ گلہ ہے وہ بھی کس سے ہے مقدر سے

ارادہ ان کا جانیکا ہے شاید اب مرے گھر سے
الٰہی بجلیاں چمکیں گھٹائیں چھائیں مینہ برسے

اگر وہ میرے گھر آئیں تو صدقے جان اُن پر سے
بلائیں گر وہ گھر اپنے تو چلتا جاؤں گا سر سے

کسی بے درد ظالم بیوفا کافر کی فرقت میں
بہت رووے بہت چیخے بہت ٹپکے بہت تڑپے

بتا دونگا کہ اک دن رحم فرما ہوگا تو مجھ پہ
مری فریادیں ہیں کر لینگی داد پتھر سے

دمِ نظارہ دیکھو بھی عیاں کیا ہے یہاں کیا ہے
تمہارے چشمِ افسوں سے ہمارے دیدۂ تر سے

پریشاں حال دامن چاک گھبرائی ہوئی صورت
ہوا معلوم تم آتے ہو شاید غیر کے گھر سے

عدو سے آج ٹھہری وصل کی تم کیا چھپاتے ہو
سمجھتے ہیں سمجھنے والے دل کی بات تیور سے

ترا گھر ہی کہ کعبہ ہی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
ہزاروں سر لگے ہیں اُس بتِ کافر کے در سے

سرِ مقتل تہِ خنجر محبت اس طرح تڑپا
نگاہیں جھک گئیں قاتل کی دردانگیز منظر سے

تنقیدیں

ادب (ماہوار) مدیر مولوی سید اعظم حسین ضخامت (۴۶) صفحات سالانہ چندہ للعہ - پتہ دفتر ادب یحییٰ گنج چوراہا لکھنؤ۔

لکھنؤ سے یہ نیا رسالہ اُردو ادب کی خدمت گذاری کے شوق میں اور ظاہری و معنوی دونوں نوع کی خوبیوں سے آراستہ شائع کیا جا رہا ہے۔ آج کل عامیانہ مذاق کے رسائل کی کثرت اور ظاہری زیبائش کے پرچوں کی زیادتی نے اچھے مذاق کی نشو و نما میں ایک طرح کی رکاوٹ سی پیدا کر دی ہے اور ان خلفشار بے تمیزی میں سنجیدہ رسائل کا خاص و عام کے دلوں میں گھر کرنا اور روز بروز زیادہ مقبولیت پانا مشکل نظر آتا ہے۔ اس حوصلہ شکن صورت حال نے اُردو کے نئے پرانے کئی معیاری پرچوں کو بند ہونے پر مجبور کر دیا اور بہت سے پرچے کس مپرسی کے عالم میں ہیں جو کبھی تو تصاویر میں رنگینی پیدا کر کے اور کبھی اپنے بلند معیار سے نیچے اتر کر پبلک کو اعانت کے لئے اپیل کرتے رہتے ہیں۔ اس ناموافق سی فضا میں بلدۂ لکھنؤ سے ادب کا اجرا ہوا ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ اردو ادب کا یہ نومولود تین ماہ سے زیادہ کا ہو گیا ہے اور اس میں توانائی اور تنومندی روز بروز زیادہ ہوتی نظر آرہی ہے اس وقت اس کے جو نمبر شائع ہو چکے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم اس رائے کے قایم کرنے پر آمادہ ہیں کہ ادب سنجیدگی کے ساتھ ادب اور اس کے متعلقات پر اعلیٰ پایہ مضامین پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ علم و فن کے دوسرے موضوعات پر بھی اچھے اچھے مضمون اس کی زینت ہو سکتے اس وقت تک ادبی تنقید اور ادبی تحقیقات کے مضامین اور بالخصوص پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کی خاموش تحقیقات کے نتائج جو اس پرچے میں شائع ہوئے ہیں اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ آئندہ اس نہج پر اس میں بہت کچھ شائع ہوگا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب نے جو خوش قسمتی سے مخطوطات کا ایک پاکیزہ ذخیرہ بھی رکھتے ہیں، ماہ بماہ اپنے تحقیقاتی مقالات سے اس رسالے کی اعانت

خاص کا وعدہ کیا ہے۔ یہ مضامین چونکہ اُردوئے قدیم سے متعلق ہوں گے اس لئے "اوراق پارینہ" کی سرخی سے بالتزام دیئے جائیں گے۔ مدیر ادب مولوی سید اعظم حسین صاحب اپنے اچھے ذوق اور عمدہ انتخاب مضامین کے لئے نہ صرف قابل مبارک باد بلکہ ہر طرح قابل اعانت ہیں۔ بعض نمبروں میں تصاویر بھی ہیں۔ مگر علمی اور مضامین سے متعلق۔ رسالے کی طباعت کتابت ہر طرح دیدہ زیب ہے۔

جن (ماہوار) مدیر مولوی نیاز فتح پوری۔

سالانہ چندہ عام۔ پتہ دفتر نگار شعبہ (جن) نظیر آباد لکھنؤ۔

دفتر نگار اور خود مدیر نگار مولوی نیاز فتح پوری کے سحر طراز قلم سے یہ رسالہ جو اُردو رسائل میں اپنی نوعیت کا واحد ہے، جنوری سے نکلنے لگا ہے۔ سحر طراز مدیر کو جن اور جنیات (یا علم اجنہ) وغیرہ سے بڑا لگاؤ نظر آتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ایسے حالات و واقعات کو بغور سنتے رہتے ہیں جو جنوں کے متعلق کسی بات کی طرف رہنمائی کرتے ہوں۔ اس رسالے کے اجرا سے اُن کا مقصد ایک تو جنوں کے متعلق علمی حیثیت سے مضامین شائع کرنا ہے اور دوسری طرف وہ پبلک کے جذبہ تجسس اعجوبہ پسندی کی ضیافت کے لئے جگہ جگہ سے جنوں کے متعلق شنیدہ دیدہ اور تراشیدہ غرض ہر قسم کے قصے کہانیاں اور واقعات چھاپنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ کارپردازان جن اپنے قارئین سے اُمیدوار ہیں کہ جنوں کی نسبت جو کچھ بھی انہوں نے سُنا ہو یا آنکھ سے دیکھا ہو یا کسی کو خواب میں کوئی بات اس گروہ کے متعلق ہو تو اس کو جس طرح بھی بن پڑے لکھ کر دفتر جن بھیج دیں تاکہ اس کو صحافتی رنگ میں رنگ کر جن کے اوراق پر لایا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن ایک مفید رسالہ ثابت ہوگا۔ موجودہ زمانے میں جب کہ مادیات کا غلبہ ہماری روحوں کو اگلے زمانے والوں کی لطافتوں سے محروم کر کے روز بروز ہمیں صنعتی آدمی یا کل بناتا جا رہا ہے، بعض لوگ خود مادیت کے مرکز یعنی یورپ میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو مادیت سے متاثر اور کثیف شدہ دل و دماغ کو ایسے ہی واقعات و کیفیات کی بحث میں الجھا کر تفنن اور تفریح کا سامان بہم پہنچاتے ہیں جیسا کہ اس رسالے سے توقع کی جاتی ہے۔ سائنس اور عقل کے دور حاضر میں جب طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ وغیرہ کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، ایسے رسالے اور کتابیں جن میں روحانیات وغیرہ عالمانہ مباحث کا ادعا بھی ہوتا ہے، خالص عوام کے اس جذبہ کی تسکین و تسلی کے لئے ضروری ہیں جس سے لوگ دنیا کی

حقیقتوں کے ملاحظے سے تھکاوٹ اور بیزاری محسوس کرکے خیالات کی دنیا میں چکر لگانے لگتے ہیں۔ اور ایسے سیمیائی جلوؤں سے قلبی کثافت اور گرانی روح دور کرنا چاہتے ہیں۔

دیوان تاباں | مرتبہ جناب سید پادشاہ حسن صاحب۔ چھوٹی تقطیع (۹۲) صفحات۔ قیمت عہ۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد اعظم معین الدین سوداگر سالار جنگ بلڈنگ حیدرآباد دکن۔

بزم ادب نظام کالج کے سلسلۂ مطبوعات اُردو کی یہ دوسری کڑی ہے۔ میر عبدالحی تاباںؔ۔ دور میر تقی کے ان چند چیدہ شاعروں میں ہیں جن کی وجہ سے یہ دور اُردو ادب کی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ قدرت نے انہیں بہت ہی حسین وجمیل پیدا کیا تھا۔ اور یہ اپنے عہد میں یوسف ہند کہلاتے تھے۔ عین جوانی میں کثرت بادہ نوشی سے مرض استسقا میں مبتلا ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا اور اس عہد کی اُردو شاعری کی بزم کو بہت نقصان پہنچا گئے۔ تاباںؔ، حاتمؔ کے شاگرد تھے اور جو کچھ استاد سے حاصل کرتے تھے اُس کو اپنی طبیعت کی براقی اور جولانی سے بہت زیادہ کارآمد بنا لیتے تھے۔ اُردو کے تقریباً ہر ایک قدیم تذکرے میں اس جواں مرگ شاعر کا ذکر ملتا ہے مگر بہت سے امور انتشار بیاں کی وجہ سے اور بعض واقعی مبہم وغیر معلوم رہ گئے۔ سید پادشاہ حسن صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی تلاش اور کوشش سے اُردو شاعری کے ایک گم شدہ ستارے سے پبلک کو روشناس کرایا اور تاباں کی حیات پر بصیرت افروز طریقے سے روشنی ڈال کر تذکروں کے بہت سے ابہام رفع کر دے۔ نیز شاعری پر بھی خاصی دلچسپ بحث کی ہے اور تاباں کے کلام کی خوبیاں اور خرابیاں بے لاگ بنکر دکھائی ہیں۔

تاباںؔ نے زیادہ عمر نہیں پائی تھی اور غالباً تیس چالیس کے درمیان سن میں ان کا انتقال ہو گیا اس لئے قدرتاً اُن کے کلام کی مقدار زیادہ نہیں۔

اس پر بھی بعض انتخاب کرنے والوں نے اُن کے کلام کو کانٹ چھانٹ کرکے بہت کم کر دیا۔ پیش نظر نسخہ میں جس کو بحالات موجودہ کلیات ہی کہنا چاہئے، تاباں کا جس قدر کلام بھی مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے علاوہ تذکروں کے انتخابات سے مل سکا شریک کر لیا گیا ہے۔ دور میر تقی کی شاعری کے تمام محاسن جستہ جستہ تاباں کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بالخصوص زبان کی لطافت لوچ اور دیگر خوبیوں کے لحاظ سے اس دور کی شاعری کو جو امتیاز حاصل ہے اس کے مدنظر دیوان تاباں متعلمین ادب اُردو کے مطالعہ کی چیز ہے۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں جو ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہے، تاباں کو مرحوم

بتایا ہے اور دیگر تذکروں کے بیانات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۵ھ سے قبل انتقال کر گئے تھے ۔ دیوان تاباں کی زبان بارھویں صدی کے نصف اوّل کا بہترین نمونہ ہے اور اُردو زبان کی وقت بوقت کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے مطالعہ میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے ۔

اُردو میں سستے مگر ناقص ایڈیشنوں کا جو عرصہ سے رواج چلا آرہا ہے اس نے ہمارے ادب کو ظاہری حیثیت سے نہایت مکروہ اور بدنما بنا دیا ہے ۔ نیز اہل کاروبار کی کم علمی اور بے پروائی سے ہمارے اکثر شاعروں کے دیوانوں کا یہی حال ہے کہ اگر ایک طرف خراب کاغذ اور بری تقطیع اور غلیظ طباعت سے بدنما ہیں تو دوسری طرف بدنما اور مکروہ اور اغلاط سے مملو ۔ تاباں کا کوئی اچھا مطبوعہ دیوان تو سرے سے مفقود ہے ۔ دیوان کے نام سے جو انتخاب شائع ہوئے وہ بھی عام کتابوں کی طرح غلطیوں سے معمور نکلے ۔ چونکہ اس نسخہ کی ترتیب میں قلمی نسخوں کا مقابلہ کر کے غلطیاں دور کر دی گئی ہیں، اور طباعت وکتابت کے بھی ظاہری اوصاف سے یہ نسخہ متصف ہے اس لئے توقع ہے کہ اردو ادب کے نفاست پسند قارئین اس کے مطالعہ سے بہر طور محظوظ ہوں گے ۔

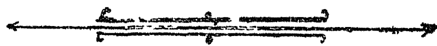
پردہ | از جناب محمد فضل الرحمن صاحب لکچرار سٹی کالج چھوٹی تقطیع (۸۴) صفحے قیمت ۸؍ ۔
ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۔

یہ ایک تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے جس کا موضوع اُس کے نام سے بالکل ظاہر ہے ۔ آج کل تبدیلی حالات کے مدنظر سماجی اصلاحات کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ حیات عامہ میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ اس کی طرف بھی گاہے ماہے ہمارے لیڈروں اور رہنماؤں کی توجہ ہو جاتی ہے ۔ اگرچہ اب تک سماجی اصلاح کا کام وسیع اور منظم پیمانے پر نظر نہیں آتا تھا تا ہم انفرادی کوششیں اکثر موقعوں پر بڑی تندی و تیزی سے جاری ہیں اور بفضلہ مفید نتائج بھی پیدا کر رہی ہیں ۔ ہندوستان میں بالعموم اور مسلمانان ہند میں بالخصوص پردہ کو سماجی اصلاح میں بہت بڑی رُکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور مصلحین کی ایک جماعت کا یہ خیال کیا بلکہ ایقان ہو چلا ہے کہ جب تک عورتیں پردہ نہ اُٹھا دیں گی اور مرد عورتوں کو صنف نازک سمجھ کر اُن کے ساتھ رعایت اور قوائے انسانی میں اپنے برابر سمجھ کر نہ صرف اپنے مساوی بلکہ اپنے سے ایک حیثیت سے بالاقرار نہ دیں گے، ہندوستان ترقی و رفعت کے خواب نہیں دیکھ سکتا ۔ پردہ ڈرامہ انھی خیالات کی نشرو

اشاعت کا آلہ ہے اور چالاک دست مصنف نے تین ایکٹ میں موجودہ رواجی پردے کی جس طرح بُرائیاں کھول کر رکھدی ہیں۔ علماء کا اس ڈرامے میں بڑا برا حصہ ہے اور خوب مضحک طور پر اُن کو پیش کیا گیا ہے۔

تاریخ (سہ ماہی) مدیر مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کتابی تقطیع ضخامت تقریباً ایک سو صفحات۔ سالانہ چندہ مع خرچ ڈاک ۸ دفتر تاریخ کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد دکن۔

مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اُردو دنیا میں تاریخی معلومات اور تحقیقاتی مضامین کے لیے خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کی اُردوئے قدیم سے جو اُردو کے ابتدائی دور کی ادبی تاریخ ہے، اکثر اُردو داں واقف ہوں گے۔ حکیم صاحب تاریخ و اثریات سے جو شغف رکھتے ہیں، اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ کی ادارت میں اس موضوع پر کوئی خاص فنی مجلہ جاری ہو تو ضرور اعلیٰ پایہ ہوگا۔ چنانچہ تاریخ جس کے اس وقت تک تین نمبر نکل چکے ہیں توقع کے موافق ہے۔ اس کے اعلیٰ پایہ مضامین اور تاریخی معلومات ضرور اہل ملک میں تاریخی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عمدہ سامان ضیافت ہیں۔ تاریخی کتابوں پر بہ التزام طویل ریویو بھی شائع ہوتے ہیں۔ نیز دکن کی تاریخ پر بطور خاص مقالات کی اشاعت اس کا ایک قابل ستائش مقصد ہے۔ حیدر آباد کی تاریخ پر ابھی تک کچھ بھی کام نہیں ہوا اور ہمارا ماضی جس کی عظمت و رفعت کا سرسری سا اندازہ شکستہ ہوئے آثار اور ڈھیتے ہوئے گنبدوں اور قلعوں سے ہوتا ہے، ہمارے لئے راز سربستہ ہی ہے۔ اُن کا آئینہ فردا اور درس حال ہونا تو بڑی بات ہے ہم سرے سے یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے حال کا دامن جس ماضی سے وابستہ ہے وہ کیا بلحاظ تمدن و تہذیب اور کیا بلحاظ شوکت و حکومت ہمارے لئے کس طرح موجب افتخار ہے۔ حکیم صاحب کی یہ کوشش قابل شکریہ ہے اور امید ہے کہ تاریخ کے شائقین اس رسالے میں گہری دلچسپی لے کر دامے، سخنے اور قلمے اس کی اعانت سے دریغ نہ کریں گے۔



نیرنگ رامپور سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا

اس عظیم انقلاب کے ماتحت جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کا تمام پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اس لیے

امیر نمبر

جس کے جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اب ایک ماہ کی تاخیر سے آخر ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا اور امیر نمبر کی بجائے

دہلی نمبر

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر نیرنگ کے انقلابی پروگرام کی یادگار ہوگا اور ہر حیثیت سے قابل قدر اور کامیاب ہوگا

آئندہ جملہ مراسلت اور ترسیل زر حضرت عشرت رحمانی مدیر نیرنگ دار السلطنت دہلی کے نام ہونی چاہیے

سنہ ۱۹۳۰ء سے رسالہ کے لئے جس قدر آرڈر موصول ہوئے ہیں ان کی تعمیل دہلی سے ہوگی۔ نیرنگ کے قدیمی معاون اور قدر داں حضرات سے امید ہے کہ وہ نیرنگ کی بدستور معاونت فرمائیں گے اور بہ لحاظ ضرورت مجھے اپنے گرامی ناموں سے یاد فرماتے رہیں گے

معزز معاصرین اپنے رسائل اور اخبارات بدستور رامپور کے پتہ پر ارسال فرماتے رہیں۔ نیرنگ دہلی سے ان کی خدمت میں پہنچتا رہے گا

محمد عزیز اللہ خاں مدیر نیرنگ

پتہ ۔۔۔ مطبع سعیدی ریاست رامپور

مجلہ مکتبہ

بابتہ ماہ فروردی ۱۳۳۹ف م فبروری ۱۹۳۰ء

تصویر :- "ایک راگنی"

جلد (۴) **فہرست مضامین** شمارہ (۵)

شذرات

کچھ روز پہلے مسٹر بالڈون نے اپنے ایک خطبہ میں عوام کی معلومات سائنس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام سائنس کے حقایق سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ جو نظریے سائنس داں کے پاس فرسودہ ہو جاتے ہیں وہ ان کی معلومات کا سرمایہ بنے رہتے ہیں حالانکہ سائنس کی تحقیقات کے لیے کوئی نقطہ انتہا نہیں ہے انھیں خیالات کو اپنا موضوع بناتے ہوئے جان میکلن نے سائنس کی تعلیم اور اس کے مقصد پر بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ خود سائنس داں اپنی تحقیقات سے عوام کو مانوس رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں رکھتے۔ اکثر صرف اسی کو تشفی بخش سمجھتے ہیں کہ وہ مدرسوں سے ایسے سائنس داں پیدا کر رہے ہیں جن پر سند کی مہریں ثبت ہیں۔ رہی یہ بات کہ عوام کو سائنس سے کہاں تک تعلق ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے اس کی ضرورت نہیں ان میں سائنس کی ٹھوس معلومات بھری جائیں، بلکہ یہ کافی ہے کہ ان کی نظر سائنٹفک ہو جائے اور وہ چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ سائنٹفک نقطہ نظر سے کرنے لگیں۔

جامعات کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب سر سی، وی رامن نے اپنے ایک مضمون میں یہ دیا ہے کہ جامعات قومی ترقی اور استفادہ کا بہترین مرکز بن سکتی ہیں اگر ان کی توجہ اعلیٰ دماغی مشاغل کی طرف منعطف ہو جائے افسوس ہے کہ یہ مطمح نظر ہماری جامعات کے سامنے سے ہٹتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ صرف خشک تعلیم اور امتحانات کی باضابطگی لیتی جا رہی ہے جامعہ میں متعلم اور معلم دونوں کی مخصوص اور غیر معمولی قابلیتوں کے بروئے کار لانے کی غرض سے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی جانی چاہئے۔ یہی جامعہ کا مطمح نظر ہے جس کی طرف عموماً ہندی جامعات کی رفتار نہایت سست معلوم ہوتی ہے۔ سر رامن کے خیال میں متعلم اور معلم کی مخصوص پوشیدہ غیر معمولی قوتیں اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتیں جب تک جامعات میں اعلیٰ تحقیقات اور ریسرچ کی فضا نہ پیدا ہو جائے اس موازنہ سے جب ہم ہندوستان کی جامعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے تقریباً سب میں ریسرچ اعلیٰ علمی تحقیقات اپج کے اور تخیل کارناموں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ جدھر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کا رجحان ایک کارخانہ بننے کی طرف جس سے صدہا ادھورے سند یافتہ منشی بن بن کر نکلتے جا رہے ہیں اس سے تعلیم یافتوں کی توہین ہمارا مقصد نہیں کیونکہ ملک کو ان کی جیسی کچھ ضرورت ہے ظاہر ہے لیکن انھیں میں سے چند ایسے بھی پیدا ہوں جنکو علمی تحقیقات میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرنے کی عزت حاصل ہو۔ اس مقصد کو ہندی

۳

جامعات جس قدر پھیلاتی جارہی ہیں اسی قدر تمدنی اور علمی حیثیتوں سے وہ مغربی اقوام کی کورانہ مقلد بلکہ مجہول خادم بنتی جارہی ہیں۔

یورپ کے "خصوصی ماہرین" بھی عجیب بلائے ناگہانی ہوتے ہیں ان میں سے بعض تو بلاشبہ اپنے مبنیہ موضوع پر بڑی حد تک وسیع نظر رکھتے ہیں لیکن انھیں کے سہارے بہت سے خودساختہ خصوصی ماہرین بھی پاؤں پھیلانے لگے ہیں اسلامی ممالک میں آج کل جو بے چینی کشمکش حیات کی پیدا ہوگئی ہے اس کو دنیا عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب نقطہ نظر شاید اُن ماہرین خصوصی کا ہے جن کے متعلق بعض ارباب صحافت کا خیال ہے کہ وہ اس اسلامی ہیجان کے بڑے نقاد اور شاہد ہیں اسی طرح کے ایک ماہر خصوصی مسٹر لطفی لیوینین نے "انٹرنیشنل ریویو آف مشن" میں ایک مضمون "اسلام سے بغاوت" کے عنوان سے لکھا ہے جس کے معنی خود اسلامی اصطلاح میں "ارتداد" کے ہوں گے۔ ان بزرگ کی نظر غایت اپنے اکثر ہمجنسوں کی طرح "آزاد ترک" پر بُری طرح جمی ہوی ہے، آزاد ترک کی روائتی تلوار ان کے دل پر آرے کا کام کر رہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانان عالم خصوصًا ترکوں میں تمام اسلامی عقاید سے باغیانہ خیالات پیدا ہوگئے ہیں۔ تاریخ اسلام میں مذہب اسلام اور حضرت محمدؐ کے ارشادات پر کبھی ایسی تنقیدیں نہیں ہویں جیسی گذشتہ دس سال سے ترکی میں ہونے لگی ہیں۔ اس کے بعد وہ ترکی تمدنی، معاشرتی اور قومی زندگی میں جو تبدیلیاں ہورہی ہیں ان کا ایک خاکہ کھینچ کر اپنے طور پر یہ ثابت کرلیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اسلام سے بغاوت کے طور پر ہورہا ہے۔

ان بزرگ کے رطب ویابس کو اگر ہم صحیح مان لیتے ہیں تو پھر خود اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ترک ہوں یا افغانی وایرانی، مصری ہوں یا عرب اور ہندی وچینی سب کے دل میں عقیدتی احساس مذہب کی جگہ، اصلی اور سادہ دین فطرت کی طرف واپس ہونے کی خواہش پیدا ہورہی ہے۔ عقیدوں سے قطع نظر تمدن ومعاشرت میں بھی وہ ایک معیاری اور بین القومی نقطہ پر آنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی تحریک کا سوال ہے۔ جس کا نتیجہ اس قدر پیش پا افتادہ نہیں ہے جیسے ہمارے خصوصی ماہر سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں اب رہا تعبیر کا حق وہ ہر ایک کو حاصل ہے۔

یہ خبر ہندوستان کے علمی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ پروفیسر بنوائے کمار سرکار، پروفیسر معاشیات کلکتہ یونیورسٹی کو ادارۂ ہند کی تحریک پر بویرائی وزارت تعلیمات نے میونخ کے ٹکنیکل اسکول میں جو

ہندوستانی مسائل پر لکچر دینے کے لیے ایک سال کے واسطے مقرر کیا ہے۔ اس تقرر کا مقصد ظاہر ہے جرمنی میں کئی سال سے ہندوستانی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی متواتر سعی کی جارہی ہے جس کے لیے سربرآوردہ ہندی علما کو وظیفے بھی عطا ہوتے رہے ہیں۔

کچھ سال ہوئے کہ بلدہ حیدرآباد دکن کے ایک روشن خیال مولوی عبدالمجید صاحب نے "صفتہ الاسلام" کے نام سے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن مسلمان آوارہ گرد لڑکوں کے لیے قایم کی تھی جس میں ایک کافی تعداد مسلمان بچوں کی نہ صرف پرورش پاتی رہی بلکہ علم اور صنعت کاری سے بھی بہرہ اندوز ہوتی رہی۔ مولوی عبدالمجید صاحب کی سعی اور انکے شریک کار مولوی میر تہور علی صاحب کی اعانت سے عرصہ تک انجمن کا کام خوب ترقی پذیر رہا۔ صفتہ الاسلام کے عروج وکمال کے زمانے میں ان دونو بزرگوں نے اس کو مرکزی انجمن بناکر اس کی ذیلی انجمنیں "انصار الصفہ" کے نام سے اکثر محلوں میں قایم کیں جن کا مقصد آوارہ گرد بچوں کی تعلیم اور اصلاح معاشرت تھی۔ گلبرگہ، مغلپورہ، سلطان شاہی، سلطان پورہ میں انصار الصفہ کی انجمنیں قایم تھیں جہاں تک ہمیں علم ہے ان میں سے اکثر انجمنیں ناواقف کار اراکین کی نفسانیت کی بدولت یا شخصی دلچسپی پر انحصار کی وجہ سے اب صرف قسم کھانے کو باقی رہ گئی ہیں۔ سلطان شاہی کی انجمن جواب سکرہی تھی۔ اسکے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس کے جدید معتمد مولوی میر مظہر علی صاحب وکیل ہائکورٹ نے اس کے احیا کا ذمہ لیا ہے باقی انجمنوں میں گلبرگہ کی انجمن بذات خود ایک مرکزبنی ہوئی شاندار پیمانے پر کام کررہی ہے۔ سلطان پورہ کی انجمن غالباً سلطان شاہی کی انجمن سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ مغلپورہ کی انجمن کے معتمد میر تہور علی صاحب کی ہمت پر صد ہزار آفریں ہے کہ موصوف کی مستعدی سے وہ اب تک برابر کام کیے جارہی ہے اور ترقی بھی کررہی ہے انجمن نے اپنا ایک کتب خانہ بھی قایم کیا ہے اس کا کام بھی اطمینان بخش طریقہ پر جاری ہے لیکن جب تک اسکی زندگی میں نئے نئے معاونین کے ہاتھ دلچسپی کے ساتھ نہ بڑھتے جائیں اس کے ابھرنے کی امید نہیں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر کتب خانے کے مہتمم جناب محمد محمود علیخانصاحب نے امداد کیلیے اپیل شایع کی ہے ملکوں کے ارتقا میں اشاعت علم کی بنیادی ضرورت پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے تاہم ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بڑودہ دیسی ریاستوں میں ایک بہت ہی چھوٹی ریاست ہے لیکن وہاں اشاعت علم کے لیے جس قدر نظام مرتب اور مروج ہے اس میں کتب خانوں ہی کو بڑا دخل ہے بڑودہ لائبریری تحریکات خود برطانوی ہند سے بھی پیش پیش ہیں۔ حتی کہ ویسرائے بہادر اپنے گذشتہ دورہ میں ریاست کی طرف سے دعوت کے موقعہ پر مہاراجہ صاحب کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے بڑودہ کی چھوٹی سی ریاست کی وہ تعریف کی کہ یاد ہی رہے گی۔ ہماری اس وسیع مملکت کے مستطیع باشندوں سے توقع ہے کہ وہ مہتمم صاحب کی اپیل پر اخبار کتابوں فرنیچر یا رقم سے غرض جس طرح ممکن ہو کتب خانہ کی مدد فرمائینگے کیونکہ یہ بلدہ کے خانگی کتب خانوں میں ہے جو عوام کی توجہ کی امید میں کام کررہا ہے اور اس طرح کہ دوسرے نام نہاد کتب خانوں کی طرح نہیں۔



ایک راگنی

شاعری اور ترجمانی حیات

از جناب ابو الحامد محمد بشارت علی صاحب فرینئی (کلیہ جامعہ عثمانیہ)

الڈ کی تعریف کے مطابق شعر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔ فطرت انسانی کی تحلیل امر ممکنہ سے نہیں
ں کی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں۔ تعریف اگر ٹھیک ٹھیک ہو جائے تو اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ
ہم کا امکان موجود ہے۔ انسان کے خیالات کے اظہار کے لئے کتم عدم سے بہت سے فنون وجو
ے روپ کے اظہار کے لئے مصوری اور نقاشی آواز اور زبان کی ترجمانی کے لئے موسیقی اور شاعری۔ چونکہ
ی ذہنی اور روحانی ہے اس وجہ سے قدرت کی طرف سے اس میں یہ مادہ رکھا گیا ہے کہ وہ قلب
اعث مسرت اور تسکین دہ ہو اس لئے اس کی عمارت کی بنیاد ایسی مستحکم اور مضبوط ہونی چاہئیے کہ اس
ں نہ ہو۔

اعر سے صحیح معنوں میں وہ مبارک ہستی مخاطب ہو سکتی ہے جس میں مجاز اور حقیقت کے درک و ادراک کا
ا کلام جاذبیت سے مملو ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے مشاہدات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے تو دہی سما
بندھ جاتا ہے اور ہمارے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ شاعری کا مقصد صرف یہی نہیں کہ انسان
کی جھلک پیدا کرے یا یہ کہ جذبات میں پاکیزگی اور حیات تازہ پیدا کر دے یا روح کو جلد اور ضیا بخشے۔
انسانی ہستیوں سے زیادہ قوت تمیز و امتیاز اور احساس رکھتا ہے اور اس کے تجارب عام انسانی
ے اور وسیع ہوتے ہیں۔ اگر بہ امعان نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اسرار حیات
ری ہے۔ اس لئے شاعری کا تمام میٹریل زندگی اور زندگی کے متعلقات میں یہ کوئی ڈھکوسلا یا خیالی
کے نامور شعرا اور نقاد اس کو مانتے آئے ہیں چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

ں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی
کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دیکر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس

جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ، مٹی اور چونے کا، بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین آسمان چاند سورج پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر مکڑی اور جھینگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض وہمی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی اس کی مثال اُس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔[۱]

اور مقدمہ شعر و شاعری میں شرائطِ شاعری کی سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں: ——

اگرچہ قوتِ متخیلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کے معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو، اُسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاصکر نسخۂ فطرتِ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں اُن کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔

مولانا شبلی بھی حالی کے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں: ——

شاعری قوتِ متخیلہ کا انکشاف ہے۔ دراصل یہ وہ فن ہے کہ جس کے ذریعے سے لفظوں کا استعمال کر کے پردہ تصویر پر خیالی نقش و نگار ثبت کئے جاتے ہیں، جو کام مصور رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ کے ذریعہ سے نکالتا ہے۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی ہوئی تصویر اور حسن و حقیقت کی تشریح سے یہ انسانی قلب کے کیفیات کو سریلی زبان کے ذریعہ معترض بیان میں لاتی ہے۔[۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو دیوان حالی دیباچہ ص مطبوعہ انوار احمدی پریس پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ء۔

[۲] مقدمہ دیوان غالب از ڈاکٹر سید محمود نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۳ء

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری بھی شاعری کی جو تعریف کرتے ہیں وہ قابل غور ہے :—

> شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود انکی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ کونسا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔ جمال الٰہی ہر شئے میں رونما ہے آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے ۔ [1]

روحی فداہ آقائے نامدار سرکار دوعالم صلعم عنترہ اور امرء القیس پر ناقدانہ روشنی ڈال کر ان کی شاعری کی جو حمد و ثنا فرمائی ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اشعار کائنات انسان اور انسانی متعلقات سے مملو ہیں۔ ان سے سیاسی ماحول، رسم ورواج، مسرت و غم، عوام کی طرز معاشرت، تروتازہ کی نفسیاتی کیفیات، شجاعت، بہادری، جانبازی، ایثار، اضحام حرب، عشق و محبت کے جذبات غرض یہ کہ فطرت انسانی اور کائنات کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے قدرت کے لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت جس کے وہ خود حصہ دار ہیں تمام انسانی ہستیوں کو جو انکی دنیائے علیہ میں سیر کرنا چاہتے ہیں حصہ دار بنایا ہے۔ بہرحال شاعری درحقیقت تخیل و احساسات کی وساطت سے زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ علی گڑھ میگزین کے قابل مدیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے :—

> علم ادب بالخصوص شاعری کا سب سے بڑا فرض عوام کے ضمیر میں اس نئی دنیا کا مفہوم اور اہمیت واضح اور روشن کرنا ہے جو بقول علامہ موصوف "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرائی ہے" [2]

مولوی ظفر علی خاں نے جنگ طرابلس کے سلسلے میں اقبال کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں وہ شاعری کی کامیابی کا انحصار اسی پر بتاتے ہیں کہ وہ زندگی کی ترجمان ہونے کے علاوہ اقتضائے وقت اور زمانہ کے موافق ہو۔ "گروہ علماء و شعراء میں وہی لوگ کامیاب ہو سکے جو اپنے اقوال کے ذریعہ سے اہل زمانہ کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں"

---

[1] رسالہ خد حیدرآباد ماہ شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ

[2] و [3] ماخوذ از دیباچہ کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق صاحب مددگار صدر محاسب۔

آگے چلکر وہ شاعری کی کامیابی اور بقائے دوام کے لئے پھر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ زمانہ کی رفتار پر نظر رکھی جائے اور اس کے مطابق شاعر اپنے توسن فکر کو گرم جولاں کرے ۔

اس بنیادی اصول کو مدنظر رکھ کر جن شعراء نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور زندگی کو بخوبی سمجھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے وہی دنیا میں باعظمت شاعر کہلاتے رہے ہیں ۔

اوپر ہم نے دو جگہ مولانا حالی کی کتاب سے اقتباسات پیش کئے ہیں ۔ موضوع کی اہمیت کی بناء پر مزید توضیح کے لئے ہم یہاں دو اور مختصر سے اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے اس نظریہ کی اہمیت زیادہ مدلل ہو جائیگی

"اس میں فطرت انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے" اس سے آگے بڑھکر اس کی مزید توضیح یوں کرتے ہیں ۔ "اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے" [۱]

[۲] جارج مورجو انگریزی ادبیات کا بڑا حامی گزرا ہے شاعری کی دو قسمیں قرار دیتا ہے ۔ ایک وہ شاعری جس میں شاعر صرف اپنے جذبات احساسات اور واردات قلبی کا اظہار کرتا ہے ۔

دوسری وہ شاعری جس میں شاعر اپنی قوت متخیلہ سے واقعات و اشیاء کی اصل حقیقت و ماہیت کو زیادہ واضح کر دیتا ہے ۔

اول الذکر شاعری ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں تاثیر رکھتی ہے مگر باوجود تاثیر کے اپنی قلبی واردات و کیفیات کی وجہ سے ایسی شاعری سچی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ یہ واردات قلبی عارضی وجود رکھتے ہیں اور ان کی بساط نقش آب سے زیادہ نہیں ۔ اس لئے ایسی شاعری کو بقا اور عظمت حاصل نہیں ہو سکتی آخر الذکر میں تغیرات اور انقلابات ممکنات سے ہے مگر اشیاء اور واقعات کے استقلال کی بنا پر یہ شاعری ابدی ہو گی ۔ اس میں شک نہیں کہ خیالات کے مدوجزر کے تحت اس میں بھی گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی خاص ملک یا خاص زمانے میں موثر سمجھی جائے مگر اشیاء اور واقعات تعین کی بنا پر شاعری بھی ابدی ہو گی اسی کو ڈاکٹر عبد اللطیف یوں ادا کرتے ہیں :- [۳]

شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کرتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا

---

[۱] دیباچہ دیوان حالی ۔

[۲] ہمایوں بابت جنوری ۱۹۲۸ء

[۳] ملاحظہ ہو :- GHALI BY S. A. LATEF P. H. D. اور مجلہ عثمانیہ بابتہ بہمن وار دی بہشت ۱۳۳۰ف ۔

آئینہ بردار ہو۔ اس پہلو کی ترجمان بجائے خود موثر ہو سکتی ہے اور بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے گھل مل کر اعلیٰ شعر کی صورت میں ٹپک پڑتا ہے۔

متذکرہ امثال اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ شاعری کا براہ راست تعلق زندگی سے ہے گویا اس کی صاف توضیح یہ ہے کہ شاعری کی بیخ و بنیاد زندگی ہے، شاعری کی تخلیق زندگی ہے۔

شاعری کا ارتقا اور عظمت زندگی پر اسی لئے اسرار حیات اور دقائق جو عام طور پر لاینحل سمجھے جاتے ہیں۔ شاعر ان کے حجاب سربستہ رموز کو توڑ کر نوامیس فطرت و حیات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ بہرحال شاعری کسی طور پر بھی زندگی سے بغاوت نہیں کر سکتی اگر وہ انحراف اور بغاوت کرے تو گویا قضا و قدر سے انحراف اور بغاوت ہے جیسے سفر میں منزل مقصود کا حصول مقصد اعظم ہوتا ہے شاعری کا مقصد اعظم یا منزل مقصود زندگی ہے۔

شاعری اور زندگی کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ ہے "قوموں کے بچپن میں اگر ہم کوئی ادب پاتے ہیں تو وہ بھی شاعری ہے جب فن کتابت بطن عدم میں تھا اور صرف حافظہ ہی انسان کے لئے ایک کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس وقت بھی شاعری جلوہ گر تھی اور لوگ سینہ بہ سینہ اشعار یاد رکھتے چلے آتے تھے بلکہ شاعری کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اسے اپنے رسم و روایات اور فضل و ہنر کے سانچوں میں ڈھال لیا۔ اسی جگہ سے یہ خیال چلا ہے کہ شاعری ایک الہامی چیز ہے اور خدائی پیغامات کا مظہر ہے" [1]

انہیں اسباب و علل کی بنا پر شاعر اور شاعری ہمارے اعتماد اور یقین کے مستحق ہیں اور شاعری سے متمتع ہونا عقل و فراست کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ ہماری زندگی ہے اور ایسی زندگی جس کو روحانی زندگی کے نام سے مخاطب کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ ترین رجحانات، ارفع عقائد، پیاری امیدوں، شدید غموں اور مقدس تصورات اسرار حیات اور نکات زندگی کی عقدہ کشا ہے اور یہی ذوق صحیح قاری کے دل و دماغ کو لطیف تحریکات سے ہموار کرتا ہے [2] بقول

اگر الفاظ کے ذریعہ فطرت کے اسرار روز روشن میں لائے جاتے ہوں، روح کی تکلیف دور کی جاتی ہو، پوشیدہ ملال فنا ہو جاتا ہو، ہمدردی کا جذبہ جنبش میں لایا جاتا ہو، نصیحت کے گھونٹ پلائے جاتے ہوں تجربہ کی تاریخ لکھی جاتی ہو۔ ماضی و حال اور مشرق و مغرب ایک رشتہ میں منسلک کئے جاتے ہوں

---

[1] مجلہ عثمانیہ جلد اول شمارہ چہارم بہمن ۱۳۳۷ ف فصلی مضمون شاعری اور حیات انسانی۔

[2] محمد امیر صاحب اورنگ آبادی بی۔ اے۔ بی ٹی۔

تو پھر واقعی شاعری قوموں کی زندگی کا ست ہے۔
شاعری حرکت میں لانے والی قوتوں اور انمٹ یادوں کا خزانہ ہے اور ان انمول خوشیوں کا دلاویز ذخیرہ ہے جو دنیا کے بازاروں میں کبھی بکنے نہ آئی ہوں شاعری اُن لوگوں کے لئے جو نہایت ہی قید اور تکلیف میں ہیں آزادی کا مژدہ اور زندگی کا سانس ہے شاعری غیر فانی ہے اور حادثات سے آزاد" ؎

غزل

(از جناب توفیق الحسن صاحب توفیق ۔ بی ۔ اے علیگ)

گوارا شوق سے ہر ظلم ہر بیداد کر لینا
دلِ رنجور پاسِ خاطرِ صیاد کر لینا

جفائیں ہم پہ جتنی چاہنا صیاد کر لینا
مگر پہلے خیالِ خاطرِ ناشاد کر لینا

یہ بولی گردشِ قسمت قفس میں دل جو گھبرائے
کبھی نالہ کبھی شیون کبھی فریاد کر لینا

قفس میں بھی نظر آجائینگے جلوے گلستاں کے
نظر کو قیدِ محسوسات سے آزاد کر لینا

بہار آئے اگر اے ہمصفیرو صحنِ گلشن میں
اسیرانِ قفس کی بے بسی بھی یاد کر لینا

قفس سے چھوٹ کر آئے نہ آئے کیا خبر ہمیں
تو اب صحنِ گلستاں شوق سے آباد کر لینا

چمن والو اگر میری مصیبت یاد آجائے
تو اک دن شکوۂ بے مہری صیاد کر لینا

نشاط و عیشِ عالم سے اگر فرصت ملے تمکو
تو ذکرِ خیر سے توفیق کو بھی یاد کر لینا

؎ مجلہ مشرقیہ جلد اول شمارہ چہارم بہمن ۱۳۳۳ ف مضمون شاعری اور حیات انسانی ص ۱۸۱

محبت کی فتح

(از جناب مسعود الرحمٰن صاحب ندوی)

خلیق الزماں صوبہ مدراس کے نہایت کامیاب و مقتدر طبقۂ وکلاء میں تھے وہ عرصہ تک بسلسلۂ تعلیم ممالک یورپ میں رہے اب عرصہ سے یو۔پی۔ کے مشہور شہر اور ہندوستان کے واحد دار العلم علی گڈھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ مغربی و مشرقی تہذیب و تمدن کے کامیاب نمونہ تھے۔ اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جو بغرض تعلیم یورپ گئے۔ اُن کے سوائے ایک لڑکی منصور کے اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ اردو فارسی کے علاوہ منصور کو انگریزی کی ضروری تعلیم بھی دی گئی تھی۔ لڑکیوں کے سلسلہ مناکحت کے بارے میں وہ کسی قدر وسیع خیال رکھتے تھے وہ زبردستی کے رشتہ کے بہت سخت مخالف تھے۔ گھر میں چونکہ ایک بچی تھی لہذا سب کی محبت کا مرکز تنہا وہی تھی نیز اپنے حسن ظاہری اور سلیقہ و تہذیب کے لحاظ سے بھی منصور انتہائی محبت کئے جانے کے قابل تھی۔

"آہ ــــ کشوری! میں اس دل کو کیا کروں۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ یہ سنبھل جائے مگر کمبخت کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔"

مذکورہ بالا الفاظ منصور نے اپنی ماما سے کہے وہ ایک صوفے پر بیٹھی گردن جھکائے ڈوپٹے کے پلو کو توڑ مروڑ رہی تھی

بی بی ــــ آپ کہاں ہیں یہ بچپن کی باتیں چھوڑئے جو شخص صرف چار یوم کا مہمان ہو اور اس کے حالات کا کسی کو علم نہ ہو وہ کہاں تک ان نوازشات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اور پھر بجائے خود بڑی حد تک ہر وقت دیوانگی کے اثرات اس پر قائم" کشوری نے کہا اور کہکر بنظر غائر منصور کو دیکھنے لگی۔ "کشوری تم کیا جانو میں اس کے اس انداز دیوانگی و محویت کی قتیل ہوں۔ ہائے ان جذبات سے تم کو کیونکر باخبر بناؤں جو سینہ کو اندر ہی اندر سلگا رہے ہیں اور جن کی تپش سے میں اپنے تمام جسم کو سخت اذیت میں مبتلا پاتی ہوں۔ میں جسقدر اس دیوانے کی شکل کو بھولا دینے کی کوشش کرتی ہوں وہ اور میرے لئے مصیبت ہوئی جا رہی ہے۔ آخر اس آزار سے پناہ و دوری کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔

...... اب میں اس نتیجہ تک پہونچی ہوں کہ تم ان تک میری تحریر پہنچا دو آیندہ میری قسمت جسقدر جو کچھ دکھلائے دیکھنا اور سہنا پڑیگا۔" منصور نے کہا اور بادیدۂ پرنم کشوری کو دیکھا۔

احمد دوپہر کو خلیق الزماں صاحب کی کوٹھی واقع متصل نمائش گاہ لیٹا ہوا اپنے خیالات میں منہمک تھا کہ اتنے

میں کشوری پہونچی اور خاصدان دیکر چلی گئی خاصدان سرکایا احمد کو حیرت ہوئی کہ پانوں کے نیچے ایک تحریر موجود ہے۔

"آپ کیوں اسقدر ظلم و تشدد کے خوگر ہیں۔ یہ عادت تو احسن نہیں اگر فرصت ہو ——— تو
نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں "

احمد (بمبئی یونیورسٹی کا لائق گریجویٹ) پہلے ہی سے کسی ادارہ محبت کی تلاش میں سرگرداں و پریشان پھر رہا تھا۔ اس تحریر کو پڑھ کر زار و قطار رونے لگا۔ احمد نے سکون پانے پر پھر تحریر کو بغور پڑھا وہ اپنے قلب و دماغ میں سوائے ایک خیال کے کسی دوسرے کے خیال کو دخیل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

مگر اس تحریر سے متاثر نہ ہونا بھی اس کے لئے ایک سخت آزار تھا۔ پرچہ کی پشت پر اس نے یہ شعر لکھا۔

"ریاضؔ دہر میں ناآشنائے بزم عشرت ہوں　　　　خوشی روتی ہے جسکو میں وہ محروم مسرت ہوں"

کشوری نے پرچہ احمد سے لے جا کر منصور کو دیدیا منصور ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ نہایت فہیم و ذکی حسن صورت کے ساتھ فطرتاً شاعرانہ مزاج و جذبات لطیف کی حامل عنفوان شباب کے ناقابل ضبط جوش سے مست و بے قابو یہ سب اسباب یونہی اوسکی تباہی و بربادی کے لئے کیا کم تھے کہ دفعتاً احمد جیسے نوجوان کا حسن سحر کار منصور کی تباہی کا بہانہ بن گیا منصور کا نازک دل و دماغ اس حادثہ کا کب متحمل ہوسکتا تھا گھر بیٹھے اس کو ایک حیلہ ہاتھ آگیا اور وہ مزے لیکر تڑپنے لگی۔ وہ محبت کو اپنے نقطۂ نظر سے ایک سرور و انبساط سمجھا کی اس کو کیا خبر تھی کہ محبت صرف ایک جذبۂ پسندیدگی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک پر کیف و خاموش آزار پر سکون خلش۔ اک جان کو گھلا دینے والی لیکن وجدانی کیفیتوں سے بھر دینے والی تپش کا نام محبت ہے جس وقت تک اس نے احمد کو نہیں دیکھا تھا وہ اس کو ایک خوبصورت شے سمجھکر متاثر ہوتی مگر جب احمد پر نگاہیں پڑیں تو منصور احمد کو سخت ظالم و دل آزار سمجھنے لگی وہ بار بار سوچتی کہ آخر یہ کیا تھا کہ جب احمد باغ میں مصروف خرام ہوتا تو میرا دل یہی چاہتا کہ میں اپنا دل اس کے قدموں کے نیچے ڈالدوں گھنٹوں احمد سکوت و محویت کے عالم میں باغ میں ٹہلا کرتا حوض پر بیٹھکر چھڑی سے سرخ سرخ مچھلیوں کے ساتھ کھیلتا کبھی کبھی شیروان کی جیب میں سے کوئی چیز نکال کر مچھلیوں کو ڈالتا پایا ہیٔت کذائی کہ اس کی پیشانی پر گھونگر دار بالوں کے لچھے آجاتے شروان کا گلا کھلا ہوا کبھی کبھی باریک تنزیب کے کرتے کا گلا بھی چاک منصور دیکھا کرتی اور احمد کبھی گھنٹوں بیٹھے دیکھا کرتی معلوم نہیں وہ فطرتاً اس افتاد طبیعت کا انسان تھا یا یہ وقتی ہیجان تھا پورے ایک ہفتہ تک مسلسل غور و فکر کے بعد منصور نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر زندگی اور زندگی بھی مسرت و شادمانی سے لبریز حاصل کرنا ہے تو پھر احمد کو شریک زندگی بنانا چاہئے ورنہ جینے کا لطف نہیں منصور فطرتاً بہت مضبوط عزم

وارادہ کی مالک تھی اس کا خیال تھا جس پر وہ بہت مضبوطی سے قائم تھی کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی کا فیصلہ کریں اور یہی وجہ تھی جو اس نے ایک مختصر تحریر خاصدان میں رکھ کر احمد کو روانہ کر دی تھی وہ صرف یہ جانتی تھی کہ احمد بمبئی پریسیڈنسی کالاق گریجویٹ اور اس کے والد کا مہمان ہے اس سے زیادہ اسے کچھ علم نہ تھا پرچہ کا جواب ایک شعر کے ذریعہ دیا گیا اس نے ذرا جرأت سے کام لیکر مفصل تحریر لکھی

"احمد صاحب۔ طرز مخاطبہ کی معافی۔ آپ نے میرے لئے کیوں سامان ہلاکت وبربادی پیدا کئے آخر یہی تو ہے؟ مسافروں کا کیا آج یہاں کل وہاں

اک جا رہتے ہیں عاشق بد نام کہیں

....

آپ "محروم مسرت" کیوں ہیں "دہر" کی شکایت آپ جیسے خوش قسمت شخص کو جائے حیرت و استعجاب ہے آپ نے سارے سامان تپش واضطراب کیوں مہیا کیا اسکی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی؟ پھر اس پر طرہ یہ کہ ہم مسافر اور "ریاض دہر" میں "محروم مسرت" ہیں آپ ہمیشہ یہاں رہنے کے لئے تشریف نہیں لائے یہی تخیلات ہیں جس کی وجہ سے میں سخت پریشان وسراسیمہ ہوں۔

تھوڑی سی بھیک مانگتی ہوں۔ عنایت ومحبت سے چند لمحات اور اک غریب ومہجور درد مند محبت کی بپتا چند منٹوں میں سن لو۔ خدا تم کو اس کا اجر دیگا۔

مہجور منصور

احمد مذکورہ تحریر کو پڑھکر دنگ رہ گیا منصور کی جرأت بیباکی سے وہ متاثر نظر آتا تھا مگر اس کے مذہب میں صنف نازک کے کسی فرد کی دل آزاری بھی جائز نہ تھی اس نے اسی اصول پر غور کرتے ہوئے منصور کی تحریر کا حسب ذیل جواب دیا

"آپ کا بیتاب نامہ ملا۔ نوازشات کا مشکور مسافر نوازی کا ممنون۔ آپ کے خط میں واقفیت ہو یا نہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے لئے اس میں سامان جراحت بہت کافی ہے۔ اگر میری وجہ اور اس غریب کی موجودگی آپ کے لئے سبب آزار وتکلیف ہوئی تو للہ اس کو معاف کر دیجئے میری رام کہانی بہت ہی دردناک ہے میرا یہاں اجنبیانہ قیام کسی ہستی کی تلاش وجستجو کا حامل ہے جس کی اک اک ادا پر میں اپنی کل ہستی فروخت کر چکا ہوں اب اس میں میرا کیا یہی مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے میں شاید آپ کے لئے باعث کلفت ثابت ہوا۔

آپ کی محبت سر آنکھوں پر محبت میری نزدیک نام ہے ہر اک بے غرض انہماک اک خود فراموشی

محویت کا اور اس میں میرے لئے راحت و آرام ہے ۔ اس لذت کی ہلاہل آپ سے کیا بیان کروں آپ کے لئے یہ مقام بالکل اجنبی ہے ۔ خدارا اس خار دار سے اپنے دامن کو بچائے آپ جیسی نازنین اور یہ دشوار پسندی ۔ راہ محبت ۔

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں ۔

مجھے توقع ہے کہ آپ نے میری تحریر سے کوئی غلط راہ قائم نہیں کی ہوگی ۔ آپ کی جملہ عنایتوں و احسانات کا مشکور ۔

احمد

تحریر کو پڑھکر منصور کو انتہائی اذیت ہوئی اُسے قطعی توقع یہ تھی کہ احمد جیسا وارفتہ مزاج نوجوان اس کے جذبات کو یوں ٹھکرا دیگا ۔ منصور نے صرف احمد سے یہ کہا تھا کہ چند لمحات دیدیجئے وہ صرف اس خواہش کو لئے ہوئے ہے کہ اگر ایک بار احمد سے لطف ہمکلامی حاصل ہوگیا تو دشوار ہے کہ ایسے منظر کو احمد جیسا رفیق القلب انسان دیرتک برداشت کرسکے "محبت کرنے والا چاہتا ہے کہ محبوب کی زندگی کو بھی اپنی زندگی کی طرح تباہ کردے ۔ محبوب خود اپنی بربادیوں میں معین ہوجاتا ہے ۔ اس لئے محبت مہلک ترین نفرت ہے وہ شخص جس سے براہ راست نفرت کیجائے اپنی ہستی کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن محبت کی فریب کاریاں انسان کو خود اپنی ہلاکتوں پر مجبور کردیتی ہیں ۔ وہ ہر دل جو حسن سے متاثر ہوتا رہتا ہے خود اپنی ہستی سے مطمئن نہیں رہ سکتا ۔ اس کی انفرادیت کا اضمحلال اس کا باعث ہے کہ اسے دوسری ہستیاں اپنے وجود سے اہم تر نظر آتی ہیں ۔ رفتہ رفتہ جذبات محبت کسی خاص محبوب کے محتاج نہیں رہتے ۔ بلکہ اک جذبۂ مخصوص طاری ہوجاتا ہے" اور یہی اصلی محبت کا مآل ہے ۔ عورت عشق و محبت کے پیچیدہ مراحل میں بہت جلد نتیجہ حاصل کرلیتی ہے وہ خود جب کسی کو چاہتی ہے تو اس کا دل اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ میں جس سے محبت کرتی ہوں وہ بھی مجھے چاہے اسی نظریہ کا ماحصل تھا جو اس نے احمد کو تحریر میں ظاہر کیا اسے یقین تھا کہ ایک بار گفتگو کے بعد احمد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ منصور سے تغافل برتے منصور نے کسی ناجائز و خلاف اخلاق امر کی جانب احمد کو دعوت نہیں دی تھی بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ جائز طور پر اپنی ہستی احمد کے قدموں میں ڈالدے ۔

احمد نے منصور کے خط کا جواب جس انداز میں دیا تھا اس پر وہ دیر تک غور کرتا رہا وہ اب طرح طرح کے خدشات میں مبتلا و خراب نظر آتا تھا اس کو علی گڈھ آتے ہوئے تقریباً پندرہ دن ہوگئے وہ اپنے اوپر نفریں کررہا ہے کہ یوں اس قدر دن فضول اپنے علی گڈھ میں گنوائے تعلیم کا حرج علیحدہ گھر والوں کی پریشانیاں جدا اس کی روح کو

اذیت پہونچا رہی تھیں۔ اور پھر منصور کے نئے حادثے نے اس کی عقل کو خرچ کر دیا تھا وہ خاموشی سے ان حادثات پر غور کر رہا تھا کہ ملازم نے خلیق صاحب کا لفافہ لا کر پیش کیا جس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"عزیز احمد　　۔ تم اس عدیم الفرصتی کو نظر میں رکھتے ہوئے مجھے معاف کرو گے کہ میں زیادہ وقت تمہارے پاس نہ گذار سکا تمہاری شرافت و قابلیت تمہاری سنجیدہ اطوار و عادات نے گھر بھر کو تمہارا گرویدہ بنا رکھا ہے اب تمہاری جدائی کسی پہلو بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔

اک خاص معاملہ میں تمہاری توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ تمہاری سعادت مندی اور ان تعلقات کی بنا پر جو تم نے چند روز میں حاصل کر لئے ہیں اس کی جرأت ہوئی۔ میری لڑکی منصور جس کے لئے میں تم سے زیادہ پسندیدہ نوجوان نہیں پا سکتا چاہتا ہوں کہ اس کو تمہاری خدمت کے کے لئے پیش کر دوں تمہارے طرز عمل سے مجھے امید و توقع ہے کہ تم میری اس جائز خواہش کو رد کر کے میرا دل نہ دکھاؤ گے اور اس معاملہ خاص میں جو شبہات تمہارے دل میں ہوں ان کو تم بذریعہ نظر جلد صاف کر لو گے۔

مخلص خلیق

تحریر پڑھکر احمد کی حالت متغیر ہو گئی واقفات سے پردہ اٹھ گیا دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا سگرٹ کو کبھی جلاتا کبھی بجھاتا وہ مجنونانہ حرکات میں محو کسی بڑے اہم مسئلہ پر غور کناں نظر آ رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے تخیلات میں محو ہی تھا کہ دروازہ کا پردہ متحیر کو نظر آیا اور ایک ذی روح ہستی سر تا پا برقع میں ملبوس سامنے آ کر رک گئی اس نے بڑا کوشش کیا کہ یہاں سے نکل بھاگے اب برقع کس کے چہرے سے علیحدہ تھا یہ منظر دیکھکر احمد کرسی پر گر پڑا اس کا سر چکرا رہا تھا آنکھیں پتھرا گئیں وہ بالکل از خود رفتہ تھا۔ سچ ہے کہ محبت اک آسمانی شعاع ہے جو انسانی عقل کو خیرہ کر دیتی ہے یہی حال منصور کا احمد کی محبت میں ہوا جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ آدھ گھنٹہ کی اس خاموشی کے بعد احمد ہوش میں آیا وہ جلد سے جلد اس مقام کو چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر مجبور تھا منصور کا برقع جسم سے جدا تھا وہ احمد کے قدموں میں سر رکھے بیٹھی تھی احمد منصور کی اس حرکت پر دل میں سخت نادم و منفعل تھا وہ خاموش تھا کہ اس سین کا کیا انجام ہونے والا ہے منصور کے آنسوؤں سے احمد کے پاؤں تر اور نظر آتے تھے احمد جیسا رقیق القلب انسان ایسے دردناک منظر کو کب تک برداشت کر سکتا تھا اٹھا منصور کو ہاتھ لگا کر قدموں سے جدا کرنا تھا کہ منصور احمد کے آغوش میں تھی اور بیہوش زانو پر سر رکھکر احمد وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھوڑے عرصہ میں ہوش آیا احمد نے کہا "آپ کیوں میری

بربادی کے درپے ہیں منصور کو اب ہوش آچکا تھا منصور کو نہ اپنے ناموس و عزت کا خیال تھا اور نہ اس بے بردگی کا وہ بالکل مبہوت تھی اور اپنی زندگی کا فیصلہ سننے کے لئے بیتاب۔ احمد اس سکر آمیز شباب کشیدہ قامتی اور محبت سے بڑی حد تک موم ہوچکا تھا آخرالامر اس نے دل پر جبر کر کے منصور سے پوچھا "آپ اس غریب الدیار شخص سے کس امر کی متمنی ہیں"۔

اس گفتگو و انداز مخاطب کو سنکر منصور کے چہرے پر آثار شگفتگی پیدا ہوی وہ بہت سنبھلی ضبط کیا بے اختیار ہوکر احمد کو لپٹ گئی دیر تک روتی رہی اب وہ کامیاب تھی احمد زخمی ہوچکا تھا اور مجبور و مایوس ہوکر منصور کے قدموں میں نظر آتا تھا۔ وہ منصور کے عالم آشوب حسن سے مسحور ہوچکا تھا اب سوائے اقرار کے اس کے لئے کوئی چارا نہیں تھا۔ منصور کی ہر خواہش پر لبیک کہنا اب اس کا فرض عین تھا۔

احمد بڑی حد تک اپنے آپ کو مضبوط دل و دماغ کا انسان سمجھتا تھا مگر یہ اس کے شباب کا فریب اور جوانی کا دھوکا تھا۔ وہ ہمیشہ امادہ ہلاک نظر آتا اس کے زخم کو صرف ذرا سے نشتر کی ضرورت تھی جو منصور کی تھوڑی سی توجہ میں حاصل ہوگیا۔ پہلے منصور کو اپنے سینہ و شانہ کی عریانی کی مطلق پروانہ تھی اور اب وہ اپنے ہاتھ بھی احمد کو دکھلانا پسند نہیں کرتی تھی۔

محبت کا تعلق روح سے براہ راست ہے تعلق ازدواج میں مبتلا ہوکر بھی اس میں وہی لطافت باقی و ساری رہتی ہے احساس مند دل و دماغ صرف اس کی لطافت و نزاکت ہی میں سرشار رہنا سرمایہ زندگی سمجھتے ہیں محبت اک قسم کی خوشبو ہے جس کا پوشیدہ رہنا ناممکن ہے۔

صبح کو احمد جب سو کر اٹھا تو بجائے مردانے کے زنانے میں اپنے آپ کو پایا منصور اس کے پہلو میں تھی اب وہ ایک غریب الوطن مایوس قسمت نوجوان احمد نہ تھا بلکہ حسین منصور کا چہیتا شوہر اور خلیق الزماں کا عزیز داماد بھی تھا۔ یہ ہے دراصل "محبت کی فتح"

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست — وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورشید ست
بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست — نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست

(✿)

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے)

بسلسلہ سابقہ

(۲)

انگریزوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی محنت کا جوش اور شوق ہے تاریخ ماضیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں نیز موجودہ زمانہ میں بھی مثل سابق ان میں یہ صفت خاص طور پر پائی جاتی ہے سلطنت برطانیہ کی اساسی اور صنعتی برتری انگلستان کے عوام (COMMONS.) کی اسی جوش سے قائم ہوئی اس قوم کو جو زبردست ترقی حاصل ہوئی ہے وہ خاصکر افراد قوم ہی کی ازادانہ محنت کا نتیجہ ہے او رکاشتکاروں مفید آلات اور مشینوں کے موجدوں صناعوں یا فن کاروں نے ہی اپنی دماغی اور جسمانی محنت سے قوم کو بنایا ہے محنت کا یہ جوش اس قوم کا اصل اصول یا مطمح نظر ہی نہیں رہا بلکہ اس کا محافظ اور مصلح بھی بنا رہا اور اس سے وقتاً فوقتاً ان کے قوانین کے اغلاط اور دستور کی خامیاں دور ہوئیں۔

ین پی (N.P.) قوم نے محنت کو جو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا وہ اس کی مناسب اور بہترین تعلیم ثابت ہوا جسطرح تن دہی اور جانفشانی کی محنت سے ہر فرد کی مفید تربیت ہوتی ہے اسی طرح ریاست کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ محنت اور مفوضہ کام کی انجام دہی ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور قدرت نے ہر دو کا ثمرہ مسرت و شادمانی مقرر کیا ہے ایک شاعر کا قول ہے کہ خدا نے محنت کو اس راہ پر رکھا ہے جو (ELYSIAN FIELDS) کو جاتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ انسان جو روٹی اپنی ذاتی محنت سے پیدا کرتا ہے اس کے مماثل کوئی روٹی خوش ذائقہ نہیں ہوتی محنت ہی سے انسان کو زمین پر قابو حاصل ہوا اور وہ جہالت کے غار سے نکلا ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب انسانی میں محنت کے بغیر ذرا بھی ترقی نہیں ہوئی محنت صرف ایک لازمہ اور فرض ہی نہیں بلکہ ایک برکت ہے صرف کاہل وجود انسان ہی اس کو برا سمجھتے ہیں محنت ابتدا ہی سے انسان کے رگ و پے۔ دست و بازو اور دماغ میں لکھدی گئی ہے بالفاظ دیگر یہ کہ محنت انسان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اس کی گھٹی میں پڑی ہے اور دماغ اور دست و بازو کی باقاعدہ محنت سے اطمینان قلب اور مسرت حاصل

ہوتی ہے محنت کی درس گاہ میں بہترین عملی دانشمندی سکھائی جاتی ہے اور محنت مشقت کی زندگی بھی جیسا کہ ہمیں آگے چلکر معلوم ہوگا اعلیٰ درجہ کی دماغی قابلیت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ہیو ملر جس سے بڑھکر محنت کی قوت اور کمزوری کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اپنا تجربہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ محنت شاقہ میں بھی انسان کو فرحت حاصل ہوتی ہے نیز اس سے ذاتی ترقی میں مدد ملتی ہے وہ ایمانداری کی محنت کو بہترین معلم اور محنت کی درس گاہ کو اعلیٰ ترین درس گاہ سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محنت ہی کی درس گاہ وہ مقام ہے جہاں انسان کو کارآمد بننے کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ آزادی کا سبق سیکھتا اور دلیرانہ محنت کا خوگر بنتا ہے۔ ہیو ملر کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک میکانک کی تعلیم یعنی اصلی اور عملی اشیاء کا روزمرہ سابقہ اور انسانی زندگی کا ہر تجربہ جس سے اس کے ذاتی جوہر ظاہر ہوتے ہیں میکانک کو سفر زندگی کو آسانی سے طے کرنے کے زیادہ اہل بنا دیتا ہے اور حقیقت میں اس کی ترقی میں کسی اور تعلیم و تربیت سے زیادہ ممد و معاون اور موزوں ہوتا ہے۔

بعض ادنیٰ اشخاص نے جو معمولی صناعوں سے تھے مختلف شعبہ جات زندگی مثلاً سائنس، تجارت، علم و ادب، فنون میں شہرت حاصل کی۔ ایسے ہی اشخاص کے حالات سے جن کا اس کے قبل سرسری طور پر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مفلسی تنگدستی اور محنت سے جو مصائب پیدا ہو جاتے ہیں وہ کسی صورت میں ناقابل عبور نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے ایجادات اور کارہائے نمایاں جن سے قوم کو زبردست قوت اور دولت حاصل ہوئی ان کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ایجادات کا بڑا حصہ معمولی انسانوں ہی کی [illegible] کا نتیجہ ہے جن کے سبب ہم ان کے احسانمند ہیں۔ اگر شعبہ ایجادات سے ان کی کارگذاریوں کو [illegible] کر دیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ حقیقت میں قوم کے [illegible] میں دیگر اشخاص کا بہت تھوڑا دخل رہا ہے

بعض [illegible] سے دنیا میں بڑی بڑی صنعتوں کی بنیاد ڈالی اور انہیں چلا کر یا سوسائٹی اپنے اکثر بڑے بڑے احتیاجات، عیش و آرام اور آسائشوں کی وجہ ان کی رہین منت ہے اور انہیں کی محنت اور قابلیت کا نتیجہ ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی ہر بات میں زیادہ آسان آرام دہ اور خوشگن ہو گئی ہے ہماری غذا، لباس، فرنیچر، شیشہ جن سے [illegible] روشنی داخل ہوتی اور ہم سردی سے محفوظ رہتے ہیں گویا جس [illegible]

وجہ خوش حال ہے اور ان سے انفرادی مرفہ حالی اور قومی آسائش میں اضافہ ہونے سے انسان دن بدن ان کے فوائد سے مستفید ہو رہے ہیں۔

بن بی بخاری انجن کی ایجاد جس کو تمام ایجادوں کا بادشاہ کہنا چاہیے ہمارے زمانے کی ہے لیکن اس کا خیال صدیوں قبل پیدا ہو چکا تھا دیگر ایجادات و انکشافات کی طرح اس میں بھی بتدریج ترقی ہوئی ایک شخص کی محنت مشقت کے ثمرات جو اس وقت بالکل غیر مفید معلوم ہوتے تھے اس کے جانشینوں تک منتقل ہوئے جانشینوں نے ان ثمرات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی کوشش سے اس میں تھوڑا اضافہ کیا اس طرح اس تحقیق کی تکمیل کئی نسلوں تک جاری رہی چنانچہ ہیرو آف الگزنڈریا کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا وہ کبھی فراموش نہیں ہوا بلکہ تخم گندم کی طرح مصری ممی کے ہاتھ میں پوشیدہ رہ کر نشو نما پایا اور بالآخر عصر جدید کی سائنس کی پوری روشنی میں ظاہر ہوا۔ نظریہ اور اصول کی حد سے آگے بڑھنے اور میکانکوں کے ہاتھ میں عملی طور پر استعمال ہونے سے قبل بخاری انجن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب مشین صبر و استقلال۔ بیان تو تحقیق مشکلات اور ان پر دلیرانہ مشقت سے غلبہ کی کیسی شاندار نظیر پیش کرتی ہے۔ انسان میں خود اعتمادی کی جو قوت ہے یہ مشین اس کا ایک مجسم مظاہرہ ہے اس مشین کی تکمیل میں حسب ذیل افراد نے حصہ لیا۔

فوجی انجینیر سادری ڈارٹمت کا آہنگر نیوکومن (GLAZIER) کاسلے انجن کا ملازم پاٹر سعول انجینیر اسمیٹن اور سب سے زیادہ (MATHEMATICAL INSTRUMENT) بنانے والا [illegible] مستقل مزاج [illegible] جیمس واٹ بلا کا جفاکش آدمی تھا اس کی زندگی کے حالات تجربہ سے اس بات کا ثبوت [illegible] ہے کہ زبردست قدرتی طاقت اور صلاحیت رکھنے والا شخص بڑے کام نہیں کر سکتا بلکہ وہ شخص [illegible] کر سکتا ہے جو اپنی قوتوں کا بلاکی جفاکشی اور باقاعدہ مندی سے بہتر استعمال کرتا ہے۔ [illegible] اور تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے زمانہ کے بہت سے اشخاص [illegible] زیادہ معلومات رکھتے تھے لیکن اپنے معلومات کو عملی جامہ پہنا کر مفید بنانے میں واٹ نے جو جانفشانی سے کام لیا ایسا کسی نے نہیں کیا سب سے زیادہ حقائق کی تلاش میں واٹ نہایت مشغول دماغ رہتا تھا واٹ نے استقلال کو ہاتھ سے [illegible]

[illegible]

[illegible] کی قوتوں سے زبردست ثبوت [illegible]

بن پی، بچپن ہی سے واٹ کو سائنس سے سابقہ پڑا کیونکہ وہ سائنٹیفک کھلونوں سے کھیلا کرتا تھا۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ باپ کی بجاری کی دوکان میں جو (QUADRANTS) پڑے رہتے تھے وہ اس کی (OPTICS) اور علم ہیئت کی تعلیم کا باعث ہوئے اور خرابی صحت نے اس کو (PLYSiSLOiGY) کے اسرار کی چھان بین کی ترغیب دی اور جس وقت وہ تن تنہا شہر میں تفریح کیا کرتا تھا اس وقت اس کی توجہ علم نباتات اور تاریخ کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئی جن ایام میں وہ (MATHEMATICAL INSTRUMENT) بنانے کا کام کیا کرتا تھا اس کو ایک موسیقی آلہ بنانے کا آرڈر ملا اگرچہ اس کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے علم (HARMOMICS) کا مطالعہ کرکے کامیابی کے ساتھ آلہ تیار کیا۔ اسی طرح جب جامعہ گلاسگو کے نیوکومن کے تیار کردہ بخاری انجن کا چھوٹا نمونہ مرمت کی غرض سے واٹ کے ہاتھوں میں دیا گیا اس نے حرارت بخار اور (CONDENSoFiAN) کے متعلق اس وقت تک جو کچھ انکشافات ہو چکے تھے ان کا مطالعہ شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ میکانکس اور مشینوں کی ساخت کے علم کے مطالعہ میں بھی مصروف رہا۔ واٹ کی ان مصروفیتوں کے نتائج آخر کار (CONDENSING) بخاری انجن کی شکل میں نمودار ہوئے۔

بن پی، دس سال تک واٹ نئی ایجادوں کی دھن میں لگا رہا۔ اس عرصہ میں اس کو مسرت کی کوئی توقع نہ تھی نیز اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے احباب بہت کم ہے اس پر بھی وہ اپنا کام جاری رکھا اور (QUADRANTS) کی تیاری و فروخت۔ مختلف موسیقی آلات کی تیاری و درستی۔ تعمیری کام اور سڑکوں کی پیمائش۔ نہروں کی تعمیر کی نگرانی یا دیگر مفید کام کے ذریعہ وہ اپنے خاندان کی پرورش کرتا رہا آخر کار واٹ کو برمنگھم کے میتھو بولٹن جیسا شخص جو ایک باہنر ہوشیار محنتی اور دوربین آدمی تھا او جس نے (CONDEN-CING ENGINE) کو مروج کروانے کا بیڑا اٹھایا تھا ہاتھ بٹانے کے لئے مل گیا ان دونوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اس وقت ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بن پی، کئی ماہر موجدوں نے وقتاً فوقتاً بخاری انجن میں اپنی کوشش سے جدید قوت کا اضافہ کیا اور بہت سے اصلاحات کرکے اس کو قریب قریب تمام اغراض صنعت مثلاً سواری۔ کل جہاز رانی۔ باربرداری غلہ کی پیسائی۔ طباعت کتب۔ سکہ سازی اور لوہے کو پیٹنے صاف اور درست کرنے کے قابل بنا دیا۔ مختصر یہ کہ اس کو ہر میکانکی کام کے جس کے لئے قوت درکار تھی قابل بنا دیا۔ انجن میں جو مفید اصلاحات

ہوئے ان میں کی ایک اصلاح (TREVITHICK) کی مجوزہ تھی جس کو آخر کار جارج سٹیفن اور اس کے بیٹے نے ریلوے انجن کی شکل میں تکمیل کو پہنچایا ریلوے انجن کی ایجاد سے بہت سے اہم اور ضروری سماجی انقلابات رونما ہوئے اور انسانی تہذیب و ترقی کے لئے بلحاظ نتائج واٹ کی ایجاد کردہ (CONDENSING ENGINE) سے زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوئے ۔

ین، پی، واٹ کی ایجاد کا پہلا عظیم الشان نتیجہ جس سے صناعوں کے قبضہ میں غیر محدود طاقت آ گئی صنعت کپاس کی ایجاد تھی صنعت کی اس زبردست شاخ کی بنا کا تعلق سر رچرڈ آرکسرائٹ سے ہے جس کی عملی قوت اور قابلیت اس کی میکانیکل قوت ایجاد سے زیادہ قابل تعریف تھی۔ آرک رائٹ کی ذاتی قوت ایجاد پر بھی واٹ اور اسٹیفن کی طرح اعتراض کیا گیا ہے واٹ کو بخاری انجن اور اسٹیفن کو ریلوے انجن سے جو تعلق تھا آرک رائٹ کو پارچہ بافی کی مشن سے وہی تعلق تھا۔ اگرچہ برمنگھم کے لیوس پال نے آرک رائٹ سے ۳۰ سال قبل بیلنوں کی پارچہ بافی کے طریقہ کو (PATENT) کرایا تھا لیکن اس کی تیار کردہ مشن اس قدر ناکمل ہے کہ ان سے اطمینان بخش طریقہ پر کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور ایجاد عملی حیثیت سے ناکام ثابت ہوئی تھی۔ مشن کے متعلق جو منتشر معلومات تھے واٹ نے انہیں فراہم کیا اور اپنی کوشش سے ان میں اضافہ کر کے مشن کو ایک جدید اور اصل کل کی شکل میں تیار کر دیا ۔

ین، پی، موجدوں کے ذریعہ پر صنعتی احتیاجات کا جب کبھی زبردست اثر پڑتا ہے تو اس وقت عموماً اکثر اشخاص کے دماغوں میں ایک ہی خیال سمایا رہتا ہے چنانچہ بخاری انجن سیفٹی لمپ تار برقی اور دیگر ایجادات کی حالت بجنسہ ایسی ہی ہے بہت سے ناقابل دماغ کسی ایجاد کی فکر میں مصروف رہتے ہیں لیکن آخر کار ایک قابل دماغ اور عملی قابلیت والا شخص میدان میں آ کھڑا ہوتا اور ایجاد کو اپنے ہاتھ میں لیکر اصول کو اس پر منطبق کرتا ہے اور اس کی کوشش سے ایجاد مکمل ہو جاتی ہے جوں ہی ایجاد پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے تمام معمولی موجدوں کے حلقہ میں اس کا بڑا چرچا شروع ہو جاتا ہے وہ اس ایجاد کی دوڑ (شرط) میں اپنے آپ کو نیچے پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ واٹ اسٹیفنسن اور آرک رائٹ جیسے اشخاص کو کامیاب موجد ہونے سے جو شہرت اور حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے

ین، پی، اکثر بڑے اور مشہور انگریز میکانکوں کی طرح رچرڈ آرک رائٹ بھی معمولی گھرانے کا آدمی تھا سنہ ۱۷۳۲ء میں بمقام پرسٹن پیدا ہوا اس کے والدین نہایت مفلس تھے اور ماں باپ کے تیرہ بچوں میں آرک رائٹ سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے کبھی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی بمشکل نوشت و خواند کر سکتا تھا بچپن میں وہ ایک اصلاح ساز کے ہاں کار آموز کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اصلاح سازی کا کام سیکھنے کے بعد اس نے بمقام بولٹن اپنی ذات پر

اصلاح سازی کا کام شروع کیا یہاں اس نے ایک چھوٹا حجرہ کرایہ پر لے رکھا تھا جس پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔
''اصلاح ساز کے ہاں تشریف لائے۔ صرف ایک پنس میں اصلاح بنائی جاتی ہے'' اس کا اثر یہ ہوا کہ
دیگر اصلاح سازوں کے پاس بہت کم گاہک آنے لگے جس کی وجہ انہوں نے بھی آرک رائٹ کی طرح ایک پنس میں
اصلاح بنانا شروع کیا اس پر آرک رائٹ جس نے اپنا کاروبار چلانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا یہ اعلان کر دیا کہ
''نصف پنس میں اصلاح بنائی جاتی ہے''۔

چند سال کے بعد اس نے اصلاح سازی کا کام ترک کر کے بال فروش بن گیا اس زمانہ میں (WIGS) پوشی کا رواج تھا اور (WIG) سازی اصلاح سازی کی ایک خاص شاخ سمجھی جاتی تھی آرک رائٹ (WIGS) کے لئے بال خریدنا شروع کیا لانبے بال حاصل کرنے کے خیال سے وہ لنکا شائر کے بال فروشی کے تمام میلوں میں جایا کرتا تھا جن میں عورتیں لانبے بال خریدنے کی غرض سے آیا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرک رائٹ اس مقصد میں کامیاب رہا۔ وہ کبھی کبھی ایک قسم کے کیمیاوی خضاب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا لیکن اس کے اعلیٰ کردار کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خورد و نوش کے مصارف سے زائد آمدنی پیدا نہیں کی۔

ین پی (WIG) پوشی کے رواج میں تبدیلی ہونے سے (WIG) سازوں پر مصیبت آئی اور آرک رائٹ کو میکانکی قابلیت رکھنے کی وجہ آخر کار مشین ساز یا موجد بننا پڑا پارچہ بافی کی ایک مشین کی ایجاد کی بہت سی کوششیں کی گئیں اور آرک رائٹ نے دوسروں کے ساتھ اپنی چھوٹی کشتی کو بھی ایجاد کے سمندر میں ڈالنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کے مماثل دیگر (SELF TAUGHT) اشخاص کی طرح آرک رائٹ اپنا فرصت کا وقت دائمی حرکت والی ایک مشین کی ایجاد میں صرف کرتا تھا اور اس مشین کی مدد سے پارچہ بافی کی مشین (SPINNING MECHINE) کا کام لینا آسان تھا۔ اس نے اپنے گذشتہ تجربات پر اس قدر جانفشانی سے عمل کیا کہ اس کو کاروبار کی پروا نہ رہی اس کا قلیل سرمایہ جاتا رہا اور وہ انتہائی مفلسی کا شکار ہو گیا۔ اس کی بیوی (کیونکہ اس وقت اس کی شادی ہو چکی تھی) بہت بے صبر واقع ہوئی تھی چونکہ آرک رائٹ کی کوششوں کو وہ محض تضیع اوقات اور روپیہ کی بربادی سمجھتی تھی۔ اس نے خشم آلود ہو کر اپنے شوہر کے تیار کردہ نمونے اس توقع سے ضایع کر دئے کہ اس طرح تو بھی خاندان کے مصائب اور مفلسی کا ازالہ ہو جائیگا۔ آرک رائٹ ایک پر جوش اور ضدی آدمی تھا۔ بیوی کے اس طرز عمل نے اس کے لئے اشتعال طبع کا کام دیا اور اس لئے فوراً بیوی سے علیحدگی اختیار کی۔

ین پی دوران سفر میں آرک رائٹ کی (KAY) نامی ایک شخص سے ملاقات ہوئی یہ شخص وارنگٹن کا

ایک گھڑی ساز تھا اس نے آرک رائٹ کو اس کی دائمی حرکت والی مشین کے بعض اجزا کی ساخت میں مدد دی۔ یاد رکھا جاتا ہے کہ (KAY) نے آرک رائٹ کو بیلنوں کی پارچہ بافی کا اصول بتلایا لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اصول کا خیال پہلے پہل آرک رائٹ کے دل میں اس وقت پیدا ہوا جس وقت اس کو اتفاق سے سرخ آہنی ٹکڑے کو آہنی بیلنوں میں سے گزر کر لمبا ہوتا ہوا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس واقعہ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں آرک رائٹ کے دماغ میں یہ خیال مستحکم ہوگیا چنانچہ اس نے جس تدبیر سے اس کی تکمیل ہو سکتی تھی اس کی کھوج شروع کر دی اور (KAY) کو اس مسئلہ میں کوئی دخل نہ تھا۔ آرک رائٹ نے اپنا بال فراہمی کا کاروبار ترک کر کے اپنی مشین کی تکمیل کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ اور اس کے ہدایات کے بموجب جب (KAY) نے اس مشین کا ایک نمونہ تیار کیا تو آرک رائٹ نے اس کو پرسٹن کی فری گرامر اسکول کے کمرہ میں رکھا۔ شہر کا قایم مقام ہونے کی وجہ اس نے اس بحث طلب انتخاب میں رائے دی جس میں جنرل برگوئن کو ناکامی ہوئی تھی۔ آرک رائٹ اسقدر تنگدست تھا اور اس کے کپڑے اسقدر پھٹے پرانے تھے کہ کئی اشخاص نے چندہ کر کے اسقدر روپیہ جمع کیا کہ وہ آرک رائٹ کے لئے (Poll Room) میں جانے کی حیثیت کے موافق لباس فراہم کرنے میں کافی ہوا۔ ایک ایسے شہر میں جہاں بہت سے کاریگر دستی محنت کے ذریعہ معاش پیدا کرتے تھے آرک رائٹ کی مشین کی نمایش خطرناک چیز ثابت ہوئی۔ مدرسہ کے باہر وقتاً فوقتاً بدشگونی کی حکایات سنی جاتی تھیں (KAY) کو اس کی (FLY SHUDLLE) کی ایجاد کی وجہ مجمع نے گھیر لیا جس کی وجہ وہ لنکاشائر چلے جانے پر مجبور ہوگیا نیز غریب ہارگریوس جس کے (SPINNING JENNY) کو بلاکبرن کے ایک مجمع نے اس واقعہ کے چند روز قبل پارہ پارہ کر دیا ان دونوں کا جو کچھ حشر ہوا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے آرک رائٹ نے یہ ہوشیاری کی [illegible] کو ایک غیر خطرناک یعنی محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اپنی مشین کو لیکر ناٹنگھم چلا گیا جہاں اس نے مقامی ساہوکاران سے مالی امداد کی درخواست کی اور مسٹر رائٹ نے اس کو اس شرط کے ساتھ پیشگی روپیہ دینے رضامندی ظاہر کی کہ ایجاد کے منافع میں اس کو حصہ دیا جائے جس مدت میں مشین کی تکمیل کی توقع تھی اس مدت میں تکمیل نہ ہونے سے ساہوکاروں نے آرک رائٹ کو مشورہ دیا کہ وہ مسٹر اسٹرٹ اینڈ نیڈ سے درخواست کرے مسٹر اسٹرٹ پاتابہ بافی کی مشین کا موجد تھا اور اس کو اس مشین کا حق پیٹنٹ بھی حاصل تھا۔ اسٹرٹ نے آرک رائٹ کی مجوزہ ایجاد کی بلحاظ اس کی خوبیوں کے بڑی قدر کی اور آرک رائٹ کے ساتھ جس کے لئے قسمت آزمائی کی راہ اب بالکل صاف ہوگئی تھی شریک ہو گیا ناٹنگھم کے گھڑی ساز رچرڈ آرک رائٹ کے نام سے حق پیٹنٹ حاصل کیا گیا اور یہ ایک قابل یادگار واقعہ ہے کہ یہ پیٹنٹ ۱۷۶۹ء میں حاصل کیا گیا یعنی اسی سال جبکہ

واٹ نے اپنی بخاری انجن کا حق پیٹنٹ حاصل کیا تھا۔ ناٹنگھم میں پہلے ایک کپاس کی گرنی قائم کی گئی جو گھوڑوں کے ذریعہ چلتی تھی اس کے چند روز بعد ہی ڈربی شائر میں بمقام کرامفورڈ نہایت اعلیٰ پیمانہ پہ دوسری گرنی تیار کی گئی جو پانی سے گھومنے والے پہیے سے چلتی تھی اور اسی سبب سے پارچہ بافی کی مشن کو (WATER FRUNE) کہا جانے لگا۔

ین پی آرک ریٹ کی کوششوں کا یہ پیش خیمہ تھا مشن کے دیگر ضروری اجزا کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس میں ارک ریٹ ہمیشہ ردوبدل اور اصلاحات کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ وہ قابل استعمال اور بیحد مفید ہو گئی لیکن کامیابی محض طویل اور متحمل کوشش سے حاصل ہوی کیونکہ چند سال تک اس کام میں آرک ریٹ کو پست ہمتی ہو رہی تھی نیز اس کو کوئی فایدہ بھی نہ تھا کثیر سرمایہ اس کے نذر ہو جاتا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا جب ترقی کے آثار نظر آنے لگے تو جس طرح (CORNISH) کے کان کن بولٹن اور واٹ پران کے بخاری انجن کا منافع لوٹ لینے کی غرض سے ٹوٹ پڑے تھے لنکا شائر کے صناع بھی جدید مشن کو توڑ دینے کے خیال سے آرک ریٹ پر حملہ آور ہوے آرک ریٹ کو کاریگروں کا دشمن ٹھہرایا گیا اور کارلے میں اس نے جو گرنی تیار کی تھی اس کو ایک مجمع نے زبردست پولیس اور فوج کی موجودگی میں برباد کر دیا۔ اگرچہ آرک ریٹ کے تیار کردہ اشیار بازار میں سب سے بہتر تھے اور لوگوں کو اس کا اعتراف بھی تھا لیکن لنکاشائر والوں نے انہیں خریدنے سے انکار کیا۔ نیز انہوں نے آرک ریٹ کو اپنی مشنوں کے استعمال کا حق پیٹنٹ دینے سے انکار کیا اور عدالت میں سخت ضرر پہنچانے کی غرض سے متفق ہو گئے آرک ریٹ کا حق پیٹنٹ ضایع ہونے سے راست باز اشخاص کو سخت ناگوار ہوا مقدمہ ختم ہونے کے بعد جس وقت آرک ریٹ کا اس ہوٹل پر سے جہاں اس کے مخالفین ٹھہرے ہوے تھے گذر ہوا تو ایک نے چلا کر کہا کہ "ہم نے پرانے اصلاح ساز کو شکست دیدی"۔ یہ سنکر آرک ریٹ نے جواب دیا کہ "کوئی پروا نہیں میرے پاس ابھی ایک استرا باقی ہے جو تم سب کی اصلاح کرے گا" اس لئے اسکاٹ لینڈ میں لنکاشائر۔ ڈربی شائر اور نیولنیارک مقامات پر جدید گرنیاں قائم کئے مسٹر اسٹرٹ کی شرکت ختم ہونے پر کرامفورڈ کی گرنیاں بھی اس کے قبضہ میں آگئیں اور اس کی گرنیوں کے تیار شدہ اشیار کی خوبی کا یہ حال تھا کہ نہایت قلیل عرصہ میں اس کی کاروبار پر پورا قابو حاصل ہو گیا اس نے قیمتیں مقرر کئے اور دیگر کپاس کاتنے والوں کی نگرانی بھی کی۔

ین پی آرک ریٹ زبردست کردار۔ استوار دلاوری اور زود فہمی والا آدمی تھا اور اس میں بلا کی کاروباری صلاحیت موجود تھی۔ ایک مرتبہ اس کا وقت سخت اور مسلسل محنت میں صرف ہوا کیونکہ اس کو اپنے بے شمار

کارخانوں کا انتظام کرنا پڑا بعض اوقات وہ صبح کے چار بجے سے شام کے نو بجے تک کام کرتا تھا پچاس سال کی عمر میں اس نے انگریزی قواعد پڑھنا شروع کیا اور کتابت اور علم ہجا میں ترقی کرنے لگا ہر مزاحمت پر غالب آنے کے بعد اس کو اپنی کوشش کا ثمرہ ملا جس سے اس کو اطمینان حاصل ہوا۔ اس کی پہلی مشن کی ساخت کے ۱۸ سال بعد ڈربی شائر میں اس کو اسقدر اعزاز حاصل ہو گیا کہ وہ شہر کا (HIGH SHERIFF) بنا دیا گیا اور چند روز بعد جارج سوم نے اس کو (KNIGHH) کا خطاب عطا کیا ۱۷۹۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ خواہ مفید ہو یا مضر آرک رائٹ انگلستان کے موجودہ فیاکٹری سسٹم کا بانی تھا۔ فیاکٹری سسٹم بلاشبہ افراد اور قوم ہر دو کے حق میں توقیر دولت کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔

بن، پی، برطانوی صنعت کی دیگر بڑی شاخوں میں جفاکش اور محنتی اشخاص کی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں جو اُن کے ہمسایوں کے لئے باعث منفعت اور قوم کے حق میں طاقت اور دولت کا ذریعہ تھے۔ ذیل کے افراد کا شمار اسی قسم کے اشخاص میں کیا جا سکتا ہے:-

بلپر کے اسٹرٹس۔ گلاسگو کے ٹینینٹس۔ لیڈس کے مارشلس او گاٹس پلیس ایطش ورتھس۔ بربلیس فیلڈنس۔ ایشٹسن ہیوڈس اور لنکاشائر کے اینس ورتھس۔

انہی کی اولاد میں سے بعض اشخاص انگلستان کی سیاسی تاریخ میں شہرت حاصل کر چکے ہیں جنوبی لنکاشائر کے پیلیس بھی ایسے ہی مشہور و معروف تھے۔

بن، پی، خاندان پیل کا بانی جو گذشتہ صدی کے وسط میں گذرا ہے ایک معمولی کسان تھا اس کا ہول ہاؤ نامی ایک کھیت بلاک برن کے قریب واقع تھا جہاں سے بعد میں وہ مچھلہاروں کے کوچہ کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا رابرٹ پیل کے ذمہ کئی لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش تھی لیکن بلاک برن کی اراضی ذرخیز نہ ہونے سے اس کے لئے زراعت میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ بلاک برن ایک زمانہ تک کسی خانگی دستکاری کا مرکز تھا جس کی صنعت بلاک برن گریس کے نام سے موسوم تھی اور جس میں شہر اور قرب وجوار کے بنے ہوئے سن کے بانے اور سوتی تانے استعمال کئے جاتے تھے۔ کارخانوں کی ابتدا سے قبل کنبے والے محنتی کسانوں میں یہ رواج تھا کہ کھیتی باڑی سے جو کچھ وقت بچتا اس کو وہ پارچہ بافی کے کام میں صرف کیا کرتے تھے چنانچہ رابرٹ پیل نے چھینٹ سازی کی گھریلو تجارت شروع کی۔ وہ بانت داری سے عمدہ مال تیار کرتا تھا علاوہ اس کے کفایت شعار اور جفاکش تھا اس لئے اس کی تجارت کو فروغ ہوا۔ وہ بڑے بڑے کام اپنے ذمہ لینے لگا اور ان افراد میں سے تھا جنہوں نے پہلے پہل نئی ایجادات اون

صاف کرنے کی بیلن استعمال کی۔

ین' پی' رابرٹ پیل کی توجہ خاص طور پر چھینٹ کی چھپائی کے جانب راغب ہوئی جس کی حیثیت اس وقت ایک غیر معروف فن کی تھی مشن کی چھپوائی کو رواج دینے کی غرض سے ان سے کچھ عرصہ تک تجربات کئے۔ یہ تجربات پوشیدہ طور پر خود اس کے مکان میں ہوا کرتے تھے اور اس کے خاندان کی ایک عورت پارچہ کو استری کیا کرتی تھی پیل جیسے خاندانوں میں اس وقت کھانے کے لئے جست کے ظروف استعمال کئے جاتے تھے ایک رکابی پر ایک نقش بنانے سے اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سے ایک الٹا نقش لیا جا سکتا ہے اور اس کو رنگ لگا کر چھینٹ چھاپ سکتے ہیں کھیت کے کنارے ایک جھونپڑی میں ایک عورت رہتی تھی جس کے پاس استری کی ایک مشن تھی۔ اس کی جھونپڑی میں جا کر پیل نے رکابی کے نقش کردہ حصہ پر رنگ جمایا اور اس پر کچھ چھینٹ رکھکر مشن میں رکھ دیا جس سے چھینٹ پر خاص نقش اتر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھینٹ کی بیلن کے ذریعہ چھپوائی کا جو طریقہ رائج ہوا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ رابرٹ پیل نے اپنے تجربہ کو مکمل کیا اور اس نے پہلے (PARSLEY) کے ایک پتہ پر پہلا نمونہ تیار کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج تک وہ بلاکبرن کے قرب وجوار میں "پارسلی پیل" کے نام سے مشہور ہے۔ کل کے ذریعہ چھینٹ کی چھپائی کا کام پیل کے ایک فرزند کے ہاتھوں جو مسرز پیل اینڈ کو نامی کارخانہ کا صدر تھا پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ اس کامیابی سے اس کے حوصلے بڑھ گئے اور رابرٹ پیل نے کاشتکاری ترک کر کے بلاکبرن سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر قصبہ بروک لیٹھو میں سکونت اختیار کی اور خود کو طباعت کے کام کے لئے وقف کر دیا۔ یہاں اس نے اُس کے بیٹوں کی مدد سے جو اس کی طرح جفاکش تھے کئی سال تک کامیابی کے ساتھ یہ کاروبار چلایا اور جس طرح بچے پڑھتے پڑھتے عنفوان شباب کو پہونچتے ہیں اس کا کاروبار مختلف کارخانوں کی شکل میں ترقی کر گیا۔ ان میں سے ہر کارخانہ صنعتی پہل پہل کا مرکز اور عوام الناس کی کثیر جماعتوں کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

ین' پی سر رابرٹ پیل کے کردار کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ہستی یقیناً ایک غیر معمولی ہستی تھی اور وہ ہوشیار۔ تیز فہم اور دوربین بھی تھا۔ اس کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو لوگ اس سے واقف تھے وہ بھی گذر چکے۔ اس کا بیٹا سر رابرٹ اپنے باپ کے متعلق اس طرح لکھتا ہے کہ "میرا باپ حقیقت میں ہمارے خاندان کا اصل بانی ہوگا اور قومی نقطہ نظر سے اس نے تجارتی دولت کی اہمیت کی بیحد قدر کی اور کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ تجارت میں انفرادی نفع کو قومی مفاد کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت حاصل ہے۔"

ین' پی' سر رابرٹ پیل کو جو پہلا بیارونٹ اور اس نام کا دوسرا صناع تھا اس کے باپ کی صنعت اور

کاروبار ترکہ میں ملا ابتدا میں اس کی حالت ایک معمولی کاریگر سے کچھ بڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ گو آیندہ مرفعہ حالی کی اساس قایم کر رہا تھا تاہم اس کو بھی ناکافی سرمایہ کی وجہ جو مشکلات رونما ہوگئے تھے ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس وقت رابرٹ کی عمر صرف بیس سال کی تھی اس نے سوتی پارچہ کی چھپائی کا کاروبار آغاز کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا جس کو وہ اس وقت تک اپنے باپ سے سیکھ چکا تھا۔ اس کا چچا جیمس ہاورتھ اور ولیم ایٹس ساکن بلاکبرن اس کے کاروبار میں شریک ہوئے اور سب نے جو سرمایہ جمع کیا اس کی مقدار صرف پانچ سو پونڈ تھی اس سرمایہ کا بڑا حصہ ولیم ایٹس کا فراہم کردہ تھا۔ ولیم ایٹس کا باپ بلاکبرن کا ایک (HOUSE HOLDER) تھا جہاں اس کو کافی شہرت حاصل تھی اور لوگ بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اپنے کاروبار کے ذریعہ روپیہ پس انداز کر کے اس نے سوتی پارچہ کی چھپوائی کی سود مند تجارت کو ترقی دینے کے خیال سے جو اس وقت حالت طفولیت میں تھی اپنے بیٹے کو کافی رقم دینے کا ارادہ کیا رابرٹ پیل اگرچیکہ کم عمر تھا تجارت کا عملی تجربہ حاصل کر لیا اس کے متعلق صحیح کہا گیا ہے کہ "اگرچیکہ وہ کم عمر تھا لیکن ایک تجربہ کار دماغ رکھتا تھا" شہر بیوری کے قریب جو اس وقت غیر مشہور تھا اور جہاں کا کاروبار ایک زمانہ سے (THE GROUND) کے نام سے مشہور تھا یہاں کی ایک تباہ شدہ غلہ کی گرنی کو معہ اس کی ملحقہ اراضی کے رابرٹ نے تھوڑی رقم کے معاوضہ میں خریدی اور چند چوبی سائبان نصب کر کے ۱۷۷۰ء میں نہایت ادنیٰ پیمانہ پر سوتی پارچہ کی چھپوائی کا کاروبار شروع کیا چند سال کے بعد اس میں سوت بافی کا کام بھی ہونے لگا۔ شرکا جس کفایت شعاری سے زندگی بسر کیا کرتے تھے اس کا اندازہ ان کی ابتدائی زندگی کے ذیل کے واقعہ سے چل سکتا ہے۔ ولیم ایٹس معہ اپنے اہل و عیال کے نہایت سادہ طریقہ پر زندگی بسر کیا کرتا تھا اور پیل پر جو تن تنہا تھا احسان جتانے کے لئے اس نے اس کو اپنے پاس قیام کرنے کی اجازت دی پیل اپنے قیام و طعام کے معاوضہ میں ہفتہ وار جو رقم دیا کرتا تھا وہ صرف ۸ شلنگ تھی لیکن ایٹس نے پیل کو مجبور کیا کہ ہفتہ وار رقم میں ایک شلنگ کا اضافہ کر دیا جائے اس پر پیل کو پہلے پہل پس و پیش ہوا اور شرکا میں ناموافقت ہوگئی لیکن آخر میں اس بات پر صلح ہوگئی کہ پیل ہر ہفتہ ۶ پنس بیشگی ادا کیا کرے۔ ولیم ایٹس کی پہلی اولاد الن نامی ایک لڑکی تھی وہ بہت جلد نوجوان پیل کی چاہیتی بنگئی تمام دن سخت محنت کر کے "دی گرونڈ" سے واپس ہونے کے بعد چھوٹی لڑکی کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر کیا کرتا تھا "خوبصورت چھوٹی نلی کیا تو میری بیوی بنے گی" اس سوال پر نلی جس طرح عموماً بچے کیا کرتے ہیں خوشی سے جواب دیا کرتی تھی کہ "ہاں میں تمہاری بیوی بنونگی" جس پر پیل کہا کہ "نلی میں تمہارے سوا اور کسی سے شادی نہ کرونگا" اور حقیقت میں رابرٹ نے نلی سن بلوغ کو پہنچنے تک انتظار کیا جب خوبصورت لڑکی سن بلوغ کو پہونچی تو

رابرٹ کا اس سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ ہوگیا اور دس سال بعد جو کاروباری گہری دلچسپی اور دن بدن بڑھتی ہوئی مرفہ حالی میں بسر ہوئے رابرٹ پیل نے الن اٹیس سے شادی کی جس کا سن اس وقت سترہ سال کا تھا۔ اس طرح خوبصورت نلی جس کو اس کی ماں کا کرایہ دار اور باپ کا شریک کار اپنے گھٹنوں پر کھلایا کرتا تھا مسز پیل اور آیندہ چلکر انگلستان کے وزیر اعظم کی والدہ لیڈی پیل بنی۔ لیڈی پیل ایک معزز اور حسین عورت تھی اس کی دماغی قوت غیر معمولی تھی اور ہر شدید ضرورت کے موقع پر وہ اپنے شوہر کی شریک و مشیر رہا کرتی تھی۔ شادی کے بعد کئی سال تک اس نے اپنے شوہر کے منشی کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے کاروباری خط و کتابت کا بہت سارا کام خود کیا کرتی تھی کیونکہ مسٹر پیل کی طبیعت لاپرواہ واقع ہوی تھی اور خط بھی صاف نہ تھا۔ شوہر کو بیرونٹ کا خطاب ملکر صرف تین سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں لیڈی پیل نے جہاں فانی سے کوچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لندن کی وضعدارانہ زندگی جو اس کی خانگی یا گھر کی زندگی سے بالکل جداگانہ تھی اس کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوی۔ ضعیف اٹیس کہا کرتا تھا کہ "اگر رابرٹ ہماری نلی سے شادی نہ کرتا تو وہ اب تک زندہ رہتی"

ین، پی، اٹیس پیل کمپنی کا زمانہ کامل خوشحالی میں گذرا سر رابرٹ پیل کارخانہ کی روح رواں بنا ہوا تھا۔ اس کی جان توڑ محنت و جفاکشی کے ساتھ اس میں وہ غیر معمولی عملی قابلیت اور اعلیٰ درجے کے تجارتی معلومات موجود تھے جن کی اکثر سوتی پارچہ بافوں میں بڑی کمی تھی اس کی دماغی اور جسمانی قوت بہت زبردست تھی اور وہ بلا وقفہ کام کیا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ رابرٹ پیل کو سوتی پارچہ کی چھپوائی سے وہی نسبت تھی جو آرک ریٹ کو سوت بافی سے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے کارخانہ کی تیار شدہ اشیا کی عمدگی کی وجہ بازار میں ان کی طلب بڑھ گئی اور لنکاشائر میں کارخانہ کی خاصی شہرت ہوگئی ہبوری کو نفع پہنچانے کے علاوہ دونوں نے اپنی شرکت میں قرب وجوار میں وسیع پیمانہ پر کاروبار شروع کیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے دستکاریوں کی دنیا کو انتہا ے کمال تک پہنچانے کی کوشش کی اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے آرام اور مرفہ حالی کے لئے ہر ممکنہ کوشش میں کوئی کسر باقی نہ رکھی دیگر ایام میں بھی وہ اپنے مزدوروں کے لئے اجرت کا کام مہیا کرنے کی سعی کیا کرتے تھے۔ (باقی)

مصحفی کا تذکرۂ ہندی

(از عمر یافعی ـ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

حاتم

(الف) حاتم شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم ولد شیخ فتح الدین، کہ بقولش تاریخ تولدش حرف "ظہور" باشد، از نجباے پاک شاہ جہان آباد است۔ ہشتاد و سہ سال عمر دارد۔ در ایام جوانی سپاہی پیشہ بودہ و ہم شعر ریختہ بروئے کار آوردہ۔ در اوائل چندے رمز تخلص میکرد۔ ازبسکہ ایں خرابہ از قدر داناں معمور بود۔ امیرزادہ ہاے والا تبار و نوئینان ذوی الاقتدار اورا پیش ازپیش بہ تواضع و تعظیم پیش آمدہ بر مسند برابر خود جا میدادند و مناسب حال خودہا ہر یکے از وافرسگیٔ ایند مرد بزرگ و جہاں دیدہ و فرسودہ روزگار ہست۔ عمرہا بعیش و طرب بودہ و سالہا بہ ناز و نعمت پرورش یافتہ۔ حالا چوں کس نماند بہ سبب مصلحت وقت و ہواے زمانہ را مختلف دیدہ۔ متوکلی و خانہ نشینی اختیار کردہ۔ از ہندی گویان قدیم ایں دیار یادگار است و نام نامیش از بس شہرت بسیار مذکور زبان صغار و کبار۔ طرز اولیش در شعر بطور مضمون و ناجی و ابرو وغیرہ شعراے ایہام بنداست۔ و طرز آخریش باندازۂ تازہ گویان حال۔ بعض اشخاص نزدیک و دور شاہ مذکور را بسبب طوالت عمر پیش خود از رفتگاں شمردہ۔ حاتم ثانی قرار میدہند لہذا در ایں آخر عمر دیوانے کہ در زبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ نامش دیوان زادہ گذاشتہ تا رفع اشتباہ آنہا گردد و اختلاف زبان ریختہ سابق و حال دعوئ مبہم آں قوم را مقرون بصدق نگرداند۔ در فارسی ہم دیوان مختصری بقدر چہار جز بطور متاخرین بیاض فرمودہ۔ در یک ہزار و یکصد و نود و ہفت د۔ ماہ مبارک رمضان رحلت کردہ۔ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔

حاتم آں پیشواے اہل سخن ‏ ‏ کہ قدم در مقام فقر فشرد
صرف عمرش قضا بہ کزلک حک ‏ ‏ چونکہ از صفحۂ زمانہ سترد
سال تاریخش از خرد جستم ‏ ‏ ناگہ ایں مصرعہ بگوشم خورد
کہ بگو مصحفی چو پرسندت ‏ ‏ آہ صد حیف شاہ حاتم مرد

این چند شعر از انتخاب زادہ آں بزرگوار است"۔

(ب) شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفته می شد۔ مولدش شاہجہاں آباد است۔ تاریخ تولدش بقولش حرف "ظہور" می برآید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بودہ و اوقات را بخوبی گذرانیدہ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زادیان قدیم بودہ روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را با یہام گوئی نہادہ۔ داد معنی یابی و تلاش مضمون تازہ میدادیم غرضکہ از شعرائے متقدمین است دریامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد۔ طرح مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانۂ سابق خود را می ستود و الحال کہ در دورۂ ما زبان ریختہ بسیار پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشار الیہ ہم مرتبہ سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوان قدیم خود را از طاق دل افگندہ۔ دیوان جدید بزبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ دیوان زادہ نامش گذاشتہ تا بسبب طوالت عمر بعض مردم دو رو دست را کہ اشتباہ حاتم دویم می افتاد برطرف کردہ و بحور اشعار را ہم جدا جدا از مصرعی بر سر ہر غزل نوشتہ و این ایجاد اوست و از ینکہ در درازی عمر و قدامت شعر از ہمہ پیشتر است ہمہ منجان حال و جمیع و شریف او را اوستاد مسلم الثبوت می دانند بلکہ او خود را اسامی کسانیکہ از اول تا آخر استفادۂ شعر ازو کردہ اند بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشت سر لوح دیوان خود نوشتہ چسپانیدہ تا معلوم کسان گردد کہ حاتم این قدر شاگرد داشت و در انجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ باتفاق ہمہ یکے از سرآمد شعرائے ہندی گویان این دیار گذشتہ مسطور است والحق کہ دروغ نیست قیاس اُستادیش ازیں جا باید کرد۔

دیگر بنا بران میر محمد تقی میر کہ شاعریست جادو کار اکثر او را در مشاعرہ ہا بطریق ظرافت واہ الشعرا میگفت چوں دو جزو مسودہ شعر فارسی ہم بطور صائب داشت لہذا پیش ازیں در تذکرہ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ عمر قریب بصد رسیدہ بود و دو سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزد از دوست۔

مضمون خط کو دیکھ ترے ہم بہت ڈرے | جتنے سو وسے تھے رہے طاق پر دھرے
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر | سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے
تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں | دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں
خوشحال اُن کا جن کو ہوئی رخصت چمن | ہم جھانک جھانک رخنۂ دیوار رہ گئے

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو — اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
بیکسی اور دماغ اے حاتم — کیا قیامت کرے جو دولت ہو

مجھے تو دیکھ کر کیا تک رہا ہے — ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے
خدا کے واسطے اُس سے نہ بولو — نشے کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

درد

(الف) خواجہ میر درد خلف شاہ ناصر کہ سلسلہ ایشاں نقشبندیہ است و آں را مقابل نقشبندیہ مجددیہ نقشبندیہ محمدیہ ایجاد کردہ نام گذاشتند در ایام جوانی سپاہی پیشہ بود۔ ازاں باز کہ پا بر بوریائے درویشی نہادہ ہمیشہ در کسب سلوک و فقر و فنا و توحید و تصوف کوشیدہ و چشم از غیر حق پوشیدہ در زبان ریختہ بعد ایہام گویان خیلے داد فصاحت دادہ چنانچہ دیوان مختصرے از و یادگار است و مقبول نظر فصحائے روزگار۔ چوں بہ سبب فضل و کمالے کہ داشت در راہ پُر خار فارسی ہم بزعم دیگر ریختہ گویان قدم نہادہ از تصنیف اوست۔ علم الکتاب و واردات و نالۂ درد، در جواب نالۂ عندلیب شاہ ناصر، و دیوان فارسی مختصر معہ رباعیات تا دریں بزم دل افروز جانشین پوست تخت زندگانی بود اکثر شاگرداں و مریداں و معتقدان از ذات بابرکاتش استفادہ ہامی گرفتند و ادراک صحبت کیمیا خاصیت او را بسیار غنیمت می شمردند۔ فقیر ہم گاہ گاہے بغیر ضانہ صحبتش را دریافتہ است الحق کہ دریں پیری شخصے بود باغ و بہار و وجودے بود از بزرگان زمانہ یادگار۔ چند سال است و جائے خود را بہ برادر خود محمد میر اثر تخلص گذاشتہ رفتہ از دوست"

(ب) خواجہ میر درد تخلص خلف الصدق شاہ گلشن مصنف کتاب نالۂ عندلیب در عہد فردوس آرام گاہ سپاہی پیشہ بود آخر آخر ترک روزگار کردہ بر سجادہ درویشی نشستہ در علم و فضل یگانۂ روزگار است گاہے در تمامی عمر از شاہجہاں آباد باوجود چندیں تفرقہ کہ عالمی را از دیار ہیونشاں آوارہ اطراف و جوانب ساخت پائے بیروں نگذاشتہ چوں در علم موسیقی ہم مہارت تمام داشت اکثرے از اوستادان ایں فن بعلت بعیت حاضر مجلس او گشتند۔ اگرچہ سلسلہ آں بزرگ نقشبندیہ ہست اما واردات درد کہ نسخہ ایست مختصر از تصنیف او برائے ہدایت مریدان خویش حرمت غنا را بطورے کہ ہست گذاشتہ و خود کہ گاہ گاہے مرتکب ایں امر شد گناہ آں

برزمہ خود گرفتہ طلب آمرزش از ایزد بے ہمال خواستہ تا مرغ روحش زمزمہ سنج باغ ہستی بود در ہر ماہ بتاریخ دوم بر مزار پدر خود مجلس غنا ترتیب میداد آنروز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر می شدند مغنیان چابک دست وبین نوازان بے کاسہ مست داد قانون نوازی ونغمہ سازی می دادند بعد سہ پاس روز رفتہ مجالس برخواست می شد۔ غرض کہ جامع جمیع فنون غریبہ بود در فقر و توکل و استغنا نظیر نداشت۔ شمۂ بیان بے پروائیش این کہ روزے حضرت ظل سبحانی برائے زیارت ایشان آمدہ بودند بعد نشستن در مجلس عذر ورد بمیان آوردہ اندکے پارا دراز ساختند مشار الیہ از مشاہدۂ این حالت متعرض شدہ واین قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پا را دراز ساخت علم الکتاب از تصنیف اوست بر صفحہ روزگار یادگار است و شعر ہندیش از بس شہرت بسیار مشہور ہر دیار اگرچہ شعر فارسی ہم وارد فقیر تا کہ در شاہجہان آباد بود بعد سالے گاہے پیش آن بزرگ بے غرضانہ میرفت یک سالست کہ در مہجوریش شفا یافتہ و بثانی علی الاطلاق واصل گشتہ از کلام معجز نظام اوست۔

کہیں ہوا ہی سوال وجواب آنکھوں میں　　یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں
سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں　　زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

کچھ کام نہیں وہ بت خود کام کہیں ہو　　پر اس دل بے تاب کو آرام کہیں ہو

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یہاں مجھے　　اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں　　گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

تجھی کو جو یہاں جلوہ فرما نہ دیکھا　　برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
تو ہی نہ اگر ملا کرے گا　　عاشق پھر جی کے کیا کرے گا

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں　　جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں
موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے　　مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے
درد ہم اپنی عوض چھوڑ اثر جاتے ہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ
کہ حال دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

جی میں ہے سیر عدم کیجئے گا
یک بیک خلق سے رم کیجئے گا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا
میں چاہوں غیر کو سو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو
تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے اور وہی غم ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

نظر میرے دل پر پڑی درد کس کی
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

درد درویش ہوں مری تعظیم
لوگ کرتے ہیں کہہ کے یا اللہ

سوز

(الف)۔ میر سوز شاعر ریختہ گو است ایں رباعی بطریق ندرت از وست "

(ب)۔ محمد میر سوز تخلص کہ بہ طرز خود اُستاد است و وضع خواندن شعرش دیگر بر اکم یاد گویند اول میر تخلص میکرد چوں در آں ایام میر محمد تقی ہم شہرت بسیار داشت لہذا ازاں در گذشتہ بجائے میر سوز قرار داده کمالات ایں بزرگ ماورائے کمال درویش و شاعری بسیار اند چنانچہ در تیر اندازی و سواری اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر و آداب صحبت ملوک و سلاطین و ظرافت طبع

وفرخندہ روئی وتحصیل معاش وگفتن کلمۃ الخیر درحق دیگرے وبااین ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصہ شعرا ست نظیر خود ندارد وگاہ گاہے کہ با فقیر ملاقات میشود بسیار مہربانگی می فرماید و غائب وحاضر از مزخرفات این ہیچمدان حظ وافی برداشتہ بے تکلف در ستایش دوستانہ می افزاید عمرش از ہفتاد تجاوز خواہد بود حق تعالیٰ باین شفقت بزرگانہ اش دیرگاہ سلامت دارد از وست سے

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے اور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے
کشورِ دل میں نہیں کوئی کہ آباد رہے یوں اُجاڑا ہے اسے تم نے بھلا یاد رہے

رزق کا ضامن خدا شاہد کلام اللہ ہے پھر اپنی صورتوں سے رو زحاجتمند ہیں
مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ان آنکھوں سے رزق یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار سوچتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں

زندگانی میں کسے آرام حاصل ہووے گا ہائے آسودہ جہاں میں کونسا دل ہووے گا
تو ہم سے جو ہم شراب ہوگا عالم کا جگر کباب ہوگا
اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا!
صرفت العمر فی لہو و لعب فآہا ثم آہا ثم آہا
مجھے گر حق تعالیٰ عشق میں کچھ دست رس دیتا تو دل ان بیوفاؤں کو کوئی میں اپنے بس دیتا
ستم ہے سوز گر وہ قتل کرتا اپنے ہاتھوں سے تو جی دیتے ہوئے بھی صورت اسکی دیکھ ہنس دیتا

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے دل جواب بیقرار ہے کیا ہے
والے غفلت نہ سمجھے دنیا کو یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے
کچھ تو پہلو میں ہے خلش دیکھو دل ہے یا نوک خار ہے کیا ہے
کھینچ کر تیر مار بیٹھے بس سوز ہے یا شکار ہے کیا ہے
جس کا تو آشنا ہوا ہوگا اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

تھرتھراتا ہے اب تلک خورشید روبرو تیرے آگیا ہوگا

بستیاں بستی ہیں اور اجڑے نگر آباد ہیں وے کہاں؟ جن کے جدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں

پرکار کی روش چلے ہم جتنے چل سکے اس گردش فلک سے نہ باہر نکل سکے
رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ ڈھل سکے
منہ دیکھ آئینہ کا، تری تاب لا سکے خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے؟
لخت دل مت نکل ابھی باہر پیرہن اشک سے مرا نم ہے
کیسی کیسی یہ باتیں کرتا ہے سوز ہے یا کہ جان عالم ہے
چین نے ان کو ان آنکھوں کو نہ شب آرام ہے شام سے تا صبح رونا صبح سے تا شام ہے

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا

دامن تلک تو تیرے کہاں دسترس مجھے تیری گلی کی خاک بھی ہوں تو ہے بس مجھے

سن سوز نہیں یہ آہ و زاری کب تک (رباعی) بس ہاتھ نہ مل یہ بیقراری کب تک
آپی عاشق ہے تو اور آپی معشوق پردے سے نکل یہ شرمساری کب تک

سودا

(الف) سودا کہ مرزا رفیع نام دارد۔ درابتدائے شوق شعر ہندی شاگرد سلیمان علی خاں وداد بود
ونیز بہ شاہ حاتم رجوع داشت۔ شاہ مذکور بہمیں جہت در فخریہ خود بہ اسامی شاگرداں کہ فہرست
آں بر پشت سرلوح دیوان خود نوشتہ۔ اسمش نیز داخل ساختہ۔ اگرچہ مرد کم علم بود امّا ذکاوت
وروانی طبعش از کلامش پیداست۔ درزبان ریختہ علم یکتائی برافراشتہ وہمیشہ بہ نجابت صحبت

داشتہ قصاید غرا در جواب بعضے قصاید عرفی تصنیف نمودہ و ماسوائے این در گفتن ہجوہا قدرت شاعری خود را نمودہ غرض ہمہ اتفاق بہ سبب شہرت بسیار و خوبی کلام او استاد مسلم الثبوتش میدانند والحق کہ چنیں بودہ نامش در ہندوستان ورد زبان بازاریان و غزلیات دیوانش بہ اطراف و جوانب و ہر عاقل و امی را بر زبان۔ با اینہمہ شہرت کہ در ریختہ نصیبش بود آخر آخر خیال شعر فارسی ہم بسر ۔ ۔ ۔ بسر آوردہ۔ اگرچہ این حرکت مناسب شانش نبود خیر غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنو گفتہ داخل دیوان ریختہ بقید ردیف ساختہ و این ایجاد اوست فقیر چند شعر برائے یادگار بطریق ندرت ازو می نویسد"

(ب) شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی مرزا رفیع المتخلص بہ سودا پسر مرزا محمد شفیع کابلی کہ در عصر خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ بعضے اورا درین فن بہ ملک الشعرائی پرستش میکنند بعضے بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعض اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند غرض ہرچہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعددہ و غیرہم نگاشتہ خامۂ خیالش بر صفحہ روزگار یادگار است دیوانش بفرنگ و صفاہان رسیدہ و دیگراں این شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال ہندی اشعار غزل صائب و قدسی گویم بجا است و اگر در علوئے معانی ابیات قصیدۂ خاقانی ریختہ اش خوانم رواست نقش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید تتبعش خواہد بود فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن این بزرگ بنجد نقش رسیدہ بود بہ پرورش سگان ریشم پشم شوق تمام داشت و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آنہا نیز قادر غرض کہ شخصے جامع الکمالات بود ہر جا کہ میرفت عزت و حرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز وجود اورا در سرکار خود بسیار غنیمت میدانستند وفاتش در لکھنو و مرقدش در امام باڑہ آقا باقر روزے در ماہ محرم فقیر آنجا رفتہ بود اتفاق زیارتش افتاد و نظر بر کتابۂ قبرش کرد بران تاریخ وفاتش گفتہ میر فخر الدین ماہر کہ ہمدم و ہمنشین او بود کندہ دید تاریخ این است

خلد کو جب حضرت سودا گئے — فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف مرد گو پائے عناد — شاعران ہند کا سرور گیا

چوں تعمیہ ایں تاریخ خلاف قانون مورخاں بود درخیال فقیر گذشت کہ چنیں شخص را چوں من تاریخ گوے
می بایست آخر ہماں روز از فیض تائید ربانی تاریخ وفات آں مرحوم و مغفور بے کم و کاست از خانۂ
خیال سحر کار مولف بیروں تراوید ... لے ... غایت انبساط و سرور کہ از موزونی ایں مصرع فصیحہ مادۂ
تاریخ کہ کاملان ایں فن را بہ دشواری دست دہد خود در طبیعت خود را آفریں گفتہ۔ آرے تاریخ چنیں شخص
چنیں می باید ے

مزار رفیع آں کہ ز اشعار ہندیش — ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستاں علو
ناگہ چو در نوشت بساط حیات را — گردید مدفنش ز قضا خاکِ لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آوردہ مصحفی — سودا کجا و آں سخن دلفریب او

من کلامہ غزل سر دیوان۔

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا — چوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ — دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

تونے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے
ظالم ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
عجب بیداد مجھ پر یہ مرا صیاد کرتا ہے — دکھاتا ہے اسے مجھکو جسے آزاد کرتا ہے

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا — کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
جو گذری مجھ پہ مت اُسے کہو ہوا سو ہوا — بلا کشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

لے کوئی لفظ تھا جس کو کیڑا چاٹ گیا ہے۔

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
میرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

جو عشق چاہئے کیجیے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجیے کہ کہے کوئی سزا وار نہ تھا

شاعران ہند کا تو گرچہ پیغمبر نہیں
پر سخن کہنے میں اے سودا تجھے اعجاز ہے

کیا جانیے کس کس سے نگہ اُسکی لڑی ہے
ہم کوچہ میں جا دیکھو تو اک ---- پڑی ہے

گو پیر ہوی شاعری سودا کی جوانا
تم سے نہ کھنچے گی یہ کماں سخت کڑی ہے

ہے قسم تجھ کو فلک دے تو جہاں تک چاہے
جلوۂ حسن لئے حسرت دیدار مجھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

نہ پھول اے آرسی گر یار سے تجھ کو محبت ہے
بھروسا کچھ نہیں اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے

جب اپنے بند قبا تم نے جان کھول دیے
صبا نے باغ میں جا گل کے کان کھول دیے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے خدا جانیے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

پھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

نہیں معلوم کیا اس سینہ میں جوں شمع جلتا ہے
دھواں نوک زباں سے بات کرتے ہی نکلتا ہے

مجھے تشنیع کیوں آیا ہے ناصح یہ ہوا آنکھیں ہیں
بس ان خانہ خرابوں سے کسی کا کچھ بھی چلتا ہے

خبر لے جلد سودا کی دگرنہ میں یہ دیکھوں ہوں
سرہانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ہاتھ ملتا ہے

فغاں

(الف) اشرف علی خاں فغاں برادر رضاعی احمد شاہ بادشاہ در ابتدائے عمر موزونی طبع بہ تتبع میرزا رفیع در شاہجہاں آباد نام بریختہ گوئی برآوردہ و آخرہا بہ عظیم آباد بخوش معاشی می گذارند۔ تا آنکہ ہمانجا وفا کرد۔ گاہ گاہے شعر فارسی ہم می گفت۔

(ب) اشرف علی خاں فغاں عرف کوکہ خاں یعنے کوکہ احمد شاہ بادشاہ از دودۂ [illegible]

شعرا بصفائے تمام می گوید و نسبت شاگردی بہ ندیم می رساند چنانچہ خود گفتہ ؎

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں   دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہووے گا

در ایامے کہ بسبب تفرقہ شاہ از شاہجہان آباد برآمدہ بہ طرف پورب گذرانیدہ و معرفت میر محمد نعیم خاں کہ ہم مکتب ایشان بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسید یکے از مقربان گردیدہ درہمان نزدیکی روزے نواب وزیر ونشش را در عالم اختلاط مجلس سوختند آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر بہمیں حرکت آزردہ شدہ بہ طرف عظیم آباد رفت و در سرکار راجہ شتاب رائے بہ ندامت پیشگی آمدہ اقتدار کلی بہم رسانیدہ بود چند سال است کہ ہمانجا زندگانی را جواب دادہ از انتخاب دیوان اوست۔

مت قصد کر صبا تو دل داغدار کا   ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا
کرتا ہے وصل میں در و دیوار پر نظر   تجھکو مزا پڑا ہے فغاں انتظار کا
عالم کو جلاتی ہے تری گرمی بازار   مرتے ہم اگر سایۂ دیوار نہ ہوتا
رفتہ رفتہ بت خوش قد مرا آفت ہوگا   قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا
کیا سبب ہے کہ نہ آیا مرے نامہ کا جواب   خیر ہو یار کی قاصد تو سلامت ہوگا
ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا   قضیہ مٹا عذاب سے چھوٹے خلل گیا

آنا ہمارے گھر میں تجھے عار ہو گیا   ایسا فغاں کے نام سے بیزار ہو گیا
کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنے نہیں   خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گذر گئی   دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا
دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے   گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا
تجھکو روزی ہو مری جان دعائیں لینا   مجھکو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

لکھنا ہے نامہ پر در و دیوار یار پر   گذرا جو کچھ الم دل امیدوار پر
کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں   یہاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پر

توشۂ راہ سبھی ہمسفراں رکھتے ہیں / تیرے دامن میں فغاں لخت جگر ہو کہ نہیں

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں / کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں
تا حشر نہ کم ہووے گی ظالم طپش دل / کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں
جاتا ہے فغاں قافلۂ ہم نفساں کل / کچھ راہ کے چلنے کا سرانجام کروں میں

ہو کر ترے قفس سے میں آزاد کیا کروں / بے بال و پر ہوں اے مرے صیاد کیا کروں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہ رکھ / ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہیں
باور نہیں اگر تجھے آتا تو دیکھ لے / آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

نہ دل چمن میں لگے ہے نہ کوہ و صحرا میں / کوئی مکان بھی میرے لئے ہے دنیا میں

کیا تجھ سے خوش رہے ہے دلِ ناشادِ رفتگاں / اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یادِ رفتگاں

تقویت ہے داغ سے میرے دل بیمار کو / اے فلاطوں کیا مرض کہتے ہیں اس آزار کو

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پُر آب ہو / اے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو
جم جم پلائے دوست تجھے اور جام مے / تو مست رہ فغاں ترا دشمن خراب ہو

کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گذر گئی / اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا / تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی؟
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں (ق) / انصاف تو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا ۲ / وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھیے تو بہر حال شکر ہے ۳ / یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے — دنیا میں الٰہی کوئی بدنام نہ ہووے
شمشیر کوئی تیز سی لینا مرے قاتل — ایسی نہ لگانا کہ مرا کام نہ ہووے
آتا ہے مری خاک پہ ہمراہ رقیباں — یعنے اسے تربت میں بھی آرام نہ ہووے

صنم نامہرباں ہے اس قدر اے میرے رب کیا ہے — مری تقصیر کچھ ثابت نہیں وہ جو غضب کیا ہے؟
صبا ہر ایک گل سے پوچھیو گلشن میں تو جا کر — گریباں چاک رہتا ہے فغاں اس کا سبب کیا ہے

قاصد! تو نا امید پھرا کوئے یار سے — خفت ہوئی مجھے دل امیدوار سے
میں دیکھتا ہوں کیا کہ سر راہ ایک شخص (ق) — کہنے لگا فغاں! انہیں شاکی تو یار سے
میں نے دیا جواب کہ سنتا ہے اے عزیز (۲) — ہے دور مرتبہ مرا صبر و قرار سے

یہ فن کسے نہیں آیا کہ دل میں راہ کرے — فغاں میں اس کے تصدق ہوں جو نباہ کرے

وہ چاہے یا نہ چاہے فغاں آپ چاہیئے — اپنی طرف سے اے مرے صاحب نباہیئے!

بے طرح جوش گل نے لگائی چمن میں آگ — ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے
تیرے ہی دل سے پوچھیئے اس غم کو ہاں فغاں — الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اثر کرتی نہیں اس بت کے دل میں آہ کیا کیجے — عجب حالت ہے میری اے مرے اللہ کیا کیجے

یار اگر جفا کرے چاہیئے دل وفا کرے — یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

میں اپنے درد دل کہنے کے صدقے — ترے سن سن کے چپ رہنے کے صدقے

ترے فراق میں کیونکر یہ دردناک جیئے — مرے تو مر نہیں سکتا جیئے تو خاک جیئے

قایم

(الف) محمد قایم ـ قائم ـ متوطن موضع چاندپور ـ شاعر ریختہ گو است و شاگرد مرزا محمد رفیع ـ شہرت تمام دارد ـ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود ـ کم کم خیال شعر فارسی کرد و میکند چوں این تذکرہ را ماہیت بیاض ہم ہست لہذا آنچہ از کلامش انتخاب افتادہ ـ حوالہ کاغذی نماید و آں این ست ـ

(ب) قیام الدین علی عرف محمد قایم صاحب ـ قایم تخلص ـ اگرچہ وطنش قصبہ چاندپور است اما توسل نسبت نوکری بادشاہی اکثر در شاہ جہاں آباد می بود ـ در آں روزہا در توپ خانہ ہم اسامی داشت و بہ مقتضائے موزونی طبع و استعداد درست آنچہ موزوں می کرد از نظر میرزا رفیع سودا میگذرانید و بہ خواجہ میر درد نیز اعتقاد داشتہ بودہ است فقیر او را در ایام و موئے بہ لباس درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ دراں روزہا تازہ وارد بود دیدہ در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و رو بہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش استادہ[1] را میرفت بلکہ در بعضی مقام رجحان می جست ـ دراں ایام باعث قصیدہ خواندن و نوکر شدن مولف در سرکار نواب موصوف ایں بزرگ شدہ بود ـ در عرصہ قلیل بسبب سلیم مزاجی و بسبب نام شاعری رابطہ شدید بہم رسانیدہ ـ کاغذہائے مسودہ اشعار نواب را کہ برائے اصلاح پیشش می آمدند از کم دماغی بہ دست مشورہ فقیر می داد چنانچہ سہ ماہ بہ ہمیں طور بہ یک جا گذرانیدہ و شام و چاشت بیک سفرہ کردہ و اللہ کہ یاد آں صحبت گذشتہ داغ ناکامی بر دل آرزومند میگذارد و الحاصل بعد بہم خوردن آبادی کثیر و صورت گرفتن کار فیض اللہ خاں رام پور والہ بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسر نواب موصوف دخیل شدہ چیزے موافق زمانہ تقرر داشت اما اوقاتش دراں بہ فراغت بسر نمی شد لہذا برائے رہانیدن دیہات قدیم ملک و یومیہ وغیرہ قصبہ مذکور در لکھنؤ مکرر گذر افگندہ و از راجہ تکیت رائے بہادر رقعہ جات و پروانہ جات بنام عامل آنجا درست کنانیدہ بردہ بود کہ بعد رسیدن وطن و فائز شدن مطلب اجلش در رام پور رسیدہ ـ و خبر وفاتش از شہر بہ شہر انتشار یافت ـ خدایش بیامرزد ـ[2] از دست او

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزباں نے کیا کہا — کیا کہا پھر کہہ بت نامہرباں نے کیا کہا

[1] غالباً "دوش بدوش استاد راہ میرفت" ہوگا ۱۲ [2] اس کے بعد پاؤ صفحہ جگہ چھوڑ دی گئی ہے اور اس جگہ کی بیچ میں سرخی سے "از دست او" لکھا ہوا ہے ۱۲

نہ وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں	پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

جو کوہکن تجھے قوّت ہی آزمانا تھا	عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اُٹھانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا	پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا!

عیش و طرب کہاں ہے غم دل کدھر گیا	صدقے میں اس گذشت کے کیا کیا گذر گیا

ہو اگر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت	تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت
قایمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری	مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

چاہیں ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت	پر جس میں یہ دوری ہو وہ کیا خاک محبت

یہاں سے اٹھ غیر کے گھر شب تو گیا کہتے ہیں	بارے اے نیک مروت اسے کیا کہتے ہیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں	یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
میں کہا: ”عہد کیا کیا تھا رات“	ہنس کے کہنے لگا کہ ”یاد نہیں!“

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں	کبھی ہم اعتبار کرتے ہیں
سی تو لینے دو جیب ناصح کو	اب کے ہم تار تار کرتے ہیں
چلئے قائمؔ کہ رفتگاں اپنا	دیر سے انتظار کرتے ہیں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور	باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں
قایمؔ یہ جی میں ہے کہ تقلید سے شیخ کی	اب کی جو میں نماز کروں بے وضو کروں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی
سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں
جور سپہر و دوری یاراں و روئے غیر
جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے
بجھے ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے
گیا تھا آج میں قاتل کے دیکھنے کے لئے
کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہ ہووے
دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم و ستم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہونگے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

شاید وہ بھول کر کبھی یہاں بھی قدم رکھے
یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اُس کے ساتھ تھی
میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یہاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

شکوہ نے غیر سے نے یار کی بیزاری سے
جو ہوا ہم پہ سوا اس دل کی گرفتاری سے

(باقی)

قلم کی سرگزشت

از جناب محمد حمید اللہ صاحب بی۔اے

خامہ فرسائی کرنے والوں کی روزافزوں کثرت کے دیکھتے خود آلۂ خامہ فرسائی پر اب تک کچھ نہ لکھا جانا تعجب خیز ہے۔ مجھ جیسے ناکارے نے چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد جو پیش کیا ہے وہ خدا نہ کرے کہ آخری ثابت ہو۔

"قلم" ایک عربی لفظ ہے جس کے معنے قطع کرنے کے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عربوں میں سب سے پہلے جو لکھنے کا آلہ رائج ہوا وہ غالباً واسطی یا بروکے قلم کا کوئی ہم جنس تھا۔ یہ لفظ ترکی، فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ ترکی میں اس کا کوئی مرادف مجھے نہیں ملا۔ البتہ فارسی میں "خامہ" (تلفظ خامے) برتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کس لفظ سے نکلا ہے۔ اردو میں قلم، ہولڈر وغیرہ تمام دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں۔ البتہ سنسکرت لفظ "لیکھنی" بھی اردو میں برتا جاسکتا ہے جو "لکھنے" سے مشتق ہے۔ ٹلک (ماخذ) جو صوبیٹی لفظ مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

یورپی زبانوں میں سے انگریزی لفظ "پین" (PEN) ہے۔ یہ لاطینی لفظ "پینّا" (PENNA) سے ماخوذ ہے۔ فرانسیسی میں "پلیوم" (PLUME)، المانی (جرمن) میں "فیدر" (FEDER) کہتے ہیں اور ان تمام الفاظ کے معنے پرندے کے پر کے ہیں۔ مگر انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار (PEN) کی رائے میں "قدیم زمانے میں مکتوبہ حروف پیدا کرنے کے لئے جو آلات مستعمل تھے ان میں پروں کی سخت کھوکھلی چھڑی نہ تھی۔ سب سے قدیم آلۂ کتابت غالباً نوکدار سوا ہے جو دھات، ہڈی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا۔ اور کسی درخت کی لکڑی سے بنائی ہوئی تختیوں پر جن پہ موم منڈھا ہوا ہوتا تھا، حروف کندہ کئے جاتے" اس قسم کے قلم کو اسٹائل کہتے تھے (دیکھو آکسفورڈ ڈکشنری) تاہم مقالہ نگار کو بھی تسلیم ہے کہ بعض پودوں کے ڈنٹھل نیز بمبو یا بانس کی چھڑیاں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ اور وہی "موجودہ قلموں کے حقیقی قدیم نمائندے" ہیں ایسے قلموں کو چھیل کر نوکدار بناتے ہیں اور نوک یا زبان قلم کے درمیان میں ایک شگاف دیتے ہیں۔ نوک بنانے کو خط لگانا کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ ہولڈر کا ماخذ ہولڈ ہے جس کے معنے گرفت اور پکڑ لے گئے ہیں ـــــــ مزید الفاظ مثلاً تلنگی، کنڑی، گجراتی، بنگالی، یونانی، اطالوی وغیرہ کی تحقیقات اور فراہمی بر سرے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے والے صاحب پر سے ممنون ہوں کہ میں نے بہت سی گنجائش ان کے لئے باقی رکھ چھوڑی ہے خواہ اس کا باعث دردسری سے بچنا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ معلوم نہیں کہ قدیم ترین تحریرات مثلاً ہیروغلیفی وغیرہ کیونکر لکھی جاتی تھیں۔ موم منڈھی ہوئی تختیوں پر روما میں قبل مسیح سُنوے سے لکھا جاتا تھا۔ پروں کے قلم بھی مروّج ہوئے مگر ان کا زمانہ غالباً بہت بعد کا ہے کیونکہ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ "پروں کے قلم کا خصوصی تذکرہ سینٹ اسیڈور آف ساویھ (ST. ISIDORE OF SAVIHE) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہ ساتویں صدی کی ابتدا سے متعلق ہے۔ مگر یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس سے بہت پہلے بھی پر لکھنے میں مستعمل نہیں ہوتے تھے۔"

عموماً قاز کے بازو کے پر قلم کے کام میں آتے ہیں اور انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے بموجب ۱۸۰۹ء میں جوسف براما (J. BRAMAH) نے پر کو تین تین چار چار ٹکڑے کرنے کا ایک آلہ بنا کر اپنے نام سے حق ایجاد کا تحفظ کرایا۔ وہ ہر ٹکڑے کو دو سے پانچ تک شگاف دیا کرتا تھا۔ مگر یہ شگاف قلم یا پر کی صرف نوک پر ہوتے تھے۔ اور بقدر ضرورت طویل بنائے جاتے تھے۔

اس کے بعد ہی پتّی والے قلم وجود میں آگئے۔ ان میں پتّی (نب) قلم میں لگائی جاتی اور ناکارہ ہونے پر بدلی جا سکتی تھی۔ ۱۸۱۸ء میں چارلس واٹ نے پروں اور قلموں کے متعلق ایک اور ایجاد کا تحفظ کرایا۔ یہ سنہری قلموں کا پیش خیمہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ اہم ترقی ۱۸۲۲ء میں ہوئی جب ہاکنس (JI HAWKINS) اور مارڈین (S. MARDEN) نے کانٹوں اور کچھوے کی پشت کا سخت غلافی مادہ قلم کی پتّیوں میں استعمال کرنے کا حق محفوظ کرایا۔ ان پتّیوں کی نوک ہیرے یا لعل کے ٹکڑوں یا کسی اور ایسی ہی سخت چیز سے دیرپا بنائی جاتی تھی۔ یا کچھوے کی کھال سے بنائی ہوئی پتّی کی نوک پر سونے کی ایک پتلی پرت چڑھا دی جاتی تھی۔

دھاتی قلم بھی قدیم زمانے سے استعمال میں آتے تھے جس کا ایک بچا کچھا نمونہ پامپی آئی کے کھنڈروں سے دستیاب ہوا تھا اور اب ناپلی (NAPLES) کے عجائب خانے میں نمایاں کیا گیا ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو انیسویں صدی کے وسط تک ان کا عام رواج نہ تھا اور ہوتا بھی کیونکر؟ لکھنے پڑھنے کا بھی تو عام رواج نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ برمنگھم کا ایک کل کار (مشینسٹ) اور چھلہ ساز (SPLIT RING MANUFACTUR) نے جس کا نام سیاموئیل ہیریسن تھا ۱۷۸۰ء میں ایک فولادی قلم ڈاکٹر جوشیا پریسٹلے کے لیے تیار کیا۔ ۱۸۰۳ء میں لندن میں وائز نامی ایک شخص فولادی قلم بنا کر فروخت کرتا تھا۔ اس کا شکل معمولی پر کے قلموں کی سی تھی اور اس پر شگاف بھی تھا۔ اس کی قیمت پانچ شلنگ کے قریب تھی۔ لیکن چونکہ وہ سخت اور نا ملائم ہونے کے علاوہ غیر تشفی بخش تھا اس لئے اس کی زیادہ مانگ نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں منظم طور پر سستے قلم بکتے نظر آئے۔ اس پر جوشیا مارسن نے جو سیاموئیل ہیریسن کا شریک کار تھا۔

پیری سے اشتراک عمل کر کے اس میں بہت سی اصلاح وارزانی پیدا کی! او پہلے نلی دار اور پھر شگاف دار قلم بنائے پیری نے جو دھاتی قلموں کے عام استعمال میں آنے کا بڑا باعث ہے ۱۸۳۰ء میں ایک اور ایجاد محفوظ کرالی جس میں پتی ایک درمیانی سوراخ اور طرفی شگافوں کے ذریعے بہت نرم کر دی گئی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں جوسف گلاٹ نے یہ اصلاح کی کہ پتی کی نوک لانبی کر دی۔

برمنگھم فولادی قلم سازی کا پہلا گھر ہے اور اب بھی اس کا اہم مرکز ہے۔

موجدوں نے فولاد کے علاوہ دوسری دھاتوں کے استعمال کی بھی تجویز کی۔ ان میں سے سونا، چاندی جست، جرمن سلور، الیومینیم، الیومینی کا نسا زیادہ عام ہیں۔ ڈاکٹر ڈالٹس کے پاس سنہری قلم کا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ہلکے سنہری غلاف کے سرے پر ریڈیم دھات لگائی گئی تھی۔ یہ ظاہر یہ ڈاکن کی ۱۸۰۸ء کی ایجاد کے اصول پر تیار کیا گیا تھا اور اس قسم کا ایک قلم ۱۸۱۱ء میں لارڈ بائرن مشہور شاعر نے استعمال کیا تھا۔ سونا چونکہ ایک نہ گھسنے والی دھات ہے اس لئے اس سے بنی ہوئی پتیاں بہت پائدار ہوتی ہیں۔ مگر یہ دھات اتنی نرم ہوتی ہے کہ اس سے نوک نہیں بنائی جا سکتی۔ اسی وجہ سے اس میں ایک سخت تر دھات لگانی پڑتی ہے۔

بار بار نئی سیاہی لئے بغیر قلم کو زیادہ سے زیادہ دیر تک مصروف رکھ سکنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں اگر سیاہ و رنگین پنسلوں کو خارج بھی کر دیں تو خزانہ دار اور دیر کش قلموں کی دو عام قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک میں نبی ہی ایسی بنائی جاتی ہے جو زیادہ سیاہی رکھ سکے۔ دوسری قسم بہت زیادہ اہم ہے۔ اس میں قلم کا تنہ سیاہی کا خزانہ بنا دیا جاتا ہے۔ سیاہی تنے میں سے خود بخود پتی میں آتی رہتی ہے۔ ایسے قلم ہر جگہ لیجائے جا سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے ایسے قلموں کو سیاہی دار نلی اور فونٹین پین کہتے آئے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو اس سے ایک صدی بعد کے موجدوں نے ان کو بنانا شروع کیا۔ جوسف براما نے متعدد نمونوں کی ایجاد محفوظ کرائی۔ ان نمونوں میں سے ایک یہ تھا کہ سیاہی دان چاندی یا کسی اور دھات کے اتنے پتلے ورقوں یا ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا کہ اسے دبا سکتے تھے، اور اس طرح سیاہی پتی میں پہنچائی جاتی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سیاہی دان میں ایک چھوٹا سا عمود یا استوانہ رکھا جاتا تھا جو پمپ کے اصول پر کام دیتا تھا۔ جدید قلموں میں سیاہی خود بخود پتی تک پہنچ جاتی تھی اور سیاہی دان میں ہوا جانے کا راستہ رکھنے کے باعث کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی اور سیاہی کے خرچ ہونے سے جو خلا پیدا ہوتا تھا اس میں ہوا داخل ہو جاتی تھی۔

بعض خزانہ دار قلم سیاہی کش ہوتے ہیں۔ اور پمپ کو حرکت دینے سے خود بخود سیاہی قلم کے تنے

میں بھر جاتی ہے ۔ یہ نسبتاً حال کی ایجاد تو نہیں البتہ اصلاح ہے ۔

بعض قلموں میں تو پتی سرے سے نکال دی گئی ہے اور سیاہی ایک باریک نلی میں سے اترتی ہے جس کے اندر ایک مخروطی سوئی ہوتی ہے ۔ قلم کو کاغذ سے لگانے پر یہ سوئی اندر دیکر سیاہی کا راستہ چھوڑ دیتی ہے اور کاغذ پر سے قلم اٹھا لینے پر سوئی پھر ابھر کر باریک نلی کا راستہ بند کر دیتی ہے اور سیاہی کو ٹپکنے یا قطرنے سے روک دیتی ہے ۔ ایسے قلم اسٹیلوگراف کہلاتے ہیں ۔

فونٹین پین ربر اور گندھک کے مرکب کو سخت کر بناتے ہیں ۔ جیسا کہ بک آف نالیج ص۲۵ میں لکھا ہے حال ہی میں امریکہ میں شب چراغ قلم نکلے ہیں جن میں پتی کے پاس ایک چھوٹا سا برقی قمقمہ (بلب) ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے برقی خزانہ یا بیاٹری ہوتی ہے ۔ اس میں روشنی صرف اس حصے پر پڑتی ہے جہاں لکھنا مقصود ہوتا ہے ۔ (ماڈرن ریویو کلکتہ) ۔

قلم کی بعض اور قسموں میں سے بلفم سنگ زیرہ (SLATE) کا قلم اور سرمے کا قلم یا پنسل اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں ۔ خشک اور سیال رنگ کی مدد سے لکھنے والے قلموں کا ایک حد تک ذکر ہو چکا ہے ۔ لیکن کھرچے ہوئے حروف کی ایک اب بھی باقی ماندہ شکل سلیٹ کی صورت میں پائی جاتی ہے ۔ اس میں بلفم (سنگ زیرہ) کا نرم پتھر پر اور حال میں مزید پائداری کے لئے کاغذی پٹھوں پر اس کا مسالہ لگا کر ـــــ بہ آسانی مٹ سکنے والے حروف کھرچے جاتے ہیں ۔ یہاں قدیم پتوں کی تحریروں کی طرف ایک اشارہ بے محل نہ ہوگا ۔ جو تاڑ وغیرہ کے پتوں پر لکھی جاتی تھیں ۔

مضمون بڑھانے کی خاطر ہم حروف نوشت آلے یعنی ٹائپ رائٹر اور مطبع یا پریس کا اس سلسلے میں ذکر کر سکتے ہیں ۔ حالیہ زمانے میں کلکاری کی ترقی سے حروف خود بخود ڈھل کر جمتے جاتے ہیں اور متعدد کام بہ آسانی یکجا طے ہو جاتے ہیں ۔

اب آواز نوشت آلے یا قلم بھی عام ہو چکے ہیں ۔ اس کے ذریعے سے آواز کا اتار چڑھاؤ وغیرہ اپنے آپ کو ایک خط منحنی میں (. . . . . . .) تحریر کرا دیتا ہے ۔ سرد ممالک میں بادل پر لکھنا اب مروج ہو چکا ہے ۔ اس کا اشارہ بھی ضروری تھا ۔

اس ضمن کے اختتام پر بالوں کے قلم یعنی برش کا تذکرہ شاید غیر متعلق نہ ہوگا ۔ یہ رنگ آمیزی خصوصاً نقشہ کشی کے لیے مستعمل ہوتا ہے اور گلہری وغیرہ کے بالوں سے بنایا جاتا ہے ۔

اپنے خیالات کو خواہ الفاظ اور عبارت میں یا نقش و نگار میں دوسروں کے لئے اور نیز خود اپنی آئندہ ضرورتوں کے لئے محفوظ کر لینا قلم کا فریضہ ہے۔ لکھنے کے ساتھ ہی ہم کو تحریر اور ساتھ ہی ساتھ پڑھنے کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے غیر معہود (UNCONVENTIONAL) اشارات سے ہمیں زیادہ بحث نہیں۔ ان کو صرف خاص شخص ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس قسم کے مخفی خطوں کا ذکر زیادہ صحیح طور پر خط یا تحریر کی تاریخ میں آنا چاہیئے۔

قلم کے ساتھ قلم سازی، قلم فروشی، خوش خطی، تصنیف و تالیف یعنی نفس خامہ فرسائی، ٹائپ اور طباعت مع فروع سب قلم کے ذیلی متعلقہ پیشیوں میں داخل ہو سکتے ہیں مگر ان کا تذکرہ بھرتی کے مضمون کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے؟

افسوس ہے کہ اس ضمن میں بالکل برجستہ نگاری پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ کسی وسیع تلاش اور جستجو کو کسی آئندہ موقعے یا مضمون نگار کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ قلم تین چار جگہ وارد ہوا ہے سب سے اہم وہ آیتیں ہیں جن سے تیمناً تبرکاً مسلمان بچوں کو پڑھنا شروع کرایا جاتا ہے اور جو سب سے پہلی وحی میں سرور کائنات صلعم پر نازل ہوئیں۔ وہ یہ ہیں:۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

اس جامع اور حقیقت آمیز تذکرے کا ترجمہ یہ ہے کہ "پڑھ اپنے خالق پروردگار کے نام سے جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اپنے بزرگ پروردگار کے نام سے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا"

ایک مشہور تفسیر میں اس کے متعلق یہ تعلیق کی گئی ہے کہ "خدا نے اپنے بندوں کو نامعلوم باتیں معلوم کرائیں اور انہیں جہل کی تاریکی سے علم کی روشنی میں پہنچایا اور فن کتابت کی فضیلت سے آگاہ کیا کیونکہ اس میں جو عظیم منافع ہیں وہ غیر محدود ہیں۔ تمام علوم کی تدوین، حکومتوں کا گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا ان کے مقالات کا اور منزل من اللہ کتابوں کا انضباط اسی کے ذریعے ممکن ہو سکا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو دینی و دنیاوی امور میں استقامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کی عظیم ترین حکمت اور لطیف ترین تدبیر تھی کہ قلم اور خط انسان کو دے گئے"

حضرت ابن الزبیرؓ قلم کے معنے "علم الخط" کے لیتے ہیں

ایک اور جگہ یہ آیت ہے ن والقلم وما یسطرون ۝ یعنی قسم ہے نون اور قلم اور

اس چیز کی جسے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ نُون کے مختلف معنے مراد لئے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں "نُون" سے مراد دوات ہے جیسا کہ حرفِ نون کی شکل دلالت کرتی ہے۔ بعض لوگ اس کے معنے کرۂ ارض کے لیتے ہیں۔ غرض حقیقت جو بھی ہو خدا جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے ان میں شامل ہونے کی عزت قلم کو بھی حاصل ہے اور اس کا باعث اس کی وہ عظیم اہمیت ہے جو اسے انسانی تمدن میں حاصل رہی ہے۔

تیسری جگہ ایک ضمنی تذکرہ ہے کہ حضرت مریم عذراؑ کی تولیت حاصل کرنے کے متعلق بیت المقدس کے راہبوں میں جب اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے قلم سے قرعہ ڈالا تھا "اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ" یعنی جب وہ اپنے قلم یہ معلوم کرنے کے لئے ڈالنے لگے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے" یہودی روایات کے بموجب سب عابدوں کے قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگے لیکن حضرت زکریاؑ کا قلم بہاؤ کی مخالف سمت میں اوپر جانے لگا اس طرح انہیں کو کفیل قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب اس سے کم از کم اتنی بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کے زمانے سے پہلے بھی قلم رائج ہو چکا تھا اور اس سے توریت لکھی جاتی تھی۔

ایک اور جگہ سورہ لقمان میں یہ آیت شریفہ ہے کہ "وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ" یعنی اگر زمین پر کے تمام درخت قلم ہو جائیں اور سمندر سیاہی کا کام دے اور اس کے بعد پھر سات سمندر ہوں تو بھی خدا کی نشانیاں ختم نہ ہوں۔ بے شبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

احادیث بھی اس کے متعلق متعدد ہیں چنانچہ یہ مشہور حدیث ہے کہ "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ فَجَرٰی بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ" یعنی خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پھر اسے حکم دیا کہ لکھ۔ چنانچہ ابدالدہر تک جو کچھ ہونے والا تھا اسے قلم نے لکھ دیا۔

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ بھی ایک حدیث ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قلم جو کچھ ہونے والا ہے اُسے لکھ کر سوکھ گیا یعنی تقدیر ہو چکی اب اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

ترمذی میں ایک حدیث زید بن ثابتؓ سے جو وحی نویسی کا معزز کام انجام دیتے تھے یوں مروی ہے کہ "ضَعِ الْقَلَمَ عَلٰی اُذُنِكَ فَاِنَّهٗ اَذْكَرُ لِلْمُمْلِیْ" یعنی قلم اپنی کان پر رکھو۔ یہ لکھنے والے کو خوب یاد دلاتا ہے۔ ایک حدیث ایک ترکی خطاطی کے شہ کار سے پر بیہ نظر آئی "وَحَقِّ الْحَقِّ الْحِكْمَةِ نِظَامُ الْعَالَمِ بِالنُّوْنِ وَالْقَلَمِ" یعنی خدا نے نون اور قلم کے ذریعے اپنی حکمت سے نظامِ عالم مکمل و مستحکم کیا۔

عربی اردو ترکی فارسی اشعار غالباً بہت سے ملینگے۔ اس وقت صرف دو تین منقولوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے ۔

و رواقمر رقنس کمثل ارا قم

قطف الخطا نیا له اقصی المدی

سود الفوائد مالم یجد سیر ھا

الا اذا لعیت ھا بیض المدی

یعنے قلم کی تحریر بعض وقت سانپ کے زہر کا اثر رکھتی ہے اور اس کا اثر ہمیشہ ابدالدہر تک باقی رہتا ہے۔ جب تک وہ چلتا نہیں اس کے پاؤں (روشنائی سے) سیاہ رہتے ہیں اور جب صاف نہ چلے تو چاقو سے چھیلا جاتا ہے۔

قلم گفت کہ من شاہ جہانم — قلمکش ابدولت می رسانم

اگر بدبخت باشد من چہ دانم — ولی یک با بدولت میرسانم

ارباب قلم تربیت آموز امم در

آداب امم ماحصل فیض قلمدر

قدر قلمی آکلاکہ اجلال عظیمی

نزدیک الٰہیہ ، بلیہ جای قسمدر

ہپ فیض قلمدر اوفضیلت کہ ہمیشہ

ہم دولتہ ہم ملتہ مسؤل اہمدر

جرای قلمدن دوکولن آثار معارف

باغ وطن ودولتہ باران کرمدر

اہل قلمک بیلملیدر قدرینی زیرا

اندیشہ لری مائدہ ابواب نعمدر

یعنے اہل قلم قوم کے معلم ہوتے ہیں اور کسی قوم کے ادبیات قلم ہی کے مرہون منت ہیں۔ قلم کی اتنی بڑی عزت ہے کہ خدا نے اس کی قسم کھائی ہے۔ سب جگہ قلم کا فیض ہے اور اس کی اتنی عزت ہے کہ سلطنت اور قوم دونوں اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ قلم کی ندی (تحریر) سے ملک اور سلطنت کا باغ سیراب ہوتا ہے اہل قلم کی قدر و منزلت معلوم کرنی ضروری ہے کیونکہ اس کے افکار و خیالات سے دنیا بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

ایثار محبت

(از جناب شبیر حسین صاحب قیس متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

جان ایک غریب کسان کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کی تھی۔ اس کا جسم سڈول اور قوی تھا۔ آنکھیں بڑی اور کالی تھیں۔ وہ ایک ذہین اور ہوشیار طالب علم تھا۔ اور بورڈنگ ہاؤس میں سکونت پذیر تھا۔ چونکہ اسکول بند ہونے والا تھا۔ اس لئے اس نے بورڈنگ کو خیرباد کہا اور اپنے مکان کو جو قریب کے قصبہ میں واقع تھا روانہ ہوا اور رات ایک سرائے میں بسر کی۔

علی الصباح جان اٹھا۔ اور منہ دھونے کی غرض سے باہر کے حوض پر آیا۔ اس اثنا میں ایک بگھی جو کسی امیر کی معلوم ہوتی تھی۔ سرائے میں آکر رکی جس میں سے میری اماونٹس اور اس کی ۹ سالہ بیٹی لارنا اتریں۔ یہ لوگ ابھی اچھی طرح دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ایک سوار نے ”ڈون“ کی خبر دی جو چند آدمیوں پر ظلم کر رہے تھے۔ اس خبر سے سب کے دل لرز گئے اور ایک ہل چل مچ گئی۔ کیونکہ ڈون ایک قزاقوں کا گروہ تھا۔ اس قصبہ کے قرب و جوار کی پہاڑیاں اور گھاٹیاں ان کا ماوی و ملجا تھیں۔ ان کا دست تطاول چپہ چپہ پر چھایا ہوا تھا۔ ہر فرد ان کے نام سے کانپ اٹھتا۔ اور بیچارے مسافروں کی جان تو ہتھیلی پر تھی۔

میری کی بگھی منزل مقصود کے لئے تیار ہو چکی تھی وہ دوسرے راستہ سے جو زیادہ پر خوف نہ تھا جانیوالے تھے جان صابن مل کر منہ اور سر دھونے ہی والا تھا کہ لارنا کا ادھر سے گذر ہوا۔ کیونکہ بگھی وہیں قریب کھڑی تھی۔ لارنا کھڑی ہو گئی اور ہمدردی کے طور پر اس نے جان کے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جان اس سے مطلق بے خبر تھا۔ اس نے منہ پونچھا۔ پھر اس کی نظر معصوم لارنا پر پڑی جو مسکرا رہی تھی جان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور بہت خوش ہوا۔ وقت تنگ تھا اس لئے آپس میں زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ جان چاہتا تھا کہ لارنا کو کوئی نشانی دے۔ بیچارے غریب کے پاس کیا دھرا تھا جو دیتا۔ آخر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا جس پر جان کندہ تھا۔ اس نے چاقو دیتے ہوئے کہا ”لارنا مجھے بھول نہ جانا یہ چاقو میری نشانی ہے ممکن ہے کہ کسی آفت کے وقت کام آئے“ لارنا کی نشیلی آنکھیں مرہون منت ہونے کا اظہار کر رہی تھیں اور اس کا چہرہ دلی احساسات کی چغلی کر رہا تھا۔ جو قدرتاً اس اتفاقیہ ملاقات سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے بھی اپنی تمام طفلانہ ادائے نسائیت کے ساتھ ایک رومال پیش کیا اور جان نے اس کا پیش کش قبول کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ لیکن ان کے پاک دل ایک دوسرے کو گہری نظر محبت سے دیکھ رہے تھے

گاڑی روانہ ہوئی اور گھوڑے نہایت تیزی سے بھاگ رہے تھے کہ مبادا راستہ میں کہیں شام ہو جائے۔ جان اسے برابر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ بگھی ناہموار راستے کو طے کرتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے معصوم دل میں ایک خفیف سا درد پیدا ہوا۔ آنکھوں میں دو بڑے بڑے گرم آنسو بھر آئے۔ یہ اولین زینۂ محبت تھا۔

خورشید اپنی ضیا بار شعاعوں کو سمیٹے آغوش مغرب میں پنہاں ہو چکا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ بگھی کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی ٹاپوں کی آواز اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ایک گونج پیدا کر رہی تھی۔ قزاقوں کے سردار سرلیز ڈون نے آواز سنی اور بگھی کو دیکھتے ہی عقاب کی طرح اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو لئے ہوئے تازہ شکار پر گرا اور عین دریا کے بیچ گھیر لیا۔ میری اور لارنا مارے ڈر کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ ڈاکوؤں نے میری کو گھسیٹ کر گود میں اٹھالیا۔ لیکن لارنا برابر جان کے چاقو کی مدد سے بچاؤ کرتی رہی۔ آخرکار وہ بھی سردار کے پاس لائی گئی۔ اُس نے لارنا کو اپنے گھوڑے پر بٹھالیا۔ اور میری کے گلے سے موتیوں کا ہار چھین لیا۔ جگر سوختہ ماں بیٹی لپٹ کر رونے لگے لیکن سرلیز ڈون نے اسے اکیلا ڈھکیل دیا۔ اور وہ سب روانہ ہوئے۔

میری دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔ اپنی حالت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایک بڑی سے لہر آئی اور بیہوش میری کو آغوش میں لیکر لارنا سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

بہادر جان بگھی کے پیچھے پیچھے پہاڑ کی چوٹی تک نکل آیا تھا اس نے سب کچھ دیکھا۔ وہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں سے قزاقوں کی جماعت گذر رہی تھی جسکا اثر کچھ ہوا تو نہیں۔ اور وہ بیچارہ کر کیا سکتا تھا۔ مگر قزاق پریشان تو ضرور ہوئے۔ اس نے قسم کھائی ”میں بڑا ہو کر ایک ڈون کو بھی زندہ نہ رہنے دونگا۔ اور کچا چبا جاؤنگا“۔ یہ کہکر وہ اپنے مکان واپس ہوا۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کے پرجوش دل میں خون انتقام موجیں مار رہا تھا۔

(۲)

اس واقعہ کو گذرے کئی سال ہو گئے۔ دنیا میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ جان جوان ہوا۔ بلکہ قوی خوشرو نوجوان لیکن اس کا دل لارنا کی محبت سے کبھی خالی نہ رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے یاد کر کرکے رویا کرتا۔ اس کا عہد طفلی انکھوں میں برابر گھومتا۔ اس کی آنکھیں مخمور اس کے گیسو عنبرین دام الفت کی طرح جان کو کھینچ رہے تھے۔ اس کا پیکر نازنین جان کے دل میں حرف کالحجر کی طرح منقش تھا۔ اس کی زبان اس کی محبت کے گیت الاپتی۔ اور وہ بہت دیر تک اس کی خیالی تصویر سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس کی نظر میں وہ لعبت حسن تھی۔ سراپا ناز۔ اور اب وہ حسن کی دیوی

کی طرح اس کی پرستش کرتا۔ وہ دوشیزہ تھی جس کے ہر انداز میں وہ شباب کی رعنائیاں مضمر تھیں جو بہت جلد رونما ہو کر دنیا میں بے مثل نظیر حسن پیش کرنے والی ہیں۔ اسکا خیالی تصور اسے ورطہ حیرت میں ڈالدیتا کہ اُف اسکی کافر جوانی کس بلا کی ہوگی۔ اور وہ سہم جاتا۔ اگر لارنا ان خوبیوں سے مبرا ہوتی تو جان اپنی چچیری بہن الزبتھ سے کبھی کے شادی کر لیا ہوتا۔ مگر لارنا اس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اسکا سچا پرستار تھا۔ اس کا دیوانہ اور اس کی شمع حسن کا پروانہ اس کے تصور سے اس پر ایک کیفیت مستولی ہوتی۔ اور وہ جھومنے لگتا۔ گو لارنا کی جدائی کو چھ سات سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ تاہم وہ اس کی راہ محبت میں ایک اٹل پہاڑ تھا اور لارنا کی موہنی مورت اس پر کھدی ہوئی تھی۔

وہ روزانہ حسب معمول ندی میں سے لکڑی کا شہتیر اٹھا رہا تھا جس کو وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ یہ ندی قزاقوں کے مکان کے قریب سے گذرتی تھی۔ جان نے تھوڑی دور تک اسے لانے کی کوشش کی لیکن وہ پھسلا سنبھلا مگر پانی کا سیل سیل بے پناہ کی طرح امنڈ رہا تھا جس نے اسے بہا دیا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی پتھر کے قریب رکجائے وہ رک گیا مگر اس کے سامنے ایک بلند آبشار تھا جو ۲۰۰ فٹ کی بلندی سے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے موت کا یقین ہو گیا۔ ایک ریلے نے اسے آبشار کے خونخوار منہ میں ڈالدیا جس نے اسے مچھلی کی طرح نیچے پھینکا۔ اور وہ بھنور میں چکر کھانے لگا۔ اس کی قسمت نے یاوری کی — اور بھنور نے اسے اٹھا کر کنارہ پر اچھالدیا۔ وہ بیہوش تھا — ادہموا۔ اور اس کے سر سے خون جاری تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد اس نے اپنی آنکھ کھولی۔ اسے جنت کا خیال ہوا۔ پھر اس نے ایک دوشیزہ کو دیکھا جسکے زانو پر اس کا سر تھا اور وہ اس کا زخم صاف کر رہی تھی اسے خیال ہوتا تھا کہ اس شخص کو اس نے کبھی دیکھا ہے۔ جان نے اسے حور تصور کیا وہ ششدر تھا۔ نوجوان لڑکی نے ایک دلربا تبسم کے ساتھ اس کا نام پوچھا جس پر جان نے اپنی نحیف آواز سے اپنا نام بتلایا۔ لڑکی نے عہد طفلی پر ایک اجمالی نظر ڈالی اس پلکیںاد۔ اور اس کا چہرہ کھل گیا۔ جان نے حیرت سے اس کا بھی نام پوچھا جس کے جواب پر اسے یقین نہ آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ لارنا نے مصر ہو کر وہی چاقو اٹھالائی جس پر لفظ جان کندہ تھا اور اسے دکھایا۔

جس طرح ایک دیا ویران گھر میں مدت ہوانکے بعد رکھنے سے چمک پیدا کر کے اس ویرانہ کو آباد کر دیتا ہے جس طرح بلبل گلاب کو دوبارہ دیکھ کر چکور چاند کی دید سے خوش ہو کر رقص میں آتے ہیں جسطرح شبنم پژمردہ پھول کی آغوش میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔ ایک مرجھایا ہوا درخت نسیم کے جھونکے سے تازہ ہو جاتا ہے۔ ایک خزاں رسیدہ چمن ابر باراں کے فیض سے سرسبز ہوتا ہے۔ اور اس میں پھر ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح

جان اور لارنا نے ایک دوسرے میں روح پھونک دی دونوں فرط محبت سے بغلگیر ہوئے۔ ان کے دل بے لوث و پاک دل سے ملے اور ان کی آبادی قلب پھر معہ باش ہوئی گزشتہ عہد طفلی کی کیفیت عود کر رہی تھی پچھلی تجلیاں دوبارہ ان کے گوشہائے قلب میں شرارے کی طرح ضوفشاں ہوئی۔ وہ اس اتفاقیہ ملاقات سے شاداں تھے۔ اسد رجہ کہ وہ ایک جان دو قالب نظر آ رہے تھے۔

اس غیر توقع ملاقات کو زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا اور ان کا پیمانہ مسرت پورا لبریز نہ ہونے پایا تھا کہ ایک قزاق دکھائی دیا۔ لارنا جان کے بچاؤ کے لئے ایک راستہ بتا رہا حرمان نصیب جان نے کہا "میری پیاری لارنا اگر کسی وقت مدد کی ضرورت ہو تو پہاڑی کے اوپر سے کپڑا ہلا کر مجھے آگاہ کر دینا۔ میں تیرے لئے اپنا خون بہانے اور کٹ مرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہونگا۔ چاہے آفات کا پہاڑ کیوں نہ حائل ہو چاہے آگ کا دریا سامنے ہو لیکن تیرا جان اپنی جان نثار کرنے کے لئے ہرگز ہرگز دریغ نہ کرے گا۔ اچھا خدا حافظ اور اس نے اپنا راستہ اختیار کیا۔ لارنا کو جب تک جان نظر پڑا اس نے راہ میں آنکھیں بچھائیں اور وہ پرنم ہوگئیں۔

(۳)

سرانیر ڈون بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ لارنا کو اپنے ہی پاس رکھتا اور نہایت شفقت سے پیش آتا۔ ایڈمن ڈون (جو کہ اس کا مشیر خاص تھا) چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کرمن ڈون کی شادی لارنا کے ساتھ کر دے۔ اسنے بوڑھے کو کرمن ڈون کا پیام دیا۔ اس نے لارنا کو طلب کیا اور پوچھا۔ لارنا نے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرمن ڈون ایک نااہل جابر شرابی جوان تھا۔ سرانیر ڈون نے کہا "میں لارنا کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ وہ اپنا شوہر آپ منتخب کر لے۔ اس پر جبر نہیں ہے"۔ لارنا اپنے شفیق سے لپٹ گئی۔ اور کرمن ڈون اور ایڈمن ڈون اس تکے سے جواب پر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور کرمن ڈون موقع کا متلاشی ہوا۔ کہ کسی طرح ــــــ سے لارنا اس کی بیوی بن جائے۔

سرانیر ڈون چراغ سحری تھا۔ اس نے قبل از مرگ ایک وصیت نامہ لکھا کہ "لارنا اپنے ماں کاؤنٹس میری کی جائداد اور ملکیت کی پوری پوری طور پر حقدار ہے۔ اور سب اسی کو ملنی چاہیئے"۔ اور یہ وصیت نامہ ایک صبا رفتار قزاق کے ہاتھ جمیس دوم کے پاس لندن بھیجدیا گیا تاکہ مبادا وصیت نامہ غصب کر لیا جائے۔ اور لارنا کا کہیں حق مارا نہ جائے۔

اس کے بعد اس نے اس کی ماں کی مالا جو اسے زبردستی چھین لیا تھا اسے واپس دیا اور اشک بار ہو کر لارنا سے معافی چاہی۔ لارنا نے اسے معاف کر دیا کیونکہ وہ اسی کے ساتھ بالکل بیٹی کی طرح سلوک کرتا تھا

اور وہ پھر بیہوش ہوگیا۔

کرمن ڈون نے جب بوڑھے سردار کی حالت سنی تو خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا اور تمام قزاقوں کو اپنی طرف ملالیا۔ نکاح بالجبر کی تیاری کرنے لگا۔ اور نشہ شراب میں چور ہوگیا۔

لارنا صورت حال کو تاڑ گئی۔ اب وہ بالکل بے بس تھی کیونکہ سوائے جان کے کوئی اس کا مددگار نہ تھا اور وہ اسطرح میدان محبت میں اس کا امتحان لے چنانچہ اس نے ایک عورت سے جو اس کو چاہتی تھی التجا کی کہ سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر کپڑا ہلائے اور جب جان آجائے تو اسے مطلع کرے۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا۔

جان اپنے مکان کے باہر اپنی بھیڑیں چرا رہا تھا اور ایک اداسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناگاہ اس کی نظر پہاڑی پر پڑی اور وہ دوڑتا ہوا آبشار پر سے کودا اور ایک جوش کے ساتھ اوپر چڑھ گیا۔ اس عورت نے اسے جبریہ شادی اور لارنا کی بے بسی سے آگاہ کردیا۔ وہ دبے پاؤں مکان کی دیوار کے پاس جا بیٹھا۔ قزاق شراب میں مست تھے۔ لارنا نے اپنے کمرہ کی کھڑکی میں سے جہاں وہ مقید تھی جان کو دیکھا اور آہستہ آواز دی۔ جان کھڑکی کے پاس آیا اس نے اپنا سر لارنا کے پیارے پیارے ہاتھوں پر رکھ دیا اور چومنے لگا۔ بعدازاں اس نے موٹی موٹی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ اور انہیں ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی جان چھپ کر بھاگا اور ایک مدہوش قزاق کی بندوق اٹھا لائی۔ کرمن ڈون شراب میں ڈوبا ہوا آیا اور لارنا کو زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ مانک نکاح پڑھانے پر کسی طرح راضی ہی نہ ہوتا تھا لیکن کرمن نے اسے موت کی دھمکی دی۔ اور وہ جان کے خوف سے راضی ہوگیا۔

جان دوسری طرف سے آیا اور ایک بیہوش قزاق کو اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں نکاح ہونے والا تھا۔ موم بتیاں گل ہوگئیں اور آپس میں اندھوں کی طرح لڑائی چلنے لگی کیونکہ وہ بے حد شراب پئے ہوئے تھے۔ بہادر جان نے ایک جست لگائی۔ اس نے لارنا کو اندھیرے میں اٹھایا۔ چار پانچ کو ٹھوکروں اور گھونسوں سے ٹھیک کرکے لارنا کو لیکر بھاگ گیا قزاقوں میں اسی طرح جوتا چل رہا تھا۔ اس لئے کامیاب جان اپنی دلبر اپنی ملکہ کو گود میں اٹھائے اپنے قصبہ پہونچ گیا۔

(۴)

دوسرے دن صبح کو جان اور لارنا محو خرام تھے۔ اور ایک دوسرے پر محبت کی نظریں ڈال رہے تھے۔ اتنے میں ایک شاہی بگھی آکر رکی۔ جس میں ایک کاؤنٹس جیمس دوم کی طرف سے پیغام لیکر آئی تھی کہ وصیت نامہ سے

ایک بڑی غلطی کا ازالہ ہوا۔ اور لارنا کو لندن سے جانے والی تھی۔ لارنا نے جان سے اجازت چاہی اور جان نے بخوشی رخصت کیا۔

بھلا جان کو اب کہاں تاب تھی کہ بغیر لارنا کے رہ سکتا۔ لہٰذا وہ بھی چند روز کے بعد لندن روانہ ہوا۔ جیمس کے عہد کا مشہور واقعہ یعنی بپتسمہ کی رسم عمل میں آنے والی تھی۔ اور لارنا بھی اس میں مدعو کی گئی تھی اسی روز تمام ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔

چند سازشی اس امر پر تلے ہوئے تھے کہ بچہ کو مار ڈالا جائے اور اس طرح سلطنت کو جیمس دوم کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار سلطنت کا حقدار نہ ہو۔ سازشیوں کے قریب جان بھی بیٹھا تھا۔ اس نے سب سن لیا اور ایک شخص تپنچہ مارنے ہی والا تھا کہ جان کی نظر پڑ گئی اور اس نے جست کر کے تپنچہ چھین لیا اور دو تین کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس واقعہ سے تمام دربار میں کھلبلی مچ گئی۔ اور راز افشا ہو گیا جیمس جان سے بہت خوش ہوا۔ اور لارنا نے اس کا تعارف کیا۔ جان نے محبت کے مارے بچہ کو انا کی گود سے لے لیا۔ یہ حرکت بہت بری تھی۔ اس لئے جیمس کو ناگوار گذرا۔ اور جان دوسرے روز ندامت سے بچنے کے لئے اپنے قصبہ چلا آیا۔

اسے جب کبھی یہ خیال آتا کہ لارنا اسقدر امیر لڑکی ہے اور وہ ایک غریب تو اس کے دل میں ایک درد سے پیدا ہوتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لارنا کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

وہ گھر پہونچا۔ اس کی بہن الزبیتھ نے پیالہ میں دودھ دیا لیکن اس نے حقارت سے واپس کر دیا۔ لارنا کی محبت اور یہ نفرت الزبیتھ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ اور وہ لارنا کا قصہ پاک کرنے کی تدبیر سوچنے لگی۔

لارنا باوفا لارنا نے اپنے مال، اپنے جاہ و حشم کو ٹھکرا دیا۔ اور وہ اپنے جان کے پہلو میں محبت کی زندگی بسر کرنے لندن سے گاڑی میں واپس آئی۔ جان غم کی تصویر بنا ہوا ایک لکڑی کے تختہ پر کھڑا تھا۔ لارنا اس کے قریب آئی لیکن جان اسی طرح بت بنا رہا۔ اس کے خیالات منتشر تھے کیونکہ اسے کبھی چین نصیب نہ ہوا۔

لارنا نے کہنا شروع کیا "جان۔ میرے پیارے جان میں صرف تیری محبت کی خاطر جاہ و دولت چھوڑ کر تیری جوگن بنکر آئی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تجھ سے شادی کر کے دن کاٹوں"۔

جان اس ایثار عظیم کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بے تحاشا ہو کر لارنا سے چمٹ گیا۔ اور اس نے اس کے متعدد بوسے لئے۔ اس کے بعد دونوں نے طے کیا کہ جلدی شادی قرار پائے۔

شادی کا اہتمام نہایت سادا تھا اور تصنع نام کو نہ تھا لیکن یہ خوبصورتی تھی [illegible] -

الزبتھ نے قزاقوں سے مدد لینے کا تہیہ کر لیا اور وہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ کر پہاڑی پر گئی اور کرمس کو اطلاع دی کرمن فوراً گرجا پہنچا جہاں نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ اس نے چھپ کر ایک فیر کیا۔ جو لارنا کے پہلو میں لگا اور وہ تڑپنے لگی۔ کرمس گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔

حسرتیں کبھی تنہا نہیں آتیں بلکہ آفتوں کو بھی ساتھ لاتی ہیں۔ آہ رے فلک لارنا نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو اس کا دشمن بن گیا۔ آہ اے دنیا معصوم لارنا کو تو نے کبھی اچھی طرح خوش نہ ہونے دیا بلکہ ہنساتے ہنساتے فوراً منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہ رے چرخ کج رفتار بے گناہ لارنا کے پیچھے تو اسقدر ہاتھ دھو کر کیوں پڑا تھا۔ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی۔ صرف یہ کہ وہ جان پر جان دیتی تھی۔ اس ــــ اس کا نام لے لے کر زندہ تھی۔ صرف یہی کہ اس نے اپنے جان کے لئے راہ محبت میں اپنے کو فنا کر ڈالنے کی غرض سے اپنی ہستی کو نیستی اپنے مال و جواہرات کو اس کے سامنے خاک سمجھتی تھی۔ جان اس کا پیارا جان اس کی نظر میں بیش بہا ہیرا تھا اس کی نظر میں ایک دیوتا تھا جس کی وہ پجاری تھی۔ محبت اگر گناہ ہے تو اے محبت تو ایک سم ہے۔ جاں ستاں۔ ایک افعی ہے زہر آلود۔ اور تو ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔

لارنا بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے۔ جان بازو بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ دل امنڈ رہا ہے۔ اس کی نوجوان آنکھیں آنسوؤں سے سرخ ہیں۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"پیاری ــــ لارنا۔ لارنا۔ آنکھیں کھولو اور اپنے جان کو دیکھو۔ تم مجھ سے خفا ہو گئیں۔ لارنا"

جب صبا چلتی ہے تو اپنے نرم نرم جھوکوں سے پھول کھلا جاتی ہے۔ بالکل اسطرح لارنا کے کانوں نے اپنے محبوب کی آواز سنی اور اس کا غنچہ دہن کھلنے لگا۔ زبان نے حکم محبوب پر لبیک کہا اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنی شروع ہوئی۔ وہ بڑبڑانے لگی "ہاں ــــ میں جان ــــ پیارے جان ــــ کو خوشی سے ــــ قبول ــــ کرتی ہوں ــــ جان ــــ" یہ نکاح کے ایجاب و قبول کے آخری الفاظ تھے۔ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں سب کی توقع اس کی زیست سے قریب قریب منقطع ہو چکی تھی اور جان کی بھی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا تھا۔ وہ فرط تپش سے آگ ہو رہا تھا اسے اپنے بچپن کی قسم یاد آگئی۔ اور وہ دیوانوں کی طرح چند رفقا کو لیکر قزاقوں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔

الزبتھ اپنے فعل سے حد درجہ نادم ہو کر خود بھی معہ اور کسانوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ جان کی مدد کے لئے روانہ ہوئی۔

جان نے تہیہ کر لیا تھا کہ قزاقوں کو حرفِ غلط کی طرح صفحہ روزگار سے مٹا دیگا۔ اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ "مریگا یا ماریگا" لہذا اس نے سیدھے بند چاٹک پر حملہ کیا اور توڑنے کی کوشش کی۔ ادھر بھی پہونچ چکی تھی۔ لہذا حملے بڑے زور و شور سے ہونے لگے۔ جان اوپر تک پہنچ گیا۔ اور اس نے کرمن کو بیچ کر دے مارا۔ وہ بھی سنبھل کر رہ گیا۔ اور دونوں میں خوب کشتی ہونے لگی۔ جان پھر اسے پٹخا۔ اور موقع پاتے ہی کرمن نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چاقو جان کے سینے کے قریب تک آگیا۔ اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ مگر کرمن بھی کافی قوی تھا۔ اس لئے جان نے چاقو والے ہاتھ کا اوپری بازو مروڑ دیا۔ اور اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ جان نے چاقو دلدل میں پھینک دیا۔ اور اس کے بعد کرمن کو دلدل کے نذر کیا۔ جان نے اس طرح بدلہ لیا۔ اور وہ اپنے گھر واپس آیا۔

دنیا ایک منٹ میں کہیں سے کہیں بدل جاتی ہے۔ لانا کا کاری زخم بھر آیا۔ گویا وہ پھر زندہ ہوگئی تھی تاکہ جان کی ہو کر رہے۔ جان کی خدمت کے لئے وہ جنت سے واپس کر دی گئی۔ الزبتھ نے جان کو آتے ہی صحت یابی کا مژدہ سنایا۔ بھلا اسے کب یقین آتا تھا۔ اس کے نزدیک تو وہ مر چکی۔ الزبتھ نے اشارہ سے لارنا کو بتلایا جو اپنی صحت یاب نگاہوں سے اس کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جان کو وفورِ مسرت سے قریب تھا کہ اسے شادی مرگ ہو جائے۔ وہ اس سے جا لپٹ گیا۔ (ماخوذ از ڈرامہ لارنا ڈون)

محرم سے بدتر عید

نہ فراغت ملی ہمیں غم سے — عید بدتر ہوئی محرم سے
عید میں بھی جدا رہے گر تم — کون سے دن ملو گے پھر ہم سے

کس کے لئے مناؤں عید

دیکھ کر مجھ کو کون خوش ہوگا — کس سے میں آج ملنے جاؤں عید
میرا خوش ہونے والا پاس نہیں — پھر میں کس کے لئے مناؤں عید

(راز قاسمی حیدرآبادی)

مشاہدات

(از جناب ابوالفاضل صاحب سراؔز چاندپوری)

(۱)

تمہیدِ نشاطِ نوجوانی دیکھی — تکمیلِ سرورِ کامرانی دیکھی
ممنونِ کرم ہوں باغبانِ فطرت! — جی بھر کے بہارِ زندگانی دیکھی

(۲)

تنویرِ جمالِ صبحِ عشرت دیکھی — تنویرِ سوادِ شامِ راحت دیکھی
اک روز میں دو کرشمہائے دلکش! — اے شاہدِ گل تری کرامت دیکھی

(۳)

ہر نقش میں رنگِ شانِ قدرت دیکھا — ہر رنگ میں جلوۂ حقیقت دیکھا
واللہ! مرقعِ جہان میں میں نے — نقاشِ ازل کا حسنِ صنعت دیکھا

(۴)

گلہائے نظر نوازِ خنداں دیکھے — فطرت کے ہزار رازِ عریاں دیکھے
فردوسِ جہاں میں ہر روش پہ میں نے — محمود نما ایازِ حیراں دیکھے

تنقیدیں

القضاء فی الاسلام
تالیف مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، دریبانی ملبی تقطیع ضخامت (۹۲) صفحات قیمت ۱۲/
پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ

ایک عرصہ سے دار المصنفین اپنی اعلیٰ علمی خدمات کے علاوہ اردو میں خالص اسلامی لٹریچر اور افادہ خاص و عام کے لایق مذہبی و دینی کتب فراہم کرنے کی جو گراں قدر کوشش کر رہا ہے وہ کسی طرح محتاج تعارف نہیں موجودہ زمانہ کے عام تعلیم یافتوں کی عربی زبان سے ناآشنائی کے مدنظر اس کی کسی طرح توقع نہیں کیجا سکتی کہ مذہبی اور دینی علوم جن کی اس وقت تک بہترین سرمایہ دار عربی ہی ہے راست عربی سے حاصل کیئے جائیں گے زمانہ حال نے یہ ضرورت شدید طور پر پیدا کردی ہے کہ جہاں تک زیادہ ممکن ہو اس کے بلند پایہ دینی لٹریچر کو اردو میں منتقل کر لیا جائے تاکہ عام تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان اسلام اور اس کے احکام کو اپنی ہی مادری زبان میں مطالعہ کریں۔ القضاء فی الاسلام، اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے اس میں عدالت اور اس کے تمام متعلقات قاضی، مدعی، مدعا علیہ، گواہ، شہادت اور فصل مقدمات وغیرہ کے مالہ و ما علیہ پر اسلامی احکام وقوانین کی قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے مسلمانوں نے اپنی ملک گیری و ملکداری کے زمانہ دراز میں معدلت گستری اور دادرسی کی جو صورتیں مہیا کی تھیں وہ بڑی حد تک موجودہ امن کے زمانہ کے پرامن انتظام عدالت جیسی تھیں، فاضل مرتب نے جگہ جگہ مختصر طور پر اسلامی عدل گستری کا موجودہ نصفت شعاری سے مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک عام شخص اسلام میں عدالت کے طور طریقوں کی نسبت بہت خاصی معلومات حاصل کر سکتا ہے اور یہی افادیت ہے جس کے باعث اس قسم کے رسایل اردو میں بہت زیادہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جانے چاہئیں۔

عالم حسیات
ازجناب نبی الحسن صاحب شمیم، اوسط تقطیع ضخامت (۲۰)، صفحے قیمت ۴ مطبع عہد آفریں اکسلسیر راڈ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

جناب شمیم ایک جوشیلے اور نو عمر شاعر ہیں اگرچہ وہ شاعری سے زیادہ اکتساب علم و فضل میں منہمک ہیں لیکن شعرگوئی سے طبیعت کا قدرتی لگاؤ ہے کہ بے توجہی کے باوجود وہ ایسے پاکیزہ شعر کہتے ہیں جو بڑی فکر و توجہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں یہ محض طبیعت کی اپج اور مزاج کی مناسبت ہے کہ شمیم صاحب کی شاعری بہت سی اچھی

صفات سے متصف ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انکی جولانی طبع قدیم و جدید ہر دو رنگ میں یکساں ہے وہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں میں کامیابی کے بہت قریب ہیں۔ عالم حیات دونوں قسم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مصنف کی عرض حال کے علاوہ مولوی وہاج الدین صاحب کمتوری لکچرار اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج نے مقدمہ لکھ کر شمیم صاحب کی شاعری کا تعارف کرایا ہے۔ شمیم صاحب کی غزلیں مضمون کے علاوہ لطافت زبان کے لحاظ سے بھی پاکیزہ ہیں اور اس خصوص میں ان کا مذاق سخن ستودہ اور پسندیدہ ہے امید ہے کہ یہ مشق بڑھتے بڑھتے شمیم صاحب کو بہت جلد وسیع شہرت کا مالک بنا دے گی۔

چاند ماہوار مصور رسالہ۔ مدیر منشی کنھیا لال صاحب ام اے ال ال بی۔ ایڈوکیٹ۔ نصف کراؤن تقطیع ضخامت عموماً سو صفحات نہایت دیدہ زیب شکل وصورت سالانہ چندہ آٹھ روپیہ ششماہی پانچ روپیہ۔ پتہ چندر لوک اڈمنسٹن روڈ الہ آباد۔

الہ آباد سے ایک ہندی رسالہ چاند کئی سال سے جاری ہے اور خاص وعام میں بڑی وسیع مقبولیت رکھتا ہے اس کی اشاعت کئی ہزار ہے اور شمالی ہند کے کم وبیش تمام ہندی تعلیم یافتہ اصحاب اس سے واقف ہیں اسی ادارے سے ایک اردو رسالہ اسی نام سے جنوری ۱۹۳۰ء سے جاری ہوا ہے۔ اردو چاند اپنے ہندی ہم نام کی طرح ادبی ذوق کی تکمیل کے ساتھ اصلاح معاشرت اور بالخصوص خواتین میں تعلیم کی اشاعت اور عورتوں کی سماجی پوزیشن کو بلند کرنے کا زبردست حامی ہے اس کے دو نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں دونوں متعدد تصویروں سے آراستہ اور طباعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ مضامین گوناگوں نوعیتوں کے ہیں۔ دونوں نمبروں میں ایک ایک محققانہ تاریخی مقالہ ہے جو مصور بھی ہے۔ پہلے نمبر میں ٹیپو سلطان پر جو مقالہ ہے اس میں منصفانہ تنقید اور تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت پر منشی کنھیا لال صاحب کو ہم مبارکباد دیتے ہیں۔

منشی صاحب اور ان کے رفقاء کار جس خلوص دل سے اردو کی خدمت پر آمادہ ہیں وہ دلی خیر مقدم کا مستحق ہے۔ اردو کے ساتھ ان کا یہ التفات اس کی ترقی کی فال نیک ہے۔ خدا کرے کہ چاند کی ٹھنڈی روشنی اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے میں ممد ومعاون ثابت ہو۔

متعلم سہ ماہی مصور رسالہ، مدیر حفیظ الدین صاحب مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ چندہ سالانہ سے طلبا سے عہ۔ دیدہ زیب طباعت کتابت تقطیع اوسط۔ پتہ دفتر متعلم پتھر گٹی حیدرآباد

یہ مولوی حفیظ اللہ میر صاحب کی کوشش سے حیدرآباد میں ایک مفید رسالہ جاری ہوا ہے اس کا مقصد کمسن طلبہ میں غیر درسی مطالعہ اور مفید و دلکش مضامین کے پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہے مضمون اکثر طالب العلموں کے ہیں۔ چھوٹے سلیس اور ستھرے طرز بیان میں لکھے گئے ہیں تصاویر بھی رسالہ کے مقصد کے مناسب طلبہ کی دلچسپی کی ہیں۔ مدارس تحتانیہ و وسطانیہ کے طلبا اس رسالہ سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سررشتہ تعلیمات جہاں اور رسالے اور اخبارات طلبائے مدارس کے لیئے خریدتا ہے، ہر مدرسہ کے دارالمطالعہ کے لیئے اس کا ایک ایک نسخہ بھی بہم پہونچائیگا۔ میر صاحب نے ایک اچھے کام کی ابتدا کی ہے خدا کرے کہ مستقل حیدرآباد کے کم عمر بچوں کی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو۔

جونیر سلف ٹیچنگ ٹرانسلیشن مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع مجلد ضخامت (۸۸) صفحات ملنے کا پتہ سید طاہر الدصاحب ندوی بی اے چوہٹا باگی پور۔ قیمت ۸/

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو وسطانی مدارس کے ایسے طلبا کو اردو سے انگریزی ترجمہ سکھانے کے لیئے لکھا گیا ہے جنکی مادری زبان اردو ہے۔ لایق مولف نے انگریزی زبان کی گرامر کے مبادیات کی اردو میں تشریح کرکے جملوں کی ترکیب اور مسلسل عبارتوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کرنے کا عملی ڈھنگ پیش کیا ہے۔ اصول کی تشریح و تفہیم کے بعد سو مشقیں دی گئی ہیں جنکے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی کتاب کے آخر میں لگادی گئی ہے۔ مدارس وسطانیہ کے طلبہ کے لیئے ایک مفید کتاب ہے اور بڑی توجہ سے مرتب کی گئی ہے۔

دروس الادب جزو اول مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع صفحات (۸۴) نسخ ٹائپ مجلد قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ مولوی خوندکار فیض الدین احمد صاحب ام اے یونیورسل لائبریری (۸۴) ویلزلی اسٹریٹ کلکتہ قیمت ۱۲/

یہ عربی زبان کی ابتدائی کتاب ہے جو بنگال کے عربی مدارس کی تیسری اور انگریزی مدارس کی ساتویں جماعت کے لیئے جن میں عربی کی تعلیم شروع ہوتی ہے لکھی گئی ہے۔ بنگال میں چونکہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اس لیئے مولف نے اس کتاب میں عربی زبان کی تعلیم بھی انگریزی کے توسط سے پیش کی ہے

عربی کے حروف تہجی کی فہرست دینے کے بعد عربی کے اسماء وافعال وغیرہ کے ساتھ ان کے انگریزی مرادف بھی لکھے گئے ہیں اور جہاں کہیں توضیح کے لیئے عبارت لکھنی پڑی ہے وہ سب انگریزی ہی میں ہے۔ کتاب کے آخری باب میں نظم کے چند سلیس ٹکڑے بھی دئے ہیں۔ اس اصول اور طریقہ پر اس سلسلہ کو آگے بڑھایا جائے اور میٹرک تک عربی نصاب تحریر کیا جائے تو یقیناً اہل بنگال میں عربی ادب کا اچھا ذوق پیدا ہوگا۔

رسید کتب

حسب ذیل کتابوں پر آیندہ شماروں میں تنقید کی جائے گی۔

۱۔ دنیا کے بہترین افسانے مترجمہ از مولوی منصور احمد صاحب شریک مدیر ہمایوں (لاہور)
۲۔ منکران خدا سے خطاب ۔ از مولوی سید علی اختر صاحب اختر
۳۔ ارنسٹ ۔ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بی اے
۴۔ ہماری شاعری۔ از مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ام اے پروفیسر جامعہ لکھنو
۵۔ تاریخ السلف۔ از جناب معنی اجمیری
۶۔ تاریخ سلاطین فاطمیہ۔ از جناب ایس ذاکر حسین صاحب جعفر

اردو ریسرچ میں ایک اہم اضافہ
گلشن گفتار

یہ شعرائے اردو کا ایک قدیم ترین تذکرہ ہے جو اب تک بالکل نایاب تھا اور جس کی دریافت سے اردو کے اساتذہ قدیم کے حالات صحت کے ساتھ معلوم کرنے میں بیش قیمت مدد ملے گی۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے مولف ارباب نثر اردو نے دوسرے تذکروں کے ساتھ تقابل و تطابق کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ہر شاعر کے ذکر میں دوسرے تمام قدیم تذکرہ نویسوں کی معلومات بھی من و عن نقل کردی گئی ہیں جس سے ایک ہی جگہ قدیم اردو شاعروں کی نسبت تمام ممکنہ مواد مل جاتا ہے۔ قیمت ۱۲ تقطیع طباعت کتابت دیدہ زیب۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

اور

اس کی امداد

(از جناب حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی بی ایس' ایم' بی' بی' ایس' نائب ناظم ندوۃ العلماء)

"ندوہ مسلمانوں کی واحد درسگاہ ہے' جو اپنے بل بوتے پر کام کر رہی ہے اور یہ شاید ملک کی ان چند درسگاہوں میں سے ہے جن کا مقصد "علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا" ہے۔ "اس لئے ندوہ کی امداد حقیقی معنوں میں علم کی امداد علما کی امداد اور مسلمانوں کی امداد ہے۔"

قومی اور مذہبی ضروریات میں قومی مدرسہ اور قومی جامعہ کے برابر بلکہ شاید اس سے زاید قومی کتب خانہ کو اہمیت حاصل ہے اگر مسلمانوں کے مذہب' علوم وفنون وادب کو محفوظ رکھنا ہے' تو ضرور ہے کہ ایک وسیع کتب خانہ بہم پہنچایا جائے جس میں ہر علم وفن کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف کا بہترین ذخیرہ موجود ہو۔ ندوۃ العلما نے اس ضرورت کو آغاز قیام ہی کے وقت محسوس کیا اور ساتھ ہی ساتھ عملی قدم اٹھانا شروع کیا چنانچہ اس نے اپنے مقصد کا ایک جزو عظیم الشان کتب خانہ کا قیام قرار دیا' اور سب سے پہلے ۱۳۱۳ھ میں علامہ شبلی نعمانی ؒ نے اپنا کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لئے وقف فرمایا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء اور ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں ندوۃ العلما کے سالانہ جلسہ میں یہ تحریک پیش کی گئی' اور جناب مولانا عبد الرافع خاں صاحب شاہجہاں پوری نے اپنا کتب خانہ جو تین ہزار قابل قدر ذخیرہ پر مشتمل تھا عنایت فرمایا' اس کے بعد اور بزرگوں نے وقتاً فوقتاً اکثر کتابیں مرحمت فرمائیں جس میں جناب نواب عالمگیر محمد خاں صاحب شمس العلماء صفی الدولہ حسام الملک ابو نصر نواب سید محمد علی حسن خاں صاحب طاہر ناظم ندوۃ العلماء' جناب مولانا سید عبد الغنی صاحب بہاری ملازم ریاست حیدرآباد دکن جناب مولانا یحیٰی لکھنوی مرحوم' جناب نواب سکندر نواز جنگ صاحب بہادر ڈپٹنہ' جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی مرحوم' جناب مولوی سید نبی اللہ مرحوم بیرسٹر لکھنؤ' جناب نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین مرحوم امروہہ' جناب مولوی سید حسن شاہ سرور مرحوم' جناب مولوی سید شرف الدین صاحب جج ہائیکورٹ' جناب مولوی سید مصطفےٰ خاں صاحب (نبیرۂ امیر الملک والاجاہ مولانا نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر مرحوم) جناب رضی الدولہ نظام الملک مولانا نواب سید نور الحسن خاں مرحوم' جناب منشی اطہر علی صاحب وکیل رئیس کاکوری خلف خان بہادر جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم' جناب مولوی احمد زماں خاں صاحب رئیس و آنریری

مجسٹریٹ شاہجہاں پور، جناب سید عبدالغفار صاحب کشمیری، جناب مولانا محمد علی صاحب مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء، جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب بی۔ اے امروہہ، جناب وزیر زادہ محمد عثمان بہاء الدین خاں صاحب ریاست جوناگڈھ (کاٹھیاواڑ) جناب صاحبزادہ بصیر احمد خانصاحب بہادر انجنیئر، جناب منیجر صاحب آفتاب صداقت لکھنؤ، جناب مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب (علیگڈھ)، جناب مولانا سید لطف اللہ صاحب خلف جناب مولانا محمد علی مرحوم مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء وغیرہ وغیرہ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دار المصنفین اعظم گڈھ۔ دائرۃ المعارف۔ دار الاشاعت شعبۂ تالیف و ترجمہ حیدر آباد دکن نے اپنے تمام مطبوعات عنایت کیں۔

جزاهم الله خير الجزاء

بزرگان ملت کی ان علم دوست کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اس سے علمی استفادہ کے لئے علماء و مشائخ اور طلبہ صرف ہندوستان سے نہیں بلکہ ممالک غیر سے تشریف لاتے ہیں۔

اس کتب خانہ کی خصوصیات ذیل ہیں۔

(١) اکثر علوم و فنون کے متعلق وہ مستند اور بلند پایہ تصانیف موجود ہیں جس پر اس فن کی بنیاد ہے اور جس سے اس فن کی تدریجی ترقی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

(٢) مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں بعض مصنفین کے قلم کے مسودے ہیں بعض کتابیں شاہی کتب خانوں میں رہ چکی ہیں، متعدد کتابیں مطلا اور مذہب ہیں، ایک بہت اصطرلاب نہایت عمدہ صنعت کا موجود ہے جو شاہجہاں کی وفات سے سات برس بعد لاہور میں تیار کیا گیا

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں صرف نادر قلمی کتابوں کی تعداد پانسو ہے، ان کے علاوہ مطبوعات کا شمار کم و بیش بیس ہزار ہے، اس عظیم الشان اور گراں قدر ذخیرہ میں جن علوم کا سرمایہ خاص طور پر جمع کیا گیا ہے ان میں سے یہاں تفسیر، حدیث، تاریخ اور ادب کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے موجودہ عربی مدارس اور اسلامی ممالک کے بہت سے دینی مدارس میں اس سے بہتر کتب خانہ موجود نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے پیش نظر نصب العین کے لحاظ سے اس کا کتب خانہ اب بھی بہت ہی نا مکمل ہے اور اس کے مخلص دردمندوں کے لئے انتہا افسوسناک ہے کہ وہ ابھی تک اسلامی ادبیات کے ان جواہر پاروں سے خالی ہے جن پر ملت اسلامی تا بہ قیامت ناز کرتی رہے گی اس کمی سے ایک طرف تو کتب خانہ کی جامعیت میں فرق آرہا ہے، دوسری طرف کتب خانہ ندوۃ العلماء کا وہ جلیل القدر مقصد پورا نہیں ہوتا، جس کی مجسم شکل دار العلوم ہے اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ علماء کی ایسی جماعت پیدا کی جائے جو وسعت علم عمیق نظر اور صحت تنقید کے ساتھ قوت اجتہاد رکھنے میں اور اپنی دماغی کد و کاوش سے اسلامی علوم اور ادبیات

میں از سر نو زندگی پیدا کر سکیں، اس اہم کمی کا اندازہ جناب کو مطلوبہ کتابوں کی اس فہرست سے ہو سکتا ہے جو اس گذارش کے ساتھ منسلک ہے۔

اسلامی ہندوستان کی موجودہ عبرت انگیز پستی کے باوجود اب بھی ان کے مکانوں، مٹے ہوئے خاندانوں اور ان کے سڑک پر بیٹھنے والے کتب فروشوں کے ذخیرے میں وہ بیش بہا کتابیں موجود ہیں جن کی تلاش میں مغربی کتب خانوں کے کارپرداز یہاں آتے ہیں لیکن صد افسوس کہ ہمارے نامور اسلاف کے دماغی کاوشوں کے یہ مایۂ ناز نتائج ناقدرشناسی کے ہاتھوں ہمارے ملک سے نکل کر یورپ چلے جا رہے ہیں اور یہ انقلاب حکومت کے زمانہ سے اب تک سلسلہ وار جاری ہے، اور باوجود اس کے کہ بہت سے کتب خانے غارت ہو گئے اور بہت سے قدیم خاندان کے ساتھ ان کے کتب خانے بھی مٹ گئے، بہت سی نادر کتابیں سڑ گئیں برسات میں گل گئیں، کیڑوں نے بیکار کر دیں لیکن غنیمت ہے کہ اب بھی بہت سی کتابیں باقی ہیں جن سے ہمارے اسلاف کی حیرت انگیز دماغی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، لہذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہمدردان علوم اسلامیہ اس کی طرف توجہ فرمائیں اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اول یہ کہ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے ذخیرے ہوں اور وہ ان کی حفاظت کا کماحقہ سامان نہ کر سکتے ہوں وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو عنایت فرمائیں،

دوسری صورت یہ ہے کہ دوسرے کتب خانوں میں جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں اُن کی نقلیں حاصل کیجائیں لیکن ان نقلوں کے حاصل کرنے کے لئے کثیر رقم کی حاجت ہے سر دست مندرجۂ فہرست کتابیں منتخب کی گئی ہیں ہمدردان قوم اور قدردانان علم سے درخواست ہے کہ وہ ان میں سے ایک کتاب کی نقل یا نقل کے پورے یا جزئی مصارف ندوۃ العلماء کو عنایت فرمائیں کہ دنیا میں اپنے اسلاف کے زرین کارناموں کا تحفظ اور آخرت میں اس واجب العمل اسلامی خدمت کا ثواب حاصل فرمائیں۔

یہ بیش بہا کتابیں اگر اسلامی خالص کتب خانہ میں آگئیں تو وہ دست بُردِ زمانہ سے یقیناً محفوظ ہو جائیں گی اور چونکہ اس سے اہل علم وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہیں گے اس لئے صدقہ جاریہ کے اصول پر خدمت علم اور اشاعت مذہب کا ثواب برابر معطی کو ملتا رہے گا۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

فہرست کتب مطلوبہ

نمبر	نام کتاب	جلد	فی جلد جزو	اجرت فی جزو	میزان	نمبر	نام کتاب	جلد	فی جلد جزو	اجرت فی جزو	میزان
۱	مسند ابی عوانہ	۴ جلد	فی جلد ۲۰ جزو	اجرت فی جزو للعہ	امالعہ	۷	کتاب الضعفاء للعقیلی	ایک جلد	فی جلد ۳۵ جزو	اجرت فی جزو للعہ	ماللعہ
۲	مسند عبد بن حمید	ایک جلد	,, ۲۰ ,,	,,	اعیہ	۸	مسند بزار	,,	,, ۳۰ ,,	,,	لعہ
۳	مصنف ابن ابی شیبہ	۴ جلد	,, ۳۵ ,,	,,	عماعیہ	۹	مسند ابی یعلی	,,	,, ۳۵ ,,	,,	باللعہ
۴	صحیح ابن حبان	ایک جلد	,, ۱۵ ,,	,,	سعہ	۱۰	مصنف عبد الرزاق	,,	,, ۳۵ ,,	,,	باللعہ
۵	کتاب الثقات لابن حبان	۴ جلد	,, ۲۰ ,,	,,	ساعہ	۱۱	الاستذکار لابن عبد البر	,,	,, ۲۵ ,,	,,	ا
۶	تمہید لابن عبد البر	,,	,, ۲۵ ,,	,,	اماء	۱۲	مسند ابن ابی شیبہ	,,	,, ۲۰ ,,	,,	لعہ
						۱۳	الاطراف للمزی	,,	,, ۶۰ ,,	,,	۱۲للعہ

میزان کل [illegible] ,, ۲۸۶۰

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) ۱۲ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ہر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا
"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

وجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو کھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محلہ مالگزاری حیدرآباد دکن۔

مجلہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ تیر ۱۳۳۹ ف م مئی ۱۹۳۰ ع شمارہ (۲)

تصویر :- حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری

فہرست مضامین

۲

شذرات

برطانوی ہند میں اردو زبان کو سرکار دربار کی سرپرستی سے محروم ہوکر ایک عرصہ دراز ہوگیا اور وہ تمام ذرائع جو سرکاری توجہ سے ایک زبان کی ترقی کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں اردو زبان کے لئے گم ہو گئے۔ علاوہ بریں خالص ہندی کے پرستار جو اردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت سے قریب ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کے آرزومند ہیں، ہر طرح اس کو نقصان پہنچانے میں جائز و ناجائز طور پر دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ان مخالفانہ کوششوں کے باوجود اردو کو جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے وہ اس کی خوش بختی کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ خبر بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ مصر جیسے دور دراز ملک میں بھی اردو کا چرچا ہونے لگا ہے۔ وہاں سے ایک پرچہ "اسلامی دنیا" نامی جناب محمود احمد صاحب عرفانی کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ پرچہ ممالک اسلامیہ کے اخبار و آثار، مشاہیر مسلمانان عالم کے حالات اور ان کے افکار و خیالات کی اشاعت کیلئے وقف ہے۔ ٹائپ پر چھپتا ہے اور مصور ہے۔ مصر جیسے دور دراز ملک سے ایک اردو پرچے کا اجراء اس امر کی بین دلیل ہے کہ اردو اگر حقیقی معنوں میں بین الاقوامی پوزیشن اختیار نہیں کر رہی ہے تو بلا شبہ اقطاع عالم کے مختلف نسل کے مسلمانوں میں تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بننے کی خاص صلاحیت رکھتی ہے۔

اس پرچہ کے دوسرے نمبر میں حیدرآباد کی دو مشہور شخصیتوں نواب سالار جنگ بہادر اور خان بہادر احمد علاء الدین کے حالات اور تصویریں درج ہیں۔ اور "عظماء اسلام" کے عنوان سے ایک خاص باب مختلف ممالک اسلام کے مشہور بزرگوں قائدوں اور قابل قدر ہستیوں کے لئے مستقلاً وقف ہے۔ جن اچھے مقاصد کو پیش نظر رکھکر یہ پرچہ جاری کیا گیا ہے ان کی تکمیل بہت زیادہ تعاون و اشتراک عمل کی محتاج ہے اور ہم مدیر "اسلامی دنیا" کے بالکل ہم خیال ہیں کہ جب تک مسلمانان ہند دامے درمے قدمے سخنے اس کی طرف توجہ نہ کریں گے یہ کام چلنا مشکل ہے۔

ہز ہائی نس سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کی افسوسناک وفات پر اسلامی ہند جس قدر اظہار رنج و افسوس کرے بجا ہے۔ ریاست حیدرآباد کے بعد یہی ایک دوسری اسلامی ریاست ایسی ہے جہاں سے برطانوی ہند کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک کم و بیش تمام اسلامی اداروں

جامعوں اور مدرسوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً امداد ملتی رہتی ہے۔ بالخصوص مرحوم مادر ریئسہ بھوپال
ٹرا اسلامی درد رکھتی تھیں۔ ان کا دستِ کرم ہر وقت مسلمانانِ ہند کی امداد کے لئے کھلا رہتا تھا۔ انکی
وفات ایک اور حیثیت سے بھی حزن آگین ہے۔ انکے انتقال سے اردو کی ایک بلند پایہ خاتون
مصنف دنیا سے اٹھ گئیں۔ تعلیم نسواں کی حمایت اور عورتوں کی ضرورت کی متعدد کتابیں ان کے
قلم سے شائع ہوئیں اور ہندوستان کے طبقہ اناث کے لئے بڑی فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ نہ صرف
بھوپال بلکہ اسلامی ہند کی خوش قسمتی ہوگی اگر مرحوم کے تخت نشین فرزند ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں بہادر بھی
اپنی بزرگ ماں کے نقش قدم پر چل کر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ان کے سچے جانشین ثابت ہوئے۔

یہ خبر بھی اردو دنیا میں بڑے رنج و ملال سے سنی جائے گی کہ مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان نے
جن کی تصنیف "رحمت اللعالمین" اردو کی مقبول ترین سیرت نبوی اور مدارس اسلامیہ اور جامعہ عثمانیہ کے
نصاب تعلیم میں شریک ہے۔ حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہوئے جہاز پر داعی اجل کو لبیک کہا۔
قاضی صاحب ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔ انکی وفات سے اردو کو بڑا نقصان پہنچا۔ اگرچہ
اردو میں سیرت پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی سیرت نبوی ملتی ہے لیکن مرحوم
کی تالیف رحمت للعالمین بصحت واقعات طرز بیان اور دیگر متعدد حیثیتوں سے اپنی نوع کی واحد کتاب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے ایم۔اے میں ابتداً اردو اور فارسی کی جدا جدا جماعتوں کی بجائے بعض مجبوریوں سے
صرف ایک جماعت قائم کی گئی تھی اور اردو فارسی دونوں کی تعلیم ایک ہی مضمون کی حیثیت سے دی جاتی تھی
اب یہ سن کر ہر بہی خواہ اردو کو مسرت ہوگی کہ صدر صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ اور اردو اور فارسی کے لائق پروفیسر کی
کی کوششوں سے اردو اور فارسی دونوں کی علحدہ علحدہ جماعتوں کے قیام کی تحریک بار آور ہوئی جنھیں عنقریب
تعلیم کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ نئی تنظیم میں دونوں زبانوں میں مقالہ نویسی بھی لازمی کر دی گئی ہے۔ اور غالباً
ادب کی تعلیم کے ساتھ صوتیاتی اور لسانیاتی پہلو سے زبان کا مطالعہ بھی اس کے نصاب میں شامل ہوگا۔ ترقی
کی طرف جامعہ عثمانیہ کا یہ قدم اس کی کامیابی کا ایک اور ثبوت ہے۔

ابتدائے دنیا سے افسانہ ہر قوم میں مقبول عام رہا ہے۔ ہر قدیم و جدید قوم میں قصوں اور افسانوں کا ذخیرہ
کثیر موجود ہے۔ انگریزی میں متعدد افراد کی منفرد اور مجتمع کوششوں سے دنیا کے بہترین افسانوں کے متعدد
مجلدات شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں دوسری مشرقی اور مغربی زبانوں کا

اعلیٰ لٹریچر اور علوم و فنون کا ذخیرہ ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ہر قوم اور ہر زبان کے چیدہ افسانے اس میں منتقل کر لیے گئے ہیں۔

اردو میں اب سے پہلے اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی۔ چند ہی روز ہوئے کہ پنجاب کے مولوی منصور احمد صاحب شریک مدیر ہمایوں نے "دنیا کے بہترین افسانے" کے نام سے (۳۳) افسانوں کا ایک اچھا مجموعہ شائع کیا ہے۔ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ نے اس خصوص میں ایک عظیم الشان سلسلہ شروع کیا ہے جو امید ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں غیر معمولی پسندیدگی حاصل کرے گا۔ یہ سلسلہ حسب تفصیل ذیل چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۱) قدیم افسانے (۲) برطانوی قصے (۳) جرمن قصے (۴) فرانسیسی قصے (۵) اطالوی قصے (۶) ہسپانوی قصے (۷) چینی اور جاپانی افسانے (۸) ولندیزی (سویس) اور دیگر قصے (۹) روسی مختصر قصے (۱۰) یورپی اور دیگر افسانے (۱۱) بلجیمی قصے (۱۲) جدید اسلامی قصے (۱۳) امریکی افسانے (۱۴) بہترین اردو قصے۔

پہلا حصہ جس میں مصر، یونان، روم، ہندوستان، ایران اور عرب کے (۲۵) چیدہ افسانے ہیں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے اور دو حصے تقریباً مکمل ہو چکے ہیں ہفتہ عشرہ میں شائع ہو جائیں گے۔

باقی گیارہ حصے زیر طبع ہیں۔ حیدرآباد کے سات مشہور انشا پرداز اس سلسلے کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ پہلے حصے کے متعلق ہمارے پاس جو حوصلہ افزا رائیں وصول ہوئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہماری یہ امید بے جا نہیں معلوم ہوتی کہ یہ سلسلہ اردو ادب میں ایک خاص نوعیت کا اضافہ کرے گا

ہماری فیاض حکومت نے حکیم سید شمس اللہ قادری مدیر رسالہ "تاریخ" کی علمی مساعی کے اعتراف میں ایک سو پچاس روپیہ ماہوار صلہ تصنیف و تالیف جاری فرمائی ہے اس کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ عطیہ بھی مرحمت فرمایا ہے۔ آئندہ سے حکیم صاحب کی جو کتابیں لکھی جائیں گی ان کے لئے سرکاری امداد دی جایا کرے گی۔

حکیم صاحب کی علمی خدمات کا حکومت کی جانب سے یہ اعتراف علمی حلقوں میں احساس تشکر کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے [illegible] کی کتابیں جو تاریخ کے موضوع پر [illegible] شائع ہو چکی ہیں [illegible] تحقیق [illegible] کے لحاظ سے بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔

[illegible] کی تصویر اس رسالہ میں کسی اور مقام پر شائع کی جا رہی ہے۔

مجلہ مکتبہ



حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری

مصنف ''اردوئے قدیم'' و مدیر رسالہ تاریخ

مطبع کوہ نور

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے (عثمانیہ))

(گذشتہ سے پیوستہ)

دیگر مفید ایجادات کی طرح جن میں کہ اکثر ہوا کرتا ہے ہلٹ کوٹ کے حق ایجاد کے نسبت لوگ معترض ہوئے۔ حق ایجاد کے مفروضہ عدم جواز کی بنا پر جھالر سازوں نے BOBBIN-NET مشن کو اختیار کرکے موجد کو مقابلہ کا چیلنج دیا لیکن ہلٹ کوٹ کی مشن میں خاصی اصلاح ہونے سے جن لوگوں کو حق ایجاد دیا گیا تھا وہ واپس لے لیا گیا اور جب یہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور باہمی تنازع کی وجہ عدالت میں رجوع ہوئے تو عدالت نے ہلٹ کوٹ کے حقوق تسلیم کئے ہر صناع نے دوسرے کے مقابلہ میں اپنے حق ایجاد کی مداخلت کی نالش کی اس پر جوری نے مدعی علیہ کے موافق فیصلہ کیا اور منصف نے بتلایا کہ ہر دو مقدمہ یہ کلوں سے ہلٹ کوٹ کے حق ایجاد کی خلاف ورزی ہوتی ہے دوران مقدمہ میں سر جان کوپلے جو (جو لندن میں لارڈ لنڈ ہرسٹ کے نام سے موسوم ہوئے) اور جو مسٹر ہلٹ کوٹ کی جانب سے وکیل مقرر ہوئے تھے ایجاد زیر بحث کے جملہ تفصیلی واقعات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے BOBBIN NETMACHINE کو چلانا سیکھا۔ خلاصہ مثل پڑھنے کے بعد انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مقدمہ کی اصلیت ان کے سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن مقدمہ چونکہ انکی رائے میں نہایت اہم تھا اس لئے انھوں نے ناٹنگھم جاکر مشن کے بالمشافہ معائنہ کا ارادہ ظاہر کیا اور جب انھوں نے مشن کا معائنہ کرکے اس کی ساخت وغیرہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تو کہا کہ "میں تمہاری جانب سے حتی الامکان جواب دہی کروں گا" چنانچہ وہ اسی شب میل میں سوار ہوکر ناٹنگھم پہونچے۔ لائق وکیل نے کل کا معائنہ شروع کیا اور جب تک خود اپنے ہاتھوں سے BOBBIN NET کا ایک ٹکڑا تیار نہ کیا اور مشن کے تمام پرزوں اور اس کی ساخت کے اصول سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کی وہاں سے واپس نہ ہوئے جس وقت مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لایق وکیل عدالت کے روبرو نہایت آسانی اور عمدگی سے BOBBIN-NET کا ایک نمونہ تیار کرکے دکھایا اور اس ایجاد کی اصلیت کو اس خوش اسلوبی اور عمدگی سے بیان کیا کہ منصف جوری اور تمام تماشائی محو حیرت ہوگئے نیز جس کامل دیانت داری اور راست بازی سے اس نے مقدمہ میں بحث کی اس کا عدالت کے

فیصلہ برخلاف اثر پڑا مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد ہیلت کوٹ کو بعد دریافت معلوم ہوا کہ اس کے حق ایجاد کی وجہ تقریباً چھ سو شین برسر کار ہو گئے ہیں مشینوں کے مالکوں سے ہیلت کوٹ کو حق ایجاد کے استعمال کا محصول وصول کرنا شروع کیا جو کافی مقدار میں وصول ہوا لیکن اس سے فیتہ کے صناعوں کو جو منافع حاصل ہوا وہ بہت کثیر تھا اور یہ مشینیں بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگیں لیکن (۲۵) سال کے عرصہ میں فیتہ کی قیمت پانچ پونڈ فی مربع گز سے گھٹ کر تقریباً پانچ پنس ہو گئی اسی زمانہ میں فیتہ کی صنعت کا سالانہ اوسط منافع قریب قریب چار لاکھ اسٹرلنگ (ASTERLEN) ہوا اور تقریباً ۱۵ لاکھ مزدور اس کی وجہ برسر روزگار ہو گئے۔

اب مسٹر ہیت کوٹ کے ذاتی حالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ۱۸۰۹ء میں ہم اس کو بمقام نوبری بحیثیت فیتہ کے صناع کے پاتے ہیں وہاں اس کا کاروبار کئی سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا اور کاریگروں کی ایک کثیر تعداد اس کے کارخانہ میں بنا پیٹ پالتی رہی مزدوروں کو ہفتہ وار انکے کام کی نوعیت کے لحاظ سے پانچ تا دس پونڈ اجرت ملتی تھی جدید مشینوں کی ایجاد کی وجہ اگرچہ کہ فیتہ کی صنعت کے کاریگروں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو گیا تاہم کاریگر حلقوں میں یہ کانا پھوسی ہونے لگی کہ یہ مشینیں دستی صنعت پر غالب آ گئی ہیں اس لئے ایک زبردست سازش اس مقصد سے کی گئی کہ جہاں کہیں یہ مشینیں پائے جائیں انھیں تباہ کر دیا جائے۔ ۱۸۱۱ء کے اوائل میں ناٹنگھم کے جنوب مغربی حصوں ڈربی شیر اور لیسٹر شائر کے اطراف و اکناف اور قرب و جوار کے پائے جانے کے کارخانوں اور فیتہ کی صنعت میں کام کرنے والے مالکوں اور ملازمین کے مابین تنازعات پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرنلڈ میں بمقام ... ایک مجمع اٹھ کھڑا ہوا اور دن دھاڑے صناعوں کی پاتا بہ بافی اور فیتہ سازی کی مشینوں کو توڑنا شروع کیا بعض سرغنے گرفتار ہوئے اور ان کو سزا دی گئی جس سے غیر متاثر اشخاص ایک حد تک باخبر ہو گئے لیکن جہاں کہیں موقع ہاتھ آیا مخالفین پوشیدہ طور پر مشینوں کو تباہ کرتے رہے مشینوں کی ساخت اس قدر نازک تھی کہ صرف ہتوڑے کی ایک ضرب میں وہ ناکارہ ہو جاتے تھے اور چونکہ مشینوں کی صنعت شہر سے دور علحدہ عمارات اور عموماً خانگی مقامات پر ہوا کرتی تھی اس لئے مخالفین کو ان کی تباہی کے موقع بہت آسانی سے ہاتھ آتے تھے۔ ناٹنگھم کے قرب و جوار میں جو شور و فساد کا مرکز بنا ہوا تھا سازشیوں نے اپنی باقاعدہ جماعتیں قائم کر لی تھیں اور راتوں میں پوشیدہ جلسے منعقد

کرکے مشینوں کی تباہی کے مختلف تدابیر سوچا کرتے تھے۔ انھوں نے غالباً اعتماد پیدا کرنے کے خیال سے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ جنرل لڈ نامی رہنما کے ماتحت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لڈیٹ کے نام سے موسوم ہیں ۱۸۱۱ء کے سرما میں بہت سارے مشین تباہ کر دیئے گئے جس کی وجہ سخت پریشانی رونما ہوئی اور کاریگروں کی کثیر جماعتیں بے روزگار ہوگئیں اس اثنا میں مالکوں نے اپنی مشینوں کو دیہات اور تنہا مقامات سے شہر میں منتقل کرنا شروع کیا اور ان کی مناسب حفاظت کے خیال سے انھیں شہر کے گوداموں میں رکھوایا۔

گرفتار شدہ مفسدین کو معمولی سزائیں دیئے جانے سے لڈیٹ کی ہمت بڑھ گئی اور چند ہی روز بعد مشینوں کو برباد کرنے کا جنون ازسرنو تازہ ہو کر بہت جلد شمالی اور وسطی صنعتی اضلاع میں پھیل گیا۔ مفسدین کی جماعت خفیہ طور پر کام کرنے لگی اور اس جماعت کے ارکان سے اس امر کی قسم لی جاتی تھی کہ وہ سازش کے سرغنوں کے اجرا کردہ احکام کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے۔ عہد شکنی کرنے والوں کو سزائے موت سنائی جاتی تھی۔ تمام کلیں جن میں پارچہ بافی چھینٹ یا تور سازی کی مشینیں بھی شامل تھیں تباہ کر دی گئیں اور ہنگامہ اور پریشانی کا زمانہ دس سال تک جاری رہا۔ یارک شائر اور لنکا شائر کی گرنیوں پر مفسدہ پردازوں کے مسلح حملے ہوتے تھے اور اکثر موقعوں پر گرنیاں تباہ ہوئیں اور انھیں آگ لگا دی گئی اس لئے فوج اور YEO-MANRY کے ذریعہ ان کی محافظت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ گرنیوں کے مالکوں کو موت کی دھمکی دی گئی اکثروں پر زبردست حملے ہوئے اور بعض قتل کر دیئے گئے آخر کار قانون کا عمل سختی سے شروع ہوا اکثر مفسد لڈیٹ گرفتار ہوئے بعضوں کو سولی دی گئی اور کئی سال کے زبردست شور و فساد کے بعد مشینیں توڑنے کے ہنگامے فرو ہوئے

جن صناعوں کے کارخانوں پر لڈیٹ نے حملہ کیا ان میں BOBBIN-NET مشین کا موجد بھی شامل تھا ۱۸۱۶ء کے گرما میں ایک روز فتنہ انگیزوں کی ایک جماعت مشعلیں لیے ہوئے اس کے کارخانہ میں جو بمقام لوبرو واقع تھا گھس گئی اور اس کو آگ لگا دی جس سے ۳۷ تور سازی کی مشینیں تباہ ہوئیں اور دس ہزار پونڈ سے زائد مالیت کا نقصان ہوا۔ جماعت کے دس آدمی اس جرم میں گرفتار ہوئے اور آٹھ آدمی قتل کر دیئے گئے۔ مسٹر ہیت کوٹ نے قصبہ والوں کے مقابلہ میں نقصان کی تلافی کا دعویٰ کیا اس دعوے کی مخالفت ہوئی لیکن عدالت نے ہیت کوٹ کی موافقت میں مقدمہ کا تصفیہ کرکے

یہ فیصلہ صادر کیا کہ قصبہ کو ہیت کوٹ کے دس ہزار پونڈ کے نقصان کی تلافی کرنی چاہیئے۔ منصفین نے نقصان کی تلافی کی ادائی کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ مسٹر ہیت کوٹ وہ روپیہ شہر لیسٹر میں صرف کرے لیکن ہیت کوٹ نے اس بات سے ناراضی ظاہر کی ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے کاروبار کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ڈیون شائر میں بمقام ٹیورٹن اس کو ایک بڑی عمارت دستیاب ہوگئی جہاں اس سے بیشتر ایک اونی پارچہ بافی کا کارخانہ قائم تھا لیکن ٹیورٹن کی پارچہ کی تجارت کو زوال ہونے سے عمارت خالی پڑی ہوئی تھی اور قصبہ بھی نہایت اداس حالت میں پڑا ہوا تھا۔ مسٹر ہیت کوٹ نے قدیم گرفتی خریدی اس کو از سر نو قائم کیا اور اس کی توسیع کر کے پہلے سے زیادہ وسیع پیمانہ پر تور کی صنعت دوبارہ شروع کی اس مقام پر مشین پوری طرح چالو ہوگئے اور کاریگروں کی ایک کثیر تعداد برسر روزگار ہوگئی اور انہیں معقول اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس نے صرف تور کی صنعت کو ہی جاری نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس سے متعلقہ YAKN-DOU-BLING ریشم بافی (SILKSPI-NNING) جال بافی (NET MAKING) اور FINISHING کی مختلف شاخیں بھی جاری ہوگئیں۔ اس نے بمقام ٹیورٹن ایک لوہا خانہ اور زرعی آلات سازی کے کارخانے بھی قائم کئے جو ضلع کے لئے بعید مفید ثابت ہوئے۔ اس کا یہ خیال کہ تمام زرعی کاروبار اور ایسے کام جن میں شدید محنت درکار ہو بھاپ کی قوت کے ذریعہ انجام پاسکتے ہیں نہایت مبارک تھا ایک عرصہ تک ہیت کوٹ دخانی ہل ایجاد کرنے کی کوشش میں لگا رہا اور ۱۸۳۲ء میں اس نے اپنی ایجاد کو پایہ تکمیل کو پہونچا کر اس کا حق پیٹنٹ بھی حاصل کرلیا۔ ہیت کوٹ کا ایجاد کردہ ہل اگرچہ کہ اس سے قبل فولر نے دخانی ہل تیار کیا تھا ایسا بہترین آلہ مقرر کیا گیا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔

مسٹر ہیت کوٹ زبردست خداداد قابلیتوں کا آدمی تھا وہ فراست زود فہمی اور اعلیٰ درجہ کی کاروبار میں قابلیت رکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذات میں دیانت اور استقلال کے وہ صفات جمع ہوگئے تھے جو انسانی کردار کی حقیقی شان ہیں۔ جفاکش اور اپنا معلم آپ ہونے کی وجہ وہ اپنے ہونہار ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کی قابلیتوں کو ابھارا کرتا تھا مصروفیت کے زمانہ میں بھی اس نے فرانسیسی اور اٹالوی زبانوں پر حاوی ہونے کی غرض سے تھوڑا وقت بچانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان زبانوں میں اسے کافی معلومات حاصل ہوگئے علم ادب کے

گہرے مطالعہ کی وجہ اس کا دماغ وسیع معلومات کا مخزن بن گیا تھا اور بہت کم مضامین ایسے تھے جن کے ٹھیک اور کافی معلومات اس نے حاصل نہ کئے ہوں اس کے دو ہزار ماتحت کارگر اس کو اپنا باپ تصور کرتے تھے اور وہ بھی ان کے عیش آرام اور فلاح وبہبود کے ذرائع بہم پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتا تھا۔ مرفہ حالی سے جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے نہ تو اس پر تباہی آئی اور نہ مفلس وجفاکش آدمیوں کے حقوق کی شنوائی کے لئے جنہیں اس کی ہمدردی اور معاونت کا ہمیشہ یقین رہتا تھا اس کے دل کا دروازہ بند ہوا۔ اپنے کاریگروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے اس نے تقریباً ۶ ہزار پونڈ کے صرفہ سے مدرسے تعمیر کروائے۔ نیز اس کی طبیعت فطرتاً زندہ دل اور بشاش واقع ہوئی تھی اور وہ سب میں ہر دلعزیز تھا۔ جو لوگ اس سے بخوبی واقف تھے اس کو بڑی قدر و منزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

۱۸۳۱ء میں ٹیورٹن کے انتخاب کنندوں نے جہاں مسٹر ہیت کوٹ خود کو ایک زبردست اور سچا محسن اور خیر خواہ ثابت کر چکا تھا پارلیمنٹ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا اور تقریباً تیس سال تک وہ ان کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس زمانہ میں لارڈ پامرسٹن اس کے شریک کار رہے تھے اور انہوں نے ایک سے زائد پبلک موقعوں پر ان کے معزز دوست ہیت کوٹ کی انکی نظر میں جو وقعت اور قدر تھی اس کا اظہار کیا۔ ۱۸۵۹ء میں پیری اور بڑھتی ہوئی کہولت کی وجہ نمائندگی سے علحدہ ہونے پر اس کے تیرہ سو کاریگروں نے ایک نقروی دوات اور طلائی قلم بطور تحفہ عطا کیا۔ صرف دو سال آرام سے بسر کرنے کے بعد ہیت کوٹ نے ۷۷ سال کی عمر میں جنوری ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا اور اپنی راستبازی صداقت شعاری۔ نیک روی۔ مردانگی اور مکان کی قابلیت کے کردار کی ایسی نظیر چھوڑی جس پر اس کی اولاد بجا ناز کر سکتی ہے۔

اب ہم مشہور لیکن بدقسمت جاکارڈ کی مختلف التوع طرز زندگی کے حالات قلمبند کرتے ہیں جس کی زندگی سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ ادنیٰ درجہ کے لیکن ذکی اور تیز طبع یا زود فہم اشخاص کا بھی قومی صنعت پر اثر پڑتا ہے۔ جاکارڈ لائنس کے محنتی والدین کا بیٹا تھا اس کا باپ ایک جلاہا اور اس کی ماں ایک (PATTERN READER) تھی انتہائی عسرت و تنگدستی کی وجہ ماں باپ جاکارڈ کو معمولی تعلیم دلانے سے بھی قاصر تھے جب اس کی عمر کام سیکھنے کے قابل ہوئی تو جاکارڈ کے باپ نے اس کو ایک صحاف کے پاس ملازم رکھوا یا ایک ضعیف العمر منشی نے جو صحاف کے ہاں محاسب کی خدمت

انجام دیتا تھا جاکارڈ کو علم ریاضی کی کسی قدر تعلیم دی چند ہی روز میں جاکارڈ کی طبیعت کا رحجان میکانکس کی طرف پایا گیا اور اس کے بعض تدابیر نے ضعیف منتی کو محو حیرت کر دیا۔ منتی نے جاکارڈ کے باپ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی ایسی تجارت میں لگائے جس میں اس کو صحافی کی نسبت اپنی عجیب و غریب قابلیتوں کے اظہار کا موقع مل سکے چنانچہ وہ ایک لوہار (CUTLER) کے پاس بحیثیت کارآموز رکھوایا گیا لیکن اس کے استاد نے اس کے ساتھ ایسا برا برتاؤ کیا کہ جاکارڈ نے چند ہی روز میں اس کی ملازمت ترک کر دی اس کے بعد وہ ایک (TYPEFOUNDER) کے پاس ملازم رکھوایا گیا۔

والدین کے انتقال پر جاکارڈ کو اپنے باپ کے پارچہ بافی کے دو (LOOMS) سے مجبوراً جلاہے کا کام اختیار کرنا پڑا اس نے جلد پارچہ بافی کی مشنوں میں اصلاحات کیں اور اپنے ایجادات میں اس قدر محو ہو گیا کہ اس کے ذہن سے اس کا کاروبار فراموش ہو گیا اور ذرائع آمدنی بہت جلد مسدود ہو گئے۔ ادائی قرض میں اپنی بیوی کی پرورش کی غرض سے اس نے (LOOMS) فروخت کر ڈالے اس پر بھی اس کی مفلسی دور نہ ہوئی قرض خواہوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا پھر ملازمت کی کوشش کی لیکن سخت اکارت ہوئی کیوں کہ لوگ اس کو ایک کاہل شخص سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جاکارڈ اپنے ایجادات کے متعلق صرف خیالی پلاؤ پکانے یا ہوائی بنگلے بنانے میں مصروف رہا کرتا ہے آخر کار ایک (LINEMAKER) کے ہاں اس کو ملازمت مل گئی اور وہ اپنی بیوی کو لائینس میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں اس کی بیوی گھاس کی زنانی ٹوپیاں بنا کر ان سے جو کچھ غیر معین آمدنی حاصل ہوتی اس سے زندگی بسر کیا کرتی تھی۔

اس کے بعد جاکارڈ کے چند سال کے حالات کا پتہ نہیں چلتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں وہ رنگین پارچہ کی مفید صنعت کی ذہن میں اس کے (DRAWLOOM) کی اصلاح میں مصروف تھا کیوں کہ سنہ ۱۷۹۰ء میں تانے کے تاروں کے انتخاب کے لئے اس نے ایک آلہ تیار کیا جس کو مشن میں لگانے سے ایک (DRAWBOY) کا کام انجام پاتا تھا۔ اس مشن کا استعمال بتدریج لیکن مستقل طور پر ہوتا رہا اور اس کی ایجاد کے دس سال بعد لائینس میں ۴ ہزار مشن برسر کار پائی گئیں جاکارڈ کی مصروفیتوں میں انقلاب فرانس سے بڑی مزاحمت واقع ہوئی اور سنہ ۱۷۹۲ء میں ہم اس کو لین کے رضاکاروں کے ساتھ کنونشن کی فوج کے مقابلہ میں بوڑھا باٹس کرانس کے زیر کمان تھی لڑائی میں مصروف پاتے ہیں شہر مفتوح ہونے پر

جاکارڈ وہاں سے روانہ ہوکر رہائن کی فوج میں داخل ہوا جہاں اس نے سرجنٹ کے عہدہ تک ترقی کی۔ وہ سپاہیانہ زندگی ہی بسر کیا ہوتا لیکن اس کا اکلوتا بیٹا گولی لگ کر فوت ہونے سے اس نے ملازمت ترک کی اور اپنی بیوی کی خبر لینے کی غرض سے لائینز کو واپس ہوا۔ گھر پہونچکر اس نے دیکھا کہ بیوی مکان کے بالائی حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہنوز گھاس کی زنانی ٹوپیاں بنانے کی قدیم صنعت میں مصروف ہے جس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا اس وقت اس کا دماغ اُن ایجادات کی جانب جن پر وہ اس سے قبل کئی سال تک غور کر چکا تھا دوبارہ متوجہ ہوا لیکن ان کی تکمیل کے لئے اس کے پاس روپیہ اور وسائل نہیں تھے۔ جاکارڈ نے اب اپنی گوشہ نشینی کی زندگی ترک کرکے کوئی ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کی ایک ہوشیار صناع کے ہاں اس کو ملازمت مل گئی وہ دن میں نوکری کرتا اور رات میں ایجادات پر غور کیا کرتا تھا اس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ (LOOMS) میں منقش اور رنگین سامان کی تیاری کے لئے مزید اصلاحات کئے جاسکتے ہیں۔ ایک روز اتفاقاً اس نے اپنے استاد سے اس واقعہ کا ذکر کرکے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اس کے محدود ذرائع آمدنی اس کے خیالات کی تکمیل میں مانع و مزاحم ہیں۔ خوش قسمتی سے استاد نے اس کے تجویزوں کو پسند کیا اور نہایت فیاضی سے اس کو کچھ رقم دی کہ وہ اپنے فرصت کے وقت اپنے مجوزہ اصلاحات کو عملی جامہ پہنائے۔

تین مہینہ میں جاکارڈ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جو ایک کاریگر کا دشوار اور محنت طلب کام انجام دے سکتا تھا۔ ۱۸۰۱ء میں پیرس کی قومی صنعتی نمائش کے موقع پر یہ آلہ پیش ہوا جس پر جاکارڈ کو ایک پیتلی تمغہ انعام ملا وزیراعظم کارنٹ کی لائینز ٹون آمد کے وقت جاکارڈ کی اور عزت ہوئی کیونکہ وزیراعظم جاکارڈ سے بالمشافہ ملاقات کرکے اس کو اس کی ایجاد کی کامیابی پر مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ آئندہ سال لندن کی آرٹس سوسائٹی کی جانب سے یہ اعلان شائع ہوا کہ جو شخص جہازوں کے لئے (FISHING-NETS) اور (BOARDIND-NETS) بنانے کی مشین ایجاد کرے اس کو ایک تمغہ عطا کیا جائے گا۔ جاکارڈ نے یہ خبر سنی اور ایک روز حسب عادت سیر و تفریح کرتے وقت اس نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا اور اس قسم کی ایک مشین تیار کرنے کی تدبیر سوچی اس رفیق صناع نے اس کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے دوبارہ ذرائع بہم پہنچائے اور تین ہفتہ کے اندر جاکارڈ کی ایجاد مکمل ہوگئی۔

جاکارڈ کے ایجاد کردہ مشین کی خبر جب اس محکمہ کے افسر کو ہوئی تو جاکارڈ کو محکمہ میں طلب کیا گیا اور جب اس نے مشین چلانے کی ترکیب بتلائی تو اس کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کی جاکر شہنشاہ کے پاس روانہ کی گئی جس کی بنا پر موجد کو معہ اس کی مشین کے پیرس طلب کیا جاکر شہنشاہ کے روبرو پیش کیا گیا شہنشاہ نے اس کے شایان شان استقبال کیا دو گھنٹہ تک جاکارڈ کی شہنشاہ سے گفتگو ہوتی رہی جس کے دوران میں شاہی مروت و اخلاق کے برتاؤ کی وجہ جاکارڈ نے بادشاہ سے ان اصلاحات کا تذکرہ کیا جو وہ رنگین سامان بننے کے لیئے (LOOMS) میں کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو بمقام کنزرویٹری ڈس آرٹس اٹ میٹرین چند کمرے دیے گئے جہاں وہ ان کمروں سے اپنے قیام کے زمانہ میں کارخانہ کا کام لیتا رہا نیز اس کو گذر اوقات کے لئے معقول الونس بھی ملتا تھا۔

کنزرویٹری میں اطمینان سے کاروبار قائم کرنے کے بعد جاکارڈ نے اپنے حرمہ (LOOMS) کے ضروری اشیاء کو مکمل کرنا شروع کیا وہاں اس کو مشین کے ان مختلف باریک اور نازک پرزوں کے گہرے معائنہ کا موقع ہاتھ آیا جو انسانی فراست کے اس بڑے خزانے میں موجود تھے۔ جن مشینوں کی جانب خاص طور پر اس کی توجہ مبذول ہوئی اور بالآخر وہ تحقیق میں مصروف ہو گیا ان میں مشہور (AUTOMATON-MAKER) کے موجد واکان سن کی تیار کردہ پھول دار ریشم کاتنے کی مشین بھی شامل تھی۔

واکان سن ایک اعلیٰ درجہ کی ایجادی قابلیت والا آدمی تھا اس کی قوت ایجاد کا وہ حال تھا کہ وہ ایک فطری جذبہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور کسی سبب سے رک نہ سکتی تھی یہ مقولہ کہ شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوتا ہے نہ کہ مشق کے ذریعہ اس موجد پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے جو اگرچہ کہ مثل دوسروں کے تربیت اصلاحات و ترقیات میں دوسروں کا رہین منت کیوں نہ ہو خاصکر اپنے ذاتی جذبہ کی تکمیل کے لیے سخت جد و جہد کر کے جدید مشین تیار کرتا ہے واکانس کی حالت بجنسہ ایسی ہی تھی کیوں کہ واکانس کی ایجادات جس قدر کہ ان کی عجیب و غریب ساخت اور عمدگی میں مشہور ہوئے اس قدر ان کے فوائد میں مشہور نہیں ہوئے بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ اتوار کا وعظ سننے کے لئے گرجا جایا کرتا تھا تو آڑ کی دیوار کے شگافوں میں سے متصلہ حجرہ کی گھڑیال کی حرکتوں کو دیکھ کر جی بہلایا کرتا تھا اس نے ان حرکات کے سمجھنے کی کوشش کی اور کئی ماہ اس مسئلہ پر غور و خوص کرنے کے بعد گھڑی کے پرزوں کا اصول دریافت کیا اس وقت سے واکانس میکانکی ایجادات کی دھن میں منہمک رہتا تھا خود کے تیار کردہ چند

بھدے اوزاروں سے اس نے ایک چوبی گھڑی تیار کی جو بالکل ٹھیک وقت بتلاتی تھی اس کے علاوہ اس نے ایک چھوٹے گرجا کے لئے چند فرشتوں کے اشکال تیار کئے جن کے بازو ہلا کرتے تھے اور بعض پادریوں کے مورتیں بھی بنائے بعض دیگر خودرو آلات تیار کرنے کے خیال ہے جن کا خاکہ اس نے پیشتر ہی سے ذہن میں قائم کر رکھا تھا واکانس نے علم تشریح علم موسیقی۔ اور علم جر ثقیل کا مطالعہ کیا جس میں اس کے کئی سال گزرے، ٹولیریس کے باغ میں بانسری نواز کو دیکھکر اس کے دل میں ایک ایسی ہی مورت تیار کرنے کا جوش پیدا ہوا اور کئی سال کے مسلسل مطالعہ اور محنت کے بعد اگرچہ کہ وہ بیمار ہو گیا حصول مقصد میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک (FLAGEOLJT-PLAYER) کی شکل تیار کی اور پھر ایک بطخ تیار کیا جو اس کی بہترین ایجاد تھی۔ یہ بطخ اصلی اور جاندار بطخ کی طرح تیرتی، غوطے مارتی۔ پانی پیتی اور تھرّاتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈکوری ایجاد کی جس سے کلوپٹرا کے غمناک واقعہ میں کام لیا گیا اور جو اکڑ اس کے پہلو میں اُچھلا کرتی تھی۔

واکانس نے اپنی کوششوں کو صرف خودرو آلات کی ایجاد تک محدود نہیں رکھا۔ اس کی فہم و فراست کی وجہ کارڈنل ڈی فلوری نے اسے فرانس کے ریشم کے کارخانوں کا ناظر (INSPECTIR) مقرر کیا اور جوں ہی اس نے اس شعبہ میں قدم رکھا اپنی ناقابل روک قوت ایجاد سے ریشم کی کل میں اصلاحات کرنا شروع کیا ان میں سے ایک اصلاح (THPOWN-SILK) سے متعلق تھی اس سے لائنس کی کاریگر اس قدر مشتعل ہوگئے کہ انھوں نے اس ایجاد کی وجہ اپنی ملازمت ترک ہو جانے کے احتمال سے اسکو سنگ ماری کی اور طرح طرح کے ایذائیں پہنچائے اس پر بھی اس نے اپنا کام جاری رکھا اور پھر پھولدار ریشم بننے کی ایک مشن ایجاد کی جس میں دھاگہ صاف اور درست کرنے کے لئے ایک جلد پرزے کا اضافہ کیا گیا تھا تاکہ ریشم کا ہر لچھا مساوی موٹائی کا ہو۔

طویل علالت کے بعد سنہ ۱۷۸۲ء میں جب واکانس کا انتقال ہوا تو اس نے اپنی تمام مشنین ملک کے لئے بطور ترکہ چھوڑیں ملک نے ان کی کچھ قدر نہ کی اس لئے وہ بہت جلد ابتر ہوگئیں لیکن خوش قسمتی سے اس کی پھولدار ریشم بننے کی مشن بمقام کنزرو ویٹری ڈیس آرٹس اٹ میٹرس محفوظ رکھی تھی۔ اور وہاں واکانس کے دیگر عجیب و غریب اور مفید آلات کے ذخیرہ میں جاکارڈ کے ہاتھ لگی یہ مشن جاکارڈ کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئی کیونکہ اپنی مرمہ مشن میں جاکارڈ جو خاص ترمیم کرنا چاہتا تھا اس سے

اس کو فوراً مدد ملی۔

واکانس کی مشن کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ اس میں ایک بیلن CYLINDER لگی ہوئی تھی جب اس کو گھمایا جاتا تو اس سے بعض سوئیاں حرکت میں آجاتیں اور تانے کے تار اس طرح ہلتے تھے کہ اس سے ایک مجوزہ معمولی نمونہ تیار ہو جاتا تھا۔ جاکارڈ نے دلچسپی سے اس بات کو ذہن نشین کرلیا اور ایک سچے موجد کے سے جوش کے ساتھ فوراً اس کی اصلاح و ترقی دینے کی کوشش شروع کی ایک ماہ کے بعد اس کی پارچہ بافی کی مشن مکمل ہوگئی۔ واکانس کے بیلن (CYLINDER) میں جاکارڈ نے وصلی (PASTEBOARD) کے ایک (ENDLESS) ٹکڑے کا اضافہ کیا جس میں کئی سوراخ ہوتے تھے اور جس میں سے تانے کے تار جلاہے کو بہ آسانی دکھتا ہوئے تھے اور مشن کے دوسرے پرزہ سے کام کرنے والے کو مشن چلتے وقت اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اسے کس رنگ کا وقتاً فوقتاً استعمال کرنا چاہیئے۔ اس طرح (DRAWBOY) اور (SHUTTLE) اور (READER OF THE DESIGNS) کے کام پر مشن کو فوراً سبقت حاصل ہوگئی۔ جاکارڈ نے اپنی جدید پارچہ بافی کی مشن سے پہلا استعمال یہ کیا کہ اس سے کئی گرانقیمتی پارچہ تیار کرکے ملکہ جوزفین کو بطور تحفہ پیش کیا۔ نپولین نے اس موجد کی کوششوں کے ثمرات سے بے حد خوش ہوکر حکم دیا کہ جاکارڈ کی ایجاد کردہ مشن کی سی کئی کلیں ماہر کاریگروں کے ہاتھ سے تیار کرواتی جاکر اس کے روبرو پیش کئے جائیں اس کے بعد جاکارڈ لائنس روانہ ہوا۔

وہاں اس نے دیکھا کہ موجدوں کو قسمت آزمائی کا موقع شاذونادر ہاتھ آتا ہے لوگ اسکو دشمن سمجھنے لگے اور جس قسم کا برتاؤ کے۔ ہارگریوس۔ اور آرک رایٹ کے ساتھ لنکا شائر میں ہوا تھا۔ اسی قسم کا برتاؤ یہاں جاکارڈ کے ساتھ کیا گیا۔ کاریگروں نے مشن کو اپنی صنعت کے لئے سم قاتل خیال کیا اور انھیں خوف ہوا کہ مبادا اس سے ان کا ذریعہ معاش فوراً مسدود نہ ہو جائے بمقام پلیس ڈس ٹروکس ایک فتنہ انگیز جلسہ منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ کلوں کو تباہ کر دیا جائے لیکن فوج کے ذریعہ اس ہنگامہ کی روک تھام کی گئی اس پر بھی جاکارڈ کو لعنت ملامت کیا گیا اور اس کی ایک شبیہ تیار کیجا کر اس کو سولی دی گئی اور اس طرح جاکارڈ کو موت کی دھمکی دی گئی۔ کونسل کی جانب سے بھی اس فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بے فائدہ ثابت ہوئی کیونکہ کونسل پر بھی لعنت ملامت کی گئی۔ آخر کار مفسدوں نے جن میں اکثر کاریگر بھی شامل تھے جاکارڈ کی ایک مشن کو علانیہ پارہ پارہ کر دیا اس کے بعد ہنگاموں کا سلسلہ جاری رہا ایک ہنگامے میں ایک غضب آلود مجمع نے جاکارڈ کو غرق کرنے کے ارادہ سے سمندر کے

گھاٹ کی طرف گھسیٹا لیکن اس نے بڑی دقت سے اس مصیبت سے نجات پائی۔

جاکارڈ کے مشن کی عمدگی کے متعلق کسی کو انکار نہیں اور اس کی کامیابی محض ایک موہومی بات تھی ریشم کی صنعت کے بعض انگریز صناعوں نے جاکارڈ کو انگلستان چل کر وہاں قیام کرنے کی ترغیب دی لیکن شہر کے لوگوں کے سخت اور ظالمانہ برتاؤ کے باوجود اس نے یہ بات نہ سنی کیونکہ اس کی حب الوطنی نے اس کو اس امر کی اجازت نہیں دی۔ غرض انگریز صناعوں نے اس کی مشن کو استعمال کیا جب باشندگان لائینس کو اپنے کاروبار میں بیٹھے رہنے کا خوف ہوا تو انھوں نے جدید مشن کو نہایت مسرت کے ساتھ استعمال کیا اور تھوڑے عرصہ میں جاکارڈ کی مشن تقریباً ہر قسم کی پارچہ بافی میں استعمال ہونے لگی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کاریگروں کے دلوں سے دہشت بالکل دور ہو گئی روزگار کو کم کرنے کے بجائے جاکارڈ کی مشن نے اس میں دس گنا اضافہ کر دیا۔ ایم لیون فاچرنے لائینس کے نقشی سامان کی صنعت کا کام کرنے والوں کی ۱۸۳۳ء میں جو تعداد بتلائی ہے وہ ساٹھ ہزار ہے اس تعداد میں آئندہ معتدبہ اضافہ ہوا۔

جاکارڈ کی باقی زندگی امن و آرام سے بسر ہوئی۔ جن کاریگروں نے جاکارڈ کو غرق کرنے کی نیت سے جس راستہ سے گھاٹ تک گھسیٹا تھا انھوں نے چند ہی روز بعد اس کی سالگرہ کی تہنیت میں تزک و احتشام کے ساتھ اسی راستہ سے لیجانے کی خواہش ظاہر کی لیکن جاکارڈ کی (MODESTY) نے اس کو ایسے جلوس میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ لائینس کی مجلس صفائی کی جانب سے اس کو ہدایت ملی کہ مقامی صنعت کو فائدہ پہنچانے کے خیال سے وہ خود کو اپنی مشن کی اصلاح کے لئے وقف کر دے جس پر جاکارڈ نے ایک قلیل وظیفہ کے خیال سے جس کی تعداد خود اس نے معین کر لی تھی رضامندی ظاہر کی چنانچہ جاکارڈ اپنی مشن کو مکمل کرنے کے بعد باقی ماندہ زندگی بسر کرنے کی غرض سے اپنے باپ کے وطن آؤلنس کو چلا گیا اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی ۱۸۲۲ء میں اس کو لیجن آف آنر کا تمغہ ملا اور ۱۸۳۴ء میں فوت ہو کر وہیں مدفون ہوا۔ اس کی یادگار میں ایک مورت (STATUE) تعمیر کی گئی اس کے پسماندے مفلسی کی حالت میں رہے اور جاکارڈ کی وفات کے بیس سال بعد اس کے دو بھتیجوں کو مجبوراً اس طلائی تمغہ کو جو لوئی (XVIII) نے ان کے چچا کو عطا کیا تھا چند صد فرانکس کے معاوضہ میں فروخت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے کہ "لائینس کے صنعتی حلقوں نے ایک ایسی ہستی کے ساتھ جس کا قصبہ لائینس اپنی شان و شوکت کے لیے رہین ہے ایسا سخت برتاؤ کیا شہید موجدوں کے مزید تذکرے کرنا اور مذکورہ بالا قسم کے دیگر ممتاز ہستیوں کے بے شمار نام گنوانا

جنھوں نے بلاکسی ذاتی مفاد کے اپنے زمانہ کی صنعتی ترقی میں حصہ لیا بہت آسان ہے کیوں کہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ قابل دماغوں نے کسی کام کی بنیاد قائم کی اور کاہلوں نے اسکے ثمرات سے فائدہ اٹھایا لیکن فی الحال حال کے ایک موجد کے مختصر حالات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ صنعتی کام کرنے والوں کو اکثر و بیشتر کیسی مشکلات اور ناکامیوں پر غالب آنا پڑتا ہے مثال کے طور پر (COMBING-MACHINE) کے موجد جوشوہیلمن کے حالات قلمبند کئے جاتے ہیں۔

ہیلمن السالک کے کپاس کی صنعت کے خاص مرکز مل ہاؤس میں ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوا اس وقت اس کا باپ کپاس کا کاروبار کیا کرتا تھا جوشو نے بھی پندرہ سال کی عمر میں یہی کاروبار شروع کیا۔ دو سال تک یہ کام کرتا رہا جس کے دوران میں اس کا فرصت کا وقت میکانکی نقشہ کشی میں صرف ہوتا رہا اس کے بعد اس نے دو سال اپنے چچا کے (BANKINGHOUSE) میں گزارے جہاں وہ شام کے وقت علم ریاضی کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس کے بعض رشتہ داروں نے بمقام مل ہاؤز کپاس کاتنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا اس کارخانہ کا عملی کام سیکھنے کی غرض سے نوجوان ہیلمن پیرس میں مسرس ٹسٹ اینڈ رے کے پاس چھوڑ دیا گیا اسی زمانہ میں وہ کنزرویٹری ڈس آرٹس اٹ میٹرز کا طالب علم بن گیا جہاں وہ لکچر سنا کرتا اور عجائب خانہ کی مشنوں کا معائنہ کیا کرتا تھا ایک کھلونے ساز سے اس نے (TURNING) کا عملی سبق بھی حاصل کیا اسطرح اس پیشہ پر پوری طرح حاوی ہوکر کچھ عرصہ بعد ویوکس تھان کے نئے کارخانے کے لئے مشن کی تیاری کی غرض سے ’’السالک‘‘ واپس ہوا یہ مشن چند ہی روز میں مکمل ہوگئی اور اس سے کام لیا جانے لگا اتفاق سے ایک تجارتی (CRISIS) رونما ہوا جس کا کارخانہ کے کاروبار پر گہرا اثر پڑنے سے کارخانہ دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا اور ہیلمن کو مل ہاؤس واپس ہونا پڑا۔

اس اثنا میں وہ اپنا فرصت کا بہت سا وقت ایجادوں میں صرف کرتا رہا اور اس کی توجہ خاص کر کپاس بننے کی مشن اور کتائی کے رشتہ کی تیاری کی جانب مبذول رہی اس کے ابتدائی ایجادات میں سے ایک ایجاد (EMBRIDERING-MACHINE) سے متعلق تھی اس میں بیس سوئیاں لگائی گئی تھیں جو ایک ساتھ چلتی تھیں تقریباً چھ ماہ کی کوشش کے بعد ہیلمن اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اس ایجاد کے صلہ میں جسے اس نے ۱۸۳۴ء کی نمائش میں پیش کیا ایک طلائی تمغہ ملا اور لیجن آف آنر کا اعزاز بھی حاصل ہوا اس کے بعد ایک مرمصر (LOOM) پارچہ ناپنے اور تہ کرنے کی مشن، انگریز جلاہوں کی ’’(BOBBIN-AND FLY-FRAMES)‘‘

کا ایک مرمہ نمونہ اور بانا لپٹنے کی مشین جس میں ریشم اور کپاس کاتنے، بننے اور تیار کرنے کے لئے کئی اصلاحات کئے گئے تھے۔ یہ تمام مشین بہت جلد معرض وجود میں آئیں اس کی بہترین ایجادوں میں سے ایک مشین وہ تھی جس میں مخمل یا دیگر لچھے دار پارچہ کے دو ٹکڑے ایک ساتھ بنے جا سکتے تھے اور جو مشین میں لگے ہوئے چاقو اور (TRAVERSING-APPARATUS) سے ہر دو پارچے بنے جانے کے بعد جدا ہو جاتے تھے۔ ہیلمن کی ایجادوں میں سب سے زیادہ خوش وضع اور قابل قدر ایجاد (COMBING-MACHINE) تھی جس کے حالات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

ہیلمن چند سال تک لمبے ریشے دار کپاس کی صفائی کے لئے ایک مشین کی ایجاد پر غور کرتا رہا کیونکہ کتائی کے لئے خام پیداوار اور صفائی کی معمولی مشین خاصکر عمدہ سوت کی تیاری کے لئے غیر موزوں ثابت ہوئی نیز اس میں بہت سا وقت ضائع ہوتا تھا ان تمام خامیوں کے رفع کرنے کے لئے الساک کے سوتی پارچہ بافوں نے اعلان کیا کہ ایک مرمہ (COMBING-MACHINE) تیار کرنے والے کو پانچ ہزار فرانکس کا انعام دیا جائے گا ہیلمن نے فوراً اس انعام کے حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اس کو اس کے ذریعہ نفع کی خواہش نہ تھی کیونکہ اس کے پاس اس کی بیوی کی معقول جائداد ہاتھ لگنے سے کافی روپیہ موجود تھا اس کا یہ قول تھا کہ "ایسا شخص جو ہمیشہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرے کہ فلاں کام سے مجھے کس قدر نفع حاصل ہوگا کبھی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتا" محض اس کے زبردست شوق ایجاد کا باعث تھا کہ ہیلمن نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اس کے شوق ایجاد کی یہ حالت تھی کہ جوں ہی کوئی صنعتی مسئلہ اس کے پیش نظر ہوتا وہ فوراً اس کا حل نکال لیتا موجودہ مسئلہ اس کی توقع کے خلاف نہایت پیچیدہ اور مشکل تھا کئی سال تک وہ اس مسئلہ کے گہرے مطالعہ میں مصروف رہا اور اس سلسلہ میں اس کو جو مصارف برداشت کرنے پڑے وہ اس قدر زبردست تھے کہ اس کی بیوی کی جائداد اس کے نذر ہو گئی اور مشین کو مکمل کئے بغیر ہیلمن مفلسی کا شکار ہو گیا۔ اس وقت سے اپنی ایجاد کی تکمیل کے لئے اس کو زیادہ تر اپنے دوستوں کی امداد پر بھروسہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

ہنوز مفلسی اور تکالیف کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی جس کو اپنے خاوند کی بربادی کا یقین ہو گیا تھا انتقال کر گئی اس کے بعد ہیلمن انگلستان روانہ ہوا اور کچھ دنوں مانچسٹر میں مقیم رہا۔ یہاں بھی وہ اپنی مشین کا کام کرتا رہا مشہور کل ساز شارپ رابرٹ کمپنی کے توسط سے اس نے اپنے لئے ایک مشین تیار کروایا لیکن اس سے بھی اطمینان بخش کام نہیں لیا جا سکتا تھا آخر میں وہ بالکل مایوس ہو گیا۔ اپنے خاندان سے ملنے کی غرض سے فرانس واپس ہوا اس کو ہنوز اپنے مشین کی دھن لگی ہوئی تھی اور اس کا دماغ بھی اسی میں محو رہا کرتا تھا ایک روز

جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا موجدوں کی بدنصیبی اور ان مصائب پر جن میں ان کے (موجدوں کے) خاندان اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں غور کر رہا تھا تو اس نے اپنی بیٹیوں کو اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کرتے اور انگلیوں میں کھینچتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے اس کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ اگر وہ لمبے بالوں میں کنگھی کرنے اور چھوٹے بالوں کو کنگھی الٹ کر پیچھے پلٹانے کی ایک مشین میں نقل اتارنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو دشواری سے نجات حاصل ہو جائے گی یہ امر قابل یادگار ہے کہ ہیلمین کی زندگی کے اس واقعہ کی مسٹر المور۔ آر۔ اے۔ نے ایک خوبصورت تصویر اتاری ہے جو ۱۸۹۳ء کی رائل اکاڈمی کی نمائش میں بتلائی گئی تھی۔

وہ اسی دھن میں لگا رہا حتی کہ مشین کے ذریعہ (COMBING) کا طریقہ ایجاد کیا جو بظاہر آسان معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت میں نہایت پیچیدہ اور نازک تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ایجاد کی عجیب و غریب خوبی صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے مشین کو چلتے وقت دیکھا ہے مشین چلتے وقت اس کی حرکات جو بالوں میں کنگھی کرنے کے متشابہ ہیں اور جس کو دیکھ کر ہیلمین کے دماغ میں مشین کے ایجاد کا خیال پیدا ہوا نظر آتے ہیں مشین کے متعلق کہا گیا ہے کہ "مشین بجنسہٖ انسانی انگلیوں کی سی نزاکت سے کام کرتی ہے" مشین کپاس کے لٹ کو ہر دو کناروں پر صاف کرتی تاروں کو ٹھیک اور ایک دوسرے کے متوازی رکھتی لمبے تاروں کو چھوٹے تاروں سے جدا کرتی اور لمبے تاروں کو ایک (SLIVER) اور چھوٹے تاروں کو دوسرے (SLIVER) میں باہم جوڑ دیتی ہے حقیقت میں مشین صرف انسانی انگلیوں جیسی نفاست اور نزاکت ہی سے کام نہیں کرتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دماغ نہایت پھرتی سے کام کر رہا ہے۔

اس مشین کی بڑی تجارتی خوبی یہ تھی کہ اس کی وجہ نہایت معمولی درجہ کا کپاس بھی نفیس کتائی (SPINNING) کے قابل ہو جاتا تھا اس کی وجہ دستکار اور صناع قیمتی پارچوں کے لئے نہایت موزوں ریشے منتخب کرتے اور اعلیٰ درجہ کا سوت کثیر تعداد میں تیار کرتے تھے اس مشین کے ذریعہ دھاگہ ایسا عمدہ تیار ہوتا تھا کہ ایک پونڈ تیار شدہ کپاس سے ۲۳۴ میل لمبائی کا پارچہ بنا جا سکتا تھا اور اس ترکیب سے اعلیٰ درجہ کی قور بننے کے بعد ایک شلنگ کی مالیت کا کپاس استعمال میں آنے سے قبل ۳۰۰ تا ۴۰۰ اسٹرلنگ کی قیمت کا ہو جاتا تھا۔

انگریز کپاس کاتنے والوں نے فوراً ہیلمین کی ایجاد کردہ مشین کی خوبی اور اس کے فوائد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا لنکا شائر کے چھ کارخانوں نے متفق ہو کر انگلستان کے واسطے کپاس کاتنے کی غرض سے ۳۰ ہزار پونڈ میں ایک مشین خریدی۔ اون کاتنے والوں نے اون کے کام میں استعمال کے خیال سے اتنی ہی قیمت پر

اس مشن کو خریدا اور مسز مارشل لیڈس نے سن کے کام میں استعمال کرنے کی غرض سے اس مشن کے ۲۰ ہزار پونڈ ادا کیے اس طرح ایک غریب ہیلمن کے پاس وافر دولت جمع ہوگئی لیکن اس سے مستفید نہ ہو سکا۔ اس کی طویل اور مسلسل محنت ہنوز بار آور ہونے نہ پائی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا بھی جو باپ کے مشکلات اور ناکامیوں میں شریک رہ چکا تھا باپ کی وفات کے چند روز بعد راہی ملک عدم ہوگیا غرض ایسی ہی ہستیوں کے ایثار کی بدولت تہذیب انسانی کے عجائب حاصل ہوئے ہیں۔

عشق ہی دل لگی نہیں

مولانا عبدالقدیر حسرت صدر شعبہ دینیات (کلیہ جامعہ عثمانیہ)

جلوۂ حسنِ دلربا کوئی ہمیں دکھائے کیوں
لیکے ہمارے دل کو پھر پردہ میں منہ چھپائے کیوں

کس کو سکھا رہے ہو چاؤ، ہاں یہ ذرا مجھے بتاؤ
تم کو اگر نہیں لگاؤ، سامنے میرے آئے کیوں

کھوکے حواس اب ہوا، تم کو یقیں مرا کہا
سامنے آئینہ کے تم دیکھنے خود کو آئے کیوں

عشق ہی دل لگی نہیں، کھیل نہیں ہنسی نہیں
دل کو خود اپنے ہاتھ سے، دیکھے یہ ہائے ہائے کیوں

عشق ہے عیش بندگی، اس میں ہو سرفگندگی
ہاں تو سوائے لفظ ہاں کوئی نہ لب پہ لائے کیوں

سارے جہاں کو رو چکے، نام و نمود کھو چکے
جان سے جو گزر چکے، اس کو کوئی ڈرائے کیوں

حسرت بے نوا ہے یہ مورد صد بلا ہے یہ
ایسے ستم رسیدہ کو کوئی بھلا ستائے کیوں

فارسی ادب اور اس کا ایک گمنام شاعر

(از جناب محمد معین الدین صاحب تہبر فاروقی دار العلوم ہائی اسکول حیدرآباد)

مضمون ذیل میں پہلے فارسی ادب کا مختصر ارتقاء۔ اور اس کے بعد ہم ایک قدیم شاعر کو ناظرین سے روشناس کرائیں گے۔

عموماً اہل مغرب کی نظروں میں اکثر مشرقی چیزیں بے وقعت وکم درجہ ہوتی ہیں۔ اُن کے خیال میں خود کی ادب وانشا کے سوا کسی زبان کے ادب وانشاء کی کچھ ہستی نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات پر مُتفق ہیں کہ "فارسی زبان تمام مشرقی زبانوں میں نہایت وسیع اور شیریں زبان ہے"۔

بے شک اس زبان میں لاتعداد شعراء گزر چکے ہیں۔ جتنے دواوین اس زبان میں مرتب کئے گئے ہیں کسی دوسری زبان میں نہیں۔ اور نہ آج تک اس کے شاعروں کا کوئی شمار ہے۔

خاندانِ آل سامان کے عہد حکومت تک فارسی شاعری کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا فارسی ادب کے مورخوں کے بیان کے مطابق عباس مروزی اس زبان کا پہلا شاعر قرار دیا گیا تھا۔ اور چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس نے خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں اپنا ایک قصیدہ پیش کیا تھا۔ اور خود بادشاہ بھی کچھ کچھ فارسی حرف آشنا ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے اس قصیدے کے صلے میں ایک ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے۔ لیکن تحقیقات جدیدہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں فارسی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ابوحفص حکیم سغدی موجود تھا۔ اور اس کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے

؎ آہوے کوہی در دشت چگونہ دودا   وندارد و یار بے یار چگونہ بودا

ایران پر پرچم اسلام لہرانے کے بعد اس کے علم ادب میں ایک بڑا مد وجزر پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ عربی کا اثر پڑتا گیا ہے۔ اور زبان ایک نئی صورت اختیار کرتی گئی۔ یہاں کے گورنر عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ تمام عجمی زبان کی کتابیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور انھیں جلا دیا جائے۔ اس لئے اہل فارس میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا نہ ہو سکا۔ اور دو سو برس تک بالکل ہی مفقود رہی۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے شعر العجم کی پہلی جلد میں تذکرۃ الفصحا کی یہ عبارت نقل کی ہے (اور یہ کتاب شاہ نصیر الدین قاچار کے عہد حکومت میں تصنیف ہوئی تھی)۔

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیان را عرب سوختند۔ از کتب قدیمہ خبرے بر جا نگذاشتند۔ الا قلیلے کہ پنہاں داشتند۔ چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدۂ سخن و شعر متروک شد۔ تا مدتے گذشت و اوضاع دیگر گشت"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دو سو برس تک شعر و شاعری کیوں بند رہی۔ ولید کے عہد حکومت میں لوازم سلطنت کی حیثیت سے اس نے پھر دوبارہ جنم لیا لیکن دارالسلطنت کی زبان عربی تھی اس لئے زیادہ تر عربی شاعری کا زور اور چرچا رہا۔

خاندان سامانیہ کی سرپرستی نے فارسی شاعری کو دفعتاً آسمان پر چڑھا دیا چنانچہ رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا پروردہ تھا۔ اب قدیم فارسی سے صرف ژند کے کچھ آثار باقی ہیں۔ یہ مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی۔ اس ژند زبان کی دو بولیاں تھیں۔ جو جناب رسالتمآب سے آٹھ سو برس پیشتر فنا ہو چکی تھیں۔ مگر چند عرصہ قبل کسی اطلاع سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بیستوں پر اور دیگر مقامات پر اس کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں جو خط پیکانی میں پتھروں پر کندہ کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلے جس ہستی نے فارسی زبان کو آمیزش سے پاک بنانے کی کوشش کی اور اس کو ایک مستقل زبان کی حیثیت دی وہ دقیقی کی ذات ہے اس کے کسی شعر میں کہیں عربی کا لفظ نہیں آیا۔ اس کے بعد فردوسی انوری و سعدی جیسی اولوالعزم ہستیاں پیدا ہوئیں اور رفتہ رفتہ زبان بھی خوب ترقی کرتی گئی۔

مسلمان فاتحین جس وقت ہندوستان داخل ہوئے تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی رفتہ رفتہ انکے قدم جمتے گئے۔ اور مفتوحین کو بھی فاتحین کی زبان سیکھنی پڑی۔ دور مغلیہ میں اس زبان کو خوب عروج حاصل ہوا اور اگر ایک دو صدی گزر جاتے تو ضرور بالضرور یہ زبان ہندیوں کے لئے بھی مادری حیثیت اختیار کر لیتی۔

مغلیہ تاجداروں کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ علاوہ ہند کے دربار ایران سے خوش گو اور باکمال شعراء جو نمود کے خواہاں ہوتے ہی ہندوستان کا رخ کرتے۔ اور مغل شاہنشاہوں کی درگاہ بھی انکی قدر دان رہا کرتی تھی بیش بیش اور کثیر رقومات سے حوصلہ افزائی کیا کرتی۔ اسی عہد میں ایران میں صفوی خاندان برسر اقتدار تھا لیکن اس نے فارسی کی ترقی کی طرف ایسی دلچسپی نہیں لی۔ جیسا کہ ہندوستان میں لیجا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہو رہا تھا کہ ایران میں جہاں کہیں اچھا شاعر پیدا ہوتا ہند اس کو دربار عجم ہی سے نہیں بلکہ مملکت ایران سے چھین لیتا۔ اس زمانے کے خود ایرانی تذکرے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلسل تین چار

صدیوں تک یہی حالت رہی۔ اور ہندوستان میں فارسی دربار سے نکل کے عام کے زبان پر جاری ہو چکی تھی۔ سرکاری کاروبار اور امورِ مملکت کے علاوہ عوام کی ضروریات زندگی بھی اسی میں طے پاتی تھیں اس کو اس درجہ ترقی ہوئی کہ مسلمان تو مسلمان ہندوؤں نے بھی فارسی میں غزلیں لکھنی شروع کر دیں۔ اور ہزاروں نے اپنے دواوین مرتب کر کے فارسی علم ادب کے خزانے میں امانت رکھوا دیئے۔

خاندانِ تیموریہ کے زوال کے ساتھ ساتھ اور مغربی اقوام کے ہند پر تسلط سے۔ اور اردو زبان کی ترقی سے اس کا اثر روز بروز گھٹتا گیا۔ یہاں تک کہ دربار سے نکلی۔ اور پھر دفاتر سے اور پھر عوام سے چھوٹ کر ہندوستان سے غائب ہو گئی۔ لیکن اب بھی کچھ کچھ نشان باقی ہیں۔

اور ہندیوں نے ابھی تک اس کا دامن پکڑے رکھا ہے۔ اس کو مدارس اور کالجوں کے کورس میں داخل کر لیا ہے۔ ہندوستان کا ایک فارسی ادیب اور ماہر آج ایران کی مروجہ جدید زبان کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ یہاں کے ماہر سعدی و حافظ کے زمانہ کی انشا پردازی و نظم و نثر کے مقلد ہیں اور وہ بالکل جدید ایرانی سے ناواقف ہیں۔ ایک ایرانی ہند کی مروجہ فارسی کو بمشکل سمجھ سکیگا۔ اور ایک ہندی مروجہ فارسی جدید کو ایک ایرانی سے یا اور کسی ذریعہ سے بغیر سیکھے ہوئے نہیں سمجھ سکتا۔

ایک مرتبہ مجھے رقعات عالمگیری کی ضرورت پڑی۔ اس کے لئے میں نے اپنے والد کی ساری کتابیں الٹ پھیریں۔ اثنائے تلاش و جستجو میں مجھے ایک کتاب ملی۔

اس کتاب کے شروع صفحہ پر "دیوان احسان" لکھا ہے۔ اور ایک صاحب کی مہر ہے۔ جس میں یہ نام لکھا ہے۔ محمد علی حسین خاں تاج الامرا اور اس پر ۱۲۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔ ہر غزل میں شاعر نے اپنا تخلص احسان ہی کیا ہے۔ لیکن ہمیں کہیں اس کا پورا نام معلوم نہ ہو سکا۔

یہ دیوان مجلد اور اس کے ایک سو بیاسی صفحے ہیں۔ سارا دیوان خوش خط اور نہایت ہی تہذیب و ترتیب کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ شروع کے دو صفحوں پر بہت ہی عمدہ اور دیدہ زیب سنہری کام کیا گیا ہے۔ حاشیہ بھی سنہری بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد اس غزل سے کلام کا آغاز ہوا ہے۔

خدایا شور سرشاری بده دیوانہ مارا | لبالب از می تحقیق کن پیمانۂ مارا
چو برگ تاک دل در سینہ ام از بہم میلرزد | نگہ دار از گزند زاہداں میخانۂ مارا
کسی تاکی بود در زیر بار منت ساقی | ز موج می پر و بالی بده پیمانۂ مارا

خوی خجلت نداردبرجبینم مایہ اشکی — مگر از ابرِ رحمت سبز سازی دانہ مارا
بہ بزمِ مردم دانا چہ نقصان رسد آخر — اگر یک پردہ رسواتر کنی دیوانہ مارا
بآب دیدہ پیمانہ تاثیری کرامت کن — میانِ بادہ نوشاں نالہ مستانہ مارا
حجابِ خودنمائی را اگر ازپیش برداری — ز تارِ شمع نشناسی رگِ پروانہ مارا
نخواہد ماند احساں کرد خجلت برجبیں ما — اگر سیلاب می آید بدرہ کاشانہ مارا

اس شاعر کا دیوان خان زماں کے حکم سے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب کے آخری صفحے پر یہ عبارت لکھی ہے:

"ایں مایدہ پر فائدہ کاتب الحروف عبدالکریم ابن حاجی یوسف۔ بنا بر حکم نواب خورشید منزلت گردون جناب المستغنی عن الالقاب بے مثل و نظیر دوران نواب خانِ زماں بر روی صحابِ مذاقان سخن شناس چیدہ۔ ہر کہ چوں خامہ برو بگذرد بطفیل دعائی خیریت دارین آن معالی شوکت ایں کس را یاد آرد۔ تم الکتاب فی تاریخ پانزدہم رجب ۳۵ سنہ جلوس معلیٰ درمقام قلعہ پرنالہ"

خانِ زماں ایک ذی عزت اور بلند مرتبت امیر تھا۔ ہمیشہ اہلِ علم کا قدرداں رہا کرتا۔ حسبِ صنا سماؤں کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ انھیں بیش بیش انعامات دیا کرتا اور اپنے گرد جمع رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ حد درجہ کا قدرداں اور علم و فن کا بڑا شایق تھا۔ کتاب خود زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اُسے کس درجہ علمی شغف ہوگا۔

رقعاتِ عالمگیری میں خانِ جہاں کا متعدد جگہ ذکر آیا ہے لیکن خانِ زماں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف اس کتاب سے قلعہ مذکور کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہ قلعہ اُن دنوں بہت مشہور اور نہایت محکم و مضبوط قلاع سے تھا اس قلعہ پر شاہنشاہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں بغاوت ہوئی تھی۔ قلعہ سر کرنے کے لئے مقرب خاں سپہ سالار کی سیادت میں فوج بھیجی گئی تھی۔ جو چھوٹی سی زد و خورد کے بعد فتح کا نشان اڑاتی ہوئی دارالسلطنت کی طرف کوچ کی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو رقعاتِ عالمگیری صفحہ (۳۶) رقعہ (۱۱۱)۔ مطبوعہ نولکشور پریس۔

"مقرب خاں بر تسخیر برنالا مامور شد۔ الخ"

اس قلعہ کو فتح کرنے کے بعد عہدِ عالمگیری میں اس کا نام بدل دیا گیا۔ چنانچہ خود بادشاہ جہاں پناہ اپنے رقعہ (۳۴) صفحہ (۱۱) میں یوں ارقام فرماتے ہیں۔

"قلعہ برنالا باسم نول تارا موسوم شد — تفصیل یورش از کنیزاں خود بپرسند"

ایسے بڑے نامور اور باکمال شاعر کا کلام آج تک قعرِ گمنامی میں اور کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا۔

اس کے سارے کلام کو دیکھا لیکن کہیں کچھ حالات معلوم نہ ہوسکے کہ یہ کہاں کا باشندہ تھا۔ اور اس کا پورا نام کیا تھا۔ صرف اس شعر میں یوں کہتا ہے کہ۔ ؎

"نشنیدہ ایم غیر تو احسان زاصفہاں   آید باختیار برو عاقلی گردد"

شاعر نے متعدد مقامات پر صائب کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صائب کا ہم عصر تھا۔ اور اکثر اشعار سے شاگرد ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ ایک مقام پر یوں کہتا ہے۔

"ہر چند احساں وارد کمال معرفت   اما چوں صائب شاعرے پیدا نہ کرد سالہا"

یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

"احساں زفیض صائب شیریں کلام بود   کہ ایں غزل بسمع دل دوستان رسید"

اب ہم ذیل میں صرف دو غزلوں کو لکھتے ہیں جس کو شاعر نے صائب کی غزلیات پر کہا ہے۔ ؎

تا دلم دیو ہوائی نفس را در شیشہ داشت   از خدا امید و ہم از مردماں اندیشہ داشت

ہم چو دل ہر قطرہ خونی کہ در تن داشتم   پیش ازیں از شوق او شغل محبت پیشہ داشت

داغ مسود ابر سر گل میزد از آشفتگی   سنبل زلف پریشاں در دلم تا ریشہ داشت

زخم ناسور اسیران تو اش قسمت فزود   پیش ازیں اگر نہ اعتبار شیشہ داشت

ایں جواب آں غزل احساں کہ صائب گفتہ است   ہر حبابی را کہ میدیدم پری در شیشہ داشت

دیگر

درمیان ما محبت جنگ پیدا می کند   از صفا آئینہ ما زنگ پیدا می کند

بس کہ بر معشوق عاشق سخت گیر دکارہا   عکس شیریں جلوہ گاہ از سنگ پیدا می کند

سینہ صافاں را چہ پروا از گزند مردم است   گوہر ما از شکستن رنگ پیدا می کند

چوں تواں دید از نگاہی روی زیبائی ترا   کز نزاکت ہر زماں صد رنگ پیدا می کند

ایں جواب آں غزل احساں کہ صائب گفتہ است   خون عاشق مدعی از سنگ پیدا می کند

سارا دیوان فصاحت و بلاغت سے آراستہ افراط و تفریط سے پاک ہے کلام میں ایسے جواہر پارے اور ۔۔ وہ اثرات ہیں کہ ہر ہر شعر پر دل کو چوٹ لگتی ہے۔ ہر جگہ اشعار کی سادگی عجب ۔۔ ہی مزہ دیتی ہے تخیل نہایت اچھوتا باندھتا ہے۔ اور حد درجہ کا نازک خیال شاعر ہے۔ الغرض اپنی [illegible] کے باعث اس کے

متعلق کافی معلومات مہیا نہیں ہو سکے۔ امید ہے کہ آئندہ کوششوں سے ان باتوں کا بھی پتہ چل جائے گا۔

مَدھوا

(از جناب جے شنکر صاحب)

"آج سات دن ہو گئے۔ پینے کی کون کہے۔ چھوا تک نہیں! آج ساتواں دن ہے سرکار!"

"تم جھوٹے ہو۔ ابھی تو تمہارے کپڑے سے مہک آ رہی ہے۔"

"وہ .... وہ تو کئی دن ہوئے۔ سات دن سے اوپر — کئی دن ہوئے — اندھیرے میں بوتل انڈیلنے لگا تھا۔ کپڑے پر گر جانے سے نشہ بھی نہ آیا۔ اور آپ کو کہنے کا .... کیا کہوں .... سچ مانئے۔ سات دن ..... ٹھیک سات دن سے ایک بوند بھی نہیں۔"

ٹھاکر سردار سنگھ ہنسنے لگے۔ لکھنؤ میں لڑکا پڑھتا تھا۔ ٹھاکر صاحب بھی کبھی کبھی وہیں آجاتے۔ ان کو کہانی سننے کا چسکا تھا۔ تلاش کرنے پر یہی شرابی ملا۔ وہ رات کو، دوپہر میں کبھی کبھی سویرے بھی آجاتا۔ اپنی لچھے دار کہانی سنا کر ٹھاکر کا دل بہلایا کرتا۔

ٹھاکر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو آج پیوگے نا!" "جھوٹ کیسے کہوں۔ آج تو جتنا ملے گا سب ہی پیوں گا۔ سات دن چنے چبینے پر گزارے ہیں۔ کس لئے۔"

"تعجب! سات دن پیٹ کاٹ کر آج اچھا بھوجن نہ کر کے تمہیں پینے کی سوجھی ہے! یہ بھی ......"

"سرکار! موج بہار کی ایک گھڑی، ایک طویل دردناک زندگی سے بہتر ہے۔ اسکی خماری میں رُدکھے دن کاٹ لئے جا سکتے ہیں۔"

"اچھا آج دن بھر تم نے کیا کیا کیا ہے؟"

"میں نے؟ اچھا سنئیے — سویرے کہرا پڑتا تھا۔ میرے دھواں سے کمبل سا وہ بھی سورج کے اطراف لپٹا تھا ہم دونوں منہ چھپائے پڑے تھے۔"

ٹھاکر صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اچھا تو اس منہ چھپانے کی کوئی وجہ؟"

"سات دن سے ایک بوند بھی حلق سے نہیں اتری تھی۔ بھلا میں کیسے منہ دکھا سکتا تھا۔ اور جب بارہ بجے دھوپ نکلی، تو پھر لاچاری تھی .... اُٹھا، ہاتھ منہ دھونے میں جو تکلیف ہوئی سرکار وہ کیا کہنے کی بات ہے!

پاس پیسے بچے تھے۔ چنا چبانے سے دانت بھاگ رہے تھے۔ کٹ کٹی لگ رہی تھی۔ پراٹھے والے کے ہاں پہنچا۔ آہستہ آہستہ کھاتا رہا اور اپنے کو بہلاتا بھی رہا۔ پھر گومتی کے کنارے چلا گیا۔ گھومتے گھومتے اندھیرا ہو گیا۔ جو بدن پر پڑے تھے، تب کہیں بھاگا اور آپ کے پاس آگیا۔"

"اچھا جو اس دن تم نے گذرنے والی کہانی سنائی تھی جس میں آصف الدولہ نے اس کی لڑکی کا آنچل بھنے ہوئے بھٹے کے دانوں کے عوض موتیوں سے بھر دیا تھا۔ وہ کیا سچ ہے؟"

"سچ! اسے وہ غریب لڑکی بھوک سے اسے چبا کر تھوک کرنے لگی!...... رونے لگی۔ ایسی تکلیف وہ دولت بڑے لوگ کر ہی بیٹھتے ہیں۔ سنا ہے سری رامچندر جی نے بھی ہنومان جی سے ایسی ہی......"

ٹھاکر صاحب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ پیٹ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دم رکتے ہوئے سنبھل کر بولے۔ "ایسے بڑپن کہتے کسے ہیں؟ کنگال تو کنگال! گدھی لڑکی! بھلا اس نے کبھی موتی دیکھے تھے؟ چبانے لگی ہوگی۔ تو میں سچ کہتا ہوں۔ آج تک تم نے جتنی کہانیاں سنائیں۔ سب میں بڑی گپ تھی۔ شہزادوں کے وکھڑے۔ رنگ محل کی تباہی۔ بیگمات کی لاحاصل محبت۔ لطف آمیز داستانیں اور دکھ سے بھری ہوئی کہانیاں ہی تمہیں آتی ہیں۔ پر ایسی ہنسنے والی کہانی اور سناؤ تو میں تمہیں اپنے روپیہ روپیہ ڈیڑھیا شراب پلا سکتا ہوں۔"

"سرکار! بوڑھوں سے سنے ہوئے وہ نوابی کے سونے سے دن! امیروں کی رنگ رلیاں۔ دلہیاؤں کی درد بھری آہیں! رنگ محلوں میں گھل گھل کر مرنے والی بیگمات! اپنے آپ سر میں چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ ان کی تکلیف سے رونے لگتا ہوں۔ امیر کنگال ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے گھمنڈ پاش پاش ہو کر خاک میں مل جاتے ہیں تب بھی دنیا بڑی پاگل ہے۔ میں اس کے پاگل پن کو بھولنے کے لئے شراب پینے لگتا ہوں۔ سرکار! نہیں تو یہ بڑی بلا کون اپنے گلے لگاتا؟"

ٹھاکر صاحب اونگھنے لگے تھے۔ انگیٹھی میں کوئلہ دہک رہا تھا۔ شرابی سردی سے ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ سینکنے لگا۔ دفعتہً نیند سے چونک کر ٹھاکر صاحب نے کہا۔

"اچھا جاؤ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ وہ دیکھو ایک روپیہ پڑا ہے۔ اٹھا لو۔ للو کو بھیجتے جاؤ۔"

شرابی روپیہ اٹھا کر آہستہ سے کھسکا۔ للو تھا ٹھاکر صاحب کا جمعدار۔ راستے ڈھونڈتے ہوئے جب وہ پھاٹک پر کی بغل والی کوٹھری کے پاس پہنچا۔ تو اسے دھیمی آواز سے سسکنے کی صدا سنائی دی۔ وہ کھڑا ہو کر سننے لگا!

"تو سور ا روتا کیوں ہے؟ کنور صاحب نے دو ہی لاتیں تو لگائی ہیں! کچھ گولی تو نہیں ماردی ہے؟"

گرج دار آواز سے للو بول رہا تھا۔ مگر جواب میں سسکیوں کے ساتھ ایک آدھ ہچکی ہی سنائی دیتی۔ اب اور بھی کڑک کر للو نے کہا۔ "مرا ہوا! جا سو رہ نخرہ نہ کر، ورنہ اٹھوں گا تو کھال اُدھیڑ دوں گا، سمجھا نا؟"

شرابی چپ چاپ سن رہا تھا۔ لڑکے کی سسکی اور ہچکی بند ہونے لگی۔ پھر اسے سنائی دیا۔ "ابا آگئے کہیں؟ کیوں مار کھلانے پر تلا ہے؟" خوف زدہ لڑکا باہر چلا آ رہا تھا۔ شرابی نے اس کے چھوٹے سے خوبصورت گورے چہرے کو دیکھا۔ آنسوؤں کی بوندیں ڈھلک رہی تھیں۔ "ارے پیارے" اس کا منہ پونچھتے ہوئے اسے لے کر وہ پھاٹک کے باہر چلا آیا۔ دس بج رہے تھے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ شرابی کی اس ہمدردی کو اس ننھے معصوم دل نے منظور کر لیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ ابھی وہ ایک تنگ گلی پر رکا ہی تھا کہ لڑکے کے دوبارہ سسکنے کی آہستہ آواز سنائی دی۔ وہ جھڑک کر بول اُٹھا۔

"اب کیا روتا ہے رے چھوکرے؟"

"میں دن بھر سے کچھ کھایا نہیں۔"

"کچھ کھایا نہیں۔ اتنے بڑے امیر کے ہاں رہتا ہے اور دن بھر تجھے کھانے کو نہیں ملا؟"

"یہی تو میں کہنے گیا تھا جمعدار کے پاس، مار تو روز ہی کھاتا ہوں۔ آج تو کھانا ہی نہیں ملا۔ کنور صاحب کا اور کوٹ لئے کھیل میں دن بھر ساتھ رہا۔ سات بجے لوٹا۔ تو اور بھی نو بجے تک کچھ کام کرنا پڑا۔ آٹا رکھ نہیں سکا تھا۔ روٹی بنتی تو کیسے! جمعدار سے کہنے گیا تھا!" بھوک کا ذکر کرتے کرتے لڑکے کے اوپر اس کی بے بسی اور اشتہا نے ایک ساتھ ہی جیسے حملہ کر دیا ہو۔ وہ پھر ہچکیاں لینے لگا۔ شرابی اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ ایک گندی کوٹھری کا دروازہ دھکیل کر لڑکے کو لئے ہوئے وہ اندر پہنچا۔ ٹٹولتے ہوئے دیا سلائی سے مٹی کی ڈھبری جلا کر وہ پھٹے کمبل کے نیچے سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ ایک پراٹھے کا ٹکڑا ملا۔ شرابی اسے لڑکے کے ہاتھ میں دے کر بولا "اب تو اسے چبا۔ میں تیرا گڑھا بھرنے کے لئے کچھ اور لے آؤں۔ سنتا ہے رے چھوکرے! رونا مت۔ روئے گا تو خوب پیٹوں گا۔ مجھے رونے سے بڑا بیر ہے۔ پاجی کہیں کا۔ مجھے بھی رلانے لگا۔۔۔۔۔۔"

شرابی گلی کے باہر بھاگا۔ اس کے ہاتھ میں روپیہ تھا۔ "بارہ آنے کا ایک دیسی ادھا اور دو آنے کی چاپ۔۔۔۔۔۔ دو آنے کی پکوڑی نہیں نہیں آلو مٹر۔۔۔۔۔ اچھا نہ سہی، چار آنے کا گوشت ہی لے لوں گا پر یہ چھوکرا! اس کا گڑھا جو بھرنا ہوگا۔ یہ کتنا کھائے گا اور کیا کھائے گا۔ اوہ! آج تک تو کبھی میں نے دوسرے کے کھانے کی فکر کی ہی نہیں۔ تو کیا لے چلوں؟ پہلے ایک ادھا ہی لے لوں۔۔"

اتنا سوچتے سوچتے! اس کی آنکھوں پر بجلی کی روشنی کی جھلک پڑی۔ اس نے اپنے کو مٹھائی کی دکان پر کھڑا پایا۔ وہ شراب کا اڈھا لینا بھول کر مٹھائی پوری خریدنے لگا۔ نمکین لینا بھی نہ بھولا۔ پورا ایک روپیہ کا سامان لے کر وہ دکان سے ہٹا۔ جلد پہنچنے کے لئے ایک طرح سے دوڑنے لگا۔ اپنی کوٹھری میں پہنچ کر اس نے دو قطاروں میں لڑکے کے سامنے سجا دی۔ ان کی خوشبو سے لڑکے کے حلق میں ایک قسم کی تازگی پیدا ہوئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ شرابی نے مٹی کی کلھیا سے پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔ نٹ کھٹ کہیں کا ہنستا ہے۔ سونگھ ہی بو ناک میں پہنچی نا۔ پالے خوب ٹھونس کر کھا لے اور رویا کی پیٹا!

دونوں نے برسوں کے بچھڑے دوستوں کی مانند ساتھ بیٹھ کر پیٹ بھر کھایا۔ سیلی جگہ میں سوتے ہوئے لڑکے نے شرابی کا پرانا کوٹ اوڑھ لیا تھا۔ جب اسے نیند آ گئی۔ تو شرابی بھی کمبل تان کر بڑبڑانے لگا۔ سوچا تھا۔ آج سات دن کے بعد بھر پیٹ پی کر سوؤں گا! لیکن یہ چھوٹا سا روکھا پاجی نہ جانے کہاں سے آ دھمکا!

ایک متفکرانہ جھلک میں آج پہلے پہل شرابی نے آنکھ کھول کر کوٹھری میں غریبانہ زندگی کی چیزوں کو منتشر حالت میں دیکھا اور اس گھٹنوں سے ٹھوڑی لگائے ہوئے بے طمع لڑکے کو بھی دیکھا۔ اس نے تلملا کر دل ہی دل میں سوال کیا۔ کس نے ایسے نازک پھولوں کو ستانے کی خاطر بے مہری برتی؟ آہ ری قسمت! پھر تو اس کو لیکر مجھے خانہ داری کرنی پڑے گی کیا؟ حرمان نصیب! جس کو میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میری اتنی مایہ ممتا۔ جس پر آج تک صرف بوتل کا ہی اقتدار تھا۔ اس کی حمایت کیوں کرنے لگی؟ اس چھوٹے سے پاجی نے میری زندگی کے لئے کونسا اندرجال پھیلنے کا بیڑا اٹھایا ہے! پھر کیا کروں؟ کوئی کام کروں؟ کیسے دونوں کا پیٹ چلے گا! نہیں بھگا دوں گا اسے۔ آنکھ تو کھولے! لڑکا انگڑائی لے رہا تھا۔ اوٹھ بیٹھ شرابی نے کہا۔ لے اوٹھ کچھ کھا لے۔ ابھی رات کا بچا ہوا ہے اور اپنی راہ دیکھ! تیرا نام کیا ہے؟

لڑکے نے تبسم کر کے کہا۔ مدھوا۔ بھلا ہاتھ منہ بھی نہ دھوؤں۔ کھانے لگوں! اور جاؤں گا کہاں؟

"آہ! کہاں بتاؤں اسے کہ چلا جائے! کہہ دوں کہ بھاڑ میں جا۔ لیکن وہ آج تک دکھ کی بھٹی میں جلتا ہی تو رہا ہے۔ تو........" وہ چپ چاپ گھر سے جھلا کر سوچتا ہوا نکلا۔ اولے پاجی۔ اب یہاں لوٹوں گا ہی نہیں۔ تو ہی اس کوٹھری میں رہ!

شرابی گھر سے نکلا۔ گومتی کے کنارے پہنچنے پر اسے یاد آیا کہ وہ کتنی ہی باتیں سوچتا آ رہا تھا۔ مگر کچھ بھی سوچ نہ سکا۔ ہاتھ منہ دھونے میں لگا۔ چمکدار دھوپ نکل آئی تھی۔ وہ چپ چاپ گومتی کے دھارے کو دیکھ رہا تھا

دھوپ کی گرمی سے آرام پاکر وہ فکر دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے پکارا۔

"بھلے آدمی رہے کہاں؟ برسوں میں دکھائی دیں۔ تم کو تلاش کرتے کرتے میں تھک گیا"

شرابی نے چونک کر دیکھا۔ وہ کوئی جان پہچان کا تو معلوم ہوتا تھا۔ مگر کون ہے، یہ ٹھیک ٹھیک نہ جان سکا۔

اس نے پھر کہا۔ تمہیں ہی سے کہہ رہے ہیں۔ سنتے ہو۔ اوٹھالے جاؤ اپنی سان دھرنے کی کل، ورنہ سڑک پر پھینک دوں گا! ایک ہی تو کوٹھری جس کا میں دو روپیہ کرایہ دیتا ہوں، اس میں کیا مجھے اپنا کچھ رکھنے کے لئے نہیں؟

"اوہ! رام جی، تم ہو بھائی میں بھول گیا تھا۔ تو چلو آج ہی آسے اوٹھا لاتا ہوں" کہتے ہوئے شرابی نے سوچا۔ اچھی رہی، اس کو بیچ کر کچھ دنوں تک کام چلے گا۔ گومتی میں نہا کر رام جی اس کا ساتھی پاس ہی اپنے گھر پہنچا۔ شرابی کو کل دیتے ہوئے اس نے کہا۔ لے جاؤ کسی طرح میرا اس سے پنڈ چھوٹے۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کو کل ڈھونا پڑا۔ کسی طرح اپنی کوٹھری میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ لڑکا چپ چاپ بیٹھا ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کیوں رے۔ تو نے کچھ کھا لیا کہ نہیں؟

"بھر پیٹ کھا چکا ہوں اور وہ دیکھو تمہارے لئے بھی رکھ دیا ہے" کہہ کر اس نے اپنی قدرتی میٹھی ہنسی سے اس رو کھی کوٹھری کو تر کر دیا۔ شرابی ایک لمحہ تک خاموش رہا۔ پھر چپ چاپ کھانے لگا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ یہ تقدیر کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟ چلوں پھر لیکر سان دھرنے کا کام چلا کر دونوں کا پیٹ بھرے گا۔ وہی پرانا چرخہ پھر سر پر پڑا۔ نہیں تو دو یا تین قصہ کہانی ادھر ادھر کی کہہ کر اپنا کام چلا ہی لیتا تھا! پر اب تو بغیر کچھ کئے گھر نہیں چلنے کا۔ پانی پی کر بولا کیوں رے مدھوا اب تو کہاں جائے گا؟"

"کہیں نہیں"

"یہ لو۔ تو پھر کیا یہاں جمع گاڑ رہی ہے کہ میں کھود کھود کر تجھے مٹھائی کھلاتا رہوں گا!"

"پھر کوئی کام کرنا چاہیئے"

"کرے گا؟"

"جو کہو!"

"اچھا تو آج سے میرے ساتھ ساتھ گھومنا پڑے گا۔ سیکل تیرے لئے لایا ہوں۔ چل آج سے تجھے

سان دینا سکھاؤں گا۔ کہاں رہوں گا۔ اس کا کچھ ٹھیک نہیں۔ درخت کے نیچے رات بسر کر سکے گا تا
"کہیں بھی رہ سکوں گا۔ پر اس بٹاکر کی نوکری نہ کروں گا۔" شرابی نے ایک مرتبہ اُس نظر سے اُسے دیکھا۔
لڑکے کی آنکھیں عزم بالجزم کا عہد کر رہی تھیں۔

شرابی نے دل ہی دل میں کہا۔ بیٹھے بٹھائے یہ باپ کہاں سے مول لیا۔ اب تو شراب نہ پینے کا
مجھے بھی عہد و پیمان کرنا پڑا۔ وہ ساتھ لیجانے والی چیزوں کو جمع کرنے لگا۔ ایک گٹھر کا اور دوسرے گل کا۔ دو بوجھ ہوئے

شرابی نے پوچھا تو کسے اوٹھائے گا؟

"جسے کہو"

"اچھا۔ تیرا باپ جو مجھکو پکڑے تو؟"

"کوئی نہیں پکڑے گا۔ چلو بھی۔ میرے باپ مر گئے!"

شرابی حیرت سے اُس کا منہ دیکھتا ہوا گٹھ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے نے گٹھری لادی۔ دونوں
کوٹھری چھوڑ کر چل پڑے۔ (بس)

(غلام رسول)

سائنس کا طریقہ تربیت

(از جناب رشید محمد صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ)

کوئی پندرہ برس ہوئے کہ میں پروفیسر اگاسز (PROI ACASIR) کے معمل میں داخل ہوا اور انھیں بتایا کہ
میرا نام مدرسہ سائنس میں طبعی تاریخ (NATURAL-HISTORV) کے طلبار کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے مجھ سے
میری آمد کے مقصد، میرے گزشتہ حالات اور حصول علم کے بعد آئندہ طریقہ کار کے متعلق چند سوالات کئے اور
بالآخر پوچھا "تمھیں کسی خاص شاخ کے مطالعہ کا شوق ہے؟"۔ اس سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جہاں
میری خواہش ہے کہ حیوانیات (ZOOLGGV) کے تمام شعبوں میں مہارت حاصل کروں میرا ارادہ یہ بھی
ہے کہ حشرات کے مطالعہ میں خاص طور پر منہمک رہوں۔

انھوں نے سوال کیا "تم کب شروع کرنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "ابھی"۔ اس جواب سے وہ بہت
خوش نظر آئے اور ایک موثر "بہت اچھا" کے ساتھ اس الکحل میں رکھے ہوئے منظوروں کی ——
بڑی بوتل کو الماری سے اٹھا لائے اور کہا "اس مچھلی کو لو۔ اور امتحان کرو۔ ہم اسے ہیمولن (HAEMULON)

کہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہارے مشاہدات پر سوال کروں گا۔" اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ گئے اور کچھ دیر بعد واپس ہو کر تفویض شدہ شئے کی احتیاط کے متعلق ہدایت دیں اور کہنے لگے "اگر کسی شخص کو منظوروں کی نگہداشت معلوم نہ ہو تو وہ فطریاتی (NATURALIST) بننے کے قابل نہیں۔"

مجھے مچھلی کو ایک چھوٹی کشتی میں رکھ کر اپنے سامنے رکھنے اور بار بار اس کی سطح کو الکوہل سے تر کرتے رہنے کا حکم تھا۔ علم الحشرات میں علم الحوت کے مقابلہ میں زیادہ صفائی کا لحاظ رہتا ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نے بلا تامل بوتل کی تہ سے مچھلی کو پکڑ کر نکالا اور ان کی مثال قابل تقلید تھی۔ الکوہل بہت پرانی اور مچھلی کی سی بو رکھتا تھا مگر اس مقدس چار دیواری کے اندر میں کسی اظہار نفرت کی جرات نہیں کر سکتا تھا اور میں نے الکوہل کو خالص آب کی طرح استعمال کیا۔ تاہم مجھے ایک شدید احساس بیزارگی سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ ایک جوشیلے حشریاتی کے لئے مچھلی کا مشاہدہ ہمت افزا نہیں تھا۔ میرے احباب بھی گھر پر مجھ سے دق ہو گئے کیوں کہ عطر کولون کی کوئی مقدار بھی اس مہک کو دور نہیں کر سکتی تھی جو میرے ساتھ ہر وقت سایہ کی طرح لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ میں اس مچھلی میں دیکھ سکتا تھا دس دقیقوں میں میں نے وہ تمام دیکھ لیا۔ اور پروفیسر صاحب کی تلاش میں نکلا جو عجائب خانہ چھوڑ چکے تھے۔ جب میں بالائی حصے میں رکھے ہوئے بعض پرانے جانوروں کے پاس ٹھیر کر واپس ہوا تو میرا منظور وہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ میں نے اس پر مائع ڈالا تا کہ اسے غش سے ہوش میں لاؤں اور طبعی ناگوار شکل کی واپسی کا اندیشہ مند رہا۔ اس تھوڑے سے اضطراب کے بعد اپنے بے زبان ساتھی کی طرف ایک ٹکٹکی باندھنے کے سوا میرے لئے کچھ نہیں تھا۔ نصف گھنٹہ گزر گیا۔ ایک گھنٹہ۔ دوسرا گھنٹہ۔ مچھلی ناگوار نظر آنے لگی۔ میں نے اسے اوپر نیچے الٹایا۔ اس کو غور سے دیکھا۔ ڈراونی دکھائی دینے لگی۔ اس کے بعد پیچھے سے، نیچے سے، اوپر سے، جانبین سے، سہ رُبعی منظر سے دیکھا۔ لیکن وہ اسی طرح ڈراونی تھی۔ میں ہراساں تھا۔ میں نے وقت سے پہلے طے کر لیا کہ ناشتہ ضروری ہے۔ مچھلی کو بوتل میں دوبارہ رکھ دیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے آزاد تھا۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ پروفیسر آگاسز عجائب خانہ آ کر گھر چلے گئے اور کئی گھنٹوں تک واپس نہ ہوں گے میرے ہمجولی اتنے مشغول تھے کہ طویل گفتگو سے انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں تھا۔ آہستہ سے میں نے اس ہیبتناک مچھلی کو نکالا اور احساس ناکامی کے ساتھ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں تکبیری (MAGNIFYING)

شیشہ استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ تمام قسم کے آلات کا استعمال ممنوع کردیا گیا تھا۔ اپنے دو ہاتھ، اپنی دو آنکھیں اور مچھلی۔ یہ بہت محدود میدان تھا۔ میں نے ایک انگلی اس کے حلق میں دانتوں کی تیزی معلوم کرنے کے لئے داخل کی۔ مختلف قطاروں میں چھلکوں کو گننے لگا۔ اور مجھے اس لغویت کا یقین ہوگیا۔ آخر کار ایک خوش کن خیال آیا کہ مچھلی کا خاکہ کھینچا جائے۔ اب میں حیرت کے ساتھ جانور میں نئے خدوخال معلوم کرنے لگا۔ اس موقع پر پروفیسر صاحب واپس ہوئے۔

انھوں نے کہا "بالکل ٹھیک! ڈرائنگ (خاکہ کشی) ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بھی خوشی ہوئی کہ تم اپنے منظورہ کو نم اور بوتل کو کاگ سے بند رکھتے ہو"۔ ان ہمت افزا الفاظ کے بعد پوچھا "اچھا اس کی شکل کیسی ہے؟" "حصوں کی ساخت کے متعلق (جن کے نام مجھے اب تک نامعلوم تھے) میرے بیان کو انھوں نے توجہ سے سنا۔ جھالر دار گلپھڑی قطعات اور متحرک پٹھے، سر کے مسامات، پرگوشت ہونٹ اور بے پلک آنکھیں، بغلی لکیر، شوکے دار پر اور دو شاخی دم، کھنچا ہوا اور کمانی دار جسم۔ جب میں ختم کرچکا تو وہ اور سننے کے منتظر نظر آتے تھے اور ناراضی کے لہجہ میں کہا "تم نے غور سے امتحان نہیں کیا۔ تم نے جانور کی سب سے نمایاں خصوصیت کو نظر انداز کردیا جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اس طرح موجود ہے جس طرح کہ خود مچھلی۔ پھر دیکھو۔ پھر دیکھو!" اور مجھے اپنی مصیبت میں چھوڑ گئے۔

میں پریشان تھا میں بیزار تھا۔ پھر وہی مکروہ مچھلی! مگر اب میں اپنے کام میں استقلال سے منہمک ہوگیا اور ایک ایک نئی چیز دریافت کرتا گیا اور مجھے اب معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کی رائے کتنی صحیح تھی۔ سہ پہر جلد گزر گئی اور اس کے ختم پر پروفیسر صاحب نے پوچھا "کیا تم نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا؟"۔

"نہیں مجھے یقین ہے کہ میں نے نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ پہلے میں نے کتنا نظر انداز کیا تھا"، میرا جواب تھا۔ انھوں نے جوش سے کہا "تو بہتر ہے۔ لیکن میں اب تمہارا بیان نہیں سنوں گا۔ مچھلی کو رکھدو اور مکان چلے جاؤ۔ شاید تم صبح بہتر جواب کے ساتھ تیار رہوگے۔ قبل اس کے کہ تم کل مچھلی کو دیکھو میں تمہارا امتحان لوں گا"۔

یہ بہت پریشان کن تھا۔ مجھے تمام رات مچھلی پر غور کرتے رہنا تھا کہ یہ نامعلوم مگر بالکل نمایاں خاص کونسا اور نیز اپنی تحقیقات کی نظر ثانی کئے بغیر دوسرے دن ان کا صحیح بیان پیش کرنا تھا۔ میں دریائے چارلس پر سے ہوکر پریشان و مضطر مکان پہنچا۔

دوسری صبح پروفیسر صاحب کی پر خلوص کورنش میرے لئے پھر ہمت افزا تھی۔ وہ متمنی تھے کہ

میں بھی اپنے طور پر اس بات کو دیکھ لوں جو انھیں معلوم ہے۔ میں نے کہا "شاید آپ کا مقصد ہے کہ مچھلی سڈول جانبیں جوڑے دار اعضا کے ساتھ رکھتی ہے" ان کے بڑے مسرت افزا "بے شک بے شک" نے گزشتہ شب بیداری کا صلہ دیا۔ جب وہ اس نکتہ کی اہمیت پر دلچسپی اور مسرت سے گفتگو کر چکے تو میں نے سوال کرنے کی جرات کی کہ مجھے اس کے بعد کیا کرنا چاہیے "ہاں۔ اپنی مچھلی کا امتحان کرو!" یہ کہا اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ گئے۔ ایک گھنٹہ بعد وہ واپس ہوئے اور میری نئی فہرست کو سنا اور کہا "بہت خوب! بہت خوب! لیکن ابھی پورا نہیں ہوا اور دیکھو" اور اس طرح تین دن تک انھوں نے اس مچھلی کو میرے سامنے رہنے دیا اور اس کے سوا کسی دوسری طرف دیکھنے یا کوئی مصنوعی سہارے کے استعمال کو منع کر دیا۔ "دیکھو! دیکھو! دیکھو!" ان کی یہی تاکید تھی۔

یہ بہترین حشریاتی سبق تھا جس کو میں نے اپنی عمر میں پڑھا۔ اس کا اثر بعد کے ہر مطالعہ کے جزئیات تک پہنچا۔ یہ ایک ترکہ ہے جسے پروفیسر صاحب نے اپنے شاگردوں کے لئے چھوڑا۔ اسے نہ ہم کبھی خرید سکتے ہیں اور نہ اس سے جدا ہو سکتے ہیں۔

چوتھے دن اسی گروہ کی دوسری مچھلی میرے سامنے رکھی گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ دونوں میں فرق و مشابہت ڈھونڈو۔ اس کے بعد اور مچھلیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ پورا خاندان میرے سامنے آ گیا۔ اور بوتلوں کا ایک کامل دستہ میز اور اطراف کے ایستادوں پر رکھا تھا۔ ناگوار بو نفیس عطر بن گئی اور اب بھی ایک پرانی چھ انچ والی کرم خوردہ کاگ کو دیکھ کر خوش کن خیالات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے!

اس طرح ہیمولنس کا پورا گروہ مطالعہ میں آ گیا۔ واقعات، مشاہدات اور انکی باقاعدہ ترتیب کے متعلق پروفیسر اگاسز کی تربیت اس تاکید پر مشتمل ہوتی کہ ان سے مطمئن مت ہو جاؤ۔ ان کا بیان تھا "واقعات بیکار چیزیں ہیں بشرطیکہ کسی عام کلیہ کے ربط میں لائے نہ جائیں۔"

آٹھ ماہ کے اختتام پر مجھے اپنے ان دوستوں کو افسوس کے ساتھ خیرباد کہنا پڑا اور کیڑوں کی طرف متوجہ ہوا لیکن جو کچھ میں نے اس تجربہ میں سیکھا وہ برسوں کی تحقیقات سے زیادہ قیمتی تھا۔

نورجہاں بیگم اور جہانگیر

(از جناب حسن قادری صاحب)

ہم میں سے کس نے نورجہاں اور جہانگیر کے زبان زدِ خاص و عام افسانۂ حسن و عشق کو نہیں سنا؟ درسی کتب میں اور دیگر مطالعہ کی کتابوں میں اس کی بابت مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو نورجہاں کی ولادت کی بابت کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور ذرا بڑے ہونے پر وہ آپ یہ پڑھتے ہیں کہ بادشاہ ہند نورالدین محمد جہانگیر نے شیر افگن خاں کی بیوی مہرالنسا خانم سے اس کی شادی سے پہلے عشق کیا تھا اور اسی عشق میں اس نے شیر افگن خاں کو مروا ڈالا اور مہرالنسا سے شادی کرلی۔ اس واقعہ کے بلا مبالغہ پر لگ گئے ہیں اور اس پر اردو لٹریچر میں کئی ایک ناولوں۔ ڈراموں اور کتابوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں ایک مشہور ادیب و مورخ اور سوانح نگار محمد حسین آزاد مرحوم نے قصص ہند میں یہ چند سطور تحریر کی ہیں۔

"ایک دن مہرالنسا کہ نورجہاں کا اصلی نام یہی تھا مینا بازار میں پھر رہی تھی۔ جہانگیر دو کبوتر ہاتھ میں لئے ہوئے ادھر سے گزرا اس سے کہا کہ ذرا یہ کبوتر تو لئے رہو اور آپ کسی کام کو چلا گیا۔ اتفاقاً ایک کبوتر پھڑک کر نورجہاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جب شاہزادہ واپس آیا تو دریافت کیا کبوتر کیا ہوا اس نے کہا وہ تو اڑ گیا۔ شاہزادہ نے پوچھا کیونکر۔ اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ اس طرح اڑ گیا۔ یہ بھولا پن شاہزادہ کو بہت بھلا معلوم ہوا اور تب ہی سے اسے ایک خیال ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اکبر کو اس کی خبر ملی بہت خفا ہوا بیٹے کو خوب دھمکایا اور فوراً ہی مہرالنسا کی ایک نوجوان سے شادی کردی۔

جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو دبے ہوئے عشق کی چنگاری چمک اٹھی نیت برگشتہ ہوگئی چنانچہ بہت سی تدبیریں کرنے کے بعد قطب الدین خاں کوکہ کو اس کے قتل کردینے کا حکم دیدیا جس کی تعمیل کی گئی۔ اب گھر بار ضبط ہو کر دربار کو روانہ ہوا۔

بادشاہ نے اب پیغام دینے شروع کردئے کہ مجھ سے نکاح کرلو۔ اور اس طرح پر چار نے کے بعد آخر سات سال گزرنے پر دونوں کا نکاح ہو گیا۔"

بے چارہ جہانگیر اس واقعہ کی بنا پر ایسا بدنام ہوا ہے کہ موجودہ نسلیں اکبر اعظم کے پرعظمت تذکرے کے

بعد جہانگیر کا تاریخ نویس پٹرا رانی ہیں اور کچھ سرسری امور کے بیان کے بعد جلد ہی دوسرے بادشاہوں کے تذکرے شروع کر دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس واقعہ کی کچھ اصلیت بھی ہے؟ بادی النظر میں اسکی بابت شک و شبہ کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی لیکن جب ذرا زیادہ شد و مد کے ساتھ سوالات کئے جاتے ہیں اور غور کیا جاتا ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ کیا اس کے تاریخی ثبوت اس نوعیت کے موجود ہیں جن کی تصدیق ہو چکی ہے؟ کیا اس عہد کے معاصرین نے اس کی بابت کچھ لکھا ہے؟ کیا اس کو تاریخی تدقیق و تحقیق کی کسوٹی پر کسا گیا ہے؟ کیا اس کی تنقید ہو چکی ہے؟ تو پھر ان سوالات کی بابت جواب ذرا سوچ کر ہی دینا پڑتا ہے۔ اور آخر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ محض افسانہ ہی افسانہ ہے اور اس کو تاریخ سے کچھ بھی سروکار نہیں ہے۔

اہل ہند کو ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کے لئے یہ کام مادر وطن کے ایک لائق فرزند نے کر رکھا ہے۔ الہ آباد کے پروفیسر بینی پرشاد نے ہندوستان کے بہت بدنام بادشاہ جہانگیر کی سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس میں جہاں انھوں نے جہانگیر کی بابت اور واقعات اور احوال تحریر کئے ہیں وہاں انھوں نے اس مشہور اور پامال افسانہ حسن و عشق جہانگیری کی بابت بھی بحث کی ہے اور اصلی واقعات پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

نور جہاں بیگم کا دادا خواجہ محمد شریف تاتاری سلطان خراساں بگ لربیگ کا وزیر تھا۔ اس نے طہماسپ شاہ ایران کی بھی چندے وزارت کی اس کی موت پر اس کے خاندان کو فلاکت سے دوچار ہونا پڑا جس سے مجبور ہو کر اس کے لڑکے یعنی نور جہاں کے والد مرزا غیاث الدین محمد المعروف بہ غیاث بیگ نے ترک وطن کا سامنا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو لڑکے اور اس کی حاملہ بیوی نے بھی سفر اختیار کیا۔ اور وہ ہندوستان کو جانے والے ایک قافلے میں شریک ہو گئے۔

بعد میں مرزا غیاث نے اہل و عیال کو ہمراہ لیکر قافلے کا ساتھ چھوڑ دیا اور آگے نکل کر قندھار میں قیام کیا۔ اور وہاں اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن والدین کی فلاکت نے اس لڑکی کی پرورش ان کے لئے وبھر کر دی تھی۔ اسی اثنا میں وہ قافلہ بھی قندھار پہنچ گیا کہ جس کا ساتھ چھوڑ کر یہ آگے بڑھے تھے جس کی وجہ غالباً وضع حمل کا اہتمام کرنا تھا۔

ملک مسعود قافلہ سالار نے ترس کھا کر ان کی ضروریات پوری کیں۔ ہندوستان آنے کے بعد اس کی معرفت مرزا غیاث کو بمقام فتح پور سیکری دربار اکبر بادشاہ میں بار مل سکا۔ یہاں مرزا نے اپنے علم و فضل اپنی لیاقت کے باعث مراتب جلیلہ حاصل کئے اور روز افزوں ترقی پاتا رہا۔

قندھار میں پیدا شدہ لڑکی کہ جس کے سبب سے باپ کو ملک مسعود کی ہمدردی اور ملازمت حاصل ہو سکی تھی مہرالنسا کے نام سے موسوم ہو کر اسم بامسمیٰ نکلی ۱۷ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک اور ایرانی جلا وطن مہاجر علی قلی خاں سے ہو گئی۔ وہ بھی مرزا غیاث کی طرح شاہان ایران کا ملازم رہ چکا تھا شادی کے بعد علی قلی خاں کو شاہزادہ سلیم کی مصاحبت میں مقرر کیا گیا اور وہ سلیم کی ہمراہی میں میواڑ کی مہم پر بھی گیا۔ وہاں شیر کا شکار کرنے پر شاہزادے نے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا جہانگیر نے جب باپ کے خلاف بغاوت کی تو شیر افگن نے چند دن اس کا ساتھ دیا اور پھر اکبر سے جا ملا۔

تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے علو حوصلگی سے کام لیکر اس کی خطا معاف کر دی اور بردوان کی حکومت عطا کی۔ بنگالہ ان دنوں مغل شہنشاہت کے خلاف سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا بہت سے مغل امرا اور جاگیرداران سازشوں میں بے محابا شرکت کرتے رہتے تھے اور چنانچہ جہانگیر نے اس شبہ پر راجہ مان سنگھ صوبہ دار بنگالہ کو واپس طلب کر کے اپنے کوکے قطب الدین خاں کو اس کی جگہ روانہ کیا۔ قطب الدین خاں نے بنگالہ آنے کے بعد بہت سے جاگیرداروں کو بغاوت کے شبہے اور الزام پر اپنی خدمات سے ہٹانا شروع کیا اور اسی سلسلے میں شیر افگن خاں بھی دربار صوبہ داری میں طلب کیا گیا جب وہ آیا تو اس کے پاس کے دو سائیس اس کے ہمراہ تھے۔

اس کے کیمپ میں حاضر ہوتے ہی قطب الدین خاں نے ناعاقبت اندیشی سے فوجیوں کو حکم دیا کہ اسے گھیر کر گرفتار کر لیں۔ شیر افگن جسے ایسے سلوک کی امید نہ تھی اس پر آگ بگولا ہو گیا اور تلوار سوت لی۔ اس نے قطب الدین خاں سے سوال کیا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ قطب الدین خاں نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ غضبناک شیر افگن نے اپنی سوتی ہوئی تلوار سے اس کے کاری زخم لگا دیا۔ قطب الدین میں زخم کھانے کے بعد بھی اتنی سکت رہ گئی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے سکا کہ شیر افگن کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اس حکم کے پہلے ہی امبہ خاں کشمیری نے شیر افگن خاں کے ایک زخم لگا دیا تھا۔ بہر حال اکیلے شیر افگن خاں کے جلد ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ امبہ خاں نے اسی جگہ جان دی اور قطب الدین خاں نے بھی اس کے بعد جان دی۔ قطب الدین خاں کے سے عزیز کوکے کی موت نے جہانگیر کو بہت رنج دیا۔ چنانچہ اس رنج میں اس نے شیر افگن خاں کو خوب گالیاں دیں۔

شیر افگن خاں کی بیوہ مہرالنسا اور لڑکی لاڈلی بیگم اب اپنے والد کے پاس دربار چلی آئی جلد

ہی دستور کے مطابق مہرالنساء کو والدۂ سلطانہ سلیمہ بیگم کی مصاحبت کا اعزاز حاصل ہوگیا۔
۱۶۱۱ء میں بماہ مارچ ایک مینا بازار میں جہانگیر نے اتفاقاً اسے دیکھ لیا۔ بیوہ نے شاہ شاہان کے دل میں جگہ پیدا کرلی۔ اور بالآخر ماہ مئی میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ (اقبال نامہ سعد ہے)

یہ ہیں اصل واقعات۔ اجو بہت سے ناظرین کے لیے نئے ہیں ان کے مقابل جو واقعات تاریخی افسانے اور واقعہ کے طور پر بیان ہوتے رہے ہیں ان کا کوئی تذکرہ اس عہد کے معاصرین نے نہیں کیا ہے۔

خود جہانگیر نے اپنی توزک میں اپنے دیگر حالات کے اقرار کے ساتھ اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ کوئی بھی کیوں کر اپنے شرمناک واقعہ کا تذکرہ کرسکتا ہے۔ لیکن توزک جہانگیری میں جہانگیر نے سب امور بہت کھلے کھلے تحریر کردیے ہیں اپنی شراب خواری۔ اپنی ابوالفضل کے خلاف سازش سب کا برملا تذکرہ کیا ہے۔ اور نیز شیر افگن کی بابت خوب برائی کی ہے کوئی قاتل اپنے رقیب کو قتل کرکے اس پر علانیہ خوشی کا اظہار نہ کرے گا۔

واضح رہے کہ توزک جہانگیری کی تکمیل معتمد خاں نے بزمانہ شاہ جہاں کی۔ کامگار حسین نے جو تالیف کی وہ شاہ جہاں کے حکم سے کی۔ شاہ جہاں کی نورجہاں سے موافقت نہ تھی اور نہ اس کو اس سے کوئی ہمدردی تھی۔ اس عہد کے مورخوں نے جب شاہ جہاں اور نورجہاں کی باہمی چپقلش کا تذکرہ کیا ہے جو جہانگیر کے آخری ایام میں حصول اثر و اقتدار اور جانشینی کے لئے ہوتی رہی تو علانیہ شاہجہاں کی طرفداری کی ہے۔ اور نورجہاں کی برائی کی ہے۔ اس پر بھی وہ کسی جگہ بھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں کرتے جس سے یہ افسانہ معتبر معلوم ہو حالانکہ یہ واقعہ کہ نورجہاں نے اپنے پہلے شوہر کے قاتل سے بکمال بے اصولی و بے شرمی نکاح کرلیا تاکہ عروج مرتبہ حاصل ہو ان کے لئے ایک اچھا شگوفہ گلکاری کے لئے ہوسکتا تھا۔

کہا جاسکتا ہے کہ دربار کے ان مورخین نے اور خود شاہجہاں نے عمداً اس کا تذکرہ نہ کیا جہانگیر کی بدنامی بھلا شاہجہاں کیونکر گوارا کرتا؟ اس کی بدنامی شاہجہاں کی اپنی بدنامی اور شاہی خاندان کی بدنامی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو درست بھی تسلیم کرلیں تو فوراً ہی عہد مغلیہ کے یورپی سیاحوں کا خیال آتا ہے۔ ان کو تو اس کا کوئی خوف اور لحاظ ہرگز نہ تھا۔ وہ علی العموم شاہان مغل کی بدگوئی ہی کرتے رہتے ہیں۔ کہنا چاہئے کہ انھوں نے اس کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انھوں نے یہ تک کیا ہے کہ نورجہاں اور شاہجہاں جہانگیر اور اس کی سوتیلی ماں کے مابین ناجائز تعلقات قائم رہنے کا حوالہ فراہم کیا ہے۔ باوجود اس دیدہ دہنی کے انھوں نے ہرگز ہرگز جہانگیر کے اس افسانوی جرم کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ وہ یہ ضرور تحریر کرتے ہیں کہ

نور جہاں کون تھی؟ اس کا شوہر بنگال میں کیوں کر مرا کب اس کی بادشاہ سے شادی ہوئی اور اس نے کس طرح کا اثر معاملات سلطنت پر حاصل کر لیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ نور جہاں سے جہانگیر کو عشق زمانہ شاہزادگی سے شروع ہو گیا تھا۔ ہاکنس طامس رو۔ اڈورڈ ٹری۔ ولیم فنچ پیٹر ڈی ولا۔ کسی نے بھی اس افسانہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس کے عہد کی بابت اقسام کی غلط سلط باتیں انھوں نے تحریر کی ہیں۔ ناممکن تھا کہ اگر جہانگیر نے واقعتاً اس اپنے افسانوی جرم کا ارتکاب کیا ہوتا تو یہ یوروپی سیاح خاموش رہتے۔ ایسے عظیم واقعہ کا ان کے کانوں سے پوشیدہ رہنا بھی غیر اغلب ہے۔ شاہجہاں کے عہد کے اواخر میں ڈاکٹر برنیر ایک انگریز وہاں آیا تھا اس نے جہاں آرا اور روشن آرا پر اقسام کے بہتان لگائے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں آرا کو شاہجہاں سے ملوث ہونے کی بابت ذکر کیا ہے۔ ایسے بے اصول اور نمک حرام ملازم نے بھی گو نور جہاں اور جہانگیر کو ہر طرح سے برا بھلا کہا ہے لیکن اس افسانوی عشق و محبت کا کوئی حوالہ بھی اس نے نہیں دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے تاریخی حوالوں سے بحث کی۔ اب عقلی اور منطقی دلائل سے اس کو پرکھا جائے گا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیونکر اکبر بادشاہ کا سا حاکم کہ جس کے تدبر نے اس کو یہ بات سمجھائی تھی کہ ازدواجی تعلقات قائم کر کے ان سے سیاسی اور معاشری فوائد حاصل کئے جائیں جہانگیر و نور جہاں کے عشق کا حال سنکر جب کہ وہ عنفوان شباب میں تھے بجائے ان دونوں کے نکاح کی منظوری دینے کے شیر افگن سے اس کا نکاح کر سکتا تھا؟

اگر فرض کر لیا جائے کہ کسی وجہ سے اس نے ایسا کر دیا تو پھر بھلا یہ امر ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ جہانگیر کے سے بد مزاج لا ابالی شاہزادے کی مصاحبت میں شیر افگن خاں اس کے رقیب کو متعین کرنے پر راضی ہوا ہوگا؟

پھر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر شیر افگن واقعتاً جہانگیر کا رقیب تھا تو اس نے اس کو اپنی مصاحبت میں امن چین سے کیوں کر رہنے دیا ہوگا۔ اکس طرح اس کو اس نے اپنی صید افگنی میں شرکت کا حق دیا اور اسے خطاب عطا کیا؟

فرض کیا کہ اسے باپ کی نارضامندی کا ڈر تھا تو وہ اپنی بادشاہت کے بعد یہ امر کر سکتا تھا کہ اس کے رقیب کا چپکے سے خاتمہ ہو جائے لیکن نہیں اس نے اس کو ترقی دی۔ واضح رہے کہ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی ایک بغاوت اس کے لڑکے خسرو نے برپا کی تھی اور اس میں شیر افگن خاں کی شرکت کا الزام ثابت ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے اور سب باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی ہیں وہ شیر افگن خاں کو بھی اس الزام کی تحت ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور اس لئے نہ کیا کہ شیر افگن سے کوئی اور وجہ پرخاش ہی نہ تھی وہ اس کا رقیب ہی نہ تھا اب خود نور جہاں کی بابت غور فرمائیے وہ ایک غیرت دار غیور خاتون تھی نیک بھی شریف بھی

شریف زادی تھی۔ جہانگیر کے مرتے ہی اس نے بقیہ تمام عمر عبادت میں صرف کی۔ پھر اس عالی مرتبت شوہر کے مرنے کے بعد جسے اسے ملکۂ زمانی بنا دیا اس نے [illegible] دنیا و آرام اپنے پر حرام کرلیا۔ ایسی خاتون نے بھلا کس طرح اپنے خاوند کے قاتل سے عقد کرلیا ہوگا؟؟ ایسی خاتون کی بابت ایسا خیال کرنا شرافت اور نسائیت کو رذالت سے بدل دینا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ تاریخ ہند کے افسانہ نگار بے معنی کی بات لکھ دیتے ہیں کہ اس نے شیر کے قابو میں نہ آنے کے خیال سے [illegible] اور نور جہاں کو اس [illegible] رذالت پر خاموش بیٹھا رہا [illegible] راجپوتی نسل کی تھی تو یہ ایمانی اور [illegible] تھی مانا کہ انسان آخر انسان ہے اور اس سے سو طرح کی خطائیں [illegible] لیکن آخر اس کی کوئی حد بھی تو ہے۔ اگر یہ برائی پرانی ہونے کے بعد انسان مشکل سے پھر اچھے کاموں کو کرنے کے قابل بنتا ہے اس کی زندگی اور دیگر خطا کاریوں سے ملوث نظر آتی ہے۔

پھر بھی ہم فرض کرتے ہیں کہ نور جہاں شریف اور غیرت مند سب کچھ تھی مگر اس کو کیا کرتی کہ جہانگیر نے اسے جبراً اپنی بیوی بنا لیا اور خود کشی کرنے نہ دی۔ پھر خود کشی حرام بھی تو ہے۔ لیکن اس معروضے کے ساتھ ساتھ یہ امر بالکل عیاں ہے کہ جہانگیر اور نور جہاں کے تعلقات بالکل مخلصانہ اور عاشقانہ تھے دونوں میں حد درجے کی گرویدگی تھی۔ زبردستی کے نکاح کے بعد اس طرح کی زندگی کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ شریف اور غیرت مند تھی تو کسی طرح وہ اپنی زندگی کے اس نئے دور سے خوش نہ رہتی!

اس کے بعد ذرا اس کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قطب الدین خاں کا بنگالے پر تقرر کیوں ہوا؟ بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنے ہمدم و ہمراز معتمد کرکے قطب الدین خاں کو اس لئے بنگالے کا صوبہ دار بنایا کہ وہ چپکے چپکے شیر افگن خاں سے اس کی بیوی کو طلاق دلوائے اور دربار کو روانہ کردے ورنہ شیر افگن خاں کا خاتمہ کردے۔ اس کام کے لئے معتبر آدمی کی ضرورت تھی اور رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قطب الدین خاں کا اس ناپاک غرض کے لئے بنگالہ روانہ ہونا تاریخی اور عقلی طور پر بالکل بے بنیاد امر ہے۔ مان سنگھ ناظم بنگالہ راجپوتوں کا مہرہ تھا اس نے خسرو کی بغاوت میں اس کا ساتھ دیا بنگالے میں اس کا رکھنا خلاف مصلحت تھا۔ بادشاہ سے اس کے تعلقات سرد ہو چکے تھے وہ اس سے بدگمان تھا لہٰذا بنگالے کے سے متمول صوبے سے جو وہاں کے افغان صوبہ داروں کی وجہ پر خطر بھی تھا اس کو ہٹانا اور اس کی جگہ اپنے معتمد علیہ شخص کا وہاں تعین عین مصلحت تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ شیر افگن پر یہ جو الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے بغاوت کرنی چاہی تھی محض الزام ہی ہے

اور محض بہانہ ہے لیکن جہاں اس کا تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہاں یہ امر بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس عہد میں کسی بھی امیر کا موقع پاکر سازش کرنا عجیب امر نہ تھا۔

لوگ شیر افگن خاں اور قطب الدین خاں کے ناگہانی قتل کو با معنی امر کہتے ہیں کیونکہ اس کا امکان ہے کہ قطب الدین خاں نے طلاق دہی کا حرف مطلب کہکر شیر افگن کو مشتعل کر دیا اور لہذا اتنی خونریزی ہوئی۔ ہو نہ ہو ایسا ہی ہوا ہو گا لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ جب شیر افگن خاں الزامات بغاوت و سرکشی کی جواب دہی کے لئے لشکر میں آیا تو دونوں طرف سے دوراندیشی نہ ہوئی مصلحت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا۔ اشتعال طبع کی اور یہی وجوہات تھیں کہ الزام کی جوابدہی کو بلایا اور بغیر جواب لئے گرفتار کرنا چاہا مرنے مارنے پر ایسے وقت تیار ہو جانا عین ممکن ہے۔

یہ غلط ہے کہ نور جہاں کو شیر افگن کے مرنے پر قیدی بناکر دربار روانہ کیا۔ شوہر کے مرنے پر بیوہ کا والدہ کے پاس جانا ایک معمولی سا امر ہے۔ اور اسی طرح سے یہ واقعات بھی کہ نور جہاں نے والدہ سلطانہ کی مصاحبت کا اعزاز حاصل کر لیا مینا بازار میں بادشاہ سے دوچار ہوئی اس کی دلبری اور آخر ملکہ زمانی اور بادشاہ بیگم کا اعزاز حاصل کیا۔ اس روایت میں ہر امر ممکن معلوم ہوتا ہے۔

غرض یہ واقعہ کہ نور جہاں سے جہانگیر کو عالم شاہزادگی میں عشق ہوا لیکن اکبری احکام سے اس کا نکاح شیر افگن سے ہو گیا۔ جہانگیر نے اس کا برا مانا۔ بادشاہ ہو کر شیر افگن کو مروا ڈالا۔ اور نور جہاں کو گرفتار کر کے محل شاہی میں طلب کیا اور ترغیب دی کہ وہ بادشاہ کی گود میں آجائے۔ نور جہاں کے انکار پر بادشاہ نے اسے اپنی والدہ کی مصاحبت میں رکھوا دیا اور پرچاتے پرچاتے للچاتے للچاتے آخر اسے اپنا کر لیا محض بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے اور واقعتاً بھی محض نامعقول امر ہے جو افسانہ ہے اور بس۔

غور کیجئے کہ خود اس افسانوی واقعہ کا آخری انجام اس کے آغاز و ابتدا کے لحاظ کرتے کس طرح کا ہونا چاہئے تھا دنیا کے اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی قوانین کی رو سے یہ حرکت نہایت رکیک اور شرمناک ہے کہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسانی خون بہایا جائے۔ جو بندۂ نفس اس کے لئے قتل و غارت گری پر اتر آئے گا وہ حد درجہ کا سیاہ کار ہو گا۔ اگر افسانہ نور جہاں و جہانگیر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ چونکہ وہ کسی اور مرد کی بیوی پر عاشق تھا اور بادشاہ بنجانے کے بعد اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنے اس ملازم کو بے گناہ قتل کرواتا ہے کہ کسی طرح سے اس کی بیوی ہاتھ آئے۔ لہذا نورالدین محمد جہانگیر حد درجہ کا سیاہ کار اور سفاک تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے اس بیان کو درست خیال کرنے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ ایسے بے اصول شخص کا طرز عمل اس وقت کے لئے کیا ہونا چاہیئے کہ جب رقیب میدان سے اس کے منشا کے مطابق قتل ہو چکا ہے اور منظور نظر معشوق محل میں آ چکا ہے؟ جس کو ایک انسان کے قتل کرنے میں کوئی باک نہ رہا ہو وہ بے محابا اپنے مطلوب کے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں اس نے ایک بے اصولی کر دی وہاں اس کو اور بھی بے اصولیاں کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ وہ فوراً ہی شب وصل کا سامان کرے گا اور اس کے لئے زبردستی کرے گا۔ اور دیگر جرائم کا بھی ارتکاب کرے گا۔ جہانگیر سے اگر شیر افگن کا قتل منسوب کیا جاتا ہے اور اسے اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہ امید کرنی چاہیئے کہ نور جہاں کے لئے وہ بہت بے چین تھا۔ اس نے اس کے دربار میں آنے کے بعد نہ تو عدت کا انتظار کیا ہوگا اور نہ نور جہاں کی مرضی دریافت کی ہوگی۔ حالانکہ خود روایت یہ کہتی ہے کہ بادشاہ نے پیغام دینے شروع کئے کہ مجھ سے نکاح کر لو اور اسی طرح پر چار نے کے بعد آخر سات سال گزرنے پر دونوں کا نکاح ہو گیا۔

پس چونکہ مجرم کے مجرم قرار پانے میں اس کے الزام میں ایک طرح کی مطابقت ہونی ضروری ہے اور جہانگیر پر جو الزام عاید ہوا ہے اس کا آغاز اور انجام بالکل ایک دوسرے سے مطابق نہیں ہے انہیں کسی طرح کا انطباق نہیں ہے لهذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہانگیر پر یہ الزام سراسر غلط اور افترا ہے کہ اس نے شیر افگن کے قتل کا حکم دیا کہ نور جہاں اسے حاصل ہو جائے پھر سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ افسانہ ہی افسانہ ہے تو کس طرح اس کا تاریخ میں تذکرہ آگیا کیونکر اتنے سارے لوگ اس کی روایت کو نقل کرتے رہے۔ "تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا"، ممکن ہے کہ اس سلسلے میں لوگ یہ بھی کہیں کہ "واقعہ نور جہاں اور جہانگیر کی شہرت ایسی عام ہے اور بچپن سے ہمارے کان اس واقعہ کے سننے کے ایسے خوگر ہیں اور ہو چکے ہیں کہ اگر کہیں یہ واقعہ اب غلط ثابت ہو جائے گا تو ہمیں ایسا صدمہ ہوگا جیسے کسی ہمدم دیرینہ کے بچھڑنے سے ہوتا ہے"۔ "رہنے بھی دو کیا ہوا جو ہم نے ان کو عاشق و معشوق بنا لیا وہ ہمارے تمہارے کچھ نہ تھے"۔

اس آخری استدلال کا جواب تو خاموشی ہی سے دیا جائیگا لیکن اس کا جواب عرض کئے دیتے ہیں کہ دو نسلوں کے گزر چکنے کے بعد محمد صادق تبریزی خافی خاں رسوجن رائے نے اس افسانے کو اپنے تخیل سے پیدا کیا اور سپرد قلم کر دیا۔

دنیا میں اکثر واقعے جھوٹ موٹ مشہور ہو جاتے ہیں اور بمشکل اس کا پتہ چلتا ہے کہ کس نے انکو شہرت دی کیوں دی گو بعد ازاں تحقیق اور دریافت سے انکو بے بنیاد مان لیا جاتا ہے بے فکری کا یہ مشغلہ ہے کہ واقعات گھڑے جائیں

افسانے لکھے جائیں پھر ان کو بے فکرے ہی شہرت دیتے ہیں یہی حال قصۂ نورجہاں و جہانگیر کا بھی ہے۔

کیا کہیے؟

(جناب محمد جمیل احمد خاں صاحب کوکب شاہجہان پوری)

دوا عبث ہے دعا بے اثر ہے کیا کہیے
ستم ظریف سہی چارہ گر ہے کیا کہیے

بہائے طاقتِ نظارہ نقدِ جاں بھی نہیں
متاعِ ہوش گراں کس قدر ہے کیا کہیے

تری تجلّیٔ عریاں بھی بے حجاب نہیں
نقاب کثرتِ تارِ نظر ہے کیا کہیے

ستائے نزع میں جی بھر کے مجھ کو موجِ نفس
سمجھ رہا ہوں کہ بادِ سحر ہے کیا کہیے

تڑپ تڑپ کے دلِ مضطرب کو بہلایا
کسے فغاں پہ گمانِ اثر ہے کیا کہیے

جہاں میں ہم کو بھی احساسِ رنج و راحت ہے
مگر سمجھتے ہیں یہ رہگذر ہے کیا کہیے

ہوا خیال یہ پیری میں باعثِ تسکیں
کہ شمعِ عمر چراغِ سحر ہے کیا کہیے

اگر نہیں اثرِ سجدہ اے جبینِ نیاز
یہ پائے ناز نہیں سنگِ در ہے کیا کہیے

وفورِ ضعف سے غربت میں دوشِ ہستی پر
یہ جانِ زار گراں کس قدر ہے کیا کہیے

وہ برقِ حسنِ جہاں سوز اور یہ آنکھیں؟
سوائے اس کے فریبِ نظر ہے کیا کہیے

ستم کی حد ہے، میرے عرضِ حال پر کوکب
وہ بولے خیر سے شوریدہ سر ہے کیا کہیے

٦٣

دکن میں مسلمانوں کے قدم

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

ملک عبدالملک مروانی کے زمانہ سلطنت یعنی سنہ ۹۰ ہجری میں جب حجاج عرب و عجم کے صوبوں کا حکمراں ہوا تو بنی ہاشم کے شریف و نجیب لوگ جہاں مل جاتے ہر چھوٹا بڑا الزام لگا کر حجاج کے حکم سے قتل کردیے جاتے اور ان کے گھروں میں آگ لگا دی جاتی۔ ایک زمانہ اس کے ان مظالم سے تنگ آگیا۔ جناب نبوت مآب محمد مصطفےٰ صلعم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد اور دوستوں میں سے کثرت سے لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور سب اُس کی بے پناہ زیادتیوں سے عاجز ہو کر نہایت پریشان حالت میں اپنے وطن اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ہاتھ اٹھا کر مال و دولت اور بیوی بچے ساتھ لیکر سات آٹھ جہازوں میں جزائر عرب کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اور دکن کے ساحلوں کی طرف جو اُس زمانہ میں۔ دابل چیول کنبائت، بھروچ، اور مچھلی بندر نام سے مشہور تھے۔ جہازوں کا رخ کردیا۔ موافق و مخالف ہوا کی مدد سے ہر جہاز ایک ایک بندرگاہ پر جا پہنچا۔

جب جہازوں سے اُترنے کا وقت آیا تو چونکہ ہر جگہ کے فرماں روا راجہ و زمیندار اسلام کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اس لئے ان لوگوں کا مزاحمت کرنا اور لڑنے پر آمادہ ہونا بالکل قدرتی تھا مجبوراً ان پریشان اور مصیبت کے مارے مسافروں نے عاجزی اور خوشامد درآمد سے کام چلایا اور بڑی مشکل سے اُن کو منا کر عہد و پیمان کیا کہ ہم اپنے دین و مذہب کو چھپائے رکھیں گے اور اپنے اپنے گھر میں عبادت کرلیا کریں گے۔ اور ظاہرداری کے لئے اُس ملک کے رسم و رواج کے موافق اپنی وضع قطع میں مناسب تبدیلی پیدا کرکے جہازوں سے اُترے۔

دکن میں مسلمانوں کی بنیادی معاشرت۔ اس اجنبی ملک میں چونکہ مسلمانوں کے نئے نئے قدم آئے تھے اس لئے یہ زمانہ اُن کے لئے بڑی ہوشیاری و احتیاط سے کام لینے کا تھا۔ اذان کہنے قرآن پڑھنے اور بعض عبادتوں کے بجالانے میں بڑی کوشش یہ کی جاتی تھی کہ دوسروں کے کان میں آواز نہ جائے ہر ایک نے دکنیوں کے پیشے اور کاروبار اُن میں گھُل مل جانے کے لئے اختیار کر رکھے تھے۔ بڑے صبر کے ساتھ ہر قسم کی مصیبت

چھپلتے اور زندگی کے دن کاٹتے تھے۔ چنانچہ اس طرف کے اکثر مقامات میں اب تک مسلمان شرفا کی عورتیں جو قوم عرب اور نوائط کہلاتی ہیں اور اُن لوگوں کی بیویاں جو اپنے آپ کو حضرت زبیر، طلحہ اور دوسرے اصحاب رسول کی اولاد ظاہر کرتی ہیں ہنود عورتوں کا لباس پہنتی ہیں۔

غرض اس طرح چھپ چھپا کر رہتے اور اپنے مذہب کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ شادی وکتخدائی میں بالکل اہل دکن کی رسوم اور آداب کی پیروی کرنا پڑتی تھی۔ مثلاً شوہر کے مرنے کے بعد جوان عورتیں مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور تمام روم وایران وتوران ممالک اسلام میں اب تک دوسری شادی کرتی ہیں بلکہ اُن کے ورثا مجبور کرکے اُن کا دوسرا نکاح کر دیتے ہیں لیکن ہندوستان میں مسلمان شریفوں کے یہاں جن سے مراد اہل عرب ہیں اس فعل کو برا سمجھ کر (حالانکہ یہ عین خدا کے حکم اور محمدی شریعت کے مطابق ہے) ترک کر دیا گیا ہے اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف چل رہے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ایک مدت تک ان کمراہوں میں رہنے اور غربت وتکلیف کی حالت میں بسر کرنے کے بعد جب نئی نسلوں کی آمد شروع ہوئی اور دیکھا کہ ہندوؤں کے تمام فرقوں میں جن کی کوئی تعداد نہیں ہے۔ پانچ قومیں یعنی برہمن، کھتری، راجپوت، بقال اور کائتہ شریف سمجھی جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ اپنی شیر خوار لڑکی کو بھی اگر کسی کے نکاح میں دیدیں، اور اُس کا شوہر پہلی رات ہی کو مرجائے تو بھی اس کا دوسرا نکاح نہیں کرتے۔ اور چونکہ ہر قوم کو شریف، ہر ملک کے دوسرے شریفوں میں اپنی شرافت کی آن رکھنا چاہتے ہیں اس لئے طبعی غیرت نے تقاضا کیا ہم کیوں ان قوموں میں سب سے زیادہ ذلیل سمجھے جائیں۔ اور بیوگان کا نکاح کرنے کی رسم عزت وآبرو اور شرافت وخاندانی عزت کے خلاف سمجھ کر بالکل ترک کر دی۔ مذہب کے احکام اور بزرگوں کی پیروی کا کچھ خیال نہ کیا۔ حالانکہ یہ بات عقل وشرع کے اعتبار سے اچھی نہیں۔ اور اس میں بہت سے ایسے فساد پیدا ہوتے ہیں جن کی تشریح نہ کرنا بہتر ہے۔

قدیم دکنی سلطنتوں کی خصوصیت | اس سلسلہ میں ان عربی النسل مسلمان دکنیوں کی یہ احتیاط تعریف کے قابل ہے کہ انھوں نے اہل عجم کے رواج کے خلاف جن کا عمل ہی اس پر ہے کہ "ضیعوا انسابهم نسبوں کو بھلا دو اُنسے بے پرواہ ہو جاؤ" نسل کی شرافت اور کفو یعنی خاندانی پیوند کا دستور ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور اپنے ہی ہم قوموں یا ایسے سید کے سوا جو صاحب شجرہ ہو اور اُس کے ننھیال و ددھیال دونوں برابر کے شریف ہوں سخت سے سخت پریشانی کی حالت میں بھی بیٹی لینے دینے کے تعلقات نہیں رکھے۔ اب بھی

عرب نسل کے خاندان ان اصولوں کے بہت پابند ہیں وہ لونڈی یا ذلیل طبقہ کی فاحشہ عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوئی ہو اس کو کبھی اپنا داماد نہیں بناتے، اگر ان میں سے کوئی شخص اس قانون کے خلاف عمل کرتا ہے تو اس کو اپنی ذریت سے خارج کر کے شادی غمی کے موقعوں پر اس سے نہایت نفرت کے ساتھ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کی نسبت رکھنا نسل کی خرابی اور شرافت کی کمی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اسی طرح دوسری بری اور خلاف شرع و تہذیب رسمیں مثلاً گھروں میں گانے ناچنے والی لونڈیاں تیار کرنا، خواجہ سراؤں سے پردہ نہ کرنا، شادی کے زمانہ میں گھر کے اندر مستورات کے سامنے نہایت بے غیرتی کے ساتھ رقص و سرود کے نام سے طرح طرح کی بیہودگی اور فحش گوئی روا رکھنا اس قوم میں بالکل نہیں حالانکہ آج کل غرور و دولت کے باتوں میں یہی باتیں دنیاوی لذتوں کا بہت بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔

اگرچہ ہندوستان کے تمام شہروں کے شرفاء دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسی لغویات کا ہم میں رواج نہیں ہے لیکن تاریخ اقوام کے مطالعہ و تحقیق کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ دولت و تونگری کی ساتھ افلاس و ادبار تنگدستی کی پریشانی میں کہ ان ہی دونوں حالتوں میں آدمی بالکل بے قابو ہو جاتا ہے۔ کوئی قوم لذت جسمانی و عیش حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہیں رہتی اور ایسے موقع پر کفو و حفاظت نسل کا سوال عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے یہ بات صرف احمد آباد کے شیخوں اور خاندیس کے شرفاء میں جو ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں اور بعض مشرقی سندھ کے شرفاء اور مشائخ میں دیکھی گئی بلکہ اب فساد زمانہ کی وجہ سے ان لوگوں میں بھی کفو کا لحاظ بہت کم ہوتا جاتا ہے۔[1]

القصہ ایک مدت کے بعد اسلام کی بنیادیں خفیہ طور پر دکن کے ساحلی مقاموں اور بندرگاہوں میں مضبوط ہو گئیں گو اس زمانہ میں سلطان محمود غزنوی نے اطراف ملک ہند میں جوناگڈھ سورٹھ تک پہونچکر حضرت سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلعم و روحی فداہ کے مبارک مذہب کی دھوم مچادی، پھر غزنوی خاندان کے بعد سلطان معز الدین نے جو بعد میں سلطان شہاب الدین غوری غازی کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ ہندوستان اور اطراف دہلی کے بعض شہروں پر قبضہ کر کے بے دینی دور کرنے اور اسلام کو رواج دینے کی کوشش کی اور روز بروز مسلمانوں کی قوت مضبوطی میں اضافہ ہوا لیکن اصل میں دکن کے شہر اس وقت تک آزادی کے ساتھ نور محمدی صلعم سے منور نہ ہوئے تھے

سنہ ۶۹۱ ہجری میں سلطان علاء الدین سلطان جلال الدین بادشاہ دہلی کا بھتیجا اپنے چچا کی اجازت حاصل کئے بغیر شہزادگی کے زمانہ میں بے شمار لشکر کے ساتھ دولت آباد تک آیا۔ جو اس زمانہ میں قلعہ دیوگیر کے

---

[1] یہ خافی خان نظام الملکی کی رائے ہے جو اپنے زمانہ کے حالات دیکھ کر قائم کی تھی۔ اب تو زمانہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ اس زمانہ میں کفو کا لحاظ بہت ہو چلا تھا تو اب اس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

انکی عیاشی اور روزافزوں دولت نے حملہ آوروں کو تسخیر ملکت کی ترغیب دی جنھیں پہلی دفعہ تو ناکامی ہوئی لیکن انھوں نے استقلال سے کام لیا اور متواتر حملوں سے ملک کو فتح کر کے چھوڑا، حامیان ملک کو نیست نابود کر دیا اور انکی مال و زر پر خود متصرف ہو گئے

انہی بازاروں میں جہاں چند گھنٹے قبل بھیڑ لگی ہوئی تھی اب بہت کم آدمی چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں اور جو نظر آرہے ہیں وہ بھی بے حجاب ہو کر پھر رہے ہیں اور اپنے ... بے حیائی اور محرمان نصیبی کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔

وہ سامنے کون لوگ ہیں جنھوں نے فرش راہ کو اپنا بستر بنا رکھا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے غم باطن کو بھول گئے ہیں یہ نو وارد مسافر، آوارہ گرد، اور لاوارث یتیم ہیں جن کی خستہ حالت اصلاح کی محتاج ہیں۔ جن کی داستان الم ہمدردی اور چارہ سازی کی منت کش ہیں۔ دیکھنے والے انسے خوف کھاتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کے جسم عریانی کی حقیقی تصویر ہیں۔ بعضوں کو متعدی امراض نے گھلا گھلا کر نحیف کر دیا ہے۔ دنیا نے اُن کو خیرباد کہہ دی ہے سوسائٹی نے انسے بے اعتنائی اختیار کر رکھی ہے اور انکو برہنگی اور فاقہ کشی کے سپرد کر دیا ہے۔

ان تھرتھراتے ہوئے جسم والی عورتوں نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ انکے حسن و جمال کا شہرہ دور دور تھا مطلب پرستوں نے انکو سبز باغ دکھا کر خوب خوب چلکے دئے، ہمیشہ انکے حسن سے مستفید ہوتے رہے اور جب انکی بہار جوانی ختم ہو گئی تو اُن عیاروں نے انکو گھروں سے نکال کھڑا کیا تاکہ یہ نازک بدن کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں کی سختیاں برداشت کریں اور فاقوں کا شکار ہو جائیں اب شاید یہ مصیبت کی ماری اپنے بے وفا آشناؤں کے دروازں پر پڑی ہوئی اُنسے فریاد کر رہی ہے اور رحم کی طالب ہیں لیکن رحم کیسا! ان مطلب پرستوں سے سوائے طعن و تشنیع کے اور کسی بات کی امید نہیں۔ یہ عبرت کا مقام ہے۔

ہائے! میں کیوں انسان پیدا کیا گیا اس لئے کہ دوسروں کو رنج و مصیبت میں دیکھوں اور انکی مدد نہ کر وں!

اے خانماں برباد لوگو! دنیا تمہیں لعنت ملامت کریگی لیکن تمہارے درد کی چارہ سازی کیطرف مطلق قدم نہ اٹھائیگی بڑے لوگوں کی ادنی سے ادنی مصیبتیں اور امراکی موہوم سے موہوم پریشانیاں نہایت فصاحت و مبالغہ سے بیان کی جاتی ہیں تاکہ ہماری ہمدردی اور توجہ کو انکی طرف منعطف کیا جائے۔ لیکن جب غریب روتا ہے تو کوئی اس کا شریک درد نہیں ہوتا اُن پر طرح طرح کے ستم ڈھائے جاتے ہیں اور ہر بادن جو دوسروں کو اپنی پناہ میں لیتا ہے اُن کے حق میں دشمن ثابت ہوتا ہے۔

خدایا میرا دل کیوں اتنا اثر پذیر بنا دیا ہے اگر تجھے ایسا ہی منظور تھا تو میری قسمت بھی ایسی بنائی ہوتی کہ میں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو سکتا اور اُن کی مدد کر سکتا۔

کیا ہی بدنصیب ہے وہ انسان! جس کا دل تو درد مند ہے لیکن اسمیں اتنی قوت نہیں کہ دوسروں کو غم سے نجات دلا سکے۔ آہ ایسے موقعہ پر درد مند انسان کی حالت طالب رحم سے بھی زیادہ قابل رحم ہوتی ہے۔

دکن کا ایک قدیم اُردو شاعر
قیس

(جناب سید امین الدین صاحب نظام آبادی)

راقم الحروف کا چند روز سے قصبۂ قلعہ بالکنڈہ میں عارضی قیام ہے جو تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد میں واقع ہے یہ ایک قدیم بستی ہے یہاں کے ''دکنی سپاہی'' دولت آصفیہ کے نہایت جاں نثار اور جانباز ملازم گزرے ہیں جنہوں نے متعدد معرکوں کے علاوہ کھرڈکی مشہور و معروف لڑائی میں خوب شجاعت دکھلائی تھی جن کے واقعات مستند مکاتیب پارینہ میں محفوظ ہیں۔

یہ قصبہ اور اس کے ساتھ دوسرے قصبے مقرب خاں سپہ سالار عساکر عالمگیری کے حصے میں آئے اورنگ زیب عالمگیر نے فتوحات کے سلسلہ میں اپنے محبوب و جانباز سپہ سالار کو دکن میں چند قصبے بطور جاگیر عطا کئے اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ جس میں یہ قصبہ بھی شامل تھا۔

سپہ سالار موصوف کے سایہ میں بہت سے سپاہی بیجاپور اور اطراف واکناف سے آکر اس قصبہ میں جمع ہوگئے اس کے ساتھ ساتھ علمی مذاق رکھنے والے افراد کا بھی اجتماع ہوا۔ سپہ سالار موصوف کے جانشین نسلاً بعد نسل اُن لوگوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ اُس زمانہ کی فضا اور ماحول کے نظر کرتے اگر ایک طرف یہاں کے لوگ ''فن سپہ گری'' میں نمایاں خصوصیت اور اپنی شجاعت کی بدولت ممتاز شان رکھتے تھے تو دوسری طرف علمی مذاق میں بھی کسی اور قصبے کے باشندوں سے کم نہ تھے۔ اب انقلاب دہر کی وجہ سے ہر چیز تہ و بالا ہوچکی اور امتداد زمانہ کے سبب عجیب کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ اصلی باشندے ''بے روزگاری'' کے بھوت کے شکار ہوگئے۔ اِن مشکلات کی وجہ یہاں کے علمی کارناموں کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

دوران قیام میں چند معزز اصحاب سے ملاقاتیں ہوئیں چونکہ یہ علاقہ راقم الحروف کا آبائی وطن بھی ہے۔ بہت سے اصحاب سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ایک معزز صاحب نے اثنائے گفتگو میں چند قدیم کتب کا اشارہ کیا اور اپنی عنایت سے کہنہ ذخیرہ سے دو کتابیں بغرض مطالعہ مرحمت کیں۔ جن میں ایک قلمی دیوان قیس بھی تھا۔

خدا جانے کتنے ایسے قدیم جواہر پارے بے اتفاقی سے گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اکثر قدامت پرست حضرات اشیاء پارینہ کو بنظر احترام دیکھتے ہیں اور متبرک جانتے ہیں یہ پاکیزہ جذبہ اس حد تک جائز بھی تھا لیکن بڑھتے بڑھتے

بخل کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ "تبرکات" زیب طاق اور لقمۂ دیمک ہو کر پیوستِ خاک ہو جاتے ہیں اور یہ تبرکات نہ خود کی ذات مبارک کے لئے فائدہ رساں ہوتے ہیں۔ اور نہ دیگر احباب یا آئندہ نسلوں کے لئے۔ جب یہ تبرک پسندی مٹ جائے گی تعصب کی ظلمت دور ہو جائے گی اور جدید علمی شعاعیں کہنہ ذخیرہ کی تاریکی کو دور کر دیں گی تو بہت سے مدفونہ اور پارینہ اوراق آسمان ادب کے ماہ پارے بن جائیں گے۔

"دیوان فیض" ایک قلمی نسخہ ہے اس کی تقطیع اوسط ہے مجلد اور محفوظ حالت میں ہے۔ کوئی جزو یا کوئی ورق ضائع نہیں ہوا، کاغذ دبیز اور سفید ہے۔ اس دیوان میں ایک منقبت اور تقریباً گیارہ قصائد اور تین سو کے قریب غزلیات ہیں۔ ریختی کا بھی کچھ حصہ ہے۔

افسوس کہ شاعر کی لائف (سوانح حیات) جزوًا یا کلاً نہیں لکھی گئی۔ بلکہ قصبۂ بالکنڈہ کے ایک معزز صاحب کے علمی مذاق نے مجبور کیا کہ وہ اس کی نقل کریں چنانچہ تمت بالخیر پر لکھتے ہیں:۔

"تمت بالخیر والعافیہ من ید سید زین العابدین ابن سید شاہ بندگی بادشاہ قادری مشائخ سکنۂ قصبۂ بال کنڈہ فی التاریخ بست و چہارم محرم الحرام ۱۲۶۳ھ ہجری بروز دوشنبہ وقت دو دنیم پہر روز در بلدہ حیدرآباد"

چھان بین سے اتنا تو معلوم ہو سکا کہ اس شاعر کا اصلی نام محمد صدیق تھا اور تخلص فیض۔ مگر افسوس کہ شاعر کی "لائف" کا پتہ نہ چل سکا۔ اس دیوان کے ناقل سید زین العابدین نے ہی نقل کرتے ہوئے (۱۳۱) صفحہ پر جو وجہ نقل تحریر کی ہے بجنسہ اس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔

"درحینیکہ عاصی خاکپائی اہل دین شفیع المذنبین سید زین العابدین مشائخ ساکن قصبہ بال کنڈہ سرکار ناندیڑ صوبہ محمد آباد بیدر ہمراہ خواجہ غلام قادر خاں صاحب منصبدار نائب نواب غلام حیدر خاں بہادر المخاطب اقتدار جنگ حمد الدولہ و حاکم قصبۂ مذکور کہ برائی انفصال مقدمہ وزروان وانکہ انداختہ مکان راجہ ساتی طوائف داخل بلدہ شدہ بودند۔ بہ بلدہ حیدرآباد رسیدہ در مکان نائب صاحب معزحد اقامت انداختہ بود چون باستماع آوازہ اشعار ریختہ وصیت حلاوتِ ریختہ ملائے محمد صدیق صاحب المتخلص فیض از نزئے نائب صاحب ممدوح شعلۂ اشتیاق سرمایہ صبر و قرار خاکستر گردانیدہ بود۔

لہذا بخواہش طرفین دیوان مسطور گرفتہ بجلدی تمام نقش نقلش برنگین کاغذ بستہ واز نظر ثانی ہم فارغ گردیدہ بر صفحہ روزگار یادگار گذاشت ہمدرین ایام راجہ رائے بخش موقوف گردیدہ سراج الدولہ سراج الملک بہادر بعہدہ دیوانی باستعانت فریجر[1] صاحب رزیڈنٹ[2] انگریز بکمپنے سرفراز شدند و ہر طرف زور سرما از حد زیادہ جاریست"

[1] FRAZER [2] انگریزی لفظ رزیڈنٹ کا مفرس ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری میں اس شاعر کا بہت چرچا اور خاصی شہرت تھی اور خاص و عام اس کے مداح اور ثنا خوان تھے۔

اقتباس ہذا کے ذیلی ٹکڑے سے پتہ لگتا ہے کہ قیس کے اردو اشعار سے کس قدر دلچسپی . . . . . لی جاتی تھی۔

"چون باستماع آوازہ اشعار ریختہ و صیت حلاوت ریختہ ہائے محمد صدیق المتخلص بقیس ... شعلہ اشتیاق سرمایہ صبر و قرار خاکستر گردانیدہ........"

دیوان قیس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شان میں ایک منقبت لکھی گئی ہے۔ زبان صاف و شستہ ہے روانی بھی ہے اور جوش بھی۔ ایک دریائے محبت موجزن ہے۔ اس کے بعد ایک قصیدہ جناب سید غلام علی شاہ صاحب نبیرہ حضرت موسیٰ صاحب قادری کی توصیف و تکریم میں لکھا گیا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فلک پہ یہ دیکھتا کیا ہوں کہکشان بہار ۔۔۔ پڑا ہے گردن مینا میں موتیا کا ہار
نہ کیوں ستاروں سے ہو چرخ اطلسی کے بہار ۔۔۔ سجی ہے بر میں قبا اوس نے آج بوٹی دار
غلط ہے قوس قزح یہ کہ خوش نویس ازل ۔۔۔ لکھا ہے ابر ہی زرکار پر خط گلزار
نہیں ہلال ہے یہ طائران ارض و سماں ۔۔۔ نکالی بیضۂ گردوں سے جس نے منقار
بچشم غور تو خط شعاع کو دیکھ اے دل ۔۔۔ خدا ہی جانے ہے یہ کس کا ہے جادۂ رفتار
کہاں ہے دانۂ شبنم پیالہ میں گل کے ۔۔۔ دھرے ہیں کاسۂ یاقوت میں دُرِ شہوار
شفق ہے ہے یہ خور ہے نہ کچھ حنا آلود ۔۔۔ کہ صبح نکلی ہے رکھے سر پہ چہرۂ گلنار
چمکتی دیکھتا بجلی کو جس طرف ہوں میں ۔۔۔ تو یاد آتا ہے مجھ کو تبسم دلدار
نہ کیوں فلک کو ہو سرطا کی برج سے تشبیہ ۔۔۔ اسی لئے اوسی کہتی ہیں چرخ کج رفتار
ہزار رنگ کے دیکھے ہیں باغ دہر میں گل ۔۔۔ سوائے ماہ کے دیکھا نہ کوئی گل بیخار

ان اشعار کی بجنسہ نقل کی گئی ہے البتہ گاف کی شناخت کے لئے گاف پوری شکل میں لکھا گیا ہے چونکہ اس دیوان کے رسم الخط میں گ اور ک میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا گ مثل ک کے لکھا جاتا تھا۔ بغرض سہولت ناظرین گ بنا دیا گیا مگر "سے" اور "ہی" کو اپنی اصلی شکل میں رکھا گیا۔ بجنسہ نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "اصلیت" اور "قدامت" کا نقشہ پوری طرح آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

ملے۔ اس تمام دیوان میں یائے معروف و یائے مجہول میں امتیاز نہیں رکھا گیا۔ رسم الخط ایک ہی ہے۔

ایک دوسرے قصیدہ میں قیس گریز کرتا ہوا کہتا ہے کہ:-

فائدہ کیا ہی غزل گوئی سی تجکو ای قیس
چھوڑ یہ مشغلہ تو وصف کیا کر اوس کا

ہی جو اسکندر دوران کا وزیر اعظم
جس کی ہی سایۂ الطاف میں عالم پلتا

کون آصف یعنی مہاراج کہ ہی چندو لعل
شرق سی غرب تلک ہی وہ جہاں میں یکتا

مدح غائب سی میری دل کو نہیں ہی تسکیں
مدح حاضر میں اسی واسطے اب ہوں لکھتا

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ قیس مہاراجہ چندو لعل کی مشہور وزارت کے زمانہ میں موجود تھا اور اسکی نغمہ سرائیاں ایوان وزارت میں گونج رہی تھیں۔ اسی قصیدے میں شمس الامرا کے متعلق آخر میں کہتا ہے کہ:-

نظر کی خانۂ تثلیث اور تسدیس پر جس دم
تو ہر برج سعادت سی ہوا وو رشک قمر پیدا

نہو کیوں شمس الامرا شاد خلعت عہد میں تیری
کہ شادی کی کیا خانہ شادی میں گوہر پیدا

خدائی جس طرح یہ روز ان آنکھوں سے دکھلایا
ایسے شوکت سی ہوا اوس ماہ کو نور بصر پیدا

خدا رکھی سلامت تجکو اور اولاد کو تیری
فلک پر جب تلک ہیں العباں سیمبر پیدا

بحق پنجتن اب گلشن امید سی تیری
قیامت تک الٰہی ہو درخت بارور پیدا

قصیدے کو دعا پر ختم کر قیس ہنر پرور
کہ محل سے اجابت کے ہو لیلائے اثر پیدا

قیس نے ایک اور قصیدہ لکھا ہے جو محتشم الدولہ کی مدح میں ہے کہتا ہے کہ:-

تو صاحب ہمت ہی ای محتشم الدولہ
اور بحر سخاوت ہی ای محتشم الدولہ

شاہان دکن سی تو ہی سلسلہ اب تیرا
تو جان ریاست ہی ای محتشم الدولہ

جز دان بہ بغل آ گی ہی تیری ارسطو بھی
وہ تجھ میں فراست ہی ای محتشم الدولہ

آخر میں ایک تہنیت نبیرۂ نواب شمس الامرا بہادر کی تقریب بسم اللہ میں لکھی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پری سامنے ہی میری کھڑی گل اندام
دل کو تسکیں ہوا اور جان کو حس ہی آرام

مانگ کا اوس کی یہ عالم ہی نہ پوچھو مجھ سے
کلک تقدیر کو ہی دیکھ کے حیرت کا مقام

ان تمام قصائد کے آخر میں ناقل زین العابدین لکھتے ہیں کہ "تمام رسید قصائد قیس" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

۱؎ وہ ۲؎ لکھتا ۳؎ وہ ۴؎ شمس الامرا کی پوتی

قیس کے اور بھی قصائد تھے۔ اس کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پہلی غزل پیش کی جاتی ہے تاکہ قیس کی غزل گوئی کا اندازہ ہو سکے۔

غزل قیس

آج وہ صحن گلستاں میں ہر عالم نور کا
ہر رگ گل میں جھمکڑا ہی چراغ طور کا

کان کا ہلتا ہی دُریوں اوس بت مغرور کا
جس طرح جھولی ہی گہوارمیں بچہ حور کا

کشتہ خط کی تیری دیکھا لٹکتا گور پر
بیضہ فولاد کی جا گا تھا بیضہ مور کا

شمع سی تشبیہ ودں میں کیونکہ اپنی یار کو
وہ تو ہی کو ٹرن سراپا یہ ہے پتلا نور کا

کون کہتا ہے کہ عارض پر ہی یہ خال سیاہ
صبح کے پہلو میں ہی بچہ شب دیجور کا

زلف دیں، الجھا دیے، جھمکا زمرد کا مگر
شاخ میں سنبل کی یہ خوشہ لگا انگور کا

خال و عارض کو تم اوس کی دیکھو تک غور سی
دانہ فلفل کو ہی ضامن رکھا کافور کا

پنجہ شانی میں یوں تھی زلف مشکیں اتکو
مہر کے پنجہ میں چھوں دامن شب دیجور کا

اس لئی کرتا نہیں ہیں قیس پہلو سی جدا
کیونکہ دل میرا ہی پروانہ چراغ گور کا

ریختی کی ایک غزل بھی جو قیس کی طبع آزمائی کا نتیجہ ہے ملاحظہ ہو۔

غزل ریختی

اتنے کیوں موتی لگائے اری نادان ددا
جھک گئے بوجھ سی بالی کی میری کان ددا

چٹکیاں لے کی میری ران میں کہتے تھی یوں
مجکو منگوا دی کوئی چٹکیکا تو تہان ددا

ٹھیک ہیں موںڈھے تو اُس کرتی کی لیکن اتنا
تنگ ہوتا ہی گلی میں سے گریبان ددا

کون یہ ہیگا نگوڑا ٹلی کو ٹھی کے کھڑا
گھورری ہی حق کو میری دیکھ کہ ہر آن ددا

اس کی آنکھوں کو تلوو نکی تلی میں ڈالوں
ہی کبیدہ پہر کا یہ ہوا جان نہ پہچان ددا

شکل ہوا کی بنا مجکو ڈرایا یوں قیس
اوڑ گئے دیکھتی سے بس میری اوسان ددا

اوس کی ہنسنے کو لگی آگ میں صدقے میں دو
اب تلک میری نہیں جان میں ہی جان ددا

قابلِ یادگار ہیں کہ ہانوری اول نے جنیوا کے مشہور مصور اُتّا کو میا سو سے قدیم محل میں حسن کارانہ استرکاری کروائی سنہ ۱۶۴۳ء میں ہانوری دوم نے محلاتِ شاہی کی از سر نو تعمیر کی اور اسی سال ملکۂ آسٹریا کی آمد کی خوشی میں خاص کمرۂ شاہی خاص و عام کے لیے بطور نمائش کھولا گیا۔

سنہ ۱۷۰۵ء میں فرانسیسیوں نے خواہ مخواہ اہلِ موناکو سے لڑائی مول لی اور بجائے فتح کے انھیں کو ہزیمت ہوئی اس لڑائی میں ہم شہر موناکو کو بھی بہت نقصان پہنچا خصوصاً ناسٹرلی کی قدیم یادگاریں بہت کچھ خراب ہوگئیں لیکن اس کے دو سال بعد ہی سنہ ۱۷۰۷ء میں شہزادہ انٹونی نے شہر کی از سر نو تعمیر کی اور قلعہ انٹونی بھی بنوایا۔ پھر اس کے چند سال بعد سنہ ۱۷۹۰ء میں فرانسیسیوں نے دوبارہ حملہ کرکے شہر اور خاص طور پر محلاتِ شاہی کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ اس تباہی کے بعد سے پھر انیسویں صدی تک اس شہر کی تعمیر و ترمیم کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

سنہ ۱۸۶۱ء میں موناکو کے رئیس نے بہت سا علاقہ شاہِ فرانس کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ مقام روز بہ روز رونق پکڑتا گیا۔ جنگیں اور معرکے ختم ہوگئے۔ شہر کی آرائش اور ترقی کی دن دونی رات چوگنی کوششیں شروع ہوئیں۔

چنانچہ سنہ ۱۸۶۸ء میں موناکو اور نائیس کے درمیان ریلوے قائم کی گئی۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں مانٹی کارلو کی سب سے بڑی سینٹ چارلس گرجا کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں موناکو سے نائیس تک پختہ سڑک ڈالی گئی۔ سنہ ۱۸۸۸ء موجودہ محل شاہی کے بڑے مینار کی ترمیم کی گئی، اور سنہ ۱۸۸۹ء میں عجائب خانہ بحری کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔

مشہور شاعر لیوکن نے اپنی نظم "فارسیل" میں موناکو کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے یہ شہر عام طور پر پسندیدہ رہا ہے۔ اور اس کی بندرگاہ سارے ساحل پر محفوظ ترین سمجھی جاتی تھی۔ دوسرے قدیم شہروں کی طرح اس شہر کو بھی بارہا تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کی خوشگوار آب و ہوا اور خوبصورت مناظر کی کشش نے لوگوں کے دلوں کو کچھ ایسا لبھا لیا کہ ہزارہا صدمے سہنے پر بھی وہ اس کو خدا حافظ نہ کہہ سکے۔ آج وہی مظلوم شہر جنوبی یورپ کا "جنت نشان" مقام بنا ہوا ہے صرف یہی نہیں بلکہ بے نظیر مظاہر تہذیب جدید کے ہر قسم کی دلفریبیاں علم و ہنر کے بہتے چشمے اس چھوٹے سے خطے میں موجود ہیں یہ شہر سطح سمندر سے سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ جہاں سے ساحل کوہستان کیاپ ڈی ایل اور

اٹلی کے نظر فریب مناظر کی سیر کی جا سکتی ہے۔ یہاں بہترین نمونہ کی پیتل توپیں اور گولوں کے ڈھیر کے ڈھیر اب بھی پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ وہ سامان مدافعت ہے جو شاہ فرانس نے شہزادہ موناکو کو تحفۃً دیا تھا موجودہ حکمران خاندان کے ابتدائی ارکان کی توجہ سے قصر شاہی کے روبرو جو عدیم المثال یادگاریں قایم کی گئی ہیں عجیب دلچسپ منظر پیش کرتی ہیں۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں یہاں کے قصر شاہی کو جو بھی صدمات پہنچے تھے انکی شاہ البرٹ اول نے خاطر خواہ تلافی کر دی ہے۔ قصر کے اندر قابل دید عمارتیں یہ ہیں (۱) عظیم الشان دیوان عام جس کے بے نظیر زینے سترھویں صدی کے بنے ہوئے ابتک اسی حالت میں قائم اور باقی ہیں۔ (۲) تخت گاہ (۳) دیوان خانہ ڈیوک یارک (۴) وہ وسیع ہال جہاں سنہ ۱۷۶۷ء میں ڈیوک یارک نے انتقال کیا تھا۔ اب بھی بادشاہ کی عدم موجودگی کے زمانہ میں خاص اجازت حاصل کرنے کے بعد یہ سب ہال دیکھے جا سکتے ہیں۔

محل شاہی کے روبرو کے وسیع میدان سے چار تنگ راستے نکلتے ہیں ان پر حسب تفصیل ذیل چند مشہور عمارتیں ہیں صدر شفا خانہ، غربا کی قدیم گرجا، عدالتیں، کالج، ایوان حکومت، محل اسقف، دیگر سرکاری عمارات، بڑی گرجا جہاں شاہان موناکو مدفون ہیں، عجائب خانہ بحری جو پرانے بارودخانے کی جگہ واقع ہے اور انتہائی مشرقی سرحد پہ باغ سینٹ مارٹن ہے۔ عجائب خانہ بحری میں مختلف اقسام کی دریائی پیداوار موجود ہے یہ عجائب خانہ موناکو کے زبردست سائنس دان بادشاہ البرٹ کا بنایا ہوا ہے جس نے ۹۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہرائی کی کھوج لگا کر وہاں کے عجائب و غرائب دنیا کے سامنے پیش کئے سینٹ مارٹن کا پر فضا باغ بڑی پہاڑی کے جنوب میں پرانی فصیل کے کھنڈروں پر بنایا گیا ہے جس میں مختلف قسم کے درختوں اور پودوں کے درمیان اندر آنے اور باہر جانے کے لئے راہیں بنی ہوئی ہیں۔ اس قدیم فصیل کے بعض حصے اب تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہاں سے کیاپ ڈی ایل، کیاپ فرا، نائیس اور رانی تیس کی طرف نظر ڈالو تو نہایت خوشنما منظر دکھائی دیتے ہیں باغ سے سمندر تک سو فٹ کی ایک سیدھی ڈھلوان ہے۔

کنٹو مائن۔ یہ مقام موناکو اور مانٹی کارلو کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر تک یہ ایک بالکل غیر آباد خطہ تھا لیکن اب اس مقام پر کنڈومائن کے مشہور آفاق ٹینس کورٹ واقع ہیں اور موسم گرما میں تماشائیوں کی وہ کثرت رہتی ہے کہ بس ایک میلہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی کافی تعداد میں ہوٹل وغیرہ موجود ہیں۔ جہاں اشیائے مایحتاج کی قیمتیں بہت ہی واجبی لی جاتی ہیں۔

مانٹی کارلو۔ اب سے ستر سال پیشتر مانٹی کارلو محض ایک چٹیل چٹان سے بڑھ کر نہ تھا۔ ۱۸۵۸ء میں موجودہ خوبصورت عمارت کیاسنو کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس عمارت میں اس وقت سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ تعمیر و ترمیم ہوتی چلی آرہی ہے۔ مشہور ماہر فن تعمیر چارلس گارنیر جس نے فرانس کے بڑے شہر آپیرا ہوز کا نقشہ بنایا تھا اس عمارت کا معمار ہے۔ اس عالیشان عمارت میں بہت سی آرام گاہیں اور کئی کتب بینی کے کمرے ہیں جہاں ہر قسم کے تازہ انگریزی اور امریکی روزنامے ہفتہ وار اور ماہوار رسائل بلا کسی معاوضہ کے مطالعہ کے لئے دئے جاتے ہیں۔

یہاں دنیا کا سب سے بہتر ناٹک گھر بھی ہے جہاں موسم بہار میں مذاقیہ تماشے بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر دکھلائے جاتے ہیں نیز روسی رقص و سرود اور گالا رقص کے مظاہرے بھی قابل دید ہوتے ہیں۔ عمارت کیاسنو کے بالمقابل نہایت خوبصورت تفریح گاہیں بنی ہوئی ہیں جن کے رخ جنوباً سمندر کی طرف ہیں۔ یہاں سے سمندر کی سیر کا وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو بیان سے باہر ہے علاوہ ازیں دھوپ تاپنے کے لئے مانٹی کارلو میں یہ مقام نہایت موزوں ہے نیز سیر کرنے والوں کے لئے آرام کرسیاں بھی مہیا کی جاتی ہیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ نہایت سہولت کے ساتھ بائیں طرف بورڈیگرا اور ساحل اٹلی تک اور دائیں طرف اینٹیبز اور اس کے سربلند پہاڑوں اور سمندر میں جہاز رانی کی سیر کرتے ہیں۔ اور جب کبھی مطلع صاف ہو تو ساحل کارسیکا جیسا دور دراز مقام بھی بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان تفریح گاہوں کا مغربی حصہ بچوں کے کھیل کود کے مشاغل کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں ہر قسم کے میدانی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ان تمام تفریح گاہوں میں کیاسنو آرکسٹرا کی جانب سے ہر روز محفل رقص و سرود وغیرہ ہوا کرتی ہے۔ مئی سے اکتوبر تک یہ محفلیں صرف رات میں ہوتی ہیں۔

اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ علاقہ ریویریا میں مانٹی کارلو سے بہتر آب و ہوا اور کسی مقام کی نہیں ساحلی حصہ پر حرارت میں کمی زیادتی شاید ہی ہوا کرتی ہے بہر حال ان سب حالات کا لحاظ کرتے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنوبی ساحل فرانس پر مانٹی کارلو دنیا کی جنت ہے۔

کیاسنو کے باغ۔ ان خوشنما اور روح افزا باغوں میں روزانہ ہزارہا آدمیوں کی چہل پہل رہتی ہے کھجور کے ہوادار درخت گرم ممالک کے کمیاب اور دیگر غیر ملکی پودے اقسام کے میوہ دار درخت اور پھولوں کے تختے سال بھر اس مقام کو بارونق رکھتے ہیں۔ یہاں داخل ہوتے ہی طبیعت کچھ ایسی بہل جاتی ہے کہ

لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

مانٹی کارلو کی متعدد خوشنما عمارات میں سے ایک کفے ڈی پیری بھی انھیں باغات میں ہے سردیوں کے موسم میں دھوپ تاپتے ہوئے رقص و سرود کے مزے اڑانے کے لئے اس سے بہتر مقام نہیں اور گرمیوں کے لئے بھی یہ مقام ایسا ہی ہے لیکن صرف فرق یہ ہے کہ اس وقت بجائے دھوپ تاپنے کا لطف حاصل کرنے کے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے میٹھی نیند کے مزے ملتے ہیں یہیں عموماً ہر ملک اور ہر ملت کے سیاح یکجا ہو کر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

اس شہر کی آب و ہوا ایسی اعتدال پذیر اور صحت بخش ہے کہ سرد ممالک کے لوگ سردی کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر صحت کے لئے مانٹی کارلو میں پناہ لیتے ہیں۔ چنانچہ طویل علالت سے کچھ افاقہ کے بعد یورپ کے نامور ڈاکٹروں نے ملک معظم کو بھی یہی رائے دی تھی کہ وہ جلد از جلد کامل صحت یابی کیلئے کچھ دنوں مانٹی کارلو میں قیام فرمائیں۔ یہاں ایک بڑا اسپورٹنگ کلب بھی ہے جو دنیا کے مشہور اسپورٹسمنوں کا مرکز رہتا ہے۔

لارآوٹو میں سال تمام پیراکی ہوتی ہے اور بچے بوڑھے مرد عورت بلا امتیاز نہاتے اور تیرتے ہیں موسم سرما میں نومبر سے مئی کے مہینے تک .... پانی کا درجہ حرارت ۵۰ سے ۴۸ تک پہنچتا ہے اور مئی سے اکتوبر تک گرمی ہوتی ہے۔ طبی اصول پر پانی کے ذریعہ ہر مرض کا بخوبی علاج کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک بہترین رستوران بھی ہے جہاں رقص و سرود کا شاندار اہتمام ہے۔ عام طور پر نہانے کے بعد لوگ کرایہ کی موٹر کے ذریعہ کیاسنو باغات کی سیر کرتے ہیں۔

مانٹی کارلو میں لافسٹ نامی ایک زبردست ٹینس کلب بھی ہے جہاں دنیا کے مشہور کھلاڑی موقتی انعامی کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کلب کے تحت نو ٹینس کورٹ ہیں جن میں سے تین لافسٹ کے باغات میں ہیں اور چھ کنڈرومائن میں۔ علاوہ ٹینس کے گولف کا بھی اچھا انتظام ہے۔ گولف کا میدان سطح سمندر سے ۳۰۶۰ فٹ بلندی پر جہاں سے قدرت کے مناظر کا دور دراز مقامات تک نظارہ ہوتا ہے۔ اس میدان کو "مونٹ اینجل گولف کورس" کہا جاتا ہے۔ اس سطح مرتفع کے ایک طرف تو سمندر موجیں مارتا ہے اور دوسری طرف سر بہ فلک پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں چمکتی دکھائی دیتی ہیں یوں تو مانٹی کارلو میں سب کے سب مقامات قابل دید ہیں لیکن سیاح کو ان سب مقامات کی سیر کرنے کے لئے بہت وقت چاہیے ذیل میں صرف چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کیاپ ڈی ایل آور کیاپ فلوری۔ مانٹی کارلو سے بذریعہ ٹرام پندرہ منٹ کی مسافت ہے۔ یہ خوشنما مقامات زیتون کے جھنڈ اور سرو کے درختوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ یہاں عالیشان ہوٹل اور خوشنما باغات اور تفریح گاہیں بھی ہیں۔

انیزے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۲۱۲ فٹ اونچا ہے قصص میں مشہور ہے کہ یہ شہر بھی اہل فینیقیا نے ہی آباد کیا تھا جہاں پر انہوں نے آتش پایا۔ اینزے کے نام سے ایک مندر قائم کیا تھا۔ یہاں رومیوں اور مسلمانوں میں بڑی جنگ ہوئی تھی۔ مانٹی کارلو سے بذریعہ ٹرام ۲۰ منٹ کا راستہ ہے۔

کیاپ فرا۔ یہاں سوائے پہلی اور نویں صدی عیسوی کے آثار قدیمہ کے اور کوئی چیز قابل دید نہیں۔ سینٹ جیس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں ماہی گیری بہ کثرت ہوتی ہے۔

پیرا کیوا۔ سطح سمندر سے ۱۰۸۰ فٹ بلندی پر مانٹی کارلو سے ۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مقام سرما کے کھیلوں کا مرکز ہے۔ مناظر کا لحاظ کرتے سوئٹیان کا مد مقابل ہے۔

سینٹ مارٹن ویسوبی۔ یہ مقام اہل روما کا بسایا ہوا اور ۳۰۹۴ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ بعض مورخین کے قول کے مطابق سینٹ مارٹن کے قریب میری کا معجز نما مجسمہ ایک گرجا میں جس کو سینٹ نکلس نے بنوایا تھا ابتک موجود ہے۔

سینٹ آگنس۔ ۳۰۵۱ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر ہے۔ انتہائے بلندی پر سینٹ آگنس کی گرجا کے قریب سینٹ سیباسٹن کی گرجا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اس شہر کو ایک مسلمان سردار نے آباد کیا تھا جس کے ٹوٹے پھوٹے محلات کی نشانیاں ابتک موجود ہیں۔

کیاسٹلن۔ ۱۷۹۳ء میں فرانسیسیوں نے یہاں کے قلعہ کو مسمار کر دیا۔ لاؤ ورسا اور گرو ناس کے شمال کی طرف نظر دوڑائیں تو برف پوش چوٹیاں اور ساپیل کا سرکس دکھائی دیتا ہے۔

کیاسٹلر۔ یہاں لاؤ ورسا اور گرو ناس کے آبشار مشہور ہیں۔

ویلی فرانشے۔ مشہور بندرگاہ جہاں بین الاقوامی بیڑے یکجا ہو کر مصنوعی جنگی کرتب دکھلاتے ہیں۔ یہ بندرگاہ ہرقل کی بنائی ہوئی ہے۔

راکیبرونے۔ یہاں صرف لاس کیسرس کا قدیم محل اور سانتا مارگریٹا کی بڑی گرجا قابل دید ہے۔ جہاں ہر سال بہت جوش و خروش کے ساتھ مذہبی جلوس نکالا جاتا ہے۔ یہاں سے کیپ مارٹن کی خوب سیر ہوتی ہے۔

سینٹ رومن۔ فرحت بخش اور خوشنما مقام ہے۔ یہاں کے چشمے قابل تعریف ہیں۔ مانٹی کارلو سے

بذریعہ ٹرام دس منٹ میں پہنچ سکتے

انگلبرگ۔ یہاں قدیم زمانے سے ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے اور یہاں کے کتبے اور نقوش قابل ستائش ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

لاٹر کی۔ یہ مقام ۳۴۶۰ فٹ ہائٹ آباد کی ۳۰۰۴ فٹ اور ڈی تین ۴۶۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ یہ سب مقامات بذریعہ ریل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں یہاں متعدد خوبصورت عمارتیں اور منظر قابل دید ہیں۔

کال ڈی ایرا۔ ۱۰۳۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ کارجس تقریباً ۳۰ کیلومیٹر اور کارجس ڈی والائی پانٹی کارلو سے ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

یورپ میں پانٹی کارلو جیسے مقامات بہت کم ہیں جہاں ہر انسان کے مزاج کے موافق آب و ہوا میسر آسکے۔ ان تفریح گاہوں کے سوا بہت سے ہوٹل اور رسٹوران بھی ہیں جہاں رہنے سہنے کا معقول انتظام ہے۔ لطف یہ کہ شرح مصارف معمولی ہے ہر شخص آسانی سے یہ کرسکتا ہے۔ پانٹی کارلو اور اس کے مواضعات اور مقامات کی حقیقی تعریف سچ پوچھئے تو قلم کے بس کی بات نہیں یورپ میں اس کو فردوس بریں خیال کرنا چاہئے۔

(ماخوذ)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے "زندہ طلسمات" ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنی کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور جملہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائش پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ قیمتی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو محصول ڈاک معاف ہوگا۔ خط و تار کا پتہ۔

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

منظرِ سحر

(از جناب حمید الدین صاحب قمرؔ مولوی فاضل)

عجب دلکشا اور سہانا سماں ہے — کہ مخمورِ صہبائے لذت جہاں ہے
الم زارِ دنیا، خوشی کا مکاں ہے — بہشتِ بریں، ملک ہندوستاں ہے

کلی مسکراتی ہے، گل ہنس رہے ہیں
مسافر سفر کو اکڑ کس رہے ہیں

کوئی مست ناز و ادا سو رہا ہے — کوئی جان بیٹھا ہوا کھو رہا ہے
نہ پوچھو! زمانہ میں کیا ہو رہا ہے؟ — کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے

عنادل کے گلزار میں چہچہے ہیں
لبِ غنچہ پر باغ میں قہقہے ہیں

لطافت ہوئی ہے تخیل میں پیدا — مسرت ہے ہر ایک شے سے ہویدا
مرا دل ہے اس پاک منظر کا شیدا — وہ ظاہر ہوا لو! سحر کا سپیدا

چمن کو جگانے صبا آ رہی ہے
نسیمِ سحر گیت سا گا رہی ہے

ترنم میں اس کے وہ جادو نہاں ہے — فدا جس پہ گلشن کا پیر و جواں ہے
چمن بھر میں دریا خوشی کا رواں ہے — رہیں کرم اس کا کل بوستاں ہے

اسی پر ہے موقوف رونق چمن کی
اسی سے ہے آباد گلشن کی بستی

ہر اک شاخ رقصاں ہے اس کے اثر سے — عیاں صورتِ وجد ہے ہر شجر سے
نمودار مستی ہے گلہائے تر سے — گلے مل رہی ہے ہر اک برگ در سے

یہ پھولوں کا رس جو سحر پھیر رہی ہے
کہ لہروں پہ خوشبوؤں کی تیر رہی ہے

تنقیدیں

طرز زندگی | تالیف سید محمد نسیم صاحب انہونوی مدیر انکشاف چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۹۸) صفحات قیمت دعہ
منتظم رسالہ انکشاف لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

نسیم صاحب انہونوی نے طرز زندگی لکھ کر ایک اچھی سماجی اصلاح پر قلم اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں ازدواجی زندگی جو اکثر بدمزہ اور طرفین کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے اس کے کیا اسباب و علل ہیں اور کس طرح اس کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے یہ اس دلچسپ کتاب کا موضوع ہے۔ مولف نے عرض حال میں اس پر غیر جانب دارانہ اور منصفانہ نظر ڈالنے اور حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ عرض حال کے بعد انہی خیالات کی اشاعت پر اصل کتاب یعنی ایک خاتون اختر جہاں کی داستان زندگی شروع ہوتی ہے۔ ابتدا میں شوکت دلہن صاحبہ کا ایک مقدمہ بھی ہے جو فسانہ نگاری وغیرہ پر بحث کرتا ہے۔ نسیم صاحب کی کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ کیا مرد اور کیا عورتیں بہ امعان نظر اس کا مطالعہ کریں اور ملک کی سماجی زندگی کی اصلاح میں اپنا حصہ لیں۔ کتاب کو عورتوں کے ہاتھ میں دینے کے قابل بنانے کے لئے مولف نے ہر جگہ زبان و بیان پر احتساب کیا ہے۔

منکران خدا سے خطاب | از مولوی سید علی اختر صاحب اختر چھوٹی تقطیع ۴۸ صفحے قیمت درج نہیں۔
عہد آفریں پریس اکسلیر روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔ یہ پر مغز مسدس ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی وحدانیت کو دل پذیر اسلوب بیان کیا گیا ہے۔ منکرین کے خیالات اور ان کی گمراہی کی توضیح کرتے ہوئے انھیں توحید باری تعالیٰ کی تعلیم دی گئی ہے۔ شروع میں ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا مقدمہ بھی ہے۔

الحجاب فی القرآن | از مولوی محمد مہدی صاحب۔ اڈیٹر انجمن اصلاح و ترقی محلہ دریا آباد الہ آباد سے طلب کی جائے۔
یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں مولف نے پردہ کے متعلق قرآنی احکام سے بحث کی ہے۔ پردے کے موافق اور مخالف دونوں فریق ان آیات سے جو معنے مراد لیتے ہیں اور جس طرح توجیہ و تشریح کرتے ہیں، ان کو گہری نظر سے جانچا گیا ہے۔ رسالہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔







مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ امرداد ۱۳۳۹ف م جون ۱۹۳۰ء شمارہ (۳۶)

تصویر :- مشاہیر مفکّرین عالم ۔

فہرست مضامین

شذرات

انجمن اساتذہ حیدرآباد کی چوتھی سالانہ کانفرنس کے اجلاس اس دفعہ امرداد کی آخری تاریخوں (۳۰ و ۳۱) میں سٹی کالج ہال میں منعقد ہوئے۔ صدارت نواب اکبریار جنگ بہادر معتمد عدالت کوتوالی و تعلیمات نے فرمائی۔ اسی سلسلہ میں نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

مولوی سید ظہور علی صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی، جو محکمہ تعلیمات کے دیرینہ تجربہ کار عہدہ دار ہیں، صدر مجلس استقبالیہ منتخب ہوئے تھے۔ موصوف نے جو خطبہ پڑھا، وہ انجمن کی ایک اجمالی تاریخ حیدرآباد ٹیچر کو ایک مرکزی تعلیمی رسالہ بنانے کی تحریک طلبہ کے سرپرستوں کے لئے نصیحتوں اور محکمہ تعلیمات سے متعلق چند مشوروں پر مبنی تھا۔

خطبہ صدارت مختصر مگر نظام تعلیم کی بہت سی ضرورتوں پر حاوی تھا۔ تمام صدر نے اساتذہ کے اصلی د ... کو نہایت موثر طریقہ سے بے نقاب کیا۔ موجودہ نظام تعلیم میں مطمح نظر کے تعین پر زور دیتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ ہمارا نظام تعلیم ملکی ضروریات کی تکمیل نہ کر سکنے کی وجہ سے سقیم ہو رہا ہے پیشہ ورانہ اور صنعتی تعلیم کی ضرورت ظاہر ہے تعلیم سے ملک اور قوم کی سچی اور حقیقی خدمت کا ذوق بھی پیدا ہونا چاہیئے۔ اساتذہ کے انتخاب میں جن امور کو مدنظر رکھنا چاہئے اُن کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کرکے آخر میں انجمن کارگذاری پر اطمینان ظاہر کیا۔

کانفرنس کے چار اجلاس وقفوں کے ساتھ ہوئے۔ پہلے جلسہ میں خطبہ صدارت اور صدر مجلس استقبالیہ کے خطبے کے علاوہ ڈاکٹر عبداللطیف سعید کا مضمون "شخصی حفظان صحت" پر خاص غور اور محنت کا نتیجہ تھا۔ ایک تحریک مدارس وسطانیہ میں معمل خانوں کے قیام اور قابل سائنس دان اساتذہ کے تقرر سے متعلق منظور کی گئی۔ دوسرے جلسہ میں دو اہم رپورٹیں پڑھی گئیں اور ایک تحریک منظور کی گئی۔ رپورٹوں میں سے ایک تعلیم جغرافیہ اور دوسری تعلیم تاریخ پر تھی۔ تحریک علوم اور السنۂ شرقیہ کے اساتذہ کے لئے ٹریننگ کالج میں تربیت کے انتظام کی بابت تھی جو عمل میں لائی جائے تو یقین ہے کہ بڑے صحت بخش نتائج پیدا کرے گی۔ تیسرے جلسہ میں جو بروز جمعہ صبح کے ۹ بجے منعقد ہوا۔ اس سے پہلے ایک تحریک

معذور بچوں کی تعلیم اور رہائش کے انتظام کے لئے مدرسہ اور اقامت خانہ کے قیام، دوسری تحریک معمر اشخاص کی تعلیم کے انتظام اور تیسری جامعہ عثمانیہ میٹرک میں تجارت کو بطور مضمون اختیاری رائج کرنے سے متعلق منظور ہوئی۔ "جماعتی خود مختاری" کے عنوان پر تقریر اور "ریاضی کا تعلق عملی زندگی سے" کے عنوان پر ذیلی مجلس کی رپورٹ پڑھی گئی۔ چوتھے اور آخری جلسہ میں ڈرائینگ اور صنعت کاری کی تعلیم کو مدارس میں زیادہ وسیع پیمانہ پر رائج کرنے کے لئے اساتذہ کو برطانوی ہند میں بغرض تعلیم روانہ کرنے کی تحریک منظور ہوئی۔

مسٹر سید علی اکبر ام، اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے گذشتہ قراردادوں کی حالت سنائی جس سے بخوبی یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ انجمن کس قدر سرگرم کار ہے اور انجمن کے کسقدر مطالبات محکمہ تعلیمات نے پورے کئے ہیں۔ اسی جلسہ میں مسٹر ترمنصرم پرنسپل نظام کالج نے "تعلیم اور شہریت" کے عنوان پر تقریر کی۔ آخر میں تقسیم انعامات اور صدارتی تقریر کے بعد اجلاس ختم ہوئے۔

انجمن اپنی کم عمری کے باوجود جس سرگرمی سے راہ ترقی میں گامزن ہے، وہ اطمینان بخش ہے اگر انجمن کے مطالبات جلد سے جلد پورے کئے جانے کی سبیل نکل جائے تو یقین ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام میں نمایاں ترقی صورت پذیر ہوسکے گی۔

گذشتہ جون کے مہینے میں اپنے سفر مدراس کے دوران میں مجھے جنوبی ہندوستان کی ایک قابل قدر درسگاہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مدرسہ جو "باقیات الصالحات" کے نام سے موسوم ہے، اسلامی علوم وفنون کا بڑا مرکز ہے۔ عموماً تمام ممالک ہند خصوصاً جنوبی ہند سے تشنگان علم یہاں آکر جمع ہوتے ہیں یہ مدرسہ جس کو "اورنٹیل کالج" بھی کہتے ہیں مدراس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک خاموش قصبہ ویلور میں قائم ہے۔ مدرسہ کے بانی مبانی حضرت شمس العلماء مولانا شاہ عبدالوہاب قادری تھے جنہوں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر اس کی بنیاد ۱۲۸۶ھ میں ویلور ہی میں رکھی تھی۔ مدرسہ کی ابتدائی حالت کو دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پون سو سال کے اندر اندر یہ اس قدر ترقی کرجائے گا۔ ابتدا میں مدرسہ کے بانی ہی اس کے تمام اخراجات کے کفیل تھے۔ لیکن اُس کو قائم ہوئے ابھی چودہ پندرہ سال ہی ہوئے تھے کہ مدراس اور ویلور کے

غیر مسلمانوں نے اس اسلامی درسگاہ کی کامیابی سے متاثر ہوکر اُس کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا [illegible] تاجروں نے بڑے بڑے چندے عطا کئے ۔ چنانچہ اب مدرسہ کا فنڈ نہایت اطمینان بخش ہوگیا ہے ۔ اُس کی ایک بڑی اور شاندار عمارت ہے جس میں تعلیم اور رہائش کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہے ایک بڑی اسلامی درسگاہ کی ضروریات کے لئے جو جو ابواب درکار ہیں، سب فراخ حوصلگی کے ساتھ فراہم کئے گئے ہیں ۔

مدرسہ کے فی الحال کئی شعبے ہیں (۱) ابتدائی اسکول (۲) کالج (۳) تعلیم گاہ صنعت و حرفت آخری شعبہ ملک کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے بڑی وسعت کی گنجائش رکھتا ہے ۔

مدرسے کے لئے ایک ٹرسٹ قائم ہے جس کے اراکین ملک کے ذی اعتماد اصحاب ہیں ۔ مدراس یونیورسٹی سے ملحق پندرہ ایسے کالج ہیں جن میں مشرقی علوم و فنون کی تعلیم ہوتی ہے ۔ چودہ کالج سنسکرت اور تامل زبانوں سے مخصوص ہیں ۔ صرف "باقیات الصالحات"، عربی اور فارسی تعلیم کا واحد اجارہ دار ہے ۔ مدراس یونیورسٹی کے منشی فاضل اور افضل العلما کی تعلیم کا انتظام یہاں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے ۔ سنا ہے کہ اس درس گاہ کو اورینٹل یونیورسٹی کے پایہ تک پہنچانے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ گورنمنٹ خود اس کی امداد کے لئے تیار ہے ۔ اگر مدرسے کے ارباب حل و عقد اس تجویز کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا سکیں تو یقین ہے کہ جنوبی ہند میں اسلامی علوم و فنون کی احیاء کا سہرا اس درسگاہ کے سر رہیگا ۔

میجر اے ۔ اے لانگڈن، نے اپنی ان تھک کوششوں سے اس سال کے شروع میں اطالوی حسن کاری کی جو نمائش منعقد کی تھی، اس کی غیر معمولی کامیابی نے آئندہ سال (۱۹۳۱ء) میں ایران قدیم اور جدید کے بہترین حسن کاری کے نمونوں کی نمائش کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ اگر میجر کے خیالات عملی جامہ پہن سکیں تو یقین کیا جا رہا ہے کہ شاہ ایران بھی اپنے ذاتی شاہی خزانوں اور دیگر عام محفوظات میں سے ایک بڑی قابل قدر تعداد آثاری اشیاء کی روانہ فرمائینگے ۔ یورپ کے عام اور خاص محفوظات میں ایرانی حسن کاری کے بہت سے قابل قدر کارنامے موجود ہیں ۔ اگر میجر لانگڈن نے ان قابل قدر آثار کی فراہمی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، تو یہ نمائش ایرانی حسن کاری کی تاریخ میں یادگار ثابت ہوگی ۔ نمائش "برلنگٹن ہوز" لندن میں منعقد ہوگی ۔

ہندوستان اور اسکی زبانیں

یہ درحقیقت کوئی مستقل مضمون نہیں۔ بلکہ اف۔ اے۔ کی کتاب "ہندی لٹریچر کا پہلا باب ہے کی اے سر جارج گریرسن کی معرکتہ الآرا تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کو زیادہ تر مد دے کر ہندی زبانوں میں سے بعض کے ادب اور ان کے درمیانی تعلقات پر ایک چھوٹی کتاب شایع کی ہے۔ کتاب سلسلہ ہری ٹیج آف انڈیا" میں شایع ہوئی۔

کچھ مہینے پہلے جب ہمارے مکرم دوست مولوی ابوالفخر عبدالوحید صاحب ام۔ اے، ال ال بی (عثمانیہ) جو آجکل جامعہ لندن میں ال ال ڈی کی تعلیم کی تکمیل میں مصروف ہیں، چھٹیوں میں ہندوستان آئے تو اس کا ترجمہ "مکتبہ" سے شایع کرنے کے لئے روانہ فرمایا۔ اور چونکہ یہ ترجمہ موصوف نے ام اے کی تعلیم کے دوران میں کیا تھا، اس لئے اس پر نظر ثانی کرنے کی خدمت میرے سپرد فرمائی۔ بعض حصے اس کے مفقود بھی ہو چکے تھے، جن کا ترجمہ بھی کرنا تھا۔ پہلے باب اور بعض حصص کا اولین وقت میں ترجمہ تو کر لیا۔ لیکن نظر ثانی نہو سکی۔ اب فرصت ملی۔ اس کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ابوالفخر صاحب نے جو ترجمہ کیا تھا، وہ امتحان کی سہولت کی خاطر سے تھا۔ اس لئے اکثر مقامات میں حذف و اسقاط بھی کیا گیا ہے۔

چونکہ ترجمے کے شایع ہونے میں تاخیر تھی، اس لئے وہ حصے جن پر مجھے اطمینان ہے "مکتبہ" میں شایع ہو رہے ہیں ان سے زبان اردو کی بہن یعنے ہندی زبان کے متعلق اجمالی معلومات حاصل ہو جائینگی۔ ضمناً ہند آریائی زبانوں، اردو ہندی کے تعلقات، اردو اور ہندی رسم الخط کی ابتدا اور ضرورتوں پر بھی روشنی پڑجائیگی۔

(عبدالقادر سروری)

ہند آریائی زبانیں | ہند آریائی زبانیں، وسیع ہند یورپی خاندان کی زبانوں کی ایک شاخ ہیں، جو اب یورپ اور مغربی اور جنوبی ایشیا کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی سرحد کے قریب ہی وہ لوگ رہتے تھے، جن کی زبان سے مختلف زبانیں پیدا ہوئیں۔ انہیں لوگوں کی ایک بڑی جماعت، جو آریا کے نام سے موسوم ہے، مشرق اور دجلہ کی طرف منتقل ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ جن کی زبانیں بھی "مختلف صورتیں اختیار کرنے لگیں۔ انہیں دو زبانوں میں سے ایک زبان، ایرانی خاندان کی زبانوں کی ماں ہی جن میں میدی پہلوی، اور فارسی زبانیں شامل ہیں۔ آریائی کی دوسری شاخ کابل کی وادیوں میں گھس گئی، اور وہاں سے بڑھکر شمالی ہند کے میدانوں میں آرہی۔ ان لوگوں کا عمل تو طن ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں آرہے تھے۔ ہند۔ آریا کہلانے لگے۔ ہند آریائی شاخ کی زبان نے قدیم ترین زمانے ہی سے

ادبی خوبیاں حاصل کرلیں، اور اس کی ادبی صورت سنسکرت یعنی (مُصفّا) زبان کے نام سے موسوم ہوئی۔ شائستہ ادبی بولی معین ہوگئی لیکن وہ زبان جس کو عوام استعمال کیا کرتے تھے اور جو پراکرت یعنی "فطری" یا "غیر مصنوعی" کہلاتی تھی بدلتی رہی۔ نقیف اور کرخت آوازوں کے اجتماع میں کمی ہوگئی لیکن زبان ابھی مثل سنسکرت کے ترکیبی ہی رہی۔ مختلف صوبوں کی زبانوں میں اختلافات روز بروز زیادہ ہوتے گئے۔ پراکرت کی انہیں شاخوں میں سے بعض مثل سنسکرت کے مستقل ہوگئیں۔ اور انہیں ادبی تہذیب عطا ہوئی جن میں سے ایک زبان پالی ہے۔ پراکرتوں کے آخری دور میں موجودہ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا پاجانے سے قبل یہ اپابھرنسہ کے نام سے موسوم تھیں۔ یہی زبانیں موجودہ شمالی ہند کی مروجہ زبانوں کا ماخذ ہیں۔ جن میں ہندی، پنجابی، مرہٹی وغیرہ شامل ہیں۔ ان زبانوں کی پیدائش .... ۱عیسوی کے قریب ہوئی۔ اس میں شک نہیں ان میں سے ہر زبان کی پیدائش کی یہی تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی۔ موجودہ زبانوں کی حیثیت اب ترکیبی نہیں رہی۔ بلکہ یہ تحلیلی ہوگئی ہیں۔

ہندی | ہندی سے ہم جو مطلب لے رہے ہیں اس کو نہایت غور سے ذہن نشین کرنیکی ضرورت ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مبہم معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثال کی طور پر اس کو ملاحظہ کیجئے۔ تمام شمالی ہند یعنے مغرب کی طرف پنجاب اور سندھ اور مشرق کی طرف بنگال تک کے وسیع رقبے میں جسقدر بولیاں بولی جاتی ہیں، ان سب کے لئے یہ لفظ ذرا وسعت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض لسانی علما جیسے سرجارج گریرسن وغیرہ نے جو تحقیقات کی ہے اس کی رو سے، اس کل رقبے میں درحقیقت صرف چار زبانیں رائج ہیں جن کے نام راجستانی، مغربی ہندی، مشرقی ہندی پوربی اور بہاری ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اصل جدا ہے، بہاری کا تعلق اصل میں اُن زبانوں کے گروہ سے ہے جس کی ایک شاخ بنگالی بھی ہے۔ مغربی ہندی اپنی اصل کے لحاظ سے پنجابی سے بہت ملی ہوئی ہے۔ ہندی کا لفظ موجودہ ہندی بھاشا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے اس کو اردو زبان سے ممیز کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن اردو اور ہندی بھاشا دونوں کی دونوں مغربی ہندی ہی کی ایک بولی سے نکلی ہیں۔ اس کی تفصیلی بحث نیچے آئیگی۔ ہندوستان یعنے پنجاب، سندھ اور بنگال کے درمیانی خطے کی تمام زبانوں کے لئے بعض وقت ہندوستانی کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال کبھی کبھی اس سادہ زبان کے لئے بھی کیا گیا ہے، جو موجودہ ہندوستان کی مشترکہ زبان یا "لنگوا فرانکا" ہے۔ اور جس کی شائستہ ادبی صورتیں ہندی بھاشا اور اردو ہیں۔

کتاب کے حدود | ادبیات جس کی تاریخ اس کتاب میں بیان کی جائیگی، راجستانی، مغربی ہندی، پوربی اور بہاری زبانوں پر مشتمل ہوگی، اردو اس سے خارج ہے۔ ممکن ہے کہ ان زبانوں کو ایک گروہ میں شامل کرنیکی تجویز سرسری نظر میں خود رایانہ معلوم ہو۔ کیونکہ یہ عام خیال ہے کہ یہ زبانیں اپنے نشو و نما میں بالکل مختلف ہیں۔ نیز مغربی ہندی اپنی اصل کے لحاظ سے پنجابی سے اور

بہاری، بنگلہ سے ملی ہوئی ہے۔ نہ کہ ان زبانوں سے جن کی یہاں گروہ بندی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو جس کا ادب اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، مغربی ہندی کی ایک شاخ سے نکلی ہے لیکن ان زبانوں کے ادب کو ایک گروہ میں شامل کرنے کیلئے ہمارے پاس ایک وجہ موجود ہے۔ جہاں پنجابی، بنگلہ اور اردو نے اپنا اپنا ادبی سرمایہ الگ پیدا کر لیا ہے، جو اپنی خاص طرز پر نشوونما پا رہا ہے، وہ زبانیں جن کے ادب کی تاریخ اس کتاب میں شامل ہے، اپنے ادبی نشوونما میں ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں۔ ان رقبوں میں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں عام طور سے وہ لوگ جو اردو کو استعمال نہیں کرتے ہندی بھاشا کو ادبی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگرچہ قدیم زبانیں اب بھی نظموں کے لئے اختیار کی جاتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کی نثر نشوونما نہ پا سکی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہمارا مؤید ہے کہ گو محققین نے ان کے اختلاف پر زور دیا ہے تاہم یہ زبانیں آپس میں قریبی تعلق رکھتی ہیں، اور ان کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا رہا ہے۔ اور ان میں سے کسی زبان کا دستہ کیوں نہ ہو لیکن ان کی دوسری زبانوں کے بولنے والے ان کو بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے زیادہ ہے۔

ان صفحات میں جس ادب کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ متجانس مگر مختلف زبانوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کو "ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا ادب" کہنا زیادہ موزوں ہوگا لیکن سہولت کے اور طوالت سے بچنے کے لئے اس کو "ہندی ادب" ہی سے موسوم کرینگے۔ اس سرمایہ میں زیادہ حصہ یا تو مغربی ہندی کا ہے یا پوربی کا۔ بہاری ادب بہت وسیع نہیں۔ اور اگر ودیاپتی کی عشقیہ نظموں کو اس میں سے خارج کر دیں تو بہت کم اہم حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ راجستانی زبان کا سرمایہ زیادہ تر بھاٹوں کے وقایع پر مشتمل ہے۔

اردو بحیثیت ایک ادبی زبان کے ہندی سے ایک اہم نقطے میں مختلف ہے۔ یہ اس کی خاص بحریں اور اوزان ہیں۔ یہ فارسی بحروں کی تقلید ہیں۔ اور اردو زبان کی شاعری کا بڑا سرمایہ بھی فارسی موضوعات پر مشتمل ہے۔

بولیاں | راجستانی زبان کی بولیاں حسب ذیل ہیں: میواتی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی، ان سب میں مارواڑی بڑی اور ادبی بولی ہے۔ اس کا دوسرا نام ڈنگل ہے۔ جو مغربی ہندی کی شاخ برج بھاشا کے راجپوتانی نام پنگل سے اس کو ممیز کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ کیونکہ برج بھاشا بھی ان مقامات میں مثل ایک ادبی بولی کے مروج تھی۔

مغربی ہندی: — اس کی بڑی بولیاں یہ ہیں بانگڑو، جو گنگا کے مغرب یعنی جنوب مشرقی پنجاب کی ارتفاع میں بولی جاتی ہے۔ برج بھاشا، وہ زبان ہے جو متھرا، اور اس کے نواح میں مستعمل ہے۔ یہ مغربی ہندی کی بڑی شاخ شاعری کے لئے ہے۔ قنوجی (جو برج بھاشا سے بہت مشابہ ہے) یہ درمیانی دوآبے کے زیرین حصوں اور شمالی مقامات میں بولی جاتی ہے۔ بندیلی۔ بندیل کھنڈ اور وسطی صوبہ ہند کی وادی نربدا کے بڑے حصے میں مروج ہے۔ ایک اور شاخ بھی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے

نواح میں بولی جاتی ہے۔ دہلی مغل تاجداروں کی راجدھانی تھی، اس لئے اسی کے نواح کی بولی سے مغلوں کے لشکر کی مشترک زباں (لنگوافرانکا) وجود پذیر ہوئی۔ اس میں پنجابی اور راجستھانی میں بہت سے فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے۔ اور چونکہ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان کا مہذب رسم الخط فارسی یا نستعلیق تھا، اس لئے یہ زبان اسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی "اردو" کے لفظی معنی لشکر کے ہیں۔ گویا اردو لشکری زبان تھی۔ مسلمانوں کے اثرات نے اس زبان کو بہت وسعت دی اور رفتہ رفتہ یہ ایک ادبی زبان بن گئی۔

مروجہ ہندی زبان، اردو ہی سے نکلی ہے۔ اس میں سے فارسی اور عربی الفاظ کو خارج کر کے ہندوستانی زیادہ تر یا سنسکرت الفاظ داخل کر دئے گئے ہیں۔

اس بولی کے لئے جو ابتداً دہلی اور میرٹھ کے نواح میں مروج تھی۔ اور موجودہ ادبی ہندی کے لئے جس کی ترقی للوجی لال کے ہاتھوں ہوئی۔ بعض ہندی محققین نے کھڑی بولی (ستھری زبان) کا نام تجویز کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ اسکی تفصیل بعد میں آئیگی۔ جہاں موجودہ ہندی کے بننے کے حالات لکھے گئے ہیں۔

مشرقی ہندی: ---- کی شاخیں شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ اودھی باگھیلی اور چھتیس گڑھی۔ ان میں سب سے بڑی شاخ اودھی ہے جو اجودھیا پردیش (اودھ) میں رائج ہے۔ اودھی کا دوسرا نام بیساواڑی ہے۔

بہاری -- کی تین بڑی شاخیں ہیں میتھیلی، بھوج پوری، ماگھی۔ ان میں میتھیلی سب سے بڑی ادبی بولی ہے۔ عموماً تمام کارنامے جو ہمارے دسترس میں ہیں۔ وہ اسی زبان میں ہیں۔ یہ ان قطعات میں بولی جاتی ہے، جہاں قدیم زمانے میں متھیلا سلطنت قائم تھی۔ یہ بہار اور گنگا کا شمالی علاقہ ہے۔

ہندی ہجا اور رسم الخط ہجا یا الف، بے، تے، جو ہندی اور اس کتاب کی دوسری زبانوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ سنسکرت کے ہیں۔ اور ان کی ترتیب بھی وہی ہے۔ یہ ترتیب صوتی اصول پر مبنی ہے۔ صرف ایک دو حروف ایسے ہیں جو ہندی میں رائج نہیں۔ رسم الخط وہ ہے جس کو دیوناگری یا ناگری کہتے ہیں۔ یہی سنسکرت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری صورتیں بھی ہیں۔ مہاجنی (یا صرافی) بنیادی صرف معاملات، تجارت وغیرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ دونو بھی (یا کیتھی) اسی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ یہ لفظ کایتھ یا کایستھ سے بگڑا ہوا ہے۔ جو ہندوؤں کے ایک محرر فرقے کا نام ہے یہ بھی رسم الخط، اصل میں دیوناگری ہی کی منبدلہ شکل ہے۔ جو تحریری ضرورتوں کو مدنظر رکھکر بنائی گئی تھی۔ اس میں سرعت اور آسانی تحریر ملحوظ ہے۔ یہ رسم الخط زیادہ تر اس رقبہ کے مشرقی حصوں میں رائج ہے، جس کی حدیں ہم نے اوپر بتا دی ہیں۔

لیکن اس کا استعمال دیوناگری کے مقابلے میں یہاں بھی شاذونادر ہی ہوتا ہے۔

لفظیات اس زبان کے بہت سے الفاظ وہ ہیں جو ان کی ماخذی زبان ہند آریائی سے سالہاسال کی ہیر پھیر کے بعد نکلے ہیں لیکن مروجہ زبانوں میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جو سنسکرت سے براہ راست لئے گئے ہیں۔ آخری قسم کے الفاظ "تت سم" (یعنی وہی) کہلاتے ہیں۔ اور ان سے ممیز ہیں "جو تت بھوا" (اسی قسم کے) کہلاتے ہیں۔ اور جو نشوونما کے دوران میں بدلتے گئے ہیں۔ اکثر مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں تت سم سے تت بھوے انہیں الفاظ یا ان کی اصل سے بنائے جاتے ہیں جو زبان میں دوش بدوش موجود ہیں جیسے یوگی اور جوگ۔ (قابل، لائق) فارسی سے بھی بہت سے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ تلسی داس جیسے بلند پایہ مصنفین نے بھی انہیں استعمال کیا ہے۔ گو حال کے بعض مصنفین "ستھری ہندی" لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن شاید ہی کوئی کتاب ایسی ملے جس میں کچھ نہ کچھ فارسی الفاظ نہ ہوں۔ کچھ پرتگالی اور اکثر انگریزی الفاظ بھی اب اس میں راہ پا رہے ہیں۔

ہندی عروض بہت کم ایسی زبانیں ہیں جن میں عروض کے اصول اس قدر خوبی کے ساتھ مدون کئے گئے ہونگے جیسے ہندی میں ہیں۔ یہ نظام ان اصول سے ماخوذ ہے جو سنسکرت شاعری میں حکمران ہیں۔ اس کا انحصار اتار چڑھاؤ پر نہیں بلکہ یہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح بول کی تعداد اور مقدار پر مبنی ہے، خواہ وہ طویل ہوں یا خفیف۔ قافیہ ضروری ہے۔ ہندی میں قافیہ صرف یہی نہیں ہے کہ مصرعہ کے آخری دو بول موافق ہوں۔ بلکہ اس میں کم سے کم دو بول کے مطابق ہونے کی ضرورت ہے۔ ہجا بلکہ قواعد زبان سے انحراف بھی جائز ہے لیکن بحروں کے اصول بے حد پیچیدہ ہیں۔ اچھے اور باکمال شاعر کے ہاتھ سے یہ چیزیں ایسے نتیجے پیدا کرتی ہیں کہ جس کی شکل اور موسیقی دونوں حیرت زا اثر مرتب کرتے ہیں۔ اور جس کی مثال شاید ہی کسی زبان میں دستیاب ہو سکے بحروں کا شمار جو ہندی عروض کی کتابوں میں مسلم ہیں، لاتعداد ہے۔ لیکن بعض زیادہ اہم اور مروج حسب ذیل ہیں۔

دوہا ــ (یا دوہرا) وہ شعر ہے جس کے ہر مصرعے میں چوبیس ماترے، ایک معین ترتیب سے جوڑے گئے ہوں۔ ماترا حقیقت میں وہ عرصہ ہے، جو خفیف حرف علت کے ادا کرنے میں صرف ہو۔ طویل حرف علت اور لفیف میں دو ماترے شمار ہوتے ہیں دوہا بے حد مقبول اور مروج بحر ہے۔ قدیم اردو شعراء نے بھی اس کو بلاتکلف استعمال کیا ہے۔

سورٹھا۔ الٹا دوہا ہوتا ہے۔ جس میں دوہے کے ہر مصرعے کا نصف آخر، نصف اول بن جاتا ہے۔

چوپائی، مقبولیت میں دوہے کے برابر ہے۔ اس میں چار مصرعے ہر ایک سولہ ماترے کے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری مروج بحریں یہ ہیں۔ کنڈلیا، چھپائی، کادیہ، سویا، کوسیا وغیرہ۔ بہت سی بحریں ایسی ہیں جو صرف گیتوں کی نظموں

میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں قافیہ عموماً شعر کے ہر مصرعے میں قائم رکھا جاتا ہے۔

ہند آریائی زبانوں کا خاندان

ہند آریائی زبانیں: پراکرت (بول چال کی)، سنسکرت (ادبی)

(اپبھرنش)	موجودہ زبانیں۔
نامعلوم	کشمیری
نامعلوم	کوہستانی
نامعلوم	لہندا (مغربی پنجابی)
وراچڑی	سندھی
گوجری	گجراتی
سورسینی	پنجابی، مغربی ہندی
آونتی	راجستانی، پہاڑی
اردھماگدھی	مشرقی ہندی
مگدھی	بہاری، بنگالی، اڑیہ، آسامی
مہاراشٹری	مرہٹی۔

پریم

(ڈاکٹر اعظم کریوی سابق اڈیٹر، الہ آباد)

پریتما اور ترنگنی میں بہت پریم تھا ۔ آپس میں ان کا برتاؤ سکھیوں کا سا نہیں تھا ان کے خطوط عاشقانہ ہوتے جن میں پیار، محبت، شکوہ و شکایت کے سوا اور کچھ نہ ہوتا ۔ پریتما بیاہی اور ترنگنی کنواری تھی جب یہ آپس میں ملتیں تو کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھکر راز و نیاز کی باتیں کرتیں اگر وہاں اتفاق سے کوئی پہنچ جاتا تو ان کی گفتگو کا سلسلہ بند ہو جاتا ۔ ترنگنی اکثر اپنی بانہیں پریتما کے گلے میں ڈالکر پوچھتی ۔ "پیاری ! سچ بتا تو سب سے زیادہ کس کو پیار کرتی ہے مجھ کو یا اپنے پتی کو ؟" پریتما جواب دیتی "تم کو ! میری پیاری ترنگنی تم کو ــــ" ایک دن پریتما نے کچھ ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو اپنے پتی سے زیادہ محبت ہے ۔ اس دن ترنگنی کو اتنا صدمہ ہوا کہ دن بھر اس نے کھانا نہ کھایا بڑی مشکل سے پریتما ترنگنی کو منا سکی پس اسی دن سے پریتما کے دل میں کچھ رنجش کی بنیاد پڑ گئی ۔

پریتما ترنگنی کی پڑوسن تھی دونوں کا مکان ملا ہوا تھا چونکہ پریتما زیادہ تر اپنے میکہ ہی میں رہتی تھی اس وجہ سے وہ جب چاہتی ترنگنی کے مکان پر چلی جاتی لیکن ترنگنی پریتما کے مکان پر بہت کم آتی تھی کیونکہ وہ کنواری تھی اس کے ماتا پتا اس کو کہیں جانے کی بہت کم اجازت دیتے تھے ۔ اس ممانعت کی ان دونوں کو کوئی پرواہ نہ تھی پریتما کے مکان سے ترنگنی کا مکان زیادہ کشادہ اور عالیشان تھا وہاں دونوں سکھیوں کو آپس میں باتیں کرنیکا خوب موقع ملتا تھا ۔

جب تک پریتما کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ ترنگنی پر دل و جان سے فدا تھی لیکن شادی ہوتے ہی اس کی محبت تقسیم ہو گئی مگر ترنگنی کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اس کا پریم روز بروز بڑھنے لگا ۔ وہ بسا اوقات جوش محبت میں جب پریتما سے کوئی شکایت کرتی تو پریتما ہنسی میں اڑا دیتی اور اپنے دل میں سوچتی ــــ مجھ کو پیار کرنے کیلئے تو میرا پتی ہے ۔ مگر ترنگنی تو کنواری ہے ۔ محبت کی بھوکی ہے مجھے اس کی شکایتوں پر کچھ برا نہ ماننا چاہیئے ۔" یہی سوچ کر پریتما دل نہ چاہنے پر بھی ترنگنی کو پیار کرتی اور اس کی ناز برداری کرتی ۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ترنگنی کا بیاہ اس کے دیور رام موہن کے ساتھ ہو جائے لیکن اب تک اس کے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی ۔ جب دن رات سے گلے ملتا تو دونوں اپنے کوٹھوں پر کھڑی ہو کر ایک دوسرے کو اپنی محبت کی کہانی سناتیں اس پر بھی ترنگنی کا جی نہ بھرتا ۔ اور وہ پریتما کو روزانہ ایک خط بھی لکھا کرتی تھی ۔

ایک مرتبہ جب پریتما اپنے سسرال میں تھی تو وہاں اس نے اپنے پتی کے ساتھ تھیٹر میں "مرلنکا" تماشہ دیکھا تھا جب

وہ سسرال سے واپس ہوئی تو اس نے ترنگنی کو "مرلنا" کا قصہ سنایا اس کے بعد پریتما اکثر ترنگنی کے گلے میں بانہیں ڈال کر گانے لگتی
—— "میرے پریم کی نیا کس نے ڈالا بھنور میں"
پریتما ترنگنی کو بہت پیار کرتی تھی پھر بھی ترنگنی کا جی نہ بھرتا جس طرح ترنگنی بات بات پر روٹھ جاتی اس طرح پریتما کو بھی خواہ مخواہ روٹھنا پڑتا۔ اگر پریتما کبھی ایسا نہ کرتی تو ترنگنی کو سخت ناگوار ہوتا اور وہ کہتی "ہاں! ہاں! تم مجھے کیوں پیار کرنے لگیں تم کو تو اپنے پتی کے سوا کسی سے محبت ہی نہیں ہے۔ کیا تم مجھ کو پیار کرتی ہو۔ جو بات بات میں روٹھوگی ——"۔ شروع میں یہ باتیں پریتما کو مذاق معلوم ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہوگئی۔ اور جھوٹ موٹ ترنگنی سے روٹھنے لگی لیکن وہ اس سے بے خبر تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

(۲)

ترنگنی اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی گنگنا رہی تھی۔
"جھوٹا وعدہ پیا مو سے کر گیو ری۔"
جس طرح ستار کے زمزمے ہوا میں گونجنے لگتے ہیں اسی طرح ترنگنی کے دل میں شیریں تصورات کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔ اس کی آوازیں درد بھرا تھا۔ آج سویرے جب پریتما ترنگنی سے ملنے آئی تو ترنگنی نے پریتما سے اچھی طرح سے باتیں نہ کیں۔ ترنگنی کے اس برتاؤ سے پریتما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ترنگنی سے بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر واپس چلی گئی اور حسب معمول شام کے وقت بھی اپنے کوٹھے پر نہ آئی۔ ترنگنی تمام دن اپنے کوٹھے پر رہی لیکن وہ ایک مرتبہ بھی پریتما کو نہ دیکھ سکی جب رات ہوگئی تو وہ مایوس ہو کر نیچے اتری اور اپنے کمرے میں پہنچکر گنگنانے لگی "جھوٹا وعدہ پیا مو سے کر گیو ری" ترنگنی نے ہر طرح سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کی لیکن اس کی الجھن بڑھتی ہی گئی آخر اس نے سوچنا شروع کیا "کیا میں پریتما کو خط لکھوں؟ نہیں نہیں میں اس کو ہرگز خط نہ لکھوں گی۔ اس نے میرے کل والے خط کا جواب اب تک نہیں دیا۔ اور اسی وجہ سے تو میں آج صبح اس سے اچھی طرح سے نہیں بولی تھی —— میں نے سنا ہے کہ آج اس کا پتی آیا ہے۔ —— تو کیا اس نے پریتما کو تھوڑی دیر کے لئے بھی کوٹھے پر جانے کا موقع نہیں دیا —— ممکن ہے کہ یہی بات ہو —— اور ہاں میں نے جو آج صبح اپنے غصہ کا اظہار کیا ہے۔ اس میں کس کی خطا ہے؟ —— یہ بھی تو پریتما ہی کا قصور ہے۔ اس نے وقت پر میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ کیا اس کے پتی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ یا قلم توڑ دیا یا دوات کی روشنائی گرا دی —— آخر ہوا کیا؟ ——"
اماوس کی اندھیری رات تھی ترنگنی کے سینے میں اس وقت خیالات کی پرشور لہریں اٹھ رہی تھیں جو آپس میں

ٹکراتیں اور اٹھتی ہوئی غایب ہو جاتی تھیں ——— کہاں ؟ — تاریکی میں جہاں کچھ بھی نہ تھا۔

وہ کچھ سوچ کر پلنگ سے اٹھی صندوق سے ایک خوبصورت رنگین کاغذ اور لفافہ نکال کر پریتا کو خط لکھا اس نے لفافہ پر پریتا کا نام لکھا اور کھڑی ہو گئی۔ لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کمرہ میں ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی "اس خط کو بھیجیں یا نہیں۔ خط بھیجنے سے پریتا کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے دب گئی ہوں اور خوشامد کرتی ہوں ——" وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا سر لفوت لگا۔ زیادہ لکھنے پڑھنے یا رنج و غم سے اکثر ترنگنی کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ترنگنی نے اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی اور بیہوش ہو کر پلنگ پر گر پڑی لفافہ ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ کے نیچے گر پڑا۔

گرنے کی آواز سن کر ایک خادمہ دوڑتی ہوئی کمرہ میں آئی اور ترنگنی کو بیہوش دیکھ کر گھر والوں کو خبر دینے کے لیے الٹے پاؤں واپس ہوئی۔ ترنگنی کی ماں محلہ میں کسی کے یہاں گئی ہوئی تھی گھر میں صرف اس کی چچی تھی جو کل ہی اپنے شوہر کے ساتھ میرٹھ سے آئی تھی وہ خادمہ کے ساتھ فوراً ترنگنی کے کمرہ میں پہنچی ہسٹریا کا دورہ اس کی ایک بہن کو بھی ہوتا تھا اس وجہ سے وہ ضروری تدابیر سے جو ایسے وقت کارآمد ہوتی ہیں خوب واقف تھی وہ ترنگنی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی ——— وہ ترنگنی کو پنکھا جھل رہی تھی تو اتفاقاً اس کی نظر ترنگنی کے اس خوشنما لفافہ پر پڑی جو ترنگنی کے ہاتھ سے پلنگ کے نیچے گر گیا تھا۔ لفافہ بند نہیں تھا اس کی چچی نے خط نکال کر لیمپ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا۔ — "پریتم!" اتنا پڑھتے ہی اس کی چچی کے ہوش اڑ گئے اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اس نے خادمہ سے کہا کہ تو پنکھا کر میں ابھی آتی ہوں یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ اس کے پتی ہردے ناتھ جو میرٹھ کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کے کمرہ میں پہنچ کر ترنگنی کی چچی اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ڈاکٹر ہردے ناتھ باہر سے واپس آئے تو ان کی بیوی نے آگے بڑھ کر ترنگنی کا خط دے کر کہا "ذرا اسے پڑھو تو۔"

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار کر بیوی کو گہری نظر سے دیکھا اور کہا۔ "کیا بات ہے یہ کس کا خط ہے؟"

"پڑھو ساری حقیقت ابھی معلوم ہوئی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ہردے ناتھ خط کو بلند آواز سے پڑھنے لگے ——— "پریتم! تم کیسے کٹھور ہو۔ کیا یہی تمہارا پریم ہے اگر میں غصہ کروں تو کیا تم مجھے مناؤ گے نہیں بلکہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ کل جو خط میں نے تم کو لکھا تھا آخر تم نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا۔ اسی وجہ سے میں آج صبح کو تم سے اچھی طرح سے نہیں بولی تھی ——— ہردے شیور! پریتم کیوں

خاطی ؟ کیا تم کو معلوم نہیں تھا ۔ اگر معلوم نہیں تھا تو پھر دریافت کیوں نہیں کیا مجھ سے روٹھ کر بغیر بات چیت کئے چلے گئے کیوں لوٹ گئے تم نے مجھے منایا کیوں نہیں ۔ تمھارے چلے جانے کے بعد میں بہت روئی دن بھر کوٹھے پر تمھارا انتظار کرتی رہی لیکن تمھارے درشن نہ ہوئے تمھاری پیاری موہنی صورت ایک دفعہ بھی نہ دکھائی دی ۔ اچھا تم جیتے میں ہاری لو اب تو اگر مجھے اپنا درشن دو ۔ پریتم ! سوچو تو سہی اس دنیا میں تمھارے سوا میرا اور کون ہے اگر تم میری دلشکنی کرو گے تو میں اس دنیا میں جی کر کیا کروں گی ۔ میرے ہردیشور ! اپنی پران پیاری ترنگنی سے اتنی جلدی نہ روٹھ جایا کرو ۔۔۔۔ تمھارے چرنوں کی داسی ترنگنی "

"خط پڑھ کر ہردے ناتھ نے پوچھا ۔۔۔ یہ خط کس کا ہے "

" نام بھی پڑھ لیا اور کہتے ہو کس کا ؟ یہ خط آپ کی لاڈلی بھتیجی کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے "

میری بھتیجی کا ۔۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آتا ؟

" جی ہاں یقین کیوں آئے گا ۔ ہائے ہمیں کیا معلوم تھا کہ انٹرنس پاس کر کے ترنگنی اتنی آزاد ہو جائے گی ۔ اور ہمیں معلوم بھی کیسے ہوتا ہم لوگ تو میرٹھ میں رہتے ہیں یہ سب قصور اس کی ماں کا ہے جس نے کنواری لڑکی کو آزاد رکھا میں تو جب سے یہاں آئی ہوں ترنگنی کے رنگ ڈھنگ مجھے اچھے نظر نہیں آئے ہائے اس نے تو خاندان میں کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ۔ کنواری لڑکی اور اس آزادی سے خط و کتابت کرے ۔۔۔۔ ٹھیک اسی وقت خادمہ گھبرائی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اور کہنے لگی ۔۔۔۔ "چھوٹی ماں جی جلدی چلو ۔ بچی کی طبیعت بہت خراب ہوتی جا رہی ہے "

ترنگنی کی چچی نے اپنے شوہر سے کہا ۔ "چلو تم بھی ذرا دیکھ لو"

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے کہا ۔ تم چلو میں ابھی آتا ہوں "

بیوی کے جانے کے بعد ڈاکٹر ہردے ناتھ نے سوچنا شروع کیا ۔۔۔ "بھائی صاحب سے کہنا ٹھیک نہیں ۔ ابھی ترنگنی کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے ۔ لیکن یہ بات چھپ نہیں سکتی اگر کسی کو پتہ چل گیا تو ہم لوگ سماج میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے ۔ لڑکے اور لڑکیوں کا بیاہ کرنا دشوار ہو جائے گا ۔۔۔۔ کیا ترنگنی کو اپنے ساتھ میرٹھ لے جاؤں ؟ نہیں نہیں وہاں بھی لے جانا فضول ہے جہاں جائے گی وہ اپنی عادت سے باز نہ آئے گی ہائے میں ترنگنی کو کتنا نیک سمجھتا تھا میں اسے کتنا پیار کرتا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدچلن ہو جائے گی ۔۔۔" اس عرصہ میں ترنگنی کی ماں کمرہ میں گھسی اور کہنے لگی ۔ بھیا تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ۔ تمھاری ڈاکٹری کس دن کام آئے گی میں ابھی باہر سے واپس آئی ہوں ترنگنی بے سدھ پڑی ہے اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے چلو جلدی چلو دیر کیوں کر رہے ہو

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اٹھ کر دوائیوں کا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک دوا کی شیشی نکال کر جیب میں رکھ لی اور ترنگنی کے کمرہ میں پہنچے۔ نبض وغیرہ دیکھ کر ڈاکٹر ہردے ناتھ نے کانپتے ہاتھوں سے جیب سے شیشی نکالی اور اس سے چند قطرے اپنی بھتیجی کے منہ میں ڈال دئے۔

(۳)

پرتیما کے پتی کا نام اننگ موہن تھا وہ جمال پور میں اسسٹنٹ سرجن تھے اور آج کل چھٹی لیکر اپنے سسرال میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ان کو پیشتر ہی پرتیما کے خطوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ ترنگنی پرتیما کی سہیلی ہے۔ اب کی جب وہ پرتیما سے ملے تو انہوں نے کہا۔ "ذرا اپنی پیاری سہیلی ترنگنی کے خطوط تو دکھاؤ۔"

پرتیما نے ہنس کر کہا۔ "واہ جی واہ! میں ان کو کیسے دکھا سکتی ہوں اس نے تو کسی کو بھی اپنے خطوں کو دکھانے کی اجازت نہیں دی۔"

"تو کیا میں بھی "کسی" کی گنتی میں آگیا ہوں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا"

"میں پہلے ترنگنی سے پوچھ لوں تو دکھاؤنگی۔"

"اگر اس نے اجازت نہ دی؟"

"تو میں نہ دکھاؤنگی"

موہن کو یہ جواب سن کر رنج معلوم ہوا اس نے کہا۔ "اچھی بات ہے نہ دکھاؤ میں تمہارا کوئی نہیں ہوں ترنگنی ہی سب کچھ ہے۔ پرتیما نے اس کا جواب کچھ نہ دیا دوسرے دن جب اس نے ترنگنی سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔ "پرتیم پیارے! میرے خطوط ان کو ہرگز نہ دکھانا"

رات کو جب موہن نے پرتیما سے پوچھا۔ "کہو جی تمہاری سہیلی نے کیا کہا۔"

"اس نے خط دکھانے کی اجازت نہیں دی"

موہن سمجھتا تھا کہ ترنگنی اجازت دے دیگی لیکن پرتیما سے صاف جواب سن کر اس کو سخت صدمہ ہوا یہانتک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی یہ حالت پرتیما سے دیکھی نہ گئی اس نے اپنے صندوق سے خطوں کا پلندا نکال کر موہن کے سامنے رکھدیا۔ اور کہا۔ "لیجئے رونے پیٹنے سے کیا فائدہ۔"

موہن نے ہاتھ میں خطوں کے پلندے کو اٹھا کر ایک طرف پھینکدیا اور کہا۔ "ہٹاؤ ان خطوں کو ۔۔۔ اب ان کو نہ پڑھوں گا"

موہن کے اس برتاؤ سے پریتیا کے دل پر چوٹ لگی اب اس کے رونے کی باری تھی چنانچہ وہ منھ پر انچل رکھ کر آنسو بہانے لگی ان آنسوؤں نے موہن کے غصہ کو دور کر دیا اور وہ پریتیا کی خوشامدیں کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ پریتیا کو منا سکا اس نے خطوں کے پلندے کو کھولا اور اس میں سے ایک خط نکال کر پڑھا اور کہنے لگا۔ "نرگس تو بہت خوشخط لکھتی ہے"۔

پریتیا نے مسکرا کر کہا۔ "جی ہاں! اس میں کیا شک ہے اسی لئے تو کہتی ہوں اگر میرے دیور کے ساتھ اس کا بیاہ ہو جائے تو کتنا اچھا ہو"

"وقت آنے دو دیکھا جائے گا"

جب موہن نرگس کے تمام خطوط پڑھ چکا تو وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔ پریتیا نے کہا۔ "اداس کیوں ہو گئے؟ کس سوچ میں ہو!

"دیکھو اب تم کو اپنی سہیلی سے دوستی چھوڑنی پڑیگی ورنہ یہ خط و کتابت کا سلسلہ بند کر دو"

"کیوں؟"

"کیونکہ اگر میں تمہارے تعلقات سے واقف نہ ہوتا اور ان خطوط کو پڑھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ پریم پتر ہیں"

"جب مردوں میں اس قسم کے خطوط معیوب نہیں سمجھے جاتے تو پھر سہیلیوں کا آپس میں پریم کرنا کیوں برا سمجھا جاتا ہے"؟

"برا ہے یا نہیں اس پر اس وقت بحث کرنے کی ضرورت نہیں بس تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو کہ تم میرے سوا اور کسی سے پریم نہیں کر سکتی ہو میری محبت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"

پریتیا نے ہنس کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو اس وقت آپ کا خیال کدھر ہے"

"ہنسنے کی بات نہیں ہے ان خطوں کو پڑھ کر میرے دل میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ سہیلیاں آپس میں ایسے عاشقانہ خطوط لکھا کرتی ہیں"

"نرگس تو مجھے روزانہ ایک خط لکھتی ہے اگر جواب نہیں پاتی تو ناراض ہو جاتی ہے"

"ناراض ہو جاتی ہے تو ہو جانے دو کوئی پرواہ نہ کرو"

"میں اس کی ناراضگی کا حال آپ سے کیا بتاؤں وہ تو بات بات میں روٹھ جاتی ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ اس نے مجھے ایک خط بھیجا اتفاق سے مجھے فرصت نہ ملی اور میں اس کا جواب نہ دے سکی آج جب میں اس سے

صبح کے وقت ملی تو اس نے بگڑ کر کہا — "ہاں جی ہاں میں خوب جانتی ہوں تم مجھ سے فرصت نہ ملنے کا بہانہ کرتی ہو اصل بات کیوں نہیں کہتی ہو کہ تم کو اپنے پتی ہی سے فرصت نہیں ملی" مجھے رنگنی کی یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ اور میں وہاں سے فوراً اٹھ کر چلی آئی چنانچہ اس غصہ میں آج شام کو بھی میں اپنے کوٹھے پر نہیں گئی وہ سمجھتی ہے کہ میں غصہ کرنا نہیں جانتی ہوں"

دونوں اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ پرتیما کی ماں نے باہر سے آکر آواز دی — پرتیما نے باہر نکل کر کہا "اماں! کیا بات ہے"

"رنگنی بہت بیمار ہو گئی ہے اس کی خادمہ تمہیں بلانے آئی ہے۔ سنتی ہوں کہ وہ بیہوش ہو گئی ہے جب کبھی اسے ذرا ہوش آتا ہے تو تمہارا ہی نام لیتی ہے۔" اتنا سنتے ہی پرتیما بے چین ہو گئی اس نے اننگ موہن سے جا کر کہا — "ہائے میری رنگنی بہت بیمار ہے ذرا چل کر اس کو دیکھ تو لو۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر میری رنگنی کو —" پرتیما کا گلا بھر آیا وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

(۴)

ڈاکٹر اننگ موہن جب پرتیما کے ساتھ رنگنی کے یہاں پہنچے تو آدھی رات گذر چکی تھی۔ رنگنی کے پلنگ کے چاروں طرف فرش پر گھر کی عورتیں بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر ہیرو ناتھ چپ چاپ ایک طرف سر جھکائے کھڑے تھے رنگنی کے گلے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی گلا گھوٹتا ہو۔ اس کے بدن میں تشنج تھا۔ اننگ موہن نے مریضہ کو بغور دیکھا نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا — "معلوم ہوتا ہے کہ رنگنی نے زہر کھا لیا ہے۔ مگر بہت دیر نہیں ہوئی میں ابھی دوا لاتا ہوں امید ہے کہ اچھی ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اننگ موہن جھپٹ کر کمرہ سے نکل گئے زہر کا نام سنتے ہی ڈاکٹر ہیرے ناتھ کا منہ فق ہو گیا ان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا لیکن کسی نے ان کی طرف نہیں دیکھا پرتیما کی قابل رحم حالت تھی وہ بیتاب ہو کر رنگنی پر گرنے چلی لیکن سب نے پکڑ کر اس کو فرش پر بٹھا دیا اتفاقاً پرتیما کی نظر اس لفافہ پر پڑی جس میں سے رنگنی کی چچی نے خط نکال لیا تھا اور جواب پلنگ کے نیچے پڑا ہوا تھا پرتیما نے لفافہ اٹھا لیا اور چلا اٹھی — "ہائے میری رنگنی! تو نے مجھ کو خط لکھنا چاہا مگر خط پورا نہ کر سکی ہائے مجھے اپنا درد دل تو بتا دیتی —" ڈاکٹر ہیرو ناتھ کانپ اٹھے انہوں نے آگے بڑھ کر پرتیما کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور اپنی جیب سے ایک خط نکال کر تحریر کا مقابلہ کیا۔ پرتیما سے پوچھا کہ کیا یہ خط رنگنی نے آپ کو لکھا تھا"

پرتیما نے خط دیکھ کر کہا — "ہاں ہاں یہ خط میری پیاری سہیلی نے مجھے لکھا تھا۔ آپ کو یہ خط کہاں ملا۔

آپ نے اسے میرے پاس کیوں نہیں بھیجا ؟ "

ترنگنی کی ماں نے بھی خط دیکھ کر کہا ۔ بھیا ! یہ تو میری ترنی کا خط ہے ۔ تم کو کہاں سے ملا ۔ میری ترنی اور پرتیما میں بہت پریم ہے یہ دونوں اسی قسم کے خط لکھا کرتی ہیں ۔ تم تو میرٹھ میں رہتے ہو تم کو کیا معلوم کہ ان دونوں میں کتنا پریم ہے ۔"

ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔ " افسوس میں یہ پہلے سے نہ جانتا تھا " ترنگنی کی ماں نے حیرت سے اپنے دیور کو دیکھ کر کہا ۔ " اس کا کیا مطلب ہے ؟" ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا وہ دوڑتے ہوئے اپنے کمرہ میں گئے اور وہاں سے کوئی دوا لا کر ترنگنی کے منہ میں ڈال دی جس سے ترنگنی کو فوراً قے ہوئی اس عرصہ میں ڈاکٹر اننگ موہن بھی دوا لے کر آ گئے تھے انہوں نے ڈاکٹر ہردے ناتھ سے آنکھیں ملا کر کہا " کیا میں دوا پلا سکتا ہوں ؟ "

جی نہیں ! اب آپ کی دوا کی ضرورت نہیں رہی میری ہی دوا سے مریضہ تندرست ہو جائے گی ۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر ہردے ناتھ نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں ۔ اننگ موہن سے آنکھیں ملانے کی انہیں جرأت نہ ہوئی ۔ پرتیما اور ترنگنی کی ماں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں یہ معمّا ان کی سمجھ سے باہر تھا ۔

متواتر قیں ہو جانے سے ترنگنی کی حالت سدھرنے لگی صبح ہوتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ آہستہ آہستہ رو بہ صحت ہونے لگی اور ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ بالکل اچھی ہو گئی ۔

(۲)

اس واقعہ کے دو مہینے کے بعد پرتیما کی کوشش سے ترنگنی کی شادی اننگ موہن کے چھوٹے بھائی رام موہن سے ہو گئی ۔ اب پرتیما اور ترنگنی ساتھ ساتھ رہتی ہیں وہ بہت خوش رہتی ہیں اب وہ پریم پتر نہیں لکھتیں اب ان کا برتاؤ آپس میں دیورانی اور جیٹھانی کا ہے کبھی کبھی رام موہن کی طرف اشارہ کر کے پرتیما ترنگنی سے ہنس کر مذاق میں کہتی ہے ۔ " اب اس نئے پریتم کے سامنے بھلا تم پرانے پریتم کو کیوں پیار کرنے لگیں ۔ ترنی ! اب وہ تمہارا بھلا پریتم کدھر گیا ؟ تم تو پریتم کو پا کر اپنی پرتیما کو بالکل بھول گئیں ۔" اس پر ترنگنی شرما جاتی ہے اور درد بھری نظروں سے پرتیما کی طرف دیکھ کر کہتی ہے ۔ " پریتم اور پرتیما میں کوئی فرق نہیں میری نگاہوں میں دونوں ایک ہیں ؟ کیوں ٹھیک ہے نہ ؟ "

سُنہری ندّی

(از جناب عبدالحمید صاحب شوق بی اے (آنرز) صدر مدرس مدرسہ احمدیہ)

باب اول

کالا جوڑا ۔ اور جھگڑ شاہ صاحب

ظالمو، رحم کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر ✤ لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر ہے ۔

ملک کشمیر میں ایک وادی تھی جس میں ہر طرف سبزہ زار اور قدم قدم پر گلزار تھا ۔ چاروں طرف پہاڑ برف کی سفید پگڑیاں باندھے آسمان سے باتیں کر رہے تھے ۔ جن سے صاف شفاف پانی کی ندّیاں ہر طرف کو بہتی تھیں ۔ ان ندیوں کا پانی چٹانوں پر سے چادریں بن بن کر گرتا تھا ۔ آبشاروں کا نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ دل ہر وقت اسی کو دیکھتے رہنے کو چاہتا تھا ۔ ان میں سے ایک ندّی غروب آفتاب کے رُخ کو تھی ۔ شام کو جب سورج کی سنہری کرنوں کا عکس اس کی بلّورین سطح پر پڑتا تھا تو بالکل ایک سونے کا دریا لہریں لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ اس سبب سے لوگوں نے اس کا نام ہی سنہری ندّی رکھدیا تھا ۔

وادی کی آب و ہوا اس قدر خوشگوار اور روح افزا تھی کہ بوڑھا جائے تو جوان ہو جائے نیم جان بیمار کو لیجاؤ تو تندرست ہو جائے ۔ موسم گرما میں جب تمام ہندوستان کرہ نار بنجاتا ہے وہ وادی رشک جنّت بنجاتی تھی ۔ تھوڑی تھوڑی بارش ہلکی ہلکی پھوار وہ لطف دیتی کہ بایدو شاید ۔ زمین اس قدر زرخیز کہ سیب ۔ انگور ۔ ناشپاتی ۔ انار غرض ہر قسم کے پھل ۔ ہر قسم کے پھول اور بے انتہا غلّہ پیدا ہوتا تھا ۔ اور لوگ ۔ اس کو وادی دولت کہتے تھے ۔ یہ وادی تین بھائیوں کی ملکیت تھی ۔

دونوں بڑے بھائیوں کے نام رزیل اور ذلیل تھے ۔ یہ دونوں نہایت ہی بدصورت ۔ اور بدباطن تھے ۔ ان کی زشت روئی ۔ سنگدلی ۔ طمع ۔ لالچ ۔ اور حرص کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے دونوں کا نام کالا جوڑا ۔ رکھ چھوڑا تھا ۔ کیونکہ وادی کے غریب باشندوں پر وہ نہایت سخت ظلم کرتے تھے ۔ ان سے سارا دن مفت بیگار لیتے اور شام مزدوری کی بجائے گالیاں دیتے اور تھپڑ مارتے تھے ۔ بلبل ۔ کوئل ۔ اور قمری

جیسے معصوم پرندوں کو وہ غلیل سے تاک کر نشانہ کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے جان فزا نغموں سے اُن کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور اُن کے خیال میں وہ اُن کے پھولوں اور پھلوں کو خراب کرتے تھے۔ کھیتوں کا غلہ کھلیانوں میں خوب بھر رکھتے۔ اور اس وقت بیچنے کو نکالتے جب بازار میں خوب مہنگا ہو جاتا۔ اس طرح انہوں نے ڈھیروں سونا چاندی جمع کر رکھی تھی۔

اس کالے جوڑے کو خدا نے اس قدر تو نعمتیں دی تھیں۔ مگر یہ دونوں کبھی پاک پروردگار کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ اس کی راہ میں کسی بیکس فقیر محتاج کو کچھ دینا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ بلکہ اُن کی بدکلامی اور ترش روئی سے ڈر کر کوئی فقیر اُن کے دروازہ پہ آتا ہی نہ تھا۔

ہمہ آدمی زادہ بوند لیکن ⁂ چو گرگاں بخونخوار گی تیز چنگی۔

تیسرے اور سب سے چھوٹے بھائی کا نام جمیل تھا۔ جو ایسا پیارا خوبصورت اور بھولا بھالا بچہ تھا کہ ہر شخص اُس کو پیار کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کوئی دس برس کا تو سن ہوگا مگر نہایت ہی ذہین اور سمجھدار تھا۔ بچپن ہی میں چونکہ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا اس لئے اس کالے جوڑے کے پالے پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں اس غریب کے خون کے پیاسے تھے۔ اس سے گھر کا سب کام کاج کراتے۔ برتن یہ دھوتا۔ گھر میں جھاڑو یہ دیتا۔ کھانا یہ پکاتا۔ مگر ذرا ذرا سی بات پر اس کو اس قدر مار پڑتی کہ معاذ اللہ اور پھر اُن ظالموں کا جھوٹا بچا کچا کھانے کو ملتا۔

ایک سال ملک کشمیر کے سب علاقوں میں بیوقت بارش سے فصلیں برباد ہو گئیں اور غلہ سڑ گیا۔ آندھیوں نے انگور کی بیلیں تباہ کر دیں۔ بھو سے چارے تک کا ستیاناس ہو گیا اور آدمی اور مویشی سب بھوکوں مرنے لگے۔ مگر وادی دولت میں وہی اگلی سی بہار تھی۔ وقت پر اور مناسب مقدار میں پانی برسا۔ غلہ۔ پھل پھول۔ ہر چیز نہایت افراط سے ہوئی اب تو کالے جوڑے کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ ہر طرف سے غلہ کے واسطے لوگ اُن کے پاس آنے لگے۔ انہوں نے مُنہ مانگے دام لئے۔ مگر جو لوگ روپیہ نہ خرچ کر سکتے اُن کے دروازہ پہ سسک سسک کر جان دیتے تھے مگر اُن ظالموں کو رحم نہ آتا تھا کہ اُن کی کچھ مدد کریں اور جان بچائیں۔

ننھا جمیل اُن ظالموں کے ہوتے کیا کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اُن کی نظر بچا کر کسی کو پھل کسی کو روٹی دے ہی دیتا تھا۔ مگر اُس کے ظالم بھائیوں کو اگر اس کا پتہ لگ جاتا تھا تو غریب اس قصور پر خوب پٹتا تھا

وہ خدا ترس بچہ خود تمام مصیبت برداشت کرتا تھا مگر لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر جس طرح بن پڑے اُن کی مدد کرتا تھا ۔

ایک دن رزیل اور ذلیل حسب معمول جمیل کو گھر چھوڑ کر اپنے کام کاج کو گئے جمیل اُن کے کھانیکو کباب بنا رہا تھا ۔ اُس نے اندر سے مکان کی کنڈی لگا رکھی تھی اتنے میں ہوا زور سے چلنے لگی ۔ بوندیں پڑنے لگیں بارش موسلا دھار ہونے لگی ۔ سردی غضب کی ہو گئی ۔ مگر جمیل کے پاس انگیٹھی میں آگ خوب روشن تھی ۔ بھونتے ہوئے گوشت کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا ۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ "خدا نے اس قدر نعمتیں میرے بھائیوں کو دی ہیں مگر افسوس کہ وہ ایک دانہ کسی کو نہیں دیتے ۔ لوگ بھوکے مرتے ہیں اور ہم مزے کرتے ہیں ۔ کاش میں کسی کی مدد کر سکتا" جمیل انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی جمیل چونکا ۔ پھر خیال کیا کہ ہوا سے شاید دروازہ ہلا ہو گا ۔ بھلا ہمارے پاس کون آتا ہے ۔ مگر دروازہ پھر کسی نے کھٹکھٹایا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت جلدی میں ہے ۔ جمیل نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو ایک عجیب و غریب شکل کا آدمی دکھائی دیا ۔ ٹھگنا سا قد تانبے کی سی سُرخ ناک ۔ نانبا ؤ کی طرح پھولی ہوئی گالیں ۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں ڈھیلے بہت جلد جلد حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے ۔ بڑے بڑے گلپھے اور موٹی موٹی چڑھی ہوئی مونچھیں ۔ سر پر ایک اپنے قد سے بھی لمبا نوکدار ٹوپ ۔ اس پر چیل کے پروں کی کلغی ۔ ڈھیلا ڈھالا سا چغہ پہنے زور زور سے دروازے کو تھپک رہا ۔

جمیل اس بونے کو حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ بونے کی نظر اس پر پڑی اور اس نے کہا "واہ میاں ۔ واہ مجھے تو سردی لگ رہی ہے اور تم دروازہ نہیں کھولتے ۔ بچے نے جواب دیا ۔ نہ باباجی میرے بھائی آ کر مجھ کو اور تم کو دونوں کو مارینگے میں دروازہ نہیں کھول سکتا ۔

بونے نے نہایت عاجزی سے کہا بیٹا کھول دو ۔ ذرا سی دیر آگ تاپ کر چلا جاؤں گا ۔ دیکھو سردی سے مرا جا رہا ہوں جمیل کو اس پر رحم آ گیا ۔ اُس نے دروازہ کھول دیا اور بونا اندر آ گیا ۔

بونا ۔ شاباش بیٹا شاباش ۔ بھائیوں سے مت ڈرو میں اُن کو سمجھا لوں گا ۔

جمیل نے کہا حضرت آپ میرے بھائیوں کو کیا سمجھائینگے ۔ آپ آگ تاپئے اور جلد جائیے ورنہ وہ آ کر بھرکس ہی نکالدیں گے ۔

بونا ۔ تو بیٹا میں کتنی دیر یہاں ٹھہر سکتا ہوں ۔

جمیل ۔ جب تک یہ کباب تیار ہو جائیں ۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک چوکی بونے کو دی ۔ اُس نے بیٹھ کر وہیں کپڑے نچوڑنے شروع کر دئے ۔

جمیل ۔ حضرت کپڑے باہر نچوڑئے آگ بجھ رہی ہے ۔

بونا ۔ اچھا ہے آگ بجھنے دو ۔ کباب دیر میں تیار ہوں گے تو مجھ کو جلدی نہ جانا پڑے گا ۔

جمیل بیچارہ اُس کی وحشتناک صورت سے ڈرتا تھا ۔ اُس کے مُنہ سے لفظ نہ نکلتا تھا ۔ اِدھر بھائیوں کے خوف کے مارے الگ مرتا جارہا تھا ۔

بونا پھر بولا ۔ بیٹا کئی دن کا بھوکا ہوں ۔ خدا کے واسطے مجھ کو کچھ کھانے کو دو ۔

اُس نے یہ الفاظ ایسی عاجزی سے کہے کہ جمیل کو بیحد ترس آیا ۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے طشتری میں دو کباب رکھ کر اُس کو دئے اور کہا "لیجئے یہ میرا حصہ ہے"۔

اتنے میں پھر کسی نے دروازہ کھٹکٹایا ۔ جمیل نے جھپٹ کر دروازہ کھولا دیکھا تو دونوں بڑے بھائی ہیں ۔ بچارے کے قدموں کے تلے سے زمین نکل گئی ۔ ایک بھائی نے زور سے تھپڑ جو مارا تو بچارا تیورا کر گرا ۔ اور کالا چوڑا یہ کہتا ہوا اندر آیا کہ ہم تو سردی میں باہر کھڑے ہیں اور یہ دروازہ ہی نہیں کھولتا لیکن اُن کے غُصّے کی کچھ انتہا نہ رہی جب انہوں نے باورچیخانے میں بونے کو دیکھا ۔ دونوں چلّائے اے کمبخت یہ کون ہے ۔

بونا ۔ اجی کوئی نہیں ۔ پھر اُس نے اپنا ٹوپ اتار کر زمین پر رکھدیا اور دونوں کو کھڑے ہو کر بہت ہی جھک کر سلام کیا ۔

رزیل جو غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا اُس نے جمیل کو سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور جھنجلا کر کہا ۔ ارے یہ کون ہے ۔ اور یہاں کیوں آیا ہے ؟

جمیل نے چیخ کر کہا ۔ بھائی جان مجھے معلوم نہیں ۔

رزیل ۔ اے کمبخت یہ مکان میں کیسے آیا ؟

جمیل ۔ بھائی جان یہ سردی میں بھیگ رہا تھا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رزیل ۔ بچہ اور کا ۔ یہ کہہ کر اُس نے غریب بچہ کو مارنے کو چھڑی اٹھائی مگر بونے نے اپنا ٹوپ آگے کر دیا ۔ اور چھڑی جمیل کی بجائے اُس پر لگی چھڑی تو اُس پر پڑتے ہی ٹوٹ گئی لیکن اس میں سے

پانی کی دھاریں ہر طرف کو نکل کر بہنے لگیں ۔
اب تو رزیل اور ذلیل دونوں اس کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے اجی تم کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟

بونا ۔غریب مسافر ہوں ۔سردی سے اکڑ رہا تھا ۔آگ روشن دیکھکر تاپنے آگیا ۔
ذلیل ۔چل یہاں سے بدمعاش ۔تمام گھر پانی سے بھر دیا ۔
بونا ۔قدم درویشاں رد بلا ۔عاجز ہوں مسکین ہوں ۔تھوڑی دیر آرام کرنے دو ۔
رزیل ۔نکل یہاں سے ۔بڑے درویش بنکر آئے ہیں حضرت !
بونا ۔اچھا بابا جاتا ہوں ۔مگر کچھ کھانے کو ملجائے ۔بھوک سے بیتاب ہوں ۔
ذلیل ۔ارے تیرے واسطے یہاں کھانا تیار رکھا ہے ۔دور ہو ۔ورنہ کچا ہی چبا جاؤں گا ۔
بونا ۔ایک پیسہ ہی دیدو ۔

اس پر ذلیل کو بہت غصہ آیا ۔اور اس نے لپک کر بڈھے کو گلے سے پکڑ لیا ۔اور باہر دھکیلنے کو ہی تھا کہ خود ٹھنگنی کھا کر گرا ۔اور لڑھک کر کونے میں جا پڑا ۔اب تو رزیل کو اور بھی تاؤ آیا ۔مگر جب اس نے بھی بونے کو گلے میں ہاتھ دیکر نکالنا چاہا تو الٹک کر ذلیل کے پاس جا پڑا ۔اس کا سر دیوار سے دھم کر کے جا ٹکرایا ۔بونے خاں نے اب تو مونچھوں کو تاؤ دیا ۔ٹوپ اٹھا کر سر پر رکھا ۔اور کھانسکر کہا ۔"آہاں ۔اہوں ۔آدھی کو رات پھر ملیں گے اب تو جانتے ہیں" بونا گھر سے نکلا تو اس نے کواڑ اس زور سے بند کئے کہ گھر کے در و دیوار تک ہل گئے ۔اس کے جاتے ہی بارش پھر زور سے ہونے لگی ۔

رزیل نے جمیل کو طنزاً کہا واہ صاحب آج تو آپ نے بڑا کام کیا ۔یہ آپ کے دوست کو تھے ۔اب کھانے کو ۔اتنے میں دونوں کی نظر طشتری والے کبابوں پر پڑی اور انہوں جھڑک کر پوچھا ۔اب یہ کیا ہے ۔
جمیل ۔میں اپنے حصے کے کباب بڈھے کو دے رہا تھا ۔
یہ سنتے ہی وہ دونوں غصہ کر کے مارے اپنے سے باہر ہو گئے ۔اور غریب کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ۔بیچارہ روتا دھوتا کسی کوٹھری میں بھوکا پڑ رہا ۔اور یہ دونوں خوب کباب کھا کر اور

شراب پی کر بدمست ہوگئے ۔ اور پھر اپنے اپنے بچھونوں پر جا لیٹے ۔
ٹھیک آدھی رات کے وقت دونوں کی آنکھ یکایک کھلی ۔ اور ایک زبردست دھماکے کی آواز آئی ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مکان کی سب چھتیں گر رہی ہیں ۔ کمرہ پانی سے بھر رہا ہے ۔ اور وہی بونا پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے ۔ اور گا رہا ہے ۔ ان کو دیکھ کر اُس نے کہا ۔ معاف کیجئے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی ۔ اچھا اب ہم جاتے ہیں ۔ باورچیخانہ کی چوکی پر ہم نے اپنا پتہ لکھ کر رکھ دیا ہے ۔ اور جمیل کا کمرہ گرانے سے بچا دیا ہے ۔ اور یہ کہکر وہ چلدیا ۔ جانے کہاں غایب ہو گیا ۔
وہ رات ایک آفت کی رات تھی ۔ آندھی ۔ مینھ ۔ طوفان ۔ بجلی کا کوندنا ۔ رعد کا کڑکنا ۔ بادل کا گرجنا ۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی ۔ دونوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ وادی جو کل بہشت کا ٹکڑا تھی اب بالکل اجاڑ ہو رہی تھی ۔ فصلیں برباد ۔ مکانات شکستہ ۔ وادی دولت وادی نحوست بنگئی تھی ۔ روپیہ ۔ پیسہ ۔ کپڑا لتّا ۔ برتن ۔ بلکہ مویشی تک پانی بہا لے گیا ۔ اور یہ دونوں حسرت سے ہاتھ ملتے رہ گئے ۔ باورچی خانہ میں چوکی پر ایک کاغذ پڑا ملا جس پر لکھا تھا ۔ میرا پتہ یہ ہے :۔
"سائیں جھکڑ شاہ صاحب "

باب دوم

عجیب و غریب لوٹا

حاصل ہوا ہے ہم کو یہ مضمون چراغ سے ۔۔۔۔ روشن اسی کا نام ہے جو کہ جلائے دل

سائیں جھکڑ شاہ صاحب کا نام سن کر تعجب ہوا ۔ اُن کو ہر جگہ تلاش کیا گیا ۔ مگر کہیں پتہ نہ ملا ۔ ہر شخص کو اس خدائی تنبیہ سے عبرت ہوئی مگر کالے جوڑے کا تو دل بالکل سیاہ ہو گیا تھا ۔ چند روز کے بعد وہ پھر ویسے ہی ہو گئے ۔ مگر اب وادی دولت سچ مچ وادی نحوست ہو گئی تھی ۔ نہ وہ پہلی سی بارش ہوتی تھی ۔ نہ اگلی سی زرخیزی اور سرسبزی کا پتہ تھا ۔ ہر جگہ تباہی اور بربادی کے آثار نمایاں تھے ۔ تمام باشندے مکانات چھوڑ چھاڑ کر دوسرے مقامات پر آباد ہو گئے ۔ اور کوئی ہوتا تو اب خدا سے ڈرتا توبہ کرتا ۔ اپنے گناہوں پر شرمسار ہوتا ۔ خدا سے مغفرت مانگتا ۔ مگر رذیل اور ذلیل

اس قماش کے نہ تھے ۔ وہ اب خدا کو ۔ زمانے کو قسمت کو فلک کو گالیاں دیتے تھے ۔ جو منہ آتا تھا بکتے تھے ۔ جب وادیِ دولت میں گذارہ نہ ہوا تو پاس کے کسی گاؤں میں جا بسے ۔ اور محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے لگے ۔ جاتے ہوئے مکان کے ایک کونے میں ان کو تین ڈلّے سونے کے ملے ۔ جو اتفاقاً طوفان سے بچ گئے تھے ۔ انہی کو غنیمت سمجھ کرلے گئے ۔ اور ایک چھوٹی سی سرافی کی دکان کھول لی ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں گاہکوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ سونے میں ملاوٹ کرتے ہیں ۔ اس لئے دکان چلنے سے رہ گئی ۔ اور اب فاقوں کی نوبت آگئی ۔ لیکن اس پر بھی جب کبھی کچھ پیسے ہاتھ لگ جاتے تو شراب ضرور پیتے ۔ آخر کار گھر میں سوائے ایک لوٹے کے کچھ نہ رہا ۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت لوٹا جمیل کو اُس کے چچا نے بچپن میں کھیلنے کو دیا تھا ۔ گھر سے چلتے وقت وہ اس کی نظر پڑا تو بیچارا اُس کو ساتھ اُٹھا لایا تھا ۔ اُس لوٹے کا منہ انسانی چہرہ کی صورت کا بنا تھا ۔ ناک سُرخ پتھر کی تھی ۔ آنکھوں میں یاقوت جڑے تھے ۔ اور جب اُس میں ڈالکر کچھ پیو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوٹا پینے والے سے آنکھیں ملاکر ہنستا ہے ۔

جب گھر میں اور کچھ نہ رہا تو کالے جوڑے نے اس لوٹے کو غور سے دیکھا ۔ معلوم ہوا کہ خالص سونے کا ہے ۔ پس جمیل کو حکم دیا کہ ہمارے باہر سے آنے تک اس کو آگ میں پگھلا رکھو ۔ جمیل اس لوٹے کو جو اُس کے چچا کی نشانی تھی نہایت عزیز رکھتا تھا مگر اُن ظالموں کے حُکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی ۔ قہرِ درویش برجانِ درویش اُس نے لوٹے کو آگ پر رکھ کر دھونکنا شروع کیا ۔ گرم ہو کر لوٹے کی آنکھیں اور ناک اور بھی سُرخ معلوم ہونے لگے ۔ بیچارا دھونکنے سے سر اُٹھا کر ذرا باہر دیکھنے لگا ۔ تو بہت فاصلے پر وہی پرانی وادیِ دولت پر نظر پڑی ۔ اب وہی ندی اس کی آنکھوں سے سامنے تھی جس کو لوگ سنہری ندی کہتے تھے اور اس وقت تو سورج کے عکس سے وہ بالکل سونے کی معلوم ہوتی تھی ۔ جمیل بچہ تو تھا ہی اُس کے دل میں خیال گذرا کہ "کاش یہ ندی واقعی سونے کی ہوتی تو میرا لوٹا بچ جاتا" ۔

ادھر اُس کے دل میں یہ خیال آیا اِدھر اس کے کان میں یہ آواز آئی ۔ "ہو جائے گی ہو جائیگی" جمیل کو بہت تعجب ہوا ۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو مکان میں کوئی نہ تھا ۔ سمجھا کہ یوں ہی وہم ہو گیا ۔ پھر وہ اسی خیال میں ڈوب گیا کہ کاش یہ ندی سچ مچ سونے کی ہو جائے ۔ یہ خیال اُس کے دل میں آتے ہی پھر وہی آواز سنائی دی ۔ "میاں ندی سونے کی ہو جائے گی" ۔ اب تو بچہ بہت ڈرا ۔ اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ کہ شاید کوئی دکان میں چھپا ہے ۔ لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ آواز لوٹے میں سے آرہی ہے

بلکہ اب تو ایک قسم کی گھنٹی سی ساتھ بج رہی تھی۔ اور لوٹا یہ گیت گا رہا تھا۔

آہا۔ آہا میرے مولا + آہا، آہا مورے مولا۔

جمیل پر اس قدر خوف طاری تھا کہ بچارا چیخ مارنا چاہتا تھا تو منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔ حیران تھا کہ پگھلتے ہوئے لوٹے میں گانے بجانے کا کیا کام تھوڑی دیر میں گانا بند ہوا تو اُس نے صاف صاف یہ الفاظ لوٹے میں سے سنے کہ بیٹا ڈرو مت مجھ کو باہر نکالو" اب تو بچہ اور بھی ڈرا خوف کے مارے ہاتھ تک نہ ہلا سکتا تھا۔ لیکن آخرکار اُس نے ہمت کرکے ایک لکڑی سے لوٹے کو آگ کے باہر نکال کر الٹ دیا تو اُس میں سے ایک صاحب برآمد ہوئے۔ جن کی چھوٹی چھوٹی سنہری ٹونٹنگیاں تھیں۔ اور ایک نیلا کوٹ زیب بدن تھا جمیل کے دیکھتے دیکھتے اُس کا قد ایک بالشت سے بڑھکر قریب دو فٹ کے ہو گیا۔ اور وہ جمیل سے یوں مخاطب ہوا "شاباش بیٹا شاباش ہم تم سے بہت خوش ہیں" یہ کہہ کر بونا اپنے کپڑوں کو سنوارتا ہوا کمرہ میں اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا۔ اُس کا مخمل کا نیلا کوٹ۔ اُس کے نیچے ایک شاندار واسکٹ۔ سر کے بال گھونگریالے۔ سفید ڈاڑھی تقریباً زمین کو چھوتی ہوئی چہرہ تانبے کا سا سُرخ مگر نہایت بارُعب اور پُرہیبت۔ کپڑے وغیرہ درست اور ٹھیک ٹھاک کرکے کہنے لگا "میں ندی کو سونے کی بنا دوں گا"

اب تو جمیل کو بھی اس سے سوال کرنے کی جرات ہوئی۔ اور اُس نے پوچھا "حضرت آپ میرے لوٹے میں رہتے ہیں"؟

اب تو بڈھے میاں اُس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "دیکھو بیٹا میرا نام خواجہ خضر ہے۔ مگر تمھارے بھائی مجھ کو "سائیں جھکڑ شاہ صاحب" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ میں سب دریاؤں اور سمندروں کا بادشاہ ہوں۔ تم بہت نیک بچے ہو اس لئے میں تمھارے لوٹے میں آ گیا تھا۔ مجھ کو سب معلوم ہے کہ تمھارے بھائی تم سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ دیکھو یہ ندی سونے کی ہو جائے گی اگر تم سو دفعہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر مسجد کے کنوئیں کا پانی اس ندی میں ڈالدو گے"۔

یہ کہہ کر خواجہ خضرؑ نے پھر آگ کی بھٹی میں قدم رکھا اور نظروں سے غائب ہو گئے اور اُن کے غایب ہونے ہی لوٹا بھی غایب ہو گیا۔ جمیل بھائیوں کے ڈر سے ہائے ہائے میرا لوٹا۔ ہائے میرا لوٹا کہہ کر رونے لگا۔

باب سوّم

ذلیل کی ناکامی

جو کہ ظالم ہے کبھی وہ پھولتا پھلتا نہیں + سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھی شمشیر کا؟ (میرؔ)

خواجہ خضرؑ کے نظروں سے غایب ہوتے ہی کالا جوڑ شراب سے بدمست اور مخمور آ پہنچی اور سب سے پہلے جمیل سے یہی سوال کیا کہ لوٹا کہاں ہے۔ جب اُس نے ڈرتے کانپتے ہوئے خواجہ خضرؑ یا جھکڑ شاہ صاحب کی دوبارہ تشریف آوری کی کہانی سنائی تو دونوں نہایت برافروختہ ہوئے اور بیچارہ کو اس قدر مارا کہ بیہوش ہو گیا۔ مگر خود بھی چونکہ نشہ میں تھے اس لئے اس کو مار پیٹ کر چوکیوں پر لیٹ رہے۔ جب نشہ اترا اور جمیل سے بار بار پوچھنے پر اُس نے وہی کہانی سنائی تو اب اُن کو اُس کی بات کا یقین سا آنے لگا۔ اور ہر ایک کے دل میں یہ لالچ پیدا ہوا کہ وہی ندی کو سونے کی بنا کر اس کا مالک بن بیٹھے۔ اب دونوں میں اس بات پر تکرار ہونے لگی کہ پہلے کون جائے۔ جب باتوں سے فیصلہ نہ ہوا تو جوتی پیزار کی نوبت پہنچی۔ شور و غوغا سن کر لوگ جمع ہو گئے پولیس آ گئی۔ پولیس کے لوگوں کو آتے دیکھ کر میاں ذلیل تو کہیں جا چھپے۔ اور میاں رزیل نقض امن کے جرم میں حوالات میں بند کر دئے گئے

ذلیل کو جب بڑے بھائی کے حوالات میں جانے کی خبر لگی تو باچھیں کھل گئیں۔ فوراً قسمت آزمائی کرنے کو تیار ہوا۔ مگر اس میں شرط تھی سو دفعہ فاتحہ پڑھ کر دم کئے ہوئے پانی کی۔ اور اس کو کلمہ طیّب تک نہ آتا تھا۔ برائے نام مسلمان تھا۔ ورنہ اسلام سے یا اسلامی اخلاق سے اس کو اور اس کے بڑے بھائی کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ماں باپ نے جو تعلیم بچپن میں دی تھی وہ سب بداعمالیوں میں بھول گئی تھی۔ اور اب یہ دونوں محض وحشی کافر تھے۔ آج جو ضرورت پڑی تو چلے مسجد کو۔ ملّاں جی کو حیرانی ہوئی کہ یہ شرابی بدمعاش آج مسجد میں کیسے۔ اُس نے نہایت عاجزی سے اپنا مطلب عرض کیا۔ مگر ملّاں بھی لالچی تھا۔ اُس نے بغیر کچھ لئے سو دفعہ الحمد کی سورۃ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تھے میاں ذلیل بھی بڑے دھن کے پکّے مغرب کی نماز کے وقت مسجد کے دروازہ پر گلاس میں پانی لے کر کھڑے ہو گئے۔

جو نمازی گذرتا اس سے دم کراتے گئے جب اس طرح مسجد کے کنوئیں کا دم کیا ہوا پانی ملگیا تو اگلے دن صبح نور کے تڑکے اُٹھ کر روانہ ہوا۔ ایک بوتل میں پڑھا ہوا پانی۔ دو بوتلوں میں شراب اور کچھ کھانا لے کر ایک ٹوکری میں رکھا۔ اور اس کو کمر پر لٹکا کر ہاتھ میں ڈنڈا لے کر چلدیا۔ رستے میں میاں رزیل کی حوالات پڑتی تھی اُس کے چڑانے کو سلاخوں کے دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر خدا حافظ کہا اور روانہ ہوا۔ اُس کو دیکھ کر رزیل خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

صبح کا سہانا سماں تھا۔ ہری ہری گھاس پر شبنم کے قطرے پڑے تھے گویا کہ سبز مخمل پر موتی جڑے تھے۔ پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں برف سے ڈھکی تھیں۔ اُن پر آفتاب کی سنہری کرنیں پڑ کر ہر طرف سنہرا سماں نظر آتا تھا۔ دھوپ سے ہلکے ہلکے بخارات اُٹھتے تھے۔ اور سورج کی کرنیں ان میں ہزاروں رنگوں کی جھلک دکھاتی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہوا کی نرم و لطیف موجیں غنچہ و گل کو چھیڑتی ہوئی آتی تھیں۔ اور شام جان کو معطر کر رہی تھیں۔ غرضکہ عجب دلچسپ اور دلفریب وقت تھا۔ اور عجیب وجد آور نظارہ تھا چنار اور شاہ بلوط کے اونچے اونچے درخت حیران کھڑے جھوم رہے تھے۔ اس نظارہ کو وہی شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہو جس نے کشمیر جنت نظیر کی کبھی سیر کی ہو۔ اگرچہ ابھی تک سنہری ندی پر دھوپ نہیں آئی تھی مگر اُس کے آبشار کا جھرنا عجب لطف دیتا تھا۔ ذلیل اپنی نظر اسی پر جمائے جا رہا تھا۔ اس دُھن میں اُس کو فاصلہ کا بھی کوئی خیال نہ رہا۔ جلد جلد قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔

جب سورج ذرا اونچا ہوا تو اُس کو اپنے آگے ایک بڑا بھاری برف کا ٹیلہ نظر آیا۔ جو اس کے اور سنہری ندی کے درمیان حائل تھا۔ بھلا اس وادی کی کونسی جگہ اور کونسی چیز تھی جس سے وہ واقف نہ ہو مگر اس برف کے ڈھیر کو تو اُس نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس پر تعجب یہ کہ برف کے نیچے سے نہایت عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی تو خوشی اور مسرت کے نعرے کبھی رونے اور چیخنے کی بھیانک پکار۔ ذلیل بہت ڈرا۔ مگر تھا دھن کا پکّا جو قدم اٹھا آگے ہی بڑھا۔ رستہ پتھریلا اور خطرناک تھا برف پاؤں کے نیچے ٹوٹتی اور پھسلتی معلوم ہوتی تھی۔ مگر یہ چلتا ہی گیا۔ برف میں سے ایک روشنی نکلنی شروع ہوئی جو کبھی تو اس کو بالکل چندھیا دیتی اور کبھی یک لخت ایسی غائب ہو جاتی تھی کہ یہ بالکل اندھیرے گھپ میں کھڑا رہ جاتا تھا۔ آوازیں جو برف کے نیچے سے آ رہی تھیں نہایت درجہ خوفناک اور ڈراؤنی ہوتی جاتی تھیں۔ بالکل بھونچکا اور مخبوط الحواس ہو رہا تھا۔ کئی دفعہ پھسل کر منہ کے بل گرا۔ مگر ایک تو سونے کی لالچ۔

دوسرے ناکام واپس جانے پر بڑے بھائی کے ملنے کا خیال اس کو کشاں کشاں آگے ہی لئے جاتا تھا۔ اب تو کھانے کی ٹوکری اُٹھانی بھی مشکل ہو گئی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پیاس سے بیتاب ہو کر برف کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر چوسنے لگا۔ جب آگے جانا مشکل ہوا تو ایک جگہ بیٹھ کر ستایا۔ کھانا کھایا۔ شراب پی اور ذرا سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو پھر چلا۔ مگر اب کھانا ختم تھا۔ شراب کی بوتلیں خالی تھیں ان کو وہیں چھوڑا اور صرف پڑے ہوئے پانی کی بوتل بغل میں دابکر چلا۔ آگے ایک دیوار کی طرح سیدھا پہاڑ تھا۔ اس پر چڑھنا تھا دھوپ تیز ہو گئی۔ سایہ کا کہیں نام نہ تھا۔ پھر منہ خشک ہونے لگا۔ اُس نے سوچا کہ بھری بوتل پاس ہے۔ ندی میں صرف چند قطرے ڈالنا ہے اس لئے گھونٹ پی لینے سے کچھ نقصان نہ ہوگا۔ یہ سوچکر اُس نے بوتل کا ڈاٹ کھولا اور بوتل منہ کو لگائی۔ مگر اسی وقت ایک کُتّے کا پلّا نظر پڑا۔ جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے زمین پر پڑا سسک رہا اور جان توڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ذلیل کی بوتل پر جمی تھیں۔ مگر اُس سنگ دل میں اس قدر رحم کہاں کہ اُس کے منہ میں چند قطرے ٹپکاتا بلکہ اُلٹا اُس کو ٹھوکر مار کر آگے چلدیا۔ اور غٹ غٹ دو چار گھونٹ پانی کے آپ چڑھا لئے۔

اُسی وقت آسمان پر ایک نیلے رنگ کا بادل چھا گیا۔ راستہ پہلے سے زیادہ ڈھلوان اور دشوار گذار ہو گیا۔ ہوا نہایت گرم اور جھلسنے والی چلنے لگی۔ پہاڑی ندیوں کا شور اور آبشاروں کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اب ذلیل کو پیاس نے پھر ستایا۔ بوتل کو دیکھا تو ابھی اس میں کافی پانی تھا۔ لگا پینے۔ عین اسی وقت ایک ننھا بچہ نظر پڑا۔ جو نہایت ہی خوبصورت تھا۔ مگر پیاس سے بیتاب۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ناک کا بانسہ پھر گیا تھا۔ لبوں کی رنگت نیلی پڑ گئی تھی۔ دم گلے میں اٹک رہا تھا۔ اُس کی قابل رحم حالت کو دیکھ کر پتھر کا کلیجہ بھی پانی ہو جاتا مگر ذلیل کو ذرا ترس نہ آیا۔ خود دو گھونٹ پانی کے پیئے۔ بچہ کو ٹھوکر مار کر رستے سے پرے کیا۔ اور اپنے رستے سے چلا گیا۔ اُس وقت ایک بالکل سیاہ بادل آفتاب کے آگے چھا گیا۔ اور ایک بادل سیاہ رنگ کی طرح بل کھاتا ہوا اُس کے پاس سے نکل کر آسمان پر چلا گیا۔

مگر اُس کی منزل مقصود بالکل قریب آ گئی تھی۔ سنہری ندی چند قدموں کے فاصلہ پر سامنے نظر آتی تھی۔ ذلیل ذرا دم لینے کو بیٹھا تو پاس ہی کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ دیکھا کہ ایک پتھر کی اوٹ میں ایک ضعیف العمر بڈھا شخص پڑا ہے۔ چہرہ پر موت کے آثار نمایاں ہیں۔ آنکھیں بے نور ہو گئی

تھیں۔ زبان کو بار بار لبوں پر پھیر کر کہتا تھا۔ "پانی۔ ہائے پانی" ذلیل کو اسے دیکھ کر رحم کی بجائے غصہ آگیا دو چار گالیاں دیکر کہا۔ ارے کمبخت۔ بہت جی چکا۔ اب کہیں مر بھی۔ کیا قیامت کے بورے ہٹورےگا اور بمصداق موئے پر سو درے۔ بڈھے کو اس نے ایک لات رسید کی اور چلا آگے۔

اس وقت جانب شرق سے بجلی کوندی۔ آسمان پر تین دفعہ تلوار کی شکل میں چمکی۔ سیاہ بادل ہر طرف چھا گیا۔ سیاہ بادل کے نیچے سورج ایک سرخ آتشی گیند کی طرح غروب ہونے لگا۔ مگر اب ذلیل عین سنہری ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کی لہریں بھی آگ کی لپیٹیں معلوم ہوتی تھیں۔ آبشاروں کی آواز ایسی وحشت ناک تھی کہ کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ قریب تھا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائے۔ مگر اس نے ذرا جی کو کڑا کیا۔ دل کو سنبھالا۔ بوتل کو کھولکر ندی میں انڈیل دیا۔ پانی کے ندی میں گرتے ہی ایک سرد ہوا کے جھونکے نے اس کو بھی ڈھکیل دیا وہ خود بھی ندی میں گرا۔ گرتے وقت ایک چیخ اس کے منھ سے نکلی۔ اسی وقت سورج غروب ہو گیا۔ ندی میں ایک خوفناک گرج پیدا ہوئی۔ اور رات کی تاریکی میں اس کی شکل کا ایک بت سیاہ پتھر کا ندی کی سطح پر نمودار ہوا۔ او پانی اس کے گرد چکر کھا بہنے لگا۔

باب چہارم

رزبل کی ناکامی

عنایت بیکسوں پر ہے کلید رحمت باری — بھلا کیا مارنا ہوتا ہے اک اللہ مارے کا

کئی دنوں کے بعد رزبل حوالات سے چھوٹ کر گھر آیا تو جمیل کو اکیلا پایا۔ ذلیل کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جو گیا ہے تو اب تک نہیں لوٹا۔ بہت خوش ہوا سمجھا کہ وہیں کہیں مر گیا۔ مگر جمیل جو قدرتاً بہت رحم دل اور پیارا بچہ تھا۔ اس کو یاد کر کے روتا تھا۔ اگرچہ ذلیل نے ہمیشہ اس پر ظلم و ستم کیا تھا مگر یہ اس کی سب باتیں بھولکر اپنے بھائی کی محبت میں بیتاب تھا اور اس کی تلاش میں جانا چاہتا تھا۔ رزبل نے اس کو تو نہ جانے دیا۔ آپ اِدھر اُدھر سے کچھ کھانے پینے کا سامان کر جانے کو تیار ہوا۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ ذلیل پانی پڑھوا کر نہیں لے گیا تھا۔ اس نے مُلا کو کچھ دے

دلا کر پانی پر الحمد نو سو دفعہ پڑھوا لی ۔ اور اگلے دن علی الصباح ایک ٹوکری میں کچھ کھانا اور شراب کی دو بوتلیں رکھ پڑھے ہوئے پانی کی بوتل ہاتھ میں لے چل کھڑا ہوا ۔

جب وہ بھی برفانی پہاڑ کے پاس آیا تو اُس کے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آیا جو ذلیل کو پیش آیا تھا ۔ اُس کو بھی اپنی ٹوکری وہاں چھوڑنی پڑی ۔ اور وہ بھی صرف پڑھے ہوئے پانی کی بوتل لے کر آگے چلا ۔ جب دیوار کی مانند سیدھے پہاڑ پر چڑھا تو اُس کو بھی سخت پیاس لگی ۔ اور جب وہ پانی پینے لگا تو اُس کو بھی پہلے تو ایک کتے کا پلا ۔ پھر ایک خوبصورت بچہ اور بالآخر ایک ضعیف العمر شخص پیاس سے بیقرار اور جاں بلب نظر پڑا ۔ یہ بھی اسی طرح اُن کو ٹھکراتا ہوا اور اپنی پیاس بجھاتا ہوا آگے بڑھا چلا گیا ۔ قریب دریا کے پہنچا تو اُس کو اُس کا بھائی ذلیل پیاس سے بیقرار اور ہائے پانی پانی چلاتا ہوا نظر پڑا ۔ اُس نے اُس کو بھی ایک زور سے لات ماری اور گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھا ۔ مگر جب مڑ کر دیکھا تو ذلیل غائب تھا ۔ اب ندی اُس کے بالکل سامنے تھی ۔ وہی سیاہ بادل آسمان پر چھا رہا تھا ۔ بجلی کوند رہی تھی ۔ بادل گرج رہا تھا ۔ دریا کی لہریں شور مچا رہی تھیں آفتاب سرخ گیند کی مانند غروب ہو رہا تھا ۔ ندی کو اور آبشار کو آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ خوفناک آوازیں اور وحشت ناک نظارے اُس کی آنکھوں کے سامنے تھے ۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا ۔ دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اُس نے ایک دفعہ سنبھل کر بوتل کا باقی پانی ندی میں انڈیل دیا ۔ ساتھ ہی وہ بھی پھسل کر دھڑام سے ندی میں گرا ۔ اور نہایت ہی دل دہلانے والی آوازوں کے درمیان وہ غرق ہو گیا اور اُس کا سیاہ بت پتھر کا بنا ہوا اپنے بھائی کے پاس نمودار ہو گیا ۔ خس کم جہاں پاک ۔ کالا جوڑا اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا ۔

باب پنجم

جمیل کی کامیابی

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

کئی دن تک جمیل بیچارا بھائیوں کا انتظار کرتا رہا ۔ مگر وہ نہ آئے پر نہ آئے ۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اُن پر کوئی مصیبت آگئی ۔ مگر کیا کر سکتا تھا ۔ ایک سنار کے پاس نوکر ہو گیا ۔ سارا دن اُس کا

کام کرتا ۔ رات کو ایک مولوی صاحب سے مسجد میں کچھ پڑھنا لکھنا سیکھتا وہ بھی اُس کو پیار اور شفقت سے پڑھاتے تھے کیونکہ یہ ان کی بہت خدمت کرتا تھا ۔ اُس کی مصیبت میں کبھی کبھی خواجہ خضرؑ اُس کے خواب میں آکر اُس کو حوصلہ دیتے اور اس کو ڈھارس بندھا جاتے ۔ مگر چند روز کے بعد پھر بھائیوں کو یاد کر کے اور اپنی تنہائی اور بیکسی کا خیال کر کے روتا ۔ آخر کار اُس نے بھی اپنے بھائیوں کی تلاش میں جانے اور اپنی قسمت کو آزمانے کی ٹھان لی ۔ مولوی صاحب نے جب اُس کا یہ ارادہ پایا تو نہایت محبت سے پانی پڑھکر دیا ۔ اور دعائیں دیکر رخصت کیا ۔

اول اول اُس کا رستہ بھی ویسا ہی صعب اور دشوار گذار تھا ۔ وہ تو بھلا جوان ہٹے کٹے تھے یہ بچہ گرتا پڑتا جا رہا تھا ۔ برف کا ڈھیر آیا تو اُس کو بھی بہت ڈر اور خوف معلوم ہوا ۔ تھک کر یہ بھی لیٹا ۔ اپنا سب کھانا وغیرہ وہیں چھوڑ کر یہ بھی پانی کی بوتل لیکر چلا ۔ پیاس اُس کو بھی ایسی لگی کہ بے اختیار بوتل کھول منہ کو لگاتے تھا ۔ مگر اسی وقت اُس کو ایک پیر مرد پہاڑ سے ہانپتے کانپتے اترتے نظر پڑے ۔ پیاس سے بیقرار تھے ۔ اُس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر بولے دو بیٹا پانی ۔ جمیل نے فوراً بوتل اپنے لبوں سے ہٹا کر اُن کے منہ کو لگادی انھوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور دعائیں دیتے ہوئے آگے چلے ۔ خدا کی قدرت دیکھئے ۔ اب جمیل کا رستہ بہت خوشگوار اور سہل ہو گیا لیکن پھر بھی دھوپ کا وقت تھا ۔ جمیل کو پیاس پہلے سے جو تھی وہ تیز ہو گئی ۔ مگر بوتل میں پانی اب بالکل تھوڑا رہ گیا تھا اُس سے ذرا زبان ہی تر کرنا چاہتا تھا کہ زمین پر ایک نیم جان بچہ سسکتا ہوا دکھائی دیا ۔ اُس کی نظر اُس کی بوتل پر تھی ۔ اور ننھے ننھے ہاتھ جن میں کوئی سکت باقی نہ تھی اُس کی طرف کو اُٹھے تھے ۔ اُس کے نیلے ہونٹ ۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں ۔ لپکتا ہوا تالو دیکھ کر جمیل کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آئے ۔ فوراً اُس کے پاس پہنچ گیا ۔ اُس کو اُٹھا کر گود میں لیا اور بوتل کا منہ کھولکر اُس کے منہ کو لگادی ۔ اور بچہ غٹ غٹ پانی پی گیا ۔ اُس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ اُس نے یہ دیکھا وہ بچہ اُس کی گود میں سے کودا اور ہنستا ہوا پہاڑی سے نیچے بھاگ گیا جمیل اُس کو جاتے دیکھتا رہا جب وہ عین پہاڑی کے نیچے جا پہنچا تو جمیل کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ ایک ستارہ بنکر آسمان کی طرف چڑھ گیا ۔ وہ اپنے اس وہم پر ہنستا ہوا آگے چلا ۔

اب اُس کا رستہ تو گویا ایک باغ میں سے تھا ۔ ہر طرف پھولوں کی مہک پرندوں کے چہچہے

بادِ صبا کے جھونکے دل کو تروتازہ کر رہے تھے ۔ یہ سماں دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا ۔ مگر پیاس جو صبح سے لگی وہ ابھی تک نہ بجھی تھی ۔ باغ میں سب کچھ تھا مگر پانی کہیں نظر نہ آتا تھا ۔ بوتل کو دیکھا تو اس میں بھی ایک ہی گھونٹ باقی ہوگا اب صبر ناممکن تھا اور بوتل خودبخود منہ کو لگ چلی تھی کہ ایک کتے کا پیاسا سسکتا اور جان توڑتا ہوا دکھائی دیا ۔ بیقرار ہوکر جمیل نے بوتل کا تمام پانی اس کے منہ میں نچوڑ دیا ۔ پانی پی کر کتا تو غائب ہوگیا مگر وہی خواجہ خضرؑ اس کے پاس کھڑے تھے اور فرما رہے تھے ”شاباش بیٹا شاباش میں بہت خوش ہوں میں اس ندی کو حکم خدا سے خالص سونے کی کردوں گا میں تجھ کو بادشاہ بنا دوں گا ۔ دیکھ تیرے دونوں ظالم اور بے رحم بھائیوں کے جسم سیاہ پتھر کے ہوگئے ۔ دیکھ تو ہمیشہ خدا کی مخلوق پر رحم کرنا ۔“

جمیل نے دیکھا تو اب وہ خواجہ خضرؑ کے ساتھ سنہری ندی کے کنارہ کھڑا تھا ۔ اس کے دونوں بھائیوں کے بت سیاہ پتھر کے اس کے سامنے تھے ۔ اس کا دل بھر آیا ۔ اور روتا ہوا حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور عرض کی ان کے لئے دعا کیجیے کہ خدا ان کا قصور معاف کردے اور ان کو زندہ کردے ۔ مگر خواجہ خضرؑ نے کہا کہ نہیں اب قیامت تک وہ اسی طرح رہیں گے ۔ تو اپنا پانی ندی میں ڈال دے ۔

جمیل یہ پانی تو میں نے کتے کو پلا یا تھا ۔ اس کا جھوٹا ہے ناپاک ہوگیا ہے ۔ خواجہ خضرؑ ۔ بیٹا جو پانی پیاسوں کو پلایا جائے وہ ناپاک نہیں ہوتا ۔ یہ کہہ کر اپنے پاس سے دو پھول اس کو عنایت فرمائے جمیل نے وہ دونوں پھول اور بوتل میں جو چند بوند پانی تھا دریا میں ڈالا پھر کر دیکھا تو خضرؑ غائب تھے ندی تمام پھولوں سے بھری ہوئی تھی ۔ نہایت دلکش آوازیں چنگ و سرود کی اس میں سے آرہی تھیں وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ پھر حضرت خضرؑ کی آواز کان پڑی کہ وادی کے دوسری طرف جاؤ ۔ اس ٹیلے کے جس کے پاس وہ کھڑا تھا ۔ دوسری طرف گیا تو دیکھا کہ وادی دولت میں ہر طرف پھر اگلی سی بہار لوٹ آئی ہے ۔ ندی کا تمام پانی سچ مچ سونے کی چادر ہوگیا ہے ۔ وہ جب اپنے پرانے مکان کی طرف آیا تو ہر چیز کو ویسے ہی صحیح سلامت پایا جیسی کہ وہ سائیں جھکڑ شاہ صاحب کے اول مرتبہ آنے سے پہلے تھی ۔ ندی کا تمام سونا وہ مزدوروں سے اٹھا کر اپنے گھر لایا ۔ اس کو لوگوں پر خرچ کیا ۔ غریبوں کے لئے لنگر جاری کئے مدرسے قائم کئے مسجدیں بنوائیں ۔ تالاب کھدوائے ۔ اور جس طرح ہوسکا مخلوق خدا کی خدمت کی ۔

اب وہ ایک امیر کبیر ہوگیا تھا۔ اُس کی دولت کے سب لوگوں میں چرچے تھے اس کی نیکی اور شرافت زبان زد خاص و عام تھی۔ شدہ شدہ یہ خبریں بادشاہ کشمیر تک بھی پہنچیں۔ اُس کی ایک اکلوتی بیٹی تھی اس کے لئے بر کی۔ اس کو تلاش کی جمیل کی شکل عقل۔ دولت شرافت کو دیکھ کر اُس نے فوراً ہی اُس کی شادی کر دی۔ اور چونکہ اُس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے جمیل ہی اُس کے بعد بادشاہ ہوا۔ اُس نے بادشاہ ہو کر زین العابدین جمیل کا لقب اختیار کیا۔ اُس کی نیکیوں کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔ اُس کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں ثبت ہیں۔

اُس کے دونوں بڑے بھائیوں کے بت آج بھی ایک ندی کے عین منجدھار میں قائم ہیں جو لوگ اُدھر سے گذرتے ہیں اُن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں اور اُن کی حرکتوں پر نفرین کرتے ہیں۔

خدا ہم سب کو نیک اعمال کی توفیق دے۔ آمین۔

(ماخوذ از کنگ آف دی گولڈن ریور، زبان اسن)

مرگ آرزو

(از مولانا عبدالقدیر حسرت صدر شعبہ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ)

اے دلِ شیدا تجھے کیا چاہیئے
کچھ نہیں دیدارِ لیلیٰ چاہیئے

اے خیالِ روئے جاناں تو تو آ
کچھ تو جینے کا سہارا چاہیئے

چاہنے والا کہیں ملتا بھی ہے
چاہنے والے کو چاہا چاہیئے

وہ نہ آئیں گے نہ آئیں گے مگر
آرزو میں اُن کی مرنا چاہیئے

جان دینے کا محبت نام ہے
عشق کرنے کو کلیجا چاہیئے

کیا ڈراتے ہو گناہوں سے مجھے
بخشنے والے کو حیلہ چاہیئے

وقتِ آخر حسرتِ بیچارہ کے
سامنے شاہِ مدینہ چاہیئے

مشاہیر مفکرین عالم



وسط میں یونان کا مشہور عالم شاعر ہومر ہے جس کے دائیں جانب
دائی عدا عورت سو وانتس (اسکیس) ہومر (ہیراس) اور بائیں جانب
میں ۔ بائیں جانب کیا ۔ اثر ۔۔۔ ہے اس کے بار وہاں ۔۔۔
(جرمنی) اور ۔۔۔ زیادہ ہیں۔

Chandrakanth Press, Hyd -(Dn) - 23-7-30—C 300

انتظارِ دوست

(از جناب محمد معین الدین رہبر فاروقی دارالعلوم ہائی اسکول حیدرآباد)

خدا جانے تو کہاں چلدیا ۔

ہیں مدت سے ترے انتظار میں چشم بہ راہ ہوں ۔ مگر تو نہیں آتا صبح سے شام تک میں ترے انتظار میں رہتا ہوں جبتک کہ آسمان کے نیلے سمندر سے ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی روشنی کی ایک لہر کنارۂ مشرق سے اٹھتی ہے اور آہستہ سے اُبھرتی ہوئی آگے کو تیرتی آتی ہے ۔ سجادہ نشین ماہ بھی ستاروں کی تسبیح ختم کر کے عبادت خانۂ مغرب میں منھ چھپا رہا ہے ۔ دوشیزۂ صبح اپنی شرمگین نگاہوں کے ساتھ فلک کے پردے سے جھانک رہی ہے ۔ ستارے چاند کی طرف رقیبانہ نظر ڈالتے ہوئے غائب ہوتے جاتے ہیں ۔ اور صبح کا ستارہ اپنی البیلی اور مستانہ اداؤں سے بام آسمان سے سر نکالے کسی کی دید کا نظارہ کر رہا ہے لیکن شاہنشاہ جہاں تاب خسرو خاور کی آمد آمد کے خوف سے تھرا تھرا کر چپکے چپکے روپوش ہوا جاتا ہے ۔ صبح ہو چکی ہے ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں ۔ بادِ صبا سمندِ ناز پر سوار ہو کر محوِ خرام ہے روشنی دم بدم صحنِ عالم میں پھیلتی جاتی ہے ۔

اے دوست تو بھی آ ۔ اور اس جنت نشان منظر کو دیکھ ، میں اکیلا ہوں ، میں تنہا ہوں ، دیکھ یہ پیارا پیارا نورانی وقت گذر رہا ہے ۔ یہ سب چیزیں تجھ بن بے مزہ نظر آتی ہیں ۔ اگر تو نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو مجھے کچھ رنج نہیں ، تو اپنے کھیلنے کا مقام بتلا ، تا کہ میں وہیں آکر تیرے ساتھ کھیلوں ، تیرے ساتھ ہنسوں تیرے ساتھ بولوں ، کیا تو میری آواز کو نہیں سن رہا ہے ؟ دیکھ اس تیری فرقت میں میری روح سوگوار ہے آنکھیں اشکبار ہیں ، چشم حسرت تیری دید کے لئے وا ہیں ۔ آ ، ذرا دیکھ کچھ تو تسلی دے ۔

میں پُرنم چشم سے اس نور بھرے عالم کی دید میں محو تھا ، کہ یکایک جس طرح ماں اپنے بلکتے ہوئے بیمار بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے ۔ اور اُس کا رونا کم ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جو رحمت کے خاص پر لگا کر فردوس بریں کی سیر کرتے دور دراز فاصلوں سے پرواز کرتے ہوئے آیا تھا ، میرے افسردہ دل اور سُست رگوں میں جان ڈالتے ہوئے ، پیشانی پر ایک نرم نامحسوس

نھپک کا نشان چھوڑ کر چلا گیا' میں چونک کر بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا ۔ اور مسکرایا ۔
میں پھر بھی تیرا انتظار کرنے لگا ۔
خدا جانے تو کہاں چلا گیا ؟
دیکھ ! میں تیری یاد میں تڑپ رہا ہوں ۔ ابھی تک تیرا انتظار باقی ہے ۔
فلک پر اودی اودی گھٹائیں بھی چھانے لگیں، کالے کالے بادل ایک خاص شان سے فلک پیمائی میں مصروف ہیں' اونچے اونچے پہاڑ جو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کس قدر دلفریب مناظر پیش کر رہے ہیں ۔ ان کی چوٹیوں پر کی برف ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا کہن سالگی کی وجہ سے کسی کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں' ہوا خراماں خراماں' ننھے ننھے درختوں سے ٹکراتی ہوئی گذر رہی ہے ۔ فضائے زمین خاموشی کا تصور کیا چاہتی ہے، شجر و حجر مست اور کسی سوچ میں چپ چاپ کھڑے ہیں ۔

میں اس وقت اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا' سورج کی کمزور کرنیں مجھ پر پڑ رہی تھیں، صبح سے میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا ۔ ایک پُر حسرت ماضی کی یاد اور ایک دھندلے ناقابل اعتماد مستقبل کی امید نے (جو ناامیدی سے بدتر ہوتی ہے) دن بھر کے مطالعہ کی کلفت اور زیادہ بڑھا دی تھی اب میں نے ایک لمبی سانس لی ۔ اور کتاب کو آہستہ سے بند کر کے تھکا ہوا پژمردہ چھت پر نکل آیا ۔

میں نے اپنی افسردہ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں' دامن مقصد پھیلا کر عرش ہلا دینے والی دعاؤں کا تانتا باندھ دیا ۔ میرے پُر ارمان چشم سے اشک حسرت رواں ہو کر میرے دامن پر گر رہے تھے میری مضطر آنکھ پھر کسی کے دید کی مشتاق تھی ۔ گریاں و نالاں جناب ایزدی میں یہ التماس کرنے لگا ۔

اے میرے پیارے خدا ! بجلی میں چمکنے والے ۔ چاند میں جھلکنے والے ۔ رات کے اندھیرے دن کے اُجالے' سورج کی روشنی آسمان کی بلندی' دریا کی روانی' جنگل کی خاموشی دلگیری و دلداری کے مالک ! بجلی کی کڑک' بادلوں کی گرج میں اپنی عظمت و بزرگی کی شان دکھلانے والے' تجھے کچھ میرا احساس ہے کہ نہیں ؟ کیا میرا دوست پھر مجھ سے نہ ملے گا' آہ ! وہ کدھر چلا گیا ۔ وہ کہاں مقیم ہے ۔ میں پھر اس سے ملنا چاہتا ہوں ۔ کیا میری گریہ' وزاری' آہ و بکا فضول ہے ۔ ؟

تھوڑی دیر بعد' معلوم نہیں کہ یہ آواز میرے کان میں کدھر سے آئی ؟ اور کہنے والے نے

یہ کہا۔

اے نادان لڑکے توکس کا انتظار کرتا کھڑا ہے؟ تجھے کس کی یاد ستارہی ہے؟ وہ ایک نامعلوم سرزمین کو چلا گیا، اور کبھی نہیں آئے گا" وہ آواز یہ کہتی ہوئی مدھم پڑ گئی۔

"وہ جو موت کی پُرامن سرزمین میں داخل ہو چکا ہے کبھی دنیا کے شور و شر اور ہنگاموں اور بکھیڑوں میں پھر داخل نہ ہوگا۔"

جذبات ماہر

(از جناب محمد عبدالکریم صاحب ماہر)

(۱) اغیار کی بہی خواہی

پردے میں سپیدی کے سیاہی تو نہیں
بالغ نظری میں نقص کم نگاہی تو نہیں
اغیار بہی خواہ نظر آتے ہیں
منظور کہیں میری تباہی تو نہیں

(۲)

الٰہی کشتِ غم کا کیوں مجھے حاصل نہیں ملتا
ہوئی مدت کہ مضطر ہوں مہِ کامل نہیں ملتا
وہ ملتا ہے کبھی تو کیا نگاہیں تک نہیں ملتیں
نگاہیں مل بھی جاتی ہیں تو ماہر دل نہیں ملتا

(۳) عید

لیکے مژدہ خوشی کا آئی عید
سب نے جی کھول کر منائی عید
جملہ سامانِ عید غیروں کا
عید اپنی تو ہے پرائی عید

(۴) وصل

فرقت میں کسی کے روتے رہنا اچھا
منہ اشک سے اپنے دھوتے رہنا اچھا
ممکن ہو اگر خواب میں وصل محبوب
واللہ ہمیشہ سوتے رہنا اچھا

(۵) مذہب و عقل

کیوں غیر کی اتباع کرنا سیکھیں؟
کیوں دانش حاضرہ پہ مرنا سیکھیں؟
مذہب کو جو زیرِ عقل رکھنا چاہیں
وہ نفس کو زیرِ عقل کرنا سیکھیں۔

(۶)

دکھ جائیں اگر پھول کہیں چن لیجئے
ممکن ہے کہ حق بات کہوں سن لیجئے
منظور ہے مذہب کی تمھیں گر اصلاح
تو پہلے ذرا عقل کے ناخن لیجئے

قوم توارج

(عورت کا درجہ اُن کی معاشرت اور ادب میں)

(از جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل ہائیکورٹ)

توارج کے ممالک ۔ طبقات ۔ حروف ابجد ۔ ادب ۔ حیات معیشت ۔

قوم توارج شاید دنیا کی نادر اقوام میں سے ہے جو جنوبی جزائر اقصیٰ میں رہتی ہے ۔ اور اس میں بعید وحشت وندرت پائی جاتی ہے ۔ اس قوم کے ایسے عادات و اخلاق ہیں جو میرے خیال میں کسی اور قوم میں نہیں پائے جاتے ۔ اصل و نسل کے لحاظ سے یہ ایک بربری قوم ہے لیکن بلاد مغرب کے تمام بربری قبائل سے علیحدہ ہے ۔ یہ قوم مسلمان ہے اس کا مذہب اسلام ہے باوجود اس کے مسلمانوں سے علیحدہ اور مختلف ہے یہاں تک کہ یہ اختلاف اصول دین میں بھی پایا جاتا ہے ۔

بلاد اسلامی میں ہم تمام اہل فکر کو مسلمان عورتوں کے پردہ کے قضیہ میں مصروف پاتے ہیں لیکن یہ چیز توارج کے پاس بالکل برعکس ہے اُن کے پاس مرد پردہ دار و غیر آزاد ہیں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور عورت مطلق العنان ہے جہاں چاہے جا سکتی ہے مردوں کا یہ پردہ اور خاموشی بعض دفعہ ہمارے مفروضہ ادب ولیاقت کی حد سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے ۔ اگر توارج جزائر کا کوئی شعبہ ہوتے تو ضرور اُن کو اس کا علم ہوتا لیکن یہ ممکن ہے کہ یا تو اُن کو اپنے جزائری ہونے کا علم نہیں ہے یا وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے ہیں ۔ فی الحقیقت بجز جغرافیائی تعلق کے اس قوم کو جزائر سے کوئی علاقہ نہیں ۔ اُن کی زبان شلحی ہے جو موجودہ حالت میں اس بربری زبان کے لہجہ سے بہت دور ہے جس کو بربری قبائل جزائر میں استعمال کرتے ہیں ۔ اُن کے چہرے مستطیل ۔ لاغر ۔ گندم رنگ مائل بہ نیلگوں ہیں جو دوسرے بربری قبائل کے چہروں سے مشابہت نہیں رکھتے ۔ اُن کے قد سیدھے اور سوتواں ہیں دوسرے بربری قبائل کے قدوں کے مشابہ نہیں ۔

بعض لوگوں نے تاریخ توارج کی بلا لحاظ خطا و صواب نشر و اشاعت کی ہے اور کئے سال

سے امریکہ کا علمی مشن اُن کے ممالک میں گشت کرتے ہوئے بحث و تنقید کر رہا ہے اور اس نے اُن کے بعض پادشاہوں کے اہم ترین علمی و تاریخی آثار کا پتہ چلایا ہے۔ میں نے کسی کو تواج کی موجودہ حالت مکمل طور سے بیان کرتے نہیں دیکھا اس لئے مناسب سمجھا کہ ممکنہ کوشش سے تواج کی موجودہ اور سچی حالت اس طور سے بیان کی جائے جس سے امر واقعی کا اظہار ہو۔

(اس باب میں میری سند معلومات)

تواج کے متعلق میرے معلومات بالکل معمولی تھے اس لئے میں نے اُن کے واقعی حالات معلوم کرنا چاہا میں نے دیکھا کہ فرانسیسی ان ممالک کی گذشتہ حالت لکھتے ہیں لیکن موجودہ حالت نہیں لکھتے اور اگر لکھتے بھی ہیں تو بالکل قلیل اور سطحی ہوتی ہے اور یہ بھی جہت ہجار پر منحصر رہتی ہے اور یہی وہ جہت ہے جو فرانس کے زیر اقتدار ہے۔ بعض دفعہ فرانسیسی کاتب کسی چیز کے متعلق ایک یا دو تواج سے پوچھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں حالانکہ وہ بالکل خلاف واقعہ جواب دیتے ہیں کیونکہ تواج اجنبی یوروپین سے عداوت رکھتے ہیں اور اُن کو غیر ملکی اور سنگدل خیال کر کے قابل اعتبار نہیں سمجھتے تارجی بیان کرتے ہیں کہ فلاں فلاں یوروپین نے ہم سے یہ باتیں دریافت کیں اور فخریہ طور سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان یوروپینوں نے اُن پر اعتبار کیا لیکن انہوں نے اُن کو دھوکہ میں رکھ کر تمام غلط اور ملتبس جواب دئے۔ پھر فرانسیسی وہاں تھوڑے ہی روز ٹھہرتے ہیں اس قلیل مدت میں اُن کی حالت کا کافی مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے اکثر اُن کی خبروں پر بھروسہ نہیں کیا۔ البتہ اس بارے میں میرے فاضل دوست سید یحییٰ ابو شمن کے بیان پر اعتماد کیا جو جزائر کے ایک نوجوان ہیں اور بحث و تلاش کے بڑے دلدادہ ہیں۔ انہوں نے تواج میں کامل پانچ سال گذارے اس مدت میں ان کے احوال سے خوب واقفیت پیدا کی۔ پہلے انہوں نے اُن کی زبان سیکھی اور ان سے میل ملاپ کر کے ان کے عادات و کردار بھی اپنے میں پیدا کر لئے اور اُن کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ پھر تو یہ اُن کے پاس قابل اعتماد ہو گئے وہ اُن کو چاہتے ہیں اور یہ اُن کو۔ ہمارے دوست کا ارادہ ہے کہ تواج کے متعلق اپنے معلومات کو جمع کر کے فرانسیسی زبان میں شائع کرے اگر کوئی دوسرا شخص تواج کی نسبت ظن و تخمینی سے کوئی خبر بیان کرتا ہے تو ہمارے یہ دوست اس خبر کو اپنی ذاتی

واقفیت اور مشاہدہ سے بیان کرتے ہیں ۔

(توارج اور اُن کے ممالک)

توارج کے ممالک جزائر افصلے کے جنوب اور صحرا طرابلس کے غرب میں واقع ہیں یہ شہر بہت ہی پتھریلے اور غیر شاداب ہیں ۔ باعتبار قومیت کے یہ شہر دو حصوں میں منقسم ہیں یعنے بلاد ہکّار یا ہجار اور بلاد آزجر ۔ ہکّار کے رہنے والے غربی توارج اور آزجر کے باشندے شرقی توارج ہیں ۔ قدیم زمانے میں اُن دونوں شہروں میں باہم جنگ و جدال تھا جس کا سلسلہ آج تک بھی جاری ہے ۔ توارج کا نام لفظ تارجا سے مشتق ہے جو صحرا فزان باغات کا نام ہے جس کا پایہ تخت مزرک ہے ۔ یہ اب تک آزاد ہے اور آزجر کے شرق میں واقع ہے ۔ توارج اس نام سے اپنے آپ کو موسوم نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنا نام ایمہا فن رکھا ہے جس کے معنے لڑنے والے یا لوٹنے والے کے ہیں ہم اسی نام سے ان کی نفسیت کو سمجھ سکتے ہیں اس لئے کہ اُن میں طبعاً لوٹ مار کی عادت ہے ۔ دراصل یہ اُس بربری قوم کا ایک شعبہ ہے جو قدیم زمانہ میں لیبیا سے جزائر میں آئے ہیں جیسا کہ اکثر مورخین کا بیان ہے اور اُن کی رایوں کی تائید کافی دلائل سے ہوتی ہے جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے یہ رتانی نہیں ہیں کیونکہ کوئی دلیل اُن کے رتانی ہونے کی تائید میں نہیں ہے ۔

(اُن کی حیات و معیشت)

عام طور سے اُن کی زندگی اچھی ہے کیونکہ اس میں کوئی غم یا برائی نہیں ہے یا یہ کہ وہ زندگی کے غم و برائی سے واقف نہیں ہیں اُن کی یہ زندگی ساری اور فی الجملہ اخلاص و ایثار پر مبنی ہے ان میں کا ہر فرد قبیلہ کے افراد کے لئے اپنے آپ کو فنا کرتا ہے اس اعتبار سے وہ اپنے ذات کے لئے نہیں بلکہ فی نفسہ اپنے قبیلہ کے لئے زندہ رہتا ہے اور اسی وجہ سے ان میں کا ہر فرد مفید و غیر آزاد ہے لیکن اس تقید کے مراتب کے لحاظ سے ہر شخص اپنے میں رشک و سعادت ضرور پاتا ہے اُن کی معیشت بہت ہی تنگ ہے اس میں بجائے آسانی و ملائمت کے سختی و خشونت ہے جوار اُن کی بہترین غذا ہے ۔ اسی کو عام طور سے کھاتے ہیں اور اسی کو باورچیخانوں میں بھر کر رکھتے

ہیں اوراحتیاط سے آہستہ آہستہ کھاتے ہیں ۔ اُن کی مرغوب ترین غذا ستو ہے جو جوار ۔ کھجور ۔ پنیر سے بنا کر پانی یا دودھ میں ملاتے ہیں اگر یہ غذا اُن کے مسافرین کو ہے تو اُس کو سواری پر بیٹھے ہوئے کھاتے اور خوشی سے گاتے ہیں نیز اُس کو نعمت سمجھ کر خدا کا بیحد شکر بجالاتے ہیں ۔ یہ لوگ بنظر اقتصاد گیہوں نہیں کھاتے کیونکہ اس میں مصالح اور خوشبودار چیزوں کے مصارف عائد ہوتے ہیں باوجود اس سخت زندگی کے بعض دفعہ یہ انتہائی فاقہ کشی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسا قحط آتا ہے کہ غذا نایاب ہوجاتی ہے ۔ جوار ۔ گیہوں ۔ جو کچھ نہیں ملتے اور نہ کوئی کھانے کی چیز دستیاب ہوتی ہے پس بصورت مجبوری پالک اور بعض دوسرے نباتات اور درختوں کے جڑ کھاتے ہیں اور کھجور کی گٹھلیاں جلا کر پیستے ہیں اور اُس کو مستعملہ پانی اور پیاز میں ملا کر استعمال کرتے ہیں اس زمانہ میں اُن کی حالت بہت خراب ہوجاتی ہے اور بڑی تکلیف و مصیبت میں رہتے ہیں اُن کا یہ قابل رحم اور حسرتناک حال دیکھ کر کلیجے پاش پاش اور دل پانی پانی ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ تنگ حالی کو اپنے لئے باعث خوبی سمجھتے اور اس پر بہتر طریقہ سے صبر کرتے ہیں خوشحالی میں کم کھانے کی عادت اور عرصہ تک بھوکے رہنے کی مداومت کرتے ہیں اور یہی چیز اُن کے لئے باعث فخر ہے ۔

اُن کی بسر برد کا ذریعہ گیہوں ۔ جو ۔ جوار ۔ بعض میوہ جات اور ترکاریوں کی زراعت ہے ۔ بجز کھجور کے ان تمام چیزوں کو چھوٹے حوضوں میں بوتے ہیں اور اُن کو کوؤں سے پانی دیتے ہیں ۔ مرد ڈول سے پانی کھینچ کر جھاڑوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس پانی کو ایک حوض سے دوسرے حوض میں پھیرتی ہے اُن کے بعض شہروں میں بہتے چشمے ہیں لیکن یہ اُس قوم میں شادابی اور ارزانی پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ۔ یہ لوگ شکار کے بڑے گرویدہ ہیں اور اُس کو انہوں نے حرفہ قرار دیا ہے ٹڈی کا خشک و تازہ گوشت کھجور کے بدلے اور کٹائی کے زمانہ میں جوار کے معاوضہ میں فروخت کرتے ہیں یہ بھی اُن کا ایک ذریعہ بسر برد ہے ۔

جس فصل میں یہاں شادابی اور ارزانی ہوتی ہے وہ فصل خریف ہے جبکہ کھجور کے درخت پھولتے اور پھلتے ہیں اور جوار تیار ہوتی ہے اور اُس کے کاٹنے کا زمانہ آپہنچتا ہے اس فصل میں یہ لوگ خوب سیر ہوتے ہیں اور اسی میں تجارت ہوتی ہے ۔ غربی سوڈان ۔ تورت و ہکار سے کپڑے ۔ کتان ۔ چاول ۔ شکر بیکہ قافلے آتے ہیں ۔ اسی فصل میں اُن کے پاس شادیاں اور خوشیاں زیادہ ہوتی ہیں ۔

اس قوم کے طبقات

اس کے تین طبقے ہیں جو ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔ (۱) آمنوکال۔ یہ بادشاہاں ہیں (۲) ایہگاروں۔ یہ جنگجو اور اشراف ہیں (۳) ایمغاد۔ یہ بازاری اور عام لوگ ہیں۔

آمنوکال یہ ایسا لفظ ہے جس میں مفرد و غیر مفرد دونوں برابر ہیں۔ اس کے معنے صاحب بلاد یا صاحب نقارے کے ہیں کیونکہ ان کے بادشاہ ایک بڑا نقارہ رکھتے ہیں جو ضرورت کے وقت دو اونٹوں پر اٹھایا جاتا ہے اُن پر دو حبشی ہوتے ہیں جو عوام کے اجتماع کے لئے اس نقارہ کو بجاتے ہیں۔ ان میں بادشاہت وراثتاً چلتی ہے ولی عہد بادشاہ کا بھانجہ ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ بادشاہ کے قبیلہ کے سوا کسی اور قبیلہ کا کیوں نہ ہو لیکن بادشاہ کا بیٹا ولی عہد نہیں ہوسکتا۔ بادشاہ کی وراثت یا قبیلہ کی سرداری وراثت میں ایک دوسرے مسئلہ کی تابع ہے وہ یہ کہ اُن کے پاس شرعی وارث بھانجہ ہے جو اپنے ماموں کے ملک و اسباب کا وارث ہوتا ہے۔ بیٹا اپنے باپ کا وارث صرف اثاثہ اور جانوروں کی حد تک ہے۔ اس وقت ان کے ملک پر دو حاکم ہیں ایک قبائل ہگار پر ہے۔ یہ قبیلہ بڑا ہے اور کیل غلا کے نام سے موسوم ہے اس کا پایہ تخت تمنغست ہے یہ ان دنوں فرانس کے تقریباً زیر حمایت ہے۔ دوسرا حاکم قبائل آزجر پر ہے۔ یہ قبیلہ ایوراغن اور آواریغ سے ہے اس کا پایہ تخت غات ہے اُس کے ممالک اب تک آزاد ہیں۔ قدیم زمانہ میں قبیلہ ہگار و آزجر میں جنگ و دشمنی تھی جو آج تک باقی ہے۔ قبیلہ ہگار تعداد اور سامان کے لحاظ سے بڑا ہے قبیلہ آزجر کے لوگ لڑائی میں بڑے ہی صبر سے مقابلہ کرنے والے ہیں۔

آزجر کی غربی جہت میں ایک تیسرا قبیلہ آمنوکالیہ ہگار تھا جسکو فرانس نے آمنوکالیہ ہگار میں ضم کردیا ہے کیونکہ آمنوکالیہ فرانسی حمایت سے راضی نہیں تھے یہی بنی ایمنان کی آخری اولاد ہیں جنہوں نے اسی قبیلہ آمنوکالیہ پر تین قرنوں تک حکومت کی ہے۔ اور بعض دفعہ پورے ممالک تواج پر ان کا اقتدار رہا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے شہر اجانت کو بنایا جو آمنوکالیہ کا پایہ تخت ہے یہ شہر خوشنما پہاڑوں اور سرسبز و بارونق وادیوں اور اپنے قدرتی لطیف منظروں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں اور آنکھوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ تواج کے تمام شہروں میں یہی ایک شہر اچھا ہے۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ کھجور کے تمام درخت جو شہر جانت میں ہیں سب وقف ہیں۔ جن کی بیع و شرے نہیں کیجاسکتی۔ شہر والے کھانے کے لئے لے لیتے ہیں۔ (ان درختوں کو

بیچتے ہیں اور نہ پھل کو، جس کو غلہ کی ضرورت ہو بلا معاوضہ ان درختوں کے کھجور لے لیتا ہے اُن باغوں کی زمین جن پر یہ درخت ہیں آج تک آمنوکال ہکّار کی ملک ہے۔ جانت کا حاکم ان درختوں کی نگرانی کرتا ہے اور شہر والوں میں سے جس کو چاہتا ہے کھجور دیتا ہے اور جس سے چاہے واپس لیتا ہے لیکن اس حاکم کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی ذات کے لئے یا آمنوکالیہ کے واسطے کھجور لے یہی حال بنی ایمنان کے عہد میں بھی تھا اور گمان یہ ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے جانت اور آہریر کے کھجور کے درختوں کو انہی دو شہروں کے باشندوں کے لئے جو اُن کے حلیف تھے مخصوص کر دیا تاکہ اُن کو بے بہرہ کر کے اُن کے مال و متاع کو چھین نہ لیا جائے۔ یا اس خوف سے کہ اگر یہ اُن کے کھجور کے درخت بیچ ڈالیں تو فاقہ کشی کی وجہ سے قتل و غارت نہ کریں۔ قوم ایمنان کا ذکر یہ لوگ بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ آمنوکال جانت کے بادشاہ کو اگرچہ فرانس نے نکال دیا ہے اور اُن کو ہکّار سے ملحق کر دیا ہے۔ تاہم یہ لوگ باعتبار عصبیت اور حلیف ہونے کے خود کو قوم آزجر سے سمجھتے ہیں اور آمنوکال غات کے ساتھ بڑی عاجزی سے پیش آتے ہیں اور ایمنان کے بعد انہی کو آمنوکالیہ شرعی شمار کرتے ہیں۔

طبقہ ایہگارن۔ یہ جنگجو لوگ ہیں جو شخصی سلطنت میں بادشاہوں کی طرح ہیں۔ یہ بہادر لوگ ایمغاون کو جو بازاری اور عام طبقہ سے ہیں اپنے غلام سمجھتے ہیں ان کے متعلق کسی ذمہ کا پاس نہیں رکھتے۔ یہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں اُن کی زندگی کا دار و مدار ایمغاون پر ہوتا ہے یہ لوگ بزرگی کے لحاظ سے نہیں بلکہ بادل ناخواستہ اُن کی ضروریات کی مال و متاع وغیرہ سے خبرگیری کرتے ہیں۔ ایہگارن بازاریوں کے اونٹ غصب کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور ان کو جبراً اپنے ساتھ تجارتی سفر کو لیجاتے ہیں یہ بہادر لوگ کوئی پیشہ یا زراعت نہیں کرتے اور نہ کوئی ملک یا زمین کے یہ مالک ہیں بلکہ یہ تمام چیزیں انہوں نے بازاریوں کے لئے چھوڑ دی ہیں جن میں یہ لوگ محنت و مشقت سے کام کرتے ہیں، جب جانت در بار آور ہو جائیں تو بلا کسی محنت و معاوضہ کے حسب ضرورت بطور غنیمت کے لے لیتے ہیں، ان مظالم سے یہ لوگ تنگ آ گئے ہیں لیکن اب تک ان کے لئے اس سے کوئی مفر نہیں۔ فرانس اگرچہ تمام ہکّار اور آزجر کے آمنوکالیہ جانت کا مالک ہے مگر اپنے مفاد کے خیال سے ان بدیہی مظالم کو رفع نہیں کر سکتا کیونکہ اگر یہ تو ارج پر سختی کرے تو تمام لوگ شہروں کو ویران چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

تمام بہادر لوگ جنگل میں رہتے ہیں اُن کے نزدیک تمام شہری لوگ بازاری ہیں جنگل کے

بازاری لوگ شہریوں سے زیادہ بہادر ہیں ۔ ان جنگجوؤں میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو چند اونٹ اور دیگر جانوروں کے مالک ہیں اس لئے کہ کسب ، پیشہ ۔ بلکہ ان بہادروں کے نزدیک عار عظیم ہے البتہ ایک پیشہ ہے جس کو وہ ذرا بھی خوار نہیں سمجھتے اور وہ لوٹ و غارتگری ہے جس کو وہ اپنے بزرگوں سے وراثتاً کرتے چلے آتے ہیں ۔ اگر کسی کا باپ بڑا غارتگر اور لٹیرا ہو تو اُس کے بیٹے پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی مشابہت میں خود بھی لٹیرا اور غارتگر بنے اُس کے سوا باپ کی کسی اور صنعت کی اتباع نہ کرے کیونکہ لڑکا شرافت و رذالت میں اپنے باپ کا نہیں بلکہ اپنی ماں کا تبع ہوتا ہے جس کی ماں بہادر اور شریف ہو اُس کا لڑکا بھی بہادر اور شریف ہوگا اگرچہ اس کا باپ حبشی اور رذیل کیوں نہ ہو اسی طرح جس کی ماں رذیل ہو اس کا بیٹا بھی رذیل ہوگا اگرچہ اس کا باپ بہادر یا آمنوکال کیوں نہ ہو ۔ اُن کے پاس نسبی شرافت و رذالت کا اعتبار صرف ماں کی طرف سے ہے یہ اپنا انتساب باپ کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف کرتے ہیں اور اپنے ماں ہی پر فخر کرتے ہیں جیسا کہ عربی شاعر فخر کرتا ہے ۔ فرزاق کا قول جس میں وہ اپنے آبا پر فخر کرتا ہے اُن کے نزدیک بالکل بیکار ہے ۔

بعض فرانسیسی علما کا بیان ہے کہ پہلے توارج میں جنسی تعلقات ایسے تھے جن میں باپ متعین طور سے معلوم نہیں ہوتا تھا ۔ اسی کے آثار باجیہ میں سے ایک اثر یہ ہے کہ اب بھی تواج ماں سے انتساب کرتے ہیں لیکن اس دعوی کے ثبوت میں کوئی ایک بھی علمی دلیل بیان نہیں کی گئی میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی البتہ انسانوں کے سوا حیوانات کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے جن میں بچہ باپ کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف منسوب ہوتا ہے لیکن ہم مستقبل میں اس امر کا انتظار نہیں کر سکتے کہ یہ بچہ بجائے ماں کے باپ کی طرف منسوب ہو ۔ تاریخ تواج میں فرانسیسی عالم کے اس بیان کا کہیں پتہ نہیں چلا بلکہ ہم نے تواج کا گذشتہ زمانہ موجودہ زمانہ سے زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہونا تاریخ میں دیکھا ہے سچ تو یہ ہے کہ مرد پر عورت کے حاکم ہونے اور تمام دنیا کی اقوام کے خلاف امر و نہی عورت کے ہاتھ میں ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے ۔ اُن کے پاس کوئی قبیلہ آبا و اجداد میں سے کسی ایک کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ اُس پہاڑ یا وادی کی طرف منسوب ہوتا ہے جو اُن کا وطن ہے جیسے (کیل زواوانن) اُس کے معنے وادی زواوانن کے ہیں اسی طرح (کیل اہیہرو) اُن کے پاس تمام قبائل و شعوب کے اسمار کا بھی یہی حال ہے ۔

(اُن کے حروف ابجد اور آبو)

اُن کے خاص حروف ابجد ہیں جن سے شلحی زبان میں مکتوب لکھتے ہیں، اور اُس کا نام "تفناق" ہے یعنی "فنیقیہ"، یہ خاص فنیقیہ کے حروف ابجد ہیں مگر ان میں طبعاً کچھ کمی زیادتی یا تغیر ہوا ہے، وہ اس سے واقف نہیں ہیں بلکہ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں اُن کی ایک شاعرہ عورت نے یہ حروف ابجد اختراع کیئے ہیں۔ یہ لوگ لفظ "تفناق" کا مفہوم اپنی زبان کے حروف ابجد کا علم سمجھے ہوئے ہیں۔ اس حروف ابجد کو عربی کی طرح سیدھی جانب سے بائیں اور بائیں جانب سے سیدھے جانب یا دونوں طریقہ سے ایک ساتھ لکھتے ہیں جیسا کہ اُس کی مثال آئیگی یہ کتاب ایک سطر ہوتی ہے جو صفحہ میں سیدھی جانب ہو کر بائیں جانب لوٹتی ہے یا اسی طرح اوپر سے نیچے یا بالعکس یا ایک ساتھ دونوں طریقوں سے لکھتے ہیں۔ عورتیں ہی ان حروف کو لکھتی پڑھتی ہیں اور اُن کی ہر عورت تفناق سے بخوبی واقف رہتی ہے بخلاف اس کے آپ اُن کی کوئی عورت ایسی نہ پائیں گے جو عربی پڑھتی یا گفتگو کرتی ہو۔ عورتوں کی توجہ عربی کی طرف نہیں بلکہ اپنی بربری زبان کی طرف زیادہ ہے۔ مردوں میں بہت ہی کم لوگ تفناق جانتے ہیں مرد ہی عربی زبان سے واقف ہیں یہی قرآن پڑھتے ہیں اور مسائل دین سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

کوئی کتاب اُن کی زبان اور اُن کے حروف میں لکھی ہوئی نہیں ہے جس کو یہ پڑھتے یا پڑھاتے ہوں البتہ بعض رسائل جو فصاحت و بیان کے اعلیٰ مثال ہیں بطور تناقل استعمال کرتے ہیں اور انہی کے اسلوب بیان کو نمونتاً کام میں لاتے اور انہی کے طرز و طریقہ کو اپنی گفتگو میں جگہ دیتے ہیں یہ مخصوص خط وہ ہیں جن کو اُن کی عورتوں نے اپنے معشوقوں کو لکھا ہے جن میں اپنے دلوں کی آشفتگی اور اُس کی تکلیف و اضطراب کی شکایت ہے۔ ان رسائل کا اسلوب بالکل فطرتی ہے اُن کی ابتدا لکھنے والی کے نام سے ہوتی ہے اُس کے بعد مکتوب الیہ کا نام درج ہوتا ہے۔ اُن کی بلاغت میں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جس کلمہ کے معنے کی تاکید مراد ہوتی ہے اُس کی تکرار کرتے ہیں اور جس کلمہ کی تکرار کی جائے وہ تاکید میں بہت ہی ابلغ ہوتا ہے۔ اسی قسم کی تاکید کے لئے بعض دفعہ کلمہ کی دس سے زیادہ مرتبہ تکرار کی جاتی ہے اُن کے پاس اور بھی اعتبارات ہیں جن سے کلام کے مدارج میں امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔ بمقابل نثر کے نظم کا حصہ اُن کے پاس زیادہ ہے۔ اُن کے شعر چند ابیات کے مقطوعات اور طویل قصائد اور منظومہ

روایتوں کے خرافات ہوتے ہیں اُن کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سادے اور فطری ہوتے ہیں ان میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں ہوتی اُن کے اشعار اُن کے نفوس اور مختلف تاثرات اور جذبات واحساسات کے واضح تصویر ہوتے ہیں اُن کے پاس شعر کے اہم ترین اغراض دلیری ۔ مدح ۔ غزل تشبیب ہیں تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غزل وتشبیب عورتوں کے ہوتے ہیں اور عورتیں ہی مردوں سے تشبیب کرتی ہیں اور عورتیں ہی عورتوں کی مدح کرتی ہیں ۔ میں آپ کو ایک نادر بات کہتا ہوں وہ یہ کہ تمام قبائل کے خلاف ان میں صرف عورتیں ہی شاعر ہیں کوئی ایک مرد شاعر نہیں پایا جاتا ۔ شاعر عورت کا اُن کے پاس بڑا مرتبہ ہے ۔ یہ جہاں جائے اُس کو سب آگھیرتے ہیں اُس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور اُس کی تعظیم وتکریم میں جلسے کئے جاتے ہیں ۔ اشعار کی قدر ومنزلت کے لحاظ سے ہر شاعرہ کے کلام کی روایت کرنے والی عورتیں ایک یا دو یا اس سے زیادہ ہوتی ہیں ۔ ہر قبیلہ اپنی شاعرہ عورتوں پر فخر کرتا ہے ۔ بعض دفعہ مختلف قبائل کی شاعرات جمع ہو کر اشعار پڑھتی ہیں اور فصاحت وبلاغت پر باہم فخر کرتی ہیں اُن کے پاس اسباب فخر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شاعرہ اپنے شعر میں غریب ونادر الفاظ کثرت سے استعمال کرے جس سے اپنے ساتھیوں پر تفوق وفضیلت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ اُن کے نزدیک بلاغت ومعجز بیانی کی ایک دلیل ہے اور شاید یہی صرف اُن کے اشعار کی صنعت ہے ۔ اُن کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اُن کی زبان میں فاطمہ بنت اغنیس نے شعر کہا اور اسی نے حروف ابجد سب سے پہلے (تفناق) سے کتابت شروع کی یہ وہ عورت ہے جس کی کمر کو کوئی شخص سولہ قرش مہر دئے بغیر نہیں چھو سکتا ۔ کمر چھونا اُن کے پاس کنایتاً شادی کرنے کو کہتے ہیں کیونکہ اُن کے عرف میں ہر مرد سب سے پہلے عورت کی کمر چھوتا ہے اُن کے پاس اس مقدار کا مہر پیش کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح ہم میں سے کسی شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی زوجہ کے مہر میں کوئی سلطنت دیدے ۔

تماجی زبان اور اس کا ادب باسلوب و خیال سب محض بربری ہیں برخلاف اس کے جزائر کے دوسرے بربری قبائل کی زبان میں عربی کا بہت بڑا حصہ شامل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ایک مخلوط عربی بربری زبان بن گئی ہے ۔ گو آپ بربری زبان سے واقف نہ ہوں تاہم اگر اس زبان کو سنیں تو پوری طرح سے سمجھ جائیں گے کیونکہ اس میں عربی اور بربری الفاظ عام عربی ترکیب میں مستعمل ہوتے

ہیں ۔ بربریوں کا جس قدر امتزاج عربوں سے بڑھتا جائے گا اسی لحاظ سے تھوڑے دنوں میں زبان پر بربریت کا اثر باقی نہیں رہے گا ۔ تارجی زبان ترکیب اور حروف معانی کے لحاظ سے عربی سے علیحدہ اور مستقل زبان ہے ۔ اس میں اکثر اسماء اشخاص اور اسماء عدد ایک سے ہزار تک سب بربری ہیں ۔ یہ لوگ عربی لفظ کو استعمال نہیں کرتے مگر ضروری صورت میں مسلمان کلمہ شہادت وغیرہ بربری تلفظ میں ادا کرتے ہیں یہ لوگ (سیدنا محمد) خامخمہ سے کہتے ہیں لیکن اس سے مراد (سیدنا محمدؐ) ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے الفاظ ہیں ۔

توارج کے حروف ابجد جس کے مقابلہ میں عربی حروف ابجد لکھے ہوئے ہیں ۔

		م	ᑕ		ا	
		ن	I		ب	⵷D
(یہ شلحی نون ہے جس کے مقابل عربی میں ایسا نون نہیں ہے)		ن	⁚		ت	+
					ج	ⵊ
		ظ	ⵟ		خ	::
		غ	⁝		د	ⵙ
(ف کے دو شکل ہیں)		ف	I / ⵊ		ز	X
		ق	..		ز (زاء معجمہ)	#
		س	ⵙ		ط	E
		ش	ⵛ		ر	V
ی	ء	ہ	⁝		ک	⁘
ج	ہ	و	⁑		ل	II

روپیہ کی سرگذشت

(از جناب عبدالمجیب صاحب صدیقی)

انگلستان کا مشہور انشا پرداز و مضمون نگار جالسف ایڈوسن کے مضمون (Adventure of A Shilling) کو پڑھکر یہ مضمون لکھا گیا ہے اس میں اس مضمون کے خلاف مشرقیت کو پیش کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔ ایڈوسن کے مضمون میں مغربیت ہے اور یہاں مشرقیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔" (عبدالمجیب)

"انسانوں کا خیال ہے اور خیال باطل ہے کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ اگر میں اپنی سرگذشت شروع سے اخیر تک سناؤں۔ اپنی سوانح حیات پیدائش سے اب تک بیان کروں تو حضرت انسان انگشت حیرت در دہاں ہوجائیں تمام شیخی کرائی ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ میں نے انسان کے مقابلہ میں کتنے مہم طے کئے ہیں کتنے سفر کئے ہیں اور کتنے اچھے اور برے کام کرگذرا ہوں۔ اگر کچھ شک ہو تو چلئے سن لیجئے۔

وہ میں سنہ ۱۳ ھ میں بمقام حیدرآباد فرخندہ بنیاد پیدا ہوا۔ کچھ دنوں خاموش اس ہی مکان کے ایک حصہ میں جس میں میں پیدا ہوا تھا پڑا رہا پھر وہاں سے بہت جلد ایک دوسرے مکان میں نہایت احتیاط و کافی سے زیادہ حفاظت کے ساتھ منتقل کردیا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میرے کئی ہم جنس قید کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں میں بھی اُن میں شریک ہوگیا لیکن نہ میں جانتا تھا کہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی گئی ہے اور نہ کوئی ساتھی ہی جانتا تھا پھر بھی میں اس وجہ سے فخر کرتا تھا کہ یہ شاہی خزانہ تھا۔ فوجی سپاہی میری پاسبانی کرتے نظم جمعیت کے عروب چوکی دیتے۔ پولیس باری باری پہرہ دیتی صبح و شام سلامی ہوتی اور میں یقین رکھتا تھا کہ ایک دن بڑی شان کے ساتھ یہاں سے روانگی عمل میں آئیگی الحمدللہ کہ شمسی مہینہ شروع ہوا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں تقسیم ہونے لگیں وظائف بٹنے لگے میری قسمت میں یہ نہ تھا کہ تنخواہ یا وظیفہ میں دیا جاؤں لیکن یہ کیا کم تھا کہ میں ایک منصبدار کی منصب میں اور دس ساتھیوں کے ساتھ دیا گیا۔

''میری سرگرمیوں کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ منصبدار اور داروغہ مشہور ہیں حضرت نے جیسے ہی منصب پائی موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے روانہ ہوئے گھر تک گئے سیدھے سبندہ خانہ پہونچے مجھ کو کال کے ہاتھ میں رکھا کچھ پیٹ بھرا کچھ جیب بھرا وہاں سے روانہ ہوئے تو اس رات وہیں رہا دوسرے روز صبح میں قصائی کی دوکان گیا۔ وہاں سے مختلف ہاتھوں میں پہونچا کبھی تاجر پارچہ کے یہاں گیا تو کبھی جنرل مرچنٹ کے غلہ میں پہنچا کبھی باغبان کے پاس گیا تو کبھی میوہ فروش کی دولت میں اضافہ کیا کبھی دال کی قیمت بنا تو کبھی چاول مجھ سے خریدے گئے شراب مجھ سے پی گئی دیسی شراب کا مزا چکھا ولایتی شراب کے مزے اڑائے کوئی ریسٹورنٹ۔ کوئی ہوٹل۔ کوئی کیفے ایسی نہ تھی جہاں میں نے اس کے لذیذ کھانے نہ اڑائے ہوں اور عمدہ عمدہ شربت و کون ڈرنک نہ پیے ہوں غرض تین سال کے اندر میں نے ملک کا پورہ دورہ کر لیا کبھی اسپیشل ٹرین میں رہا تو کبھی میل میں کبھی اسپرس میں سفر کیا تو پاسنجر گاڑی میں۔ بہرحال دورہ کیا سفر کیا۔ سیر کی اور ایک حبہ بھی جیب سے نہ خرچا اور خرچیا کیوں میں ایک ننھی سی جان کسی کی جیب میں بیٹھ جاتا کسی کی صندوقچی میں جگہ پاتا کسی کے بٹوے میں ہوتا۔ کسی نے تھیلی میں رکھا کسی نے پگڑی میں باندھ سر چڑھایا کسی نے ساڑھی کے پلو میں باندھا ہندوستانی مزدور بھی کس قدر غلیظ ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہوں پیٹ بھر کھانے نہیں ملتا تو صفائی کا کیا انتظام کریں گے نہ نہانے کی فرصت نہ کپڑے دھونے کی فرصت مفلسی کا یہ عالم کہ صابن تو کجا دو پیسے کے ریٹھے تک تو نصیب نہیں ہوتے کہ کپڑے دھولیں جب میں اس کے پاس پہنچا تو گھبرا اٹھا وہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگا اس بیچارہ غریب کے پاس کوئی محفوظ جگہ نہ تھی کہ مجھ کو رکھتا بس ہر وقت ساتھ کمر سے باندھے لیے پھرتا بس اس کے پسینہ کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور کلیجہ منھ کو آتا تھا۔ اس طرح پھرتا رہا تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ اور میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ کبھی ایک جا چین نہ لی۔ موٹر سواری کے مزے لوٹے۔ بیل گاڑی کے ہچکولے کھائے تانگہ جھٹکہ پر سوار ہوا۔

''اس سلسلہ میں ایک سفر کا حال کسی قدر تفصیل سے سن لیجیے ایک زمیدار نے تعلقہ کی تحصیل میں مجھ کو محاصل سرکاری میں ادا کیا میں تحصیل کے خزانہ میں عربوں کی نگرانی میں رہا۔ وہاں سے ایک روز بنڈی میں لد کو توالی اضلاع کے سپاہی نظم جمعیت کے عرب اور تحصیل کے چپراسیوں کی حفاظت میں ضلع کی راہ لی۔ بنڈی کا سفر ہر دیہات پر ہمارا پُرجوش استقبال کیا جاتا خیر مقدم ہوتا حضور سرکار سلامت اور

سرکار نظام کی جے' کے نعرے بلند ہوتے رات ایک قصبہ میں قیام رہا گاؤں میں ایک دھوم اور ہل چل تھی صبح دم نکل کھڑے ہوئے دوپہر ہوتے ہوتے ضلع کے خزانہ میں داخل ہو گئے وہاں سے چند دنوں بعد ایک ویگن میں بھر لایا۔ طویل سفر کے بعد خزانہ عامرہ میں داخل ہو گئے پھر وہاں سے ایک ملازم کی تنخواہ بنکر نکلا لیکن افسوس کہ میری زندگی نے پلٹا کھایا اور میں ایک کنجوس کے ہاتھ پڑا۔

مجھ کو ایک تھیلی میں رکھا گیا جس میں میرے ہم جنس اور نو سو ننیانوے تھے پھر ایک تجوری میں جگہ پائی جس بیجا میں بلا جرم پرار زندگی کے دن کاٹنے لگا۔ اگر وہاں کوئی خوش قسمتی کی بات تھی تو بس یہ کہ ہم صبح شام باہر نکالے جاتے ترازو میں تولے جاتے پھر وہیں رکھ دئے جاتے بس یہی ایک وقت ہوتا کہ ہم تجوری سے اس کا انتظار کرتے اور تازہ ہوا کھانے کے منتظر رہتے نہ معلوم میں اس قید میں کب تک پڑا رہتا اگر ایک واقعہ پیش نہ آتا ایک رات ہم نے باہر سے بڑے بڑے ہتھوڑوں کے پڑنے کی آواز سنی پہلے تو ڈرے سہمے لیکن کسی قدر مسرور ہوئے جب یہ دیکھا کہ ہم کو اس طرح رہائی ہوگی ہم منتشر ہو گئے میرے اور دوسرے ساتھیوں کا حال تو میں نہیں جانتا۔ میں ایک شوخ طبیعت شوقین مزاج ناعاقبت اندیش عیاش نوجوان کے ہاتھ پڑا میں شرم کے ساتھ اظہار کرتا ہوں کہ میں نے اس کو ایک مذہبی گناہ کے کرنے اور قانون اخلاق کے جرم کے مرتکب ہونے میں مدد دی اور اسی طرح میں ایک بازاری عصمت فروش کوٹھے والی عورت کے پاس پہنچا رات بڑی بےچینی سے کاٹی وہاں سے بہت جلد اور میں بہت خوش ہوں کہ مجھ کو بہت جلد رہائی ہوئی۔ میں نکلا اور ایک عطار کے پاس پہنچا۔

وہ عطار نے مجھ سے عطر تول تول کر بیچا۔ سونار نے سونے کے تولنے میں مجھ سے باٹ کا کام لیا چاندی کے وزن کرنے میں میں کام آیا۔ ایک شخص نے مجھ کو جیسے ہی اپنی جیب میں ڈالا فوراً میں زمین پر تھا اب میں وہاں پڑا انتظار کی گھڑیں کاٹ رہا تھا ہر آنے جانے والے کی صورت کو للچائی ہوئی نظروں سے اس امید میں دیکھتا کہ وہ مجھ کو اٹھالے اور میں پھر سیر و سیاحت کی زندگی بسر کرنے لگوں۔ لیکن وہ وقت بڑی دیر میں آیا جب کہ میری شکل مرور زمانہ کی وجہ سے یا پاداش عمل کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی تقریباً مسخ ہو گئی تھی نشان مٹ گئے تھے میل کچیل بہت جم گیا تھا۔ ایک رات سویرے ہی سے بادل گھرے۔ گھنگھور گھٹا چھائی خوب گرجا بجلی چمکائی اور 'گرجیگا تو برسیگا کیا اور بولیگا تو کریگا کیا' کے خلاف برسا گلیوں میں نالے اور سڑکوں پر ندیاں بہادیں پتھر کنکر روڑا راڑی حرکت میں آئے مٹی بہ نکلی کچرا الگ ہوا

اور میں لڑکتا پڑکتا منظرِ عام پر آہی گیا صبح دم ایک کی نظر مجھ پر پڑی خدا کا شکر ادا کیا مجھ کو اٹھایا بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا اور کیوں نہ رکھتا بیچارہ بھوکا تھا۔ ہاہ! کیا ہمارے ملک کا دولتمند اور خوش باش طبقہ اس بات سے واقف ہے کہ ملک میں اُن کے بعض بھائیوں پر دن دن بھر کا فاقہ گذرتا ہے اور بعض کو دن میں صرف ایک وقت کا کھانا میسر آتا ہے وہ بھی آدھا پیٹ اگر وہ یہ جانتے ان کے پہلو میں حساس دل ہوتا اور بنی نوعِ انسان کی ہمدردی ان میں ہوتی تو میں کبھی سینما نہ جاتا تھیٹر جا کر ڈرامے نہ دیکھتا کبھی تو مسرور نہ ہوتا منشیات مجھ سے نہ خریدی جاتیں بیڑی چٹا سگریٹ سگار کی قیمت نہ بنتا زندگی کے ناچ تے دل نہ بہلاتا جیسے ہی اُس نے مجھ کو پایا کسی رسٹورنٹ یا ہوٹل نہیں بلکہ سیدھے بھٹیار خانہ کی راہ لی چار پیسے کا کلیجہ اور دو پیسہ کی نہاری سے اپنی دوزخ کی آگ بجھائی۔

وہ اب میری زندگی پھر نئے سرے سے شروع ہوئی پہلے کی طرح اب پھر میں سیر و سیاحت میں مصروف ہوا لیکن چند ہی روز گذرے تھے کہ قسمت کا مارا ایک جعلی سکہ کے جرم میں ماخوذ ہوا پولیس نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا اپنے ذہن رسا کی داد حاصل کرنے کی دھن میں میرا شمار کھوٹے سکوں میں کیا اس طرح میں کتر گیا لیکن سانچ کو کیا آنچ میں کھرا کا کھرا ہی رہا۔ مادہ مختلف شکلیں بدلتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا میرے دو ٹکڑے کر دئے گئے لیکن میں فنا نہ ہو سکا مگر افسوس! میں کام کا نہ رہا تھا میں بھٹی میں ڈالدیا گیا۔ گلایا گیا دوبارہ ڈھالا گیا اس طرح میں نے نیا جنم لیا۔ لیکن مجھ میں تھوڑا فرق پیدا ہو گیا تھا ایک طرف چارمینار اس ضرب اور نظام الملک آصفجاہ بہادر اپنی حالت پر تھے دوسری طرف ایک روپیہ جلوس میمنت مانوس ضرب فرخندہ بنیاد حیدرآباد حسب حال صرف فرق اس قدر ہوا تھا کہ پہلے چارمینار کے قلب میں "م" تھا تو اب "ع" ہوا اس کے سوا کوئی فرق نہ آیا میں نے پھر اپنی زندگی شروع کی اب میں اُس کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کیا کیا گذرا بس وہی کولھو کے بیل کی چال پھر ملک میں گشت لگانا شروع کیا اس نئی زندگی کے صرف دو واقعات سن لیجے پھر بتلاؤں گا کہ میں موجودہ حالت میں کس طرح پہنچا۔

وہ پہلا یہ کہ ایک صاحب نے سنٹ جارجس گرامر اسکول کی تعلیم ختم کی اور یورپ کی ڈگری کے شوق میں چل کھڑے ہوئے ملکی یادگار کے خیال سے مجھ کو بھی ساتھ رکھ لیا میں نے جہاز کے سفر کا مزا چکھا عدن پورٹ سعید اور جبل الطارق کی سیر کی بہر صورتیں سے گذرا اس طرح یورپ پہنچا اور

میں صرف اس کام کا تھا کہ ہر وقت ان حضرت کے دوست و احباب کے سامنے میری نمایش کی جائے۔ میری عبارت پڑھی جائے اس کا ترجمہ اُن کی زبان میں حسب قابلیت سنایا جائے اور بس اللہ اللہ خیر سلّا۔

"دوسرا یہ کہ ایک شخص نے ذاتی خصومت اور شخصی منافرت کی بنا پر ایک نوعمر اکیس سالہ جوان کو قتل کر ڈالا۔ پیچھے ایک نوجوان بیوہ اور ایک ننھا بچہ بیوگی اور یتیمی کی تلخیاں چکھنے مصیبت کے دن کاٹنے اور عسرت کی زندگی بسر کرنے رہ گئے۔ عدالت فوجداری میں چارہ کار اختیار کیا گیا تمام رویداد مقدمہ بتلاتی تھی کہ قاتل کو سزا ہوگی اگرچہ مظلومہ اور مظلوم کو کوئی نفع نہ پہنچتا تاہم کچھ تو ٹھنڈک ہوگی لیکن جیسے ہی میں خفیہ طور پر اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ حاکم عدالت کے پاس پہنچا تو نہ پوچھئے کہ میں نے کیا کیا ظاہر کرتے شرم آتی ہے لیکن حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آئندہ ایسی بدعنوانیاں نہ ہوں اور مظلوموں پر مزید ظلم نہ ہو میں نے جاتے ہی حاکم کی ہتھیلی گرم کی اور جیب بھاری کیا بس مجرم جرم منسوبہ سے ایسا بری ہوا جیسے مسکہ میں سے بال نکل آتا ہے یہ ایک بڑا گناہ میں نے کیا تھا جس کے کفارہ کی فکر تھی۔

"ایک بزرگ دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہوئے۔ دنیوی جھگڑوں سے پیچھا چھوٹا لڑکے بال سیانے ہوئے دولت وافر ہوئی دنیا سے جی بھرا عاقبت کی سوجھی بمصداق بلی سات سو چوہے کھا کر حج کو چلی۔ چلو حج کے لئے نکل کھڑے ہوئے مجھ کو برکت کے خیال اور مُلک کی یادگار کے لئے ساتھ رکھ لیا اس طرح میں نے حج کیا عمرہ ادا کیا عرفات میں کھڑا رہا۔ صفا و مروا کے درمیان سعی کی رمی جمار کی خطبہ سُنا بیت اللہ میں نماز ادا کی میرا کوئی خاص مذہب نہیں جس کے پاس جاتا ہوں اس مذہب کا ہو جاتا ہوں اس ہی لئے میں مندروں میں بھی چڑھایا گیا۔ قبروں کی نذر ہوا۔ پادریوں کا نذرانہ بنا بہرحال بعد حج حاجی بن کر وطن لوٹا لیکن دیکھئے کم بختی کہ میرے سر میں گنڈا لگایا گیا میں ہنسلی میں لٹکایا گیا اور اب ایک معصوم بچہ کے گلے کا ہار ہوں۔ بچّہ کے والدین مجھ کو باعث برکت خیال کرتے ہیں اور میں قید میں پڑا دن کاٹ رہا ہوں۔ اور حج کی وجہ سے یہ عزت نصیب ہوئی اور اسی عزت پر خاتم۔

ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی

میں

صنعتی ترقّی کا امکان

(از جناب عبدالقادر صاحب مبائی)

اپنے مبحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ ایک اجمالی نظر ملک ہندوستان پر ڈال لیں ملک ہندوستان قدرتی عطیات سے مالا مال ہے۔ کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک قدرت نے ہر جگہ کم و بیش اپنی فیاضی تقسیم کردی ہے۔ اس ملک میں بڑے بڑے اور ہمیشہ بہنے والے دریا موجود ہیں۔ ساتھ ہی عمدہ عمدہ لق و دق جنگل کوسوں تک چلے گئے ہیں۔ زمین ایسی زرخیز ہے کہ گویا سونا پیدا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی خام پیداوار سارے ملک کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ لوہا۔ سونا۔ چاندی۔ کوئلہ ہر چیز کافی موجود ہے گویا اگر ہندوستان والے چاہیں تو دیگر ممالک سے قطع تعلق کر کے بھی ایک مہذب شائستہ اور متمدن زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ یورپ کی طرح ان کو یہ مجبوری بھی نہیں ہے کہ اگر دوسرا ملک مصنوعات کے معاوضہ میں اشیاء خوردنی پختہ و خام نہ دے تو بھوکوں مریں۔ ہندوستان اگر مغرب کے لئے خام پیداوار فراہم نہ کردے تو اپنی تمام صنعتی ترقی کے باوجود بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہرحال ایک بڑی حد تک ہندوستان کو استغنا ضرور حاصل ہے۔ ملک ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو اپنی قدرتی خصوصیات کے لحاظ سے اپنی ایک علحدہ زندگی قائم نہ کرسکتا ہو۔

اس لحاظ سے گویا اس متمدن زمانہ میں ملک ہندوستان کو دیگر ممالک کے مقابلہ میں آزاد رہنے کا زیادہ حق حاصل ہے۔ اور ترقی کے میدان میں آج کل کے معیار کے لحاظ سے سب سے پہلے رہ سکتا ہے لیکن اس اجمال کے بعد بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تمام اسباب کے باوجود یہ ترقی کے میدان میں کیوں پیچھے رہ گیا۔ اس کے جواب میں گذشتہ تاریخ پر نظر ڈالکر آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ ترقی ملک میں شروع ہوچکی تھی اس کی سیاسی آزادی سلب ہوگئی اور وہیں سے ترقی کے دروازے میں قفل لگ گئے۔

اس کے بعد ہم اب ان چیزوں پر نظر ڈالیں گے جو کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہیں

(۱) سب سے اہم اور لابدی چیز خام پیداوار ہے اگر ملک میں خام پیداوار موجود ہے تو پھر صنعت کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ اور صنعت اسی قدر عمدہ پیمانہ پر ہوسکتی ہے جس قدر عمدہ خام پیداوار دستیاب ہوسکے مثلاً اگر کسی ملک میں نئے شکر کثرت سے نکلتا ہے تو بھی اسی قدر کثرت سے اور کم لاگت سے ہم شکر تیار کرسکتے ہیں۔ رہا اب یہ سوال کہ خام پیداوار تو موجود ہے لیکن ایسے ماہرین یا کاریگر کہاں سے لائے جائیں جو شکر تیار کرسکتے ہوں۔ اس مقام پر ہم کو یہ تو ضرور مان لینا چاہیے کہ جب نئے شکر پیدا ہو رہا ہے تو اس مقام پر کم سے کم گڑ بنانے والے جو بیلوں کے کولہو سے گڑ نکالتے ہونگے ضرور موجود ہونگے اور اصول فطرت کے لحاظ سے موجود ہونا چاہیئے۔ تو اب یہاں پر حکومت کا کام ہے کہ اس چیز کو ترقی دینے کے لئے اول تو اُن کی مختلف طریقوں پر ہمت افزائی کرے۔ دوسرے اچھی صحت اور دلچسپی رکھنے والے کاریگروں کو چن کر خاص اس کام کی تربیت کے لئے باہر بھجوائے تاکہ واپس آنے کے بعد وہ لوگ بھی بجائے گڑ کے شکر تیار کریں۔ اگر اُن کے پاس سرمایہ نہ ہو تو حکومت کو سرمایہ فراہم کردینا چاہیئے تاکہ اس سے وہ لوگ مشین وغیرہ بھی خرید سکیں۔ غیر یہ تو میں نے ایک مثال پیش کی اور اسی طرح ہر شئے کے واسطے قریب قریب ممکن ہے۔ اور جب اس طرح صنعت میں کچھ جان آجائے تو فوراً امداد دیدینی چاہیئے تاکہ مسابقت سے بچے۔ ورنہ شروع شروع میں بھی اگر مسابقت کرنا پڑے تو صنعت پھر مشکل سے ہی ترقی کرسکتی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس صورت میں ملک کو حاصل ہوسکتی ہیں جب کہ حکومت دیسی ہو۔ ورنہ غیر قوم کی حکومت میں اس قسم کے خلوص اور ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اس کے بعد اب ہم ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی کے متعلق بحث کریں گے جو ہمارا اصل مبحث ہے۔ خدا کے فضل سے اس خطہ ملک پر دیسی حکومت ہے اور ہم کو وہ تمام مراعات حاصل ہوسکتی ہیں جو برطانوی ہند میں میسر نہیں ہیں۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں کافی خام پیداوار موجود ہے اگر اس کو توجہ سے کام میں لایا جائے تو بہترین صنعتی ترقی ہوسکتی ہے۔ یہ ملک مختلف اضلاع میں تقسیم ہے۔ اور ہر ضلع آب و ہوا اور پیداوار کے لحاظ سے علیحدہ خصوصیات رکھتا ہے۔ اضلاع تلنگانہ کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ یہاں چاول

روئی ۔ مکئی ۔ نیشکر وغیرہ خوب پیدا ہوتے ہیں ۔ ان اضلاع میں پانی کافی مقدار میں موجود ہے تالاب بڑے بڑے پائے جاتے ہیں ۔ اکثر مقامات سے کوئی نہ کوئی ندی بھی ہو کر گذرتی ہے ۔ لہذا اُن اسباب کی وجہ سے زراعت نفع بخش ہے دوسرے گنّے کی پیداوار کی وجہ سے شکر سازی کے کارخانے بھی کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ تالاب کے شکم میں گنّا بہت عمدگی سے پیدا ہو سکتا ہے اور آج کل جو بڑے قرار دیئے گئے اور جو بیکار ہیں وہ بہت نفع میں آ رہے ہیں ۔ آب و ہوا کے مرطوب ہونے کی وجہ سے کپڑے کی گرنیاں بھی قائم ہو سکتی ہیں لیکن روئی کی زیادہ اور کامیاب کاشت نہیں ہے ۔

اس کے بعد ضلع مرہٹواڑی ہیں ان میں تیل کے بیج مثلاً مونگ پھلی ۔ السی ۔ سرسوں ۔ کرڑ ۔ روئی ۔ سفید جوار وغیرہ بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان میں روئی اور تیل کے بیج قابل ذکر ہیں کہ اُن سے کافی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے ۔ لیکن ایک بات البتہ ضرور ہے کہ بارش اُن مقامات پر بہت ناکافی ہے ۔ حکومت کو چاہیئے کہ پانی اور ذرائع آب پاشی کا جلد سے جلد انتظام کرے یہاں کی زمینات بہت عمدہ ہیں اور ریگڑ (سیاہ زمین) بہت ہے ۔ ریگڑ کی زمین بہ نسبت چلکہ (سفید زمین) اور لال مٹی کی زمین کے افضل ہے ۔ اور پودے کی غذا کے لئے اپنے اندر زیادہ اجزا رکھتی ہے ۔

اس کے بعد اضلاع کرناٹک ہیں اُن اضلاع کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے ۔ اُن اضلاع میں بھی اکثر غلے پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن کوئی چیز غیر معمولی نہیں ہے جس سے کوئی بڑا کام لیا جا سکے ۔ اُن مقامات کی آب و ہوا ناقابل برداشت ہے ۔ خصوصاً موسم گرما میں تو دوزخ کا لطف آتا ہے ۔ اس مختصر حال کو چھوڑ کر اب ہم فرداً فرداً اُن مقامات کا تذکرہ کریں گے جہاں انحصار صنائع کی صورت موجود ہے ۔

سب سے پہلے اور قریب تر جو مقام کہ دارالسلطنت سے اور انحصار صنائع کی صورت رکھتا ہے وہ سنگاریڈی ہے ۔ یہاں کی حالت یہ ہے کہ یہ ضلع کا مستقر ہے اول تعلقدار ۔ ناظم ضلع ۔ مہتمم پولیس وغیرہ بہرحال اعلیٰ عہدہ دار قیام پذیر رہتے ہیں ۔ آب و ہوا بُری نہیں ہے ۔ چونکہ تلنگانہ کا حصہ ہے اس لئے چاول اور دیگر غلے پیدا ہوتے ہیں ۔ زمین ایسی بری نہیں ہے ۔ ریگڑ (سیاہ زمین) اور چلکہ (سفید زمین) دونوں قسم کی زمین موجود ہے ۔ جو بات قابل ذکر اور سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک زمانہ دراز سے ریشمی کپڑا بنا جا رہا ہے ۔ لیکن اس کپڑے کو گرگھے پر ہاتھ سے بنتے ہیں ۔ لیکن صاف اس قدر ہوتا ہے کہ مثل مشین کے کپڑے کے معلوم ہوتا ہے ۔ تمام تھان میں کہیں بھی چک یا موٹا باریک ریشم

نہیں ہوتا ۔ کپڑا اس قدر گراں بھی نہیں ہے کہ اوسط طبقے کے لوگ نہ پہن سکیں ۔ لیکن ان کاریگروں کی کارگذاری صرف اس قدر ہے کہ وہ ریاست میسور سے یا ولایت سے ریشم منگا کر کپڑا بن دیتے ہیں یوں سمجھئے کہ اُن کی محنت اور کارکردگی اس فن میں شامل ہے ۔ اگر ریشم کی پیداوار کا انتظام مناسب کر دیا جائے اور اُن کو کچھ تربیت سرکاری طور سے دلائی جائے ۔ تو یہ صنعت اپنے اندر ترقی کی کافی گنجائش رکھتی ہے ۔ یہاں ایک سرکاری مزرعہ بھی قائم ہے ۔ ایک عملہ اس میں کام کرتا ہے لیکن زراعت پیشہ طبقہ کو اس سے مطلق فائدہ نہیں ہو رہا ہے ۔ اس مزرعہ میں شہتوت کے درخت لگائے گئے ہیں لیکن بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر گو تجربتاً یہ کیا جا رہا ہے کہ ریشم کے کیڑے پالیں اور اُن سے ریشم نکالیں لیکن اسقدر چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کرنے سے ہم صحیح اندازہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ آیا یہ ریشم سازی ہو سکتی ہے یا نہیں اس لئے کہ بہت امکان ہے کہ مسلسل حادثات کی وجہ سے یا چھوٹے پیمانہ کی وجہ سے کوئی فائدہ نظر نہ آئے ۔ دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ کامیاب ہی ہو ۔ غالباً ممالک محروسہ میں وقار آباد سے زیادہ ریشم کی کاشت کے لئے کوئی موزوں مقام نہیں ہو سکتا ۔ یہ بہت ٹھنڈا مقام ہے دوسرے اور بھی تجویز نیت کے وجوہ ہیں ۔

بہرحال ریشم سازی اور ریشم بافی اعلیٰ پیمانہ پر صنعت یہاں کامیاب ہو سکتی ہے اگر کاریگران کو مشین سے کام لینے پر مجبور کیا جائے تو صنعت اور سستی ہو جائے گی ۔ اور ہمارے مُلک میں مال پھیل جائے گا ۔ یہ لوگ کافی مالدار ہیں سرکار کو اُن کے کام میں روپیہ صرف کرنا نہ پڑے گا ۔ صرف ترغیب و تحریص اور تھوڑے اثر سے کام لینا ہوگا ۔

اس کے بعد اس سے قریب ایک اور تعلقہ ہے جسے سدی پیٹ کہتے ہیں یہاں پیتل کی صنعت بہت عمدہ ہے پیتل کے آفتابہ ۔ کشتیاں و دیگر ظروف کافی مقدار میں تیار ہوتے ہیں اگر ان کاریگروں کو مدد دی جائے تو یہ بھی صنعت کا مرکز بن سکتا ہے اس کے اطراف کے مقامات میں بھی یہ کام جاری ہے لیکن سدی پیٹ میں مرکزی مقام بننے کی صلاحیت ہے یہ کاریگر ایسے مالدار نہیں ہیں کہ اپنے سرمایہ سے اس کام کو بڑے پیمانہ پر بھی چلا سکیں ۔ یہ کاریگر علاحدہ علحدہ یا دو چار آدمیوں کو اپنی امداد میں لیکر مختصر سامان تیار کر لیتا ہے جس کی اجرت اُس کی ضروریات کی کفیل ہو جاتی ہے ۔ بہرحال حکومت کو جلد اس طرف توجہ کرنا چاہیئے تاکہ یہ صنعتیں زوال پذیر ہونے سے قبل ہی روبہ ترقی ہو جائیں ۔

اس کے بعد ایک چھوٹی سی صنعت میدک میں بھی جاری ہے۔ یہ صنعت کپڑے چھاپنے کی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے خوشنما دسترخوان، پردے، چادریں وغیرہ چھپتی ہیں۔ اُن کے رنگ عموماً پختہ اور بہت کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے بیل بوٹے آسانی سے یہ لوگ چھاپ دیتے ہیں۔ اگر اس صنعت کو امداد دی جائے تو رفتہ رفتہ ترقی کر کے یورپ کے اعلیٰ چھاپوں کا آسانی سے مقابلہ کریں گے ابھی تک تو صرف موٹے کپڑوں کھادیوں وغیرہ پر چھاپ رہے ہیں کیونکہ ایسے ہی کپڑے پہننے والے چھپواتے بھی ہیں۔ تھوڑی سی نفاست و ملک کی قدردانی درکار ہے۔ اس کے بعد میں بیدر کا ذکر کروں گا۔ بیدر میں ایک سیاہ دھات برآمد ہوتی ہے جو لوہے کے مشکل ہے اس دھات پر یہاں کے لوگ سونے چاندی کا کام کرتے ہیں یہ کام اس قدر صاف اور نفیس ہوتا ہے کہ بالکل ولایتی مال معلوم ہوتا ہے۔ پان دان، چھڑیاں، کشتیاں، ڈبیاں وغیرہ اس قسم کی چیزیں بہت کثرت سے تیار ہوتی ہیں۔ شوقین لوگ اپنے تصاویر وغیرہ بھی بنواتے ہیں۔ لیکن کسی قسم کے کام میں بھی ہم غیر تناسبی بات نہیں پاتے اور بالکل سائنٹفک طریقہ پر کیا ہوا یہ کام معلوم ہوتا ہے۔ یہ دھات نرم قسم کی ہوتی ہے اس وجہ سے تراش خراش میں اور آسانی ہوتی ہے۔ لیکن بس دستکاری سے بہت دیر میں اور بڑی محنت کے بعد اور گراں لاگت پر اشیاء تیار ہوتی ہیں۔

تیسرا مقام کریم نگر ہے۔ یہاں سونے چاندی کا کام بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے جالدار ظروف تیار کرتے ہیں۔ عطر دان، پاندان، ڈبیاں، عطردان، کشتیاں، تھالیاں تیار ہوتی ہیں ان پر بیل بوٹے ہمہ قسم کے ہوتے ہیں۔ بیل بوٹوں کا تناسب بہت ہی موزوں اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

قاآنی کا عروج

اور

اعزاز

(از جناب عبدالقوی صاحب فانی۔ ایم۔ اے لکچرار فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

قاآنی کی شاہی دربار میں باریابی اور مجتہد الشعرا کا خطاب

پروفیسر فانی نے قاآنی پر تحقیقات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ سلسلہ لکھنؤ کی کسی علمی مجلس میں پڑھا گیا تھا۔ گذشتہ دسمبر میں جب میں لکھنؤ گیا تو ڈاکٹر بدل الرحمن دحال پرنسپل اسماعیل کالج اندھیری کی توسط جناب فانی سے ملاقات ہوئی اس سلسلہ مضامین کا ذکر آیا تو میں نے اس کو مکتبہ کے لئے مانگ لیا۔ فانی صاحب نے پہلا حصہ جو بڑی کوشش اور محنت سے لکھا تھا میرے نام روانہ فرمایا لیکن افسوس ہے کہ وہ مجھے نہ مل سکا اور گم ہوگیا معلوم نہیں اس کی تدوین پھر کس طرح ہو سکے گی۔ فانی صاحب بکمال مہربانی یہ دوسرا حصہ بھی مکتبہ کے لئے عنایت فرمایا ہے جس کا مکتبہ بے حد ممنون ہے۔

(عبدالقادر سروری)

شاہزادہ شجاع السلطنت کی سرکار میں قاآنی نے خوب ترقی کی، اور ایک مدت تک وہ اس کی شاہانہ فیاضیوں سے مستفید ہوتا رہا۔ چنانچہ رضا قلی ہدایت لکھتے ہیں۔

”در خراسان و کرمان سالیان دراز بتربیت حضرت شجاع السلطنت پرداختہ در کمالات مرتبۂ عالی حاصل کردہ در شاعری بمقامات اعلیٰ واصل آمدہ“

دس سال کے بعد جب شاہزادہ کی خراسان سے رے میں طلبی ہوئی شاہزادہ نے فتح علی شاہ قاچار سے قاآنی کی شاعری کی تعریف کی، شاہ کو جو خود بھی ایک بلند رتبہ اور اچھا شاعر تھا خاقان تخلص کرتا تھا قاآنی کے اشعار سننے کا شوق پیدا ہوا۔ قاآنی کو شاہی دربار میں حاضری کا حکم ہوا تعمیل حکم کے ساتھ ہی قاآنی نے ایک عمدہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کے صلہ میں بادشاہ کی سرکار سے علاوہ خلعت کے مجتہد الشعرا کا خطاب ملا اور شاہی درباریوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔

۱؎ مجمع الفصحا صفحہ ۴۲۳ جلد دوم ۲؎ دیوان قاآنی دیباچہ صفحہ ۵ ۳؎ ماخذ ایران کا پایۂ تخت طہران ... کو فاصلہ پر ہے

حسان العجم کا لقب

جب فتح علی شاہ نے ۳۸ برس سلطنت کر کے ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا محمد شاہ غازی سریر آرائے دولت ایران ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت فقیر دوست ہنر پرور اور فیاض تھا۔ انھیں خوبیوں کا نتیجہ تھا کہ بقول مصنف گنج شائگان۔

"دران چند سال نقد ہنر و جنس کمال بدانگونہ رواج یافت کہ معارف اہل حال و مشاہیر ارباب کمال از فارس و عراق و سائر ممالک آفاق طے مسافت کردہ در پایۂ سریر خلافت بہر عرض ہنر حاضر گشتند۔ از ہجوم آن نجوم و اجتماع آن کواکب در آن عالم آن ثواقب آستان معلیٰ چون راہ مجرہ نمودے و حکیم قاآنی اندران جمع کالقمر البازغ فی النجوم بودے"[1]

قاآنی کو بادشاہ کی مدح سرائی کے صلہ میں حسان العجم کا لقب عطا ہوا اور ذات ہمایونی کے ساتھ رہنے کا حکم صادر ہوا اور ایک معقول وظیفہ بادشاہ کی سرکار سے مقرر ہو گیا۔ چنانچہ ایک قصیدہ[2] میں اسی کی طرف اشارہ کر کے کہا ہے۔

خدایا شہنشاہ مرمرا حسان لقب دادی ۔۔۔ بلے حسان بود ہر کو تو بگزینی زاحسانش
کدامی فخر ازیں برتر کہ گوید آصفی چون تو ۔۔۔ محمد شہ محمد ہست و قاآنیست حسانش

قاآنی نے اپنی کتاب "پریشان"[3] جو سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی ہے اسی بادشاہ کے نام سے معنون کی ہے۔

(۳) ملک الشعرا کا خطاب

۱۸۴۸ء میں ۴ ستمبر کو محمد شاہ غازی نے ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ تخت نشین ہوا۔ شاہزادہ[4] علی قلی میرزا اعتضاد السلطنۃ وزیر معارف قاآنی کا ممدوح اور نہایت قدردان تھا اس کی مربیانہ پرورش اور توسط سے اسی زمانہ میں جبکہ ناصر الدین شاہ ولیعہد سلطنت سے قاآنی کی رسائی ان کے دربار تک ہو چکی تھی اور سرکار ولیعہدی سے قصیدوں کے صلہ میں اس کو برابر اکرامات و انعامات عطا ہوتے رہتے تھے۔ ناصر الدین شاہ کے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی قاآنی کو اور بھی زیادہ عروج حاصل ہوا

---

[1] دیوان حکیم قاآنی، دیباچہ [2] دیوان قاآنی ص ۲۰۵ [3] پریشان ص ۴ [4] دیوان حکیم قاآنی، دیباچہ

وہ حسب دستور شاہ کی مدح سرائی کا فرض ادا کرتا رہا اور میرزا آقا خاں صدر اعظم اور شاہزادہ علی قلی میرزا کی سفارش کے اثر سے ملک الشعراء کے معزز خطاب سے ممتاز ہوا۔

اس زمانے میں فرقۂ بابیہ کی تحریک زوروں پر تھی اور حکومت ایران اس کے فرو کرنے میں ہمہ تن مشغول تھی۔ ۱۵ اگست ۱۸۵۲ء میں تین بابیوں نے ناصر الدین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا مگر اتفاق سے وہ بچ گیا۔ اسکی خوشی میں قاآنی نے ایک زبردست قصیدہ لکھ کر نظم کیا جس کا مطلع یہ ہے۔

ساقی امشب مے بیا پے دہ کہ من بر بیا آب　　نذر کردم گر ببیں بیا بی نوشم خمر شراب

اس کے صلہ میں بادشاہ نے قاآنی کا ایک معقول وظیفہ عمر بھر کے لئے مقرر کر دیا۔

(۴)

سیاحت ہند کا شوق

قاآنی کو حافظ شیرازی کی طرح ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا تھا لیکن بعض موانعات کی وجہ سے دشت ارژن ہی سے واپس جانا پڑا۔ چنانچہ قاآنی نے "پریشان" میں اپنے اس ارادہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

"در عشر آخر صفر و غالباً اول بہار و شادی لیل و نہار بود کہ از شیراز با طایفۂ از دوستان بعزم ہندوستان بر آمدم و قضارا چون دو سہ فرسنگ از دشت ارژن شیراز گذشتیم ...... معاودت بشیراز اتفاق افتاد"

(۵)

وفات

قاآنی کی عمر کا زیادہ حصہ خراسان، کرمان، شیراز اور طہران میں بسر ہوا۔ چنانچہ رضا قلی خاں ہدایت کی اکثر ملاقاتیں قاآنی سے انہیں تینوں مذکورہ مقامات میں ہوئی تھیں جن کی نسبت وہ لکھتا ہے۔

"در شیراز و کرمان و طہران فقیر سالہا صحبت وی را دیدہ و اشعارش نیکو از وی شنیدہ"

لیکن ان مقامات میں سے قاآنی کا زیادہ زمانہ شیراز میں گزرا جو اس کا وطن تھا۔ پروفیسر براؤن بھی جب ۱۸۸۸ء کی فصل بہار میں شیراز گئے تو نواب میرزا حبیب علی خاں بہادر کے محل کے اسی خاص کمرہ میں ٹھہرے تھے

۱؎ منتخبات قاآنی مقدمہ مطبوعہ حبل المتین پریس کلکتہ سنہ ۱۹۱۶ء ۲؎ تاریخ ادبیات براؤن ص ۱۳۲ جلد چہارم [illegible] ۳؎ دیوان قاآنی ص [illegible] ۴؎ پریشان ص [illegible] ۵؎ مجمع الفصحا ص [illegible] جلد دوم ۶؎ تاریخ ادبیات فارسی عہد جدید ص ۲۴۸ جلد چہارم

جو قاآنی کا مسکن تھا۔ چونکہ وہ شاہی درباری شاعر تھا اور شاہی دربار سے قائم ہو چکے تھے اس لئے اس کا آخر زمانہ طہران ہی میں بسر ہوا اور وہیں ۱۲۷۰ھ ہجری میں اس کی وفات ہوئی۔

ناصر الدین شاہ کو قاآنی کی وفات کا بہت افسوس ہوا اور تجہیز و تکفین کے تمام مصارف شاہ نے اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔ مدفن دارالخلافہ طہران میں ہے۔

خود قاآنی کے بیان کے بموجب حساب لگانے سے اس کی تاریخ پیدائش ۲۰ رمضان یا ۲۰ شوال ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۲ نومبر یا ۲۰ دسمبر ۱۸۰۷ء قرار پاتی ہے۔ سنہ وفات جس پر اکثر سوانح نگار متفق ہیں ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء ہے البتہ ماہ وفات کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا ورنہ اس کا پتہ چلتا ہے۔ اگر قیاس چاہتا ہے کہ اس کی وفات سنہ متذکرہ بالا کے ماہ محرم یا صفر یا ربیع الاول مطابق ماہ اکتوبر یا نومبر یا دسمبر میں ہوئی ہوگی۔ قمری حساب سے اس کی عمر ۴۸ سال ۲ مہینے کی ہوتی ہے اور شمسی حساب سے ۴۵ برس ۱۱ ماہ کی۔ دونوں میں کچھ دن بڑھتے ہیں جو نظر انداز کر دئے گئے ہیں اور اس حسابی اندازہ میں اوسط کا خیال کرتے ہوئے ماہ صفر مطابق ماہ نومبر کا بطور ماہ وفات لحاظ رکھا گیا ہے۔

میرزا فرصت اپنی کتاب آثار عجم میں سنہ وفات ۱۲۷۲ھ لکھتا ہے[1] اور صاحب مجمع الفصحا ۱۲۷۰ھ[2] پروفیسر براؤن کی تحقیق کے مطابق قاآنی کا سنہ پیدائش ۱۸۰۷ء اور سنہ وفات ۵۴-۱۸۵۳ء ہے جو علی الترتیب ۱۲۲۲ھ اور ۱۲۷۰ھ کے مطابق ہیں۔

محمد کاظم شیرازی لکھتے ہیں کہ جب مرض الموت کی شدت ہوئی اور قاآنی کے احباب جو اس وقت اس کے پاس جمع تھے اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تو اسے توبہ و استغفار کی تلقین کرنے لگے اور خدا سے لو لگانے کی تاکید کی۔ قاآنی نے باچشم پرنم اسی حالت میں یہ شعر پڑھا۔

شرمندہ از آنیم کہ در دورِ مکافات | اندر خورِ عفو تو نکردیم گناہے

شاعر کہتا ہے کہ ہم اس بات سے شرمندہ ہیں کہ اس بدلے کے گھر یعنی دنیا میں ہم نے کوئی گناہ تیری بخشش کے شایان شان نہیں کیا ہے۔

یہ شعر زبان پر جاری ہوتے ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آیا اور روح اور طبیعت ہلکی ہوگئی اور قاآنی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی مضمون کا ایک شعر حضرت شیخ مصلح الدین شیرازی کا ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] پریشان صفحہ ۴ مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۷ھ۔ [2] منتخبات حکیم قاآنی مقدمہ مطبوعہ حبل المتین پریس کلکتہ ۱۹۰۸ء۔

ہمی شرم دارم ز لطف کریم　　　کہ خواہم گنہ پیش عفوش عظیم

اسی مضمون کو حضرت نظامی نے ایک دوسرے انداز سے ادا کیا ہے:

گناہِ من ار نامدے در شمار　　　ترا نام کے بودے آمرزگار

حکیم عمر خیام نے بھی اسی خیال کو مختلف انوکھے اندازوں اور طرزوں میں ادا کیا ہے۔ ہر انداز اور طرز میں ایک نئی بات ایک نیا رنگ اور ایک نیا اثر ہے۔ نمونتاً ہم تین رباعیاں لکھتے ہیں۔

(۱) من بندۂ عاصیم رضای تو کجاست　　　تاریک دلم نورِ صفای تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی　　　آن بیع بود لطف و عطای تو کجاست

(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو　　　صد سال شدم بناز در نعمت تو
صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد　　　تا جرم من است بیش یا رحمت تو

(۳) ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　　　وان کس کہ گنہ نکرد چون زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی　　　پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

طلب مغفرت کے ان روح افزا اشعار سے ان شعرا کے لطیف جذبات اُخروی کا ایک گونہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خدائے غفور الرحیم کی شان ستاری اور کریمی پر کتنا بھروسا اور یقین تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خود ربّ العالمین بھی اپنے بندوں پر اپنی رحمت کا دروازہ بند نہیں کرتا ہے بلکہ ٹوٹے ہوئے دلوں اور مایوسوں کو بشرطیکہ ان کے دلوں میں گناہوں کا احساس اور سچی ندامت موجود ہو اپنے کلام پاک میں یوں دلاسہ دیتا ہے لا تقنطوا من رحمة اللہ (خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو)۔ اب یہ ذوقِ سلیم کا کام ہے کہ وہ دیکھے اور پرکھے کہ کس کا اندازِ بیان زیادہ مؤثر جامع لطیف اور عبدیت و معبودیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

تنقیدیں

تاریخ الامت حصہ ہفتم

از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری۔
بڑی تقطیع (۲۰۰) صفحات۔ صاف کتابت وطباعت قیمت عہ
مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے ساتھ ہی حافظ صاحب نے اردو میں تاریخ اسلام کے کسی مفید اور متوسط درجے کے بسیط سلسلے کے فقدان کو محسوس کرکے تاریخ الامت کی بنیاد ڈالی اور مسلسل کئی برس کی کوشش کے بعد بحمداللہ یہ سلسلہ اپنی حد تک مکمل ہوگیا تاریخ الامت کا ساتواں حصہ آل عثمان کی مختصر سی تاریخ ہے۔ آل عثمان کی ابتدا سے لیکر ترکی میں جمہوریہ کے قیام اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت کے حالات و واقعات اجمالاً نہایت سلیس اور سادہ زبان میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ آخر میں تاریخ ترکی کے اتار چڑھاؤ اور حالات کے ردوبدل پر ایک سرسری نظر واپسیں بھی ڈالی گئی ہے۔ جگہ جگہ علمی ترقیوں، سیاسی تحریکوں اور معاشی حالات کا بھی ذکر ہے مختصر طور پر ترکی کے موجودہ دستور حکمرانی کے کچھ اصول بھی درج ہیں۔

اردو دنیا کو حافظ صاحب نے اس بیش بہا سلسلے کی تالیف سے جو فایدہ پہنچایا ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں اُن کی کوشش سے عام مطالعے کے لئے ایک اچھی تاریخ اسلام مدون ہوگئی۔ اگرچہ یہ کتاب جامعات کے اونچے نصاب تعلیم کی ضرورت کما حقہ پوری نہیں کرسکتی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ کالجوں کے طلبائے تاریخ اسلام اس سے درسی مطالعہ سے بہت کچھ فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی زبان کو بطور خاص سلیس اور سادہ رکھا گیا ہے جس سے اُس کا افادہ بہت زیادہ ہوگیا۔ اس سلسلے کی تکمیل حافظ صاحب قابل مبارکباد ہیں اور اُن کا یہ کارنامہ اردو دنیا میں ہمیشہ اُن کے نام کو زندہ رکھے گا۔

ہمارے رسولؐ

از مولانا خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی۔ چھوٹی تقطیع (۸۰) صفحات صاف کتابت وطباعت۔ قیمت ۲ر مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

مکتبہ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اردو میں سیرت نبوی پر متعدد چھوٹے رسالے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں "ہمارے رسول" بھی ایک ایسا ہی مفید اور بہت اچھا رسالہ ہے۔ آسان زبان میں آنحضرت کی پاک زندگی کے واقعات اور حالات صحیح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تالیف کا مقصد کم سواد لوگوں اور نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے سلیس اور سادہ پیرایۂ بیان میں اسوۂ حسنہ کی تعلیم دینا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ مولف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور اُن کا مقصد پورا ہوگیا۔ میسور میں اس رسالے کو نصاب تعلیم میں شریک کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح صوبجات متحدہ پنجاب کے مدارس اسلامی میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔

گلشن گفتار

مخزن (لاہور) کی رائے

یہ اُردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا ہے جسکو مولوی سید محمد ایم۔ اے نے مقدمہ اور اشاریہ شامل کر کے مکتبۂ ابراہیمیہ کی مطبوعات سلسلہ میں شائع کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا۔ قدامت کے علاوہ اس تذکرے میں مؤلف نے بعض مفید معلومات جمع کی ہیں۔ جو کم و بیش اس عہد کے لکھے ہوئے دوسرے تذکروں میں مفقود ہیں۔ مثلاً شعراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے درج کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے کلام کے انتخاب میں اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ انتخابات میں صرف متفرق اشعار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض جگہ پوری غزلیں درج کی ہیں اکثر شعرا کے حالات مثلاً عادل شاہی دربار کے ملک الشعرا ملا نصرتی اور ولی دکنی کے دو شاگردوں اشرف گجراتی اور محمد رضی احمد آبادی کے حالات بھی درج کئے ہیں جو دوسرے تذکروں میں ناپید ہیں یا بہت مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ شعرا کے حالات میں بعض ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جن کے ذریعہ دکن میں بعض غیر معروف اردو مراکز کا پتہ چلتا ہے۔ سید محمد صاحب موصوف نے ہر شاعر کے حالات کے ضمن میں دوسرے تذکروں مثلاً نکات الشعرا، چمنستان الشعرا اور بعض غیر مطبوعہ تذکروں یعنی تذکرہ فتح علی گردیزی، تحفۃ الشعرا اور گلزار ابراہیم سے بعض نہایت ضروری معلومات نیچے حاشیہ میں درج کر دی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو تقابل و تطابق سے صحیح حالات کے دریافت کرنے کا موقع مل سکے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مختصر سا ہے اور ۲۰ × ۲۶ کے تقریباً (۷۲) صفحات پر مشتمل ہے تاہم معلومات کے اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ ہمیں سید محمد موصوف کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے اس کتاب کو پبلک کے سامنے پیش کر کے اردو علم و ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ہم سید صاحب موصوف اور مکتبۂ ابراہیمیہ کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہیں

نگار (لکھنؤ) کی رائے

اردو شاعروں کے تذکرہ میں نکات الشعرا، اردو تذکرہ فتح علی حسینی گردیزی، بہت قدیم تذکرے سمجھے جاتے ہیں اور علاوہ ان کے اس عہد کا کوئی اور تذکرہ دستیاب نہ ہوا تھا، لیکن اب ایک اور تذکرہ اسی عہد کا لکھا ہوا ملا ہے جس کا نام گلشن گفتار ہے اور جو ۱۱۶۵ھ میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اسکا مؤلف خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی تھا جو عارف الدین خاں عاجز کا شاگرد تھا۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور علاوہ قدیم دکنی شعراء کے شمالی ہند کے معاصر شعرا کا بھی ذکر اس میں آ گیا ہے جناب مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے نے اسکو مرتب کیا ہے اور انکی تحقیقات میں یہ شعراء اردو کا اولین تذکرہ ہے۔ فاضل مرتب نے ساتھ ہی ساتھ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ دوسرے قدیم تذکروں کے بیانات بھی شائع کر دئے ہیں جس سے یہ کتاب اور زیادہ مفید و دلچسپ ہو گئی ہے۔

زمانہ (کانپور) کی رائے

یہ اردو شعراء کا ایک قدیم تذکرہ ہے جسکو تقریباً ۱۱۶۵ھ میں خواجہ خانصاحب حمید اورنگ آبادی نے مرتب کیا تھا۔ اور اب ایک قلمی نسخہ سے بعد صحت مسٹر سید محمد۔ ایم۔ اے نے ترتیب دیا ہے۔ قدیم زمانے کے دستور کے مطابق دوسرے تذکروں کی طرح یہ بھی فارسی میں ہے اور شعراء کے حالات و نمونہ کلام بھی مختصر ہے، جن شعرا کا حال اس میں درج ہے ان کی تعداد صرف تیس ہے اور اس طرح اصل تذکرہ بہت مختصر ہے، مگر لائق مرتب نے ہر شاعر کے حالات ذیل میں دوسرے قدیم مطبوعہ و قلمی تذکروں کے بیانات من و عن نقل کر کے اس تذکرہ کو مکمل و مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں ایک پر از معلومات مقدمہ کا بھی اضافہ کیا ہے اور اب مجموعی حیثیت سے یہ تذکرہ کارآمد و لائق مطالعہ ہو گیا ہے خصوصاً ان اصحاب کے لئے جو اردو شاعری کی ارتقائی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ تذکرہ یقیناً مفید ہو گا۔ آخر میں ہم قابل مرتب مسٹر سید محمد اور کارکنان مکتبۂ ابراہیمیہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ مکتبۂ ابراہیمیہ اپنی مطبوعات کے ذریعہ سے اردو زبان کی جو خدمت کر رہا ہے۔ اور مفید علمی و ادبی موضوعات پر جو قابل قدر کتابیں شائع کر رہا ہے وہ مستحق مبارکباد ہے اہل علم کو اس دارالاشاعت کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے۔ کراؤن سائز۔ قیمت ۱۲

مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

صاحبان قلم کیلئے زرّین موقع

اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے
ہزاروں روپئے کے انعام

چاند اردو قیمت سالانہ آٹھ روپیہ
ششماہی پانچروپیہ فی جلد ایکروپیہ

چاند میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے
مینیجر اردو چاند، چندر لوک الہ آباد

تمام ہندوستان کے مشہور اہل قلم، چاند میں اپنے اپنے مضامین بھیج رہے ہیں آپ بھی جلد روانہ فرمائیے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ چاند جس آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ ویسا اردو میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے اسلئے تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی اشاعت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہو گئی ہے اور مشہور اہل قلم اپنے مضامین چاند میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چاند ایک ماہواری علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی رسالہ ہے۔ اس میں مختلف قسم کی عمدہ سے عمدہ تصاویر بھی شائع ہوتے ہیں تصاویر کا مجموعہ کیا ہے گویا ایک مصور کا البم ہے۔

چاند سال میں کئی مرتبہ خاص نمبر کی حیثیت سے شایع ہوگا۔ حال ہی میں اسکا اسپشل نمبر شائع ہونیوالا ہے۔ اسکے لئے جلد از جلد مضامین بھیجے جاویں مضمون نگاران کیلئے اچھا موقع ہے، انکو اختیار ہے کہ جس سبجکٹ پر چاہیں مضمون لکھیں اس شخص کو جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا انعام دیا جاویگا۔ تین انعام ہونگے۔ (۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم۔ ہر ایک صنف کو پایہ مضمون کے اعتبار سے سو روپیہ تک کا نقد انعام دیا جاویگا

اس کے علاوہ

سال بھر تک جن اصحاب کے سب سے اچھے مضامین (نثر ہو یا نظم) چاند میں شایع ہونگے انکو بھی بہترین مضمون پر انعام دیا جائیگا۔ اسمیں بھی تین انعام ہونگے (۱) مضمون (نثر) (۲) افسانہ (۳) نظم۔ سو روپئے تک کا انعام اسمیں بھی ہوگا مضامین، افسانہ اور نظمیں ان شرائط کی پابندی

(۱) مضامین علمی، ادبی، اخلاقی معاشرتی تاریخ یا تحقیقی ہوں

(۲) افسانوں میں کوئی خاص جدت ہو

(۳) نظم کسی خاص مضمون پر ہو۔ قواعد عروض اور زبان کی غلطیاں نہ ہوں

(۴) سب مضامین صاف و شستہ زبان میں لکھے جاویں اردوئے لطیف یا دقیق اردو نہ ہوں

(۵) مضامین غیر مطبوعہ اور نئی طرز کے ہوں

(۶) جتنے مضامین نظم ہوں یا نثر یا افسانے انکو مضمون نگار پھر کسی دوسرے پرچہ میں بھیجنے کا مجاز نہوگا جملہ حقوق کا مختار ایڈیٹر ہو جائیگا مضمون نگار کو کوئی حق باقی نہ رہیگا

(۷) مضامین زیادہ طویل نہوں حشو و زوائد سے پاک ہوں

(۸) اگر کوئی مضمون نگار چاہے تو ایک سے زائد بھی مضمون افسانہ یا نظم بھیج سکتا ہے

(۹) ایڈیٹر کا فیصلہ آخری ہوگا جو کسیطرح مسترد نہ ہو سکیگا اور یہ فیصلہ قانوناً قابل تسلیم ہوگا

(۱۰) اسپشل نمبر کیلئے ۲۰ اگست تک تمام مضامین نظم و نثر و افسانے آجانا چاہئیں۔ دیگر مضامین ماہ بماہ آتے رہینگے

(۱۱) وہ مضامین جن کو مقابلہ میں انعام نہ دیا جاسکیگا۔ اگر وہ پسند آئینگے چاند میں شایع کردئے جائینگے لیکن وہ مضامین جو چاند میں نہ شایع ہو سکینگے۔ وہ اسی شرط پر واپس ہو سکتے ہیں کہ مضمون نگار حضرات اپنا پتہ صاف لکھیں۔ اور واپسی کے لئے ٹکٹ روانہ کریں

(۱۲) ہر مضمون نگار کو چاند کا خرید فرمانا ضروری ہے۔

جملہ مضامین وغیرہ حسب ذیل پتہ سے بھیجنا چاہئے۔

منشی کنہیا لال ایڈیٹر "چاند" الہ آباد ٹیلیفون نمبر ۲۰۵ تار کا پتہ "چاند"

مجلّہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ شہریور ۱۳۳۹ف م جولائی ۱۹۳۰ء شمارہ (۴)

تصاویر (۱) حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم
(۲) مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب
ام-اے، ال ال بی عثمانیہ، بارایٹ لا، ڈی فل، بی سی ال (آکسن)

فہرست مضامین

شذرات

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ اجلاس میں مولوی عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ اور صدر جلسہ نے جو خطبہ دیا تھا، کچھ عرصہ پہلے لکھا جا چکا تھا، لیکن چونکہ ہم اس کو صدر صاحب کی تصویر کے ساتھ شایع کرنا چاہتے تھے، اس لئے وہ رکا رہا، بلاک اب تک وصول نہیں ہوا۔ اس لئے مزید تاخیر کو مذموم سمجھ کر ہم خطبہ کو شائع کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ ملک کی گذشتہ تعلیمی ترقی کے متعلق ملک کے ایک دیرینہ تجربہ کار عالم اور تعلیمی خدمت گذار کے خیالات ہیں، اس لئے یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔

گذشتہ ماہ میں حیدرآباد کے لئے ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ مولوی سید اشرف صاحب شمسی، سابق مددگار پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ، جو عربی علوم کے متبحر عالم اور فارسی کے قابل شاعر اور ادیب تھے، انتقال کر گئے۔ مولوی صاحب کی پبلک زندگی جس قدر شاندار تھی، اسی قدر خانگی زندگی بھی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ مولوی صاحب کا ملک بھر میں بڑا احترام تھا۔ آپ کے انتقال پر کئی پبلک جلسے منعقد ہوے۔ مولوی صاحب کا "مکتبہ" سے بھی ایک خاص تعلق تھا۔ جامعہ عثمانیہ کی بی، اے کی جماعتوں کے لئے جو فارسی کورس پچھلی دفعہ تیار ہوا تھا، اور مکتبہ کی طرف سے شایع ہوا تھا، اس سے متعلق ایک دار التصنیف قایم کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب ملک کے کئی اور علماء کے ساتھ مؤلفین میں شامل تھے۔

ہمارے پاس مولوی صاحب کی زندگی اور علمی خدمات سے متعلق کئی مضامین اور نظمیں اب تک وصول ہو چکی ہیں۔ ہم ان میں سے ایک اچھا انتخاب کر کے ستمبر (آبان) کے رسالہ میں ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اتفاق سے مولوی صاحب کی ایک تصویر بھی دستیاب ہو گئی ہے۔ جو اسی رسالے میں چھپے گی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل طیلسانی، مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب.

جو جامعہ عثمانیہ سے ام۔ اے اور ال ال بی کے امتحانات بیک وقت امتیاز کے ساتھ کامیاب کرنے کے بعد سرکاری وظیفہ سے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے، غالباً آگسٹ کے آخر میں ہندوستان واپس ہونگے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلیل قیام انگلستان کے زمانے میں جو کام کئے وہ شاید قدیم سے قدیم جامعہ کے لیے بھی مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔ دو سال ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب نے آکسفورڈ سے ڈی فل (پی ایچ ڈی) کی ڈگری قانون میں امتیاز کے ساتھ حاصل کی تھی۔ اس سال آپ نے (بی، سی، ال) کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ کامیاب کر لیا۔ یہ امتحان آکسفورڈ یونیورسٹی کا سخت ترین امتحان ہے۔ اور اسی لیے کسی متعلم کو، جب تک وہ بی، اے آنرز کامیاب نہ ہو، اس میں داخلہ کی اجازت نہیں ملتی۔ مگر چونکہ ڈاکٹر سیادت علی خاں صاحب نے ڈی، فل، آکسفورڈ ہی سے امتیاز کے ساتھ کامیاب کر لیا تھا۔ اس لئے باستثنائے خاص، بی، سی، ال میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اور امتحان اس سال آپ نے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مغربی علوم کے ساتھ مشرقی علوم کے بھی جامع ہیں۔ آپ نے مولوی فاضل کا امتحان بھی "ڈبل فرسٹ" یعنی سرفہرست کامیابی حاصل کی تھی۔ آکسفورڈ میں ڈی، فل، اور بی، سی، ال، کے ساتھ ساتھ آپ نے بیرسٹری کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

ان خصوصیات کے حامل حیدرآباد میں تو خیر، شاید ہندوستان میں بھی بہت کم ہی نظر آئیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ حیدرآباد آپ کی شاندار کامیابیوں کا اعتراف، انہیں کے شایان شان کرے گا۔

گذشتہ رسالے میں مولوی کامل میر مظہر علی صاحب کے مضمون "قوم تو ارج" سے متعلق چند فروگذاشتیں رہ گئیں۔ مضمون کے آخر میں "ترجمہ از المقتطف" لکھا ہوا تھا، چونکہ پتھر پر لکھا گیا تھا، اس لئے طباعت میں اڑ گیا۔ کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں بھی رونما ہو گئیں۔ ہم مولوی صاحب سے عذر خواہ ہیں۔

جناب راز چاندپوری، جن کی نظمیں اکثر "مکتبہ" میں شایع ہوتی رہتی ہیں، اپنی قدیم اور جدید دونوں طرز کی نظموں کا مجموعہ "دنیاے راز" کے عنوان سے عنقریب شایع کر رہے ہیں۔ راز صاحب کو نظم میں ایک خاص ذوق ہے، شمالی ہند اور دکن کے اکثر رسالوں میں آپ کی نظمیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔

یہ مجموعہ ہماری ادبیات میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔

قرون وسطیٰ کی ایک تاریخی کتاب "بڈفرڈ بک آف اورس" کا نایاب مخطوطہ ابھی ابھی برٹش میوزیم میں داخل کیا گیا ہے۔ لیکن قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کی قیمت سترہ ہزار پونڈ یعنے دو لاکھ روپیہ سے زیادہ دینی پڑی۔ اسی رقم کی پابجائی کچھ تو عوام کے چندہ، کچھ نیشنل آرٹ کلکشن فنڈ کی امداد اور باقی میوزیم کی رقم سے کی گئی۔ یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برٹش میوزیم کے سرمایہ کی کیا قدروقیمت ہے؟

ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کنچن جنگا پر چڑھ کر اس کے رازوں کو فاش کرنے کے لئے جو مہم چند جرمن محققین اور دیگر علمار نے ترتیب دی تھی، آخرکار ہار مان کر واپس ہوگئی۔ اس میں دشواریوں کو بڑا دخل ہے۔ بہرحال کچھ ہو اب ہمالیہ کے متعلق بہت سے نظریہ قائم ہونے لگے ہیں۔ اسی مہم کے ایک فرد پروفیسر ڈی رن فرتھ نے کچھ روز پہلے بمبئی کے جرمن کلب میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمالیہ کی چوٹیاں ابھی ابھی سمندر کے عمق سے بلند ہوئی ہیں اور یہ بلندی روز افزوں ہے۔ ممکن ہے کہ پروفیسر کا یہ خیال صحیح ہو کیونکہ جغرافیائی اور ارضیاتی انقلابات اس قدر تدریجاً رونما ہوتے ہیں کہ ان کا نظر آنا محال ہے۔ چنانچہ موجودہ کوہ آتش فشاں "سوبیس" کی آتش فشانی اور اطالیہ، ایران اور برما میں "زلزلہ" ایسے واقعات ہیں، جن سے قدیم تاریخ ناواقف معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگ ہندوستان کے متعلق یہ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم کے مقابلہ میں یہاں گرمی اب کم پڑتی ہے۔ گذشتہ بیس سال کے اندر ہی اندر نمایاں فرق محسوس ہونے لگا ہے۔ اگر یہ بھی درست ہے تو پھر ہندوستان آب وہوا کے لحاظ سے بھی بود و باش کا بہترین ملک بنجائے گا۔ لیکن ابھی یہ صرف نظریہ ہی نظریے ہیں۔



آخری تاجدار اودھ حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم

مطبع کوہ نور حیدرآباد دکن

واجد علی شاہ

از

(جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی)

سلطان عالم واجد علی شاہ کی ذات پر جو اعتراضات ہیں ان کے منجملہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عیش پرستی نے ان کے ہاں بدکاری کا رنگ اختیار کر لیا تھا حالانکہ واقعات سے اس کی تائید میں کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچ سکتا۔ اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں انہوں نے ایک کتاب "پری خانہ" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جہانگیر سے زیادہ صاف گوئی سے کام لیکر اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں تمام ہیجیں؛ وہ نازآفرین دلربائیں جو انکی محلسرا میں تھیں عقد یا متعہ کے ذریعہ سے ان پر حلال کر لی گئیں تھیں اور اسمیں اسقدر سختی اور پابندی سے کام لیا جاتا تھا۔ کہ کوئی غیر منکوحہ اور غیر ممتوعہ عورت خدمتگزاری یا ذلیل خانگی کاموں کیلئے بھی حضور تک نہ پہنچ سکتی تھی کہ جو جوان خادمات ضروری خدمات پر مامور تھیں وہ بھی متعہ کر کے حرم سرا میں داخل کر لی گئیں تھیں جنکے حلال ہونے کے فتوے پر فوراً جناب قبلہ وکعبہ کی مہر لگ جاتی تھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ممنوعات کی تعداد اسقدر بڑھا رکھی تھی کہ بہشتن تک نواب آبرسا بیگم اور مہترانی نواب مصطفےٰ بیگم تھی بعضوں نے انکی ممتوعہ عورتوں کی تعداد پر اعتراض کیا ہے حالانکہ تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ اکثر بادشاہوں کی محلسرا میں ایک کثیر تعداد بیگموں کی رہا کی ہے ان کے پدر نامدار حضرت امجد علی شاہ ہی کے ہاں کئی عورتیں تھیں۔ سلاطین مغلیہ کو لیجئے۔ تاجداران دکن کے حالات ملاحظہ فرمائیے یہ درست ہے کہ واجد علی شاہ نے محلات کی تعداد کو نہ پہنچیں لیکن یہ یقینی ہے کہ ہر جگہ ممنوعات کی کثرت تھی اور اب بھی اس روشن زمانے میں نوابوں اور رئیسوں کے ہاں ایسی عورتوں کی تعداد خاصی ہوا کرتی ہے۔

حضرت جان عالم کو اگر واقعی کوئی الزام دیا جا سکتا ہے۔ تو وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ان عورتوں میں اسقدر منہمک کر دیا تھا کہ سوائے جلسوں میں شریک رہنے کے اور کوئی کام ان سے سرانجام نہیں پاتا تھا ان کو عورتوں سے نہیں بلکہ گانے سے عشق تھا ایک جگہ وہ "پری خانہ" میں لکھتے ہیں بادشاہ دہلی محمد شاہ اور ابراہیم عادل شاہ سلطان بیجاپور وغیرہ شاہان سلف نے اکثر جمیل و شکیل عورتوں کے علم موسیقی کی تعلیم دلوا کر درجہ کمال تک پہنچانے میں بہت کوشش کی ہے لہذا مابدولت و اقبال نے بھی اکثر زہرہ جبینان ماہ تمثال کو فن موسیقی کی تعلیم کا حکم دیا تھا۔

دوہرا زبانی رادھا:—

آو پیاری موہنا پلک ڈھانپ توہے لیوں نہ میں دیکھوں اور کا نہ توہے دیکھن دیوں

جب یہ جلسہ تیار ہوا تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا سکندر حشمت بہادر کو بھی تکلیف دی۔ سب پریاں حنا کا عطر ملکر ہونٹوں پر مسی لگا کر میرے تخت کے گرد اگرد کرسیوں پر آکر بیٹھیں۔ میرے بھائی مثل گل خنداں میرے پہلو میں بیٹھے تھے شیشہ کے کنول رنگ برنگ کی مردنگیں جابجا لگائی گئی تھیں تخت کی چاروں طرف پھولوں کی چادریں ڈالی گئی تھیں محلات کے دیکھنے کے واسطے چقیں چھوڑی گئی تھیں غرض یہ پر لطف و جانفزا جلسہ بھر رات رہے برخواست ہوا"

جب ان کے پدر والا قدر کا انتقال ہوا ہر طرف گریہ و زاری کا شور۔ رونے دھونے کی دھوم نالہ و شیون کا کہرام برپا تھا۔ لکھنو اچھا خاصہ ماتم کدہ ہو گیا۔ ایک رات جبکہ چار گھڑی گذر چکے تھے ایک انگریزی چپراسی بڑے صاحب کے یہاں سے آیا اور کہنے لگا کہ صاحب نے کہلا بھیجا ہے کہ چھوٹے صاحب حاضر نہیں ہیں لہذا ملک صاحب بلند مکان والاشان کی ہمراہی کیلئے حاضر ہیں ان کے ساتھ تشریف لایئے۔ الحاصل یہ گئے اور بڑے صاحب سے گفتگو کے بعد بارادری پر آکر انہوں نے دوگانہ ادا کیا اور مجتہد العصر والزماں نے اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر تاج رکھا اس کے بعد تخت پر جلوہ آرا ہوئے۔ اور جسقدر ارکین سلطنت حاضر تھے سب نے نذریں پیش کیں سلامی کی توپیں سر ہوئیں دوسرے روز سب مصاحبان خاص وغیرہ کو عمدہ تلوار ون خلعتوں معقول خطابوں سے سرفرازی ہوئی حضرت جنت مکان کے مقبرے کے واسطے دس لاکھ روپئے منظور فرمائے گئے۔

کچھ عرصے بعد ان کے جسم پر چند دنبل نکل آئے روز بروز مرض زیادہ ہونے لگا۔ تمام جسم آگ کیطرح جلتا تھا سب متعلقین اور محلات جو شریف اور نیک تھے رات دن روتے تھے۔ لیکن بعض بے وفاوں کو اسکی پروا نہ تھی وہ تماش بینوں کیطرح اپنے اپنے کپڑے پہن کر دن بھر ناچ گانے میں مصروف رہتی تھیں جب جانعالم نے یہ بے اعتنائی دیکھی مرض کی اسی شدت میں وہ رضی الدولہ کے مکانیں چلے گئے تاکہ ہمجنسوں اور معشوقوں کی چشمک ئی سے محفوظ رہیں۔ اسی عرصہ میں انہوں نے جملہ منع کی ہوئی چیزوں سے بوجہ شدت مرض انکار کیا اور اسوقت سے گانا وغیرہ یکدم موقوف کر دیا گیا اسی وجہ سے تمام پریخانہ برباد اور گوئے ملازم وغیرہ برطرف کر دئے گئے۔

اسی ضمن میں پریخانہ میں انہوں نے ایک فہرست اپنے باوفا اور بے وفا معشوقوں کی دی ہے جس کا بیان خالی از دلچسپی نہیں سلطنت محل صاحبہ نواب دلدار محل صاحبہ نواب سکندر محل صاحبہ، امیر محل صاحبہ ملکہ ملک تاج النساء

شاید ابو الفضل سے کچھ ہی کم درجہ ہوں"، رفعت الدولہ اور لائق الدولہ جیسے صاحب کمال نثر نگار وابستہ دامان دولت تھے طبیعت بیحد موزوں تھی۔ مولانا شرر لکھتے ہیں کہ "میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ اپنے دولت خانے سے بوچے پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں شریک ہونے کیلئے روانہ ہوئے اور جو مرثیہ و سلام وہاں پڑھیں گے انہیں راستے میں تصنیف کر رہے ہیں دو کاتب ساتھ ساتھ ہیں ایک کو مرثیہ کے بند تصنیف کر کے لکھواتے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار مرثیہ کا لکھنے والا جب تک تیار ہوا بند لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کے شعر بتاتے ہیں اور دونوں کو اسقدر جلد جلد کہ ایک کا بھی قلم نہیں رکنے پاتا امام باڑہ دو فرلانگ بھی نہ ہوگا مگر وہاں تک پہونچتے پہونچتے پورا سلام اور مرثیہ کے چھ بند لکھوا دیے دو مختلف بحروں پر ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جسقدر دشوار امر ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فن شعر کی مشکلات سے واقف ہیں"۔

ان کی تمام تصانیف میں یہی شان برجستگی اور قلم برداشتگی تھی۔ سوچنے اور گھنٹوں فکر کرنے سے ان کا دماغ بالکل نا آشنا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی جو ان کے کلام میں کہیں کہیں لغزشیں دکھائی دیتی ہیں اصلی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ سلامت خود کبھی کسی سے اصلاح نہ لیتے حالانکہ دربار میں نامور شعرا اور استادان سخن کا مجمع رہتا تعلیم و اصلاح کا زمانہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو چکا۔ مٹیا برج میں وہ خود استاد زمانہ تھے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کلام الملوک ملوک الکلام، جتنے شعرا و اساتذہ ملازم تھے سب شاگرد سمجھے جاتے تھے وہ شرف شاگردی حاصل کرنیکی درخواست کرتے بہ عنایت شاہی انکو یہ عزت دیجاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جسمیں نام و خطاب کیساتھ الفاظ "تلمیذ السلطان" بھی کندہ ہوتے میر انیس مرحوم کے ایک صاحبزادے کو مولانا شرر نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ مٹیا برج کے معزز امیر کی مجلس میں پڑھ رہے تھے کہ واجد علی شاہ بہ نفس نفیس تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کہ "بھئی میں ذاکر کی حیثیت سے آیا ہوں" انیس کے صاحبزادے نے اپنا مرثیہ ختم کرتے ہی شاگردی کی آرزو ظاہر کی اور اسی وقت گروہ تلامذہ میں شامل کر لئے گئے۔

نظم و نثر کا دربار میں اسقدر چرچا تھا کہ تحریر تو در کنار گفتگو میں بھی مجال نہ تھی کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف فصاحت محاورہ لفظ نکل جائے بادشاہ اور ان کے محلات کے درمیان جو خط و کتابت ہوتی تھی انکو "نوید نامہ" کہا جاتا تھا یہ رنگین اور پر افشاں کاغذ پر لکھے جاتے۔ عبارت بھی کاغذ کیطرح رنگین اور مقفیٰ ہوتی زبان صاف ستھری اور محاورہ کے صحیح اور برمحل استعمال کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ غالباً یہ ذخیرہ تلف ہو گیا۔

مولانا شرر لکھتے ہیں کہ "حضرت جانعالم نے سینکڑوں مرثیے اور سلام کہہ ڈالے اور اتنی کتابیں نظم و نثر میں تصنیف فرمائیں کہ ان کا شمار بھی شاید آج کسی کو نہ معلوم ہو گا۔ لیکن مندرجہ ذیل کتابیں انکی زیادہ مشہور ہیں؛

خطابات محلات۔ اپنے محلوں کو جو جو خطاب دیے تھے وہ اس مثنوی میں بتائے ہیں۔ کون کون منکوحہ تھیں

کون کون متوعہ۔ کن کن کو طلاق دی اور کسکو کسکو اولاد ہوئی۔ پھر ذکور و اناث مرحوم و ذبیحات کی تفصیل و تقسیم وغیرہ۔ یہ قید خانے کی تصنیف ہے۔
صحیفۂ سلطانیہ۔ اثنائے تلاوت میں خیال آیا کہ لفظ "رب" کے ساتھ جتنی قرآن میں دعائیہ آیتیں ہیں سب یکجا و مرتب کیجائیں،
ہر ایک کے فوائد وغیرہ بھی بتا دئے جائیں یہ رسالہ اسی خیال کی کتابی صورت ہے۔

دریائے تعشق یہ عشقیہ مثنوی عام ہے۔

حزن اختر یہ مثنوی قید خانہ میں تصنیف ہوئی لہذا جو جو مصائب و آلام انقلاب زمانہ کیوجہ یہاں اُنپر پڑے وہ سب من و عن نظم کئے گئے ہیں یوں تو اسکی شاعرانہ حیثیت بھی بہت کچھ ہے لیکن خود نوشتہ سوانحعمری کا ایک دردناک ٹکڑا ہونیکی وجہ زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

جلد مراثی۔ اسمیں ۲۵ مرثئے ہیں جن کے کل بند دو ہزار ایک سو گیارہ ہیں۔

دفتر غم و بحر الم۔ اسمیں ۲۲ مرثئے ہیں۔

سرمایہ ایمان۔ اسمیں ۳۲ مرثئے ہیں۔

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ان کے دو دیوان ہیں۔ ایک میں (۲۳۰۴) اشعار ہیں۔ اس میں سب غزلیں ہیں۔ دوسرے میں (۸۷۷۵) اشعار ہیں۔ اس میں ایک مسدس ایک مناجات دو تین نامے اور تین چار رباعیات کے سوا باقی سب غزلیں ہیں۔ نمونے کے طور پر دو غزلیں نقل کیجاتی ہیں پہلی آتش کے جواب میں ہے اور دوسری غالب کے۔

اُڑے ہے باغ سے باغباں کیسے کیسے ۔۔۔ خزاں ہو گئے بوستاں کیسے کیسے
خدا کے لئے اپنی زلفیں اٹھاؤ ۔۔۔ یہاں قید ہیں باغباں کیسے کیسے
رہا عشق سے نام مجنوں کا ورنہ ۔۔۔ تہ خاک ہیں بے نشاں کیسے کیسے
وہ نازک کمر تھا توقف صد نے اکثر ۔۔۔ مجھے خط دئے بے نشاں کیسے کیسے

کلیجہ میں اختر پھپھولے پڑے ہیں
میرے اٹھ گئے قدرداں کیسے کیسے

تلخی ہجر سے ہیں شیریں بیاں کے پاؤں ۔۔۔ سر کی جگہ ترا شئے پھر کوہ کن کے پاؤں
اس ناتواں کے جسم پہ پڑ دو لگتے نہیں ۔۔۔ ہیں شوق راہ یار سے سارے بدن کے پاؤں
آیا شراب خانہ میں ٹوکر نہ محتسب ۔۔۔ کاسے سے آج توڑ تے پیاسنگ کے پاؤں
اختر غزل کا سیر کی خاطر سے کہہ چکے ۔۔۔ بیواسطہ پہ تھے گلے میں سخن کے پاؤں

نواب معشوق محل صاحبہ نگار محل صاحبہ وغیرہ اوسط درجہ کی وفادار ہیں باقی سب بے وفا .... امیدوار ہوں یہ بے وفائی نامہ جو کوئی ملاحظہ فرمائے۔ عورتوں کی محبت سے باز رہے اور اپنا روپیہ ایمان تلف نہ کرے کیونکہ اس کا جو انجام ہوتا ہے وہ ظاہر ہے یہ لوگ اگر حضرت یوسف کو بھی پائیں تو اپنی بے وفائی سے ہاتھ نہ اٹھائیں لہٰذا ان لوگوں سے کنارہ کرنا بہت اچھا ہے۔ مجھ سے بادشاہ خوبصورت و خوب سیرت کے ساتھ جس کی صفت و ثنا میں کتابیں بھری پڑی ہیں دل نہ لگائیں تو بھلا دوسرے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی ہے۔

واجد علی شاہ کو حکومت کرتے ہوئے دس برس گذر گئے۔ ایک دفعہ رزیڈنٹ اور ٹرم گورنر جنرل کا خط لئے ہوئے اُن کے دربار میں آیا خط میں لکھا تھا کہ تمہاری سلطنت بہت بدنام ہے اور رعایا تم سے ناخوش ہے اس لئے ہم تم کو سلطنت سے علیحدہ کرتے ہیں۔ لیکن وعدہ کرتے ہیں کہ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ گزارے کیلئے تمہیں ملتا رہے گا۔ حضرت جانعالم اس زمانے میں علیل تھے اس لئے انہوں نے دیکھا کہ جز طاعت غیر چارہ نہیں۔ وہ راضی ہونے کو تھے جانثاران وقت نے مجبور کیا کہ بادشاہ سلامت ضرور انگلستان جا کر فریاد کریں۔ بعد از خرابی بسیار خواجہ بیدار شد۔ غرض انہوں نے سفر پر کمر باندھی اور لکھنؤ سے کانپور الٰہ آباد اور بنارس ہوتے ہوئے براہ دریا کلکتہ پہنچے وہاں پہنچ کر مٹیا برج میں ٹھہرے۔ یہاں ان کی بیماری نے طول کھینچا اور نقاہت حد سے زیادہ ہوئی تو مجبوراً اپنی والدہ محترمہ ملکہ کشور، اپنے عزیز بھائی مرزا اسکندر حشمت اور اپنے ولیعہد مرزا محمد علی بہادر کو استرداد سلطنت کی کوشش کیلئے انگلستان روانہ کیا اور خود مٹیا برج میں مقیم ہو گئے۔

سال بھر کی بیماری کے بعد خدا نے شفا عطا کی تو تمام ملازمین اور مصاحبان حرم نے خوشی کا جشن منایا۔ لیکن ابھی سوئے ہی تھے کوٹھی کو گوروں نے اچانک گھیر لیا۔ وائسرائے کے سکریٹری مسٹر ایڈمنسٹن نے کہا کہ بعض باغیوں کے بیان سے آپ پر اشتباہ ہوتا ہے حالانکہ آپ کی ذات پر کوئی بدگمانی نہیں کیجا سکتی۔ لیکن مصلحت وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ چند دن فورٹ ولیم میں چلکر رہیں بادشاہ کیطرف سے کوئی عذر نہ سنا گیا۔ پانچ مصاحبین مجاہد الدولہ دیانت الدولہ، ذوالفقار الدولہ، ولایت الدولہ اور محتشم الدولہ، شاہی طبیب الدولہ کاظم علی سوار، باقر علی، محمد جان چوبدار، عبدار خاں کنول بردار، جمال الدین چپراسی، شیخ امام بخش قلیاں بردار، امیر بیگ خواص، ولی محمد بولدان بردار، پنجہ کش گول انداز، عبدالرزاق آرام گوش، کریم بخش آبکش۔ حاجی قادر بخش کہار، حامی گاڑی بونچھ اور بیر نواب رفیق محل الدولہ خادمہ عورتوں میں داروغہ راحت السلطان خاصہ بردار، کریٹانی آب خاصہ دار، ... تاصدان بردار محمدی خانم توشک ... کا ... راہ ہوئے۔

فورٹ ولیم کا ایک پھاٹک قلی دروازہ کہلاتا ہے آٹھ دن تک یہ غریب الوطن قیدی اوس کے بالاخانے پر رہے۔ اس کے بعد قلعہ کے اندر ایک کوٹھی میں جگہ دی گئی فتح الدولہ نے جو کہنہ مشق شاعر اور بادشاہ جمجاہ کے اوستاد تھے یہاں انتقال کیا طبیب الدولہ نے قید کی مصیبت سے بہت آہ و واویلا کی اور انگریزوں کی اجازت سے قید سے چھوٹ کر مٹیا برج میں مقیم ہوئے مگر جب کبھی بادشاہ کی طبیعت ناساز ہوتی علاج کیلئے آتے کربلائی قید کی تکلیف گوارا نہ کرسکی۔ اسقدر بیباک ہوگئی کہ مظلوم سلطان سے لڑ بھڑ کر چلی گئی۔

قیدیوں میں سے کوئی قلعہ کے باہر نہ نکلنے پاتا اور نہ کوئی باہر کا آدمی اُن سے ملسکتا سقہ اور ملازمین تک کوئی چیز لاتے تو گورے نگرانی کیلئے ساتھ آتے خاصہ مٹیا برج سے بک کر آتا تھا محلات کے یہاں سے روز خاصہ کے خوان و خاصدان وغیرہ آتے تھے جنکو اچھی طرح سے دیکھ بھال لیا جاتا مگر والدہ اور بھائی کے یہاں سے جو خطوط لندن سے آتے وہ برابر پہنچ جاتے انہیں خطوں سے واجد علی شاہ کو ماں اور بھائی کی وفات کا حال معلوم ہوا جس سے بیحد و حساب رنج پہونچا۔

اسی زمانے میں بادشاہ کو واجد علی داروغہ کی عرضداشت ملی اس نے پہلے تو اطمینان دلایا تھا کہ تمام محلات عالیات اور شہزادے اور شاہزادیاں خیریت سے ہیں بعد اس کے انکی تنخواہوں کے بند ہو جانے سے فقر و فاقے میں مبتلا ہونے کے دردناک حالات تھے یہ عرضداشت بادشاہ نے اپنی ایک تحریر کیساتھ منسلک کر کے لاٹ صاحب کی خدمت میں بھیجدی۔ لاٹ صاحب نے جواب میں اطمینان دلایا کہ آپ سب متعلقین کی عنقریب خبر گیری کیجائیگی اور فی الحال ضروری مصارف کیلئے دو لاکھ روپیہ عطا ہوئے۔

جب اس سخت قید میں ایک زمانہ گزر گیا اور غدر کی شورش کم ہوئی تو واجد علیشاہ کو خدا خدا کر کے فورٹ ولیم سے رہائی نصیب ہوئی اور مٹیا برج کے گلزار میں از سر نو بہار آئی جہاں ماہ طلعت پریجمالوں کی آنکھیں اور فرقت زدہ ملازموں کے وفادار دل اپنے جانعالم کے شوق میں بچھے ہوئے تھے مٹیا برج جو شمع اودھ کا آخری شمعدان تھا اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا لکھنؤ اُجڑ گیا مگر اس کے منتخب صاحبان کمال وہاں پہنچ کے ظل اللہ جہاں پناہ کے سایہ عاطفت میں رہا بھاگرتی کے کنارے بس گئے تھے۔ مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ و دربار اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگالے کے ایک کونے میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ بجھنے کو تھی لہذا اکثر اوقات چراغ سحر کیطرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھاتی تھی لیکن بادمخالف کا مقابلہ نا بست کے آخر ۱۸۸۷ء میں ایک تند و تیز جھکڑ مغرب کیطرف سے آیا اور اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا

واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت پاکیزہ اور بلند درجے کا تھا عربی کے تو عالم نہ تھے البتہ فارسی میں بقول مولانا شرر

اسی دیوان میں ایک غیر منقوط بند ملتا ہے۔

کرم الٰہ کا حائل ہوا ہمارا واہ کرو کلام کہ وہ دل ہوا ہمارا واہ
دل اس امام کا عامل ہوا ہمارا واہ صلہ ملا کہ وہ کامل ہوا ہمارا واہ

لکھا ہمارا الم اور حال کا کل کا
وہ رو د لکھا کہ ہوا دسوکہ ہم کو اک گل کا

رقص

(جناب محمد عبدالرحمٰن چغتائی صاحب)

رقاصہ نے حنا لگا رکھی تھی۔ بادشاہ نے رقص کے لئے حکم دے رکھا تھا۔

بادشاہ رقاصہ کے انتظار میں اس قالین پر جہاں رقاصہ کے پاؤں جگنو کی طرح اٹھتے بیٹھتے دکھائی دیں گے کسی بڑے دیوتا کے بت کی طرح . . . . تمثیل حیرت بنا تک رہا تھا۔

قالین یہ وہی جگہ ہے جہاں بادشاہ کا دل رقاصہ کے قدموں کے ساتھ رقص کریگا . . . .

. . . . بادشاہ محو تماشہ ہے۔

رقاصہ کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹ پازیبوں کی جھنکار ابھی تک سنائی دے رہی ہے . . . . لیکن قالین پر اس کے قدموں کا کوئی نشان نہیں۔

غزل

(نواب ثنا یار جنگ بہادر قراج اول تعلقدار ضلع رائچور)

دل اس بت پرفن سے بھی وصل کا سائل ہے
دیوانہ ہی دیوانہ انجام سے غافل ہے

یاں منتظر جلوہ اک عاشق بیدل ہے
واں محو خود آرائی وہ حور شمائل ہے

دیباچۂ الفت ہے محرومی و ناکامی
واماندگی منزل قطع رہ منزل ہے

آوارۂ غربت کو حاجت نہیں رہبر کی
خار رہ منزل ہی خضر رہ منزل ہے

موجوں کے تلاطم کا کیا خوف شناور کو
ہاں ہمت مردانہ دو ہاتھ میں ساحل ہے

منت کش عزلت ہے میری شب تنہائی
یا ایک میرا نالہ فریاد رس دل ہے

یہ کوچہ جاناں ہے اور یہ در جانانہ
اک صید گہ جاں ہے اک سجدہ گہ دل ہے

تم دل کی حقیقت سے آگاہ نہیں شاید
ہر قطرہ خون میرا لخت جگر دل ہے

سارے یہ کرشمے ہیں اک چشم فسوں گر کے
ناقہ ہے نہ مجنوں ہے لیلیٰ ہے نہ محمل ہے

مانا کہ مزاج اس نے وعدہ تو کیا لیکن
وعدہ کا وفا ہونا مشکل سی یہ مشکل ہے

شکسپیر کا ایک شاہکار ڈراما

(انٹنی اور کلیوپٹرا کا ایک سین)

مترجمہ

(جناب سید صغیر حسین صاحب میرٹھی)

شکسپیر کے مشہور ڈراما انٹنی اور کلیوپٹرا اور اس کے حسن و عشق کے معرکتہ الآرا پلاٹ سے اردو دنیا متعدد اصحاب کی کوششوں سے واقف ہو چکی ہے صغیر صاحب نے پورے ڈرامے کو بڑی صفائی اور خوبی سے اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس اشاعت میں اس کا ایک سین پیش کیا جا رہا ہے آئندہ اس کے چند اور مزید سین شائع کیے جائینگے توقع ہے شکسپیر کا یہ شاہکار بھی اردو جامے میں زیور طباعت سے آراستہ ہو جائیگا۔

(مجلۂ مکتبہ)

دوسرا سین

روم۔ لیپیڈس کے محل کا ایک کمرہ

اینوباربس و لیپیڈس کا آنا

لیپیڈس۔ اچھے اینوباربس یہ ایک شریفانہ کام ہے۔ اور تم اُس کو بڑی خوبی سے انجام دو گے کہ اپنے سردار کو خوشامد کر کے ملائم اور نرم گفتگو پر آمادہ کرو۔

اینوباربس۔ میں ان سے التجا و فکر وں گا کہ وہ اپنے شایانِ شان گفتگو کریں اور خود سیزر نے ان کو برانگیختہ کیا مجھکو یقین ہے کہ انٹنی سیزر سے متنفرانہ برتاؤ کرینگے مشتری کی قسم اگر انٹنی کی ڈاڑھی میری منہ پر ہوتی تو آج میں سیزر کی ملاقات کے

سے لئے حجامت تک نہ ہوتا۔

لیپی ڈس۔ یہ وقت ذاتی مخاصمت کے اظہار کا نہیں ہے۔

اینوبارس۔ کسی معاملہ کے لئے ہر وہ وقت موزوں ہو سکتا ہے جس میں کہ اس معاملہ کا وقوع ہوا ہو۔

لیپی ڈس۔ لیکن اہم معاملات کی موجودگی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دخل ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

اینوبارس۔ نہ اسوقت جبکہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا وقوع اول ہو۔

لیپی ڈس۔ تمہاری گفتگو غصہ سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن خدا کیلئے بجھتی ہوئی چنگاریوں کو پھر مشتعل نہ کرو۔ معزز انیٹنی بھی ادھر آرہے ہیں۔ (انیٹنی اور ونیٹی ڈیس کا آنا)

اینوبارس۔ اور وہ سامنے سے سیزر بھی۔

انیٹنی۔ اگر یہاں کوئی قابلِ اطمینان تصفیہ ہو جائے تو ہمکو فوراً پارتھیا روانہ ہو جانا چاہیئے۔

ونیٹی ڈیس۔ تم نے سنا۔

سیزر۔ میکنے اس میں کچھ نہیں جانتا اگر پا سے دریافت کرو۔

لیپی ڈس۔ معزز دوستو! یہ وہ مقصد جس کے لئے ہم یہاں پر یکجا ہوئے ہیں نہایت اہم ہے۔ پس کبھی ایک حقیر امر کی وجہ سے ہم میں تفرقہ نہ پڑنا چاہیئے۔ باہمی رنجشوں کو آہستگی سننا چاہیئے۔ جب ہم اپنے معمولی اختلافات کا تذکرہ بحالت غیظ و غضب کرتے ہیں تو گویا اپنے رو بہ اندمال زخموں کو اور الٹا مہلک بنا دیتے ہیں۔ پس اے معزز شرکا! یہی وجہ ہے کہ میں نہایت سرگرمی سے ملتجی ہوں کہ اپنے انتہائی [illegible] وجوہات مخاصمت پر نہایت شیریں الفاظ میں گفتگو کرو نہ اس طرح کہ موجودہ حالت میں مزید رنجش کا اضافہ ہو جائے۔

انیٹنی۔ یہ ایک عمدہ تقریر ہے۔ اگر ہم اپنی اپنی فوجوں کے روبرو ایک دوسرے سے آمادۂ جدال ہوتے تو میں یہ کرتا (مصافحہ کرتا ہے)

سیزر۔ روم میں آپ کا آنا مبارک ہو۔

انیٹنی۔ شکریہ!

سیزر۔ تشریف رکھیئے۔

انیٹنی۔ آپ تشریف رکھیئے۔

سیزر۔ بہتر ہے جیسی آپ کی مرضی۔

انیٹنی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بہت سی باتوں کا برا مان جاتے ہیں۔ جو ایسی نہیں ہوتیں کہ ان کا برا مانا جائے یا اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سیزر۔ میں تو تضحیک ہونگا اگر بلا سبب یا کسی معمولی وجہ کی بنا پر یہ کہوں کہ میں ناراض ہوا اور وہ بھی آپ سے اور بھی زیادہ قابل مضحکہ ہوں گا اگر میں نے کبھی برائی کے ساتھ آپ کا نام لیا ہو جبکہ آپ کا تذکرہ مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا تھا۔

انیٹنی۔ میرے مصر کے قیام سے آپ کو کیا واسطہ تھا؟

سیزر۔ اس سے زیادہ نہیں جتنا میرا یہاں روم کا قیام آپ کیلئے مصر میں واسطہ رکھتا تھا۔ لیکن اگر آپ میرے خلاف وہاں کوئی سازش کرتے۔ البتہ آپ کا قیام مصر قابل ضرف گیری تھا۔

انیٹنی۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ سازش کرنا؟

سیزر۔ آپ تو میرے مطلب کا اندازہ ان واقعات سے کر سکتے ہیں جو مجھے یہاں پیش آئے۔ آپ کی بیوی اور بھائی نے میرے خلاف فوج کشی کی جس کا بیّن مقصد آپ کی طرف داری تھا۔ جنگ میں آپ ہی کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔

انیٹنی۔ اس معاملہ میں آپ کو غلط فہمی ہوئی میرے بھائی نے اپنی اس حرکت میں مجھ کو بنائے جنگ کبھی قرار نہیں دیا تھا میں نے اس کی تحقیق کر لی ہے۔ مجھے اس کا علم ان راستباز لوگوں کے بیانات سے ہوا ہے جنہوں نے آپ کی طرف داری میں تلواریں کھینچی تھیں کیا اس نے آپ کے اقتدار کی تحقیق کرنے میں میرے اقتدار کی تحقیر نہیں کی اور کیا ان کا آپ کے خلاف جنگ کرنا میری مرضی کے خلاف نہیں ہوا جبکہ ہم دونوں کے اغراض واحد ہیں۔ اس کے متعلق میری گذشتہ تحریرات نے آپ کا کافی اطمینان کر دیا تھا اگر آپ مجھ سے لڑنا ہی چاہتے ہیں تو چونکہ آغاز جنگ کے لئے آپ کے پاس کافی مواد موجود نہیں ہے اس لئے میرے بھائی کے طرز عمل کو اس کا سبب نہ قرار دیجئے۔

سیزر۔ مجھ پر نقائص رائے کے عائد کرنے میں آپ خود ستائی کر رہے ہیں لیکن آپ نے اپنے عذرات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

انیٹنی۔ نہیں نہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے میں جانتا ہوں اور مجھکو اس بات کا یقین ہے کہ آپ اس خیال کی

اختیاج کاملہ کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ میرے اور آپ کے اغراض واحد ہوتے ہوئے ہیں ان لڑائیوں کو بہ نظر پسندیدگی نہیں دیکھ سکتا تھا جو میرے اطمینان قلب اور صلح پسند طبیعت کے بالکل خلاف تھیں۔ اور میری بیوی کے متعلق جو آپ نے فرمایا میری تمنا ہے کہ کاش اس کا جیسا ہوش کسی دوسری عورت میں پایا جاتا۔ آپ ایک ثلث دنیا کے مالک ہیں اور عنانِ حکومت کی تھوڑی سخت گیری سے اس کو اطمینان کے ساتھ قدم قدم چلا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی زوجہ پر قابو حاصل کرنا محال ہے۔

اینوباربس۔ کاش ہم سب کی بیویاں ایسی ہی ہوتیں تا مرد عورتوں سے دست بگریباں رہتے!

اینٹنی۔ وہ اسقدر ضدی اور خودرائے تھی کہ اس کے برپا کئے ہوئے فسادات جو خودسری کا نتیجہ تھے لیکن جن میں انتظامی دوراندیشی اور زودفہمی کی کمی نہ تھی آپ کے حق میں باعثِ تکلیف ثابت ہوئی جس کا میں نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں اس بارے میں آپ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ میں مجبور تھا۔

سیزر۔ ان سب باتوں کے متعلق میں نے آپ کو لکھا تھا۔ جب آپ اسکندریہ میں مصروف عیش و عشرت تھے لیکن ان تمام خطوط کو بیکار سمجھکر آپ نے جیب میں رکھ لیا اور میرے قاصد کو طعن و تشنیع کے ساتھ اپنے سامنے سے دور کردیا۔

اینٹنی۔ جناب قبل اسکے کہ اسکو باریابی کی اجازت دیجاتی وہ یکدم اندر گھس آیا۔ اس وقت میں نے پہلے پہل تین بادشاہوں کی دعوت کی تھی اور اس وجہ سے شب کو میری وہ حالت نہ تھی جو صبح میں تھی لیکن دوسرے روز میں نے اس سے اپنی شب کی حالت کا تذکرہ کیا جو گویا اس سے معافی مانگنے کے برابر تھا ہمارے جھگڑے سے اس شخص کو کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے اگر ہمکو لڑنا ہی ہے تو موجودہ بحث میں سے اس کا تذکرہ قطعی خارج کردینا چاہیئے۔

سیزر۔ آپ نے اس عہد و پیمان کی پابندی نہیں کی جس کے لئے قسم کھائی تھی۔ اسی قسم کا الزام مجھ پر عائد کرنے کے لئے کبھی تمہاری زبان نہیں کھل سکتی۔

لیپی ڈس۔ سیزر تحمل سے کام لو۔

اینٹنی۔ نہیں لیپی ڈس ان کو کہنے دو ان کا یہ گمان کہ مجھ میں اس اقتدار کی کمی ہے جس کا انہوں نے ابھی ابھی ذکر کیا ایک نہایت قابل احترام معاملہ ہے سیزر اور فرمائیے میں بھی تو سنوں کہ وہ شرائط کیا تھے جو

متعلق ہیں نے قسم کھائی تھی؟

سیزر۔ یہی کہ بوقت ضرورت فوج اور روپیہ سے تم میری اعانت کرو گے لیکن ان دونوں سے تم نے انکار کیا۔

انیٹونی۔ یوں کہئے کہ غفلت کی وہ بھی ایسے وقت میں ہوئی جب کہ نشہ سرور نے مجھکو خود اپنی عالم ہوشی سے بے خبر کر دیا تھا۔ جہاں تک جلد ممکن ہوگا میں اس کی تلافی کروں گا۔ لیکن اپنے نقائص کے اعتراف سے میری عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور میرا اقتدار بغیر اس عظمت کے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے مصر سے نکالنے کیلئے فلویا نے یہاں فسادات شروع کئے جس کے لئے میں ایک لاعلم اور بے خبر بانی کی حیثیت سے اس حد تک معافی کا خواستگار ہوں جہاں تک کہ میری عزت اور خودداری اس معاملہ میں مجھ کو سرنگوں ہونے کی اجازت دیتی ہے۔

لیپی ڈس۔ یہ نہایت شریفانہ گفتگو ہے۔

میکے ناس۔ مہربانی فرما کر آپ اپنی باہمی رنجشوں کو زیادہ طول نہ دیجئے۔ ان کو قطعی دل سے نکال ڈالنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ ضرورتیں آپ سے باہمی مصلحت کے لئے التجا کر رہی ہیں۔

لیپی ڈس۔ میکے ناس تم نے قابل تعریف بات کہی۔

اینوباربس۔ یا اگر آپ دونوں فی الوقت ایک دوسرے سے محبت قرض لے لیں تاپمپی کا تذکرہ قطعی مفقود ہو جانے کے بعد پھر واپس کر سکتے ہیں۔ جب آپ کو کوئی اور کام نہ رہے گا تو لڑنے جھگڑنے کے لئے کافی موقع ملے گا۔

انیٹونی۔ تم محض ایک سپاہی ہو اس لئے سیاسی معاملات کے سمجھنے سے قاصر ہو خاموش رہو۔

اینوباربس۔ آہا میں بالکل بھول گیا تھا۔ راست گفتار شخص کے لئے خاموشی ہی مناسب ہے۔

انیٹونی۔ تمہاری موجودگی اس مجمع کے لئے باعث تذلیل ہے لہذا زیادہ گفتگو نہ کرو۔

اینوباربس۔ تو جاؤ جہنم میں میں بھی بت بنا جاتا ہوں۔

سیزر۔ میں مقصد تقریر کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا البتہ طرز گفتگو کو ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہم دوستی قائم رہے جبکہ ہمارے طبائع اپنے طرز عمل میں سقدر مختلف ہیں تاہم اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ کونسا حلقہ دوستی ہمکو مضبوطی کے ساتھ اپنے حصار میں لے سکتا ہے تو میں دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک

اسکی تلاش کرنیکے لئے آمادہ ہوں۔

اگرپا - سیزر! مجھکو بھی اجازت دیجئے۔

سیزر - ہاں ہاں اگرپا کہو۔

اگرپا - پیاری آکٹیویا آپ کی سوتیلی بہن ہیں اور عالی مرتبت مارک انٹنی کی زوجہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

سیزر - اگرپا ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالو۔ اگر کلیوپٹرا نے سن لیا تو تمہاری سخت کلامی ان کیجانب سے مستوجب سزا ہوگی۔

انٹنی - سیزر! میری اس سے کوئی شادی تو ہوئی نہیں مجھے سننے دیجئے کہ اگرپا اور آگے کیا کہتے ہیں۔

اگرپا - آپ دونوں میں رشتۂ محبت اور تعلقات برادرانہ قائم کرنے اور آپکے دلوں میں اخوت باہمی کی نہایت مضبوط گرہ ڈالنے کے لئے مناسب ہے۔ کہ انٹنی آکٹیویا کو اپنی زوجیت میں لے آئیں جن کے حسن کا تقاضہ یہ ہے کہ بہترین انسان انکا شوہر ہے۔ نیکی اور ظاہری شان و شوکت سے وہ بات ظاہر ہے جس کا فخر کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اس شادی سے تمام حقیقی رنجشیں جو اسوقت نہایت ہی اہم معلوم ہو رہی ہیں اور تمام اہم اندیشے جو اسوقت مختلف خطرات کا پیش خیمہ ہیں بالکل بے حقیقت ہو جائینگے بحالت موجودہ محض افواہیں اصلیت کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ مگر اسوقت واقعات بھی افواہوں کی صورت اختیار کرلیں گے انکو محبت آپ دونوں سے ہوگی وہ آپ کو باہم دگر اور عوام الناس کو آپ دونوں سے محبت کرنے پر مجبور کریگی جو کچھ میں نے عرض کیا اسے معاف فرمایئے۔ میرا یہ خیال وحشی نہیں ہے بلکہ خوب غور شدہ ہے جس کو بطور فرائض میں بارہا سوچ چکا ہوں۔

انٹنی - کیا سیزر آپ کچھ فرمائینگے؟

سیزر - اس وقت تک نہیں جب تک کہ یہ معلوم ہو جائے کہ موجودہ گفتگو سے انٹنی نے کیا اثر لیا۔

انٹنی - اگرپا بالفرض میں کہوں کہ اچھا اگرپا ایسا ہونے دو تو اگرپا میں اسکی تکمیل کی کیا قدرت ہے۔

سیزر - سیزر کا اقتدار اور آکٹیویا پر اس کا قابو ایسا کر سکتا ہے۔

انٹنی - کاش [illegible] ایسے اعلیٰ مقصد میں جو اس [illegible] معلوم ہوتا ہے رکاوٹ پیدا ہونے کا خواب بھی نہ دیکھوں ہاتھ لائیے۔ اس عالیشان اور مبارک کام میں امداد فرمایئے خدا کرے اس وقت سے برادرانہ محبت ہمارے دلوں میں جوش زن رہے اور ہمارے اہم منصوبوں کے تکملہ میں ہماری

مدد کرے۔

سیزر۔ مصافحہ کیلئے میرا ہاتھ ہے میں ایک ایسی بہن آپ کے حوالہ کرتا ہوں جس سے کبھی کسی بھائی نے محبت نہ کی ہوگی۔ ہماری سلطنتوں اور دلوں کو متفق کرنے کے لئے خدا اس کو زندہ رکھے اور پھر کبھی ہماری باہمی محبت دور نہو۔

لیپی ڈس آمین! یہ نتیجہ نہایت مسرت انگیز ہے۔

انیٹنی۔ میرا خیال پامپی کے خلاف جنگ کرنے کا نہ تھا۔ کیونکہ کچھ عرصے سے وہ میرے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آرہا تھا۔ میں اب صرف آپ کا شکریہ ادا کرسکتا ہوں مبادا مجھ پر احسان فراموشی کا الزام عائد ہو اور اس کے بعد میں ابھی اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں۔

لیپی ڈس۔ وقت آن پہونچا ہمکو پامپی پر فوراً حملہ آور ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ ہم پر دھاوا کردے گا۔

انیٹنی۔ اس کا پڑاؤ اس وقت کہاں ہے؟

سیزر۔ کوہ سی نم کے قریب۔

انیٹنی۔ اس کی بڑی قوت کسقدر ہے۔

سیزر۔ زبردست اور روز افزوں۔ لیکن سمندر پر تو اس کا کامل تسلط ہے۔

انیٹنی۔ مشہور بھی یہی ہے کاش اب تک میں اس سے مبارزطلبی کرچکا ہوتا! ہمکو اس کے لئے جلد تیاری کرنی چاہیئے لیکن قبل اس کے ہم مسلح ہوں طے شدہ معاملے کی تکمیل کرلینی چاہیئے۔

سیزر۔ بڑی خوشی کیساتھ میں اپنی بہن سے ملاقات کے لئے آپ کو مدعو کرتا ہوں اور راست وہیں لے چلتا ہوں۔

انیٹنی۔ لیپی ڈس آپ بھی اپنی شرکت سے ہم کو محروم نہ رکھیں گے۔

لیپی ڈس۔ معزز انیٹنی۔ علالت بھی مجھکو شرکت سے نہیں روک سکتی۔

(بینڈ کا بجنا۔ سیزر انیٹنی اور لیپی کا جانا)

میکے ناس (اینوباربس سے) جناب مصر سے سلامتی سے واپس آنا مبارک ہو۔

اینوباربس۔ (اگرپا اور میکے ناس کا تعارف کراتا ہے) (اگرپا کو) یہ سیزر کے نہایت چہیتے لائق میکے ناس ہیں۔ (میکے ناس سے) اور یہ میرے محترم دوست اگرپا ہیں۔

اگرپا۔ اچھے اینوباربس۔

میکے ناس ہم کو خوش ہونے کا بہت اچھا موقع ملا۔ کیونکہ معاملات نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا گئے۔ آپ کا قیام مصر میں پُرلطف رہا ہوگا۔

اینوبارس جی ہاں جناب۔ ہم اسقدر سوئے کہ دن کی صورت بھی نہ دیکھی اور شغل شراب سے رات کی تبدیل کی۔

میکے ناس کیا یہ سچ ہے کہ آٹھ سالم بریاں جنگلی سور دسترخوان پر موجود تھے۔ اور کھانے والے صرف بارہ۔

اینوبارس جو کچھ آپنے کہا یہ اصلیت کے مقابلہ میں بالکل ایسا ہے جیسا کہ عقاب کے سامنے مکھی اس سے بھی کہیں زیادہ سامان دعوت مہیا تھا جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

میکے ناس اگر اس کے متعلق خبریں سچ ہیں تو وہ ایک نہایت ہی حسینہ وجمیلہ اور عالیشان خاتون ہے۔

اینوبارس چونکہ دریائے سڈنس پر اول ول دونوں دوچار ہوئے تو کلیوپٹرا نے اینٹنی کے دل پر کامل تسلط کر لیا۔

اگریپا یا تو کلیوپٹرا اس موقع پر اپنے پورے جاہ وحشم کیساتھ موجود ہوگی۔ یا مخبر نے مجھکو نہایت خوبی کے ساتھ قصۂ تصنیف کر کے سنایا۔

اینوبارس میں عرض کرتا ہوں۔ سنیئے وہ کشتی جس پر کلیوپٹرا سوار تھی ایک چمکدار تخت شاہی کے مانند تھی اور اس کا عکس سطح آب پر شعلہ افگن تھا۔ کشتی کا پچھلا حصہ خالص طلائی تھا۔ بادبان ارغوانی تھے اور ایسے معطر کے ہوائیں بھی ان کے عشق کی مریض تھیں۔ پتوار نقروی تھے جن کی متواتر ضرب سے سریلا اور خوش گوار نغمہ پیدا ہوتا تھا اور وہ پانی جس پر ان کی ضرب پڑتی تھی نہایت تیزی کے ساتھ ان کے پیچھے رواں ہوتا تھا گویا کہ وہ انکی ضربوں کا عاشق ہے خود کلیوپٹرا کے متعلق جس قدر بھی بیان کیا جائے ناکافی ہے۔ وہ اپنے زربفتی شامیانے کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے سراپا کے سامنے زہرہ کی وہ تصویر ماند تھی جس کے کھینچنے میں مصور کے خیال نے دست قدرت کو مات کر دیا تھا۔ اس کے اطراف حسین اور نوخیز لڑکے متبسم کیوپڈ (عشق کا دیوتا) کی طرح استادہ تھے، ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگ کے پنکھے تھے جن کی ہوا بجائے ٹھنڈک پہونچانیکے اس کے نرم ونازک رخساروں کی تمتماہٹ کو اور زیادہ تیز کر رہی تھی۔ اور ان سے وہ اثر پیدا ہو رہا تھا جو ظاہر نہونا چاہیئے تھا۔

اگریپا اینٹنی کیلئے کیسا نایاب نظارہ رہا ہوگا۔

اینوبارنس کلیوپٹرا کی خواصیں جل پریاں (عروس بحری) پرندوں کے مانند تھیں اور ہر ایک حسن وخوبی میں بنت البحر کو بھی شرمندہ کرتی تھی اس کی آنکھوں کی طرف نگراں تھیں گویا کہ اشاروں پر حکم بجالانیکی منتظر ہیں اور جس ادا کے ساتھ وہ اس کے

سامنے تعظیماً خم ہوتی تھیں - اس سے اس نظارے کی خوبی میں اضافہ ہو جاتا رنگ گئے تھے کشتی کے پچھلے حصے پر ایک حسین بنت البحر پتوار لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلانے میں مصروف تھی - ریشمی ڈوریاں ان پھولوں کے مانند نرم و نازک ہاتھوں سے مس ہونے کی مسرت میں پھولی نہیں سماتی تھیں جو اس فرض کو نہایت ہوشیاری سے انجام دینے کیلئے مقرر کئے گئے تھے - کشتی سے ایک نرالی اور عنبر فشاں خوشبو آرہی تھی جس سے قرب وجوار کے گھاٹ معطر تھے - تمام باشندے جوق جوق کلیوپٹرا کو دیکھنے کیلئے شہر سے باہر نکل پڑے تھے حتی کہ انٹنی چوک کے منظر عام چبوترے پر تخت نشین ہوا سے باتیں کرتا ہوا تنہا بیٹھا رہ گیا - اور اگر اس کو خلا واقع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہوا بھی کلیوپٹرا کے نظارے کیلئے چلی گئی ہوتی اور دنیا قطعی اس سے خالی ہو جاتی -

اگریا - لاثانی ملکہ مصر!

اینوبار بس - جس وقت وہ کشتی سے اتری انٹنی کے قاصد وہاں پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر مدعو کیا جس کے جواب میں اس نے نہایت ادب سے کہلا بھیجا کہ اگر آپ خود ہمارے مہمان ہوں تو بہتر ہے - ہمارے خوش اخلاق انٹنی نے کبھی صنف نازک سے لفظ "نہیں" کہتے نہیں سنا - دس مرتبہ خط بنوا کر دعوت میں گئے اور اپنا دل اس کھانے کی قیمت میں دیدیا جس کو صرف نگاہوں سے کھانے پر اکتفا کی -

اگریا - ایسی شاہزادی!

اینوبار بس - میں نے ایک بار اس کو شاہراہ عام پر ایک ٹانگ سے چالیس قدم تک دوڑتے ہوئے دیکھا اور بیدم ہو کر بولتی اور ہانپتی جاتی تھی تا کہ اس کا عیب کمال سے بدل جائے اور ہانپتے وقت اسکے الفاظ جادو کا اثر رکھتے تھے

میکے ناس - اب تو انٹنی کو چاہیئے کہ اُسے قطعی چھوڑ دیں -

اینوبار بس - نہیں، وہ کبھی ایسا نہیں کرینگے - عمر کلیوپٹرا کو پژمردہ نہیں کر سکتی - اور نہ رسم و رواج کی پابندی اس کے لاتعداد مختلف آدمیوں کے ساتھ لطف و محبت کے ذائقہ کو بدمزہ کر سکتی ہے - دوسری عورتیں لوگوں کی خواہشات کو آسودہ کر دیتی ہیں مگر کلوپٹرا جس شخص کو بے انتہا سیر کرتی ہے اسکی خواہشات کو اور زیادہ مشتعل کر دیتی ہے کیونکہ نہایت فحش حرکات اس کے اندر دلفریب معلوم ہونے لگتے ہیں حتی کہ اس کو فاحشہ دیکھکر مقدس پادری بھی اس کی اصلاح کیلئے دعا خیر کرتے ہیں -

میکے ناس۔ اگر حسن فہم اور عصمت اینٹنی کے دل کو مشتعل بنا سکتے ہیں تو اکٹیویا اُن کے حصہ میں آ جانا ایک مبارک قرعہ ہے۔

اگرپا۔ اچھے اینوباربس آؤ چلیں اور جب تک آپ یہاں مقیم ہیں میرے مہمان رہیں۔

اینوباربس۔ جناب بانہایت خوشی سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(سب کا جانا)



انساں ہونا

(از مولانا عبد القدیر حسرت صدر شعبہ دینیات)
(جامعۂ عثمانیہ)

غایتِ معرفت و علم ہے ناداں ہونا
سرمۂ دیدۂ تحقیق ہے حیراں ہونا

بوالہوس تیغِ محبت سے ہو کس طرح شہید
کار ہر سنگ نہیں لعلِ بدخشاں ہونا

خود نہاں اور عیاں اس سے نہاں ہائے جہاں
حیرت انگیز ہے پیدائی کا پنہاں ہونا

ایک ہاں یا وہ ہر گونہ بلا ہائے جہاں
کیا قیامت ہے یہ وابستۂ پیماں ہونا

چشمِ تحقیق میں ہیں شادی و ماتم توام
لطمۂ بادِ خزاں گل کا ہے خنداں ہونا

داورِ حشر میری جان ہے بسمل قاتل کو
اور منظور نہیں اس کا پریشاں ہونا

اُنس انسان میں ہے اصل سمجھ لے حسرت
انس جب تک نہ ہو ممکن نہیں انساں ہونا

اتحادِ یورپ

(۱)

ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ڈی ایس سی (پیرس)، ڈی۔ ایف۔ ایم آنرز (لندن)

ڈاکٹر صاحب کا نام اردو صحافت میں بالکل نیا نہیں۔ اس سے قبل آپ کئی اردو رسالوں میں دلچسپ مضمون لکھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور کے "نیرنگ خیال" میں آپ کا ایک مضمون "اتحادِ ایشیا" شائع ہوا تھا۔ آپ نے یہ دلچسپ مضمون ہمارے محبِ صادق ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری کی تحریک پر خاص مجلہ مکتبہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ آپ نے چار برس یورپ میں رہ کر لندن سے برقی انجنیری میں اور پیرس سے طبعیات میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور اب اپنے وطن پنجاب کو لوٹے ہیں (مجلہ مکتبہ)

یورپ باایں ہمہ قیل وقال کبھی متحد نہیں ہو سکا۔ حالانکہ مدبرین فرنگ کی مساعیِ لاحاصل عرصۂ مدید سے اتحادِ یورپ قائم کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سولہویں صدی کی ابتدا میں آنسلون[1] اپنی کتاب "فرہنگِ انقلاباتِ سیاسیاتِ یورپ" کے دیباچے (ص ۱۷) میں لکھتا ہے:

"اب چند ماہرین سیاست اس بات کا سبق دے رہے ہیں کہ یورپ میں ایک سلطنت مشترکہ کی بنا ڈالی جائے مگر یہ کہاں ممکن ہے کہ یورپ والے ایک ایسی انجمن یا اقتدار قائم کرلیں کہ جملہ ممالک فرنگ کے لئے موجد آئین و مصدر احکام متصور ہو۔ "ہنری چہارم" کے فکر رسا اور ایبے سنٹ پیٹر کی ان تھک کوشش نے اس آرزو کو بر لانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر روزمرہ کے مشاہدات اس بات کے موکد ہیں کہ یہ تجویز ناممکنات سے ہے" ایبے سینٹ پیٹر (جس کا ذکر مندرجہ بالا حوالہ میں مرقوم ہے) ایک نہایت بلند پایہ فرانسیسی فلاسفر تھا اس نے اتحادِ یورپ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا اور اس کے بعد جملہ حکومتوں سے استدعا کی کہ اس کتاب عمل پر کاربند ہوں۔ مندرجہ ذیل شرائط اس تجویز اتحاد کا ملخص سمجھیں:

(۱) جملہ شاہان یوروپ مدعو کئے جائیں تا کہ اتحادِ یورپ کی شرائط طے کریں۔

(۲) ہر ملک جو ان شرائط پر دستخط کرے "اتحادی" قرار دیا جائے۔

---

(1) ANCILLON-TABLEAUX DES EIVLUTION DUSYSTEINE POLITIQUE DE L' EUROPE DEPUIS 15 SIECLE BIBSAINH 8ENUIEVE PARIS

(۳) ہر ملک جو اس اتحادِ عظیمہ میں شریک ہو حسبِ مقدور چندہ دے جس سے "انجمن" کا اقتدار قایم کیا جائے اور اس طرح اس کے حلقۂ اثر کو وسعت دی جائے۔

(۴) اختلافِ رائے کے وقت "اتحادی" حرب سے گریز کریں اور قضیات کے تصفیہ کے لئے "پنچایت" پر بھروسہ کریں۔ اس "پنچایت" کے ممبر "انجمن اتحاد" سے منتخب کئے جائیں۔

ایبے سینٹ پیئر روحانیات کا قایل تھا اور انسانی حرص و آز سے کلیتہً بے خبر۔ مندرجۂ بالا تجاویز اسکی سادہ لوحی کی شاہد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس نے "اتحادِ یوروپ" کے لئے یہ لائحۂ عمل تیار کیا اس وقت یوروپ خودغرض بادشاہوں کے زیرِ فرمان تھا جو نخوت و رعونت کے نشے سے اس قدر سرمست تھے کہ انھیں ان تجاویز سے زنجیر پا کرنا تحصیلِ حاصل تھا۔ جین جیک روسو جو ہمیشہ واقعیت کو خیال پر ترجیح دیتا تھا ایبے سینٹ پیئر کے خیالِ اتحاد کی نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ کیونکر امید ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ جو خدائے آسمان کو اپنے ملکی اقتدار میں دسترس نہ ہونے دیں ایک "انجمن اتحاد" کے قوانین پر کاربند ہوسکیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات معمولی سپاہی انسانی خودپرستی کی وجہ سے اپنی شکایات "حضورِ مارشل" میں پہنچانا قابلِ ہتک قرار دیتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خودغرض آزادہ رو شاہانِ یوروپ بوقتِ غیظ و غضب اپنے جذبات کو ایک "کونسل" کے فرمانبردار کردیں گے؟"

یوروپ کے ممالکِ مختلفہ کو ایک تسبیح میں پرونے کا خیال دراصل اس وقت پیدا ہوا جب جنگِ صلیب کے دوران میں یوروپ بھر کے گرجاؤں میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف منادیِ عام کی گئی۔ اس وقت اس خیال کی حیثیت صرف مذہبی تھی۔ چنانچہ ہم پفینڈر کی کتاب (۱) "تاریخِ عالم" کے دیباچے میں حسبِ ذیل عبارت درج پاتے ہیں: "پاپا" کی طرف سے ایک سنسنی خیز اعلان شائع ہوا جس میں جملہ ممالکِ یوروپ کو فلسطین کے عیسائیوں کی اعانت کے لئے متحد ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس دعوت کے جواب میں با اقتدار لوگوں نے جنگِ صلیب میں حصہ لیا۔ مشہور سپہ سالارانِ جنگ میں ہیوز ملقب "اعظم"، برادر شاہِ فرانس، ڈیوک آف نارمنڈی، برادر شاہ انگلستان، ریمنڈ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں"، مگر جنگِ صلیب کے بعد ہوسِ ملک گیری کا [illegible] ہندوستانی"

---

(1) BARON DE PUFFENDER INTRODUCTION A L'HISTOIRE MODERNE GENERALE, EN POLITIQUE BIB. ST GENEVIEVE PARIS

کی دولت اور خوشحالی کو دیکھ کر جملہ ممالک یوروپ کے منہ میں پانی بھر گیا اور ہر ایک کو شاں ہوا کہ کسی طرح یہ "سونے کی چڑیا" اس کی ڈالیوں میں اپنا نشیمن بنائے۔ اس حرص و آز کی وجہ یوروپ میں ایک پھوٹ پڑ گئی اور جذبات اتحاد جو جنگ صلیب نے پیدا کئے تھے، معدوم ہونے لگے مگر آخر کار صد سالہ جنگ نے پھر ایک مرتبہ اقوام یوروپ کو تھکا دیا۔ اور مدبرین یوروپ محسوس کرنے لگے کہ براعظم پر اُس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہوسکتا جب تک ایک رسمی معاہدہ جملہ ممالک یوروپ کے اختیارات کو محدود نہ کرے۔ اس وقت اتحاد یوروپ کی بنیاد "مساوات فوجی" پر رکھی گئی۔ یہ تجویز ایسی تھی جس کو صحیح معنوں میں سیاسی تجویز کہا جاسکتا ہے چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۱۴ء کو جو شرائط نامہ انگلستان، فرانس اور دوسرے ممالک یوروپ میں طے ہوا اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

"صلح عام کو ترقی دینے کے لئے پندرہ جون ۱۸۱۴ء کو ہیگ میں دوسری کانفرنس بلائی جائے جس میں یوروپ کے شہزادے، بادشاہ، مدبرین اور وزراء وغیرہ جمع ہوں تاکہ اتحاد یوروپ سے متعلق مختلف مشکلوں کے حل کے لئے غور و خوض کیا جائے۔"

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے بالاختصار بیان کیا ہے کہ کس طرح یوروپ کئی صدیوں سے ایک رسمی اتحاد کے قائم کرنے کے لئے کوشاں رہا ہے۔ حال میں موسیو بریاں فرانسیسی وزیر امورِ خارجہ نے اس خیال کی تکمیل کیلئے بیڑا اٹھایا ہے۔ لیگ اقوام اسی خیال کو فروغ دینے کے لئے بنائی گئی۔ گو ناواقف دنیا کو کہا گیا کہ اس سے مراد اقوام عالم میں ربط و صلح پیدا کرنا ہے۔ جنگ یوروپ کے بعد اس براعظم کی حالت بدل سی گئی ہے۔ فرانس کے سپاہی جو اس جنگ میں مقتول ہوئے اُن کی تعداد .... سے کم نہیں اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کی آبادی روز بروز رو بہ تنزل ہے لہذا فرانس نے "Security" یعنی وعدۂ معاونت کی پالیسی بے وجہ اختیار نہیں کی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جرمنی باوجود لاتعداد مشکلات کے بحیثیت تجارت، صنعت، اور بالخصوص بہ حیثیت آبادی فرانس سے کہیں بڑھ کر ہے اس کی یہ تیز گامی دیکھ کر فرانس کو چین کی نیند سونا حرام ہے۔ اس لئے فرانسیسی چاہتے ہیں کہ دوسری اقوام سے معاہدے کئے جائیں جن کی رو سے ان کی جنگی حیثیت بڑھ سکے اور دوسرے ملکوں کی جنگی حیثیت کم ہو جائے۔ چنانچہ کیلاگ پیکٹ" جو در اصل موسیو بریاں ہی کی اختراع تھا اس لئے تیار کیا گیا کہ کسی طرح امریکہ اور انگلستان کی ہمدردی

حاصل کی جائے۔ فرانس کی یہ پالیسی دراصل بہت قدیم ہے "اتحادِ ثلاثہ" جو مارشل فوش اور کلیمنشو کی ساعی کا نتیجہ تھا اسی پالیسی کا مظہر تھا۔

۱۷ مئی ۱۹۳۰ء کو موسیو بریاں نے ممالک یوروپ کو دعوت بھیجی کہ وہ ریاست ہائے متحدۂ یورپ کے قائم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں اور اس طرح ہنری چہارم کی مردہ تجویز کو زندہ کرنے میں شریک ہوں۔ ہم چند ملخصات پیش کرتے ہیں جن سے قارئین مطلع ہوسکیں گے کہ یوروپین اخبارات نے اس دعوت کو کن نظروں سے دیکھا۔ یہاں ہم اپنی رائے اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہیں مگر ہم اس مضمون کے حصۂ دوم میں اس دعوت پر بالتفصیل بحث کریں گے۔

(۱) "پان یوروپین یونین" (Pan Eropeen Unian) نے کونٹ کوون ہے کی تحریک سے موسیو بریاں کی تجویز پر آفریں کہی اور اس بات کا اعلان کیا کہ یونین اس تجویز کو بار آور بنانے میں کوشاں ہوگا۔

(۲) نیویارک ٹائمز (New Yark Times London) فرانسیسی مدبر کی خیالی تجویز پر آفریں کہتے ہوئے رقمطراز ہے کہ دراصل اس تجویز سے یہ مراد ہے کہ "اتحاد سیاست" کی آڑ میں "اتحاد سرمایہ داری" یا شرائط "تقسیم سرمایہ داری" طے کی جائیں۔

(۳) جرمن اخبار "جرمانیہ" (Germania) لکھتا ہے کہ بنظر سطحی دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موسیو بریاں کی یہ تجویز اس بات کی محرک ہے کہ "لیگ اقوام" کی ایک خصوصی شاخ پیدا کی جائے۔ تجویز اتحاد ایک بحث طلب مسئلہ ہے اور اس کے موافق و مخالف دلائل پیش کیئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال سیاست دانوں کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خیالی تجویز اور حقیقی ارادہ میں تفریق کریں۔

(۴) ڈچ ٹاگس تز واگتوں (جرمنی) (Dutch Tagus zweigtugn) رقمطراز ہے کہ موسیو بریاں کی تجویز اس وقت تک ناقابلِ غور متصور ہوگی جب تک عہدنامہ وارسلز کے شرائط کو فسخ نہ سمجھا جائے۔

(۵) لوکل انت زواگر (Locale Inth Yweige) جرمن اخبار لکھتا ہے کہ فرانس کا اصل ارادہ ہے کہ اس تجویز کی سبیل سے "وعدۂ معاونت" حاصل کیا جائے۔ امریکہ، انگلستان اور اٹلی سے مایوس ہوکر اب فرانس اس بات کا خواہشمند ہے کہ دوسرے ممالک سے یہ مقصد حاصل کرے۔ اگر موسیو بریاں کی تجویز معرضِ عمل میں آگئی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے اور ہماری آزادی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

(۶) آرتر تز دالونگ (Arther Yuse Yueting) اسٹریا کا اخبار راقم ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں

آمانکہ فرانس کا اتحادِ یورپ پر اصرار کرنا کونسی مصلحت کا پیش خیمہ ہے ایک "انجمن صلح" جس میں انگلستان اور روس شریک نہ ہوں فرانس کے لئے کسی طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ تاہم یہ حقیقت کہ اتحادِ یورپ مدبرینِ فرنگ کے لئے سرمایۂ افکار ہے اس بات کی شاہد ہے کہ اک نہ اک روز یہ آرزو پوری ہو کر رہے گی۔

(۷) انگریزی اخبار آبزور (Observer) لکھتا ہے: یہ انسانی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ایک مشہور ترین مدبر نے "اتحادِ یورپ" کا بیڑا اٹھایا ہے جس کی بنیاد آلاتِ حرب پر نہ ہوگی بلکہ اس کی بنا عقلِ عامّہ اور نیک نیتی پر رکھی جائے گی۔

(۸) میوز Meuse. بلجیم کا اخبار لکھتا ہے کہ فرانس جو شہنشاہیت کا دشمن ہے "اتحادِ یورپ" کی تجویز سے صلح و امن کا دستور العمل قائم کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔"

مندرجۂ بالا ملخصات کو پڑھنے کے بعد قارئین خود تصفیہ کر سکتے ہیں کہ اس اہم مہم کو سرانجام دینے کے لئے کس قدر مشکلوں کا سامنا ہوگا۔ ہم اس مضمون کے دوسرے حصہ میں اس پر بحث کریں گے جو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۲)

ہمارے نزدیک حصولِ اتحاد تین صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ مگر یورپ حاضرہ کی شیرازہ بندی ان میں سے کسی صورت میں ہونا اگر دشوار نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے:

(۱) اتحاد بوجہ سرمایہ داری | ایسے اتحاد کی امثال بکثرت مل سکتی ہیں جس کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ممالکِ یورپ میں جو اتحاد اب تک تھا اس کی بنیاد یہی سرمایہ داری تھی۔ ایشیا، افریقہ وغیرہ کی اقوام بوجہ انحطاطِ تجارت، صنعت و حرفت اور جملہ اسبابِ حصولِ دولتمندی سے نامراد ہو چکی تھیں ان کی پستی اور کم مایگی کی وجہ فرنگی اقوام نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا اور اس طرح تمام براعظم غربت اور تنگدستی کے ہاتھوں سے چھٹ کر باہم ترقی پر کمند افگنی کے لئے متحد ہو گیا۔ دراصل آزادی اور یک جہتی کی بنیادیں قومی فارغ البالی ہے۔ چنانچہ آنسلون لکھتا ہے "کسی حکومت کی قوت کثیر المالی، کثرت رعایا، یا عساکر وافرہ پر انحصار نہیں رکھتی۔ بلکہ اس عمارت کا سنگِ بنیاد قومی دولت مندی اور سرمایہ داری ہے۔ یہ دولتمندی اور سرمایہ داری اس طرح میسر ہو سکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد خوشحال ہو۔ اور ہر فرد کی خوش حالی اس طرح نصیب ہو سکتی ہے کہ صنعت و حرفت، تجارت، اور دوسرے مشاغل کو برسرِ اوج پہنچایا جائے"۔ یورپ کے ممالکِ مختلفہ میں اتحاد پیدا کرنے کا

خیال جو ایک خوش فہمی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی مساعی سے ہر فرد قوم کو خوش حال بنانے کی کوشش کی گئی اور اس طرح انفرادی خوش حالی سے قومی عروج کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ اس امنگ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اقوام یورپ میں پست اقوام کو تاخت و تاراج کرکے ذخائرِ اموال و امتعہ کی فراہمی کی ہوس دامنگیر ہوتی۔ اس دوڑ دھوپ میں افرادِ قوم کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کسی ذاتی عناد کی وجہ سے حکومت کو تہ و بالا کرتے یا ہمسایہ قوموں سے دست و گریباں ہو جاتے۔ مگر بیسویں صدی میں یہ حالت بدل سی گئی ہے۔ ایشیائی اقوام، ترکی، چین، جاپان، ایران، روس وغیرہ بیدار ہو رہے ہیں اور اس بیداری کے ساتھ اُن کے دلوں میں قومی و ملکی حریت و فارغ البالی حاصل کرنے کی آرزو پیدا ہوئی ہے۔ اس سے یورپ کی کشتیِ تجارت میں روڑا اٹکا ہے۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ ہم لیبر منسٹر کی رپورٹ سے جو ڈیلی میل میں چھپی حسب ذیل اعداد بے روزگاری نقل کرتے ہیں:۔

اٹلی	۳۷۲،۲۳۶	اپریل سنہ ۳۰ء کے آخر تک
ہالینڈ	۴۰۸،۵۴۱	مارچ سنہ ۲۹ء کے آخر تک
بلجیم	۶۳۱،۹۱۹	۵ر اپریل سنہ ۳۰ء تک
جرمنی	۲۷،۸۶،۹۱۲	اپریل سنہ ۳۰ء کے آخر تک
روس	۱۲۳۵،۶۰۰	"
انگلستان	۱۸۸۵،۳۰۰	۱۷ر جون سنہ ۳۰ء تک
فرانس	۱۱،۵۱۰	۱۷ر مئی سنہ ۳۰ء تک

ان اعداد سے ظاہر ہوگا کہ فرانس کے سوا قریباً ہر دوسرے ملک میں بے روزگار لوگوں کی تعداد بکثرت ہے ان لاتعداد لوگوں کو اُس وقت تک اتحاد پر راغب نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک انھیں روزگار نہ دیا جائے (قارئین خود ہندوستان کی حالت سے قیاس فرما سکتے ہیں کہ خالی پیٹ سے سیاست کی سرگرمی کہاں تک رہ سکتی ہے) عہدِ حاضر میں جب تاراج شدہ اقوام خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہی ہیں اور "مغربی انڈسٹری" روز بہ روز روبہ تنزل ہے اس قسم کی اُمید موہوم ہے۔ لہٰذا راقم کے نزدیک مغرب میں "اتحاد بوجہ سرمایہ داری" کا زمانہ گزر چکا ہے۔

(۲) اتحاد بوجہ وحدتِ مقصد | ہم اس مضمون کے حصۂ اول میں ذکر کر چکے ہیں کہ دورانِ جنگِ صلیب میں

ایک مذہبی احساس نے ممالک یورپ کو متحد کر دیا۔ اس وقت ممکن تھا کہ جملہ اقوام فرنگ کو ایک تسبیح میں پرو لیا جاتا مگر فطرت انسانی بے حد خود غرض واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ایشیا کی دولت نے اقوام یورپ کے قلوب میں پھوٹ ڈال دی۔ ظاہراً اب کوئی ایسا مقصد نظر نہیں آتا جو یورپ کو از سر نو متحد کر دے۔ سوائے اس کے کہ امریکہ کی روز افزوں ترقی یورپ بھر کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکا دے۔ مگر "بحری کانفرنس"، جس میں انگلستان نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بحری طاقت میں اپنا ہم پلہ قرار دیا۔ اس بات کی شاہد ہے کہ انگلستان بجائے فرانس اور اٹلی سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کے جاپان اور امریکہ کی دوستی اولےٰ تر سمجھتا ہے۔

(۳) اتحاد بوجہ ہمدردی مذہب | مذہب ہی ایک ایسی صورت ہے جس سے اتحادِ عالم یا اتحادِ براعظم ہو سکتا ہے۔ اور اس کی آخری صورت یہ ہوگی کہ جملہ ممالکِ غرب "پاپا" کے اقتدار کو تسلیم کر لیں۔ مگر حالاتِ حاضرہ میں یہ خواب و خیال ہے۔ یورپ میں قومیت ملک پر منحصر ہے اور "عیسائیت" ایک رسمی لفظ۔

ہم مندرجۂ بالا دلائل کو خود فرنگی اخبارات کے ملخصات سے واضح تر کریں گے تاکہ قارئین کو اس مسئلہ کا علم کلیتہً ہو سکے۔ موسیو بریاں وزیر امور خارجی کی معرکۃ الآرا "دعوتِ اتحاد یورپ" کی اشاعت کے چند روز بعد "دوس مسولینی"، وزیر اعظم اٹلی نے فلارنس میں ۲۰۰،۰۰۰ آدمیوں کے سامنے ایک معنی خیز تقریر کی جس کا ضروری حصہ حسب ذیل ہے:

"اٹالوی قوم کے لئے سب سے مضرت رساں دشمن "شک" ہے خصوصاً اس بات میں شک کرنا کہ حکومت اٹلی اپنے مصمم ارادہ کو سر انجام نہ دے گی۔

میں اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہماری "بحری تجویز" حرف بحرف پوری ہوگی کیونکہ اٹالوی ارادہ اٹل ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ان سمندروں میں قید رہیں جو کبھی ہماری ملکیت تھے۔ ہم اپنے تئیں آزاد بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

اٹلی آج اس قدر طاقتور اور منظم ہے کہ وہی ملک اس کا دشمن ہو سکتا ہے جس کو خواہش فنا ہو۔ الفاظ خوب ہیں مگر مشین گن، بم، بحری جہاز، ہوائی مشینیں اور توپیں الفاظ سے خوب تر ہیں۔ کیونکہ "حقوق" کا لفظ اس وقت تک بے معنی ہے جب تک "طاقت" اور "قوتِ بازو" ان کی نگہبان نہ ہو۔ اٹالوی مدبر "نکولا ماشیاولی" نے کیا خوب کہا تھا کہ صرف وہی "نبی" "نذر بلا" ہوئے جو آلاتِ حرب نہ رکھتے تھے۔

کل ہماری منظم افواج کی پریڈ اس شان و شوکت سے ہوگی کہ اقوام عالم دیکھ لیں گے کہ اٹلی

کس قدر مسلح ہے۔"

جب مسولینی نے یہ الفاظ دہرائے تو "ملیشیا فوج" کے سپاہی اپنی بندوقوں کو ہوا میں حرکت دے رہے تھے گویا ہر لفظ کے موید ہیں۔ اٹالوی وزیراعظم نے اپنی تقریر کو ان الفاظ سے ختم کیا:

"اٹلی آج اس قدر آلاتِ حرب سے مزین ہے کہ ہم دنیا کو دو چیزیں پیش کر سکتے ہیں ہماری بیش قیمت تنظیم یا تباہ کن دشمنی"

یہ تقریر فلارنس میں اس قدر مقبول ہوئی کہ شہر کا گھر گھر فوجی جھنڈوں اور قومی نشانات سے آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا۔ عامۃ الناس کے جذبات رفعتِ آسمان پر پہونچے ہوئے تھے۔

اس تقریر کے چند روز بعد مسولینی نے میلان میں ۲۴ مئی ۱۹۳۰ء کو دوسری تقریر کی۔ سامعین کی تعداد ۳۰،۰۰۰ تھی اس کا ضروری حصہ یہ ہے:

"آج اٹلی کے لوگ اپنی تقدیر کے آقا ہیں اور اپنے "حقوق" کی حفاظت کے لئے بدل و جان آمادہ۔ ہم ان حالات سے ناواقف نہیں جو کل وقوع پذیر ہونے والے ہیں۔ ہم ان کے انتظار میں اپنی قوت اور فوج کو منظم کر رہے ہیں کیونکہ ہم اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ دفعۃً کسی مہم کی نذر ہو جائیں۔

تم کو اس آنے والے وقت (مراد جنگ ہے) کے متعلق یقین کامل دلانے کے لئے میں ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ مقرر کئے دیتا ہوں"

اس تقریر کے دوران میں اکثر سامعین "مسولینی زندہ باد"، "... فرانس غارت شود" کے الفاظ دہرا رہے تھے اس تقریر کے دوسرے حصے بھی اسی قدر آتش فشاں ہیں۔

اٹلی کے مختلف امصار و دیار کے طلبا فرانس کے مخالف ایک خصوصی تنظیم ... حصہ لے رہے ہیں۔ جن کو "مجلس طلبائے روم" نے مسولینی کو حسب ذیل تار دیا:

"پوایل کے طلبا اپنے دلوں کو آلاتِ جنگ سے مزین کر چکے ہیں اور اس بات کا ... ن کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں کہ اپنے ہاتھوں کو بھی آلاتِ حرب سے پیراستہ کریں ------"

موسیو گراندی اٹالوی وزیر امور خارجہ نے روم میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے پاس ایک صحیح وجہ ہے کہ ... یورپ کے ... شکوک ... دیکھیں۔ اگر ... بین الاقوامی حالات پر غور کیا جائے جو لیگ اقوام کے حلقۂ اثر کے اند ... وقوع پذیر ہو رہے ہیں تو ان ... سے

ثابت ہوتا ہے کہ یورپ میں آلات حرب کو بجائے کم کرنے کے اُن کے بڑھانے ... تیز ہو رہی ہیں ... بجائے رفع شکوک غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے۔"

"ہنری بیرنگر" فرانسیسی نائب صدر کمیشن امورات خارجی مسولینی کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"مسولینی نے کہا کہ "حقوق" کا لفظ بغیر "فوجی طاقت" کے بے معنی ہے۔ کیا یہ الفاظ موسیو بریاں کی دعوت کا صحیح جواب نہیں ہیں؟ یہ امر از حد خطرناک ہے کہ ان تمام واقعات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ سیاستِ امن پر عملدرآمد ضروری ہے مگر سیاست بیرونی کے نشیب و فراز سے بے اعتنائی کوتاہ نظری ہے۔ اقوامِ یورپ کے اقوال و افعال میں بہت فرق ہے۔ ہر ملک "آلات حرب" کو کم کرنے کی بجائے روز بروز اس میں اضافہ کر رہا ہے۔ اسی طرح جرمنی نے اپنی فوجی بجٹ کو گلوم دوم کی بجٹ کے برابر پہونچا دیا ہے۔ اٹلی بحری طاقت کے پروگرام کو حرف بحرف پورا کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ روس اپنی طاقتِ حرب کو زار کی طاقت سے بڑھانے کا آرزومند ہے۔ ان حالات میں اتحادِ یورپ مشکل نظر آتا ہے۔ دراصل یورپ یورپ کہاں رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) انگلستان ایک معمولی جزیرہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی آبادی ۴۰ ملین سے زیادہ نہیں اور اُس کے زیرِ نشان ایشیا، افریقہ اور امریکہ ہیں ۴۰۰ ملین انسانوں کی آبادی ہے۔

(۲) فرانس جس کی آبادی ۳۹ ملین ہے افریقہ، ایشیا اور امریکہ میں ۶۰ ملین آدمیوں پر حکمراں ہے

(۳) بلجیم اور ہالینڈ یورپ میں ناقابلِ توجہ ہیں مگر کانگو کی سلطنت اُن کی ہے۔

(۴) روس نصف یورپ میں ہے نصف ایشیا میں۔

(۵) جرمنی اور اٹلی کو ملک گیری کی ہوس دامنگیر ہے۔

ان حالات کے ماتحت اگر موسیو بریاں نے ہو سکے تو اس یورپ کو متحد کرنے کے لئے ساعی ہو جو دراصل یورپ نہیں کہلایا جا سکتا۔

موسیو ونیواسوری پیرونی نے اٹالین پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہم فرانس سے ایک عہدنامہ کیوں نہ کرلیں جس کی رو سے فرانس، اٹلی، اسپین اور انگلستان میں ایسا اتحاد قائم ہو سکے کہ ہم عربوں کی مخالفت میں ایک روح و جسم ہو جائیں" اس کے جواب میں "ٹیالوجا" نے کہا: "اٹلی فرانس کے ساتھ واشنگٹن میں بحری مساوات حاصل کر چکا ہے اور یہ سوال "لیگ اقوام" کے سامنے پیش کرنا چاہیے"

مندرجہ بالا ملخصات کو حاجت تبصرہ نہیں۔ قارئین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خود یورپ میں "کیلاگ پکیٹ" یا "عہد نامہ امن" کی کیا وقعت ہے؟ جب خود ممالک یورپ کی یہ حالت ہوئی تو "اتحادِ عالم" کو جنون ہی کہنا چاہیئے۔ جیسا کہ "بحری کانفرنس" کے نتائج سے ظاہر ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اس کانفرنس میں پانچ ملک مدعو کیے گئے۔ انگلستان، فرانس، امریکہ، جاپان، اور اٹلی ہیں تین ماہ کی مشقت کے بعد جو معاہدہ طے ہوا۔ اس میں اٹلی اور فرانس شروع سے شریک ہی نہ ہوئے۔ انگلستان، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان نے اس معاہدہ پر دستخط کئے مگر دستخط کرنے کے کچھ روز ہی بعد جو نتائج برآمد ہوئے حسب ذیل سطور سے ظاہر ہونگے؛

جاپان | جاپانی بحری وزیر جب وطن پہنچا تو اس کی پارٹی کے ایک ممبر نے اسے چھری نذر گزرانی۔ مراد یہ تھی کہ اس چھری سے خودکشی کرلو۔ امیر البحر ٹکارابائی کے خلاف یہ اشتہار چسپاں کئے گئے: "غدار قومی جو امریکہ اور انگلستان کے زانو پر سربسجود ہوا"۔ لفٹننٹ کمانڈر کساکاری نے بحری معاہدہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے "ہارا کیری"، "یعنی خودکشی"، کرلی۔ جاپان میں یہ قدیم رسم ہے کہ کسی ناگوار واقعہ کی تشہیر کے لئے "ہاراکیری" کرلی جاتی ہے۔

انگلستان | جرنال۔ ۱۰ رمئی سنہ ۱۹۳۰ء ۰۵ ممبر کنسرویٹو نے بحری معاہدہ کے خلاف دستخط کئے۔ دستخط کنندگان نے جو رزولیوشن پاس کیا وہ یہ تھا: "بحری معاہدہ کا تیسرا حصہ جس سے مراد یہ ہے کہ آلات حرب کو محدود کیا جائے۔ برطانوی فوائد کے لئے ازبس مضرت رساں ہے اور پارلیمنٹ کو کبھی اس کی حمایت نہ کرنی چاہیئے" بحری معاہدہ کا تیسرا حصہ ہی ایسا ہے جس کو ضروری کہا جا سکتا ہے۔ کمانڈر اڈمیرل ہیش مندرجہ ذیل رزولیوشن پیش کرنے والے تھے:-

"لندن کے بحری معاہدہ" سے صرف یہ مراد ہے کہ برطانوی اور صرف برطانوی بحری طاقت تک کو محدود کیا جائے۔ امریکہ جس کے موجودہ بحری جنگی جہاز ۹۰۵۰۰ ٹن سے زیادہ نہیں۔ ۳۲۳۵۰۰ ٹن تک بڑھایا جا سکتا ہے، جاپان جس کی موجودہ طاقت ۱۶۶۸۱۵ ٹن ہے ۲۰۸۸۵۰ ٹن اور اضافہ کرسکتا ہے۔ اٹلی اور فرانس اس معاہدہ کی قید سے آزاد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "بحری معاہدہ" صحیح معنوں میں برطانوی فوائد کے مخالف ہے یہ صرف ہماری بحری طاقت کا سبب تھا کہ دنیا ہماری رائے کا لوہا مانتی تھی۔ اب دنیا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری حالت بدل ہی گئی ہے۔ ہم نے وہ شرائط قبول کئے ہیں جن پر اٹلی اور فرانس دستخط کرسکے"۔

خود امریکہ میں "بحری معاہدہ" کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے۔ الغرض سیاساتِ عالم

ما ناظم پذیر ہیں یہ الفاظ اقبال سے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

حدیثِ شوق

(جناب الحاج ابو الاشرف محمد جہانگیر صاحب مجید آستانی ابو العلائی)

یہ غزل عالیجناب مہاراجہ سر پیش السلطنتہ بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی کے ایک مشاعرۂ خاص میں پڑھی گئی تھی۔ طرح مصرع "آ کسی دن میکدہ میں رقص جام و ہو بھی دیکھ" تھا......
مجید صاحب حیدر آباد کے کہنہ مشق شاعر ہیں طبیعت اچھی پائی ہے اور غزل خوب کہتے ہیں نمونہ کلام اُن کے شاعرانہ مذاق کا آئینہ اور ہر طرح لائق داد ہے۔ (مجلہ مکتبہ)

آ، بہارستانِ عالم کا تماشا تو بھی دیکھ! — اپنے محشر خیز جلوے، اپنا رنگ و بو بھی دیکھ!
دیکھ! ضبطِ شوق کا عالم کسی دن تو بھی دیکھ! — دکھ پہ قدرت دیکھ ظالم، درد پر قابو بھی دیکھ!
میری بزمِ آرزو کو اپنی بزمِ ناز کر — تیری صورت میں بھی دیکھوں، میری صورت تو بھی دیکھ!
ہے ورقِ زرین حدیثِ شوق کا لختِ جگر — رازِ دل کا ایک نقطہ ہے مرا آنسو بھی دیکھ!
سوزِ ناکامی نے پھر کی ہیں شرر افشانیاں — میری شامِ بیکسی بھی دیکھ اور جگنو بھی دیکھ!
سیکھ لے حسن و وفاداری کے پہلو، سیکھ لے! — لے، مراد دل لے! تو اس کو دیکھ، اس کی خو بھی دیکھ!
چشمِ جادو فن کے مارے جیتے ہیں مرتے بھی ہیں — سحر میں اعجاز دیکھ، اعجاز میں جادو بھی دیکھ!
محو خوابِ ناامیدی ہر پریشاں حال ہے — دیکھ! تاثیر ہو لیے دامنِ گیسو بھی دیکھ!
آنکھ کی پتلی کو غافل! نور کی پتلی سمجھ! — ہاں! اسی پردے میں عکسِ قامتِ دلجو بھی دیکھ!
اے دلِ بیتاب! بزمِ ناز، اسکی بزمِ ناز! — ڈھونڈ لے کوئی بہانہ اور کوئی پہلو بھی دیکھ!
اب تڑپ میں درد بھی ہے درد میں لذت بھی ہے — آ، کبھی بیتابیِ دل کا تماشا تو بھی دیکھ!
تیرے اندازِ بیاں کا پوچھنا کیا ہے مجید — ایک ہی ہے آج اربابِ سخن میں تو بھی دیکھ!

برسات کا سماں

(ماخوذ از رامائن)

(جناب محمد عبدالرحمٰن آزاد صدیقی)

جب سے رام چندر جنگل میں آکر رہے ہیں جنگل منگل روپ بنگیا ہے درخت ہرے بھرے نظر آتے ہیں پھل پھول افراط سے پیدا ہو گئے ہیں۔ شہد کی مکھیاں پھولوں اور رس بھرے پھلوں میں لپٹی ہوئی نغمہ سرائی کرتی ہیں، درختوں میں لٹکے ہوئے شہد کے چھتے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ آگے چلکر تلسی داس عقیدت مذہبی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگل میں یہ تروتازگی مہاراج ہی کے فیض قدم کی بدولت پیدا ہو گئی ہے جو پہاڑ کی ایک خوش آئند چٹان پر آکر ٹھہر گئے ہیں۔

کھت انُج سن کتھا انے کا۔ بھگت بربیت نرپ نیت دی وکا

انُج = بھائی، سن = سے، بھگت بربیت = خدا پرستی کے اصول، نرپ نیت = اصول ملک داری = راجہ کے فرائض۔

راجہ راجچندر اپنے چھوٹے بھائی لکشمن سے کچھ اس طرح کے حقائق و معارف بیان کرتے ہیں جن میں خدا پرستی اور راج نیت کی سبق آموز نصیحتیں بھری ہوتی ہیں۔

برشکال میگھ نبھہ چھائے۔ گرجت لاگت پرم سوہائے۔

برشکال = موسم بارش، میگھ = بادل، نبھہ = آسمان فضائے بسیط، پرم سوہائے = دلکش اور بھلے برشکال فارسی لفظ ہے جو سنسکرت میں کاف سے بدل کرلے لیا گیا ہے۔

بارش کا موسم شروع ہو گیا ہے کالے کالے بادلوں سے فضائے بسیط معمور ہے، جو گرجتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

رام اپنے عزیز بھائی لکشمن کی طرف مخاطب ہیں اور ان کو مناظر قدرت کی جانب ایک ادائے عارفانہ کے ساتھ متوجہ کرتے ہیں:

لکشمن دیکھ ہو مور گن ناچت بار دیکھ گرہی ورت رت ہرش جس بشن بھگت کنہ دیکھ

گرہی = دنیادار۔ گرینکاؤ کا رشن = رزاقِ عالم یعنی خدا = بشن بھگت = خُداپرست۔

اے لکشمن! دیکھو، جیسے نیک دل گرھستی عارفان کامل کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ویسے ہی موران کالے کالے بادلوں کو دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولے نہیں سماتے ہیں۔ مست ہو کر ناچ رہے ہیں۔ اس جگہ موروں کو گرھستی یعنی دنیادار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور بادلوں کو عارفان الٰہی سے تشبیہ دینا بوجہ اُن کے فیض کے ہے کیونکہ وہ پانی برساتے ہیں اور نباتات و حیوانات کو پیامِ حیات پہنچاتے ہیں۔ گرھستی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک نیکوکار و نیک کردار دوسرے بدکار و بداعمال سنسکرت میں اُن کے لئے دو لفظ ہیں (دھرمی) و (ادھرمی) مولانا روم نے بھی دنیاداروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں پہلی قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو دنیا کو اختیار کرنے پر بھی گناہوں سے بچے رہتے ہیں اور نیک عمل کو نہیں چھوڑتے دوسری قسم میں وہ دنیاپرست شامل ہیں جو بوالہوس اور مبتلائے معصیت ہیں اور دنیاپرستی کی دھن میں دین و مذہب کی پروا نہیں کرتے، شب و روز گناہوں میں آلودہ رہتے ہیں اور عاقبت کی فکر نہیں رکھتے۔ پابندِ مذہب رہ کر نیک عمل کے ساتھ دنیاداری بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔ جس نے زن و فرزند کے ساتھ رہ کر آلائشِ معصیت سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔ وہی گرھستی کہلائے گا۔ جن دنیاداروں کا ایمان درست نہیں ہے۔ وہ اہل اللہ کو نہ پہچان سکتے ہیں نہ ان سے فیض اُٹھا سکتے ہیں۔ پس ایسوں کو دنیادار کہنے کے بجائے دنیاپرست کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

گھن گھمنڈ بینہہ گرجت گھورا   پریا ہین ڈرپت من مورا
دامن دمک رہی گھن ماہیں   کھل کی پریت یتھا تھر ناہیں

گھن گھمنڈ = گھنگھور گھٹائیں۔ بینہہ = بادل = پریا = معشوق و محبوب = دامن = بجلی گہن = آسمان فضائے بسیط۔ کھل = خودغرض = پریت = محبت = یتھا تھر = قرار و قیام۔

آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں بادل گرج رہے ہیں۔ اُن کا گرجنا سُن کر میرا دل تنہائی میں اپنے محبوب کے بغیر تڑپتا ہے۔ بجلی آسمان پر چمکتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے اُس کو ایک جگہ پر قرار نہیں ہے جس طرح خودغرض اور فابوپرست لوگوں کی دوستی و محبت کا اعتبار نہیں ہوتا نہ وہ قایم رہتی ہے اسی طرح بجلی کی روشنی ایک جگہ قایم نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جیسے

بجلی کی بیقرار اور متزلزل روشنی کسی راہ گیر کو جو اندھیرے میں چل رہا ہو فائدہ نہیں پہنچا سکتی ویسے ہی خود غرض دوستوں کی دوستی سے کسی کو فیض نہیں پہنچ سکتا ۔ نہ اُس کو پائداری واستواری ہوتی ہے ۔

برشہیں جلا بھومی نیارائے   بتھا نوے ہیں بدہ ودیا پائے

جلاَ = بادل ۔ بھومی = زمین = نیارائے = نزدیک ۔ آکر = بدہ = عارف ۔ ودیا ۔ علم معرفت

پانی بھرے ہوئے بادل زمین کی طرف جھک کر برس رہے ہیں جیسے عارفانِ کامل معرفت الٰہی کے بوجھ سے جھک جاتے ہیں اور منکسر المزاج ہوجاتے ہیں = اس جگہ بدہ سے عارفِ کامل مراد ہے اور ودیا کے معنیٰ معرفتِ الٰہی کے ہیں جب انسان معرفتِ الٰہی کو پاجاتا ہے تو وہ منکسر المزاج ہوجاتا ہے اور غرور و تمکنت کو پاس نہیں آنے دیتا جو درخت باردار ہوتے ہیں اُن کی ڈالیاں زمین کی طرف جھک جاتی ہیں اور خوشہ چینوں کو فیض پہنچاتی ہیں جو شجر بے ثمر ہیں اُن سے نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ وہ خود اپنے لئے کوئی بہتری حاصل کرسکتے ہیں کاٹ کر پھینک دئے جاتے ہیں یا جانوروں کا چارہ بنتے ہیں ۔

بوند ادھات سہین گر کیسے + کھل کے بچن سنت سہین جیسے

ادھات = چوٹ = گر = پہاڑ = سنت = اہل اللہ = کھل = جاہل و نااہل =

پانی کی بڑی بڑی بوندوں کی چوٹیں پہاڑ اس طرح برداشت کر رہے ہیں جیسے اہل اللہ نالائق لوگوں کی ناسزا باتوں کو سُن کر برداشت کر لیتے ہیں اس جگہ پہاڑوں کو اہل اللہ سے تشبیہ دینا ایک نہایت لطیف کنایہ ہے مقصود لکشمن کو نصیحت کرنا ہے کیونکہ وہ تیز مزاج تھے طبیعت میں غصہ زیادہ تھا ذرا سی بات میں بھڑک جاتے تھے فلسفۂ اخلاق میں ناصحانہ مضمون تلخ اور بے مزہ تصور کیا گیا ہے اکثر حکما نے نصیحت کی کڑوی دوائی میں تمثیلات واشارات کی مصری ملا کر اُس کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ اس جگہ حکیم روحانیت رام نے اُسی نسخہ کو استعمال کیا ہے ۔ نہایت لطیف اور دلکش کنایہ ہے اپنے عزیز بھائی لکشمن کو سمجھاتے ہیں کہ تحمل و صبر میں تم کو اس پہاڑ کے مانند بننا چاہیئے ۔ تم جب تک اپنے نفس کو تحمل کا خوگر نہ بناؤ گے عرفان حقیقی سے بہرہ اندوز نہ ہو سکو گے اس لئے غصہ روکو اور نفسِ سرکش کو

صبر و تحمل کی زنجیر میں باندھ کر قابو میں کر لو۔

چھدر ندی بھر چلی اُترائی جس تھوڑے دہن کھل اترائی

چھدر ندی = چھوٹی ندی = اُترائی = اُبل کر چلی = اِترانا = غرور تمکنت کو کام میں لانا۔

کمال ادب دیکھو اُترائی اور اِترائی میں صرف اعراب کا فرق ہے مگر زیر و پیش کی تبدیلی سے شعر میں زوردار مضمون پیدا ہو گیا ہے اُترائی کے معنیٰ ہیں لبریز ہو کر اُبل چلنے کے اور اِترائی کہتے ہیں غرور سے اینٹھ کر چلنے کو۔ تو فرماتے ہیں کہ دیکھو چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے اس طرح بھر کر اُبل چلے ہیں جیسے کم ظرف اور سفلے لوگ تھوڑی دولت پاکر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پس عارف کو نہ چاہیئے کہ جادۂ عجز سے قدم باہر نکالے۔

بھوم پڑت بھا ڈابر پانی جمین جیو ہیں مایا لپٹانی

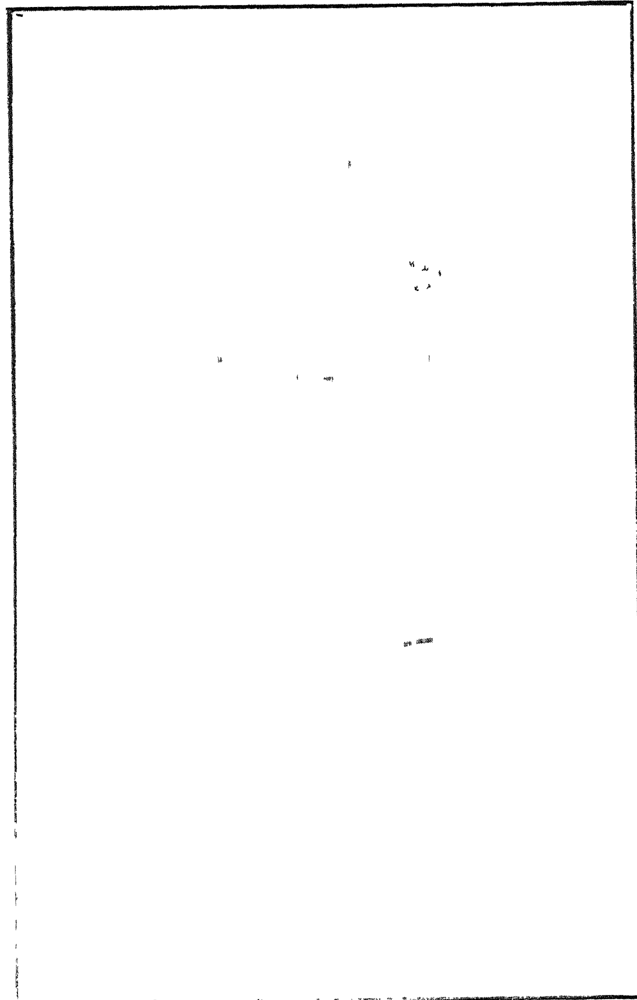
بھوم = زمین = ڈابر = کثیف گندلا۔ جمیں = جیسے۔ جیو = روح = مایا = خواہشات جیونہیم

فرماتے ہیں کہ جس طرح پاک و منزہ روح خواہشات نفس کے دام میں پھنس کر گندی ہو جاتی ہے اُسی طرح برسات کا صاف و شفاف پانی زمین پر گرتے ہی گندلا ہو گیا ہے۔ ڈابر کے معنیٰ کثیف کے ہیں جب تک پانی زمین پر نہیں گرا تھا پاک و صاف تھا زمین پر گرا تو آلائش ارضی نے اُس کو میلا اور گندلا کر دیا۔ روح جب تک جسم کے کثیف قید خانہ میں نہیں ڈالی گئی تھی۔ گناہوں سے بچی تھی اور پاک و صاف تھی۔ جب عالم اجسام میں مستور ہوئی تو دنیا کی کثافتیں اور خواہشیں اُس سے لپٹ گئیں جس سے اُس کی پاکیزگی جاتی رہی اور مُکدر ہو کر رہ گئی۔

میرے دوستو! ان مضامین نادرہ پر غور کرو اُن تخیلات عجیبہ و نفیسیہ کو دیکھو ان اشارات بلیغہ اور کنایات غریبیہ کا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو رامائن کے شاعرانہ مضامین کو بنظر غایر دیکھ چکے ہیں۔ آپ اپنے مُلک کی زبانوں سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کرتے اگر آپ کو اپنے ملک کے ادب سے دلچسپی پیدا ہو جائے تو آپ کو خود اپنے گھر میں ادبیات کا ایسا قیمتی ذخیرہ مل جائیگا۔ کہ پھر آپ کو یورپ کے بازاروں میں اس جنس کی تلاش کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ کتنے دُرِ شہوار گمنامی کے سمندر کی تہہ میں پڑے ہیں جن کا حال ہمارے غواصانِ ادب کو ابھی معلوم نہیں ہے کس قدر لعل بے بہا تعصب اور بد مذاقی کے قعر میں مدفون ہیں جن کی خوش آبی اور چمک دمک سے

دنیا محوِ حیرت بن سکتی ہے نہیں معلوم مغرور مگر اپنی حالت پر قانع مسلمانوں کے حصہ میں ملک کی گراں بہا ادبی دولت جو خود اُن کے گھر میں موجود ہے کب آئے گی اور وہ اُس سے کب فائدہ اُٹھائیں گے ۔ ہمارا ادب اُس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک بد مذاقی اور تعصب کا پردہ ہم اپنی آنکھوں پر ڈالے رہیں گے ۔ ہم کو خود ان ادب سے پورا حصہ اسوقت تک نہ ملے گا تاوقتیکہ ہم میں کالیداس اور تلسی داس کے ایسے ہزاروں باکمال ادیب او شاعر پیدا ہوں ہماری ادبی تشنگی اُس وقت تک نہ بجھے گی جب تک بیاس اور بھوبھوتی کے ایسے باکمال شعرا ہم میں پیدا ہو جائیں ۔ ہمارا ادب ٹیگور کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے ہم اس نوبل پرائز کے جیتنے والے گیتانجلی کے مردِ میداں مصنف کو دیکھ کر رشک کرتے اور حیرت ہوتی ہے کہ کاش ہم میں بھی ایسے سورما پیدا ہوتے جو یورپ کی بازیگاہوں میں بازی لگاتے اور جیت کر آتے ! اقبال اور اکبر ہماری بزم ادب کے روشن چراغ ہیں مگر محفل کی وسعت اُن کی روشنیوں سے کہیں زیادہ روشنی کی متقاضی ہے اُس کو بجلی کا لیمپ اور گیاس کی روشنی درکار ہے ۔ میرے عزیزو ملک کے فرزندو ! اُٹھو اُٹھو اور اپنے اپنے ادبی لیمپوں سے محفل کو جگمگا دو مجلس کو متجلی کر دو اُردو کے مردہ جسم میں بالیدگی کی روح پھونک دو اُس کو دُنیا کی ممتاز زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کر دو اور یہ کوشش کرو کہ ہم جلیسوں اور ہم نشینوں میں اُس کا سر نیچا نہ ہونے پائے !

(باقی آئندہ)



مولوی فاضل ڈاکٹر محمد سید الدین صدیقی ایم اے - ال ال ڈی (کیمبرج)
ڈی فل ای سی ال (آکسفورڈ) دیرسدوا دت

مطبع کرہ او حاد ، د دکن

خطبۂ صدارت

(حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس)

گذشتہ ماہ تیر میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب عادت ٹون ہال میں منعقد ہوا تھا۔ جلسہ کی صدارت کے لئے اس سال ملک کے تجربہ کار و ماہر تعلیم عہدہ دار مولوی عبدالرحمان خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ کا انتخاب ہوا تھا موصوف نے جو خطبہ دیا وہ ملک کی گذشتہ تعلیمی حالت اور آئندہ ضروریات پر بڑی حد تک حاوی ہے اس لئے ملک کی تعلیمی ترقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے۔

(مجلہ مکتبہ)

خواتین و حضرات!

ایک دن شام کو چند ہی روز قبل سالانہ امتحانوں کے کام سے تھکا ماندہ میں نظام کلب گیا تو میرے دوست مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تعلیمی کانفرنس حیدرآباد کے دسویں جلاس کی صدارت میرے تفویض ہوئی ہے اور میں جلد اس کے لئے تیار ہو جاؤں۔ پروفیسر میگ ناتھ ساہا (Meg Nadh Saha) جو عثمانیہ یونیورسٹی کے کلی امتحانات طبیعات کے لئے میرے ساتھ شریک ممتحن منتخب ہوے تھے انہیں دنوں میں آنے والے تھے۔ تعلیمی سال کا آخری زمانہ ایم۔ یس۔ سی کے علمی امتحانات کی تیاری میں، توقع کر رہا تھا کہ ان سے فارغ ہو جاؤں تو ذرا فرصت کے ساتھ آرام تو کیا ہوں کسی دوسرے علمی کام میں مصروف ہو جاوں معتمد صاحب کے یہ فرمانے سے میں حیران و ششدر ہو گیا۔ کانفرنس کی صدارت کا اعزاز میرے لئے باعث تشکر و ممنونیت تھا لیکن پریشانی تھی کہ خطبہ کی تیاری اور ضروری مواد کی فراہمی کیلئے وقت کہاں سے لاؤں معتمد صاحب موصوف نے مواد کی فراہمی میں مدد دینے کا وعدہ فرمایا تو مجھے اس عزت کے قبول کرنے کی ہمت ہوئی۔

حضرات! میں آپ کا نہایت درجہ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس جلسہ کی صدارت پر مامور فرمایا۔

مجھ سے پہلے جن بلند مرتبہ نامور اور عالیشان ہستیوں نے یہ کام انجام دیا ہے ان کے مقابلے میں جب میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو آپ کی یہ کرمفرمائی میرے لئے باعث فخر ہو جاتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے اس خطبہ میں جو فروگذاشتیں ہونگی آپ ان کو ازراہ کرم تنگیٔ وقت کے خیال سے معاف فرمائیں گے۔

معزز حاضرین! میں اس خطبہ میں تعلیم کا کوئی جدید نظریہ یا سائنٹفک اصول نہیں بیان کروں گا۔ کسی خاص مسئلہ پر مفصل بحث نہیں کروں گا۔ اس کا نہ تو موقع ہے اور نہ اس کے لئے اتنا وقت مل سکتا ہے۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے حیدرآباد کی گذشتہ اور موجودہ تعلیمی حالت کا ایک خاکہ کھینچ کرتا ناچاہتا ہوں اور ضروریات حالیہ کے پیش نظر ملک کی ترقی و بہبود سے متعلق میرے ذاتی تجربہ اور معلومات کے لحاظ سے جو تجاویز مناسب معلوم ہوتے ہیں ان کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تعلیمات کے مسائل بہت ہیں اور ان پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے اشخاص بھی جنہوں نے مسلسل سررشتہ تعلیمات ہی میں اپنی پوری مدت ملازمت صرف کی ہو تعلیم کے مختلف شعبوں پر حاوی نہیں ہو سکتے یہ اسپیشیالائزیشن (specialisation) یعنے تخصیص کا زمانہ ہے ہر شعبہ میں خصوصی ماہرفن کی ضرورت ہے کوئی ایک شخص ایسا نہیں مل سکتا جو تعلیم کے تمام شعبوں سے اچھی طرح واقف ہو میری عمر کا بیشتر حصہ اس ملک کی محض اعلیٰ تعلیم اور اس کے مسائل حل کرنے کی کوشش میں صرف ہوا ہے۔ تعلیم کے دیگر مسائل کے متعلق میری رائے اور میرے معلومات اپنے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہیں۔ جیسا کہ ڈسمبر ۱۹۲۵ء کے خطبہ صدارت میں میرے محترم دوست نواب مرزا یار جنگ بہادر نے بیان فرمایا ہے۔ ممالک محروسہ میں اسٹیٹ ایجوکیشن اور سرکار کی طرف سے براہ راست تعلیم کا انتظام تقریباً اسی وقت سے آغاز ہوا ہے جب سے کہ گورنمنٹ ہند نے اپنے آپ کو باشندگان ہند کی تعلیم کا علی الاعلان ذمہ دار گردانا۔ اس وقت سے اب تک تقریباً (۷۵) سال ہوئے خواہ برٹش انڈیا میں یا ممالک محروسہ میں ترقی ہی ترقی ہوتی رہی ہندوستان کے ممالک میں تعلیم کی ترقی نہ ہو تو کیا تنزل ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ ترقی کس رفتار سے ہو رہی ہے۔ کیا تعلیم کے مختلف شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح اس کی اصلاح ہو سکتی ہے؟

یہ امر واضح ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی کی رفتار برطانوی ہند کی رفتار سے سست تر رہی ہے اس کے اسباب بھی واضح ہیں۔ دیسی ریاستوں کو وہ سہولتیں اور ذرائع عمل حاصل نہیں جو سرکار عظمت مدار کو حاصل ہیں برٹش انڈیا کی تعلیمی رفتار کے ساتھ توازن و تقابل حیدرآباد کی تعلیمی رفتار کے متعلق رائے

قائم کرنے کے لئے مبنی بر انصاف نہ ہوگا۔ یا تو برٹش انڈیا کے مختلف صوبہ جات کی تعلیمی حالت سے فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے یا ان کے اوسط سے میری رائے میں یہ ایک بیکار آدمی کا کام ہے۔ ایسے اعداد و شمار کو جس شکل میں چاہیں ڈھال سکتے ہیں۔ لیکن ان سے فائدہ کچھ نہیں ہم سب تسلیم کرتے ہیں۔ برٹش انڈیا کے بہترین صوبے سے ہمارے اس حصۂ ملک کی تعلیمی حالت یقیناً پست تر ہے۔ اور ان کی ترقی کی رفتاروں میں بھی طبعی طور پر اسی قسم کی نسبت پائی جاتی ہے۔ اس سے ہمارے مدبرین یا عہدہ داران سررشتہ تعلیم پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ جب تک ملک کے تمام حالات پر غور نہ کیا جائے سد راہ تعلیم موانعات اور دقتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ شاید زیادہ منصفانہ طریقہ یہ ہوگا کہ ہم اس وقت ہماری گذشتہ بیس سال سے پہلے کی تعلیمی حالت سے موجودہ حالت کا اندازہ کریں اس مدت کا اکثر و بیشتر حصہ ہمارے آقائے ولی نعمت ہز اگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علی خاں بہادر جی۔ سی۔ یس۔ آئی۔ سلطان العلوم کی فرمانروائی کا ہے۔ اس مجمع میں غالباً متعدد ایسے لوگ موجود ہونگے جنہوں نے عہد عثمانی کے آغاز سے پہلے حیدرآباد کی درس گاہوں میں تعلیم ختم کی ہوگی۔ اور جو عالی تر یا فنی تعلیم کے خواہشمند رہے ہوں گے۔ لیکن ادھر ادھر تگ و دو کرنے کے بعد ضرور محسوس کیا ہوگا۔ کہ اس مقصد کے لئے بیرون ممالک محروسہ جانا ناگزیر تھا جو ذی استطاعت تھے اور شوق بھی کافی رکھتے تھے انہوں نے تو مدراس، پونہ، بمبئی یا علیگڑہ وغیرہ جاکر اپنی آرزوئیں پوری کرلی ہونگی بقیہ لوگوں نے صرف حسرت ہی حسرت میں عمریں رائیگاں کی ہونگی۔ میں آپ کے حافظہ پر اس وقت کی درس گاہوں کی تعداد اور ان کی تفصیل وغیرہ کی فہرستیں پڑھکر اعداد و شمار کا بار ڈالنا اور تکلیف دینا نہیں چاہتا چند سرسری لیکن مناسب حال واقعات بیان کردوں گا۔ مشرقی علوم کے لئے اس وقت دارالعلوم کا دروازہ کھلا تھا مغربی علوم کے لئے (لیکن سائینس کو اس سے خارج کرکے) نظام کالج کی بلند عمارت موجود تھی۔ مگر اس میں داخل ہونے کا راستہ مدراس یونیورسٹی کے تعلق کی وجہ بہت دشوار گزار اور ڈھلوان تھا۔

قانون کے شیدائی شب کو لاکلاس کی سیر کرلیا کرتے تھے مغربی طب کے خواہشمند میڈیکل اسکول کی معدودے چند نشستوں پر متمکن ہوکر اس کے مختصر کورس کو پورا کرنے کے لئے ذی اثر حضرات سے سفارشی خطوط مانگتے پھرتے تھے۔ انجینئرنگ کے طلب گاروں کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ آرٹس اور سائینس کی اعلیٰ تعلیم میں بھی ایسی ہی رکاوٹیں حائل تھیں۔ سائینس پڑھکر انٹرمیڈیٹ تک تو حاصل کرلیتے تھے لیکن آگے جانے کا راستہ بند تھا عملی تعلیم کے لئے سامان مل سکتا تھا۔ تو عمارات کا سوال نئی جماعتوں کے افتتاح کو خارج از بحث کردیتا تھا۔ قدیم

طرز پر جنہوں نے عملی مشق بغیر مضامین سائنس میں ڈگریاں حاصل کرلی تھیں وہ اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھے اور دوسرے بدنصیب ان کو حسرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ایم اے کے لئے پڑھنا اور اس کی ڈگری حاصل کرنا صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ مدراس یا کسی اور جگہ چلے جاتے اور وہاں بھی برائے نام کسی پروفیسر سے مدد لیکر دو تین سال کتابیں رٹ لیتے اور ایم اے بن کر واپس آتے۔

ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات کا نام بھی ہند کی جامعات میں کبھی نہیں سنا جاتا تھا البتہ کتب نویسی اور خصوصاً نصاب کی کتابوں پر نوٹس لکھنا فارغ التحصیل شخص کے لئے مفید و کارآمد کام سمجھا گیا تھا۔ اور ہمارے ملک کے حضرات کبھی کبھی اس جولانگاہ میں قدم رکھتے تھے۔

ذرا اب حالیہ صورت کو دیکھئے جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا دسترخوان ملک کی معمولی سے معمولی حیثیت اور اوسط قابلیت والے لڑکے کے لئے بھی بچھا دیا ہے ملک کا ہر فرد و بشر جس نے ملک میں نشو و نما پائی ہے اور اسی لئے زبان اردو سے واقف ہے۔ ادق سے ادق مضامین میں ایم اے اور ایم ایس سی کی حقیقی معنوں میں تعلیم پاتا اور ڈگری حاصل کرسکتا ہے۔ یہ سہولتیں طب اور انجنیری اور ایجوکیشن کے پیشوں کی تعلیم میں بھی مہیا ہوچکی ہیں۔

عثمانیہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ کے عالی شان مستقبل سے کون شخص ہے جو آشنا نہیں زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کارروائی جاری ہے اور امید ہے کہ چند سال کے بعد ہمیں ان مضامین میں بھی برٹش انڈیا کی محتاجی نہ رہے گی۔

اس بیان سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حیرت انگیز ترقی پر نازاں ہوکر اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھیں کہ بہت کچھ ہوچکا ہے، 'سب کچھ ہو رہا ہے' 'صرف وقت کا سوال ہے' کافی مدت میں ہم تعلیم کے نقطۂ نظر سے کمال کو پہنچ جائیں گے۔ کمال تو کسی صورت میں ممکن نہیں یہ ریاضی کی وہ ( ) نامتناہی مقدار ہے جس کے صرف قریب تر ہونا ممکن ہے۔ لیکن جس کو پہنچ جانا ناممکن ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہماری رفتار ہماری متمدن زندگی کے لئے کافی تیز ہے۔ ہم جو روپیہ صرف کر رہے ہیں اس کی تقسیم تعلیم کے مختلف شعبوں پر ان کی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے صحیح اصول پر ہو رہی ہے یا نہیں میں نے اب تک صرف اعلیٰ تعلیم اور کچھ فنی تعلیم کا حال بیان کیا۔ دیگر شعبہ جات تعلیم کے متعلق بھی کیا ہماری ترقی کوئی حقیقت رکھتی ہے یا نہیں۔

سہولت کی خاطر تعلیم کو متذکرہ ذیل حصوں یا شعبوں میں تقسیم کریں تو بیجا نہ ہوگا:

(۱) ابتدائی تعلیم جس کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ دیہی رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا اور دوسرا شہری رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا۔
(۲) وسطانی تعلیم
(۳) فوقانی تعلیم
(۴) جسمانی تعلیم یا فزیکل ٹریننگ
(۵) تعلیم اناث
(۶) اعلیٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم۔
(۷) ٹکنیکل تعلیم جو دستکاری پر زیادہ زور دے۔
(۸) پروفیشنل یا فنی تعلیم مثلاً طب، انجینیرنگ، زراعت، صنعت، تجارت، قانون وغیرہ۔
(۹) ریسرچ یا اعلیٰ تحقیقات علمیہ۔
(۱۰) معمر اشخاص کی تعلیم اڈیلٹ ایجوکیشن۔
(۱۱) معذورین کی تعلیم جیسے اندھوں، بہروں اور گونگوں کی۔

۱۳۳۸ف کی رپورٹ سے جو زیر ترتیب ہے۔ میرے دوست مولوی فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات نے مجھے از راہ کرم جو اطلاع بہم پہنچائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار عالی نے پبلک ایجوکیشن کی اہمیت کے کما حقہٗ سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ بعض ابواب میں سرکار عالی کا فیاضانہ صرفہ دیگر ممالک کے لئے قابل تقلید سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ ابتدائی تعلیم، ٹکنیکل تعلیم، تعلیم نسواں، ریسرچ پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا موجودہ طریق تعلیم زیادہ تر برٹش انڈیا کے طریقۂ تعلیم کی تقلید ہے لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ دن قریب تر آ رہا ہے۔ جب کہ یہ قدیم طریقہ ایک بڑی حد تک بدل دیا جائیگا۔ اور محض کتابی یا زبانی تعلیم کے عوض طلباء کو ملک اور خود ان کے ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم دلائی جائے گی جس سے کسب معاش و روزگار میں انہیں حالیہ تکالیف و پریشانیاں برداشت کرنی نہ پڑے گی۔

اگر میں متذکرہ بالا (۱۱) ابواب پر تفصیل سے بحث کرنا چاہوں تو اس کے لئے کئی گھنٹوں کی ضرورت ہوگی۔ نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس اتنا وقت یا آپ حضرات کو اتنی فرصت ہے

اس پر صرف صرف چند ابواب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرکے آپ صاحبوں سے استدعا کروں گا کہ ان پر غور فرمائیں۔

متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ملک کے تمام باشندوں کو لکھنا پڑھنا آنا ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسا کہ محض زندگی کے لئے کھانا پینا۔ جو پبلک نوشت وخواند سے واقف نہیں وہ متمدن نہیں ہوسکتی۔ ابتدائی تعلیم کا لزوم ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے سے ان کو تہذیب سکھا دی جاتی ہے کیا سرکار کا فریضہ اس معاملے میں صرف اسی قدر ہے اور بس۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ابتدائی تعلیم بالکلیہ ناقص ہے اور آگے چلکر اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم عام تو کی جائے لیکن اضلاع کے لئے یہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو کہ لوگ اپنے آبائی پیشوں کو ترک کرکے ملازمت کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کریں اور دیہات کو ویران و برباد نہ چھوڑ دیں۔ اسی طرح شہری رقبوں میں بھی ابتدائی تعلیم اگر طلبہ کو صنعت و دستکاری سے نافر بنا کر صرف پیشہ ملازمت سرکاری یا وکالت ہی کو معزز پیشہ تصور کراتی ہے۔ تو اس سے احتراز کیا جانا چاہیے۔

ممالک محروسہ میں سب سے زیادہ عام جو پیشہ ہے وہ پیشہ زراعت ہے۔ دیہاتی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں زراعت کی تعلیم بطور جزو اعظم شریک کی جانی چاہیئے۔ تاکہ لڑکے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ جانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ زراعت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور دھوکے میں پڑکر علم یا ملازمت کی خاطر شہروں میں بھٹکتے نہ پھریں۔ جس سے نہ تو خود انہیں کوئی اطمینان کی زندگی میسر ہوسکتی ہے۔ اور نہ ان کے والدین یا سرپرستوں کو اولاد کی پرورش و تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اگر زراعت کا شوق دلائے اور اس کے متعلق صحیح اور مفید معلومات مہیا کرائے۔ تو اس سے بہتر کوئی تعلیم ہمارے ملک کی فلاح و بہبود اور نوع انسان کی خوشحالی کے لئے نہیں سوچی جاسکتی۔ ایسی ویسی تعلیم کے ساتھ اضلاع میں کافی ٹکنیکل مدارس کا کھولنا بھی ضروری ہوگا۔

زراعت محض بیج بونا اور کھیتوں کو پانی پہنچانا نہیں ہے۔ اس کے لئے آلات کی بھی ضرورت ہے وہ آلات ایسے ہونے چاہئیں کہ آسانی سے کم قیمت پر بر وقت مہیا ہوسکیں ورنہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ جب تک ملک میں میکینیکل انجینیرنگ عالمگیر نہ ہو جائے آلات کا اس طرح بہم پہونچانا ناممکن ہے۔ عرصۂ دراز تک جانوروں گائے بیل وغیرہ سے کام لینا پڑے گا۔ اور ان کی نگہداشت بغیر حفظان صحت اور ویٹرنیری سرجری دشوار ہے۔ پس دیہات میں ایسے ٹکنیکل اور ویٹرنیری مدارس کا زیادہ تعداد میں کھولا جانا بھی ضروری ہے۔

زراعتی تعلیم کے متعلق مجھ کو فنی تعلیم کے ساتھ بھی کچھ کہنا ہوگا۔ شہری رقبوں کی تعلیم میں زیادہ تر شہری ضروریات کا لحاظ کیا جانا چاہئیے۔ اس رقبہ کے لوگوں کی نظر زیادہ تر ملازمت اور تجارت وصنعت وحرفت کی طرف لگی رہتی ہے۔ عام تعلیم تو قدیم یا موجودہ طریقہ سے حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن وسطانی اور فوقانی مدارس میں اگر کمرشیل کلاسیں، ٹائپ رائٹنگ ورشارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دلائی جائے اور مناسب صنعت و حرفت کے مدارس کھولے جائیں تو شہروں میں بے روزگاری کا سوال زیادہ تشویش اور تکلیف کا باعث نہ ہوگا۔

جسمانی تربیت میں نہایت خوف وہراس کے ساتھ چند سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ملک کے نوجوانوں اور خصوصاً طلبہ کی صحت جسمانی گھٹتی جارہی ہے۔ شہر کے لڑکے اور لڑکیاں خاص طور پر کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ حفظانِ صحت اور معیشت کے عام مسائل کے ساتھ وابستہ ہے۔ تمام ملک میں ملیریا، طاعون اور دق کے امراض پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری سکونت و بودوباش کے مقامات غیر سائنٹیفک طریقہ پر منتخب ہوئے ہیں اور سچ پوچھو تو مصداق ہیں :۔

"حیدرآباد نگینہ ——— اندرمٹی اور چونا"

انسانوں کی بودوباش کے لئے اتنے موزوں نہیں ہیں جتنے کہ چوہوں گھونسوں اور متعدی امراض کے لئے موزوں ہیں۔ میں دولت مند بزرگوں اور صاحب ثروت امرائے سے معافی چاہ کر عرض کروں گا کہ ماحول کے اثر نے ان کے مکانات کو بھی جراثیم سے مصئون اور معرا نہیں رکھ چھوڑا ہے۔ حفظانِ صحت کی معمولی سے معمولی واقفیت بھی اس سقم کو دور کردیگی۔ آرائش بلدہ کی اسکیم سرعت کیساتھ جاری ہے تو توقع کیجاتی ہے کہ غربا کی رہائش کا مسئلہ بھی خاطر خواہ طریقہ پر حل ہوجائیگا۔ یہ امور سررشتہ تعلیم کے دائرہ سے باہر ہیں سررشتہ تعلیم طلبہ کے اقامت خانوں اور طلبہ کی ورزش جسمانی کی طرف توجہ کرسکتا ہے۔ اقامت خانوں کی زندگی اخلاقی اصول کے تابع، ہمدرد اساتذہ کے زیرنگرانی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اس کے ساتھ ساتھ اگر ورزش جسمانی کا بھی انتظام کیا جائے تو ملک کے آئندہ شہری (Citizen) اپنی تندرستی کی وجہ زیادہ صحیح الدماغ وخوش خلق اور کارفرما وکارکن ثابت ہوں گے۔ بوائے اسکاوٹس موومنٹ ٹری ٹوریل کور کا قیام اور طلبۂ مدارس کی عام جسمانی تربیت کے لئے ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ تجربہ کار شخص کا تقرر حال ہی میں عمل میں آیا ہے۔ ہمیں امید دلاتے ہیں کہ طلبہ کی صحت جسمانی میں معتدبہ ترقی ہوجائے گی۔ یونیورسٹی کے طلبہ کا سالانہ طبی معائنہ بھی منظور ہوچکا ہے اگر . . . .

مدارس کی عمارتیں سائنٹیفک اصول کے بموجب بن جائیں گی تو طلبہ کی اکثر و بیشتر جسمانی کمزوریاں مثلاً بینائی کا قصور، خشونی نقائص وغیرہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گے۔

طلبہ کا فطرۃً ورزش جسمانی کی طرف میلان طبع ہوتا ہے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ اقامتی جامعات میں سب سے بڑی تربیت کتابی علوم سے بدرجہا بڑھکر کھیل اور ورزش جسمانی اور معاشرتی زندگی ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے بڑے مدارس میں بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں۔ اس فطری شوق کی ایک مثال شفیع احمد صاحب سابق طالب علم کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی پیراکی میں کامیابی ہے۔ جیسا کہ اکثر حاضرین کو معلوم ہے اسی فطری جذبے نے شفیع احمد صاحب کو رودبار انگلستان کے عبور کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس عالی شان عزم میں کامیاب ہو جائیں۔

ٹکنیکل تعلیم ٹکنیکل تعلیم پر میں نے اس سے پہلے بھی کچھ کہا ہے۔ کسب معاش کے نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت واضح ہے لیکن یہاں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ٹکنیکل تعلیم کی کامیابی کیلئے اول تو ملک کی صنعت و حرفت کا وسیع پیمانہ پر موجود ہونا لازمی ہے۔ کارخانوں کے مالکوں کو ایسے ہونہار کارآموزوں کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیئے۔ جو وہاں جاکر نوکری کرنا چاہتے ہیں۔ کارآموزوں کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے مدرسہ یا جامعہ کی سند ان کو اگر کسی چیز کا اہل بناتی ہے تو محض کارخانوں میں داخل ہو کر کام سیکھنے کا اہل بناتی ہے . . . . اصل کام وہ کارخانوں ہی میں سیکھیں گے اگر یہ اسپرٹ رہی تو ملک میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ فروغ ہوگا لیکن انڈسٹری یا صنعت میں کسی ملک کا حقیقی معنوں میں ترقی کرنا محض اس قسم کی تدابیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بعض معاشی اور بین الاقوامی مسائل کا حل ہونا بھی ضروری ہے۔ برطانوی ہند کے معاشی اور ٹکنیکل ماہر اور علی الخصوص کمیٹی اس طرف توجہ کر رہے ہیں مجھے اپنی طرز زندگی اور مصروفیتوں کی وجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سر دست میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان حضرات کو جو اس مسئلہ کے حل میں اپنے آپ کو مشغول بناتے ہیں تحقیقات کر لینے دیں اس کے بعد ہم ان کے نتائج پر تنقید کر سکیں گے ہمارے ملک کی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر ہے ہمیں چاہیے کہ سر دست زراعت ہی کے مسائل پر غور کریں اور ان کے تمام حل ڈھونڈیں۔

جو کچھ بھی ٹکنیکل تعلیم ہم دے سکتے ہیں اس کو کامیاب بنانے کیلئے طلبہ کو بالطبع دست کاری کی طرف مائل اور اس سے مانوس بنانا ایک شائستہ تعلیمات کا بڑا فریضہ سمجھا جا سکتا ہے اس کے لئے ابتدا ہی سے طلبہ کو

دست کاری کا عادی بنانا ضروری ہے۔ پس مناسب ہوگا کہ دستکاری کو تعلیم کے نصاب میں شامل کردیا جائے۔
سائنس چونکہ ایک عملی علم ہے اس کو بھی ابتدا ہی سے نصاب تعلیم میں شریک کرنا لازمی ہوگا۔ جتنے بھی عملی مضامین
ہیں ان سبھوں کی بنیاد طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور ریاضی پر قائم ہے۔ پس ان مضامین کی طرف خاص توجہ کی جانی چاہیے
اور اعلیٰ تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ترقی و ترویج کا انتظام ہونا چاہیے۔
اعلیٰ تعلیم اعلیٰ تعلیم ایک ایسی شئے ہے کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش بلکہ تکوین ہوتی ہے الحمد للہ
ہمارے ملک میں اس کی طرف بتوسط جامعہ عثمانیہ و نظام کالج وغیرہ کافی توجہ کی جارہی ہے دس بارہ سال
کے اندر جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اور ایم ایس سی تک کی جماعتیں کھل گئیں ایل ایل بی کی تعلیم بھی اچھے اصول پر
ہو رہی ہے۔ جامعہ کے موزوں عمارت نہ ہونے سے ہم اس تعلیم سے وہ حیرت انگیز فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے
جس کی ہم توقع ہے۔ باوجود ان رکاوٹوں کے ہم نے جو کام شروع کردیا ہے اس کی اہمیت کو ممالک غیر کے ماہر
نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ بلحاظ تعلق مجھے جامعہ عثمانیہ کے متعلق زیادہ نہیں کہنا چاہیے صرف اس بات پر اکتفا
کرتا ہوں۔ حیدرآباد میں جامعہ کا قیام ایک فطری امر تھا۔ اور اسی طرح اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی ہمارے کے لئے
ایک فطری بات تھی گزشتہ جلسہ تقسیم انعامات کے موقع پر میں نے بیان کردیا ہے کہ اردو زبان میں تعلیم حقیقی باشندگان
ملک کے تمام افراد کو بلالحاظ قوم و ملت انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلانے سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔
میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ملک کی دوسری زبانوں مثلاً تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی بھی خاطر خواہ
خدمت کی جارہی ہے ان زبانوں میں ایم اے تک کی بھی تعلیم دی جاتی لیکن ان کے پروفیسروں نے زمانہ کا رنگ
دیکھ کر اور طلبہ کا طبعی رجحان دیکھ کر یہ مشورہ دیا کہ بجائے ورنیکولر زبانوں میں ایم اے کی جماعتیں کھولنے کے ریسرچ
کی تعلیم دلائی جائے چنانچہ حال میں (۵، ۵، ۷) روپیہ کے تین وظائف ان زبانوں کی ریسرچ کے لئے منظور ہوئے ہیں
اور یہ کام آئندہ شہریور سے شروع کردیا جائیگا۔ سائنس میں ایم ایس سی کے ساتھ ریسرچ بھی شریک کردی گئی ہے۔
تاریخ کے ایم اے میں پہلے ہی سے مقالہ نویسی داخل تھی اب اردو میں بھی اسکو لازمی کردیا جانا تجویز ہوا ہے۔
اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش
ہوتی ہے۔ اس بارے میں میں ذرا زیادہ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں:
کسی قوم یا ملک کا وقار اس کے اعلیٰ ترین افراد سے ہوتا ہے وہ کون ہیں؟ ملک کے مدبر و عمائد سلطنت جو
اپنی قابلیت، وفا شعاری، ہمدردی اور کارگزاری سے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ امرا و سرمایہ دار جو اپنے فضل و کرم

جود و سخا اور ملک کی خدمت گزاری سے رعایا اور حاجتمندوں کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں ان کے سوا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو زمانہ دراز سے دنیا پر اپنا اثر ڈالتا چلا آرہا ہے۔ اس طبقہ میں مذہب و ملت کے پیشوا اور علماء و فضلا شریک ہیں زمانہ حال کی مادیت پرستی نے افسوس ہے کہ پیشوایانِ مذہب و ملت کو خارج از بحث گردانا اس لئے میں ان کا ذکر اس جگہ مناسب نہیں سمجھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ علما فضلا ہی اس زمرہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے علما فضلا ہی کے متعلق بحث کروں گا۔ پہلے زمانے میں خانگی تعلیم سے یا کسی مشہور و معروف استاد کی خدمت سے لوگ علم و فضل کے بلند ترین درجوں تک پہنچ سکتے تھے۔ اب مادی علم اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ بغیر اعلیٰ پیمانہ پر باقاعدہ اور مسلسل کوشش کرنے کے ملک کا کوئی فرد حقیقی معنوں میں عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔ روحانیت کا دروازہ بند ہونے کو ہے صرف مادیت میں ترقی اور حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ خواہ فنون کے شعبہ میں ہو یا سائنس کے شعبہ میں نام آوری حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی تحقیق صرف بڑے پایہ کے کتب خانوں اور تجربہ خانوں ہی سے ممکن ہے۔ قابل سے قابل شخص ان کتب خانوں اور تجربہ خانوں کے بغیر گمنام رہ جاتا ہے۔ اور اوسط ذہانت کا انسان بھی ان میں کام کر کے کبھی کبھی بڑے اہم اور نمایاں ایجادات و انکشافات سے دنیا کو مسخر کر لیتا ہے۔ کتب خانوں اور تجربہ خانوں پر سرکار یا قوم کی طرف جتنا بھی روپیہ صرف ہو فائدہ سے خالی نہیں۔ ان میں کام کرنے والوں کو اطمینانِ قلب نصیب ہونا چاہیئے۔ اگر ایسی پروفیسریاں قائم کر دی جائیں اور ان پر ملک کے قابل ترین اشخاص مامور کئے جائیں تو ممالک محروسہ میں بھی اسی پایہ کی ایجادات و انکشافات دیکھنے میں آ سکیں گی جیسی کہ برطانوی ہند کے بعض حصوں میں انجام پا رہی ہیں اور جن کا چرچا چار دانگ عالم میں ہو رہا ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور، میگ ناتھ ساہا، اور سر سی وی رمن وغیرہ کی وجہ علمی دنیا میں ہندوستان کو اندنوں جو شہرت نصیب ہوئی ہے وہ بیس سال قبل لوگوں کے وہم و گمان سے بھی باہر تھی کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے سربرآوردہ ماہرانِ علوم و فنون میں حیدر آباد کے منتخب افراد کا نام داخل ہو۔ ایسے کام کرنے والے یہاں ڈھونڈنے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کو موقع دیا جانا چاہیے۔ ایک بار جب وہ اطمینان کے ساتھ کام پر لگ جائیں گے تو ان کے زیر اثر ملک کے ہونہار طبقہ سے بھی ایک بڑی جماعت ایسے محققین کی پیدا ہونے لگے گی۔ میں نے کوڈائی کنال (Kodaiknal) کی رصدگاہ شمسی طبیعات یعنی (Solar physics observatory.) میں ریسرچ کی اجازت ہمارے طالب علموں کے لئے حاصل کر لی پروفیسر ساہا نے ہمارے ایک یم۔ یس۔ سی کے طالب علم کو الہ آباد کی فزکس لیبوریٹری میں

(SPECTEROSCOPY) پر کام کرنے کی دعوت دی ہے نظام کالج کے ایک ہونہار گریجویٹ نے
پروفیسر رامن کے تجربہ خانہ میں قابلِ تعریف کام کرنا شروع کر دیا ہے یہاں میں جامعہ عثمانیہ کے ان لائق طلبہ کا
ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے یورپ کی جامعات میں قابلِ تحسین کامیابی حاصل کی ہے اور کر رہے ہیں
اس لئے کہ متعدد موقعوں پر میں نے تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کر دیا ہے اگر ہم ہمارے تجربہ خانوں کو ترقی دیکر اطمینان
کے ساتھ اعلیٰ تحقیقات کا کام شروع کر دیں تو ہمارے طلبہ کو باہر جانے کی ضرورت نہ ہوگی اور تحقیقات میں
جو کچھ کامیابی حاصل ہوگی اس کا کریڈٹ ہمارے ملک ہی کو ملے گا۔

تعلیم نسواں اب میں تعلیم نسواں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگرچہ گزشتہ چند سال سے ہم نے اناث کی اعلیٰ تعلیم پر کافی روپیہ صرف کرنا شروع کر دیا ہے اور مستورات کو یورپ بھیجکر تعلیم دلائی
جارہی ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی تعلیم نسواں پر اس سے بہت زیادہ روپیہ اور توجہ صرف کرنے کی شدید
ضرورت ہے۔ عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ روزمرہ کی معمولی اور ان کے ضروریات کے
مناسب تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے
خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو بلند طبقہ کی ہوں یا پست طبقہ کی نہ صرف لکھنے پڑھنے کی بلکہ اچھے اور اونچے
معیار تک کی تعلیم دلانا کس لئے ضروری ہے۔ اگر ہندوستان مہذب دنیا کی نظروں میں عزت مقام
چاہتا ہے تو اسے بہت جلد اپنے اناث کو تعلیم یافتہ بنا دینا چاہیے۔ لیکن اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ
لڑکیوں کو ان کے مفید مطلب اور کارآمد تعلیم دلائی جائے لڑکیوں کے لئے لڑکوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہی
غیر موزوں ہے جیسے کہ فوجی ملازمت۔ اگر مطمع نظر یہی ہے کہ لڑکیاں بھی سب کی سب لڑکوں کی طرح
میٹرکولیٹ انٹرمیڈیٹ پاس یا بی اے ایم اے بن کر تعلیم گاہوں سے نکلیں تو میں بلا تامل اپنے آپ کو ایسے
ماہرانِ فن تعلیم کے زمرہ سے علیحدہ کرلوں گا جن کا یہ مطمع نظر ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بارہا اناث کی تعلیم کیلئے
سرپرستوں اور معلمتوں سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا۔ میں نے جب دریافت کیا کہ انگلستان کے مدارس کی
اعلیٰ تربیت اناث کے اصول پر تعلیم کیوں نہیں دیجاتی تو یہی جواب ملا کہ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم لڑکیاں ہمارے
مدرسوں میں شریک ہوں گی کیونکہ سرکاری یا یونیورسٹی کی سند کی رشوت کے بغیر اکثر و بیشتر والدین اپنی بچیوں کو
مدرسہ بھیجنا عبث سمجھتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد یہ خیال پبلک کے دلوں سے دور ہو جائے گا
اور تعلیم کے اصل منشاء و مقصد کی طرف وہ مائل ہو جائینگے۔

یہ سرکاری اور یونیورسٹی کی سندیں ہیں جو غالباً اناث کو بھی انہیں نصاب کا پابند کرتی ہیں جو مردوں کے لئے تجویز ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید مسٹر کاروے (Karve) کی بنائی ہوئی مستورات کی جامعہ نے حصول سند کے شوق کو مفید مطلب نصاب کے ساتھ ایک حد تک نباہ دیا ہے۔ لیکن بہ نظر غائر اگر دیکھا جائے تو اولاً اس صورت کے جب کہ عورت کو مجبوری یا محض شوق کی خاطر نوکری اختیار کرنا پڑتا ہے حصول سند کی خواہش ضروری ہے اور اگر کالج صحیح اصول پر باقاعدہ طریقہ سے اناث کی ضروریات ہی سے متعلق نصاب تجویز کرکے تعلیم دینا شروع کریں تو میرا خیال ہے کہ بیشتر روشن خیال والدین اپنی بچیوں کو ایسے ہی مدرسوں میں بھیجنا پسند کریں گے اور تعلیم یافتہ اناث کی تعداد میں معتدبہ ترقی ہوگی۔ ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں یقیناً اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی خوش رہیں گی اور شادی کے بعد شوہروں میں بھی بخوبی اتفاق رہے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی ذہانت والی یا اعلیٰ تعلیم کی دلدادہ لڑکی محض کسب علم کی خاطر یونیورسٹی کا کورس اختیار کرنا چاہتی ہے تو ایک دوسری ہی بات ہے۔ ایسی لڑکی کو جس قدر بھی اس کے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے مدد دی جائے اچھا ہے ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ہاں سے ایسی چند لڑکیاں نکلیں گی اور اپنے ماں باپ اور وطن کا نام روشن کریں گی۔

اگر اناث کو سینا پرونا، کشیدہ کاڑھنا اور کھانا پکانا سیکھ لینے کے بعد حفظانِ صحت، ڈومسٹک اکانومی، بیالوجی یا طب خصوصاً (Midwifery) دایہ گری اور نرسنگ (Nursing) کا شوق دلایا جائے تو وہ ملک و قوم کے لئے نہ صرف مفید بلکہ مایہ ناز بھی ہوں گی۔ آخر الذکر دو شعبوں میں ہندوستانی عورتوں اور علی الخصوص مسلمان عورتوں کی اس قدر قلت ہے کہ ان کے لئے سرکار اور پبلک کی جانب سے خاص طور پر کوشش کیجانے کی ضرورت ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ پردہ مانع تعلیم اناث ہے اور جب تک یہ نہ اٹھ جائے گا ہندوستان میں تعلیم یافتہ عورتیں عنقا ہی عنقا رہیں گی۔ پردہ کی حقیقت یا اس کی ضرورت و غیر ضرورت کا سوال معاشرتی ہے خالصاً تعلیمی نہیں لہذا میں اس کے حسن و قبح پر اس محفل میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ پردہ کا عذر بتا کر جو لوگ تعلیم اناث سے غفلت کرتے ہیں اور اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ پردہ اٹھا دیں بعد کو عورتوں کی تعلیم شروع کریں اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کے گھروں کا پردہ تو غالباً اٹھ جائیگا لیکن اس میں تعلیم داخل نہیں ہوگی۔

ایسی پردہ نشین شادی شدہ مستورات کی تعلیم کے لئے جو اپنے گھر کے کاروبار اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ مدرسے جا کر علم حاصل نہیں کر سکتیں سنز ناسکرنے ایک اسکیم تجویز کی ہے جو محلوں یا خاندانوں کے اتحاد عمل پر مبنی ہے جب یہ اسکیم مکمل صورت اختیار کر کے حیدرآباد کی انجمن خواتین (WOMEN BASED CIETION) کی منظوری حاصل کرے گی تو امید ہے کہ اس سے بہت خاندان استفادہ کر سکیں گے کیا عجب ہے کہ اپنے خطبہ میں محترمہ مسز رستم جی اس مسئلہ پر بھی بحث کریں۔

تعلیم نسواں کے کئی اور مسائل حل طلب ہیں مثلاً یہ کہ آیا چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقررہ عمر تک مدارس میں ایک ساتھ تعلیم دلانا مناسب ہے یا نہیں یا یہ کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دلانا زیادہ مفید ہوگا یا اپنی مادری زبان کی تعلیم مسائل بہت دلچسپ اور ان پر خالصاً تعلیمی نقطۂ نظر سے اچھی بحث کیجا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ خوش نصیبی سے محترمہ مسز رستم جی موضوعِ تعلیم نسواں پر تقریر کرنے والی ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کو اب ختم کر دوں۔

اب میں مختصر طور پر یہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تعلیم کی اسپرٹ کیا ہونی چاہئیے مجھے یہ کہنے میں مطلقاً تامل نہیں کہ وہ تعلیم جو اخلاق کی نگہداشت نہ کرے عبث اور بے سود ہے۔ انسان میں اخلاق حمیدہ جب تک نہ پیدا ہوں وہ بہائم سے علیحدہ نہیں سمجھا جا سکتا مختلف زبانوں اور تمدن میں اخلاق کی تعلیم مختلف طریقوں پر رہی ہے لیکن ہر صورت میں اس کا کوئی معین نصاب نہیں رہا ہے یہ زیادہ تر اساتذہ کے اخلاق اور ملک کے اخلاق ہی پر مبنی رہا ہے قدیم زمانے میں شاگرد استاد کو اپنے ہر کاروبار میں پیشوا اور ہادی سمجھتے تھے۔ اور اساتذہ کو بھی اپنے شاگردوں سے ایسی محبت اور انست تھی جیسی کہ اپنی اولاد کے ساتھ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں تعلیم مفت دیجاتی تھی یا اساتذہ کا معاوضہ اوقاف یا اسٹیٹ کی دیگر پوشیدہ امداد وں کے ذریعے سے کچھ ایسے غیر محسوس طریقہ پر ادا ہوتا تھا کہ تعلیم مفت ہی متصور ہوتی تھی۔ زمانہ میں رفتار کے ساتھ اس طرز تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ موجودہ تنخواہ یاب اساتذہ کا کم از کم ایشیائی ممالک میں وہ احترام نہ رہا جو پرانے عہد کے اساتذہ کو نصیب تھا۔ لوگ یہی سمجھنے لگے کہ استاد کو اگر ہماری فیس سے روپیہ نہیں ملتا ہے تو کم از کم سرکار سے تو ضرور معاوضہ ادا ہوتا ہے۔ پس ہم پر احسان ہی کیا۔ معمولی تعلیم کی حد تک تو ایسے یا ان سے مختلف خیالات کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم و تحقیقات عالیہ کا سوال پیدا ہوا تو اساتذہ نے یہ محسوس کیا کہ ان ابواب میں طلبہ کی رہنمائی ایک ایسی چیز ہے جس کا معاوضہ روپیہ پیسے سے کسی طرح

ہوہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی معاوضہ ہو سکتا تو وہ اپنے صرف شاگرد کی عقیدت، فرمانبرداری اور سعادت مندی کے ذریعہ ہو سکتا ہے طلبہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ہمن جامعات میں آئے دن نئی نئی تحقیقات وانکشافات کی بارش برس رہی ہے وہاں استاد و شاگرد میں ایسے ہی تعلقات پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں دیکھے جاتے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ ہر درجہ کی تعلیم میں بھی اس قسم کا تعلق برقرار رہتا۔ زمانہ گزشتہ کی اس خوبی کو کر حاصل کرنے کیلئے اساتذہ کو زیادہ ایثار سے کام لینا ہوگا اور شاگردوں کو زیادہ سعادتمندی اور اطاعت گزاری اختیار کرنی ہوگی۔ جو کامیاب استاد ہیں وہ اب بھی پیشہ تعلیم کو حصول زر کی خاطر نہیں اختیار کرتے بلکہ محض علم کی محبت میں اختیار کرتے ہیں جو جاہ طلب ہیں وہ اس میدان میں زیادہ دن رہنے نہیں پاتے۔ وہ یا تو اپنا پیشہ ہی بدل دیتے ہیں یا زمانہ انہیں ایثار سکھا دیتا ہے۔ یہ تو اساتذہ سے متعلق واقعات ہیں۔ طلبہ بھی جب تک سعادتمندی نہیں اختیار کرتے انہیں علم نہیں نصیب ہوتا۔ اور اگر نصیب بھی ہوا تو اس کے مفاد سے وہ محروم رہتے ہیں پس میں اساتذہ وطلبہ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ نوع انسان کے ارتقاء و فلاح و بہبود کی خاطر وہ زمانہ ماسبق کے ان مبارک اخلاق واطوار کو اپنا نصب العین بنالیں جس سے معلم و متعلم دونوں کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ اور دونوں کو بیرون از قیاس فائدہ پہونچتا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں استاد ہیں وہ اپنے ہونہار شاگردوں کے مفاد کے لئے اگر ضرورت ہو تو تمام دنیا سے بگاڑ کر لینا بھی پسند کرتے ہیں ایسی بیشمار مثالیں موجود ہیں کہ شفقت استاد کی بدولت کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی یکتائے روزگار بن گئے۔ ان کی دنیا و آخرت دونوں ہی اچھی رہی ہیں استاد کا احترام اور اس کے ساتھ وفا شعاری شاگرد کے لیے ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے جو مذہبی حکم کی وقعت رکھتا ہے۔

معمر لوگوں کی تعلیم یا اڈیلٹ ایجوکیشن ایک زمانے سے زور دیا جا رہا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ایسے معزز لوگ جو بدقسمتی سے اوائل عمر میں اچھی تعلیم پا سکے عمر بھر ایسے ہی ناقص التعلیم رہیں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کا تمدن زیادہ تر تعلیم ہی پر قائم ہے اور تعلیم عمر اور دیگر قیود سے بری ہے معمر شخص کے لئے امتحانات کامیاب کرنا یا ڈگریاں لینا اگر ممکن نہیں تو محض علم کی خاطر تحصیل علم چنداں مشکل نہیں انسان کی قوت ارادی فضا اور وقت دونوں پر غالب آ سکتی ہے علم کے ایسے

طلب کتب خانوں اور ان کے کلاسوں او رپبلک لائبریری کے لکچروں سے خاطر خواہ استفادہ کرسکتے ہیں۔ پس امید ہے کہ اگر کسی ملک میں زیادہ وقت ملک پبلک کو تعلیم دینے کے انسٹیٹیوشن زیادہ تعداد میں اور وسعت کے ساتھ قائم ہوجائیں تو کتب خانوں کا اثر ملک کی خواندگی پر انتہا درجہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ دو ہ و مضافات میں بھی ملک میں ایسے کتب خانے بڑی تعداد میں قائم ہونے لگے ہیں۔ اگر ان کتب خانوں کے مہتمم یا مہتمم محض اشاعت تعلیم ہی اپنا نصب العین رکھیں اور سیاسی پاس انداز سے دور رہتے ہوئے کام کریں تو ملک علم کی تنویر سے منور ہوجائیگا اور فرقہ بندی کے جھگڑے آپ سے آپ مٹ جائینگے۔

اشاعت تعلیم میں صاحب ثروت امرا ابتک ہم نے جو کچھ کہا وہ زیادہ تر سرکاری انتظامات تعلیم **اور دولتمند اشخاص کا اثر** کے متعلق تھا ہمارے ملک ہندمیں پبلک کو ہر ایک سرکار کا ہاتھ بٹانے کا ابھی احساس بہت کم ہے۔ اگر پبلک بھی ایسے تعلیمی اور رفاہ عام سے متعلق کاموں میں بعض زیادہ نہیں تو تھوڑی دلچسپی لے تو یقین کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں کسی دوسرے متمدن ملک سے پیچھے نہیں رہے گا۔ امرا اگر کارہائے تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم ان کو دلچسپی دلانے کی کوشش کریں۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک حیدرآباد میں لائق اور نامور اساتذہ وغیرہ بہت گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی ہمارے امرا یا صاحب ثروت حضرات پر اپنے علمی کاموں کا ایسا گہرا اثر نہیں جمایا جس سے ان بزرگ ہستیوں کو ملازمتوں یا وظائف یا انعام تعلیمی کے ذریعہ ان اساتذہ کی یادگاریں قائم کرنے کا کچھ بھی احساس پیدا ہوا ہو۔ جو یادگاریں قائم ہیں وہ زیادہ تر سرکاری کی رقم سے قائم ہیں۔ پبلک فنڈ سے اگر کوئی یادگاریں قائم ہیں تو ان کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کا ہونا نہونا دونوں مساوی ہیں۔ جیسا ہمیشہ سے کہا جاتا ہے اس قلت کی وجہ زیادہ خود اہل علم کا باہمی حسد یا سہل انگاری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب ان کمزوریوں کو رفع کریں گے اور طبقہ علما کی فضیلت کو ملک سے منوا کر انہیں اس بلند رتبہ پر پہنچاویں گے جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

مطابع اور اخبارات کا اثر اشاعت تعلیم پر مطابع خواہ انگریزی ہوں یا اردو یا دیگر ملکی زبانوں کے مدارس سے بھی زیادہ علم کی اشاعت کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہزارہا

معلومات دور دراز مقامات تک اور عام طور پر بہترین پیرایہ میں پہنچائی جاتی ہیں۔ مطابع کے مالک اور علمی اخبارات و رسالہ جات کے ایک طرح سے علم کے سرپرستوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ انھیں اپنی قوت کا اندازہ تو ضرور رہتا ہے لیکن امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنی اس قوت کو اچھے ہی کاموں میں صرف کریں گے۔ ان کے پاس ایک نہایت ہی تیز شمشیر ہے جس سے وہ اگر چاہیں تو جہل او دروغ کو دنیا سے نیست و نابود کردیں پس انہیں چاہیئے کہ اس ہتیار کو صرف نیک کاموں کی تائید میں استعمال کریں۔ بیانات اور غلط بیانی اور غیر محققہ اطلاعوں کی اشاعت سے پرہیز کریں ورنہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا وہ مشہور شعر ان کے حسب حال سمجھا جا سکیگا۔

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نگفتم کہ دیوار مسجد بکن

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اب ایسے مدبر پیدا کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے جو اس شعر کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور واقعات کے بیان اور رایوں کے اظہار میں حق شناسی اور نیک نیتی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں سیاسیات کو نظر انداز کرکے مطابع کے ان کاروبار سے بحث کر رہا ہوں جو علمی رسالوں اور کتابوں کی طباعت سے متعلق ہیں مناسب رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سے ہر گھر مدرسہ یا دار التعلیم بن سکتا ہے اور ان کا ہر مطالعہ کرنے والا ایک گھریلو یونیورسٹی کا طالب تصور ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری اقتصادی کمزوری اجازت نہیں دیتی کہ ملک میں مطابع کی کافی تعداد مہیا ہو جائے اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں انگریزی اور اس میں بھی ریاضی اور سائینس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں خدا کرے کہ طباعت کتب کے لئے حیدرآباد میں جلد مدراس بمبئی کلکتہ وغیرہ کی سی سہولتیں میسر ہو جائیں تاکہ مصنفین کو تصنیف و تالیف کی مزید سہولت ہو اور پڑھنے والوں اور بالخصوص طلبہ کو سستے داموں اور عمدہ چھپائی کی کتابیں مل سکیں۔

یہاں اردو ٹائپ اور نستعلیق وغیرہ کا سوال بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ حال ہی میں نستعلیق کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے تھے اور اس کا مسئلہ زیر سرپرستی سرکار عالی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہوا ہے اس لئے میں صرف اتنا بیان کرکے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار عالی نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش میں کئی ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے۔ اور خرچ کرنے پر آمادہ ہے جس سے اس کی سرپرستی علم کا ایک مزید

ثبوت ملتا ہے۔

تعلیمی نمائشیں اور ان کے فوائد

سابق میں ہماری تعلیمی کانفرنس کے جلسوں کے ساتھ علمی نمائش کا بھی انتظام ہوتا آیا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ حتی الامکان ایسی نمائشوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں ان کے قیام و انتظام پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ بیان کروں کہ گرہر سال بلدہ کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسی نمائشیں منعقد کیجائیں، اور دیگر ممالک کے مدارس و اساتذہ وغیرہ کو ان میں شرکت کی دعوت دی جائے تو شوق مسابقت اور باہمی ارتباط نہ صرف تعلیم کی ایفی شینسی (EFFICIENCY) یعنی استعداد کو ترقی دیگا بلکہ آپس کا اتحاد بھی بڑھا دیگا جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے۔ ایسی نمائشوں میں سینما کے ذریعہ تاریخی و اقتصادی مطالب پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور سائنس کے جدید ترین تحقیقات اور ان کے نتائج سے چھوٹے اور بڑے بچے اور بوڑھے سب کے سب بوقت واحد واقف کرائے جاسکتے ہیں۔

فوٹو گرافی اور پینٹنگ

اسی ضمن میں میں نقاشی و عکاسی یعنی پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی ضرورت تعلیم کیجانب آپ کی توجہ کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک کو عمدہ پینٹروں اور فوٹو گرافروں کی سخت ضرورت ہے سیر و سیاحت کے ذریعہ انسان اپنے اور پرائے ملکوں کے خوشنما مناظر سے آگاہ ہو جاتا ہے اور ان کا خوش گوار اثر اس کے جمالیاتی حواس کو تقویت بخشتا اور اس کی اخلاقی زندگی کو فروغ دیتا ہے لیکن حافظہ کہاں تک اور کب تک کام دیسکتا ہے ان چیزوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمدہ فوٹو یا تصاویر لئے جائیں بعض صورتوں میں فوٹو گراف کے ذریعہ اشیاء کی تفصیل خاطر خواہ نہیں کیجا سکتی معہذا اچھے سے اچھے فوٹو گراف زیادہ دیرپا نہیں ہوتے اس لئے پینٹنگ یا ڈرائنگ اور فوٹو انگریونگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے ہمارے ملک میں مہذب دنیا کے ان مشہور و معروف کمالات کا شوق پیدا کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ان کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جائے اگر ہر سال چند ہونہار طالب علم اٹلی یا دیگر مشہور ممالک یورپ کو فنون لطیفہ کی تعلیم کے لئے بھیجے جائیں تو ملک کو اس سے بڑی تقویت ہوگی ان کمالات کے کرشمے انسان کی حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذی اثر اور صاحب ثروت لوگ ممالک غیر کی خوبیوں کو دیکھکر اپنی بود و باش کے شہروں کو بھی خوشنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے:-

سیر و سیاحت (اکسکرشن)

گر بہ دکان خانہ در گردی ــــ ہرگز اے خام آدمی نشوی

بروا اندر جہاں تفرج کن ـــــــ پیش ازاں روز کز جہاں بروی

کون ایسا شخص ہے جو سیر و سیاحت کے فوائد سے انکار کرتا ہے یا اس کا لطف اٹھانا نہیں چاہتا کسی عمر میں بھی ہو سیاحت مختلف طریقوں سے منفعت بخش ہوتی ہے لیکن نوعمری اور طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ انسان کے حواس مشاہدہ قوی اور اس کی آئندہ زندگی کو ایک خاص شکل میں ڈھالنے کے مواقع بیشتر اور بہتر ہوتے ہیں سیر و سیاحت زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے انگلستان کے مدارس بصاحب و ثروت اور علم دوست اصحاب کی مدد سے جو کیا عجب کہ انہی مدارس کے طلبہ قدیم میں سے ہوں) طلبہ کی سیر و سیاحت کا خاص طور پر انتظام کرتے ہیں سولہ سترہ سال کے لڑکے چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں دوران مدت تعلیم دنیا کا سفر کرکے اپنے اپنے مدرسوں کو واپس لوٹتے ہیں بوائے اسکاوٹ کی تنظیمیں بھی اس قسم کے کاموں میں عہدہ داران مدارس کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایسے اکسکرشن ہمہ قسم کے ہوتے ہیں اور سب کے سب دلچسپی سے مملو ہوتے ہیں ان میں کوئی پاپیادہ ملک کا سفر کرتے ہیں کوئی سیکلوں پر اگر دور کا سفر مطلوب ہے تو ریل یا جہاز کے ذریعہ سیاحی کرتے ہیں ارباب دولت کے فرزند موٹر کاروں میں گھوم کر آتے ہیں شاید چند سال کے بعد ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی طلبہ سیاحت کرسکیں چونکہ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ اس قسم کا سفر مدرسہ کی زندگی کا ایک جزو ہے اور ڈسپلن یعنی ضبط کا حقہ ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لئے دوران سفر کوئی ناشگوار بات وقوع میں آنے نہیں پاتی اگر آتی ہے تو خاطی کو پوری سزا دیکر واپس بھیجدیا جاتا ہے جب نوعمر طالب علم ایسے باقاعدہ طریقہ پر دنیا کی سیر کرتا ہے اس کے مختلف ممالک پہاڑ دریا، جنگل میدان، شہر اور قصبے دیکھتا متعدد اقوام کی بیشمار درس گاہوں پر نظر ڈالتا ان کے ہم عمر بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا اور کھیلتا ہے تو دنیا اس کے اندازہ میں چھوٹی ہوجاتی ہے اور انسان کا عزو وقار اور اس کے ساتھ ہی خدا کی قدرت اور عظمت کا یقین اس کے دل میں بڑھ جاتا ہے اگر بنی نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرانا مقصود ہے تو شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ دستیاب نہیں ہوسکتا۔

کھیل کھیلوں کے متعلق جسمانی تربیت کا ذکر کرتے وقت میں کچھ زیادہ نہ کہہ سکا ابھی ابھی سیر و سیاحت کے بیان میں میں نے کھیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے طلبہ کے لئے کھیل بھی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کورس اس دعوی کے ثبوت میں مجھے کوئی دلائل پیش کرنیکی ضرورت نہیں ہر کس و ناکس مدارس کے لئے کھیل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے کیا خوب ہوتا کہ ہمارے تمام یا کم ازکم بڑے بڑے مدارس اور کالج اپنی اپنی زمین رکھتے اکثر صورتوں میں تو مدرسہ کو خود بنا مکان نصیب نہیں تو میدان کہاں سے آتی جامہ ندارم دامن از کجا آرم لیکن جب کرایہ کے مکان میں مدرسہ کھولا جاتا ہے تو کھیل کے لئے زمین بھی کرایہ یا اجازت سے لی جاسکتی ہے اور اکثر صورتوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات دارالسلطنت سے دور واقع ہوئے ہیں انہیں یہ بڑا فائدہ ہاتھ آیا کہ ان کے پھیلنے میں مواقعات کم آئے ہیں اور ان کو کھیل کود کے لئے سطح میدان کے وسیع رقبہ بہ آسانی مل گئے اور مل جاتے ہیں لندن اور دوسری شہری جامعات کو یہ قدرتی مواقع نصیب نہ ہوسکے اس پر بھی لندن کے کالج اور مدارس شہر کی آبادی سے باہر مناسب میدان کرایہ یا اجازت سے لیکر رکھتے

ہیں اور شوقین طلبہ موسم بہار و گرما میں وہاں ریل وغیرہ کے ذریعہ پہنچ کر کھیل کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سررشتہ تعلیمات اگر اس قسم کی سہولتیں اپنے علاقہ کے تمام مدارس کیلئے مہیا کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف طلبہ کی صحت ہی ترقی کرے گی بلکہ تعلیم کے ساتھ عام تربیت بھی اچھی ہو جائے گی۔

تعلیم اور بے روزگاری اکثر اصحاب تعلیم کی عمومیت کے لئے جب کوئی تحریک کیجاتی ہے تو بے روزگاری کا سوال پیش کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیم عام ہونے سے پڑھے لکھے آدمی بہت ہو جائینگے اور ان سب کو چونکہ نوکریاں نہیں مل سکتیں اس لئے ان میں بے چینی پھیل جائے گی۔ صحیح اعداد و شمار کے بغیر کسی بھی مسئلہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر دینا مناسب نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں ضرور ایسا ہوتا ہو۔ لیکن ابھی حیدرآباد میں تعلیم کی ایسی عمومیت نہیں ہے کہ اس قدر خدشہ پیدا ہو صرف اتنا سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا بھی تدبیر نہیں ہے۔ پہلے تو ہمیں چاہئے کہ ایسے طریقہ تعلیم ہی اختیار نہ کریں جن سے بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو تعلیم عام ہو یا نہ ہو ملازمت کی تعداد تو محدود ہی رہے گی۔ ممکن ہے کہ تعلیم زیادہ ہونے سے نوکریوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ ہو جائے لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص سرکاری یا خانگی نوکری حاصل کریگا اور ساتھ ہی ہر زندہ انسان کو اپنا پیٹ پالنا اور اپنے متعلقین کی پرورش کرنا ناگزیر ہے۔ اس خطبہ کے ابتدائی حصے میں میں نے جس قسم کی تعلیم کی سفارش کی ہے اگر وہ اختیار کیجائے تو بے روزگاری اور بے چینی کا خطرہ کم رہے گا بحالت موجودہ جبکہ اعلی تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً گریجویٹس وغیرہ کی تعداد ہمارے ملک میں چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور ہر سال ہماری اور دیگر جامعات سے ڈیڑھ دو سو سے زیادہ گریجویٹ نہیں نکلتے ہیں۔ تو باہر کے خصوصیت کے ساتھ لائق افراد کے تقرر کی گنجائش نکال کر بھی ہمیں شاید کافی تعداد میں ملازمت مل سکے اگر ریاست کے تمام محکمہ جات کارخانہ جات وغیرہ کی سرکاری اور غیر سرکاری خدمتوں کو شمار میں لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ محض گریجویٹس کی تعداد کا خدمات کی تعداد سے مقابلہ کرنا درست نہیں۔ امیدوار کے لئے خدمت کی موزونیت کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً خدمت کے لئے امیدوار کی موزونیت کا تو لحاظ کرنا لازمی ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو اب بھی جبکہ گریجویٹس کی تعداد کم ہے ملک میں کافی نوکریاں نہیں مل سکتیں۔ پس ضروری ہے کہ تعلیم کا طریقہ تبدیل کیا جائے۔ یہ مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے اور امید کیجاتی ہے کہ بہترین مشوروں کی بموجب اس مسئلہ کا بہترین حل منظور ہوگا۔

میں مکرر یہ کہوں گا کہ ہمیں زراعت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے۔ ہماری تعلیم ہمیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کیلئے زیادہ قابل بنانا چاہئے کہیں بعض حضرات اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ اس تحریک سے

میرا منشا یہ ہے کہ ہم لوگ صرف غریب کسان بن جائیں نہیں! میں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص میدان میں آئیں۔ جاگیردار اپنی جاگیروں کو آپ خود سنبھالیں مقطعہ دار بہ نفس نفیس اپنے مقطعوں کی دیکھ بھال کریں اور پٹہ دار و انعامدار اپنے وسیع زمینات پر صحیح اور فنی معلومات کے ساتھ زراعت اور باغبانی کریں تعلیم یافتہ شخص اگر زراعت کی طرف توجہ کرے تو وہ نوکری سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ زراعت سے مرفہ الحال زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سے شرائط کی تکمیل کی ضرورت ہے آب رسانی، اتحاد عمل، تقاوی وغیرہ کا اچھا انتظام ہونا چاہیئے۔ صبر و استقلال اور جدید تحقیقات کے نتائج سے واقفیت جب تک نہ ہو کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن جب زندہ رہنا مقصود ہے تو زندگی کے لئے جن امور کی ضرورت ہو ان کا مہیا کرنا بھی لازمی ہے۔

سرکاری خدمات کے متعلق بھی مجھے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سیول سروس کے لئے [illegible] بہترین امیدواروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اس طرح دوسری گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ خدمات کے لئے بھی اچھا انتخاب کیا جانا چاہیئے تمام خدمات کے لئے تحریری یا زبانی امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مناسب شرائط وضوابط کے لحاظ سے امیدواروں کی قابلیت و اہلیت کا پرکھ لینا تو ضروری ہے۔ ذاتی تلخ تجربہ نے ہر بڑے یا چھوٹے عہدہ دار کو نہایت تکلیف دہ طریقہ سے ثابت کرکے بتا دیا ہے۔ اپنا رہا ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی خدمت کے لئے بھی ایک خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت ہے اور اگر [illegible] تقرر یا ترقی اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے تو کام میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اب میں اس تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کو علم سے بے حد دلچسپی ہے۔ آپ نے کروڑہا روپیہ رفاہ علم کے لئے منظور فرمایا ہے۔ اور اس کروڑہا روپیہ میں سے کارہائے تعلیم پر معتدبہ رقمیں صرف ہوتی ہیں اور صرف ہونے کو ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی ہو اور ان کے زیر سرپرستی حیدرآباد میں علم و ہنر کو ایسا عروج نصیب ہو جیسا کہ بغداد و قرطبہ میں ان کے بہترین زمانے میں نصیب ہوا تھا۔ آمین!

ترانۂ غم

از

(جناب حکیم آزاد انصاری)

وہی ایک جلوۂ یار ہے کہیں نور ہے کہیں نار ہے
وہی ایک اصلِ بہار ہے وہی پھول ہے وہی خار ہے

وہی حالِ نخوتِ یار ہے وہی خوئے غفلت کار ہے
وہی رنگ ہے وہی ڈھنگ ہے وہی ننگ ہے وہی عار ہے

وہی تم کہ خواہشِ جان و دل وہی الم کہ کاہشِ جاں گسل
وہی تم ہو اور وہی جیت ہے وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

وہی ساعتِ غمِ دوست ہے وہی غایتِ غمِ دوست ہے
وہی حالتِ دلِ زار ہے کہ شکیب ہے نہ قرار ہے

وہی شورشِ شیونِ غم فزا وہی آہ و نالۂ جاں گزا
وہی زخمۂ غمِ یار ہے وہی نغمہ ہے وہی تار ہے

وہ دل کہ دعوئ دوستی وہی دوست اور وہی دشمنی
وہی دشمنِ دلِ زار ہے وہی دوست ہے وہی یار ہے

جو ذرا سی پی کے بہک اٹھے جو ابل پڑے جو چھلک اٹھے
وہ ضرور لائقِ عار ہے وہ ضرور قابلِ دار ہے

کبھی ساغرِ مئے غم بھی پی کبھی خوش بھی ہو کبھی خوش بھی جی!
کہ حباب اس کا سرور ہے تو نجات اس کا خمار ہے

نہ وہ ربطِ ضبط بہم رہے نہ تم رہے نہ وہ ہم رہے
نہ وہ شوق ہے نہ وہ ذوق ہے نہ وہ چاہ ہے نہ وہ پیار ہے

ہمیں باغ جانے سے کیا غرض ہمیں داغ کھانے سے کیا غرض؟
نہ وہ یارِ لالہ عذار ہے نہ وہ لطفِ سیرِ بہار ہے

میری جدوجہدِ رہِ طلب ابھی خوار تر ہو تو کیا عجب!
کہ تری نظر میں وقار ہے نہ میری نظر میں وقار ہے

زہے عہدِ فرصتِ رنج و غم زہے دورِ بے غمی ستم
کہ وہ آس سے سروکار ہے نہ وہ یاس سے سروکار ہے

مرے اہلِ شعر و دوستو مجھے طعنِ عجزِ بیاں نہ دو!
جو تخلص آ نہ سکے تو کیا یہ قصورِ شعر نگار ہے؟

شریر شریف

از

جناب ناکارہ حیدرآبادی

"لو" میں نے گھر میں داخل ہو کر کہا "شریف کہاں ہے" جب باپ گھر آتا ہے اور اپنے لخت جگر کو کہیں نہیں دیکھتا ہے تو جان سے، اگر وہ زندہ ہو، پوچھا اس قسم کا سوال کرتا ہے۔ میری بیوی نے کہا "کیا کہوں آپ تو دفتر گئے اور شریف نے شرارت شروع کی"

یہ میرے سوال کا جواب ہرگز نہیں تھا۔ اس پر فوراً سننے کے بجائے میں سیدھا ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اور شعور اتار کر سلیپر پہن لیا "میں" دھڑ گیا اور ادھر شریف نے شرارت شروع کی؟ آخر ہوا کیا؟

بلاشبہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مکان میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوئی ہے جس کے لئے فراست اور حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ایسے موقعوں پر عورتوں کی حیرانی و پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی اور ان کے دماغ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ بیوی کی تکلیف میاں کی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ایک عرصے کے بعد آج مجھے ایک نایاب موقع ہاتھ آیا ہے۔ لاؤ اس معاملہ کو سلجھا تو دوں اور اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت دوں وہ بھی کیا یاد کریں گی۔ میں اس وقت خوش خوش تھا اور دنیا کا روشن پہلو دیکھ رہا تھا۔ دعوت میں شریک ہو کر اور کھانا وں ماحضر سے اچھی طرح ممنون و مشکور فرما کر ہر انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دنیا رہنے کی جگہ ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ شروع ہو گئیں "تمہارے جانے کے بعد ایک پھیری والا غبارے لو غبارے پکارتا ہوا ادھر آنکلا شریف گلی میں کھیل رہا تھا اور ـــــ" "گلی میں کھیل رہا تھا؟ ہاں ٹھیک ہے۔ آج جمعہ ہے مدرسہ نہیں گیا" میں نے نوٹ کے طور پر کہا "اچھا آگے چلو"

"اس کی آواز سنتے ہی میرے پاس دوڑا آیا اور لگا ضد کرنے۔ اماں میں بھی دو غبارہ لیتا ہوں اماں اوں اوں میں نے کہا اوں اوں نہ روؤ۔ وہ تو زمین پر لوٹ پوٹ کیا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو دیا۔ پھر وہ کہا اس سے بھی کام نہیں بنتا جھٹ کمرہ میں گھس گیا ور جو بند بیٹھے تھے اس کو اٹھا سیدھا باہر بھاگا میں ہزار ہاں ہاں کرتی رہی

لیکن آپ کا بیٹا میری کا سکوت تلوا ہر گیا اور برابر ایک بڑا سا غبارہ خرید لایا میں نے فوراً غسل خانہ میں اسکو بند کر دیا اور بولی اچھا ٹھہر تھوڑی دیر ٹھہر وہ آتے ہی ہونگے دیکھ تو سہی کیسا پٹواتی ہوں ایسا نڈر ہو گیا ہے تو؟ دیکھو جی تم اس کو ڈھیلی ڈوری بہت دیتے ہو اس کی عادت بگڑتی جا رہی ہے۔ وہ آپ کی ـــــــ"

میں نے مسکراتے ہوئے قطع کلام کیا۔ بلا شبہ ایسے موقع پر فراست اور حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے بیگم۔ تمہاری شادی کی رات سے میں تمہاری جس خوبی کی قدر کرتا آیا ہوں وہ یہ ہے کہ تم اپنا فرض بخوبی ادا کرتی ہو چلی ہو اور آگے کچھ کہنے سے پہلے تم یہ بات ذہن نشین کر لو تم نے شریف کو اندر بند کر دیا یہ تمہاری حد تک ایک اچھا فعل ہے لیکن کیا وہ حقیقت میں ایک اچھا فعل ہے جس پر غور کرنا چاہئے۔ انگریزی میں ایک پرانا مقولہ ہے کہ ـــــــ"

معترض نہ بن کر کہنے لگیں لیکن آپ سمجھے نہیں وہ چیز جو شریف ـــــــ" معلوم ہوتا تھا وہ واقعہ کی تفصیل بتانا چاہتی ہیں مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے کہا انگریزی میں ایک مقولہ ہے جس کا با تصرف اور آزاد ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ بیجا لاڈ پیار سے بچہ بگڑ جاتا ہے۔ جب تک ڈنڈا استعمال نہ کیا جائے اس وقت تک کام نہیں چلتا۔ بیشک زمانہ سلف میں یہ نصیب بہت معقول اور کارآمد تھی۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ آجکل سائکالوجی کا دور دورہ ہے ماہرین کہتے ہیں کہ جسمانی سزا جس کی تم خواہش مند ہو یہ اس مطلب شریف کے لئے بچوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہوتی بلکہ صرف عارضی طور پر شرارت کو دباتی ہے۔ جو بعد میں اور زیادہ جوش کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ لڑکے کو بلایا جائے اور نرم مگر نصیحت آمیز لہجہ میں اس کو بتایا جائے اس کو کہاں لغزش ہوئی اور وہ کہاں راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اور ایسی چھوٹی چھوٹی خطائیں ایک روز چلکر ـــــــ"

بیگم صاحبہ کی بے صبری اب غصہ سے بدلتی معلوم ہوئی لیکن جناب جھنجھلا کر بولیں آپ میری بات تو پہلے سن لیجئے تقریریں پھر کرنا"

میں کم سخن مشہور ہوں مگر جب ایک دفعہ بولنا شروع کرتا ہوں تو صرف بیہوشی مجھے روک سکتی ہے "آخر شریف نے کیا کیا؟" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا میں سمجھتا ہوں تم کو اس کا افسوس ہے کہ اس نے تمہارا کہنا نہیں مانا اور بغیر اجازت ایک چیز اٹھا لیجا کر اس کے بدلے ایک غبارہ خرید لایا۔ وہ چیز کیا تھی ہمیں اس سے بحث نہیں۔ آخر اس معمولی سے جرم کی اگر میں اس کو جرم کہہ سکتا ہوں کیا اساس ہے جس کے لئے ایسا سخت علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ کچھ نہیں سوائے ایک ننھے سے دل کی خواہش پورا کرنے کے شوق کے ہر شخص کی کوئی نہ کوئی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ دنیا جہان کی عظیم ترین ہستیاں ہر زمانہ میں اپنے دل میں خواہشات رکھتی تھیں۔ میری بہت سی خواہشات ہیں۔

تمہاری بہت سی خواہشات پوری نہیں ہوئی ہونگی" ہندوستان کے مشہور و معروف مچھر پہلوان" اور لیڈر گاندھی جی کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو سوراج مل جائے غرض جہان ــــــ "

اب تو میری اہلیہ محترمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے پہلے تو یہ خیال ہوا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ لیکن ان کی صورت دیکھنے پر خیال غلط نکلا۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ میری تقریر اس قدر موثر اور دلسوز ثابت ہوگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں سنو تو۔ مجھے صرف یہ کہنا ــــــ "

کسی کام کو شروع کرکے اس کو اختتام کو پہونچانا میرے خصائل خصوصی میں سے ہے اور اب میں اپنی مندرجہ بالا تقریر ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ہر قسم کی اصلاح کے ــــــ سوائے حجام کی اصلاح کے دوران میں ہمیں رحم و کرم سے کام لینا چاہئیے۔ خصوصاً بچوں کے معاملہ میں اس جذبہ سے بے حد متاثر ہوکر کام کرنا چاہئیے۔ "شیخ پیر" ــــــ یہ شکسپیر کا آواگون ہے۔ "رحم کے متعلق کہتا ہے ــــــ خیر جانے دیجئے وہ کیا کہتا ہے۔ ہاں تو میرا کہنے سے یہ مطلب ہے کہ شریف کو میرے سامنے بلاؤ اور اس کو مٹھائی کھانے کو دو اور پھر دیکھوں میں کیسے ــــــ عین اس وقت ان سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوگئی کہ میں حیران رہ گیا وہ کھلکھلا کر رو پڑیں یعنے پہلے تو ہنس پڑیں اور پھر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رونے لگیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جس کو میں نے ان کا رونا سمجھا تھا وہ ان کی ہنسی تھی" بہت اچھا بہت اچھا" کہنے لگیں" آپ نے بھی حد کر دی۔ میں جب سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ جس چیز سے شریف نے غبارہ خریدا تھا وہ تمہیں بہت عزیز تھی اور اس پر تمہیں فخر تھا۔ مختصر یہ کہ وہ آپ کی خوشنما یا بنگیں پنسل تھی"۔

کیا" میں نے سلیپر ہاتھ میں لیا۔ اور دروازہ کی طرف جھپٹا" بولو وہ بد معاش لونڈا کہاں ہے" میں نے کڑک کر پوچھا۔

(باقی آئندہ)

غزل

از

(جناب محمد جمیل احمد خاں صاحب کوکب شاہجہانپوری)

اللہ اللہ، اثر ناصیہ فرسائی کا! داغِ سجدہ ہے کہ نقشہ تری رعنائی کا

عالم آئینہ ہے اُس محوِ خود آرائی کا کیا تماشہ ہے، تماشہ ہے تماشائی کا!

دم بدم کیوں نہ بڑھے ذوقِ جبیں سائی کا ذرہ ذرہ میں ہو عکس اس کی خود آرائی کا

خود نمائی کی کوئی حد بھی ہے دیکھو دیکھو! ٹوٹ جائے نہ طلسم انجمن آرائی کا

میری دنیائے تمنا کہیں برباد نہ ہو اک قیامت ہے تصور تری انگڑائی کا

وحشتِ عشق نے دی وسعتِ صحرا گھر کو جوشِ جب حد سے بڑھا بادیہ پیمائی کا

نگہِ شوق ہو کس کس پہ تصدق یعنی برگِ ہر گل ہے مرقع تری رعنائی کا

امتحانِ دلِ بے تاب و تواں کی حد بھی! دیکھئے ذوقِ نظر چشم تماشائی کا

کہیں شیرازۂ عالم نہ پریشاں ہو جائے حشر انگیز ہے منظر تری انگڑائی کا

ہو گیا، روکشِ آئینہ حجابِ کثرت اللہ اللہ یہ عالم تری یکتائی کا!

خوب دادِ دلِ ناکام ملی کوکب کو
شکریہ! آپ کی اِس حوصلہ افزائی کا

تنقیدیں

ستارۂ محمدیؐ | مولفہ جناب علی احمد صاحب زاہد جبل پوری متوسط تقطیع اچھا خط اور صاف چھپائی ضخامت (۱۴۰) قیمت (۱۰) ملنے کا پتہ ایس ۔ اے ۔ احمد اینڈ کمپنی، جامع مسجد جبل پور ۔

۵ ہر فروری ۱۹۲۷ء کو غروب آفتاب کے بعد جبل پور میں یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا گیا کہ ایک روشن ستارہ ٹوٹ کر ایک لکیر بنا ۔ پھر چند منٹ کے بعد اس نے لفظ "محمد" صلعم کی صورت اختیار کی ۔ اس نظارے کو کیا ہندو کیا مسلمان، سب ہی مذہبوں اور فرقوں کے پیرؤں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اخباروں کے ذریعہ یہ خبر عالمگیر پھیل گئی ۔ اُس کی نسبت مختلف اصحاب نے مضامین لکھے، نظمیں کہیں، اخبارات میں مقالات افتتاحیہ شایع ہوے ۔ جناب علی احمد صاحب نے جو جبل پوری باشندے ہیں، ان تمام مضامین کو کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے ۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے بھی ایسے عجیب وغریب واقعات جو اسلام کی حقانیت کی آسمانی شہادتیں ہیں، پیش آئے ان کو بھی ضمناً بیان کر دیا ہے ۔ تقریباً تمام مضامین اور نظمیں اسلامی جذبات وخیالات سے بھری ہوئی اور صداقت اسلام پر روشنی ڈالنے والی ہیں ۔ بعض نظمیں بڑی پاکیزہ اور عمدہ شاعری کا نمونہ ہیں ۔

زیورِ اخلاق | منظومہ مولوی محمد وزیر الدین صاحب انصاری عاقلؔ اورنگ آبادی متوسط تقطیع (۴۴) صفحات دیدہ زیب خط وطباعت قیمت (۸) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے ۔

یہ ایک اخلاقی مثنوی ہے جس کی غایت لڑکیوں میں عمدہ خصائل پیدا کرانا اور دلنشین پیرائے میں انھیں اپنی زندگیاں سنوارنے کی نصیحت کرنا ہے ۔ اس مثنوی کے مطالعے سے جس کا پیرایہ بیان کمسن لڑکیوں کا لحاظ کر کے خاص طور پر آسان اور دلچسپ رکھا گیا ہے، لڑکیوں میں سادہ زندگی کا شوق پیدا ہوگا ۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدارس نسوان میں یہ مثنوی امدادی کتاب کے طور پر شریک نصاب کی جائے یا طالبات کو انعام کے طور پر دی جائے تو مناسب ہے ۔

کلام ناظمؔ | از مولوی قاضی ظہور الحسن صاحب ناظمؔ سیوہاروی چھوٹی تقطیع (۵۶) صفحے اوسط درجے کی کتابت

وطباعت ۔ قیمت (۱۲ر) ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۔

قاضی ظہور الحسن صاحب ناظمؔ اردو کے ایک اچھے شاعر ہیں اور بالخصوص تاریخی قطعات لکھنے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ۔ کلام ناظم کے نام سے عبدالبصیر صاحب ان کے ایک ہم وطن ، نے ان کی چند غزلیں ردیف وار اور کچھ متفرق کلام شایع کرایا ہے ۔ اکثر غزلیں اچھی ہیں اور مشاعروں وغیرہ میں داد حاصل کرچکی ہیں ابتدا میں "خادم الطلبا ابوالکلمان عبدالحفیظ صاحب ، برق فیروزپوری" نے تقریب لکھی ہے جس میں ناظم صاحب کے کمالات شعری پر مختصر سی بحث کی گئی ہے ۔

بال سکھا مدیرین (۱) ہری ناتھ سنگھ صاحب (۲) سید حامد علی صاحب حامدؔ متوسط تقطیع (۴۰) صفحات نہایت عمدہ خط اور بڑی صاف طباعت سالانہ چندہ (عہ) انڈین پریس الہ آباد ۔

الہ آباد کا مشہور مطبع "انڈین پریس" پہلے اردو کی بہت کچھ خدمت بجالاچکا ہے ۔ ایک عرصے سے وہ اردو کی طرف سے بے توجہ تھا ۔ اب پھر اردو کی خدمت گزاری پر آمادہ ہے ۔ کچھ دنوں قبل بعض اچھی علمی کتابیں اس نے شایع کی اور اب ملک کی ایک نہایت اہم ضرورت یعنے ترقی اطفال کے سلسلے میں کم سن بچوں کے لئے ایک ، ماہوار اردو رسالہ 'بال سکھا' شایع کرنا شروع کیا ہے ۔ یہ رسالہ دلفریب سرورق کے ساتھ نستعلیق ٹایپ پر چھپتا ہے ۔ خط بہت پاکیزہ اور طباعت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ چھوٹے چھوٹے مضمون قصے ، نظمیں ، مفید معلومات اور نصیحتیں وغیرہ کمسن بچوں کے مذاق کی تمام چیزیں بڑے سلیقے کے ساتھ شایع کی جاتی ہیں ۔ اکثر مضامین تصویر دار ہیں اور تصویریں بلاک کی بنی ہوئی اور بہت خوب ہوتی ہیں ۔ ایک مرتبہ کوئی بچہ یہ رسالہ پڑھ لے تو یقین ہے وہ ضرور دوسری دفعہ اس کے لیے مچلے گا کیونکہ ہر حیثیت سے اس کو جالب توجہ بنایا گیا ہے ۔ جو والدین اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دماغی اور اخلاقی تربیت کو خاص طور پر مدنظر رکھتے ہیں وہ ضرور اس کی خریداری پر تیار ہوجائیں گے ۔

کتب موصولہ

(۱) قافیہ میانول مولفہ جناب سید سخاوت علی صاحب شوخ (۲) ہماری شاعری از پروفیسر سید مسعود حسن صاحب ادیب (۳) مضامین فرحت حصہ دوم از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب (۴) رسالہ اعجاز (ماہوار) لکھنو (۵) رسالہ طریقت (ماہوار) دہلی (۶) رسالہ حسن خیال (ماہوار) میرٹھ (۷) بڑی بی مولفہ ایم اسلم صاحب (۸) سالنامۂ دکن پنچ (ہفتہ وار) حیدرآباد ۔

رسالہ ادب

"ادب" ہر حیثیت سے اسم با مسمیٰ ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہے اور تہذیب و متانت اس کا شعار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے اور آئندہ بہت کچھ ترقی کے آثار پاتے ہیں۔ دل آزاری، دریدہ دہنی، لفظی نزاع، جماعتی تنگ نظری، مذہبی تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہے۔ اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ لیکن ادب کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے۔ تمام با ادب اہل ادب اس کی برادری میں شامل ہیں۔

ادب دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا دامن تمام آلائشوں سے کیوں کر پاک رکھا جا سکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سایہ میں پروان چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا مطمح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق تمام کی اصلاح اور ادبیت و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے بہی خواہ ان مقدس مقاصد کے حصول میں ادب کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کو اس رسالہ کی شان، بلند نگاہی اور متانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند پرچے ملاحظہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم کم از کم ۲ صفحہ چندہ للعہ سالانہ، ایک پرچہ کی قیمت ۶/ر۔

منیجر ادب، متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ

چاند

جناب رواں صاحب

کمسن ہے کامیاب ہو جائیگا
کچھ روز میں لاجواب ہو جائے گا
یہ چاند ابھی چاند نظر آتا ہے
نکھریگا تو آفتاب ہو جائیگا

اصلاح، ادب، علمی فوائد، صنعت و حرفت پند و نصیحت، نتیجہ خیز افسانے، صلاح ملک ترقی کی راہیں، اتحاد کے ترانے اور اتفاق کے درس دیکھنا اور سننا چاہیں تو چاند الہ آباد کو دیکھیں اخبار و رسائل کی دنیا میں اس رسالہ کی دھوم مچ گئی ہے ہندی چاند پندرہ ہزار اور اردو چاند پانچ ہزار چھپتا ہے اردو چاند ابھی ابتدائی دور میں ہے، پبلک اس کی گرویدہ ہو رہی ہے، اور مانگ بڑھتی جاتی ہے اگر ہمدردان ملک و قوم کو اس طرف توجہ ہوئی تو یقیناً اس کی روشنی سے تمام ملک جگمگا اٹھیگا اور اردو چاند بھی بیسوں ہزار تعداد میں نکلنے لگیگا۔ عمدہ کاغذ، صاف ستھری اعلیٰ درجہ کی چھپائی۔ تصویروں کی کثرت اور ضخامت میں کوئی رسالہ اس کی برابری نہیں کر سکتا زمانہ کی سچی خدمت اس کا اعلیٰ مقصد اور اصلاح و درستی پاکیزہ مدعا ہے

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ

چندہ سالانہ	آٹھ روپیہ
ششماہی	پانچ روپیہ
فی جلد	ایک روپیہ

کاپی نمونہ بلا قیمت نہ اجرا ہوگی نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرا لیجئے۔

"چاند" اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت منیجر دفتر "چاند" اردو ایڈیشن چندر لوک الہ آباد سے دریافت کیجئے ٹیلیفون ۲۵۵ تار کا پتہ "چاند"

خاص نوٹ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات بنام ایڈیٹر چاند اردو ہونا چاہئیے

مجلہ مکتبہ

جلد (۵) بابتہ ماہ مہر سنہ ۱۳۳۹ ف م جولائی سنہ ۱۹۳۰ ع شمارہ (۵)

تصویر باغ عامہ کا ایک دلفریب منظر

فہرست مضامین

شذرات

اس سے پہلے کسی قریبی اشاعت میں ہم نے ایرانی حسن کاری کی نمائش کا ذکر کیا تھا۔ بعض منتظمین کی کوشش سے لندن میں منعقد ہونے والی تھی۔ اب اس کا تصفیہ ہوگیا ہے، آئندہ جنوری اور فروری میں نمائش "رایل اکاڈمی" لندن میں منعقد ہوگی۔ تیاری بڑے وسیع پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ جو اشیا جمع کی جا رہی ہیں اُن کی اجمالی تفصیل یہ ہے۔ ایران کے طلائی، نقرئی اور تانبے کی اشیاء، ایرانی قالین، جو دنیا خصوصاً یورپ بھر میں بے حد مشہور اور مقبول ہے۔ کارچوب، زربفت، مخمل، مٹی اور کانچ کی چیزیں، مطلا مخطوطات، ہتیار اور فوجی سامان، مورت سازی اور تعمیر کاری کے نمونے وغیرہ۔ دنیا بھر کے عجائب خانوں اور شخصی محفوظات سے چیزیں بھیجی جا رہی ہیں۔ اعلیٰحضرت تاجدار ایران نے کمال مہربانی سے شاہی محلات اور شاہی خزانوں بلکہ ان مسجدوں سے بھی نوادرات بھیجنے کا حکم دیا ہے جس میں آج تک کسی یورپی شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی۔ حکومت مصر بھی قاہرہ کے میوزیم سے بہترین ایرانی مصنوعات نمائش میں بھیج رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ اب تک بے شمار مصنوعات کا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے لیکن کارکن کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطّہ سے اگر کوئی نادر ایرانی چیزیں نمائش کے لئے بھیجنی چاہے، تو وہ "معتمد عمومی، پرشین آرٹ اگزیبیشن کارک اسٹریٹ، لندن" کے پتہ پر مراسلت کر سکتے ہیں۔ جو چیز بھی بھیجی جائیگی، اس کی پوری حفاظت اور واپسی کی ذمہ داری کمیٹی نے لی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان، جو سالہا سال تک ایرانی تہذیب و تمدن کا اجارہ دار رہا ہے۔ اس بین القومی ایرانی نمائش کے موقع پر فراخدلی کے ساتھ اپنے ہاں کی ایرانی نوادرات بھیج کر ایران کی گذشتہ خدمات کا کچھ نہ کچھ ضرور اعتراف کر سکے گا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے یہاں نوادرات کے اجارہ داروں کے بخل اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی بدنیتی نے، ہم میں، ایسی خدمات کا وہ اعلیٰ احساس اب تک پیدا ہی نہیں کیا۔ جو بلا مبالغہ یورپ کے ہر ادنیٰ فرد کے دل میں بھی موجود ہے۔

دنیا کے ہر خطہ میں جہاں جس کام کا موقع اور سہولت ہے ہوتا رہا ہے۔ انگریز، انگریزی

زبان کی اشاعت دنیا کے ہر دور دراز خطے میں کر رہے ہیں، ان کے پاس حکومت ہے، سلیقہ ہے ملکی زبان میں تعلیم کا احساس پیدا نہ ہوتا، تو ہندوستانی انگریزی زبان کے مقابلے میں، اپنی زبانوں کو بھول بھی جاتے تو کوئی شبہ نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں پہلے فارسی زبان کو رواج دیا، پھر جب وہ ہندی ہو گئے، تو ہندوستانی زبانوں میں سے جس کو اپنے حسب مطلب دیکھا، اس کی خدمت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اس زبان پر ان کی اپنی زبان کا اثر ہونا ضروری تھا، بہر حال اس زبان کو ہندوستانی کہو یا اردو، انہوں نے اس کی خدمت کی۔ دکن کے عادل شاہوں نے دکن کی ممکنہ خدمت کی۔ اور یہ گویا اصول بنگیا ہے۔

حیدرآباد کے پڑوس میں مغربی جانب مرہٹہ قوم کا مرکز پونا ہے۔ یہاں اس قوم کے ایک فدائی ڈاکٹر بھنڈارکر نے (جو بعد میں سر بھنڈارکر ہو گئے تھے) مرہٹی زبان، مرہٹہ قوم اور ان کے عتایق کی خدمت کے لئے جو بہت زیادہ قدیم نہیں ہیں، ایک ادارہ "بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے قائم کیا تھا۔ اب وہ اس قدر پھیل گیا ہے کہ مشرقی ریسرچ یعنے تحقیقات کا نہ صرف دکن میں بلکہ سارے ہندوستان میں واحد اجارہ دار سمجھا جا رہا ہے۔ یہ سب بھنڈارکر کی نیک نیتی اور مرہٹہ قوم کی باہمی امداد کا نتیجہ ہے اس قوم میں زندگی کے آثار کس قدر نمایاں ہو گئے ہیں۔ سو سال پہلے ان کی حالت پر نظر کرو تو یہ جاہل جنگجو قبیلہ تھا، جو سیواجی قائد کی سرکردگی میں منصہ تاریخ پر نمودار ہوا۔ بقا کی کش مکش میں جنگیں لڑیں، کچھ حکومت حاصل کی۔ اور اب سے چند سال پہلے یہ قوم بجھتی نظر آ رہی تھی، آج دیکھو تو پھر چمکنے پر تیار ہو گئی ہے۔ اس قوم کی تنظیم کا ایک بڑا مرکز بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ ہے۔

اس ادارے نے تھوڑی سی مدت میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا حصر کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف وہ مرہٹی تاریخ اور عتایق کی چھان بین میں مصروف ہے، دوسری طرف زبان کی وسعت اور ترقی میں کوشاں اور قومی تنظیم بھی کر رہا ہے۔ یہ مرہٹہ قوم کی نئی زندگی کا شفاخانہ ہے۔ جہاں اس کے قومی امراض کو دور کرکے، اس کو صحت یاب تنومند اور طاقت ور بنانے کی تمام دوائیں مہیا کرلی گئی ہیں۔

ابھی ماہ اگست کی آخری تاریخوں میں اس ادارے کی پانچویں سالگرہ منائی گئی صوبہ بمبئی اور اطراف سے علما جمع ہوئے تھے بڑا شاندار موقع تھا۔ نواب گورنر بمبئی جو چند ہی روز پہلے اس کے میر مجلس منتخب کئے گئے ہیں، مدعو کئے گئے تھے، وہ خود کو تشریف لا نہ سکے۔ مگر اپنا پیغام بھیج دیا جو اعانت کی خواہش

اور خدمات کے اعتراف سے مملو تھا۔ عطیہ بھی دیا۔

حیدرآباد میں فارسی، عربی اور اردو زبان کی ریسرچ کے لئے موقعے موجود ہیں۔ دکن کی مستند تاریخ کی تدوین کی بھی سخت ضرورت ہے۔ تاریخ کی تدوین میں عربی اردو خصوصاً فارسی زبان کی تحقیقات سے جب تک مدد نہ لی جائے۔ یہ کام بخوبی انجام نہیں پاسکتا۔ چند مرکز اور چند ادارے بھی ہمارے پاس موجود ہیں، جن میں تھوڑی سی اصلاح کے ساتھ انہیں اپنی طرز کے بہترین اداروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ مرکز ہے۔ دارالترجمہ، کتب خانہ آصفیہ، دائرۃ المعارف کے ادارے، اگر بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ کے جیسے کام کرنے والے دستیاب ہوجائیں تو ان کی حیرت انگیز کارگزاری پر ہمیں تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ سرکاری ادارے ہیں۔ یہ ایک اشارہ ہے۔ ممکن ہے کہ ہم کبھی تفصیل بھی پیش کرسکیں۔

حیدرآباد میں چھاپے کی دشواریوں میں بلاک سازی کا فقدان بھی بڑا تکلیف دہ تھا۔ کلکتہ یا مدراس کو تصویریں بھیج کر بڑی زحمت انتظار کے بعد بلاک حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب ہمارے ناظرین یہ سنکر بہت مسرور ہونگے۔ حیدرآباد میں بھی اس فن کے ایک ماہر پیدا ہو گئے ہیں۔ عظیم الدین صاحب صیغہ دار محکمہ تعلیمات نے محض اپنے ذاتی شوق اور ذوق فن سے اپنی تنخواہ کا کثیر نقصان برداشت کر کے بڑی بڑی صعوبتوں کے بعد کلکتہ کے مشہور کارخانوں میں اس فن کو سیکھا اور اب پایۂ تکمیل کو پہنچا کر اپنے وطن حیدرآباد آگئے ہیں انکی مہارت فن کے لیئے ہمارے ہاں کے متعدد شایع شدہ بلاکوں کے علاوہ سالنامہ رہبر دکن کے صفحہ آخر کی تصویروں کا نمونہ کافی ہے۔ ہمیں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ بارگاہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ میں ان کے کارنامہ کو شرف پسندیدگی بخشا گیا اور ہمارے قدر دان علم و فن ظل اللہ نے اپنی رعایا کے ایک فرد کے اس ذوق فن اور اس کے نمونہ فن کاری کو ملاحظہ فرما کر وہ خوشنودی ظاہر فرمائی جو ہر اہل فن کی دلی آرزو ہے۔

شمالی ہند کی زبانوں میں ٹی اور ڈی کے تلفظ کی زیادتی

(از کرنل گریہم بیلی پروفیسر اردو، لندن یونیورسٹی)

(مترجمہ جناب حمید اللہ صاحب ام ۔ اے ال ال بی

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ پرتگالی زبان کے نطعی (Dental) ت، د (T، D) ہندوستان میں حسب حال نطعی باقی رہے ہے۔ اس کے برخلاف انگریزی مسوڑوں سے ادا ہونے والے (Alveolar) ٹ، ڈ (T، D) ذلقی (Cerebral) ہو گئے یعنی ان کے تلفظ میں نوکِ زبان تارک (Palate) سے لگانی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کپتان، بوتل، ہاسپتال وغیرہ کو جنھیں ہم اصلاً، انگریزی کہتے ہیں، پرتگالی الاصل قرار دینا پڑے گا۔ یہ سوال یوں آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا؛ بظاہر مخالف اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں اور بعض ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں۔ (س۔ ر۔ د لگادو کی تصنیف Fonsin سے قیمتی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں)

مندرجہ ذیل سطور کے پیش نظر وہی علاقہ ہے جہاں اردو، پنجابی اور ہندی (اپ ھ) بولی جاتی ہیں، اگرچہ کہ جن حقائق کے ثابت کر دکھانے کی کوشش کی گئی وہ وسیع تر حلقے پر محمول ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ ایک تلفظی مسئلہ ہے اس لئے ہمیں اپنے آپ کو تکلمی الفاظ تک محدود کر لینا چاہیئے اور سوائے اس کے کہ تکلمی الفاظ نہ ملیں، تحریری الفاظ کو نظرانداز کر دینا چاہیئے۔ مطبوعہ شکلیں عموماً استخراجی (Academic) بنیاد پر بآسانی بدل دی جاتی ہیں۔

ہم بلا پس و پیش کہہ سکتے ہیں کہ انگریزی (T، D) کی ایک عظیم اکثریت جب ہندوستانی الفاظ میں رائج ہوتی ہے تو ذلقی ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان میں سے کوئی نطعی ہو جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟ یہ یاد رہے کہ بے تکی توجیہیں عموماً کم مفید ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

توجیہیں کسی معین اصول پر مبنی ہونی چاہیئیں۔ اسی وجہ سے یہ آسان خیال کہ پنجابی ڈاگدار (ڈاکٹر) فارسی کے عام لاحقے کی مناسبت سے لیا گیا ہے اس وقت تک بے قیمت ہے تا آں کہ ہم یہ نہ بتائیں کہ کیوں انسپکٹر، ڈائرکٹر، ماسٹر بگڑ کر انس پیٹ ٹر، ڈانگ ٹر، ماس ٹر، ہو گئے ہیں اور کیوں (Canister) ایک قسم کا تمباکو کناس تر ہو گیا ہے۔

(۱) الفاظ جو غالباً پرتگالی الاصل ہیں اگرچہ انہیں عموماً انگریزی سے ماخوذ کہا جاتا ہے:۔

اردو	پرتگالی		انگریزی	
بپ تِس مہ	Baptismo	بپ تزمو	Baptism	بپ ٹزم
بونام (کنایۃً شکل)	Butao	باتاؤ او	Button	بٹن

اس کے مقابل عام طور پر بٹن جو انگریزی (Button) سے آ رہا ہے بولتے ہیں۔

اردو	پرتگالی		انگریزی	
گارڈ	Guarada	گارادا	Guard	گارڈ
پ آسپتال / اھ ہاس پتال	Hospital	اوس پی تال	Hospital	ہاس پٹل
کپتان	Capitao	کپی تاں او	Captain	کیپ ٹن
کارتوس	Cartucho	کارتیو شو	Cartridge	کارٹ رج
مستول	Mastro, Masto	مسترو، مستو	Mast	ماسٹ
پستول	Pistola	پس تولا	Pistol	پسٹل
سلاد (ترکاری)	Salada	سالادا	Salad	سیلڈ
سکتّر	Secretario	سکریتاریو	Secretary	سکریٹری
تماکو	Tabaco	تباکو	Tobacco	ٹباکو
تولیہ (توال)	Toolhe	تولا	Towel	ٹاویل

بوتل (پرتگ Botelho انگ Bottle) اور پتلون (پرتگ Pantlona انگ Pantloon) پرتگالی ہو سکتے ہیں مگر کم از کم یہ ممکن ہے کہ یہ الفاظ شمالی ہند میں اس وقت بھی برتے جاتے ہیں جب کہ یہ الفاظ پرتگالی میں ابھی موجود بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۲) الفاظ جو حقیقتاً انگریزی معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں دندانی ٹ، ڈ (T ، D) ہیں جو انگریزی مسوڑوں سے نکلنے والوں (Alveolar) سے مشابہ ہیں۔ اگر کوئی پرتگالی لفظ (اپ ھ) سے مشابہ ہے تو بیان کر دیا گیا ہے:۔

	انگ		پرتگ
لنن	London لنڈن		Londres لون درے
ا دھاؤزی	Dalhousie ڈلھوزی۔		
پ دِلاوجی	پہاڑی مقام		
پ اردلی	Orderly آرڈرلی۔		
اھ اردلی			
پ ڈاگدار	Doctor ڈاکٹر		Doutor دوتو
اھ			

(ڈاکٹر عام طور پر اھ میں بولا جاتا ہے کتابوں میں ڈاکٹر للوجی ہیں، ڈاگدر آج کل)

	انگ	پرتگ
پ ا دراز واحد	Drawer واحد ڈرار	
ر درازاں جمع	Drawers جمع ڈرارز	
کیتلی	Kettle کیٹل	Caldeira کالدرا
کناستر	Canister کینس ٹر	
توس	Toast (Pieuf) ٹوسٹ	
تریل	Tray ٹرے۔	
سَنتری	Sentry سنٹری	Sentinella سان تی نیلا

مندرجہ ذیل الفاظ بھی اس میں بڑھائے جا سکتے ہیں مگر وہ اتنے یقینی نہیں ہیں:۔

درجن	Dozen ڈیزن	Duzia دُوزیا
ہاتھی کاک	Artichoke آرٹی کاک	Alcachofra آلکاشوف را

	انگ	پرتگ
ٹُرَپ	(card) Trump ٹرمپ	Trunfo ترون فو
تاپین	Turpentine ٹرپن ٹائن	Terebinthia تربی تھیا / Trebétima ترے بی تی ما

(کتابی صورت میں اسے تَرمن تین اور تَرمن تُو کہتے ہیں جو پرتگالی (Termentina) سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں) علم مثلاً (Stirling) کو اِسترلنگ غالب نے لکھا ہے۔ اور للوجی کے دیباچے میں (Gilchrist) کو گل کرسٹ لکھا گیا ہے۔ مزید نیچے دیکھئے:

مہینوں کے نام پرتگالی سے زیادہ انگریزی نظر آتے ہیں۔ اور غالباً ہم یہ نتیجہ نکالنے میں صحیح ہیں کہ چار زبانوں میں ٹ، ڈ (T، D) کا دانت کی بجائے مسوڑے سے تلفظ پایا جاتا ہے۔ یہ نہ بھلا یا جائے کہ ج (ج) اپ ھ میں انگریزی سے عملاً مشابہ ہے مگر پرتگالی ج (ژ) سے بہت جدا ہے۔

اپ ھ	انگ	پرتگ
جنوری	January جنوری	Janeiro ژانی رو
فروری	February فبروری	Fevereiro فے ری رو
مارک (CH ج)	March مارچ	Março مارسو
اپریل	April اپرل	Abril آبری
مئے	May مے	Maio مے او
جون	June جیون	Junho ژونو
جولائی	July جیولائی	Julho ژولو
آگست	August اوگسٹ	Agosto آگوستو
ستم بر	September سپٹم بر	Setembro سے تین برو
اکتوبر	October آک ٹوبر	Outubro اوتو برو
نوم بر	November نوفم بر	Novembro نوفین برو
دسم بر	December ڈسم بر	Dezembro ڈے زین برو

قابل ذکر آگست ، ستمبر ، اکتوبر ، دسمبر ہیں

(۳) الفاظ جن میں پرتگالی نطعی (دندانی) ذلقی ہوسکتا ہے ان میں سے بعض بہت مختلف فیہ ہیں اور باقی تمام کے تمام متشابہ ۔

اردو	پرتگ
بالٹی	Balde بَل دے
(پ ا ، فالتو (بمعنی زاید)	Falto (بمعنی کم، فال تو
لینھدی پھالتو (کولی مزدور)	
نیپالی پھالٹو پھالتو	
پٹاخہ (بمعنی آتشبازی)	Foguetes فُوگیت (بمعنی راکٹ)
ٹوپی (سر کا لباس)	Tope (سر مستول) توپے
برانڈا	Varanda وراں دا (اپ ھ)

(ھ ا) بَرَنڈا = برآمدہ (کتابی صورت)

میرے خیال میں برآمدہ ایک مصنوعی فارسی لفظ ہے جو ہندوستان میں گڑھا گیا ہے اور ایران میں ایسا ہی نامانوس جیسے (Nom. De. Plume قلم نام = فرضی نام) اور ذومعنی فرانس میں، اس پر بے حد بحث ہوتی ہے ۔

(Termentina) ترمین تی نا ترمنٹو (کتابی صورت)

Terpentina ترپین تی نا

"اپ ھ" لفظ پلٹن (رجمنٹ) اور بسکوٹ (بسکٹ ، جاگٹ (جاکٹ) ممکن ہے انگریزی (Battalion) بٹالین (Biscuit) بس کٹ (Jacket) جاکٹ سے ماخوذ ہیں یہ بھی ممکن ہے پرتگالی (Batalhao) باتالاؤ اور (Biscoito) بیزکوئی تو (Jaqueta) ژاکے تو سے ماخوذ ہوں ۔

(۴) میں نے دو تین باتوں کی تعلیق کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب کی نسبت ۱۰۰ سال قبل کے ہندوستانی، ہندی دندانی تلفظ کو انگریزی مسوڑے کے تلفظ کے مساوی کرنے

کے لئے مستعد نہ تھے۔ اگر مزید ثبوت ملیں تو دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اسد اللہ خاں غالب تقریباً ۱۸۳۰ء میں (دیکھو اردوے معلیٰ اڈیشن ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۱۱) اسٹرلنگ بجائے (sterling) کے لکھتا ہے۔ اور دو جگہ سکرتر بجائے (secretary) کے مجھ یحیٰ تنہا سیرالمصنفین (۱۹۲۴ء) میں اسی عبارت کو نقل کرکے اسٹرلنگ اور سکرتر کے لئے تبدیل کرلیتا ہے۔ تاہم سکتر آج کل گفتگو میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ للولال ۱۸۰۳ء میں کل کرشت بجائے christmas کے لکھتا ہے گو مروجہ صورت کل کریسٹ ہے۔ (اسی طرح تنہا نے لکھا ہے مذکورہ بالا دیکھو) اس عبارت میں للو خود آزادی سے ذلقی حروف استعمال کرکے ان کو انگریزی مسوڑوں سے تلفظ پانے والے الفاظ کا نمائندہ بناتا ہے۔

نوک زبان مسوڑوں سے تلفظ پانے والے الفاظ ادا کرتے وقت دانت اور مسوڑوں کے تقریباً بیچ میں ہوتی ہے۔ اگر سخت مسوڑوں کو آگے سے پیچھے تک ۱½ انچ شمار کریں تو ذلقی "ت ٹ ڈ" دانتوں کی حد کے پچھلے کنارے سے آدھی انچ پر زبان رکھ کر ادا کرتے ہیں۔ مرکز یا اگلے دانتوں کے نصف نچلی تقریباً ¼ انچ کا چوتھائی حصہ دانتوں کی اگلی حد (incisors) سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندمیں اب ذلقی (T، D) ٹ، ڈ کا مخرج گویا مسوڑوں سے ادا ہوتا ہے۔ یہ کوئی صوتی اصول نہیں ہے بلکہ دیہاتی گفتگو میں بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح ہمارے پاس :-

پ رَٹّہی دَ رَہٹی دَ رپوٹ دَ رپورٹی (وہ شخص جو خبریں پہنچاتا ہے)

پ بَٹّہی دَ بٹّہی دَ بے ٹہی یعنی سستی دیری۔

انشاء اللہ خاں کا پُر ذکاوت شعر ہر دو رجحانات ظاہر کرتا ہے :-

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب کا ٹ جا حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

میں نے انگریزی Th ث کو جیسے (Them ، Think) میں ہے۔ مس نہیں کیا ہے جیسے تقریباً ہمیشہ "تھ" پڑھتے ہیں اور اگر آخر میں ہو تو کبھی صرف "ت"۔ مثلاً اس کے تھرو (یعنی اس کے ذریعے) سامت صاحب (مسٹر اسمتھ) اس کے برخلاف تھرڈ کلاس (تھرڈ کلاس کے لئے) قابل تطبیق ہے۔ دوسری قسم کا Th > D : فادر < Father ، رومن کیتھلک مذہبی امام ؛ لیکن "پادری" پرتگالی لفظ "Padre" (پادرے) سے لیا گیا ہے جو عام طور سے عیسائیوں کے امام کے لئے بولا جاتا ہے۔

(۵) خاتمہ ۔ یہ ظاہر یہ امر صاف ہے کہ چند اب یہ الفاظ براہ راست انگریزی سے آئے ہیں جن میں پرتگالی اثر بالکل ممکن نہیں اور وہ اب بجائے ذلقی "T D" کے دندانی سے بدل گئے ہیں ۔ کیا اس کی کوئی توجیہ ممکن ہے ؟

(۱) ایک توجیہ پیش کرتے ہی مسترد ہوجاسکتی ہے ۔یعنی یہ کہ "ر" کا "ٹ یا ڈ" کے قریب ہونا اس کے تلفظ پر اثر انداز ہوتا ہے ۔بہت سے انگریز جو انگلستان کے باشندے ہیں "ٹ" "ڈ" "ل" ان کا مخرج نوک زبان (ذولق) سے ادا کرتے ہیں جب کہ "ر" اس کے بعد ہی ہو ۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو T D کے بعد "R" آجائے تو اسے دانتوں سے ادا کرتے ہیں مگر یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جدید "R" شمالی ہند میں کچھ اثر رکھتا ہے ۔ اس بارے میں ہندی طالب علموں کو انگریزی پڑھتا دیکھ کر ہم پوری تشفی حاصل کرسکتے ہیں ۔

(۲) بعض انگریزی سے ماخوذ الفاظ پرتگالی اثر سے تبدیل پا چکے ہیں اور اس کے برعکس ۔

(۳) جب پرتگالی خارج از بحث ہوجاتے ہیں تو ہم انفرادی الفاظ کے متعلق کچھ بھی اصول نہیں پاتے ۔سوائے اس کے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اسی یا سو برس پہلے انگریزی مسوڑوں سے ادا ہونے والے "T، D" اب کی نسبت نطعی سے زیادہ قریب تھے ۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو اس امر کی توجیہ مشکل تر ہوجاتی ہے کہ کیوں للو، گلبرٹ، لارڈ منٹو، ٹیلر، ڈاکٹر، لفٹنٹ (لپٹن) ہنٹر اور لاکٹ لکھنے میں ذلقی حروف برتتا ہے ۔

(۴) کسی پرتگالی "T D" کے متعلق جو ذلقی ہو گئے ہوں، میں کچھ کہنا نہیں چاہتا، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اس مضمون کا اصلی مبحث نہیں ہیں اور کچھ اس لئے کہ بہت ہی قلیل تعداد الفاظ جن سے یہ نظارہ ہوسکتا ہے، مشتبہ ہیں ۔

غزل

جناب حکیم آزاد انصاری

میں ہوں اور میلان دل اک دل کے دشمن کی طرف　　جستجوئے رہنما لائی تو رہزن کی طرف
خیر یارب آشیانِ بلبل بیکس کی خیر　　برق منڈلاتی نظر آتی ہے گلشن کی طرف
راہ الفت لاتعد خطرات سے پُر ہے تو ہو　　لوٹنا مخدوش تڑپاتا ہوں دامن کی طرف
کون پوچھے میری کلفت، میری بیتابی کی بات　　کون دیکھے میری وحشت، میری اُلجھن کی طرف
وہ ذرا نفرت سے چتون پھیر کر بیجا عتاب　　وہ مرا حیرت سے تکنا تیری چتون کی طرف
پھر تجھے اے دشمن زادِ سفر قسمت! نوید　　پھر مجھے لٹنے کی حسرت لائی رہزن کی طرف
مجھ کو بھی حسرت ہے، میں بھی ہمکلام دوست ہوں　　لے چل، اے ارمان لے چل دشت ایمن کی طرف
اب کسے معلوم، وحشت میں کہاں کا قصد ہے　　اب نہ منزل کی طرف رُخ ہے نہ مسکن کی طرف

کس طرح آزاد! تنہا فوجِ قسمت سے لڑوں؟
اپنے بیگانوں کی جانب، دوست دشمن کی طرف

طرزی افشار

از

(جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب شتین)

تمہید سرزمین ایران بھی عجب مردم خیز ہے۔ کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی زمانہ شاید ہی ایسا ہو گا جس میں اہل کمال کا قحط ہو ممکن ہے یہ دعویٰ صحیح نہ ہو کسی زمانے میں ان میں کمی واقع ہوئی ہو اور کسی میں زیادتی۔ لیکن ان کا اوسط دیگر ممالک کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ ہی رہا۔ دنیا میں اس بات کا فخر (اگر ہم یہاں مبالغہ نہ کر رہے ہوں) خطۂ ایران ہی کو حاصل ہے کہ جہاں اس نے بلند پایہ سنجیدہ سے سنجیدہ مذاق کے ادیب و شاعر پیدا کئے ہیں وہیں آتش زبان ظریف سے ظریف ادبا و شعرا دنیا کے اسٹیج پر لا کھڑا کر دیئے۔ اشتہا اصفہانی، سگ قزوینی، عبید زاکانی، عرب مشہدی، خضر سبزواری، عالی شیرازی، فتحی ہراتی، قلندر کاشی، کافر اصفہانی، مولانا ہاویانی، نوری مشہدی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ کو لیجئے یہ افراد کچھ کم تفنن گو ظرافت نگار شاعر ہوئے ہیں جن کے انفاس شعریہ نے ظرافت و فکاہت کی فضائے بسیط کو جان نواز و روح پرور نغموں سے بھر دیا۔ طرزی افشار بھی انہیں تفنن گو شعرا میں سے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی کے تذکرہ نویسوں نے ان کی شرح حال سے اپنے تذکروں کو زینت نہیں دی۔ اور نہ ان کے کلام پر قدرانہ نظر ڈالی۔ ہم اس کمی کو محسوس ہی کر رہے تھے۔ کہ مولانا عبدالباری آسی نے حال میں اردو و فارسی زبان کے ظریف شعرا کا ایک تذکرہ بنام "خندۂ گل" لکھکر اردو ادبی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ کیا چنانچہ وہ طرزی افشار کے کلام کے متعلق مختصر مگر جامع الفاظ میں اظہار رائے فرماتے ہیں:-

"طرزی۔ ان کی ظریفانہ شاعری کا بہترین جوہر لطافت و ظرافت یہ ہے کہ انہوں نے

دعویٰ کیا تھا کہ زبان فارسی بھی اس قابل ہے کہ عربی زبان کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے اسمار کو بھی مصادر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے مختلف صیغوں کا اشتقاق بوجہ احسن ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کی بنار پر انہوں نے اپنی زبان اور شاعری کو اس خیال اور صنف پر مبنی کر دیا تھا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کمالات اور خیالات اربابِ ادب کے نزدیک ظرافت بن گئے۔ اور ان کی شاعری سے ظریف شاعروں میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ طرزی ایک خوش طبع ظریف المزاج، بذلہ سنج شاعر تھے۔ رندانِ بادہ نوش اور سرمستانِ امارد پرست کیلئے شعر کہتے تھے۔ اور اسی مذاق کے لوگ اس کو گلی گلی اور کوچے کوچے گاتے پھرتے تھے۔" (صفحہ۔ ۲۰۵)

ذیل کا مقالہ آقا میرزا محمد تمدن کے کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے جو مجلۂ "ایران شہر" شمارہ (۱۲)، سال سیم" بابتہ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا تھا۔ میرزا تمدن کی تحقیق اس وجہ سے قابلِ اعتماد ہے کہ وہ ایران کے قصبۂ ارومی کے (جو جھیل ارومیہ کے قریب واقع اور اسی نام سے موسوم بھی ہے) رہنے والے ہیں۔ چونکہ طرزی افشار کے حالاتِ زندگی اور ان کے نمونۂ کلام سے اردو خواں اصحاب بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لئے براہِ راست فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

(ابوالمحاسن منین)

طرزی افشار دسویں صدی ہجری کے آخری زمانہ کے شعرا میں بڑا ہی آتش زبان و فصیح اللسان ادیب گزرا ہے۔ یہ بلیغ البیان شاعر شاہ عباس صفوی کا معاصر و ہمعہد اور اس کے دربار سلطنت میں رتبہ عالی رکھتا تھا۔

وہ افشار کے جلیل القدر قبیلہ سے تھا۔ اس کا تولد ارومی کے ایک قریہ میں ہوا۔ اس کا نام طرزی تھا۔ ارومی کے شعر پرور ماحول میں جو اس .... نواح کے مخصوص فطری ودائع میں سے ہے شعور پیدا کیا اور زانوے ادب بھی وہیں کے ادبا کے آگے طے کئے بعد ازاں

مسافرت اصفہان میں ایک عرصہ تک وہیں پر اقامت اختیار کی۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ اب تک اس کی شرح حال اور تاریخ حیات کے خصوص میں کوئی اہم چیز کتب تذکرہ وغیرہ میں نظر سے نہیں گزری۔ البتہ "مجمع الفصحا" میں طرزی افشار کے نام کے نیچے اس عبارت پر قناعت کی گئی ہے: "وہ ایک ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج، روشن فکر اور عہد صفویہ کے شعرا میں سے گزرا ہے، اس نے طرز سخن گوئی میں عجیب اختراع کی ہے اور یہ طرز ادا بھی اسی کا شیوۂ خاص رہا ہے۔ پھر چند اشعار اس کے کلام سے نقل کئے گئے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

مبادا کہ از ما ملولیدہ باشی — حدیث حسوداں قبولیدہ باشی
چو درس محبت نخواندی چہ سودا — فروعیدہ باشی اصولیدہ باشی
بروطرزیا، زلف خوباں بہ چنگ — زمانے بیفتد کہ پولیدہ باشی

اُس کا دیوان فی الوقت موجود ہے۔ اور مثل شعرا کے تمام دواوین کے اس کی غزلیں حرف الف سے شروع ہو کر حرف یا میں تمام ہوتی ہیں۔ اس کے دیوان کے آخر میں چند رباعیاں اور بحر طویل میں مذاقیہ اشعار ہیں۔ اس کی غزلوں سے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں بعض حالات، شاہ عباس صفوی کے دربار میں رسائی اور دربار سلطنت میں رتبہ عالی کا حاصل کرنا ظاہر ہوتا ہے؛ اسی طرح اس کی پہلے پہل تحصیل علوم کے ارادے سے اصفہان کی مسافرت اور اس کے تمام سفروں کا حال پورے طور پر اس کے اشعار سے ملتا ہے۔

اُس کا ایک جلد گرانقدر اور مکمل دیوان راقم الحروف کے پاس موجود تھا جو رمضان ۱۳۳۵ ہجری میں شہر ارومی کے بازاروں کو روسی عساکر کے آگ لگا دینے کے باعث بہت سی قیمتی کتابوں کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس وقت اس کے دیوان کا ایک نسخہ راقم کے پاس موجود مگر ناقص ہے، لیکن چونکہ اس کے دو تین کامل نسخے خود ارومی میں موجود ہیں۔ لہذا میں ان کے حاصل کرنے کی کوشش میں ہوں ویسے تو طرزی کی بعض غزلیں اور متفرق اشعار جو پریشان اوراق میں اور بعض مختلف اشخاص کی زبان

پر ہیں۔ جمع کر کے اس کی تکمیل میں مصروف ہوں۔

طرزی کی مختصر شرح حالات اور تاریخ حیات اس کے بعض اشعار کے ساتھ تاریخ افشا اور بعض اردومی سے متعلق مختلف تاریخوں میں مندرج و مذکور ہیں، لیکن یہ تا حال طبع نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان کے دو تین مخطوطے بعض قدیم الخاندان اشخاص کے پاس موجود ہیں جنہیں میں فراہم کرنے کی کوشش میں ہوں اور کوشش جاری رکھوں گا۔ اس کے حالات زندگی اس کے بعض اشعار اور غزلیں، جنہیں اس کے دیوان سے اقتباس کیا گیا ہے، ذیل میں بغرض ملاحظہ درج ہیں۔

سیاحت عراق عجم کے بعد اس نے اپنی اصفہان کی مسافرت کے خصوص میں کہا ہے:

از بلدۂ قزوین بصفاہاں سفریدم   بیخرجی و بے اسب خراماں سفریدم
یاراں سفریدند بہ جمعیت و من ہم   یک قافلہ با جانِ پریشاں سفریدم
وارم طمعے آں کہ بہیچم نہ فروشند   ہر چند کہ چوں زیرہ بکرماں سفریدم

اس کو اصفہان میں عرصہ دراز تک سکونت پذیر ہو کر تحصیل علوم میں مشغول رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بحر طویل میں جس کو ذیل میں درج کیا جائے گا۔ اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جبکہ ابتدا میں اس نے شہرت نہیں حاصل کی تھی اور نہ بلند رتبہ کو پہنچا تھا جیسا کہ وہ خود اپنی ایک غزل کے ضمن میں کہتا ہے:

اہل عجب وریا و ماغیدند   من فقیریدم و حقیریدم
ہرگز از کس نہ خواستم چیزی   گر قلیلیدم ار کثیریدم
پشت بر منصب جہانیدم   نے امیریدم نے وزیریدم
ہمہ از پیش شاہ میرشدند   من ہم از پیش خویش میریدم
یار رانیست قید من طرزی   او حریریدہ من حصیریدم

اس کے بعد اس نے دربار سلطنت میں رسوخ حاصل کیا اور اس طرح سے اپنے فضل و کمال کے سایہ میں مقام بلند کا مالک ہو گیا جیسا کہ وہ خود اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا ہے:

می تواں گفت مردم امروزہ   عاقبت رفتہ رفتہ شاہیدم
از حوادث چناں امینیدم   کہ بہ درگاہ شہ پناہیدم
عمری از دور می نگاہیدم   بہ مکان شہ اشتباہیدم

اس نے متعدد سفر کئے ہیں۔ اور ان تمام سفروں میں سے ایک سفر عتباتِ عالیہ ابھی ہے چنانچہ اس نے اپنی ایک غزل کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے:

ترکیدم و تاتیدم و آنگہ عربیدم   در دیدۂ کوتہ نظراں بوالعجبیدم
شعبان رمضان کرب و بلادم متعجب   بے آتش جماد یدم و بی نان رجبیدم

بعض جگہ اس نے اپنی جدت طبع پر تعلی بھی کی ہے جن میں سے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

گرچہ طرز نو اختراعیدم   جانبِ نظم را مراعیدم

ایضاً:

آب از دہانِ قافیہ سنجاں فرو چکد   چوں بشنوند طرزِ نو آبدارِ من

دوسری غزل کے ضمن میں:-

ترا طرزیا! صد ہزار آفرین   کہ طرزِ غریبی جدیدیدۂ ای

ایک اور مقام پر:

طرزی سخنورانِ جہاں آہنیدہ اند   تا تیغِ طرزِ تازہ برونیدہ از غلاف

اس کی اس طرزِ سخن سرائی میں بہترین محرک خود شاہ عباس صفوی کی ذاتِ والا صفات تھی جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے:

طرزیدنِ من ز طرزِ تازہ   از دولت شاہِ دین پناہ است

وہ ہمیشہ سفرِ حجاز کا آرزو مند رہا ہے اور اکثر اپنی غزلوں کے ضمن میں آرزوئے کا اظہار کرتا ہے چنانچہ ایک مقام پر وہ اس کا ذکر کرتا ہے:

طرزی اندرہ ہمت، ہمرہاں حجازیدند   تو ز راہ مانیدی بسکہ اصفہانیدی

دیوان کے آخر میں ایک بحرِ طویل اس کی ادائے خاص میں ڈوبی ہوئی درج ہے

جس کے ضمن میں اس نے جو تحصیل و تکمیل علوم اور متفرق نواح میں اپنی مختلف سیاحتوں پر تعلی کی ہے۔ اس سے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اس میں سلسلہ صفویہ کی مدح سرائی کی گئی اور اس کے اپنے باپ کی مفارقت کی وجہ اظہار غم کیا گیا ہے۔ اس بحر طویل سے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

۱۔ شکر للہ کہ بخلیہ مراد یدز خاک و در قومی کہ ز اولاد رسول ند برا فلاک قبولند گروہی همہ پاکیزہ و خوش صورت و نیکو سیرت و پاک سرشت و ملکی خو همی یافتہ ام از صحبت شان فیض فراوان و برون از حد و اندازہ و دو سیدہم و رگزیدم علم و فہمیدہم اگر بگزرد ایام من این نوع با تم علما را۔

گرچہ عمرم بجہان بیہدہ گردیدہ فرنگیدہم و ترکیدہم و تاتیدہم و گرجیدہم و روسیدم و ازگیدم و بے فائدہ گشتم پس از این دست من و دامن آن طائفہ کز همت ایشان بحجر و جسم ز صفاہان و بشیرازم و آنگا حجازیدہ و جیدہ زیارت بکنم مقبرِ پاک شہدا را۔

۲۔ کردگار الکا و اوگرابا و شہا بندہ نوازا کہ مرا نیست ز خود خیر بدہ خیر و توفیق و بہ لطف و کرم تا با صولم، بفروعم ز کرہا ے تو اینہا نہ بعید است کہ خلاقی و رزاقی و بیرون کنی از نخل، رطب شکر شیرین ز قصب، نیست ز لطف تو عجب کز کرم خویش برآری ز کرم مقصد ما را۔

آہ اگر باز می افشارم و از صحبت ایشان متاذی شدہ او قات بضائع گذرد مہر طرفی چو بہ نگاہم بنماید رخ خنجر بیگ و قیلج بیگ و ایرانقلی بیگ، و اشش و موسیٰ آقا و "منی تانیدمی" بہر فردی از افراد بہ این زمرہ مذکور بہ تعظیم و نا چار تنگ ہیم و گو یم کہ "بو بو رہ نہ بو بو رسن چکرم جانمہ منت" زیرہ کہ کشیدہ است مشیر و خنجر نتواند کہ زند تا کہ شہد سر بسر آہن خارا۔

۳۔ زندہ شدہ گزان، قوم فرہنگیدہ خراسان و عراقیدہ ام و سیر کنان آمدہ ام تا بہ صفاہان و شب و روز ہمی درس ہمی خوانم و می مشقم و بی تعلیقم بکنم

یاد زترکان کہ نیاوند خدارا۔

ہیچ قیدی بہ دلم نیست بجز دور شدن از پدر پیر کہ فرمودہ خداوند بہ احسان وی آیا بود آن روز کہ ببینم رخ نورانی او را و ببوسم یدش و عذر بخواہم، برای باد صبا، از من مہجور ستم دیدہ پریشان دل آزردہ سلامی و پیامی بہ پدر بردہ بگو طرزی افشار کہ از دستِ فراق تو ز بس گریہ و آہ سحری، کردہ خجل ابر و ہوارا۔

ذیل میں طرزی کی غزلیات سے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

با منِ دل خستہ اے دلدار جنگیدن چرا
تو غزالِ گلشنِ حسنی پلنگیدن چرا

با مسلمانانِ مسکین کافریدن بہر چہ
با گرفتارانِ مستضعف فرنگیدن چرا

می نگاہی با من و می التفاتی با رقیب
با منِ یک رنگ ای رعنا دو رنگیدن چرا

از سر کوییت منِ دیوانہ را راندی بسنگ
دلبرا دنگی مرا کافیست سنگیدن چرا

ای کہ می سہوی دمادم با وجودِ عقل و ہوش
بادہ ایدون از برای چیست بنگیدن چرا

ہر یک از قوسِ قضا تیر اجل خواہند خورد
مردماں را گو کہ این توپ و تفنگیدن چرا

طرزیا چون در طریقِ عاشقی می مقصدے
ہمچو زہاد ریائی عذر لنگیدن چرا

ایک اور غزل:

در مملکتِ حسن تو را بادشہیدند   بر جبہہ ما خطِ غلامی رقمیدند

فریاد که فریادِ فقیران نشنیدی   هر چند که بر خاکِ درت زیر و بمیدند
رفتند حریفان که بشادند غمیدند   از دل به تو دادن بدلِ خوشتمید ند
چون میگذرد نیک و بد عالم فانی   خوشحال کسانیکه به نیکی عملیدند
هر طائفه طرزی علم خویش نمودند   دونان درمیدند و کریمان کرمیدند

ایضاً:

افتاده دل بدامک وحشی نگاهکی   بی رحمکی ستمگرکی دل سیاهکی
مژگانکِ درازک خنجر گزارکش   تشنیده ای بخونکی بر بی گناهکی
در بحرکِ عقیقکِ سیرابکش مدام   دارم بخونکِ دلکِ خود شناهکی
باشد بخونکی و بنجصالک رقیبکش   ویک دروغ گویک و بیرون راهکی
از حسنک تو ذره اکی کم نمی شود   گر بنگری ببویک ماه گاه گاهکی
خونها ز چشمکِ منک افتاده طرزیا   در اشتیاق ماهکِ مهر اشتباهکی

ایضاً

ای که در شیرین زبانی شکرستانیده ای
در رهٔ یاقوت لب را خطِ ریحانیده ای
سبزهٔ خط را به آهوئے تتان تنموده ای
عاشقان را عید رخ بنموده قربانیده ای
مدعی بر خوانِ وصلت می زند بریان پلو
سینهٔ ما در تنورِ هجر بریانیده ای
دلبرا در حق گزاری ها نه تقصیریده ام
جان فدا آید ستمت هر گه که مهمانیده ای
باخط سبز و گل رخساره سیب آن ذقن
وه که در اقلیم خوبی باغ و بستانیده ای
نی همی می سیر گاهی باغ رخسارت مرا

بلکہ عالم را بخطِ رخ گلستانیدہ ای
طرز یا خطش بطرزِ تازہ تعریفیدہ ای
در فضائے شاعری چوں باز تر لانیدہ ای

خاتمۂ تحریر پر یہ عرض کرونگا کہ فی الوقت صرف اسی اجمال پر اکتفا کی گئی اور خاص طور پر یہاں اس امر کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ طوالت سے بچنے کے لئے بعض وہ اشعار جو بطور شواہد حال بیان کئے گئے ہیں ان کو طرزی کی غزلوں سے انتخاب کرکے بقیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر دلچسپی کا باعث ہو تو اس کی تمام غزلیں اور اشعار بھی تدریجاً عرض کر دئے جائینگے۔

آہ

ازجناب رازقاسمی صاحب حیدرآبادی

چشم حسرت سے تجھے دیکھ کے رو دیتا ہوں
خامشی نام ہے مجبور کی گویائی کا

سنتا ہوں دنیا میں خوشی بھی ایک چیز ہے۔ دیکھنے کا آرزومند ہوں، مگر کوئی دکھانے والا نہیں ملتا۔ یا کسی میں خوشی کے دکھانیکی قابلیت نہیں اور جو دکھا سکتا ہو، وہ دکھانا نہیں چاہتا۔

کسی زمانے میں میرے منہ سے ہا ہا کی بے ربط و بے معنی صدائیں نکلتی تھیں جن کو لوگ ہنسی کہا کرتے تھے اب وہ بے معنی آوازیں بند ہوگئیں صرف ٹھنڈی سانسیں نکلتی ہیں اور اکثر آنکھوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔ جس کا نام ساتھ والوں نے آنسو رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اول الذکر کیفیت کا نام خوشی و مسرت اور مابعد الذکر حالت کا نام رنج و غم ہے۔

اگر فی الاصل خوشی کی حقیقت چند بے ربط قہقہے اور غم کی اصلیت چند بے بساط پانی کی بوندیں ہیں تو ایسی خوشی و غم کو ہم دیوانوں کا سلام وہ خوشی خوشی نہیں جو مردہ ارمانوں میں جان نہ ڈال سکے اور وہ غم غم نہیں جو کم از کم جینا حرام نہ کرے۔

کسی کی ادنیٰ چشم ترحم ڈوبتے کو ترا سکتی اور مرتے کو بچا سکتی ہے۔ مگر آہ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا یا نہیں کر سکتا اور ایسا نہ کرنے میں ہی اس کے لئے بہتری ہے ...... کیوں .... ؟

"یہ میں خود نہیں جانتا"

"یہ ایک سربستہ راز ہے جس کو میں خود نہیں جانتا"!

رباعیات

از

جناب حکیم بہبود علی صاحب صفی اورنگ آبادی

(۱)

خاموشی میں زبان کی راحت ہے
عصیاں سے بچو، تو جان کی راحت ہے
قلت اسباب کی ہے، راحت دل کی
دل کی راحت جہان کی راحت ہے

(۲)

تلوار کا جوہر ہے، جو تلوار ہو تیز
رفتار ہے کام کی جو رفتار ہو تیز
لیکن تیزی زبان کا حسن نہیں
گفتار کا عیب ہے، جو گفتار ہو تیز

(خاص مجلہ مکتبہ کے لئے)

چوری کے بعد

از

کالرو گوزی

مسٹر بن ولگا ایک ریشم فروش تھا یہ ایک نہایت نیک نفس اور نہایت ایماندار اور قابل اعتماد تاجر تھا۔ اتوار کی صبح کو ایک روز حسب معمول بیدار ہو کر اس نے غسل کر کے لباس پہنا۔ اور چونکہ اس نے آج کا روز اپنی دوکان کا ششماہی کرایہ ادا کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ رقم کو گننے کے بعد وہ کہنے لگا "ان دس سی کوئنس (وینس کے سکّے) کو جیب میں لے کر میں پہلے نماز کے لئے جاؤں گا اور نماز پڑھنے کے بعد کرایہ کی ادائی کا کام پورا کر دوں گا" یہ کہکر اس نے کپڑے پہن لئے اور گرجا کی طرف روانہ ہوا۔ گرجا کے قریب پہنچکر گھنٹہ کی آواز سے اُسے معلوم ہوا کہ نماز ہو رہی ہے۔ اُس نے کہا "او ہو نماز ہو رہی ہے"۔ اس لئے وہ جلدی گرجا میں داخل ہوا۔ مقدس پانی کو چھونے کے بعد قربان گاہ کے قریب جہاں پادری اپنا وعظ سناتا ہے پہنچا۔ یہاں وہ جاتے ہی عبادت میں مصروف ہو گیا لیکن اس جگہ ہولے ایک حسین اور نیک خصال عورت کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ عورت ملک وینس کے عام وضعداروں کے مطابق عمدہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور سنہری انگوٹھیاں چوڑیاں اور ہیروں کی مالا پہنے ہوئے تھی یہ بہت پاکدامن اور پرہیزگار تھی اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت مجلّد کتاب تھی جس میں سے وہ ایک فرشتہ کی طرح حمد و ثنا کے گیت گا رہی تھی۔

جرارڈو چند منٹ اس کی طرف کسی بُرے خیال سے نہیں بلکہ اس کے زاہد فریب حسن سے متاثر ہو کر دیکھتا رہا اور خود بھی اپنی جیب سے ایک کتاب نکالکر گیت گانے میں شریک ہو گیا۔

نماز ختم ہونے کے بعد جرارڈو اخلاق و رواج کے بموجب عورت کو سلام کرنے والا تھا لیکن ابھی وہ اس خیال میں ہی تھا کہ وہ عورت گرجا سے چلی گئی اور جرارڈو یہ سوچتے ہوئے کہ اس کی خدمت میں اپنے سلام کا ہدیہ کس طرح پیش کیا جائے۔ اس کے پیچھے چلا گیا۔ گرجا سے باہر نکلکر وہ اپنے مکاندار کے گھر پر پہنچا اور کرایہ ادا کرنے کی غرض سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم غائب تھی۔ اس نے کہا "یہ کیا بات

ہے۔ کیا میری عقل ٹھکانے نہیں؟ آخر کار اس کو جیب کے ایک گوشے میں ایک سخت چیز دستیاب ہوئی اس نے اس کو باہر نکالا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوبصورت سنہری مالا ہے جس پر ہیرے جڑے ہیں اور تقریباً دو سو ڈوکیٹ کی مالیت کی ہے۔ مالا دیکھ کر تاجر تقریباً خوف زدہ ہوگیا۔ پہلے تو اس نے اس کو جادو سمجھا اور اس قدر خوش ہوا کہ زبان سے ایک لفظ بھی کہے بغیر واپس ہونے لگا۔ مکان دار کرایہ کی رسید لکھنے کے لئے ہاتھ میں کاغذ قلم لئے کھڑا تھا یہ پکارتا رہا کہ "مسٹر جرارڈو کیا معاملہ ہے؟" اس نے دریچہ سے جھانک کر جرآرڈو کو زور سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مکان دار کو کرایہ کا روپیہ وصول نہ ہونے کا افسوس ہوا لیکن جرآرڈو مالے کی مالیت کا اندازہ کروانے کی غرض سے سنار کے پاس پہنچا جب اس نے سنا کہ مالا دو سو ڈوکیٹ کی مالیت کی ہے تو اس کو فوراً اُس عورت کا خیال آیا جو نماز میں اسکے بازو کھڑی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ شاید مالا اس عورت کا ہے لیکن اس کا اُس کو یقین نہ تھا۔ پھر خیال کیا کہ شاید اس عورت نے ایسا مذاق کیا ہے لیکن یہ بھی مقام اور وقت کے لحاظ سے ناممکن تھا، علاوہ اس کے دونوں ایک دوسرے سے واقف نہ تھے۔ اس نے خیال کیا کہ جس وقت میں عبادت میں مشغول تھا عورت کو رقم کی ضرورت ہوئی غالباً اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا، اتفاقاً اس کا سنہری کنگن جیب میں رہ گیا ہوگا۔ "سرقہ کے الزام سے اس کو خوف ہوا وہ شرمندہ ہوا اور اس خیال کو دل سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا اور مالا کو محفوظ رکھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔

دوسرے روز مسٹر جرآرڈو سڑک پر جا رہا تھا اس کی نظر اتفاقاً ذیل کے اشتہار پر پڑی جو دیوار کے ایک گوشہ میں چسپاں تھا۔ اس کی عبارت یہ تھی:- "ایک سنہری کنگن جس کو خوبصورت ہیرے لگے ہوئے ہیں گم ہوگیا یا چوری گیا ہے جو شخص اس کو سانتو مار کولا کے گرجا میں لاکر مالک تک پہنچائیگا اس کو معقول انعام دیا جائے گا۔" مسٹر جرآرڈو یہ الفاظ دیکھ کر متحیر ہوگیا اور ان کو بار بار پڑھتا تھا۔ اسکے بعد وہ اشتہار میں جس گرجا کا نام بتلایا گیا تھا اس کی طرف روانہ ہوا۔ گرجا میں پہنچکر اُس نے نائب پادری سے کہا: "مقدس باپ! میں آپ کے پاس ایک واقعہ کا اعتراف کرنے آیا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اس سے مطلع کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے جس کی عدم تکمیل کی صورت میں مجھے واپس جانا پڑے گا۔" پادری نے کہا: "کہو کیا معاملہ ہے اگر تمہاری شرط معقول ہے تو اس کی اجازت دیجائے گی" مسٹر جرآرڈو نے کہا: "وہ کنگن مجھے ملا ہے لیکن میں سوائے اُس خاتون

سے کسی کو نہ دوں گا میں استدعا کرتا ہوں کہ آپ اس سے کوئی شبہہ یا کسی میرے برے ارادے کا احتمال نہ کریں یہ مناسب ہوگا کہ میں بالمشافہ خاتون کو کنگن حوالے کردوں اگر آپ مجھے اس خاتون کا مکان بتلادیں تو بڑی مہربانی ہوگی جیسا کہ کیا تھلک گرجا کے ایک اچھے پیرو کو کرنا چاہیئے ۔ میں اس خاتون کی خدمت میں جاکر کنگن اس کے حوالے کردوں گا ورنہ مجھے آپ معاف فرمائیے کنگن میں اپنے پاس رکھ لونگا" یہ سن کر پادری نے کہا "مجھے حکم ملا ہے کہ جو شخص کنگن لائے اس کو تین سو کوئینس دوں لیکن غالباً تم کو ایک کی بھی ضرورت نہیں ہے"۔ جرار ڈو نے کہا "پادری صاحب میں ایک سو سو کوئینس کے بدلہ میں بھی کنگن واپس نہ کروں گا لیکن اگر میں بالمشافہ مالک کو یہ چیز حوالے کروں تو ایک حبہ بھی نہ لونگا"

پادری نے جواب دیا "خدا کا خوف نو کرو ۔ جو چیز تمھاری نہیں اسے تمھیں اپنے پاس نہ رکھنا چاہیئے لیکن تم کنگن خاتون ہی کے حوالے کرنا چاہتے ہو تو میں اپنے منشی کو بتلاتا ہوں وہ تمھیں اس خاتون کا مکان بتلا دے گا"۔ اس طرح جرارڈو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کے بعد منشی نے ایک خوش وضع اور نہایت وسیع مکان کی طرف اشارہ کرکے کہا "اس خاتون کا مکان یہی ہے"۔ مکان نہایت آراستہ پیراستہ اور عالی شان تھا۔ پہلے تو جرارڈو نے یہ خیال کرکے کہ اُس نے ایک بھاری غلطی کی ہے وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا جب وہ اس سوچ میں کھڑا تھا کہ اب کیا کیا جائے ایک خادمہ سیڑھیوں کی طرف سے پکارتی ہوئی آئی ۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو" اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جرارڈو نے مبہوت ہوکر کہا "میں مالکہ مکان سے مل کر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ بازو کے کمرے میں جاکر خادمہ نے اپنی مالکہ سے کہا : "کوئی صاحب کسی معاملہ میں گفتگو کرنے کی غرض سے آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔ خاتون نے کہا : "انھیں آنے دو ۔ تو نے اُنھیں اندر کیوں نہیں بلایا" اندر داخل ہوکر جرارڈو ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے اُسی خاتون کو دیکھا ۔ خاتون نے جرارڈو کو پوری طرح دیکھا اور اس کا چہرہ افسردہ ہوگیا اور اس پر قریب قریب بیہوشی طاری ہوگئی تھی کیونکہ کنگن گم ہوجانے کے وقت سے اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ اُس نے اس بوڑھے آدمی کی جیب میں کنگن چھوڑ دیا ہوگا ۔ اس نے یہی سمجھا کہ گرجا سے آتے وقت کنگن سڑک پر گم گیا ہوگا وہ اس وقت شرمندہ ہو رہی تھی کہ میں نے اشتہار کیوں دیا ۔ لیکن قدرت جو مجرموں کو ایسی سزا دیتی ہے جس کی کہ انھیں توقع بھی نہیں ہوتی خطا وار

کو گرفتار کرنے میں کبھی ناکامیاب نہیں ہوتی جرار ڈو خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا دونوں خاموش تھے۔ آخرکار تاجر اپنے اطمینان قلب، تمیز اور وسیع تجربہ کی وجہ سے کنگن اپنی جیب سے نکالا اور ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگا: "میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کنگن کس طرح میرے پاس آیا۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا کنگن گم ہوگیا تھا، لیکن میری جیب کی رقم چوری گئی اگر میری رقم واپس نہ ملے تو میں اس بدمعاش کو ایسی سزا دونگا جو اس کو عمر بھر یاد رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کا دوست ہے اور آپ اُس سے بہت محبت رکھتے ہیں میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنی شہرت اور خاندانی اعزاز کی خاطر اُس کا جرمانہ ادا کریں ورنہ میں اس سے ایسا انتقام لونگا جو آپ کو سخت ناگوارِ خاطر ہوگا۔ اگر آپ میری رقم ادا کردیں تو یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے اور آپ مناسب ہدایت کے بعد چور کو آزاد کرسکتے ہیں۔" پریشانی کے باوجود خاتون یہ الفاظ سنکر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس نے بڑی عقلمندی کی کہ دس سی کوئینس اپنی میز میں سے نکالکر جرار ڈو سے کہنے لگی: "میں قسمیہ کہتی ہوں کہ جب سے اس بدمعاش نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس وقت سے وہ میری ناراضمندی اور غصہ کے خوف سے بھاگ گیا۔ آپ کا روپیہ لیجئے۔ اور چونکہ آپ اس کو آزاد کرکے اس معاملہ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں، میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ آپ اسی طرح عمل کریں میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔ آپ کے منشا کے موافق میں اس کو کافی ہدایت کرکے آیندہ ایسے جرم کے ارتکاب سے باز رکھوں گی یہ کہکر اُس نے سی کوئینس گن کر تاجر کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور اپنا کنگن واپس لے لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تاجر واپس چلا گیا۔ یہ عورت ایک معزز اور معتبر گھرانے کی لڑکی اور ایک دولتمند شخص کی بیوی تھی۔ فیشن کی دلدادہ تھی اور اس کو بناؤ سنگار اور فضول خرچی کا بیحد شوق تھا اس کا شوہر اس کو ان اغراض کی تکمیل کے لیئے کافی روپیہ نہیں دیتا تھا۔ اس لئے وہ دیگر ذرایع سے جیسا کہ ہم نے اُدھر بیان کیا ہے روپیہ حاصل کرنے کی عادی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بُرے افعال و غلط کاریاں ہی انسانی عقل پر پردہ ڈالدیتی ہیں جس کی وجہ انسان رفتہ رفتہ قعرِ مذلت و تباہی میں جا گرتا ہے! ——— ترجمہ

از

وہ بھی کیا دن تھے!

از مولوی سیّد اعظم اللہ صاحب اطہرؔ وکیل

کبھی تم کو بھی تھی میری محبّت وہ بھی کیا دن تھے / کہ پہروں دیکھتے تھے میری صورت وہ بھی کیا دن تھے

اِدھر بے تاب تھا میں، تم اُدھر بے چین تھے شب میں / کہو تو یاد ہے وہ وصل و فرقت وہ بھی کیا دن تھے

مرے نوکِ زباں تھا سارا قانونِ وفاداری / تمہیں سب یاد تھے آئینِ الفت وہ بھی کیا دن تھے

کیا کرتے تھے میرے دیدۂ حیراں کا نظّارہ / تمہیں آئینے سے ہوتی تھی نفرت وہ بھی کیا دن تھے

تمہیں میرے تصوّر میں پسند آتی تھی تنہائی / میرے سایہ سے بھی تھی مجھ کو وحشت وہ بھی کیا دن تھے

تصور بھی جدائی کا کبھی آتا نہ تھا دل میں / کبھی آتی نہ تھی فکرِ قیامت وہ بھی کیا دن تھے

بگڑنے میں لگاوٹ کی ادا کیا یاد آتی ہے / عتاب آلود نظروں میں مروّت وہ بھی کیا دن تھے

بناوٹ سے بگڑنے کی ادا پھرتی ہے نظروں میں / بجائے شکر تھی باہم شکایت وہ بھی کیا دن تھے

سحر تک عیش میں کٹتی تھی باہم کیا وہ راتیں تھیں / سحر سے شام تک تھی گرم صحبت وہ بھی کیا دن تھے

ہمیشہ کاروبارِ عیش میں مصروف تھے دونوں / نہیں تھی اس سے دم لینے کی فرصت وہ بھی کیا دن تھے

تصور بھی کبھی آتا نہ تھا رنجش کا آپس میں / کبھی دو دو پہر رہتی تھی حجت وہ بھی کیا دن تھے

کہو اطہرؔ یہ کیسی عمر کھوئی اپنی غفلت میں / بس اب روتے ہو یہ کہہ کہہ کے حضرت "وہ بھی کیا دن تھے"

دنیا کے چند خود ساختہ انسان

از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)

ظروف سازی کی تاریخ میں جن اشخاص کی عمدہ مثالیں اور سوانح عمریاں (جنھوں نے نہایت صبر و استقلال سے کام کرکے شہرت دوامی حاصل کی) ملتی ہیں ان میں سے تین ممتاز اشخاص کا ذکر کیا جاتا ہے اور وہ برنارڈ پالسی (فرانس) جان باٹر (جرمن) اور ویجوڈ (برطانیہ) کی ہستیاں ہیں۔

اگرچہ اکثر قدیم اقوام کو چکنی مٹی کے معمولی ظروف بنانے کا ہنر معلوم تھا اور مینا کاری کے ظروف کی صنعت کا رواج بہت کم تھا قدیم (ETRUSCANS) میں یہ صنعت جاری تھی اس کے نمونے آج تک آثار قدیمہ میں پائے جاتے ہیں یہ صنعت مٹ چکی تھی لیکن حال ہی میں پھر یہ جاری ہوگئی۔ قدیم زمانہ میں امریکیا کے برتن کی بڑی قدر ہوتی تھی اور آگسٹس کے زمانہ میں ظروف کی قیمت وزن کے لحاظ سے سونے میں ادا ہوتی تھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مورلینڈ کو بھی اس صنعت کا علم تھا کیونکہ جس وقت پیسا نے ۱۱۱۵ء میں جزیرۂ میجورکا کو فتح کیا اس زمانہ میں اہل مورلینڈ یہاں یہ صنعت کیا کرتے تھے۔ مال غنیمت میں مورلینڈ کی مٹی کی کئی رکابیاں ہاتھ آئیں۔ جنھیں پیسا کے کئی قدیم گرجاؤں کی دیواروں پر فتح و نصرت کی یادگار کے طور پر چسپاں کیا گیا تھا آج تک وہ وہاں موجود ہیں۔ اس کے تقریباً دو صدی بعد اہل اٹلی نے مورلینڈ کے سے میناکاری کے برتن بنانا شروع کیا۔ اس کو اہل اٹلی نے مورلینڈ کی صنعت گاہ کی مناسبت سے میاجولیکا کے نام سے موسوم کیا۔

اٹلی میں جس شخص نے میناکاری کی صنعت کو دوبارہ دریافت کیا وہ فلورنس کا لوساڈلارابیا نامی ایک سنگ تراش تھا۔ واساری کا بیان ہے کہ وہ بڑا جفاکش مستقل مزاج اور باحوصلہ آدمی تھا۔ تمام دن اپنی چھینی سے کام کرتا اور بڑی رات تک نقشے اور تصاویر تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا فن آخر الذکر سے اس کو بڑی دلچسپی تھی اس میں دیر تک اس قدر محنت سے کام کرتا تھا کہ پیروں کو

سردی سے بچانے کے لئے اپنے نزدیک بالوں کی ایک ٹوکری رکھ لیتا تھا اور پٹرو کری میں چھوڑ دیتا تھا کہ گرمی حاصل ہو اور وہ اپنے کام میں مصروف رہ سکے۔ وساری کہتا ہے کہ "اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ کوئی شخص جو اپنے آپ کو حرارت، سردی، بھوک، پیاس، اور دیگر تکالیف برداشت کرنے کا عادی نہ بنائے کسی صنعت میں شہرت حاصل نہیں کر سکتا اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آرام طلبی اور تعیشات دنیاوی میں گھرے رہنے کے باوجود عزت و شہرت حاصل کر سکتے ہیں، اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں کیونکہ کمال اور شہرت آرام کی نیند سونے سے نہیں بلکہ جاگنے کی تکلیف اٹھانے اور مسلسل محنت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔"

لیکن لوسا کو باوجود سخت مشقت کے سنگ تراشی کے ذریعہ اپنی بسر اوقات کے لئے کافی روپیہ کمانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب بھی وہ کسی ایسی چیز کے ذریعہ جو سنگ مرمر کی نسبت ارزاں اور ملائم ہو نقشہ کشی یا بت تراشی کا کام جاری رکھ سکتا ہے چنانچہ وہ مٹی کے نمونے بنانا اور انھیں پائدار بنانے کی غرض سے تجربتاً مٹی کو پکانا اور سخت کرنا شروع کیا۔ آخر کار کئی تجربوں کے بعد اس نے مٹی پر ایک ایسا مادہ چڑھانے کی ترکیب دریافت کر لی جو بھٹی کی سخت گرمی کھانے سے قریب قریب ایک غیر فانی روغن یا لمع کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ بعد میں اس نے لمع پر رنگ چڑھانے کی ترکیب بھی دریافت کر لی جس کی وجہ لمع کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

تمام یورپ میں لوسا کی کارگزاری کے ڈنکے بج گئے اور اس کی صنعت کے نمونے جابجا پھیل گئے چند نمونے فرانس اور ہسپانیہ روانہ کئے گئے۔ جہاں ان کی بڑی قیمت وصول ہوئی۔ اس زمانہ میں فرانس میں مٹی کے ظروف میں صرف بھدے مرتبان اور ہانڈیاں تیار ہوتی تھیں اور پالسی کے زمانہ تک ان میں معمولی اصلاح بھی نہیں ہوئی تھی۔ پالسی نے بڑی بڑی دشواریوں کا اس دلیری سے مقابلہ کیا کہ اس کی زندگی کے گوناگوں واقعات قریب قریب افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

برنارڈ پالسی کے متعلق قیاس ہے کہ اس کی ولادت ۱۵۱۰ء میں جنوبی آفریقہ کے ایک پادری کے ہاں ہوئی اس کا باپ غالباً ایک (WARKERINGIAN) تھا۔ برنارڈ کو بھی آبائی پیشے کی تعلیم دی گئی اس کے والدین بوجہ مفلسی بیٹے کو کسی مدرسہ کی تعلیم دلانے سے قاصر تھے۔ برنارڈ کہا کرتا تھا میرے پاس بجز آسمان و زمین کے جو ہر شخص کے لئے کھلے ہیں، کوئی کتاب نہیں۔ بہرحال اس نے شیشہ پر رنگ چڑھانے کا کام سیکھا اور بعد میں بت تراشی بھی سیکھی اور لکھنے پڑھنے میں بھی مہارت حاصل کی۔ جس وقت اس کی عمر تقریباً

۱۴ سال کی تھی۔ کلیچ کی تجارت میں زوال پیدا ہوگیا۔ پالسی نے باپ کے گھر کو خیرباد کہہ کر اپنی پیٹھ پر سامان کا تھیلا لئے ہوئے تلاش معاش کی غرض سے روانہ ہوا۔ پہلے گیاسکنی کی طرف سفر کیا۔ جہاں کہیں کام ملتا اس کو کر لیتا تھا وقتاً فوقتاً اپنا کچھ وقت پیمائش اراضی میں صرف کرتا تھا۔ پھر شمال کی جانب سفر کیا اور مختلف اوقات میں فرانس، فلانڈرس اور جرمنی کے مختلف مقامات پر اس کا چند روزہ قیام رہا۔

پالسی نے تقریباً اور دس سال تک اپنی زندگی اسی طرح بسر کی اس کے بعد اس نے شادی کی جس کی وجہ اس کی آوارہ گردی کا خاتمہ ہوگیا اور اس نے قصبہ سینٹس میں سکونت پذیر ہو کر شیشہ کے سامان کی رنگائی اور پیمائش اراضی کا کام شروع کر دیا۔ اس کے تین بچے تولد ہوئے جس سے نہ صرف اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں بلکہ اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا۔ آمدنی ضروریات زندگی کے لئے بالکل ناکافی ہوئی۔ اب اس کو سخت محنت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ غالباً اس نے یہ محسوس کیا کہ شیشہ کی رنگائی جیسے غیر معین پیشے میں سر کھپانے کی بہ نسبت وہ کوئی دوسرا بہتر کام کر سکتا ہے چنانچہ وہ ظروف کی میناکاری کی صنعت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس فن سے وہ بالکل ناآشنا تھا کیونکہ اس میں قدم رکھنے سے قبل اس کو کبھی مٹی کو پکتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کو بغیر کسی کی امداد کے ہر چیز از خود سیکھنا پڑا اس کو کامیابی کی بڑی توقع تھی وہ بڑے شوق و دلچسپی، مستقل مزاجی اور صبر سے کام سیکھتا رہا۔

حسن اتفاق سے اٹلی کا بنا ہوا ایک خوش وضع پیالہ جو غالباً لوساڈلا رابیا کا بنایا ہوا تھا پالسی کی نظر سے گذرا، یہی وجہ تھی کہ پالسی نے جدید فن پر غور کرنا شروع کیا اس واقعہ کا جو بادی النظر میں معمولی اور غیر معلوم ہوتا ہے ایک معمولی دماغ نیز خود پالسی پر بھی کسی اور وقت میں اثر نہ ہوتا لیکن وہ ایسے موقع پر واقع ہوا جبکہ پالسی اپنا پیشہ بدلنے کی فکر میں تھا۔ فوراً اس کے دل میں اس پیالے کی نقل اتارنے کا جوش پیدا ہوا اور اس پیالے کو دیکھتے ہی اس کو سخت اضطراب ہوا اور اس وقت سے جس ملمع سے وہ برتن روغن کیا گیا تھا اس کو دریافت کرنے کی دھن پالسی کے دماغ میں بس گئی۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو اس راز کی تلاش میں سفر اٹلی اختیار کرتا لیکن اس کو اپنے اہل و عیال کی دیکھ بھال کرنی تھی اور انھیں چھوڑ نہ سکتا تھا۔ [illegible] کچھ سال یہیں رہ کر مٹی کے برتن بنانے اور ان کو ملمع کرنے کی ترکیب دریافت کرنے کی امید میں کوشاں رہا۔

پہلے پہل اس نے ان چیزوں پر غور کیا جن سے ملمع تیار ہوتا تھا پھر اُن کی ماہیت و حقیقت دریافت

کرنے کی غرض سے ہر طرح کے تجربات شروع کئے۔ جن اجزا کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ان سے ملمع تیار ہوتا ہے اس نے انھیں کوٹا پیٹا۔ پھر معمولی مٹی کے برتن خریدے ان کو پارہ پارہ کیا، اپنے مرکبات ان پر لگا کر بھٹی پر جس کو اس نے اسی مقصد سے تیار کیا تھا گرم کرنے کے لئے رکھ دیا اس کے تجربات ناکام ثابت ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ برتن ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور لکڑی ادویات وقت اور ساری محنت اکارت ہوئی۔
عورتیں عموماً ایسے تجربات کو جن کا نتیجہ محض یہ ہوتا ہے کہ ان کی اولاد کے خورو نوش ولباس کے مصارف ان میں برباد ہو جاتے ہیں پسند نہیں کرتیں پالسی کی بیوی گو دیگر معاملات میں اپنے شوہر کی اطاعت کرتی تھی مٹی کے اور برتن خریدنے سے سخت ناراض تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ برتن محض توڑنے کی غرض سے خریدے جاتے ہیں لیکن اس کو مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ کیونکہ ملمع کے راز پر حاوی ہونے اس سے واقفیت حاصل کرنے اور اس کو ادھورا نہ چھوڑنے کا پالسی نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔
پالسی نے اور کئی سال اپنے تجربات جاری رکھے۔ پہلی بھٹی ناکامیاب ثابت ہونے پر اس نے دوسری بھٹی گھر کے باہر تیار کی۔ اس میں پہلے کی نسبت زیادہ لکڑی جلی۔ زاید ادویات برتن اور وقت ضائع ہوا آخر چل کر اس کو معلوم ہوا کہ اب وہ اور اس کا گھر بار مفلسی کا شکار ہو جائینگے۔ اس نے کہا "میں نے اس طرح کئی سال رائگاں کئے بجز رنج وافسوس کے کچھ حاصل نہ ہوا اس کا سبب یہ ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ فرصت کے اوقات میں وہ کبھی کبھی اپنا پچھلا شیشہ کی رنگائی، تصویر کشی اور پیمائش اراضی کا کام کیا کرتا تھا لیکن ان ذرائع سے اس کو نہایت قلیل آمدنی ہوتی تھی۔ آخر کار لکڑی بے حد گراں ہونے سے اس کے تجربات جاری نہ رہ سکتے تھے اس نے ہانڈیوں کے اور ٹکڑے خریدے پہلے کی طرح ان کے تین یا چار سو ٹکڑے کرکے ان پر کیمیاوی ادویات لگائیں اور مقام سینٹس سے ڈیڑھ لیگ کے فاصلہ پر سفال سازی کے ایک کارخانہ کی معمولی بھٹی میں پکانے کی غرض سے لے گیا۔ پکنے کے بعد ٹکڑوں کو باہر نکالا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ساری محنت برباد ہوئی اب اس کی ہمت پست ہوگئی لیکن مایوس ہونے پر بھی اس نے ہمت نہ ہاری کیونکہ اس تجربے کو اسی مقام پر از سر نو آزمانے کا اس نے پورا تہیہ کر لیا تھا۔
پیمائش اراضی کے کام کی وجہ اس کو کچھ عرصہ اپنے تجربات ملتوی رکھنے پڑے۔ ریاست کے ایک سرکاری حکم کی بنا پر محصول اراضی لگانے کی غرض سے سینٹس کے قرب وجوار کے (SAIF MARSHES) کی پیمائش کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس پیمائش اور ضروری نقشہ کی ترتیب کا کام پالسی کے سپرد ہوا اس میں

پالسی کا کچھ وقت صرف ہوا جس کا اس کو معقول معاوضہ ملا لیکن جونہی یہ کام ختم ہوا اس نے دگنے جوش کے ساتھ اپنے ملمعوں کی تحقیق کا پرانا کام پھر آغاز کر دیا اس مرتبہ اس نے تین درجن برتنوں کے ٹکڑے لئے اور ان پر اپنے مختلف مرکبات چڑھا کر ایک قریب کی شیشہ کی بھٹی پر پکانے کی غرض سے لے گیا اس تجربے سے اس کے کسی قدر دھندلی سی امید بندھی۔ کانچ کی بھٹی کی زائد گرمی سے بعض مرکبات پگھل گئے پالسی نے سفید ملمع کی بڑی تلاش کی لیکن کوئی ملمع اس کے ہاتھ نہ آیا۔

اور دو سال تک اس کے تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا حتیٰ کہ (SAIF-MARSHES) کی پیمائش سے جو آمدنی ہوئی وہ بھی قریب قریب صرف ہو چکی اور مفلسی نے پھر منہ دکھایا۔ اب پالسی نے ایک بڑی اور آخری کوشش کرنے کا ارادہ کیا اور اس مرتبہ سابق سے زیادہ برتن لیکر تجربہ شروع کیا۔ مٹی کے برتن کے تین سو سے زائد ٹکڑے جن پر اس نے اپنا تیار کردہ مصالحہ لگایا تھا شیشہ بھٹی کے پاس بھیجے گئے اور وہ خود بھی اس تجربے کے نتائج دیکھنے کی غرض سے وہاں پہنچا۔ چار گھنٹے تک وہ بھٹی کو دیکھتا رہا اس کے بعد بھٹی کھولی گئی۔ مٹی کی ہانڈیوں کے تین سو ٹکڑوں میں سے صرف ایک ٹکڑے کا مصالحہ پگھلا اس کو باہر نکالا گیا سخت ہونے کے بعد وہ سفید اور چکنا ہو گیا۔ اس ٹکڑے پر سفید ملمع کیا گیا اور پالسی نے اس کو "غیر معمولی خوبصورت ملمع" کے نام سے موسوم کیا۔ حقیقت میں پالسی کی نظر میں اس کا خوش وضع نظر آنا لازمی تھا کیونکہ ایک طویل کوشش اور انتظار کے بعد اس کو یہ نتیجہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کو لئے ہوئے وہ اپنی بیوی کے ہاں مکان کو دوڑا گیا اس نے خود میں جیسا کہ اس کا بیان ہے ایک نئی روح محسوس کی لیکن ہنوز پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی گو اس آخری کوشش کی جزوی کامیابی اس کے لئے اپنی ناکامیوں اور تجربات کا سلسلہ آئندہ جاری رکھنے کی ترغیب و تحریص کا باعث ہوئی۔

اس ایجاد کو مکمل کرنے کی غرض سے جس کی عنقریب تکمیل کا اس کو یقین ہو گیا تھا اس نے اپنے مکان کے قریب کانچ کی ایک بھٹی تیار کرنے کا ارادہ کیا جہاں اس کو خفیہ طور پر اپنے تجربات کرنے کا موقع مل سکتا تھا اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بھٹی تیار کرنی شروع کی اور اینٹوں کی بھٹی سے اپنی پیٹھ پر اینٹیں لایا کرتا تھا۔ معمار، مزدور، اور ہر قسم کا کام اس نے خود انجام دیا سات آٹھ ماہ اور گزرے آخر کار بھٹی تیار ہو کر قابل استعمال ہو گئی۔ اس اثنا میں ملمع چڑھانے کی غرض سے پالسی نے مٹی کے بہت سے برتن تیار کئے تھے۔ ابتدا میں تھوڑا پکانے کے بعد ان پر ملمع کا مصالحہ چڑھا دیا جاتا تھا اور پھر تجربہ کی

غرض سے بھٹی میں رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ پالسی کی تمام آمدنی اس کے بھینٹ چڑھ چکی تھی تاہم آخری آزمائش کی غرض سے وہ کچھ عرصہ تک لکڑیوں کا کاٹھ وغیرہ جمع کرتا رہا۔ آخر کار آگ سلگائی گئی اور کام شروع ہوا۔ تمام دن بھٹی میں لکڑیاں پڑتی رہیں، رات بھر بھی پالسی اس میں لکڑیاں جھونکتا اور دیکھ بھال کرتا رہا لیکن طمع نہ پگھلا۔ صبح ہوگئی اور بیوی نے صبح کا ناشتہ پاس نے نہ رکھا۔ کیونکہ پالسی بھٹی کے قریب سے جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکڑیاں ڈالتا جاتا تھا ہلا نہیں۔ دوسرا روز بھی گذر گیا لیکن طمع نہ پگھلا۔ دن ختم ہوا۔ دوسری رات بھی گذری۔ بلا غرض مایوس اور افسردہ دل پالسی طمع کے پگھلنے کے انتظار میں بھٹی کی طرف نظر جمائے بیٹھا رہا۔ تیسرا روز اور رات بھی گذری، پھر چوتھا پانچواں حتیٰ کہ چھٹا دن بھی گذر گیا۔ مسلسل چھ شبانہ روز تک باہمت پالسی نے جان توڑ کوشش کی مگر پھر بھی طمع نہ پگھلا۔

پالسی کے دل میں خیال آیا کہ شاید طمع کے اجزا میں کوئی نقص یا پگھلائے ہوئے مرکب میں کچھ کسر رہ گئی ہے اس لئے اس نے از سر نو پھر ایک آزمائش کیلئے تازہ مرکبات وغیرہ تیار کرنے شروع کئے اس میں اور دو تین ہفتہ گذر گئے۔ اب دقت طلب سوال یہ تھا کہ مٹی کی ہانڈیاں کس طرح خریدی جائیں؟ کیونکہ جو ہانڈیاں اس نے پہلی آزمائش کے لئے خود اپنے ہاتھ سے تیار کر رکھی تھیں عرصہ تک پکنے کی وجہ اس قدر ناکارہ ہوگئی تھیں کہ ان سے دوبارہ کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس کا تمام روپیہ صرف ہو چکا۔ اب نوبت قرض کی آپہونچی تھی اور اپنی اخلاقی حالت کے ٹھیک ہونے کی وجہ وہ قرض حاصل کرسکتا تھا۔ اگرچہ اسکی بیوی اور پڑوسی سمجھتے تھے کہ وہ اپنی آمدنی مہمل اور باطل تجربات میں ضائع کر رہا ہے لیکن پالسی کو کامیابی ہوئی۔ خرید لکڑیاں اور برتن خریدنے کے لئے اس نے اپنے ایک دوست سے کافی قرضہ حاصل کیا اور پھر ایک بار آزمائش کے لئے تیار ہوگیا۔ برتنوں پر نیا مصالحہ لگایا گیا۔ اور ان کو بھٹی میں رکھ کر آگ سلگا دی گئی۔

یہ سب سے آخر اور نہایت مایوس کن آزمائش تھی۔ آگ بھڑک اٹھی اور سخت گرمی پیدا ہوئی اس پر بھی طمع نہ پگھلا۔ لکڑیاں کم ہونے لگیں اور مشکل یہ تھی کہ ضروری آگ کسطرح برقرار رکھی جائے قریب میں باغ کے احاطہ کی لکڑیاں پڑی تھیں ان سے کام چل سکتا تھا۔ پالسی اپنے بڑے تجربہ کی کامیابی کے مقابلہ میں ان کو ایثار کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے باغ کی لکڑیاں کھینچکر بھٹی میں جھونک دیں اب بھی طمع نہ پگھلا۔ باغ کی لکڑیاں بے فائدہ جل گئیں طمع کے پگھلنے کے لئے ابھی اور دس منٹ

کی ضـــرورت تھی۔ اس وقت جس قیمت پر بھی لکڑیاں دستیاب ہوں خریدنے کی ضرورت تھی۔ اب گھر کا فرنیچر اور الماریاں بچی تھے۔ یکایک مکان میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دی اور پالسی کے بیوی بچے جن کو خوف ہوا کہ اس کی عقل سلامت نہیں چیختے ہی رہے لیکن اس نے تمام میزیں گھسیٹ کران کے ٹکڑے بھی بھٹی میں جھونک دیئے۔ اب بھی ملمع نہ پگھلا اب الماریوں کی باری آئی مکان میں لکڑیوں کے توڑنے کی پھر ایک آواز آئی اور الماریاں بھی ٹکڑے ٹکڑے کئے جا کر فرنیچر کے بعد آگ میں جھونک دی گئیں... بیوی بچے مکان سے باہر نکل پڑے اور شہر میں دیوانہ وار چلا کر کہنے لگے کہ پالسی کو جنون ہو گیا ہے اور وہ گھر کا فرنیچر توڑ کر جلا رہا ہے۔

کامل ایک مہینے سے پالسی نے جسم کے کپڑے تک نہیں بدلے تھے۔ سخت محنت فکر اور غذا نہ ہونے سے وہ بالکل تھک گیا تھا علاوہ مقروض ہونے کے وہ قریب قریب لٹ گیا۔ لیکن آخر کار اس نے ملمع کے راز کو پا ہی لیا۔ کیونکہ حرارت کی آخری زبردست آنچ نے ملمع کو پگھلا دیا جبھی ٹھنڈی ہونے کے بعد گھر کے معمولی بھورے مرتبان جب اس میں سے باہر نکالے گئے۔ تو ان پر ایک سفید روغن پایا گیا۔۔ اس ملمع کی خاطر پالسی کو لعنت ملامت حقارت وذلت برداشت کرنی پڑی اور اب جبکہ اس کے لئے اچھا زمانہ آیا۔ اپنی تحقیق کو عملی جامہ پہنانے کے موقع کا صبر سے انتظار کرتا رہا۔

اس کے بعد پالسی نے ایک ظروف ساز کو اس غرض سے نوکر رکھا کہ وہ اس کو اس کے مقررہ نمونوں کے مطابق مٹی کے برتن بنا دیا کرے ان پر ملمع چڑھانے کی غرض سے خود چکنی مٹی کے کچھ قدیم سکے یا تمغے تیار کرنا شروع کیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ برتن تیار ہو کر قابل فروخت ہونے تک اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گذر بسر کس طرح ہو خوش قسمتی سے سنٹس میں ایک شخص رہتا تھا جس کو اگرچہ پالسی کی رائے سے اتفاق نہیں تھا لیکن اس کی دیانت وراست بازی پر بھروسہ تھا یہ شخص ایک مسافر خانہ کا محافظ تھا اور چھ ماہ تک پالسی کے قیام وطعام کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے رضامند ہو گیا اسطرح خورد ونوش کی فکر سے نجات حاصل ہوئی لیکن پالسی نوکر کو مقررہ اجرت ادا نہ کر سکتا تھا۔ گھر کا تمام اثاثہ ختم ہونے سے اس کو برہنہ ہونا پڑا چنانچہ اس نے اجرت کی جزوی ادائی

یں جو اس کے ذمہ واجب الادا تھی اپنے چند کپڑے دیدئیے
اس کے بعد پلسی نے ایک مرمہ بھٹی تیار کی لیکن یہ اس کی شومی قسمت کا باعث تھا کہ اس
بھٹی کا تھوڑا اندرونی حصہ FLINTS سے تیار کیا تھا جب اس کو گرم کیا گیا تو FLINTS میں تڑک
ہوئی اور وہ پھوٹ گئے - پگھلا ہوا مادہ برتنوں کے ٹکروں پر پھیل کر جم گیا - ملمع کسی قدر ٹھیک
ہوا - بھٹی کے پھوٹنے سے نقصان ہوا، مزید چھ ماہ کی محنت رائیگاں ہوئی نقصان کے باوجود لوگ
ن ظروف کو کم قیمت میں خریدنا چاہتے تھے پالسی نے اس طرح برتن فروخت کرنا گویا اپنی غزت گھ
ور اس کو بٹہ لگانا سمجھا اس نے تمام برتن پارہ پارہ کردئے وہ کہتا ہے کہ اس پر بھی یاس مجھے جوش دلا
ہی اور میں نے دلیری سے اپنا کام جاری رکھا - بعض اوقات جب کبھی ملاقاتی اور مہمان مجھسے
تے تو اگرچہ حقیقت میں میں افسردہ خاطر رہتا تھا - لیکن خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی تواضع او مہمان نوا
یا کرتا تھا - مجھے جو مصائب برداشت کرنا پڑے ان میں سب سے زیادہ خود میرے گھر کے لوگ
کے مضحکے اور ایذا رسانیاں تھیں یہ لوگ اسقدر تنگی تھے کہ انہیں میرے بغیر کسی ذرائع کے کام
سرانجام دینے کے متعلق توقع نہ تھی - کئی سال تک میری بھٹیاں غیر محفوظ حالت میں رہیں - ا
دیکھ بھال کے موقعوں پر کئی شب مجھے بارش اور ہوا کے تکالیف برداشت کرنا پڑے - میرا کو
غمگسار اور مددگار نہ تھا بجز اس کے کہ ایک جانب بلیوں کے رونے اور دوسری طرف کتوں کے
بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں کوئی تسلی کا سامان موجود نہ تھا - بعض دفعہ طوفان اس شدت کے ساتھ جھٹیول
چلاتا تھا کہ مجھے فوراً انہیں چھوڑ کر دروازوں میں پناہ لینا پڑتا تھا - بارش میں بھیگنے سے ایسا معلو
ہوتا تھا کہ میں کیچڑ میں لت پت ہوگیا ہوں - اپنی اس حیثیت کذائی سے کبھی آدھی رات اور کبھی صبح میر
مکان جاتا تھا - رات میں مکان میں روشنی نہ ہونے سے ٹھوکریں کھاتا اور ایک مخمور کی طرح ایک
جانب سے دوسری جانب گھومتا تھا - حقیقت میں میں بھٹی کی دیکھ بھال سے تنگ آگیا اور
اپنی طویل محنت کے ضائع ہونے کا بڑا افسوس تھا - افسوس کہ مجھے گھر میں پناہ نہ ملی کیونکہ بارش
میں بھیگنے اور کیچڑ میں لت پت ہونے کے علاوہ مجھے میرے کمرے میں سابق سے زیادہ
ایذا پہنچائی گئی -

جذباتِ نسیم

از

جناب محمد سلطان محی الدین خان قاسمی صاحب نسیم

مدعا ہے یہ سرِ بزم تماشائی کا
کاش جلوہ نظر آئے تری رعنائی کا

دل ہے سینہ میں کہ تفسیرِ جفائے دلبر
قطرۂ خوں میں ہے نقشہ ستم آرائی کا

او تقاضائے جنوں! رحم کہ گھبراتا ہوں
چھوٹ جائے کہیں دامن نہ شکیبائی کا

بنگیا عشق میں گو سرو چراغاں لیکن
منتظر حیف رہا اپنے تماشائی کا

رازِ سر بستہ ہوں۔ ہے مہرِ تعین لب پر
ورنہ کیا مجھ کو بھی دعویٰ نہیں یکتائی کا

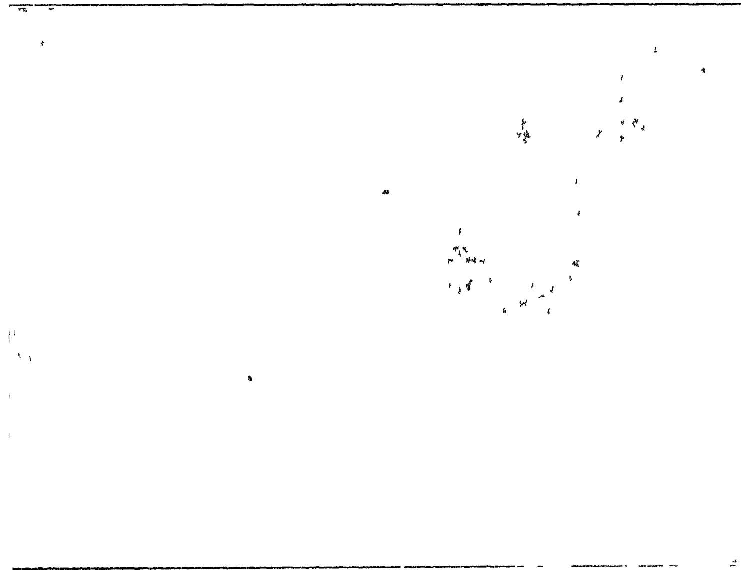
میں وہ موسیٰ ہوں۔ کہ دل میں ہے عیاں جلوۂ طور
لطف کچھ اور ہی در پردہ ہے گویائی کا

لامکاں ہے مرے جولانِ جنوں کو درکار
شوق پورا ہو کہاں بادیہ پیمائی کا

بزمِ امکاں میں رہا صورتِ انساں بنکر
کیا نیا رنگ ہے سب سے میری یکتائی کا

باعثِ ننگ محبت نہیں ناکام سہی
پردہ در نالۂ پنہاں نہیں سودائی کا

چاہیئے ضبطِ نفس عشق میں لیکن اے نسیم!
لب خاموش میں انداز ہے گویائی کا



باغ عامہ کا ایک دلفریب منظر

انگلستان اور اسکاچستان کے قدیم تعلقات

از

(جناب محمد فریدالدین خاں صاحب)

انگلستان اور اسکاچستان کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان دونوں ممالک کی تاریخ دیکھیں۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں ممالک شروع ہی سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

سنہ ۹۳۴ء میں کانسٹنٹائن شاہ اسکاچستان اور ایتھلسٹن شاہ انگلستان میں لڑائی ہوئی اور اول الذکر کو بمقام برونان برد شکست ہوئی۔ سنہ ۱۰۳۱ء میں ملکم دوم شاہ اسکاچستان نے کیانوٹ کے آگے حلف اطاعت اٹھائی۔ سنہ ۱۰۷۲ء میں ولیم فاتح نے ملکم سوم سے اپنی فرمانبرداری کا اقرار لیا اور اسی طرح ولیم دوم نے بھی کیا۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں انگلستان اور اسکاچستان میں رشتہ داری ہوئی۔ ہنری اول نے ملکم سوم کی بیٹی مٹلڈا سے شادی کرلی۔ سنہ ۱۱۳۷ء میں ڈیوڈ شاہ اسکاچستان نے انگلستان پر اپنا حق (مٹلڈا اپنی ہمشیرزادی کی طرف سے) جتایا اور حملہ کیا لیکن سنہ ۱۱۳۸ء میں اس کو محاربۂ علم میں شکست ہوئی۔ سنہ ۱۱۵۷ء میں ہنری دوم نے ملکم چہارم کو اسے ملک جنوبی اضلاع دینے اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ الکزنڈر دوم نے جان کی اطاعت قبول کی اور اس طرح الکزنڈر سوم نے بھی ایڈورڈ اول کی اطاعت کی۔ الکزنڈر سوم کا انتقال سنہ ۱۲۸۶ء میں ہوگیا وہ مارگریٹ (دوشیزۂ ناروے) کو وارث سلطنت چھوڑ گیا۔ مگر اس نے بھی بہت جلد انتقال کیا۔ اب بہت سے دعویداران تخت شاہی پیدا ہوئے ان میں سے جان بیلیل[۱]، رابرٹ بروس[۲] اور جان ہیسٹنگز[۳] قابل ذکر ہیں یہ ڈیوڈ کی اولاد سے ہیں تمام دعویداران تخت نے ایڈورڈ اول کو بحیثیت ایک جج کے مقرر کیا کہ وہ تمام دعویداروں کا فیصلہ کرے اسکاچستانی اور انگریز معززین کی ایک مجلس مقرر ہوئی جس میں ایڈورڈ نے بیلیل کا حق جتایا۔ بیلیل نے ایڈورڈ اول کے آگے حلف اطاعت اٹھائی اور وہ بادشاہ اسکاچستان بنا دیا گیا چونکہ ایڈورڈ اول ایک حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے

اس نے اسکاچستانیوں سے اس بات کا اصرار کیا کہ تمام مقدمات کی سماعت اسی کے آگے ہوا کرے مزید براں بروس نے فرانس سے گین کے متعلق جنگ چھڑنے والی تھی ایڈورڈ نے اسکاچستانی سردار کو فرانس کے مقابل اپنی طرف سے لڑنے کیلئے کہا اس پر اسکاچستانی بگڑ گئے اور ان لوگوں نے حلفِ اطاعت توڑ ڈالی۔

اسکاچستان میں جنگ

لڑائی سنہ ۱۲۹۶ء میں شروع ہوئی برِوک کو انگریزوں نے لیلیا۔ اور اسکاچستانوں کو جنگِ ڈنبار میں شکست ہوئی بیلیل ٹور (ہو سے تح) میں قید کر دیا گیا۔ اور ایڈورڈ اول کی طرف سے ارل وارین گورنر اسکاچستان مقرر ہوا۔ سنہ ۱۲۹۷ء میں ولیم والیس نے چند سپاہی فراہم کر کے ارل وارین کو اسٹرلنگ کے مقام پر اور انگریزوں کو اسکاچستان سے مار باہر کیا۔ دوسرے سال ایڈورڈ بذات خود اسکاچستان پر حملہ آور ہوا اور والیس کو سنہ ۱۲۹۸ء میں بمقام فالکرک شکست ہوئی والیس چند سال بعد گرفتار ہوا اور اسکو سولی دیدی گئی۔

جان کامن کی بغاوت

جان کامن بیلیل کا پوتا، تمام شمالی صوبجات پر قابض تھا گو اس کو سنہ ۱۳۰۳ء میں کچھ کامیابی ہوئی لیکن پھر اسکو ایڈورڈ کا دست نگر ہونا پڑا کچھ عرصے تک ان تمام شورشوں کا سلسلہ معدوم ہو چکا تھا۔ اور اسکاچستان میں امن وامان تھا مگر سنہ ۱۳۰۶ء میں پھر رابرٹ بروس (بیلیل کا مخالف) نے اسکاچیوں کو اپنے ہمراہ لیکر ملک میں ایک شور برپا کیا۔ بروس کامن کا خاتمہ کر کے سنہ ۱۳۰۶ء میں اپنے آپ کو بادشاہ اسکاچستان مشہور کیا۔

اڈنبرو پرت اور راکس برو پر قبضہ کر لینے کے بعد بروس اسٹرلنگ کے محاصرہ میں سرگرم ہوا۔ اب ایڈورڈ دوم ایک لاکھ سپاہی لیکر بروس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ مگر بروس نے صرف ۴۰۰۰۰ سپاہیوں کی مدد سے ایڈورڈ دوم کو سنہ ۱۳۱۴ء میں شکست فاش دیدی یہ لڑائی جنگِ بانک برن کہلاتی ہے ایڈورڈ سوم کے عہد میں اسکاچستانیوں نے پھر انگلستان کے سرحدی صوبجات پر حملہ کیا اور سنہ ۱۳۲۸ء میں انگریزوں و اسکاچستانیوں کے درمیان ایک صلح ہوئی جو (THE SHAMEFUL PEACE) کے نام سے مشہور ہے اس عہد نامے کی وجہ سے اسکاچستان کو انگلستان کے ہاتھ سے پوری آزادی مل گئی۔ اور ایڈورڈ سوم کی ہمشیرہ جونا کی شادی بروس کے خلف اکبر سے کر دی گئی۔

سنہ ۱۳۴۶ء میں جب کہ کیالے کا محاصرہ جاری تھا۔ اور فرانسیسیوں اور انگریزوں میں جنگ ہو رہی تھی تو اسکاچستانیوں نے شمالی انگلستان پر حملہ کیا۔ یہ سب کوشش نوجوان بادشاہ ڈیوڈ نے فرانس کی اعانت کے لئے کی تھی کیونکہ فلپ ہشتم شاہ فرانس نے اس کی جلاوطنی کے زمانے میں ڈیوڈ کے ساتھ بہت ہمدردانہ

سلوک کیا تھا اور جب ۱۳۴۶ء میں ڈیوڈ اور ایڈورڈ سوم کے درمیان جنگ نول کراس ہوئی تھی تو اسکاچستانیوں کو بری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی، خود بادشاہ اور بہت سے امرا لندن میں مقید کئے گئے۔

ہنری چہارم کے عہد میں بھی اسکاچستانیوں نے انگلستان پر حملہ کیا مگر ۱۴۰۲ء میں کوہ ہولڈن کی لڑائی میں انہوں نے پرسیوں PERCIES کے ہاتھ شکست فاش اٹھائی اس فتح کی وجہ سے انگلستان کو بجائے نفع کے نقصان ہی پہنچا۔ اسی بناء پر پرسیوں کی بغاوت شروع ہوئی۔

ہنری ہفتم نے ۱۵۰۲ء میں جیمس چہارم شاہ اسکاچستان کی شادی اپنی لڑکی مارگریٹ سے کردی چونکہ ہنری ایک سیاسی قابلیت کا آدمی تھا اس لئے اس نے بدامنی کے زمانے میں اسکاچستان کو اپنا بنا رکھنا کوئی بیجا کام تصور نہ کیا۔

۱۵۱۱ء میں ہنری ہشتم نے اتحادِ مقدس میں شرکت حاصل کی اور فرانس کے مخالف اسپین، جرمنی، انگلستان یہ تینوں قوتیں متحد ہو کر پاپا کی جاگیرات کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ جب فرانس کو جنگ مہمیز میں شکست ہوئی تو فرانس نے شاہِ اسکاچستان سے سازش کی اور جیمس چہارم شاہِ اسکاچستان نے اپنے سالے ہنری ہشتم کا کوئی لحاظ نہ کیا اور فوراً انگلستان کی سرحد پر حملہ آور ہوا لیکن جیمس چہارم اس طوطا چشمی سے بارور نہ ہو سکا۔ ۱۵۱۳ء میں اس کو نواب سرے کے ہاتھوں میدان فلاڈنگ کی جنگ میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ خود جیمس اور اس کے بہت سے ساتھی میدان ہی میں قتل ہوئے۔ ۱۵۴۲ء میں پھر ایک لڑائیوں کا سلسلہ اسکاچستان سے شروع ہوا اور جنگ سالوے ماس کی فتح نے اسکاچستانیوں کا زور بالکل توڑ دیا اور اس شکست کی خبر سے جیمس پنجم شکستہ دل ہو کر بہت جلد مر گیا اور تخت کے لئے اس کو جو میری آف اسکاٹ کے نام سے مشہور ہے چھوڑ گیا۔

سامرسٹ جو ایک مدبر اور سیاسی قابلیت کا آدمی تھا اس نے ان دونوں حکومتوں میں اتحاد پیدا کرنے کی ایک تدبیر سوچی اور ۱۵۴۳ء میں ایڈورڈ ششم اور میری دونوں کی شادی کے لئے اقرارنامہ لیا گیا۔ مگر خود اسکاچستانیوں کی نااتفاقی کی وجہ سے یہ عہد پورا نہ ہو سکا۔ ۱۵۴۷ء میں سامرسٹ نے اسکاچستان پر حملہ کیا اور چاہا کہ جبراً اسکاچستانیوں سے اس وعدہ کی تکمیل کرائے گو جنگ پنکی میں اسکاچستانیوں کو شکست ہوئی مگر انہوں نے میری کو جلد از جلد فرانس روانہ کر دیا تاکہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے اور وہاں اس کا نکاح ہنری دوم کے خلف اکبر فرانس سے کر دیا گیا۔

میری اسٹوارٹ کا ظہور پھر ملکۂ الزبتھ کے عہد میں ہوتا ہے۔ میری الزبتھ کی جانی دشمن تھی میری کی پہلی حرکت جس سے الزبتھ کی مخالفت ظاہر ہوتی ہے وہ اس کا اپنے آپ کو تخت انگلستان کا حقیقی وارث خیال کرنا ہے۔ الزبتھ کو وہ محض ایک غاصب قرار دیتی تھی اور خود کو چونکہ ہنری ہفتم کی پوتی تھی وارثِ تاج و تخت سمجھتی تھی مگر میری کے یہ سب حقوق ناقابل سماعت تھے، پہلی بات جو اس کے مخالف تھی وہ انگلستان کے قومی کلیسا یا مذہب کا پاپائے روم سے بالکل آزاد ہونا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ انگلستان کی قومی پارلیمنٹ ایک آزاد قوت رکھتی تھی۔

اسکاچستان میں بھی ان دونوں اصلاحات کی تحریک بہت زوروں پر تھی اور اسکاچستانیوں نے الزبتھ سے اعانت کی درخواست کی مگر اس کا فیصلہ ایک طرف مذہب کے ہونے سے اور دوسری طرف میری اسٹوارٹ کے ہونے سے متزلزل ہوا تھا مگر جب میری نے ملکۂ انگلستان کا خطاب اپنے لئے جائز رکھا تو الزبتھ نے بھی پریسبٹیریوں کو مدد دینی شروع کردی میری کو پھر اسکاچستان کی سلطنت سے محروم کر دیکر جیمس ششم جو کہ ابھی نابالغ تھا اسے بادشاہ بنا دیا گیا۔ میری کے شوہر کا جب فرانس میں انتقال ہو گیا تو اس نے ڈارنلے کے ساتھ شادی کر لی اور پھر اس کو مروا دیکر باتھول کے ساتھ نکاح کیا۔ اس بنا پر اسکاچستانی اس کے سخت مخالف تھے اسکاچستان سے بھاگ کر میری انگلستان آئی اور یہاں اس کے آنے کی وجہ سے کئی شورشیں اور سازشیں ہوئیں ۱۵۶۹ء میں میری کو الزبتھ نے بحیثیت ایک مجرم کے مقید رکھا تقریباً ۲) سال تک میری قید رہی اور ۱۵۸۶ء میں فیصلے کے مطابق اس کو مجرم قرار دیکر قتل کر دیا گیا۔

۱۶۰۳ء میں اسکاچستان اور انگلستان کی ان سب جنگوں، سازشوں، اور شورشوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جیمس ششم ایک ہی ساتھ ادھر اسکاچستان کا بادشاہ بنا دیا گیا اور ادھر جیمس اول کے خطاب کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ بنا دیا گیا۔ غرض اس طرح سے دو ایسی حکومتوں کا اتحاد ۱۶۰۳ء میں ہوا جو صدیوں سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

ایک تسلّی

(شکسپیر کی ایک شہرۂ آفاق نظم کا ترجمہ)

از

جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

ذلت و افلاس پر پڑتی ہے جب میری نظر — اشکِ حسرت ہوں بہاتا اپنے حالِ زار پر
حشر گو کرتے ہیں برپا نالہائے بے اثر — میری اک سنتے نہیں ہیں آسماں کے گوش کر
جب ہجومِ یاس کا پاتا ہوں اپنے دل میں گھر — دانت خوش بختی پہ رہ جاتا ہوں اپنی پیس کر

گاہ گھبرا کر یہ کہہ اٹھتا ہوں میں حسرت نصیب
ہائے مجھ کو کر دیا افلاس نے ذلت نصیب!

چاہتا ہے دل مرا بن جاؤں میں سرمایہ دار — شان ہو جائے مری مثلِ امیرِ باوقار
تاجِ زریں سر پہ ہو بر میں قبائے زرنگار — صورت و سیرت پہ میری ہو دلِ عالم نثار
اور ہوں رنگا رنگ بزم آرائیاں لیل و نہار — دوستوں کو ہو جدائی میری ازبس ناگوار

کیا بتاؤں دل میں میرے کرتا ہے کیا کیا خطور
ممکنہ کوشش سے بھی ممکن نہیں جس کا ظہور

یک بیک صبر و قناعت دل سے ہو جاتے ہیں دور — عیشِ موجودہ کی بھی اشیا سے رہتا ہے نفور

رنج کا اٹھتا ہے طوفاں غم کا ہوتا ہے وفور   غرقِ گردابِ فنا ہوتی ہے کشتیٔ سرور
سنگِ غم سے شیشۂ دل میرا ہو جاتا ہے چور   حالتِ ناگفتہ سے ہو جاتا ہوں میں ناصبور

دیکھ کر چشمِ حقارت سے میں اپنے آپ کو
کوسنے لگتا ہوں خجلت سے میں اپنے آپ کو

ایسی حالت میں کہ جب ہوتا ہے میرا غیر حال   میری پیاری زندگی ہو جاتی ہے مجھ کو وبال
بن کے رحمت میرے حق میں آتا ہے تیرا خیال   بارور ہو جاتا ہے میری تمنا کا نہال
ہر طرف ہوتے ہیں میرے دل سے اندوہ و ملال   اور میرا حال ہو جاتا ہے بس اس کی مثال

جیسے غم نا آشنا کوئی پرندِ صبح خیز
اڑ کے سطحِ خاک سے جو ہو فلک پر نغمہ ریز

سچ یہ ہے، خوبیٔ محبت جب تری یاد آتی ہے   شادمانی کی وہ دولت ساتھ اپنے لاتی ہے،
عیش کی اک کیفیت دل پر مرے چھا جاتی ہے   کیا بتاؤں میں کہ کیا حالت میری ہو جاتی ہے

اپنی حالت کے مقابل جانتا ہوں مبتذل
شانِ شاہانِ جہاں گنجینۂ اہلِ دول



سولہویں صدی کا ایک ہیئت داں

(ٹائیکو براہے)

از

جناب محمود مرزا صاحب متعلم بی اے نظام کالج حیدرآباد دکن

بہتیرے ایسے انسان ہیں جو ہر روز صبح میں سورج کو نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں، رات میں چاند ستارے ان کے سامنے چمکتے نظر آتے ہیں کبھی آسمان سے کوئی روشن شے گرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے تو کبھی بادلوں سے مہیب آوازیں آتی ہیں مگر ان کو اس بات کی کوئی پروا بھی نہیں ہوتی کہ آخر وہ کیا ہیں اور کیوں ایسی دکھائی دیتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر طبقہ اور ہر زمانے میں ایک نہ ایک وجود ایسا ضرور ہوا ہے جس نے اپنے ماحول کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور ان سے نتائج اخذ کئے۔ زمین اور آسمان سورج اور ستاروں کے متعلق ہم کو پرانے سے پرانے خیالات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ سب سے قدیم خیال یہ ہے کہ زمین اور آسمان دونوں ایک جگہ دور جا کر ملے ہوئے ہیں زمین چپٹی اور ساکن ہے۔ اور سورج اس کے اطراف چکر لگاتا ہے۔ یونان والوں نے زمین ستاروں اور سورج کو دیوتاؤں سے موسوم کیا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ سورج ایک دیوتا ہے جو ہر روز اپنی رتھ آسمان پر سے زمین کے اوپر دوڑاتا ہے اہل مصر کا یہ خیال تھا کہ کرۂ ارض ایک بڑا دیو ہے جو ایک کہنی اور پاؤں ٹکائے لیٹا ہے۔ اور آسمان ایک دیوی ہے جو زمین کے دیو کے پیروں پر پیر رکھے ہوئے اور دونوں ہاتھ اسکی کہنی پر ٹکائے ہوئے نصف دائرہ کی شکل میں قائم ہے۔ اس دیوی کے لباس پر بیل بوٹے چمکتے ہیں جنکو ہم ستارے کہتے ہیں اک کشتی ہے جو اس دیوی کے سرہانے سے نکلتی ہے اور پائینتی کی طرف جاتی ہے۔ اس کشتی میں مختلف صورت کے انسان ہیں جو کبھی کھیلتے ہیں اور کبھی کودتے ہیں اور یہ کشتی سورج ہے جو زمین کو روز روشن کرتی ہے۔ اہل ہنود کا فلسفہ سب سے بڑھا ہوا تھا انہوں نے یہ بتلایا کہ زمین ایک نصف کرہ ہے جو چار بڑے ہاتھیوں پر قائم ہے اور یہ ہاتھی اک کچھوے کی پیٹ پر کھڑے ہیں جو اپنا منہ

اور ہاتھ پاؤں نکالے پانی کی سطح پر تیر رہا ہے۔

جب یونان میں بطلیموس پیدا ہوا تو اس نے بتایا کہ زمین کے گرد سات سیارے چکر کاٹتے ہیں و ہر ایک سیارہ ایک آسمان پر ہے اس طرح کل سات آسمان ہیں اس کے خیال میں زمین پر کرۂ ہوا کے بعد کرۂ نار ہے اور اس کرۂ نار کے بعد پہلا آسمان ہے جو چاند سے منسوب ہے۔ پھر دوسرا جو عطارد سے اور تیسرا زہرہ سے چوتھا سورج سے پانچواں مریخ سے چھٹا مشتری سے اور ساتواں زحل سے زمانہ سلف کے لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے ہر ایک دن ایک ایک ستارہ کی حکومت کا زمانہ ہے پیر کے دن چاند منگل کے دن مریخ بدھ کے دن عطارد جمعرات کے دن مشتری جمعہ کے دن زہرہ ہفتہ کے دن زحل اور اتوار کے دن سورج زمین پر حکومت کرتے اور بنی نوع انسان کی قسمت کا اپنی مرضی کے موافق فیصلہ کرتے ہیں۔

اگرچہ اہل یونان نے علم و فن میں کمال حاصل کر لیا تھا مگر ہمکو ان کی معلومات کا زیادہ پتہ نہیں چلسکتا کچھ تو اس لئے کہ ان کے زمانے کو گزرکر بہت عرصہ ہوا اور کچھ اس بیان کے لحاظ سے کہ اسکندریہ کا بڑا کتب خانہ جہاں یونانی علوم کی بڑی بڑی کتابیں تھیں جلا دیا گیا۔ اور پھر زمانہ کی ناقدری کیوجہ سے رہی سہی کتابیں بھی تلف ہوگئیں ایک زمانہ دراز تک علوم و فنون کا چرچا مسلمانوں میں ہوتا رہا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے نئے علوم ایجاد کئے الکیمیا خود اس بات کا شاہد ہے کہ علم کیمیا عربوں نے ایجاد کیا علم نجوم اور فلسفہ میں مسلمانوں نے بہت بڑی ترقی کی اور انہیں علوم کی ضیا باری یورپ میں ہوئی جسکی وجہ سے یورپ نے ترقی کیطرف رخ کیا سب سے پہلے یورپ میں جو بڑا مجدد عالم ہوا وہ بیکن تھا اگر اسکو موجودہ زمانہ کا پیشرو کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ہر ایک علم میں اسکو کمال تھا مگر بدقسمتی سے اس زمانے کے لوگ جاہل تھے اور صرف اس لئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ جانتا تھا اور روپیہ پیسہ سے زیادہ محبت رکھتا تھا لوگوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور اسکو سزائے موت سنا دی گئی۔ روگر بیکن کے کوئی دو سو سال بعد لنیارڈو ولسی پیدا ہوا اگرچہ یہ ایک مصور تھا مگر ہم اس کے کارنامے کے مطالعہ سے یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ واقعی وہ اپنے زمانے کا ایک بڑا شخص تھا سب سے پہلے اسی نے نقاشی میں روشنی اور سایہ اندازی کے قانون ایجاد کئے رنگکاری کے مختلف طریقے اسی نے بنائے اسی کے زمانہ میں طباعت کی مشین ایجاد ہوئی جسکی وجہ علوم و فنون کی تحصیل میں ایک حد تک بڑی آسانی ہوگئی کولمبس نے اتفاقاً نئی دنیا کا پتہ چلایا اور کوپرنکس پادری نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین سورج کے اطراف چکر لگاتی ہے۔

سب سے بڑی مشکل جو کوپرنکس کو پیش آئی وہ یہ تھی کہ مذہبی علما کبھی ایسی بات کے سننے کے لئے آمادہ نہ تھے انجیل پر اُن کا ایمان تھا اور وہ یقین کرتے تھے کہ سورج ایک روشنی ہے جس کو فرشتے حسب حکم خداوندی زمین کے گرد لائے لیجاتے ہیں

اور جو کوئی ان خیالات کے خلاف آواز بلند کرتا اس کو موت کا فتویٰ سنا دیا جاتا تھا۔ چونکہ کاپرنکس خود ایک مذہبی آدمی تھا۔ اور ساتھ ساتھ علوم ریاضی کا ماہر بھی تھا۔ اس لئے اس نے آہستہ آہستہ مگر بڑے استقلال کے ساتھ یہ خیالات شائع کرنے شروع کئے اور جب اس نے زمین کی حرکت کے ثبوت میں ایک مستقل کتاب لکھی تو اس کو پاپائے روم کے نام سے معنون کیا اور کتاب کی اشاعت کے اخراجات کا کفیل بھی ایک بڑے مذہبی شخص کو بنایا۔ اور اسی وجہ سے وہ متعصب لوگوں کے پنجہ سے بچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا جب اس کی کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو اس کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنی کتاب کو اطمینان سے دیکھتا اچانک فالج نے اس پر حملہ کیا۔ اور وہ مطبوعہ کتاب کو سرہانے لئے ہوئے راہی ملک عدم ہو گیا۔

کاپرنکس کے بعد ٹائیکو نے دنیائے علوم میں خروج کیا۔ یہ بھی ایک مذہبی شخص تھا۔ اور اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سورج متحرک ہے اور زمین ساکن اور سورج زمین کے اطراف چکر لگاتا ہے نہ کہ زمین سورج کے اطراف مگر اس کا یہ نظریہ جو کاپرنکس کے کلیہ کے خلاف تھا اس کے عین حیات تک ہی قائم رہا اور اس کے بعد ثابت ہو گیا کہ کاپرنکس کا خیال بالکل درست اور صحیح تھا اور ٹائیکو کا غلطی پہ ہیں۔

گرچہ ٹائیکو کا قیاس زمین کے سکون کے متعلق غلط تھا۔ تاہم اس نے علم ہیئت میں بہت سے معلومات حاصل کئے۔ اس نے سیاروں کے دیکھنے کیلئے رصدگاہیں بنوائیں جو یورپ میں اس سے پہلے بھی نہ بنی تھیں اجرام فلکی کے متعلق اس کے قیاسات خواہ کچھ ہی ہوں مگر جو مشاہدے کہ اس نے کئے وہ بہت درست اور صحیح ہیں وہ سب سے پہلا ماہر ہیئت داں اور عملی علم ہیئت کے سلسلہ کا جس کے کمال کا نمونہ آجکل گرینچ کی رصدگاہ بنی ہوئی ہے بانی تھا۔ اس کے زمانے میں نہ تو خوردبین کا وجود تھا اور نہ دوربین کا اور جب ہم غور کرتے ہیں یہ حساب میں اس نے ایک درجے کے ساٹھویں حصہ تک کی کمی بیشی کسی جگہ نہیں کی تو ہمیں ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں بھی اس کا مشاہدہ ستاروں کی ٹھیک ٹھیک حرکت کے متعلقہ اعتراض کیلئے بعض اوقات پیش نظر ہوتا ہے اور پچھلے زمانہ میں تو ہیئت دانوں نے نسلاً بعد نسلٍ اس کے مشاہدہ کو ایک قابل اعتماد امر فرض کر لیا تھا اس کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہیئت داں اس قابل نہ سمجھے کہ مشاہدہ میں اس کی جیسی صحت کو پہنچ سکیں بہرحال وہ علم ہیئت کا ایک زبردست ماہر تھا جس کی سوانح ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

ٹائیکو براہے شریف خاندان کا لڑکا تھا۔ اس زمانے میں جبکہ شرفا و امرا کا کام صرف شکار اور قتل و خون تھا کون امید کر سکتا تھا کہ ایک شخص جو قسمت سے کہیں کا حکمراں بننے والا ہے علوم و فنون

کیطرف توجہ کرکے کیا ئے روزگار بن بیٹھے گا۔ علم کا حاصل کرنا امرا کیلئے اس زمانے میں باعث عار تھا پادریوں اور درویشوں کیلئے علم مخصوص تھا اور عوام کی نظر میں تحصیل علم کوئی زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی مگر ٹائیکو کا چچا پڑھا لکھا آدمی تھا لڑکے کے طبعی رجحان کو دیکھکر مناسب سمجھا کہ اسے اپنا بیٹا اور وارث بنائے اور اعلیٰ تعلیم دلوائے۔ اس خیال سے اس نے خود اس کو ابتدائی تعلیم دی۔ یہاں تک کہ ہونہار لڑکا تیرہ برس کی عمر میں یونیورسٹی کی شرکت کیلئے کوپن ہیگن روانہ ہوا۔ زمانہ تعلیم میں ایک چاندگہن نے اس کی توجہ علم نجوم کیطرف منعطف کردی اور وہ غیب کی باتوں کے جاننے کیلئے سیاروں کی حرکت کا مطالعہ کرنے لگا۔ سنہ ۱۵۶۰ء میں اس کے چچا نے قانون کی تعلیم کیلئے روانہ کیا مگر اس نے تمام رقم نجوم اور ہیئت کی کتابوں اور اوزاروں کے خریدنے میں صرف کردی اور قانون کی ذرا بھی پروانہ کی۔ حقیقت میں جس شخص کا مطمح نظر قانونِ عالم کا مطالعہ ہو اس کی نظر میں قانون انسانی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

سنہ ۱۵۶۳ء میں اوس کو مشتری اور زحل ملتے نظر آئے۔ اور جیسے کہ لوگوں کا خیال تھا اس سال ملک میں بڑی زبردست وبا پھیلی۔ مگر ان سیاروں کے اتصال نے ٹائیکو کے رجحان کو اور زیادہ کردیا۔ اس نے کاپرنکس کے جدول کے ذریعہ جب تاریخ کو معلوم کرنا چاہا تو تاریخ اور وقوع میں ایک ماہ کئی دن کا فرق پایا۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کرلیا کہ پرانے جدول کی تصحیح کیلئے نئے جدول بذات خود تیار کرے اس کام کی تکمیل کیلئے ایک طویل عرصہ کی ضرورت تھی تاہم اس نے خود کو نئے جدول کی تیاری کیلئے وقف کردیا اس کا پہلا اوزار ایک قسم کا رولر تھا جس کے ذریعہ وہ سیاروں کی جگہ اور رفتار معلوم کرسکتا تھا اور اس کے ذریعہ کسی سیارہ کا مقام کرہ آسانی پر دریافت کرسکتا تھا۔

سنہ ۱۵۶۵ء میں اس کے چچا کا انتقال ہوگیا اور ٹائیکو اس کی جائداد کا وارث ہوا۔ جب ٹائیکو اپنے چچا کی جگہ حاصل کرنے ڈنمارک آیا۔ اور لوگوں میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ تو عوام الناس نے سوائے تمسخر اور تذلیل کے اس کے ساتھ کوئی برتاؤ نہ کیا۔ بالآخر ڈنمارک سے وہ انہی خیالات کو لئے ہوئے نکلا اور پھر دوبارہ جرمنی کا رخ کیا۔ اس کی طبیعت کچھ ایسی تیز واقع ہوئی تھی۔ کہ ذرا سی بات پر الجھ جاتا تھا۔ جرمنی میں جب وہ ایک درویش کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کسی ریاضی کے مسئلہ پر دونوں میں بحث چھڑ گئی نوبت مار پیٹ تک پہنچی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں ... (Duel) ڈوئل لڑیں .... سات بجے شام کا وقت تھا۔ حریفوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزمائی کی مگر ٹائیکو کے حریف کا وار ایسے زور کا چلا کہ بیچارے کی ناک جڑ سے اڑ گئی آخر کار ناک نہ ارد کا عیب وہ کس طرح دفع کرتا مجبوراً سونے کی ناک بنوائی

اور ہر روز وہ اس عیب کو چھپانے کے لئے اس طلائی ناک کو اپنے چہرہ پر لگا لیا کرتا تھا۔

اسی زمانہ میں وہ آگسبرگ گیا۔ اور وہاں اس نے ایک بڑا مقیاس الرفعت تیار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس آلہ کے ذریعہ اس نے متعدد سیاروں کے فاصلوں یا ان کے ارتفاع کی نسبت نئے نئے معلومات حاصل کئے یہ آلہ اتنا بڑا تھا کہ بیس آدمی اس کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے لیجاتے تھے یہ آلہ برابر پانچ سال کام دیتا رہا لیکن آخرکار ایک طوفان کیوجہ سے برباد ہو گیا۔

سنہ ۱۵۷۱ء میں وہ دوبارہ ڈنمارک گیا۔ لیکن اب کی دفعہ اس کی شہرت کے ڈنکے بج گئے اور لوگوں نے اس کی بڑی عزت کی۔ چونکہ لوگوں کو کیمیا بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے اس نے کیمیا کیطرف توجہ کی اور عوام کی دلچسپی کے لئے مختلف مرکبات تیار کئے۔ پرانے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کچھ تو گرمی سردی سے اور کچھ سیاروں کی گردش سے کسی دھات کا سونا یا چاندی میں تبدیل ہونا مشکل بات نہیں۔ چنانچہ وہ ہر ایک دھات کو ایک ایک سیارے سے منسوب کرتے تھے۔ چاندی چاند سے سونا سورج سے تانبا مریخ سے اور سیسہ زحل سے منسوب تھے اس لئے انہیں ان مفردات کی الٹ پھیر سے ایک عجیب الخاصیت دوا تیار کی جس سے وہ ہر ایک مرض کا علاج کرتا رہا اور ایک عرصہ دراز تک اس دوا کا تمام یورپ میں چرچا رہا۔

کیمیا بنانے کے شوق میں وہ اپنے عزیز وقت کو بیکار ضائع کر دیتا اگر نومبر ۱۵۷۲ء میں ایک دمدار ستارہ آسمان پر نمودار نہ ہو کر اس کی توجہ اپنی طرف نہ پھیر لیتا۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بیس سال کے عرصہ میں ایک دمدار ستارہ نکلتا ہے۔ اور دنیا پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یہ ستارہ مشتری کے برابر چمکیلا تھا اور پورے ڈیڑھ سال تک نکلتا رہا۔ ٹائیکو نے اس کے فاصلہ کے معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ ستارہ مذکور اس لامتناہی فاصلے کے آسمان پر نکلا تھا جو قطب تاروں کے طبقہ سے منسوب ہے۔

کوپن ہیگن کی یونیورسٹی نے اس سے علم ہیئت پر لکچر دینے کیلئے درخواست کی۔ مگر اس نے علم کی بے عزتی کے خیال سے اس کام کو اپنی کسر شان سمجھا۔ آخرکار بادشاہ نے بذات خود اس سے ایک دوستانہ درخواست کی جس پر وہ راضی ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے عالی نسبی کے تعصب کو بالائے طاق رکھکر روستائیوں اور کسانوں سے ربط و ضبط پیدا کیا۔ وہ ان کا بغیر کسی فیس کے اپنی مستند اور مشہور و معروف دوا سے علاج کرتا جس سے مریض بہت جلد شفا پا جاتے تھے۔ جب شکم پرور طبیبوں نے اپنی روزی کو اسطرح ڈوبتے دیکھا تو وہ اس کے جانی دشمن بن گئے اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی قصہ مختصر وہ ایک زبردست مصلح اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ اس نے ایک کاشتکار کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

اب ہم ٹائیکھو کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بیان کرتے ہیں۔ فریڈرک دوم نے جب یہ دیکھا کہ ٹائیکھو علم و فن میں اپنے زمانے کا یکتا ہے اور جب یہ خیال کیا کہ اگر اوس کی روپے سے مدد کیجائے تو نہایت ہی حیرت انگیز انکشافات کو ظاہر کرے گا تو اس نے ایک شاندار نذر اسے پیش کی۔ نذر یہ تھی کہ اگر ٹائیکھو ڈنمارک میں رہے اور وہیں ایک رصدگاہ بنائے علم ہیئت کے معلومات بہم پہنچانے پر راضی ہو جائے تو سرکار کی طرف سے چار سو پونڈ سالانہ اسکے اخراجات کے لئے ادا کریں گے۔ اور سردست رصدگاہ کی عمارت کے لئے بیس ہزار پونڈ کی منظوری دیجاتی ہے۔

ٹائیکھو اس سے زیادہ چاہتا ہی کیا تھا۔ اس کی دلی تمنا یہی تھی اگر کسی ملک نے اپنا روپیہ کار آمد میں خرچ کیا تو بس یہی تھا۔ اس گراں بہا عطیہ کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کی تمام اقوام سے سائنس کے کاموں میں ڈنمارک کا ملک پیش پیش رہے۔ جزیرہ ہون رصدگاہ کے لئے تجویز ہوا اور یہاں دنیا کی عظیم الشان رصدگاہ سب سے پہلے پہل یورپ میں تیار ہوئی۔ اس کا نام ہورین برگ رکھا گیا جس کے معنی قصر الافلاک کے ہیں رصدگاہ جزیرہ کے وسط میں ایک پہاڑی پر بنائی گئی اور یہاں ہر ایک شئے کا انتظام کیا گیا تھا۔ رصدگاہ کیا تھی واقعی ایک نمونہ جنت تھی۔ چاروں طرف ہرے بھرے باغ۔ مطالع تجربہ گاہیں، قیام گاہیں اور چار معائنہ گاہیں۔ جہاں نایاب و بہترین آلات وغیرہ مہیا تھے تیار کئے گئے تھے۔ در و دیوار نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ اور اطراف میں زمانہ سلف کے عظیم الشان اشخاص کی تصاویر آویزاں تھیں بے شک بیس ہزار پونڈ کی رقم معمولی نہ تھی تاہم عمارت کی تکمیل کے لئے ٹائیکھو نے اتنی اور رقم اپنی جیب خاص سے خرچ کی۔

بیس سال تک اس علم و فن کی خانقاہ میں ٹائیکھو نے کام کیا۔ اور بہت جلد یورپ کی سرزمین کا عظیم ترین شخص بن گیا۔ فلسفی حکماء مدبران وقت اور سلاطین زماں اس بڑے ہیئت داں کی ملاقات کو آتے اور اسکی نادر ایجادوں کا معائنہ کرتے تھے۔

ٹائیکھو کا برتاؤ بڑے بڑے امرا کا فراج بحال کر دیتا تھا۔ فطرتاً ٹائیکھو کسی کے آداب و لحاظ کی پروا نہ کرتا تھا خواہ کوئی امیر و کبیر ہی کیوں نہ آئے اسکی غریب مسکین شکل بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اور وہ ذرا سی بات پر دیوان سلطنت کو بھی ڈانٹنے سے نہ چوکتا تھا۔ بہر حال اعزاز و مرتبت کی قدر اسکی آنکھوں میں نہ تھی بعض نادان امرا جو اسکی ملاقات کو آتے اس کے برتاؤ کو... اپنی ہتک خیال کر کے اس کے تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو جاتے تھے۔ اس نے ایک مسخرہ کو غیب کی باتیں بتانے کے لئے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ جب وہ ضیافت کے دسترخوان پر بیٹھتا اور کھانا کھا لیتا تو ہی غیب داں کو بلاتا اور غیب کی باتیں سنانے کا حکم دیتا

دینا۔ اس وقت کسی شخص کو بھی اس کے سامنے دم مارنے کی اجازت نہ تھی
اس کو لوگوں سے نفرت تھی۔ اور ان کو متعلقہ علمی آلات نہیں دکھاتا تھا بلکہ ان کے سامنے نظر فریب عجیب غریب اشیا مثلاً کھلونے، کلیں، چھوٹی چھوٹی پن چکیاں، انوکھی گھڑیاں، طلائی کرہ اور تمام قسم کے گورکھ دھندے پیش کرتا تھا جن سے بلاشبہ وہ خوش ہوجاتے تھے ٹائیکھو کا برتاؤ کوئی برا یا فوق العادت نہ تھا۔ بلکہ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی روش زمانے کی رفقا کے مطابق ایسے زمانہ میں جبکہ امرا کے اخلاق وحشیوں سے کچھ کم نہ تھے اور غارت گری اور قتل و خوں ان کی نظر میں کوئی جرم نہ تھا تو ٹائیکھو جیسے طبیعی کے لئے اپنی اور اپنے علم کی حفاظت کے لئے یہی چارہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی تندخو اور آتش مزاج بن جائے۔ اور امرائے عظام کا جابرانہ مقابلہ کرے۔

ان بڑی ہستیوں میں سے جو ٹائیکھو کے پاس آئیں انگلستان کا بادشاہ جیمس اول بھی ہے جیمس ٹائیکھو سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا اور اس کی رسد گاہ میں جب کہ وہ ڈنمارک کی شہزادی این سے ۱۵۹۰ء میں شادی کرنے کے لئے آیا تو آٹھ دن تک ٹھہرا رہا۔

جیمس نے جو ہدیہ ٹائیکھو کو بطور نذر دئے ان میں سے ایک کتا بھی تھا اور یہی بچارا کتا ٹائیکھو کی بربادی کا سبب بنا۔ اس کتے کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔

اتفاقاً جب کہ ڈنمارک کا دیوان سلطنت ٹائیکھو کی ملاقات کے لئے آیا تو اس نے ایک لات بچارے کتے کے رسید کی جس پر ٹائیکھو کا مزاج برہم ہوگیا اور اس نے دیوان اعظم کی بری طرح خبر لی جب دیوان صاحب ملاقات سے واپس ہوئے تو انہوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ ٹائیکھو کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیں گے محل میں آکر بادشاہ سے شکایت کی مگر مہربان بلکہ صوفیا نے ٹائیکھو کی طرف داری کی اور معاملہ ٹھنڈا ہوگیا کچھ عرصہ بعد فریڈرک کا انتقال ہوگیا اور کمسن لڑکا تخت نشین ہوا اب یہ وقت تھا کہ لوگ ٹائیکھو سے اپنا بدلہ لے سکتے تھے۔ وزیر اعظم نے تخت نشین لڑکے کو ٹائیکھو کے خلاف میں بھڑکانا شروع کیا۔ اس زمانے کے خطوط سے جو ٹائیکھو نے لکھے واضح ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مستقبل قریب کے متعلق خوف و ہراس ہے اور اندیشہ ہے کہ اس کو رسد گاہ چھوڑنی پڑے تاہم وہ خود کو اس خیال سے تشفی و دلاسا دینے کی کوشش کرتا ہے کہ جہاں وہ جائے گا اس کی لیاقت اسکی بصیرت اس کے ساتھ رہے گی اور ہر جگہ وہی چاند وہی سورج وہی آسمان وہی تارے نظر آئینگے۔

ایک دفعہ جب کہ نوعمر شہزادہ اس سے ملنے کیلئے آیا اور مختلف باتوں کی تشریح کے لئے اصرار کیا تو اس نے سختی سے جواب دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جاگیر چھین لی گئی اور تنخواہ بند کردی گئی اور پانچ

سال کے اندر غلطی نے اسے مجبور کردیا کہ رسدگاہ کو چھوڑکر روزگار کی تلاش میں دربدر خاک بسر نکلے اور وطن کو خیرباد کہے اس کی بیوی اور آلات و اوزار رسدگاہ میں ہی رہے تاکہ جب وہ کہیں مقیم ہوجائے تو وہ اس کے پاس بھیج دئے جائیں دیوانِ سلطنت نے ایک کمیشن مقرر کی کہ اس کے علم ہئیت سے متعلق کارنامہ کا اندازہ کرلے۔ اس نابکار کمیشن نے یہ رپورٹ دی کہ ٹائیکھو نے جوکچھ کیا وہ بیکار ہی نہیں بلکہ متضرر محض تھا اس پر عوام الناس نے بجائے ٹائیکھو کی بڑی نے دے کی اور گلیوں اور سربازار بدنام کیا۔

آخر وطن میں رہنے کیلئے اس کے واسطے رکھا ہی کیا تھا گھربار چھوڑ چھاڑ اس نے جرمنی کا رخ کیا پورے دوسال صحرانوردی میں بسر ہوئے۔ آخرکار بوہیما کے روشن خیال شہنشاہ روڈلف ثانی نے اسے پراگ میں آنے کی دعوت دی اور تین ہزار کراؤن سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کیا۔ یہاں اس نے ایک قلعہ کی مرمت کی اور رصدگاہ کا انتظام کیا۔ علم کے شیدائی اس کے گرد جمع ہوئے۔ اور انہیں شاگردوں میں ایک غریب لڑکا جان کپلر بھی تھا جس نے آگے چلکر اپنے اوستاد سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

گرچہ ٹائیکھو نے پراگ میں بہت سے مشاہدے کئے اور رودلفی جدول کا کام آغاز کیا تاہم لوگوں کی بدنامی نے اس کی ہمت توڑدی اور اس کے کام کی بے اعتنائی نے اس کی کمر بٹھادی۔ اور موت کا چنگل اس سے قریب ہوتا جاتا تھا ایک تکلیف دہ بیماری نے اسے آگھیرا اس کے ساتھ ساتھ بےچینی بےخوابی اور سرسام وشوریدہ سری نے اس پر حملہ کیا۔ اور یہ مظلوم ہستی بیماری کے دورہ میں یہ کہتی ہوئی چلی گئی :-

"آہ شاید وہ ابھی طلوع نہ ہو۔ . . . . . اور میرا انتظار اور زندگی بیکار ضائع ہے"

اس کے عزیز از جان آلات روڈلف کے حکم سے نمائش گاہ میں سجادئے گئے یہاں تک کہ الکٹر پلیٹائن نے پراگ پر قبضہ کیا اور زمانہ کی کایا پلٹ سے وہ آلات خورد برد ہوکر ٹوٹ پھوٹ گئے۔ صرف ایک یادگار اب تک باقی ہے جو پیتل کا ایک بڑا کرہ ہے۔ اور جسکو تقریباً ۲۰ سال بعد بادشاہ ڈنمارک کے اخیر زمانے کے وزیر نے پہچانا کہ یہ کرہ ٹائیکھو کا ہے۔ آجکل یہ کرہ کوپن ہگین کی لائبریری میں موجود ہے۔

جزیرہ ہون پر ڈینیون نے حملہ کرکے رسدگاہ کو مسمار کردیا۔ اور اب اس عظیم الشان رسدگاہ کی یادگار تودۂ خاک اور گڈھوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تاہم ٹائیکھو کا اصل کام ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے دوستوں اور اس کے شاگردوں نے اپنی اپنی عمر میں اس کے بوئے ہوئے درخت کو سیراب کرکے باور کردیا ہے۔

خاموشی کہتے ہیں جس کو میری گویائی ہے

از
جناب محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم

سر کو ہر دم ہوس ناصیہ فرسائی ہے — پاؤں کو مشغلۂ بادیہ پیمائی ہے
آنکھ اس شوخ کے جلوہ کی تمنائی ہے — دل جمالِ رخ پرنور کا شیدائی ہے
درد نے دل میں مرے سب جگہ پائی ہے — خوب تقدیر نے راحت مجھے پہنچائی ہے!
سب غلط دعویٰ اعجاز مسیحائی ہے — تم سے صحت کسی بیمار نے کب پائی ہے؟
دیکھنا چاہتے ہیں طور پہ جا کر ہم بھی — کس قدر ہوش ربا جلوہ رعنائی ہے!
میں ہوں دیوانہ تو سمجھا نہ مجھے اے ناصح! — اہل دانش تجھے کہدیں گے کہ سودائی ہے
دشت وحشت میں نہ بیٹھیں گے تری دیوانے — رہ نما ان کا ہر اک جادۂ صحرائی ہے
یاالٰہی مری دنیا ہی میں پرسش ہو جائے — عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے
پوچھتا ہوں انہیں آئینہ دکھا کر ہر روز — کیا اسی منہ سے تمہیں دعویٰ یکتائی ہے
اس کے ہمراہ جو پھرتا ہے تری زلفوں میں — دل تو دیوانہ ہے کیا شانہ بھی سودائی ہے
اک میری چپ سے ہوا راز نہانی افشا — خاموشی کہتے ہیں جس کو میری گویائی ہے
کنج مرقد میں تو ہر طرح سے ہم خوش ہیں فروغ — غم اگر ہے تو ذرا سا غم تنہائی ہے

دُھن کا پکّا

ازجناب سید احمد صاحب نسیم آبیدر آبادی)

(بہ سلسلہ گذشتہ)

باب پہلا

سین پانچواں

لہستان

(اسپورٹس کا میدان۔ رعایا امرا اور بادشاہ جمع ہیں۔ خالد اور شہزادی بھی شاہ کے قریب متمکن نظر آتے ہیں عمران یہودی اور اس کی بیٹی ایک طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔)

شاہ لہستان۔ اب امید نہیں کہ کوئی اور شخص ہمارے بہادروں کے مقابلہ کے لیئے آئے گا ہمارے چاروں بہادروں میں نارمن نے بہت نمایاں طور پر بہادری دکھائی۔ اور اپنے حریفوں پر شمشیر زنی و نیزہ بازی میں فتح پائی۔ اس کے دونو حریف نو زمین پر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور ایک سخت زخمی ہوا۔ اس لحاظ سے خوبصورتی کی ملکہ کا انتخاب جو اسے تاج پہنائے وہی کرسکتا ہے۔ یہ کون آرہا ہے؟

منتظم اسپورٹس (شاہ کو مودبانہ آداب بجالا کے) شاہ عالیجاہ۔ ایک بہادر جو اپنا نام ظاہر کرنا اور اپنی صورت دکھانا نہیں چاہتا بہادر نارمن سے معرکہ آزما ہونا چاہتا ہے۔

شاہ۔ (حیرت سے) بہادر نارمن سے؟

منتظم اسپورٹس۔ جی ہاں۔

شاہ۔ اور اپنا نام اور صورت بھی ظاہر کرنی نہیں چاہتا۔

منتظم اسپورٹس۔ جی ہاں۔

شاہ۔ اسے یہاں لے آؤ۔

منتظم اسپورٹس مودبانہ تسلیم بجالا کے اس بہادر کو لانے جاتا ہے۔ شاہ اور امراء راستہ

کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھتے ہیں۔ منتظم اسپورٹس ایک شخص کو اپنے ہمراہ لاتا ہے جو سر سے پاؤں تک جوشن میں ڈوبا ہوا ہے)

منتظم اسپورٹس۔ (تعظیم سے تسلیم بجالاکے) یہی وہ بہادر ہے جو نارمن سے مقابل ہونا چاہتا ہے

شاہ۔ کیوں جی تم نارمن سے ہی کیوں لڑنا چاہتے ہو۔ ہمارے منتخب کردہ تین بہادر اور ہیں ان سے قوت آزمائی کرو۔ تم اپنی صورت کے ساتھ نام بھی نہیں بتاتے۔

بہادر۔ جی ہاں سریر آرائے سلطنت اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ امید ہے کہ میں معاف فرمایا جاؤنگا اور نارمن کے مقابلے کی اجازت سے سرفراز فرمایا جاؤں گا۔

شاہ۔ مگر مجھے تمھاری کامیابی کی امید نہیں۔ کسی اور بہادر کو انتخاب کرو۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے کیونکہ تم ایسے قوی ہیکل اور نارمن کی ٹکر کے نہیں ہو۔

ایک امیر۔ شاہ عالم پناہ کا حکم سنو۔ تم نارمن کی ٹکر کے نہیں ہو۔

بہادر۔ (شاہ سے)

دنیا میں میرا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے — اک دوست ہے اے شاہ سو وہ مرد نہیں ہے
مرجاؤں اگر میں تو کوئی غم نہ کرے گا — میت پہ میری کوئی بھی ماتم نہ کرے گا
دنیا میں۔ جو دوست تو پھر لطف ہی کیا ہے — اس طرح کے جینے سے نہ جینا ہی بھلا ہے
اس جنگ میں بالفرض اگر موت ہی آجائے — لے لیگی کوئی ہستی قابل یہ مری جائے

شاہ۔ دیکھو ہم اپنے فرض سے ادا ہو چکے اور تمھیں خبردار کر چکے۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔ کیا کہتے ہو؟

بہادر۔ فدوی لڑے گا۔

(بہادر شاہ کو مودبانہ تسلیم بجالاتا اور منتظم اسپورٹس کے ساتھ دنگل میں آتا ہے۔ نارمن ایک طرف سے نکلتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر تک خاموش دیکھتے ہیں۔ اور پھر دونوں میں نیزہ بازی ہوتی ہے۔ دونوں کے نیزوں کی نوکیں چور چور ہو جاتی ہیں تماشائی تالی بجاتے ہیں اب دونوں میں شمشیر زنی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر ایک ہی وقت میں وار کرتے ہیں۔ نارمن کی تلوار سپر کی مدافعت کی وجہ گمنام بہادر کے شانہ پر اوچھی پڑتی ہے۔ گمنام بہادر کا بھرپور وار نارمن کی سپر اور اس کے خود کو کاٹ کر سر پہ پڑتا ہے نارمن زمین

گرتا ہے ۔ تماشائی ایک اور مرتبہ چیئرز دیتے اور تالی بجاتے ہیں)

شاہ ۔ اس گمنام بہادر کو جلد لاؤ ۔

(منتظم اسپورٹس بہادر کو شاہ کے حضور میں پیش کرتا ہے)

شاہ ۔ ہم تم کو تمھاری کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ۔ اب یہ تاج لو اور خوبصورتی کی ملکہ کو پیش کرو۔ جس کے انتخاب کا حق ہمیں حاصل ہے ۔ وہ ہمیں یہ تاج پہنائے گی ۔

(شاہ گمنام بہادر کو تاج دیتا ہے ۔ بہادر تلوار کی نوک پر اسے لیتا اور آہستہ آہستہ گیلری کی ایک ایک عورت کو دیکھتا ہوا زبیدہ کے پاس آکر ٹھہر جاتا ہے ۔ اور تھوڑی دیر تک بغور دیکھنے کے بعد تاج اس کے قدموں پر ڈال دیتا اور مودب کھڑا ہو جاتا ہے ۔ شہزادی اپنی کرسی سے اٹھتی اور تاج لیتے ہوئے اُس کی طرف بڑھتی ہے ۔

شہزادی ۔ معزز بہادر ۔ میں تمھیں تہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں ۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ میرے ہاتھ سے تاج پہننے والا معزز بہادر کون ہے ؟

منتظم اسپورٹس ۔ تاج پہننے کے لئے آپ کو خود اتارنا پڑے گا ۔

بہادر ۔ براہ کرم میرا خود نہ اُتاریئے ۔

شہزادی ۔ تاج پہنانے کے لئے بڑھتی ہے ۔ مگر بہادر لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر گرتا ہے ۔ منتظم اسپورٹس جب خود وغیرہ اتارتا ہے تو جمیل کی صورت دیکھتے ہی شہزادی دونوں ہاتھوں سے دل تھامی ہوئی گرنے کے قریب نظر آتی ہے ۔

دوسرا باب

سین پہلا

(ایک کمرہ جس میں ایک پلنگ پر جمیل سو رہا ہے ۔ قریب میں ایک اسٹول پر دو تین دوا کی شیشیاں ایک گلاس کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں ۔ ربیعہ جمیل کے کمرے میں داخل ہوتی اور اس کے پلنگ کے قریب آتی ہے اور اس کو نہایت محبت اور والہانہ نظر سے

دیکھتی ہے اور پھر اس کے منھ کے قریب اپنا منھ لیجا کر چاہتی ہے کہ اس کا بوسہ لے مگر
پھر کسی خیال سے ہٹ جاتی ہے)

ربیعہ ۔ کیا موہنی صورت اور کیا پیارا چہرہ ہے ۔ کاش اس کو بھی مجھ سے محبت ہوتی ۔ مگر افسوس اسکے دل کی تو کوئی اور مالک ہے ۔ اور وہ مجھ سے محبت بھی کیوں کرے ۔ کجا میں ایک یہودن اور کجا وہ ایک مسلمان ۔ مجھے وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تف ہے مجھ پر کہ یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کی محبت کا دم بھروں ۔

(گانا ربیعہ کا)

ستم پیشہ جفا جو کو دیا دل ∴ الٰہی آ گیا کس پہ مرا دل
یہودن میں مسلماں وہ غضب ہے ∴ پھنسا بھی تو کہاں جا کر پھنسا دل
کسی مغرور کافر سنگدل پہ ∴ نہ آنا تھا نہ آنا تھا مرا دل
لگا کر آگ سارے تن بدن میں ∴ کہاں چھوڑا مجھے او بیوفا دل

(عمران آہستہ آنا اور ایک گوشے میں کھڑا ہو کر ربیعہ کا گانا سنتا ہے ۔ گانا ختم کرتی ہے تو بیٹی کے پاس آتا اور اس کو اپنے گلے سے لگاتا ہے)

عمران ۔ بیٹا تم ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو جو اپنے کفو کا نہیں ، جو اپنے قبیلے کا نہیں ، جو اپنی قوم کا نہیں ۔ وہ مسلمان ہے تم یہودن ہو ۔ وہ بے خانمان ہے تم صاحب سامان ہو ۔ اس کا خیال اپنے دماغ سے نکالدو ۔ اس کی ہوس اپنے دل سے دور کردو ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کی محبت میں روز بروز گھلی جا رہی ہو ۔ اگر یہی حالت رہے تو بس ہماری زندگی ہو چکی ۔

ربیعہ ۔ آہ ابا ۔ ابا !

عمران ۔ (بیٹی کو گلے سے لگا کر) بیٹا نوجوانی میں دل و دماغ میں ایسے ہی خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اور کام نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کا بسیرا ہوتا ہے ۔ اس سال تمھاری دل بہلائی کے لئے شام و دمشق کی سیاحت کریں گے دیکھو وہ بیدار ہو چکا ۔

(جمیل بیدار ہونا اور انہیں دیکھ کر خراماں خراماں ان کے پاس آتا ہے)

عمران ۔ نوجوان محسن ۔ ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہیں کہ اب آپ مثل سابق کے تندرست اور توانا

ہوتے جارہے ہیں ۔

جمیل ۔ یہ بالکل سچ ہے ۔ اب تو میری صحت مجھے پہلے سے بھی بہتر نظر آتی ہے جس کی وجہ اپنے بوڑھے دوست اور پیاری بہن ربیعہ کی تیمارداری اور توجہ ہے ۔ جس کے لئے میں آپ کا اور پیاری ربیعہ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے ۔

ربیعہ ۔ (سائڈ میں) پیاری ربیعہ !

جمیل ۔ آپ کی ہمدردی کا میں شکرگزار ہوں ۔ ایسے وقت جب کہ ایک گمنام زخمی کا کوئی پرسان حال نہ تھا آپ نے اپنے اوپر تکلیف گوارا کی اور اس کی تیمارداری کی ۔

عمران ۔ پیارے دوست ہمیں اس گفتگو سے شرمسار نہ کرو ۔ اور ہماری ناچیز خدمت کی ستائش سے ہم کو زیربار نہ کرو ۔ ہم آپ کے شرمندہ احسان ہیں ۔ یہ آپ ہی کا طفیل ہے جو میں اور میری بیٹی یہاں ہیں ورنہ معلوم نہیں اس ظالم کے ہاتھوں ہمارا کیا حشر ہوتا ۔ معلوم نہیں میری بیٹی کہاں رہتی اور میں کدھر رہتا ۔ آپ کی اس بیش بہا خدمت کے مقابلے میں تو ہماری خدمت عشر عشیر نہیں ۔

جمیل ۔ خیر صاحب ۔ اب اس ذکر کو جانے دیجئے ۔ اور مطلب پر آئیے ۔ اب چونکہ میں اچھا ہو گیا ہوں اس لئے اپنے معزز میزبانوں سے آج شام کو مرخص ہوں گا ۔

عمران ۔ نہیں نوجوان دوست آج نہ جاؤ ۔ دو چار روز اور آرام لو ۔

ربیعہ ۔ ہاں صاحب ذرا طبیعت کو اچھی طرح سے سنبھل جانے دیجئے اور پھر اس کے بعد آپ روانہ ہو جائیے ۔ ابھی آپ اس قابل نہیں کہ کہیں سفر کریں ۔

جمیل ۔ مجھے چند ضروری کام ہیں اس لئے میرا جانا ضروری ہے ۔

عمران ۔ کہاں کا ارادہ ہے

جمیل ۔ مقدونیہ ۔

عمران ۔ جب ایسی بات ہے تو پھر آپ کے سفر کا بندوبست کرتے ہیں ۔ (جانا عمران اور ربیعہ کا)

جمیل (آپ ہی آپ سے) معلوم نہیں زبیدہ کس حال میں ہے ۔ حالات تو کچھ سنبھلتے نظر نہیں آتے ۔

(باقی)

برنس اپنی شاعری پر

(شاعر کا خود نوشت دیباچہ)

رابرٹ برنس (۱۷۵۹ - ۱۷۹۶) اسکاچستان کے ایک معمولی کسان کا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی بخوبی تعلیم نہ ہو سکی۔ اور اس کو ادب عالیہ اور دیگر علوم سے بے بہرہ رہنا پڑا۔ اس کا مطالعہ غالباً اسکاٹ لینڈ کے چند غیر معروف شعرا کے کلام تک محدود تھا لیکن اس میں شاعری کا فطری جوہر موجود تھا۔ اسکی اکثر نظمیں ترانے اور زمزمہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک نقّاد نے لکھا کہ برنس کا کلام پڑھکر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ "شاعری دل سے نکلتی اور دل میں پہنچتی ہے"۔

وہ غالباً اسکاچستان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے ہموطنوں نے بھی اس کی قدردانی کی۔ اس کا کلام آج تک ہر دلعزیز و مقبول ہے۔ اس کو وہاں کا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری کی تاریخ میں بھی برنس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عہد مرور (جب کہ ادب عالیہ در اصل کی جگہ خیالی شاعری نے لے رکھی تھی) کے شعرا میں برنس کو ایک خاص اور امتیازی حیثیت ہے چنانچہ اس نے متقدمین شعرا مثلاً اسکاٹ ورڈسورتھ اس کے خوشہ چیں و مدّاح رہے۔

اس نے اپنے کلام کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ (جبکہ اسے شہرت و امتیاز ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا) ایک دیباچہ منسلک کیا تھا جو ادبی مذاق کے حضرات کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہم اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حسب ذیل فرومایہ نظمیں اس شاعر کی کاوشیں نہیں جو تعلیم و تربیت سے مستفید ہو چکا ہو یا شاید اعلیٰ زندگی کی آسائش و فرصت سے فائدہ اٹھا کر تھیوکریٹس اور ورجل کی پیروی میں دیہاتی

مضامین کی تلاش کرتا ہو۔ مصنف ہذا کے لئے یہ مشہور عالم شعراء راز سربستہ ہی رہے۔ اصولوں کے تحت شاعری شروع کرنیکے لوازمات سے محروم ہونیکے باعث وہ ان جذبات اور اطوار کا راگ اپنی مادری زبان میں گاتا ہے جن کو اس نے خود محسوس کیا یا اپنے گردوپیش کے دیہاتی ساتھیوں میں دیکھا۔ صغرسنی سے یا کم از کم اپنے جذبات لطیف کے ابتدائی ہیجان ہی سے وہ شعرگوئی میں مصروف رہا۔ لیکن حال ہی میں احباب کی ستائش دیا غالباً ان کی طرفداری جرات آموز ہوئی اور اس کو خیال ہوا کہ خود میں جو کچھ قدر و جوہر ہے اس کو ظاہر کرے۔ تاہم ان میں سے کوئی نظم بھی پریس کو بھیجے جانے کے ارادہ سے نہیں لکھی گئی تھی شاعری سے دلبستگی میں اس کے مقاصد یہ تھے کہ کٹھن زندگی کی محنت و مشقت کے دوران میں اپنے تخیل کی چھوٹی مخلوق سے سرور حاصل کرے۔ اپنے مختلف جذبات یعنی محبت، غم، امید و بیم کا خاکہ کھینچے اور دنیا کے مصائب کے درمیان اپنا ایک ذریعہ تسلی تراش لے اور اس کے ساتھ اس کا یہ عقیدہ رہا کہ شاعری آپ اپنا صلہ ہے۔

اب وہ ایک مصنف کی حیثیت سے پبلک کے سامنے آرہا ہے مگر اس کام میں اسے خوف اور اندیشہ ہے بیت گو قبیلہ میں شہرت بہت عزیز رہی ہے اس لئے مصنف ایک غیر معروف و گمنام شاعر ہونے کے باعث اس خیال سے اندیشہ مند ہے کہ کہیں اس پر بھی گستاخ، احمق اور یاوہ گو ہونے کا الزام نہ لگایا جائے اور اس کے متعلق یہ خیال نہ کیا جائے کہ بحروں کی توڑ جوڑ اور قافیہ پیمائی سے واقف ہو کر خود کو شاعر تصور کرنے لگا۔

شاعر شنٹون کا قول ہے کہ "فروتنی نے بہت سے ذکی اشخاص کو تارک الدنیا بنا دیا لیکن کسی کو شہرت عطا نہیں کی" اگر کوئی نقاد لفظ "ذکی" پر بگڑے تو مصنف اس سے یہ کہے گا کہ وہ خود کو چند شاعرانہ قابلیتوں سے معمور سمجھتا ہے ورنہ اس کا اس طریقہ سے اپنے کلام کا شائع کرنا نہایت ہی ذلیل فعل ہوتا۔ لیکن وہ یکساں خلوص سے اس کا بھی اظہار کرتا ہے کہ اس کی بہترین کاوشوں میں رامزے و فرگوسن جیسی ذکاوت و بلند خیالی نہیں پائی جاتی متذکرہ دو شعراء کو اس نے اکثر زیر مطالعہ رکھا لیکن اس کا مقصد غلامانہ پیروی نہیں تھی بلکہ اپنا چراغ روشن کرنا منظور تھا۔

چندہ دہندگان کی خدمت میں مصنف اپنے پرخلوص شکریے بھیجتا ہے یہ اسپنے اصرا ف کے سامنے رسمی کورنش نہیں بلکہ ایک شاعر کے گرم دل کی احسان مندی ہے جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ ان کی فیاضی و محبت نے اس کو اعتبار و شہرت کا موقع دیا جس کی خواہش ہر شاعر کے پہلو میں ہوتی ہے اپنے قارئین سے دو بالخصوص فاضل و شائستہ اصحاب سے جو اس کے کلام کو پڑھ کر اس کی عزت افزائی کریں گے۔ اس کی یہ استدعا ہے کہ تعلیم و تربیت اور ماحول زندگی کی رعایت پیش نظر رکھیں لیکن اگر ایک منصفانہ و غیر جانب دارانہ تبصرہ کے بعد اس کے کلام کے متعلق گمراہی و بیہودہ گوئی کا الزام عاید ہو تو اسپنے حال پر چھوڑ دیں اور بلا تامل و رحم نفرت و فراموشی کے حوالہ کر دیں۔

(ترجمہ) ـــــــ از سید شاہ محمد بی اے عثمانیہ)

دنیا کے شاہکار افسانے

مرتبہ مولوی عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی مصنف دنیائے افسانہ وغیرہ جو دکن کے چھ انشاپردازوں کی کوششوں کا شاندار نتیجہ ہے۔ چودہ حصوں میں شائع ہوا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان کو ہندوستان کی تمام زبانوں پر اور دنیا کی اکثر زبانوں پر فوقیت حاصل ہو رہی ہے اس کے بعد اردو میں کسی اور افسانوں کے مجموعہ کی ضرورت نہیں دنیا کی تمام زبان اور دنیا کے تمام افسانہ نگاروں کے بہترین شاہکار مختصر قصوں کا تاریخی تنقیدی اور سوانحی مجموعہ ہے جو ایک سو سے زائد قصوں پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ وجہ کی نہایت بہترین قیمت صرف ؎؎

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

عروجِ فکر

از

جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہاں پوری

اللہ اللہ یہ حجاب کا رنگ! — روکشِ مہر ہے نقاب کا رنگ

اے تری شان یہ نقاب کا رنگ — زرد ہوتا ہے آفتاب کا رنگ

کس قدر شوخ ہے شباب کا رنگ — عرق رخ میں ہے شراب کا رنگ

[illegible] شباب کا رنگ — کہ تصور میں ہے حباب کا رنگ

پرتو عارضِ درخشاں سے — آفتابی ہوا نقاب کا رنگ

لذتِ عشق اسی نے پائی ہے — جس نے دیکھا ہو کچھ عتاب کا رنگ

دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی — کیوں نہ اشکوں میں ہو شہاب کا رنگ

چھوٹ نکلا ہے دیدۂ تر سے — گلشنِ دل کے التہاب کا رنگ

گرمیِ حسنِ عالم آرا سے — اور کچھ ہو گیا نقاب کا رنگ

چشمِ باطن سے دیکھ اے کوکب!
ذرہ ذرہ میں آفتاب کا رنگ

مجلہ مکتبہ

۶۱

تنقید

جلد ۵۱ شمارہ ۵۱۵

بڑی بی | تقطیع کراون۔ مطبوعہ مطبع کریمی، لاہور۔ ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو بازار بارود خانہ لاہور قیمت ۱۲/

یہ ام، اسلم صاحب کی چار کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ میاں اسلم ادبی حلقوں میں اپنی کثیر مصنفات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ ان چند اردو مصنفین میں سے جنہوں نے بچوں اور عورتوں کی اصلاح مختصر قصوں کے ذریعہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایک درجن سے زیادہ مطبوعے اسلم صاحب کے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ بڑی بی اس قسم کا تازہ ترین مجموعہ۔ اس میں حسب ذیل قصے ہیں (۱) بڑی بی (۲) سہاگن (۳) رضیہ (۴) وہ بھی سچے۔

اسلم صاحب کے قصے کئی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اس مختصر سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہیں جس کا مطمح نظر بچوں اور عورتوں کی معاشرتی اصلاح ہے۔ دوسری طرف قصے کی اور تیسرے لطف زبان کی بدولت یہ بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

بچوں اور عورتوں بلکہ معمولی نوشت و خواند سے واقف عوام کی اصلاح تمدن کے لئے قصے سے بہتر، زیادہ مقبول اور موثر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ متمدن زبانوں میں قصہ، اس خدمت پر عرصہ سے مامور ہے۔ اس لئے اس مسلم تجربہ سے ہمیں زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھانا چاہیئے۔

بڑی بی کے چاروں قصے یکساں دلچسپ اور نسائی کرداروں کی وجہ سے زبان کی لطافت سے بھی خالی نہیں ہیں میاں اسلم کے اکثر قصوں کی طرح، ان چاروں قصوں کے کردار بھی اسلم صاحب ہی کی طرح جدید تمدن کی سلامت رو ہستیاں ہیں۔ اس طرح کے رہبروں کی ہمارے بچوں ہماری عورتوں بلکہ خود ہم کو بھی سخت ضرورت ہے۔ مصنف نے ہماری کورانہ تقلید کی خامیاں، غلط فہم، غلط روئی روشنی کے موئدین ہرزہ کاریاں ہر قصے میں قصے ہی سے نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کی ہیں۔ اس طرح کے قصوں میں موعظانہ کیفیت کے پیدا ہو جانے کا ہمیشہ ڈر لگا ہوا ہے۔ چنانچہ حافظ نذیر احمد کے اکثر قصے جیسے توبۃ النصوح کے بعض مقامات، فسانہ کے کردار عادت کی نصیحتیں اس سقم سے قطعی خالی نہیں ہیں۔ لیکن اسلم صاحب نے اپنی طرف سے کوئی مشورہ نہیں دیا پھر بھی ہم قصوں کو پڑھ کر سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔

اس طرح کے ادب کی اردو کے لئے بہت ضرورت ہے۔ اس لئے ہم میاں اسلم صاحب کی اس تازہ تصنیف کے مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور آئندہ کے لئے ان کی پختہ خیالی کے مزید کارناموں کے متوقع ہیں۔



چاند، مردانہ دنیا ہی کا چاند نہیں بلکہ زمانہ دنیا کا بھی چندرمان ہے۔ چاند ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی سہیلی، ہمجولی، اور گوئیاں ہے۔ چاند میں عالم نسواں کی اعلیٰ خوبیوں پر، نسوانی سدھار و فلاح پر، ان کے حقوق کے وکالت پر، انکے فوائد و بہبود پر بہترین مضامین شایع ہوتے ہیں چاند نسوانی اخلاق کا ترجمان، تربیت اولاد کا رہنما، قومی سدھار میں استریوں کی امداد کا ڈنکا پیٹنے والا، اور مہیلاؤں کی ترقی کا آرگن ہے۔ چاند ادبی، خانگی، تاریخی، صنعتی، علمی، اصلاحی۔ اور معاشرتی مضامین، اور بہترین مضامین کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تصاویر کی کثرت کے اعتبار سے ایک تصویری البم ہے اور اردو زبان۔ عام ملکی اردو زبان۔ اور صاف و نکھری اردو زبان میں۔ بڑی آب و تاب سے ہر ماہ کی ۱۵ پندرہ تاریخ تک شائع ہوجاتا ہے۔ کاغذ و چھپائی نہایت نفیس، لکھائی عمدہ۔ ترتیب اعلیٰ۔ اور ضخامت سب اردو رسالوں سے بالا ہوتی ہے۔ اس کی خوبیاں اگرچہ مقبول عوام ہو چکی ہیں لیکن نمونہ دیکھنے کی اور بات ہے۔ یہ کہنا بے سود ہے کہ نمونہ دیکھکر آپ کیا کریں گے؟ بالیقین مستقل معاون بنجائیں گے۔

نمونہ کا پرچہ ایک ماہ تک مفت، آئندہ ایک روپیہ رونمائی دینے سے حاضر کیا جائے گا۔

ایڈیٹر۔ منشی کنھیا لال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی۔ ایڈوکیٹ۔ الہ آباد۔

نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران کرالیجیے

چندہ سالانہ	آٹھ روپے
ششماہی	پانچ روپیہ
فی جلد	ایک روپیہ

چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی کا وسیلہ معقول ہے مفصل کیفیت کے لیے منیجر دفتر چاند (اردو ایڈیشن) چندر لوک، الہ آباد سے دریافت کیجیے ٹیلیفون ۲۰۵۶
تار کا پتہ "چاند" (خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور دیگر ایڈیٹوریل مضامین کی بابت مراسلت بنام ایڈیٹر "چاند" اردو ہونا چاہیے)

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ

کے

تازہ ادبی تحفے

اردو شہ پارے جلد اوّل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم، اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) (۱) تاریخ اردو ادب قدیم۔ (۲) اردو نظم و نثر کے جواہر پارے۔ (۳) ہر دور کے مصنفین کے علمی کارنامے۔ (۴) قدیم و متروک الفاظ کا فرہنگ۔ (۵) مشاہیر قدیم کے تصاویر۔ لکھائی چھپائی بہتر۔ کاغذ فیدرویٹ۔ ضخامت (۴۰۰) صفحہ قیمت (۱۲/۔) مجلد

ارباب نثر اردو:۔ مؤلفہ سید محمد ایم، اے (عثمانیہ) (۱) انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کی تاریخ (۲) فورٹ ولیم کالج کے مساعی جمیلہ کا تذکرہ۔ (۳) اردو نثر نویسوں کے حالات۔ (۴) اردو نثر کی کتابوں پر تنقید و تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی ضخامت (۳۲۰) صفحہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عالی) مجلد

دنیائے افسانہ حصہ اول مؤلفہ عبدالقادر سروری ایم، اے، ال ال بی (۱) تاریخ افسانہ نگاری (۲) اصول و مبادیات افسانہ نویسی۔ اردو افسانوں پر تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی ضخامت (۲۱۸) صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عہ)

افسانہ و کردار یعنی دنیائے افسانہ حصہ دوم مؤلفہ عبدالقادر سروری ایم، اے، ال ال بی، (۱) اشخاص قصہ اور ان کی افسانوی اہمیت۔ (۲) افسانوں کا میعاد (۳) اردو کے چند بہترین اشخاص قصہ پر تنقید و تبصرہ۔ بہترین لکھائی چھپائی ضخامت (۲۳۲) صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت (عہ) مجلد

گلشن گفتار مرتبہ سید محمد۔ ام۔ اے (عثمانیہ) (۱) زمانہ قدیم سے لے کر میرؔ و سوداؔ کے عہد کے شعرا کا تذکرہ۔ (۲) قدیم اردو شاعری پر ایک نظر۔ (۳) اسالیب شعری، ان کی مقبولیت (۴) اردو تذکرہ نویسی پر دلچسپ بحث۔ لکھائی چھپائی عمدہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت (۱۰۰) صفحہ قیمت (۱۲/)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

اردو شہ پارے

پر

(۱)

جسٹس سر سلیمان جج عدالت عالیہ الہ آباد
کی رائے

ڈاکٹر محی الدین قادری کی "اردو شہ پارے" اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اپنے موضوع اور عام ترتیب دونوں حیثیتوں سے یہ کتاب نہایت عمدہ ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اردو خواں پبلک اس کتاب کو ضرور پسند کرے گی ۔

(۲)

ڈاکٹر عبد الستار صدیقی ام۔اے۔ پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ الہ آباد
کی رائے

مجھے کتاب کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ باوجود اور مشاغل کے مصنف نے اس کام کے لئے بھی فرصت نکال لی ۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر محی الدین زور ایسی بہت سی مفید کتابیں شایع کریں ۔ جامعہ عثمانیہ کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ اس کے طلبہ تصنیف و تالیف کا کام خوش اسلوبی اور خوش ذوقی کے ساتھ کرتے رہیں ۔

کتاب نہایت خوب ہے اور اردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے امید ہے کہ باقی حصے بھی جلد چھپیں گے ۔ ڈاکٹر زور نے اپنے ذمہ کا کام بہت اچھی طرح انجام دیا ہے انہوں نے محنت اور کاوش کے ساتھ یہ شہ پارے مرتب کرکے اردو پر احسان کیا ترتیب اور انتخاب بہت ہی اچھا ہے ۔ کتابت و طباعت بہترین قیمت فی جلد مجلد ۔ لے ۱۲/

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

جلد (۱) شمارہ ۵

[illegible]

وجیپال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اس کو سالہا سال کے تجربے اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ درد سر درد سول بچھو کے زہر کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔ **نوٹ** ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

زندہ طلسمات

جس کی باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکما اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے حسب ذیل امراض پر آناً فاناً تیر طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ پلیگ بخار ہچکی متلی کھانسی دمہ بواسیر خارش سانپ بچھو کے زہر اور ہمہ اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشہ نمبر (۱) [illegible] نمبر (۲) [illegible] نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا۔ پتہ خط و تار کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد

مجلّہ مکتبہ

جلد (٥)　　بابتہ ماہ آبان ۱۳۳۹ف م ستمبر ۱۹۳۰ء　　شمارہ (٦)

تصویر علامہ بحرالعلوم سید اشرف شمسی مرحوم

فہرست مضامین

شذرات

اس نمبر پر مجلہ مکتبہ کی پانچویں جلد ختم ہوتی ہے اور بحمد اللہ وہ اگلے نمبر سے چھٹی شش ماہی میں قدم رکھے گا۔ اس ڈھائی سال کی مدت میں حیدرآباد سے متعدد رسالے اجرا ہوے مگر ناموافق حالات اور ناکافی خیر مقدم نے انہیں ختم کر دیا اور وہ کسی طرح پروان چڑھنے نہیں پائے۔ ارباب صحافت نیز ان حضرات سے جو رسالے کی اشاعت واجرا کے کاموں سے واقفیت رکھتے ہیں، یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ حیدرآباد کے موجودہ حالات میں علمی رسالے کا چلانا کس قدر دشوار ہے ہمیں اس کام میں جتنی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں، ان کا اظہار کئی بار کر چکے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب تک ہم نے ہمت نہیں ہاری اور برابر کوشش کیے جا رہے ہیں۔ کئی مشکلات پر ہمیں غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور مستقبل قریب و بعید میں بھی امید کی جا سکتی ہے کہ ہماری مساعی بالکل نامشکور نہیں رہینگی

مکتبہ ابراہیمیہ پندرہ سال سے ملک کی جو علمی خدمت انجام دے رہا ہے اس سے اب تقریباً سارا ملک واقف ہے۔ حال ہی میں "دنیا کے شاہکار افسانے" کا جو مفید سلسلہ شروع کیا تھا اس کے اس وقت تک دو حصے (۱) قدیم افسانے (۲) چینی اور جاپانی افسانے، شایع ہو گئے ہیں عنقریب اور دو حصے شایع ہونے والے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اور بلند پایہ علمی اور تعلیمی کتابیں زیر طبع ہیں۔ ان میں سے اس وقت صرف ایک کتاب کا ذکر ہم اپنے قارئین کے لیے کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو کے کل مقدمات کا مجموعہ ہے۔ مولوی صاحب اپنے اسلوب بیان کے علاوہ ٹھوس علمی مقدمات لکھنے میں جو شہرت رکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس مجموعے میں مذہب و سائنس، تاریخ و تذکرہ، ادب و زبان کے (۲۰) مقدمات ہیں۔

مولانا سید اشرف شمسی سابق پروفیسر فارسی کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے

وہ فقید العصر عالم تھے کہ نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان میں بھی بہت کم عالم ان کے پایے کے ہوں گے۔ مولانا ایک عالم مگر متوکل خاندان میں پیدا ہوئے۔ یتیمی و فلاکت میں تحصیل علوم وفنون کی اور فارغ التحصیل ہو کر جاہ و منصب کی بجائے علم کی شمع برداری اور فخر و غنا کو اپنا شعار بنایا۔ زمانہ طالب علمی سے درس و تدریس کا کام شروع کیا اور آخر عمر تک اسی مشغلے میں زندگی بسر کی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک ہو گی۔ مولانا نہ صرف جامع علوم وفنون بزرگ تھے بلکہ فارسی کے بہت بلند مرتبہ شاعر بھی تھے۔ ایک مدت مدید تک حیدر آباد کو اپنے فیوض و برکات علمیہ سے سیراب کر کے چند ہی مہینے ہوئے کہ مولانا نے اس دنیا سے انتقال کیا اور اپنی مسند علم خالی چھوڑ گئے۔ اس نمبر میں مولانائے مرحوم کے متعلق جو مضامین اور نظمیں شایع کی جا رہی ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ ان کا تبحر عظمت اور شعر و شاعری کس درجہ کی ہے۔؟

حیدر آباد میں اردو صحافت روز بہ روز ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اگرچہ گزشتہ تین چار سال میں کئی ہفتہ وار اور روزانہ اخبار جاری ہو کر بند ہو گئے۔ تاہم صحیفہ نگار افراد اس ناکامی سے پست نہیں ہوئے۔ بعض مستقل مزاجی سے کوشش کیے جا رہے ہیں۔ نئی کوششوں میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب رئیس (عثمانیہ) کی مساعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رئیس صاحب نے منشور نامی ایک روزنامہ جاری کیا ہے اور بڑے سلیقہ اور کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اپنے مندرجات و مضامین کی وجہ سے ان کا اخبار باوجود اس کے کہ اُسے جاری ہوئے ابھی دو تین مہینے بھی نہیں ہوئے مگر بڑی ہر دلعزیزی پیدا کر رہا ہے۔ ایسے سرگرم اور پرجوش ارباب صحافت سے جیسے کہ اس وقت اس میدان میں سرگرم جد و جہد ہیں، امید کرنی چاہیئے کہ حیدر آباد کی صحافت کا مستقبل بہت شاندار ہو جائے گا۔

ادارۂ چاند (الہ آباد) سے ایک ہفتہ وار سماجی سیاسی اخبار ہندی زبان میں شایع ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ یہ پرچہ مصور ہوگا اور قوم کی سماجی اصلاح اور سیاسی بلند آہنگیوں کے مضامین و مقالات شایع کرے گا۔ رسالہ چاند اپنے عام پسند مضامین اور رنگ

برنگ کی تصویروں اور نسوانی دلچسپی کی چیزوں سے جس قدر قبولیت حاصل کر رہا ہے، اس کے مدنظر کارکنان چاند نے جو نئی تجویز سوچی ہے امید ہے کہ وہ اسی طرح شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کریگی۔ (اخبار کا نام "بہادر یتے") جز

اس نمبر میں ہم نواب ضیار یار جنگ بہادر (علامہ مفتی نور الضیار الدین صاحب) کی ایک فارسی غزل شایع کر رہے ہیں۔ نواب صاحب معز علامہ شمسی مرحوم کے ہم درس و ہم مذاق ہیں۔ باوجود جاہ و منصب کے آپ علم و فضل کی جس مسند پر متمکن ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم اس غزل کے لیئے جو بطور خاص ہمیں مرحمت فرمائی گئی ہے، نواب صاحب معز کے ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئیندہ بھی ان کی عنایات اسی طرح "مکتبہ" پر مبذول رہیں گی۔

عام طور پر تمام علم دوست حضرات اور بالخصوص بہی خواہان جامعہ عثمانیہ و اہل ملک اس اطلاع سے مسرور ہوں گے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبۂ قدیم نے حیدرآباد میں ایک مجلس علمیہ عثمانیہ (عثمانیہ اکاڈیمی) قایم کی ہے۔ یہ انجمن تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ کی تصانیف و تالیفات، افکار و خیالات کو منظر عام پر لانے اور عام اہل ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرانے کے لئے افاضل کی تقریروں وغیرہ کا ایک زبردست لایحہ عمل اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وقت چند پرجوش طیلسانیوں کے ہاتھوں اس کی ابتدا ہوچکی ہے اور اس کا دایرہ عمل بھی زیادہ وسیع نہیں ہوا ہے تاہم جامعہ کے فیض یابوں کی ملک میں کمی نہیں اور عنقریب ہمیں اس کی توقع ہے کہ اس کا حلقہ امکان وسیع ہوجائے گا اور طیلسانیین عثمانیہ اس مرکز پر جمع ہوجائیں گے۔ اس انجمن نے قلیل سے سرمایے سے اپنا کام شروع کردیا ہے اور بہت قریب میں اس کا ابتدائی کام جو آیندہ کاموں کا نمونہ اور پیش خیمہ ہوگا، پبلک کے آگے آجائے گا۔



علامہ بحر العلوم سید اشرف شمسی مرحوم
(سابق مددگار پروفیسر فارسی کلیہ جامعہ عثمانیہ)

اسلام میں فلسفہ کا نشو و نما

از

جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل

فلسفہ اسلام سے پہلے ابو سہل بن نوبخت نے اپنی کتاب نہمطان میں لکھا ہے کہ جم بن اونجہان کے عہد سے بہت زمانہ پیشتر فلسفہ نے بہت ترقی کی تھی مگر اس ترقی کے بعد بعض نسلوں کی سہل انگاری اور لاپروائی کی وجہ اس میں تنزل پیدا ہو گیا تھا۔ جم ابن اونجہان کے عہد میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفہ کی طرف توجہ کی اور اس کے ہر شعبے کو بڑی کدو کاوش سے کتابوں کی صورت میں ترتیب دیا اسکے بعد ضحاک بن قے نے فلسفہ کو ترقی دی اور اس نے مشتری کے نام سے ایک شہر آباد کیا جہاں اس نے بروج سماوی کی تعداد کے مطابق بارہ (۱۲) محل تیار کروائے اور کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کر کے اس شہر میں علما و فلاسفہ کو بسایا۔ عوام الناس غیر معمولی قابلیت کی وجہ ان فلاسفہ کے بڑے معتقد رہے۔ اسی زمانہ میں ایک نبی مبعوث ہوے تھے جن سے اکثر فلسفیوں نے انکار کیا اور بعض ان کے موافق بھی ہو گئے اسی وجہ سے آپس میں تفریق پیدا ہو گئی اور ہر فلسفی ایک شہر کا بادشاہ بن بیٹھا۔ انہی فلاسفہ میں ہرمس نامی ایک مشہور فلسفی تھا جو مصر پہنچ کر وہاں کا بادشاہ بن گیا یہ علم کیمیا کا موجد ہے اس نے اس فن میں متعدد کتابیں لکھیں اور اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کی وجہ تھوڑے ہی عرصہ میں مصر کو سرسبز و شاداب بنا دیا اور وہاں کے باشندوں کی ہر طرح سے اصلاح کر کے ان کے دماغوں کو تعلیم سے روشن کر دیا۔

ولادت مسیح سے تقریباً پانچ سو سال پہلے یونان نے اولمپس کی پرستش کو خیر باد کہہ کر فلسفہ میں بڑی ترقی کی تھی اور مذہب کے قید و بند سے آزاد ہو کر فلسفہ ہی کو اپنا معتقد علیہ بنا لیا تھا چنانچہ فیثا غورث اور سقراط وغیرہ اسی عہد کے مشہور فلاسفہ ہیں جنہوں نے ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں قابل قدر ترقی کی تھی۔ ۳۳۴ قبل مسیح میں سکندر یونانی نے مقدونیہ سے نکل کر ایران پر فوج کشی کی۔ دمشق۔ بابل، شام اور مصر وغیرہ کو اپنی حیرت انگیز شجاعت کے ذریعہ فتح کیا۔

بابل، بڑا قدیم اور آباد شہر تھا ایک زمانہ میں اس کی فصیل کا دور جس کی بلندی (۸۰) فیٹ تھی

(۶۰) میل سے زیادہ تھا اس سرزمین میں فاضل علما و فلاسفہ تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی حکمت و دانش سے فضا میں دو معلق باغ تیار کئے تھے اور ان کو کلوں کے ذریعہ دریا کا پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہیں دنیا کی وہ نادر سرنگ تھی جس کے ذریعہ دریائے فرات کے نیچے سے آمد و رفت ہوتی تھی۔ یہیں سے ارسطو کے بھتیجے کیلستھنیز کو (۱۹۰۳) سال پہلے کے کلدانیوں کے مشاہدات اجسام فلکی سے متعلق آلات رصد ملے جن کو اس نے ارسطو کے پاس روانہ کر دیا۔ یہیں سے بطلیموس کو ایک جدول ہاتھ آئی تھی جس میں (۷۴۷) سال قبل مسیح سے اس وقت تک کے مشاہدات کسوف و خسوف کے نتائج موجود تھے۔

بعل وہ شہر ہے جو علم و حکمت میں مشہور تھا اس کے بلند مندر کی چھت پر وہ رصدگاہ تھی جس میں کالدیہ کے ہیئت داں اختر شماری کرتے تھے۔

اصطخر، بلحاظ علوم و فنون ان سب سے زیادہ قابل ذکر ہے جہاں سنگ مرمر کے کتب خانے اور ایسی نادر الوجود عمارتیں تھیں جن میں کندہ کاری، صناعی، مینا کاری اور دیگر علوم و فنون کے بہترین نمونے محفوظ تھے۔ یہیں بادشاہان ایران کے موسم گرما بسر کرنے کا مقام تھا جس کے اطراف سبعہ سیارہ کی نجومی مناسبت سے مجلا پتھر کی سات فصیلیں تھیں۔ مختصر یہ کہ سلطنت ایران حیرت افزا آثار اور عظیم الشان علوم و فنون کا مخزن تھی۔ ان ممالک کو فتح کرنے کے بعد سکندر نے یہاں کے تمام علوم و فنون کو یونانی زبان میں ترجمہ کرا کے تقریباً ان تمام عمارتوں اور کتابوں کو جو قدیم فارسی زبان میں تھے نیست و نابود کر دیا۔

فارس کے بادشاہوں نے زردشت و جاماسب کے عہد میں فلسفہ و دیگر علوم کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا زردشت و جاماسب نے غلبہ سکندری کی پیشین گوئی کر دی تھی اس لئے ان بادشاہوں نے بنظر تحفظ اس علمی ذخیرہ کو چین و ہندوستان میں منتقل کر دیا تھا۔ سکندر کی جنگ کے بعد بابل کی حالت بالکل خراب ہو گئی تھی ایک عرصہ تک یہاں طوائف الملوکی پھیلی رہی۔ بالآخر اردشیر بابکان ساسانی بابل کا بادشاہ ہوا اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کی حالت درست کر لی۔ اس کے بعد چین و ہندوستان کی کتابوں کو واپس منگوا لیا اور اکثر لوگوں کو روم بھیجکر ان کتابوں کی نقلیں منگوائیں جن کو سکندر بابل سے ترجمہ کروا کر لے گیا تھا اس طرح جو علوم و فنون سکندر کی جنگ سے برباد ہو گئے تھے

بڑی محنت و کوشش سے اردشیر اور اس کے بیٹے سابور نے دوبارہ جمع کرائے ان کے بعد کسریٰ نوشیروان نے ان علوم کی بڑی سرپرستی کی۔

سکندر یونانی کے انتقال کے بعد خونریزی اور خانہ جنگیوں کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہو گیا۔ افسران فوج نے سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ سکندر کا علاتی بھائی بطلیموس سوٹر جو مصر کا حاکم تھا اب وہ بھی خود مختار فرمانروا بن گیا اور اپنا پایہ تخت اسکندریہ کو قرار دیا جس کی آبادی کی بنیاد خود سکندر نے ڈالی تھی اور فلسطین سے یہودیوں کو لا کر یہاں آباد کیا تھا۔ بطلیموس سوٹر کے حسن سلوک اور خدا شناسی کی وجہ یونان و مقدونیہ وغیرہ کے اکثر خاندان یہیں آ کر آباد ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسکندریہ دنیا کا عظیم الشان اور دلفریب شہر بن گیا۔ بطلیموس سوٹر نے عجائب خانہ کا افتتاح کیا جس کے لئے سنگ مرمر کی ایک بہترین عمارت تیار کرائی گئی اور اس میں کتب خانہ بھی قائم کیا۔ اسحٰق راہب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اسکندریہ کا بادشاہ بطولوماوس فلید لفوس علوم قدیمہ کا بڑا دلدادہ تھا اس نے زمیرہ نامی ایک شخص کو کتابیں جمع کرنے کے لئے مقرر کیا تھا اس شخص نے (۱۲۰۱۴۵) کتابیں جمع کیں اس کے بعد بادشاہ سے عرض کی کہ ہندوستان، سندھ، فارس، بابل، روم، جرجان اور موصل میں ابھی بہت بڑا ذخیرہ باقی رہ گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر اسی طرح محنت اور کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ ان تمام ممالک کا علمی ذخیرہ یہاں منتقل ہو جائے۔ چنانچہ اسی بادشاہ کے عہد میں جب عجائب خانہ مکمل ہوا تو اس وقت یہاں کے کتب خانہ میں مختلف علوم کی چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ اس زمانہ میں اسکندریہ مصر کا پایہ تخت ہی نہیں تھا۔ بلکہ فلسفہ اور دیگر علوم کی تعلیم کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز تھا۔ اس مشہور عالم کتب خانہ کے جمع کرنے میں شاہان بطلیموسیہ نے بڑی فراخ دلی سے روپیہ خرچ کیا۔ عجائب خانہ میں کاتبوں کی ایک جماعت محض اس لئے مامور تھی کہ جن کتابوں کو ان کے مالک بیچنا نہیں چاہتے ان کی صحیح نقلیں کر لیں۔ جب کسی کتاب کا ترجمہ کیا جاتا تو اس کا معاوضہ اس قدر دیا جاتا کہ اس زمانہ میں اس معاوضہ کا تصور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس عجائب خانہ میں شائقان علوم کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی جن کے تمام ضروریات کا انتظام حکومت کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ اس دار العلم کے انتظام و اہتمام کے لئے کسی سربرآوردہ اور مشہور عالم کو مامور کیا جاتا تھا۔ یہیں رصدگاہ بھی قائم کی گئی تھی۔ فلکی کرّے، آلات ہیئت، اصطرلاب، آلات

پیمائش بکثرت مہیا کیے گئے تھے۔ اسی عجائب خانہ کے حکما و فلاسفہ کے دماغوں نے آتشین انجن اور آبی گھڑیاں ایجاد کیں۔

حفاظت علوم کی طرف شاہان فارس کی خاص توجہ رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمیشہ کے لئے علوم دنیا میں محفوظ رہیں اور لوگ ان سے مستفید ہوتے جائیں۔ اس حفاظت و پائیداری کے خیال سے شاہان فارس نے کتابوں کو بوج پتر پر لکھوایا یہی نہیں بلکہ ایک ایسا مقام تلاش کروایا جو بمقابل دوسرے مقامات کے حوادث دہر سے محفوظ ہوتا کہ وہاں کتب خانہ کے لئے کوئی محفوظ عمارت تیار کی جا سکے۔ ان تمام اوصاف کے لحاظ سے اصفہان کا انتخاب عمل میں آیا۔ پھر اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ مقام رسناق جے منتخب ہوا اور یہیں کتب خانہ محفوظ کیا گیا۔ ابو معشر کا بیان ہے کہ اب تک یہ عمارت موجود ہے اس کا نام سارویہ ہے۔ ہمارے زمانہ سے بہت سال پیشتر جب اس کا ایک گوشہ منہدم ہوگیا تو اس میں سے مختلف علوم کی کتابیں برآمد ہوئیں جو قدیم فارسی زبان میں تھیں اور اس وقت اس کتب خانہ کا حال معلوم ہوا۔

ابن ندیم کہتے ہیں کہ ابو الفضل نے میرے پاس ان کتابوں میں سے چند نسخے بھیجے جو اصفہان کی شہر پناہ میں صندوقوں میں محفوظ پائے گئے تھے۔ یہ کتابیں چمڑے پر یونانی زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ ان میں اس قدر بدبو تھی گویا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دباغت دی گئی ہے۔ ایک سال گذرنے کے بعد جب یہ کتابیں خشک ہوئیں تب کہیں ان کی بدبو دور ہوئی۔ ان میں کی کچھ کتابیں اس وقت بھی شیخ ابو سلیمان کے پاس موجود ہیں۔

جس طرح ارض مغرب میں اہرام مصر قدامت وصنعت کے لحاظ سے مشہور ہیں اسی طرح مشرق میں سارویہ نہایت مستحکم اور نادر الوجود عمارت ہے۔

ابو اسحق بن شہرام کا بیان ہے کہ روم میں ایک قدیم مندر ہے جس میں لوہے کا عظیم الشان دروازہ نصب ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کہ یونانی کواکب و اصنام پرستی میں مبتلا تھے اس وقت اس مندر کی بڑی تعظیم و توقیر کی جاتی تھی۔ میں نے بادشاہ روم سے اس مندر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن بادشاہ نے یہ کہہ کر اس کے بتلانے سے انکار کر دیا کہ جب سے یونانیوں نے نصرانیت اختیار کی ہے اس وقت سے یہ مندر بند کر دیا گیا ہے اس لئے اب اس کا کھولنا خلاف مصلحت ہے۔ باوجود اس انکار

کے جب کبھی میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا برابر اس معبد کو دیکھنے کی تمنا ظاہر کیا کرتا یہاں تک کہ ایک روز میرے اصرار سے مجبور ہو کر بادشاہ نے مندر کو کھولا جس کی عمارت سنگ مرمر اور دوسرے مختلف رنگوں کے بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی تھی، اس میں نہایت خوشنما مختلف کتبات اور نقوش تھے جن کی نظیر دیکھی نہیں گئی ۔ اس مندر میں قدیم کتابوں کا اتنا ذخیرہ تھا جن کے اٹھانے کے لئے ایک ہزار اونٹ درکار تھے ۔ ان میں بعض کتابیں اپنی اصلی حالت پر تھیں، بعض تو بالکل بوسیدہ ہو گئی تھیں اور بعض ایسی تھیں جن کو دیمک نے کھا لیا تھا ۔ اس جگہ میں نے بہت سے نادر اشیا و آلات سونے وغیرہ کے بنے ہوئے دیکھے ۔ میرے نکلتے ہی معبد کا دروازہ بند کر دیا گیا ۔ یہ سیف الدولہ کے عہد کا واقعہ ہے ۔ یہ مندر قسطنطنیہ سے تین روز کی مسافت پر واقع ہے ۔ یہ چند تاریخی روایتیں یہاں صرف اس لئے لکھی گئی ہیں کہ ان کے مطالعہ سے کم از کم سطحی طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام سے پہلے فلسفہ نے کس طرح اپنی ترقی و تنزل کے دور گزارے اور دنیا کی نظروں میں اس علم کی کیا اہمیت تھی اور قدما نے اس کی کس طرح قدر و حفاظت کی ۔

فلسفہ کا نشو و نما اسلام میں تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے بھی تہذیب و تمدن میں اس وقت تک کافی ترقی نہیں کی جب تک کہ اسنے اعلیٰ علوم و فنون کی تعلیم دیکر اپنے افراد کی سطحی ذہنیتوں کو بلند نہیں کیا ۔

عرب کی قوم گو عرصہ دراز سے قعر جہالت میں پڑی ہوئی تھی مگر جب اسلام کی نورانیت نے اُس کے دل و دماغ کو منور کر دیا اور اس کی قدیم ذہنیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا ۔ تو اس بیداری کے ساتھ ہی عربوں نے بھی علوم و فنون کی ضرورت محسوس کی اور ان کے حصول کے لئے بڑے شوق و محنت سے قدم بڑھایا ۔

اس زمانہ میں علوم کے حصول میں عربوں کو بڑے مراحل طے کرنے پڑے اس لئے کہ (۱) پہلے تو عربی زبان میں علوم موجود نہیں تھے (۲) دوسرے غیر زبان کے علمی کتابوں کا دستیاب ہونا بھی نہایت دشوار تھا (۳) تیسرے تحصیل علم کے لئے دور دراز ممالک کا مخدوش سفر اختیار کرنا ضروری تھا لیکن عربو کے شوق اور ان کی طلب صادق نے ان تمام دشواریوں کو انکی نظروں میں آسان بنا دیا ۔ حصول علم کے وہ ایسے شیدائی بنے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کو نہایت کشادہ پیشانی سے برداشت کیا اور

مشکل سے مشکل منازل نہایت آسانی سے طے کئے۔ اس تعلیمی شغف نے عربوں پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ سب سے پہلے علمی ذخیرہ کو اپنی زبان میں جمع کرنا چاہیئے تاکہ قوم کا ہر فرد سہولت کے ساتھ علوم حاصل کر سکے اور غیر زبان سیکھنے کی زحمت ان کے شوق اور ارادوں میں مزاحم نہ ہو۔

سب سے پہلے خالد ابن یزید ابن معاویہ نے فلسفہ کے ترجمہ کی جانب توجہ کی۔ یہ بڑے قابل وفاضل اور علوم وفنون کے شائق تھے۔ خالد "حکیم آل مروان" کے نام سے مشہور تھے ان کو علوم قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی اکثر یونانی فلاسفہ نے مصر میں آکر سکونت اختیار کی تھی اور عربی زبان کے اچھے ماہر ہوگئے تھے۔ خالد نے اُن کو بلا کر فن کیمیا کی اکثر کتابوں کا ترجمہ عربی میں کروایا ان کے علاوہ بعض اور مسلمانوں نے بھی مختلف علوم کے عربی میں ترجمہ کئے۔

اس کے بعد خلفاء عباسیہ نے خاص طور سے اس جانب توجہ کی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں فلسفہ نے حقیقی طور پر اسلام میں نشوونما پائی۔ منصور عباسی نے علمی سرپرستی کی ابتدا کی، اس کو علوم قدیمہ کا بڑا شوق تھا اپنے عہد حکومت میں اُس نے ہر طرف طب اور قانون کے مدارس قائم کئے اور علوم و فنون کی ترویج میں بیحد کوشش کی منصور کو علم ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اس کا اکثر وقت اسی فن کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔

ہندوستان کے ایک بڑے عالم ہیئت نے منصور کے دربار میں حاضر ہو کر ایک زائچہ پیش کیا تھا جس کی منصور نے بڑی قدر کی۔ محمد ابن ابراہیم فزاری سے اس کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس کے سوا اور چند کتابیں اس فن میں لکھوائیں۔ غرض اُس نے اپنے دور حکومت میں علم ہیئت کو ممکنہ ترقی دی۔

مہدی کے دورِ حکومت میں خاندانِ برامکہ کی توجہ سے علوم قدیمہ کا مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ ابن ناعم، ابرش، اہوازی وغیرہ اسی عہد کے مترجمین ہیں جنہوں نے فلسفہ اور دیگر علوم کے عربی میں ترجمہ کئے۔

خلیفہ ہارون علمی دلچسپی کے لحاظ سے خاص شخصیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے زمانہ خلافت میں علم کی بڑی سرپرستی کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا۔ ترجمہ وتصنیف کے لئے بیت الحکمتہ کی بنیاد ڈالی اور ہر زبان کے قابل ولائق افراد کو مختلف علوم کے ترجمہ کے لئے مامور کیا ہارون کے زمانہ میں عام طور سے علمی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اکثر امرا اور رؤسا نے بھی اس جانب توجہ کی اور رقم کثیر صرف کر کے

مختلف علوم کے عربی زبان میں ترجمہ کرائے چنانچہ بنو شاکر نے فلسفہ، طب، ہندسہ، موسیقی وغیرہ مختلف علوم کی کتابیں دور دراز ممالک سے زر کثیر خرچ کر کے منگوائیں اور اُن کا عربی میں ترجمہ کروایا۔

خلیفہ مامون کا عہد حکومت فلسفہ کے لئے نہایت ہی مبارک ثابت ہوا حقیقت میں فلسفہ نے جو ترقی اس دور میں کی اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ صاحب الفہرست نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون نے خواب میں ایک خوبصورت شخص کو تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا جس کے غیر معمولی وقار و رُعب سے مامون بہت متاثر ہوا۔ اور دریافت کیا کہ آپ کون ہیں اُس شخص نے جواب دیا کہ میں ارسطا طالیس ہوں۔ اس کے بعد مامون نے ارسطا طالیس سے کچھ امور دریافت کئے جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

اس خواب کے بعد ہی مامون کو فلسفہ اور علوم قدیمہ سے بڑی دلچسپی ہوئی اس نے فلاسفہ و علماء کی قدر و منزلت کر کے عام علمی شوق میں اور بھی اضافہ کیا۔ فلسفہ کے لئے مامونی عہد بہت اہمیت رکھتا ہے اس دور میں فلسفہ نے کامل طور سے اسلام میں نشوونما پائی اور اس علم دوست خلیفہ کی قدردانی اور کوششوں نے فلسفہ کو عربی زبان میں معراج کمال پر پہنچایا۔

سب سے پہلے مامون نے فلسفہ اور علوم قدیمہ کی کتابیں مہیا کرنا ضروری خیال کیا چنانچہ اس نے قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو کے تمام تصانیف تلاش و تفحص سے جمع کر کے دارالخلافہ کو بھیج دے۔ قیصر کو اس فرمائش کی تعمیل میں کوئی تعرض نہیں تھا۔ مگر اس زمانہ میں مذہبیت انتہا [illegible] جس کی وجہ خود روم میں فلسفہ مفقود ہو چکا تھا تاہم قیصر کی کوشش سے ایک راہب نے پتہ بتایا کہ یونان میں فلسفہ کا ایک قدیم کتب خانہ ہے قسطنطین نے فلسفہ کی کتابیں بڑی تلاش سے جمع کر کے اس میں محفوظ کر دی تھیں کہ اگر فلسفہ عام طور سے رواج پا جائے تو مذہب کو سخت صدمہ پہنچے گا یہ کتب خانہ قسطنطین کے زمانہ سے مقفل ہے اب تک کسی نے اس کو نہیں کھولا۔ قیصر نے اس کتب خانہ کو کھلوایا جس میں سے صرف فلسفہ کی بہت سی کتابیں محفوظ نکلیں جن کو مامون کے پاس بغداد روانہ کر دیا گیا۔ حجاج ابن المطر، یوحنا ابن بطریق، سلما کو مامون نے زر کثیر دیکر روم کی جانب روانہ کیا تاکہ وہاں سے منتخب کتابیں علوم قدیمہ کی لائیں۔

اُن کے علاوہ آرمینیا، مصر، شام اور دوسرے ممالک کو بھی لاکھوں روپیہ دے کر متعدد اشخاص کو صرف اس لئے روانہ کیا کہ فلسفہ کی تصنیفات بہم پہنچائیں۔ غرض کہ جس شوق و کوشش

سے مامون نے فلسفہ کا قدیم ذخیرہ جمع کیا۔ اس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ اس کتب خانہ میں مختلف علوم اور مختلف زبانوں کی تقریباً دس لاکھ کتابیں تھیں۔

مامون کی اس غیر معمولی دلچسپی نے امرا و اعیان دولت میں علمی شوق پیدا کر دیا تھا چنانچہ محمد اسحٰق کا قول ہے کہ محمد، احمد، حسن نے جو بنوشاکر المنجم کے نام سے مشہور رہیں روم سے علوم قدیمہ کی کتابیں منگوانے میں بڑی کوشش کی۔ انہوں نے حنین ابن اسحاق کو زر کثیر دیکر روم روانہ کیا۔ یہ وہاں سے مختلف علوم فلسفہ، ہندسہ، ارثماطیقی، طب، موسیقی کے بہترین نادر کتابیں لایا۔
ابو سلیمان سجستانی کا بیان ہے کہ بنو منجم نے حنین ابن اسحاق، حبیش ابن الحسن، ثابت ابن قرہ وغیرہ کو ماہانہ پانسو دینار مقرر کر کے صرف کتابوں کی نقل کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ اُن کے علاوہ بیش قرار مشاہرہ دیکر مترجمین کو ملازم رکھا تھا جو مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اور بھی بہت سے امرا نے بڑے شوق سے علوم قدیمہ کی بہترین خدمتیں کیں جن کی وجہ ایک بڑا علمی ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہوگیا۔

مامون نے صرف علوم قدیمہ کا ذخیرہ ہی جمع کرنے میں کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ہی اس بے بہا ذخیرہ کو جو مختلف زبانوں میں تھا عربی میں ترجمہ کرانے کی جانب بھی توجہ کی۔ چنانچہ یعقوب ابن اسحٰق کندی کو جو مختلف زبانوں سے واقف اور فلسفہ کے بڑے ماہر تھے، ارسطو کے تصانیف کے ترجمہ کے لئے مامور کیا۔ حقیقتہً کندی نے بڑی قابلیت اور کد و کاوش سے ارسطو کے فلسفہ کو عربی جامہ پہنایا جس کی وجہ بعد کے لوگوں کو فلسفہ کے سیکھنے میں بڑی سہولت ہوگئی۔

مامون نے قسطا ابن لوقا کو جو ایک عیسائی فلاسفر تھا اور جس نے فلسفہ و حکمت کی بہت سی کتابیں جمع کی تھیں۔ بیت الحکمتہ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا۔ سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا مجوسیوں کے علوم و فنون کے ترجمہ کی خدمت دی۔ جبرئیل بن بختیشوع جو ایک عیسائی طبیب تھا اس کو بھی ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح مامون کی توجہ سے فلسفہ کا کافی ذخیرہ عربی زبان میں پیدا ہوگیا۔

مامون کو قدرتی طور پر فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی اس فطرتی شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مامون کی قبا کی آستینوں پر اقلیدس کے مقالہ اولی کی شکل پنجم کا نمونہ بنا ہوا تھا اس لئے کہ یہ شکل اس کو نہایت پسند تھی اور اسی وجہ سے اس شکل کو عربی میں شکل مامونی بھی کہا کرتے تھے۔

مامون بلا لحاظ مذہب عام طور سے حکما و فلاسفہ کی بڑی توقیر کرتا تھا۔ اس کا قول ہے کہ علماً وفضلا خدا کے محبوب ومقبول بندے ہیں، یہ لوگ اپنے ابنا رجنس کو حکمت و فراست کی تعلیم دیتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو دنیا پر پہلے کی طرح پھر وحشت وجہالت چھا جائے گی۔

مامون کی یہ دلچسپی صرف علمی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ عمل کا بھی اس کو بے حد شوق تھا چنانچہ زمین کے کروی ہونے کا امتحان کرنے کے لئے اس نے علم ہیئت کے ماہروں کے ذریعہ بحیرۂ احمر کے ساحل پر دائرۂ ارضی کے ایک درجہ کی پیمائش کروائی جس سے زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل معلوم ہوا۔ اس ایک پیمائش سے زمین کے مدور ہونے کی نسبت مامون کو کافی اطمینان نہ ہو سکا اس لئے عراق عرب میں دو ہیئت داں جماعتوں کے ذریعہ دوبارہ پیمائش کرائی گئی۔ اس کے بعد مامون نے زمین کا مدور ہونا تسلیم کیا۔ محض فلسفہ کی اشاعت و ترویج کی وجہ اس زمانہ کے علما دین نے مامون کو بدعتی ٹھہرایا مگر علما کا یہ فتویٰ مامون کو آخری دم تک فلسفہ کی خدمت سے باز نہ رکھ سکا۔

مصر میں بنی فاطمہ نے بھی بڑی محنت و کوشش سے لاکھوں روپیہ صرف کر کے بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا اور اس میں ایک لاکھ مختلف علوم کی خوش خط کتابیں جن میں سے فلسفہ کی چھ ہزار پانسو کتابیں صرف شعبۂ ہیئت و طب کی تھیں رکھی گئیں۔ اس کتب خانہ میں دو کرے بھی تھے (۱) ایک چاندی کا (۲) دوسرا پیتل کا جس کی نسبت مشہور ہے کہ یہ بطلیموس کا بنایا ہوا تھا۔

اندلس میں خاندان بنی امیہ نے علوم قدیمہ کی بڑی خدمت کی حکومت کی جانب سے ایشیا، افریقہ وغیرہ مختلف ممالک میں محض اس لئے لوگ مقرر کئے گئے تھے کہ جو نادر کتاب ملے فوراً خرید لیں اسی شوق اور کد و کاوش سے خلفا بنی امیہ نے بھی ایک عظیم الشان کتب خانہ مہیا کیا تھا جس میں مختلف علوم کی چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں اور جس کی صرف فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ اس کتب خانہ میں ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں کاتبوں، جلد سازوں، نقاشوں کی کثیر جماعت ملازم تھی۔

مسلمانوں کے اس علمی شوق و شغف کا ذکر کرتے ہوئے گبن کہتا ہے کہ صوبہ جات کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدار سے کام لیتے ہیں ان کی رقیبانہ مسابقت نے علمی مذاق کی اشاعت میں غیر معمولی حصہ لے کر فلسفہ اور سائینس کی روشنی کو اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیا۔

(باقی آئندہ)

تو حدیثِ گم شدہ کاروان ز زبانِ نقشِ قدم طلب

اثر خامہ
علامہ نواب ضیاء یار جنگ بہادر
(سابق رکن عدالت عالیہ سرکار عالی)

رہ و رسمِ منزلِ شوق را ز بلاکشانِ حرم طلب
سر و پا چو آتشِ دل زند ز دو دیدہ جنبشِ نم طلب

چو قدم ز خویشتن برون نہی دل و دیدہ را چہ سکون دہی
پیِ صیدِ آہوی بیخودی گذری بوادیِ رم طلب

چہ بلاست گریۂ شادیی کہ فلک بکامِ تو آورد
بہ ستارہ ریزیِ آسمان شرری ز آتشِ غم طلب

تو ہوایِ دامنِ خنجری دلِ خون گرفتہ چہ میخوری
ز خرامِ فتنۂ محشری رہِ سیرگاہِ عدم طلب

ز خرامِ نازِ گذشتگان چہ تلاش دیدہ دہد نشان
تو حدیثِ گم شدہ کاروان ز زبانِ نقشِ قدم طلب

ز فسونِ سوزِ شبِ محن بزبانِ شمع گرہ مزن
تو کشادِ کارِ صد انجمن ز نقابِ رویِ صنم طلب

ز خمارِ دیدۂ آرزو دلِ عالم است تہی سبو
تو جوابِ نرگسِ مستِ او ز طلسمِ ساغرِ جم طلب

چو تبار حرف نمی زند مژہ ترجمانی دل کند
سخنی کہ لب نکند ادا ز دہن دریدہ قلم طلب

چہ بہ پیشِ اہلِ جہان کنی دلِ خویش را چو صدف تہی
گہرِ ارادتِ بخششی ز محیطِ فضل و کرم طلب

چہ خوش است گریہ بہ سرخوشی شبِ ماہ بر سرِ آبِ جو
تو بیادِ ساقیِ مہوشی قدحی ز جوششِ یم طلب

ز علوِ مرتبتِ سخن سخن آفرین بود آشنا
تو جوابِ این غزل ای ضیا ز سخنورانِ عجم طلب

عجائب خانہ دہلی

میں

خط نسخ و شکستہ کے نمونے

از جناب محمد سردار علی صاحب مدیر رسالہ "تجلی" حیدرآباد

آج سے ایک سال قبل میں نے عجائب خانہ دہلی (دہلی میوزیم) کے ذخیرۂ خطاطی پر جو خط ثلث، نسخ، نستعلیق، شکستہ، غبار وغیرہ پر مشتمل ہے ایک بسیط تفصیلی مضمون لکھا تھا جس کا ایک حصہ (صرف خط نستعلیق سے متعلق) سالنامہ رہبر دکن ۱۳۴۹ف میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی مضمون کا یہ دوسرا ٹکڑا (خط نسخ و شکستہ سے متعلق) "مجلۂ مکتبہ" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد انشاء اللہ خط کوفی، ثلث، طغرا وغیرہ کے نمونوں سے متعلق تیسرا حصہ بھی ناظرین "مکتبہ" کی خدمت میں پیش کروں گا۔

اس مضمون کی تمہید جس میں خوشنویسی کی تاریخ اور مختلف خطوں کے ارتقار سے بحث کی گئی ہے کافی طویل ہونے کی وجہ بجائے خود ایک مستقل مضمون بن گئی ہے۔ اس کو بھی اسی سلسلہ میں پیش کیا جائے گا

اس مضمون کا ماخذ عجائب خانہ دہلی کا کیٹلاگ ہے نمونوں کے نمبر بھی وہی دئے گئے ہیں جو کیٹلاگ میں درج ہیں۔

نسخ کے نمونے نمبر۲ ایک وصلی یاقوت المستعصمی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو نقش و نگار سے مزین ہے اور جس پر تاریخ ۶۸۰ھ (۸۲ - ۱۲۸۱ء) درج ہے۔ جلال الدین المعروف یاقوت مستعصمی بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا درباری خوشنویس تھا۔ خطاطی میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے نام سے ایک طرز تحریر موسومہ "یاقوتی" مشہور ہے[1]۔ ہندوستان

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۳۸۶

او . ایران میں اس کے خط کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ اس کو شیعہ عقائد رکھنے کی وجہ خلیفہ نے قید کر دیا تھا لیکن تین سال کے بعد رہا کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ہلاکو خاں کے حکم سے بغداد میں قتل عام ہو رہا تھا اس وقت یاقوت ایک مینار میں پناہ گزیں ہو کر خطاطی کی مشق کر رہا تھا۔ اس سے اس کے خطاطی کے شوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یاقوت نے بعمر ۱۲۰ سال بمقام بغداد ۶۹۷ھ[1] (۹۸ - ۱۲۹۷ء) میں وفات پائی۔

نمبر۳ - ایک قرآن جو خط کوفی اور نسخ کی مشترکہ طرز میں لکھا ہوا ہے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس طرز کی نسبت (جو عام طور پر خط بہار کہلاتی ہے)۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کے عہد قدیم میں رائج تھی۔ اس خیال کو اس حقیقت سے اور تقویت ہوتی ہے کہ مورٹنر نے عربی خطاطی پر جو کتاب شائع کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ عربستان، ایران اور مصر اس طرز سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ خط نسخ کے مقابلہ میں پنپ نہ سکا۔ نسخ نے پہلے ایران میں اور بعد ہندوستان میں پھیل کر اپنا تسلط جمالیا۔ اس قرآن کی لوح اور ابتدائی دو صفحے طلائی نقش و نگار سے مزین اور جدولیں طلائی ہیں تمام کتاب میں لفظ اللہ جہاں کہیں آیا ہے طلائی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح رموز اوقاف بھی طلائی ہیں۔ یہ نسخہ امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک قدیم خاندان کے رکن کے پاس سے جو یہاں کے ایک مشہور بزرگ شاہ ولایت کی اولاد سے ہے خرید اگیا ہے اس نسخہ کے متعلق اس خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ نسخہ فیروز شاہ (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) نے اپنی دختر کے جہیز میں جو ایک بزرگ کے لڑکے سے بیاہی گئی تھی دیا تھا۔ سر اوریل اسٹین وسط ایشیا کے آثار قدیمہ کے بہت بڑے عالم ہیں اس نسخہ کے متعلق ان کی رائے ہے کہ اس کا کاغذ بخاری ساخت کا ہے اور بلاشبہ اسی قدر قدیم ہے جس قدر خاندانی روایت میں بیان کیا جاتا ہے۔

نمبر۴ - ایک قرآن جس میں مذکور الصدر نسخہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں البتہ جدولیں طلائی نہیں اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اول و آخر کے چند صفحے بعد میں لگائے گئے ہیں جس کی طرز تحریر بہت مختلف ہے۔ کتاب کے بیچ میں چند صفحے طلاکار اور رنگین ہیں۔

---

[1] تذکرہ خوشنویساں میں یاقوت کی وفات کا سن ۶۹۸ (۹۹ - ۱۲۹۸ء) لکھا ہے ص ۲۹

نمبر ۵ ۔ ایک وصلی جو نقش و نگار سے آراستہ ہے محمد افضل کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اپنے کو داراشکوہی اور البخاری لکھتا ہے ۔ یہ وصلی ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں جب کہ شہزادہ داراشکوہ قندہار کے محاصرہ میں مصروف تھا لکھی گئی ہے ۔

نمبر ۶ ۔ ایک حمایل شریف جس کے ابتدائی دو صفحات نقش و نگار سے مزین اور عنوانات و جدولیں طلائی ہیں اس پر کاتب کا نام ہے نہ تاریخ تحریر درج ہے ۔ لیکن اس کی نسبت روایت کی جاتی ہے کہ یہ حداد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ دہلی میوزیم کے ذخیرۂ خطاطی میں حداد کی تحریر کا اور کوئی نمونہ موجود نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ خاندانی روایت کہاں تک درست ہے ۔

عبدالباقی المعروف حداد کو شاہ جہاں کے آخری عہد میں اورنگ زیب نے اس کے وطن ایران سے طلب کیا تھا ۔ ہندوستان پہنچ کر اس نے اپنی تحریر کے کئی نمونے ملاحظہ شاہی میں پیش کئے جس میں ۳۰ ورق کا ایک قرآن مجید بھی تھا ۔ شاہ نے اس کو "یاقوت رقم" خطاب دیا[۵۱] ۔ حالات خوشنویساں[۵۲] کے مولف کا بیان ہے کہ اس نے حداد کے ہاتھ کا لکھا ہوا انتیس ورق کا قرآن دیکھا ہے اور خط خفی میں یہ نادر اور عدیم المثال ہے[۵۳] ۔ زیر بحث حمایل خط خفی کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے ۔ حداد اپنے وطن کو واپس چلا گیا لیکن اس نے اپنے کئی شاگرد ہندوستان میں چھوڑے ہیں اس کی طرز کے لکھنے والے نصف صدی پیشتر بھی ہندوستان میں پائے جاتے تھے ۔

نمبر ۷ ۔ ایک نقش و نگار سے مزین وصلی علی اکبر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عبدالباقی حداد کا بیٹا تھا ۔

نمبر ۸ ۔ ایک طلاکار وصلی علی اصغر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عبدالباقی حداد کا دوسرا بیٹا تھا ۔

نمبر ۹ ۔ ایک قرآن محمد عارف "یاقوت رقم خاں" کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس پر سن ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ - ۷۰ء) درج ہے ۔

محمد عارف ملقب یاقوت رقم خان ہرات کا باشندہ اور ہندوستان میں عبدالباقی حداد کا

---

۵۱ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۲۴

۵۲ قلمی موجودہ کتب خانہ مولوی ظفر حسن مرتب کیٹلاگ ۔

۵۳ حالات خوشنویساں ورق ۶۸

بہترین شاگرد تھا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹوں کو خط نسخ کی تعلیم دیا کرتا تھا اور نستعلیق کی تعلیم کے لئے میر سید علی جواہر رقم مقرر تھا۔ حالات خوشنویساں کا مولف لکھتا ہے (ورق ۴) کہ اس نے ان شہزادوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن اور پنجسورہ کے نسخے دیکھے ہیں جو محمد عارف کی طرز میں بہت شاندار لکھے ہوئے ہیں۔ محمد عارف کو یاقوت رقم خاں کا خطاب شاہ عالم بہادر شاہ کا دیا ہوا ہے۔[۲]

نمبر۱۰۔ سرخی سے لکھی ہوئی ایک زرفشاں وصلی محمد عارف یاقوت رقم خان کے بھانجے اور شاگرد عباد اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

نمبر۱۱۔ ایک وصلی قاضی عصمت اللہ کی لکھی ہوئی ہے جو محمد عارف یاقوت رقم خاں کا شاگرد تھا قاضی عصمت اللہ نے خوشنویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی خفی اور جلی دونوں خوب لکھتا تھا ۱۱۸۶ھ (۷۳-۱۷۷۲ء) میں انتقال کیا۔[۳]

نمبر۱۲۔ ایک وصلی فیض اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو عصمت اللہ کا بڑا بھائی تھا۔ خط نسق میں بہت اچھا ہاتھ تھا۔ اس کے استاد کا نام معلوم نہیں ہے ممکن ہے کہ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح محمد عارف یاقوت رقم خاں کا شاگرد ہو۔

نمبر۱۳۔ ایک وصلی سید امام علی رضوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو ولیعہد مرزا ابوظفر (جو بعد میں شاہ عالم ثانی ہوا) کے خوشنویسوں میں ملازم تھا۔ یہ قاضی عصمت اللہ کی طرز پر لکھتا تھا۔

نمبر۱۴۔ ایک وصلی جلال الدین رضوی فرزند سید امام علی رضوی کے ہاتھ کی ہے جو شہزادہ میرزا ابوظفر کا ملازم اور اپنے باپ کی طرز پر لکھتا تھا۔[۴]

---

[۱] میر سید علی جواہر رقم تبریز کا رہنے والا تھا۔ عہد شاہجہاں میں ہندوستان آیا شاہجہاں نے جواہر رقم خطاب دیکر شہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ اپنے عہد حکومت میں اورنگ زیب نے اپنے بچوں کو خوشنویسی سکھانے کے لئے مقرر کیا اور شاہی کتب خانہ کی مہتمی کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ جواہر رقم حملہ دکن کے موقع پر اورنگ زیب کے ساتھ تھا۔ ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) میں انتقال کیا اس کی لاش دہلی لاکر دفن کی گئی۔ میر عماد کے طرز پر لکھا کرتا تھا اس کے خط کا نمونہ دہلی میوزیم میں موجود ہے جس کا نمبر (۲۰) ہے۔

[۲] تذکرہ خوشنویساں ص ۱۲۶

[۳] تذکرہ خوشنویساں ص ۱۲۷

[۴] تذکرہ خوشنویساں ص ۱۲۹

نمبر ۱۵ ۔ ایک وصلی جس کا کچھ حصہ نسخ اور کچھ طغرا میں ہے دہلی کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ثانی (۵۷ - ۱۸۳۷ء) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے ۔ بہادر شاہ کو خوشنویسی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ خود بھی کئی قسم کے خط لکھتا تھا لیکن سب سے زیادہ نسخ میں اس نے مہارت بہم پہنچائی تھی، قاضی عصمت اللہ کے طرز میں لکھا کرتا تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاعری کی طرح خطاطی میں بہادر شاہ کے کئی شاگرد تھے اور سب کو دربار شاہی سے ماہانہ نین روپیہ وظیفہ ملتا تھا ۔

نمبر ۱۶ ۔ ایک طلاکار وصلی محمد ہمایوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو مغلیہ خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور آخری صدی کے وسط میں زندہ تھا ۔

نمبر ۱۷ ۔ دعا کی ایک کتاب جس کے ابتدائی دو صفحے طلاکار ہیں یہ آغا میر حسین شیرازی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اس پر سن ۱۲۴۹ھ (۳۴ - ۱۸۳۳ء) درج ہے ۔

نمبر ۱۸ ۔ ایک وصلی تحریر کردہ عبدالرحمان

نمبر ۱۹ ۔ ایک وصلی تحریر کردہ اسد علی

نمبر ۲۰ ۔ ایک وصلی تحریر کردہ شمس الدین عاصی ۔

نمبر ۲۱ ۔ دعا کی ایک کتاب موسومہ "صحیفہ کاملہ"

خط شکستہ کے نمونے

خط شکستہ نستعلیق کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کب ایجاد ہوا ۔ حالات خوشنویساں (ورق ۱۱) اور تذکرۂ خوشنویساں (۶ - ۱۰۰۵) کے مولفین کا بیان ہے کہ عہد جہانگیر (۲۷ - ۱۶۰۵ء) میں نور محمد حسین فرزند مرزا اشکر اللہ نے جو دربار اکبر میں ایران کا پناہ گزیں تھا اس خط کو ایجاد کیا ۔ ابوالفضل نے خط شکستہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے ۔ دونو مولفین مذکور الصدر کے بیانات صحیح نہیں ہیں اس لئے کہ دہلی میوزیم میں سلطان ابوسعید کا جو بابر کا دادا تھا ایک فرمان موجود ہے جو خط شکستہ میں لکھا ہوا ہے اور جس پر سن ۸۶۸ھ (۱۴۶۴ء) درج ہے ۔ اغلب ہے کہ جہانگیر کے عہد تک خط شکستہ سے ہندوستان واقف نہ ہو اور میرزا محمد حسین نے اس کو یہاں رائج کیا ہو ۔ دہلی میوزیم میں خط شکستہ کے حسب ذیل ۱۳ نمونے موجود ہیں ۔

نمبر ۹۰ ۔ ایک فرمان جو وصلی کی طرح موٹے کاغذ پر چسپاں ہے اس کا سن ۸۶۸ھ (۱۴۶۴ء)

اور اس پر سلطان ابوسعید فرزند سلطان محمد کی مہر لگی ہوئی ہے یہ فرمان سید شادی اور سید شرف الحق کے حق میں ان کو کسی درگاہ کا متولی بنانے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ سلطان ابوسعید شہنشاہ بابر کا دادا تھا جس نے ۱۴۵۲ء سے ۱۴۶۷ء تک حکمرانی کی۔

نمبر ۹۱۔ بیاض بختاور خان (۵۰ ورق) یہ عہد اورنگ زیب (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء) کے خوشنویس درایت خان کی تحریر کا نمونہ ہے۔ اس کا اصلی نام عبداللہ اور درایت خان خطاب ہے جو اورنگ زیب کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس کے باپ کا نام محمد جعفر اور لقب کفایت خاں ہے اور ہندوستان میں خط شکستہ کے موجد محمد حسین کی اولاد سے ہے۔

بختاور خان دربار اورنگ زیب کا ایک امیر تھا۔ شاہ نے اپنی حکمرانی کے دسویں سال اس کو منصب یک ہزاری سے سرفراز فرمایا اور تیرہویں سال خواجہ سراؤں کا مہتمم مقرر کیا۔ بختاور خان نے ۱۳ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ مطابق ۱۹ فبروری ۱۶۸۵ء میں وفات پائی خود شہنشاہ اورنگ زیب تھوڑی دور تک اس کے جنازہ کے ساتھ آیا تھا۔[۱] دہلی میں بختاور خان کی بنائی ہوئی ایک سرا مشہور ہے وہ "مرآۃ عالم" نامی ایک تاریخ کا مولف بھی تھا۔

نمبر ۹۲۔ بیاض بختاور خاں (ورق ۱۶) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس محمد سعید انصاری کی تحریر کا ایک نمونہ۔

نمبر ۹۳۔ بیاض بختاور خان نواب اشرف خاں کی تحریر کا نمونہ جو شاہجہان اورنگ زیب کے دربار کا ایک امیر تھا۔ اس کا اصلی نام محمد اشرف ہے اور اشرف خان اورنگ زیب کا دیا ہوا خطاب ہے۔ اشرف خان نے ۱۰۹۷ھ (۸۶ - ۱۶۸۵ء) میں انتقال کیا۔[۲]

نمبر ۹۴۔ بیاض بختاور خاں (ورق ۸۴) نواب اشرف خاں کے شاگرد نورالدین محمد کی تحریر کا نمونہ اس پر سن ۱۰۸۱ھ (۷۲ - ۱۶۷۱ء) درج ہے۔

---

[۱] مآثر عالمگیری مولفہ محمد مستعد خاں شایع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۸۷۱ء) ص۲۵۳ ایلٹ ہسٹری آف انڈیا جلد ہفتم ص۱۵۱

[۲] مآثر الامرا، شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص۲۷۴-۲۷۲ اورینٹل بیوگرافیکل ڈکشنری مولفہ تھامس ولیم بیلی ص۸۲

نمبر ۹۵ ۔ بیاض بختاور خان (ورق ۲۹۰) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس سید احمد کی تحریر کا نمونہ ۔

نمبر ۹۶ ۔ بیاض بختاور خان (ورق ۵۵۰) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس محمد نعیم اصفہانی کی تحریر کا نمونہ اس پر سن ۱۰۹۷ ھ (۸۶ - ۱۶۸۵ء) درج ہے ۔

نمبر ۹۷ ۔ بیاض بختاور خان (ورق ۱۸۲) عہد اورنگ زیب کے خوشنویس مرزا محمد معزالدین محمد فطرت کی تحریر کا نمونہ ۔

نمبر ۹۸ ۔ بیاض بختاور خان عہد اورنگ زیب کے ایک گمنام خوشنویس کی تحریر کا نمونہ ۔

نمبر ۹۹ ۔ ایک وصلی ابوالقاسم الحسینی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جس پر سن ۱۱۳۱ ھ (۱۹ - ۱۷۱۸ء) درج ہے ۔

نمبر ۱۰۰ ایک وصلی مرید خان طباطبائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس پر عہد محمد شاہ کے بیسویں سال کا سن درج ہے (۱۷۳۸ء) مرید خان کا اصلی نام محمد صادق ہے یہ محمد شاہ (۴۸ - ۱۷۱۹ء) کا درباری امیر اور قوم سادات سے تھا ۔ خوشنویسی میں درایت خان کا شاگرد تھا ۔

نمبر ۱۰۱ ۔ ایک وصلی شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت کے ۲۰ ویں سال (۱۷۸۵ء) کی لکھی ہوئی ہے یہ عمادالدین حسن شاگرد پریم ناتھ کی تحریر کا ایک نمونہ ہے ۔

نمبر ۱۰۲ ۔ ایک وصلی جس پر سن ۱۲۲۳ ھ (۹ - ۱۸۰۸ء) درج ہے حیات خان شاگرد رائے پریم ناتھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے [1]

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴ حالات خوشنویساں ورق ۱۲ ۔

افسردہ دلی

از
جناب علی اختر صاحب

کلیوں میں تبسم ہے، لیکن اگلی سی وہ آب و تاب نہیں
اے صبحِ امیدِ افسردہ! کیوں آج یہ گل شاداب نہیں

ہے روحِ ترنم رقصیدہ، بےچین ہوا کی موجوں میں
انداز وہی ہیں، آج مگر رفتارِ نوا بیتاب نہیں

ہے گردشِ جام و صحبتِ مے، پہلی سی نشاط انگیز مگر
ساقی کی نشیلی آنکھوں میں وہ عکسِ شرابِ ناب نہیں

پہلے بھی نمودِ حسن میں تھے انداز و ادائے صبر شکن
حیراں ہوں سماں ہے اب بھی وہی اور روح مری بیتاب نہیں

زلفیں تو وہی ہیں صید طلب، آزاد ہے لیکن پائے نظر
شوخی تو وہی ہے موجوں میں، اب دامِ فگن گرداب نہیں

دل بھی ہے، ادائے بسمل بھی، خواہانِ ستم بھی ہوں لیکن
اب دل میں نہیں وہ ذوقِ طپش، یا تیغِ نظر میں آب نہیں

غفلت میں نشاطِ بیداری، اک نیند سی ہر شے پر طاری
اب بھی ہیں جوانی کی راتیں لیکن وہ سرورِ خواب نہیں

ہوتی ہیں بہاریں نذرِ چمن، کھلتے ہیں شگوفے بھی لیکن
محرومِ بصارت ہیں آنکھیں، یا عیش کے وہ اسباب نہیں

افسردہ دلی کا راز ہے یہ، ہیں ورنہ وہی ساماں اختر
ہر ذرۂ عالم وجد میں ہے، تیری ہی نظر بیتاب نہیں

چار مینار کی سیر

از

جناب محمد معین الدین رہبر فاروقی متعلم دارالعلوم ہائی اسکول حیدرآباد

یہ عمارت قطب شاہیہ حکومت کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہے۔ اس کے حالات قلم بند کرنے سے قبل موجودہ شہر حیدرآباد کی کچھ مختصر سی تاریخ بتلا دینی ضرور ہے۔ کیونکہ شہر کی بنا کا باعث وجود چار مینار ہوئی۔

شہر آباد ہونے سے قبل سب سے پہلے ایک پل رود موسیٰ پر بنایا گیا اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب گولکنڈے میں آبادی بڑھ گئی تو اکثر لوگ اس مقام پر آکر آباد ہو گئے تھے۔ رود موسیٰ بیچ میں حائل تھی۔ آمد و رفت میں سخت تکالیف درپیش ہوتے تھے۔ تو بادشاہ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ رفاہ عام اور فائدۂ انام کے لئے ایک پل اس ندی پر بنایا جائے۔ پل کی تیاری کا حکم ہوا حسب الحکم کام بھی اختتام کو پہنچا۔ ؎۱

لیکن مورخین نے اس پل کے وجود کے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے جب لوگ گولکنڈے سے اٹھ کر اس مقام پر آکر آباد ہوئے تو ان میں ایک طوائف بھی تھی جو موضع چیچلم (موجودہ شاہ علی بنڈے کے قریب واقع تھا) میں سکونت پذیر تھی۔ حسن و جمال میں بے مثل تھی۔ بادشاہ (ابراہیم قطب شاہ) کا فرزند (محمد قلی) اس کے زلف سیاہ کا شکار ہو گیا، پوشیدہ طور پر اس کے پاس آتا تھا۔ ایک روز بارش کے زمانے میں حسب عادت یہاں آیا۔ رود موسیٰ چڑھاؤ پر تھی، پار جانا مشکل تھا۔ لیکن غلبہ عشق سے بے چین ہو بے خود ہو کر ندی میں گھوڑا ڈال دیا، خوش قسمتی سے پار ہو گیا۔

؎۱ اس مضمون میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے

(۱) تاریخ خورشید دکن مصنفہ منشی محمد عبدالعزیز صاحب (۲) مآثر دکن مصنفہ سید علی اصغر بلگرامی (۳) دکن گزیٹیئر آف نظام ڈومینین مصنفہ کیمبل (۴) گلزار آصفیہ (۵) سیاحت نامہ موسیو تھیونو (۶) جریدہ آثار قدیمہ (۷) پرچہ نظام گزٹ عدد ۱ جلد ۱ (۸) تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم (۹) تاریخ دکن مصنفہ عبدالعلیم نصر اللہ خاں صاحب (۱۰) رسالہ تاریخ قطب شاہیہ و کیفیت تیاری بلدہ و عمارات بلدہ۔

خفیہ نویس نے اس سانحہ ہوش ربا کی بادشاہ کے جناب میں اطلاع بھیجی ۔ بادشاہ بہت پریشان ہوئے شہزادے کے صحیح وسلامت بچ نکلنے پر شکر الٰہی بجالائے، اور فوراً حکم دیا کہ ایک پل بہت جلد تعمیر کیا جائے ۔

داروغہ عمارات حکم کے ملتے ہی فوراً پل کی تیاری میں مصروف ہوا، نہایت اہتمام و انتظام سے آٹھ مہینے کے عرصے میں دوسری موسم بارش تک کام، تکمیل کو پہنچا ۔

عرض اس پل کا بارہ ۱۲ گز تھا، اور اس میں بائیس ۲۲ در رکھے گئے تھے، قریب دو ۲ لاکھ ہون کے، اس کی تیاری میں صرف ہوئے ۔ تعمیر پل کے بعد چار ۴ ہزار روپے باقی رہے ۔ داروغہ مذکور نے بادشاہ جہاں پناہ سے اس کا حال کہا، تو حکم ہوا کہ "ان کو غربا و مساکین میں تقسیم کردیں" ایک شخص نے پیشگاہ سلطان میں اس پل کی تاریخ "صراط المستقیم ۹۸۱ھ" لکھ کر گزرانی بادشاہ کو یہ تاریخ بے حد پسند آئی، اور اس کے صلے میں پانچ سو ۵۰۰ اشرفیاں مرحمت کیں ۔ یہ پل شہر سے مغرب کی طرف واقع ہے اور اب تک "پل قدیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

جب ابراہیم قطب شاہ کا ۹۸۸ھ میں انتقال ہوا ۔ تو محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا ۔ اب کیا تھا ! بادشاہت اپنی ہی تھی، دلی حوصلے نکالنے میں کون حائل تھا ۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں میر شاہ مرزا کی دختر سے نسبت قرار پائی اور ۹۸۸ھ میں بڑے تزک و احتشام سے عقد سعید اختتام کو پہنچا شادی کے چند دن بعد ایک روز بادشاہ دارالسلطنت گولکنڈہ سے شکار کھیلتے ہوئے قلعہ سے جانب مشرق چار کوس کے فاصلے پر پہنچے موسیٰ ندی کے کنارے ایک سرسبز و شاداب قطعہ دیکھا ۔ جو بے حد پسند آیا حکم دیا کہ "اس جگہ شہر آباد کیا جائے" ۔

پھر کیا تھا ! حکم کے ساتھ ہی منجم بلائے گئے ۔ ساعت نیک کی تلاش ہوئی ۔ نجومیوں نے حساب لگایا اور ایک زبان ہوکر تاریخ و ساعت عرض کردی ۔ اسی مقررہ ساعت میں شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔

بادشاہ کو طوائف سے حد درجہ محبت تھی ۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسی کے نام سے اس شہر کو موسوم کیا ۔ طوائف کا نام بھاگ متی تھا ۔ اس لئے شہر کا نام بھاگ نگر ہوا ۔ محمد قاسم مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ سترہ سال تک شہر اسی نام سے موسوم رہا ۔ اس عرصہ میں بادشاہ کی محبوبہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ اس نام سے شرمندہ ہوا اور حضرت علی حیدر کرار ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام مبارک سے منسوب کرکے "حیدرآباد" رکھا ۔ تعمیر شہر کے بعد اس کا تاریخی نام "فرخندہ بنیاد" رکھا گیا ۔

تاریخ دکن (جو ۱۲۸۵ھ میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی تھی) کے مصنف عبدالعلیم نصر اللہ خاں صاحب

نے یہ روایت لکھی ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ کرکے طبقۂ قطب شاہیہ کے خاتم سلطان ابوالحسن تاناشاہ کو قید کرکے اپنے ہمراہ دولت آباد لے گیا تو روانگی سے قبل، شہر حیدرآباد کو دارالجہاد سے موسوم فرمایا

اکثر مورخین شہر کے آباد ہونے کی یہ وجہ بھی لکھتے ہیں کہ جب شہنشاہ اکبر نے دکن پر فوج کشی کی، اکبری فوجوں نے خاندیس کی ریاست اجاڑ دی، اور نظام شاہی سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، تو اس بدامنی کے زمانے میں اکثر لوگ بے خانماں ہوکر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور ان میں کا بیشتر حصہ گولکنڈہ کی سلطنت میں آکر آباد ہوگیا۔ اس سے شہر گولکنڈے کی آبادی میں اور اضافہ ہوگیا۔ کثرت آبادی کے باعث شہر میں بیماری پھیلی اور باشندوں کو پانی کی قلت سے سخت تکلیف ہونے لگی۔ محمد قلی قطب شاہ کو فکر ہوئی کہ کہیں دوسری جگہ شہر آباد کیا جائے۔ اس لئے موجودہ شہر حیدرآباد کا مقام منتخب ہوا۔

الغرض شہر کی بنا چار راستوں اور چار بازاروں پر قرار پائی۔ ہر ایک بازار ایک دوسرے کا ہم شکل تھا۔ بازار نہایت وسیع اور کمانیں بہت بلند تیار ہوئیں۔ چودہ سو (۱۴۰۰) دوکانیں اور بارہ سو (۱۲۰۰) محلے، خانقاہ اور مدرسے، لنگر، مہمان خانے تعمیر ہوئے۔ اکثر جگہ حمام بھی بنائے گئے اور شہر کے شمال جانب ایک طرف خاص جگہ مقرر ہوئی، جس میں ایوان ہائے شاہی اور قصر ہائے فلک رتبہ جہاں پناہ، اور خانوادۂ شاہی کے لئے تعمیر ہوئے۔

دکن کے مسلمان بادشاہوں میں ایک نہ ایک بادشاہ ایسا ضرور گزرا ہے جس کو تعمیر عمارات کا غایت درجہ شوق تھا۔ قطب شاہیہ سلاطین میں اور حالات کے قطع نظر محمد قلی قطب شاہ کا دور تعمیر عمارات کے باعث ایک درخشندہ کارنامہ ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اس شہر کو عروس البلاد بنانے کی فکر میں رہا کرتا تھا چنانچہ اس نے اس کار خاص کے لئے ایک معتدبہ رقم مختص کردی تھی۔ میر ابوطالب جو شاہ کا خزانچی تھا، بادشاہ کے حضور میں ایک روز یہ عرض پیش کی کہ "جہاں پناہ! اب تک ڈیڑھ کروڑ روپے سے زیادہ صرف ہوچکے ہیں"

عربی میں ایک ضرب المثل ہے۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ بادشاہ کے مذہب پر ہوتے ہیں) بادشاہ کے اس شوق ذوق کو دیکھ کر رعایا، شہر امرائے دولت بھی اپنی حویلیوں، مکانوں اور باغوں وغیرہ کو آراستہ کرنے لگے۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک اپنی عمارات کو دوسرے سے

زیادہ خوبصورت بنانے میں سبقت لے جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کی آبادی میں اور چار چاند لگ گئے۔ شہر کے اطراف چاروں ستون میں دس دس کوس تک سرکاری باغات وعمارات کی تعمیر ہوئی۔ چار رفیع الشان کمانیں ہر ایک گوشے میں تیار ہوئیں، اور ہر کمان کے محاذی راستے نہایت کشادہ تیار کئے گئے۔ چاروں کمانوں کے بیچ میں ایک ہزار گز کا میدان چھوڑا گیا۔ اور اس میدان کے بیچوں بیچ ایک حوض تعمیر ہوا جو اب گلزار حوض کہلاتا ہے (بادشاہ جہاں پناہ ماہ محرم میں اسی حوض پر تشریف فرما ہوتے تھے اور سلطنت کی ساری فوج ملاحظۂ عالی سے گذرتی تھی)

شہر کی چاروں کمانوں میں صرف دو کو زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ ایک مشرقی کمان تھی، اس کا نام کالی کمان رکھا گیا، اس پر ایک بلند نقارخانہ تیار ہوا۔ ہر صبح وشام نقارہ بجایا جاتا تھا، ساکنان شہر کے علاوہ دور دور تک اس کی آواز ادنیٰ و اعلیٰ کو سرور بخشتی تھی۔ دوسری شہر دل کی کمان جو مغرب میں واقع ہے وہ محل شاہی کا خاص دروازہ تھی۔

جب شہر کی بنا پڑ چکی تو اس کے دو سال بعد ۹۹۹ھ میں اس عمارت (چار مینار) کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دکن کے تواریخ ناقل ہیں کہ کسی شخص نے بادشاہ کے دربار میں اس کی تاریخ تعمیر "یا حافظ" لکھ کر پیش کی۔ قطب شاہیوں کا مذہب امامیہ تھا اس لئے تیمناً و تبرکاً یہ عمارت تعزیہ (تابوت) کی شکل پر تیار کی گئی۔

بعضے مورخ یوں بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ اس نئے شہر کو مشہد مقدس کے نمونے پر آباد کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے حضرت ضامن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے روضے کے عوض چار مینار تعمیر کروایا۔ ایک قول یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گولکنڈہ میں وبا پھیلی ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں، کئی لوگ بے خانمان ہوگئے، لوگوں نے گھبرا کر خدا سے دعا مانگی۔ کسی نے یہ رائے دی کہ تابوت اور پنجہ کا جلوس نکالا جائے۔ تماموں نے اس فعل کو مقدس سمجھ کر بالاتفاق قبول کیا حسب مشورہ اسی طرح کیا گیا۔ حسن اتفاق سے بیماری کا زور کم ہوگیا۔ بادشاہ نے بھی اس بلائے عظیم سے نجات پانے کی خوشی میں یادگار قائم رکھنے کے لئے گچ اور پتھر سے ایک تابوت (چار مینار) وسط شہر میں تعمیر کروایا۔

اتفاقاً ایک قلمی نسخہ، جس کا نام "رسالہ قطب شاہیہ اور کیفیت تیاری بلدہ و عمارات بلدہ"

تھا، میرے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب نے مجھے مطالعہ کے لئے عنایت فرمایا تھا؛ اس میں چار مینار کی تعمیر کا ایک نیا اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

مصنف رسالہ مذکور بیان کرتے ہیں کہ "جب شہر میں شدّت کے ساتھ وبا پھیلی اور آسمانی بلاؤں سے، جب مخلوق خدا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تو جمعرات کے روز محرم الحرام کی پہلی تاریخ ۱۰۰۰ھ ہجری میں، شہر کے بیچوں بیچ، بڑے حُسن و عقیدت کے ساتھ، ایک تعزیہ بٹھایا گیا، خوش اعتقادی سے بیماری کا زور کم ہو گیا۔ اور جب بادشاہ کو اس بات کی اطلاع ہوی، تو سلطان نے اس تابوت کو مقدس سمجھ کر، ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے۔ یا شاید اس عقیدے سے کہ تعزیہ کی برکت سے ہمیشہ ملک آفات و بلیّات سے محفوظ و مصئون رہے گا، جہاں یہ تابوت ایستادہ کیا گیا تھا، پتھر اور گچ سے اُسی وضع پر چار مینار کی تیاری کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دو لاکھ پچاس ہزار روپے کے صرفہ سے دکانیں اور کمانیں بھی تیار کروائیں۔

اس عمارت کے چار رُخ ہیں۔ اور ہر ایک رُخ چاروں سمتوں کے موافق بنائے گئے ہیں۔ چونکہ عمارت مربع ہے، اس نے اس کا ہر ایک رُخ (۶۰) فیٹ چوڑا اور (۴۲) فیٹ بلند ہے۔ وسطی عمارت چار رفیع الشان محرابوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک محراب کی بلندی ۴۴ فیٹ اور عرض ۳۰ فیٹ ہے۔ اور ہر ایک محراب کے روبرو سے ایک ایک رستہ گذرتا ہے۔ شمالی محراب کا راستہ گلزار حوض سے ہوتے ہوے رود موسیٰ کی طرف گیا ہے۔ اور جنوب کا شاہ علی بنڈے کی جانب، مشرقی کوٹلہ عالیجاہ اور مچھلی بندر کی طرف اور مغرب کا پُل قدیم کی طرف جاتا ہے۔ بالائی عمارت دو منزلہ ہے جس کا بیرونی رُخ خوش نما محرابوں اور قسم قسم کی گلکاریوں سے مزیّن ہے۔ اور چاروں طرف چار بلند مینار کھڑے ہیں۔ ہر مینار چار درجوں پر منقسم ہے اور ہر ایک کا ارتفاع ۸۰ فیٹ ہے۔ اور ان میناروں کی بلندی سطح ارض سے ۱۸۰ فیٹ ہے[1]۔ چاروں میناروں میں سے اوپر چڑھنے کے لئے راستے بنائے گئے ہیں۔ اور تمام سیڑھیاں مدوّر ہیں۔ اور تقریباً ان کی کُل تعداد ایک سو چونتیس ۱۳۴ ہے۔

بالائی عمارت کی پہلی منزل پر مدرسہ آباد تھا۔ اور دوسری پر مسجد کے قریب خزانۂ آب بنایا گیا تھا۔ جس میں تالاب جل پلی سے پانی آتا تھا۔ اور اس خزانہ سے تمام شہر اور محلات

---

[1] آثر دکن میں بلندی ۱۶۰ فیٹ بتلائی گئی ہے جو دکن کی قدیم تاریخوں کے دیکھنے سے یہ بلندی صحیح ثابت نہیں ہوتی۔

شاہی میں پانی تقسیم ہوا کرتا تھا۔
پہلی منزل کے اندرونی حصہ کی ہر سمت میں سات، سات محرابیں ہیں اور انکے درمیانی محرابوں میں چاروں طرف چار گھڑیالیں نصب ہیں۔ ان کے اوزاروں کو اندرونی حصے کی طرف سے ایک بڑے چوبی دروازے کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور ایک گھڑی میں چھ برقی قمقمے لگائے گئے ہیں تاکہ رات میں بھی وقت بآسانی معلوم ہو سکے۔ ان (گھڑیوں) کو ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء میں نصب کیا گیا تھا ان کے عقب میں بہت کافی جگہ موجود ہے۔ اور اسی مقام پر مدرسہ آباد تھا۔ اس اندرونی حصے میں سولہ مدور محرابیں بنائی گئی ہیں۔

دوسری منزل کھلی ہوئی ہے اور اس میں ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ اس منزل کے مشرقی حصے میں پندرہ محرابیں ہیں۔ بیچ کی محراب ایک گول گنبد نما منبر ہے جو مسجد کے لئے تعمیر کی گئی تھی یہ محراب دوسری چار بڑی محرابوں پر مستحکم ہے۔ مشرقی جانب کی محراب سے مسجد میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ گویا یہ محراب منبر کے علاوہ مسجد کے دروازے کا کام بھی دیتا ہے۔ اس عمارت (چارمینار) کے اکثر فوٹو اسی رُخ سے اُتارے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ گنبد عمارت میں بہت خوش نما اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد مسجد کی تینوں جانب یعنی شمال، جنوب اور مشرق میں کمانوں کی مسلسل قطار ہے۔ اور ان کمانوں کی تعداد (تینس ۳۰) ہے۔ (یعنی ہر رُخ پر دس دس ۱۰ کمانیں ہیں)، مسجد کا صحن نہایت کشادہ اور وسیع ہے۔ مسجد اور اس کے صحن میں کم از کم دو سو ۲۰۰ آدمی اچھی طرح نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اصل مسجد کی پانچ کمانیں ہیں۔ اور اس کے اندرونی حصے میں دو طاق ہیں جو شمالاً جنوباً واقع ہیں اور چار مغرب میں ہیں۔ مسجد کے اندر گچ کا فرش کیا گیا ہے فرش پر مصلوں کے نشانات بنائے گئے ہیں۔ صرف اندرون مسجد اکیس ۲۱ مصلے ہیں۔ اور مسجد کے کل سولہ ۱۶ مینار ہیں۔ مسجد نہایت خوش نما اور خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ اس میں گلکاری کا بہت بہترین اور نہایت لاجواب کام کیا گیا ہے۔

مینار کے پہلے اور دوسرے درجے میں دس دس ۱۰ محرابیں ہیں۔ اور تیسرے میں بارہ ۱۲ اور چوتھے درجے میں تیرہ ہیں۔ اور اس چوتھے درجے سے اوپر اور آٹھ محرابیں ہیں۔ اور میناروں کا بالکل آخری حد ہے یہاں سے سارے شہر اور اُس کے گرد و نواح کی بستیوں کے

کے مناظر نہایت خوش نما اور دلفریب نظر آتے ہیں جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
ان محرابوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے اور ان میناروں کے بیرونی رُخوں پر ایک ایک سونے کا کلس لگا دیا گیا ہے۔ اوپر سے محلات شاہی اور دیگر امرا وغیرہ کے مکانات نظر آنے کی وجہ سے، عام طور پر اس عمارت پر چڑھنے کی اجازت نہیں۔

چار مینار کی تیاری میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے۔ (ہون اس زمانے کا ایک سکہ ہے جو ساڑھے چار روپیہ سکہ مغلیہ کے مساوی ہوتا تھا۔ آج کل کے حساب سے سات روپیہ سے زیادہ کا ہوتا ہے) جب سلطنت قطب شاہیہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ اورنگ آرائے حکومت ہوا تو تاج شاہی اور تخت سلطنت سے بے خبر ہو کر سارا راج وزرا و عمال ملک کے سپرد کر دیا۔ پھر کیا تھا؟ جس کو جو سوجھی وہ کر بیٹھا۔ جس کا ہاتھ بنا انہوں نے خزانۂ شاہی کو خوب لوٹا۔ غرض یہ کہ سلطنت میں جب ظلم و تشدد کی انتہا نہ رہی اور مخلوق خدا چیخ اٹھی اور اس کی خبر دارالسلطنت دہلی کو پہنچی، تو شہنشاہ ہند بگڑ بیٹھے اور ان کو رعیت کی پامالی اور مظلومیت ایک آنکھ نہ بھائی مع لشکر جرار گولکنڈے پر چڑھائی کی۔ اور بالآخر قلعہ گولکنڈہ کو عالمگیری فوجوں کے ہاتھوں نے سر کر لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب تانا شاہ کو مقید کر کے اپنے ساتھ دولت آباد لے گیا۔ بعد تسخیر گولکنڈے کی ریاست سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی۔ اور سلطنت دہلی کی طرف سے اس صوبہ کا عامل بہادر دل خاں کو قرار دیا گیا۔ اسی صوبہ دار کے عہد میں چار مینار کا مغربی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا، تو صوبہ دار موصوف نے فوراً اس کی تعمیر بصرفہ سات ہزار کرا دی۔

۱۷۵۶ء میں فرانس کا مشہور جنرل بوسے (BUSAY) اور اس کی فوج اس عمارت کے اطراف کے باغات میں مقیم ہوئی تھی۔

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں پہلی دفعہ نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل کے عہد حکومت میں اس پر ایک لاکھ روپے کے صرفے سے درستی اور استرکاری کی گئی۔ اس کے بعد پھر دوبارہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے عہد وزارت میں اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی، تو سید علی خاں المخاطب بہ حیدر نواز جنگ مہتمم صفائی کے اہتمام سے قریب دو لاکھ روپیہ کے خرچ سے اس کی استرکاری کی گئی۔

۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء سے چار مینار میں سٹی افغان پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا۔ اور ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی تشریف آوری پر اس کو لوہے کی جالی سے محصور کر دیا گیا تھا، اور صرف جانب شمال آمد و رفت کے لئے ایک آہنی پھاٹک لگا یا گیا۔ جو اب تک موجود تھا۔

کچھ عرصہ قبل ماہ ڈسمبر ۱۹۲۹ء ۱۳۴۹ھ میں جب ہز اکسلنسی لارڈ ارون وائسرائے و گورنر جنرل ہند تشریف فرمائے حیدر آباد ہوئے، تو قبل تشریف آوری، شہر آراستہ اور سنوارا جانے لگا، اور شوارعِ بلدہ کی طرح، محکمۂ آرائش سرکار عالی نے چار مینار کی سڑک کو بھی کشادہ کرنے کا انتظام کیا تھا، چنانچہ اس نے بغرض وسعت سڑک، اس لوہے کے کٹھرے (جالی) کو نکال دیا، لیکن اس جالی کی علحدگی نے ایک تاریخی حیثیت اختیار کرلی۔ واقعہ یہ تھا کہ لوہے کے کٹھرے کی حفاظت کے لئے جن پتھروں کو استادہ کیا گیا تھا، ان میں کے جنوب مشرقی کونے کے پتھر کو، جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے چلے کے متصل تھا معلوم نہیں، پہلی مرتبہ کس ہندو نے اس پر سیندور ڈالا، اور یہ سیندور زدہ پتھر آہستہ آہستہ پرستش کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی عام طور سے پرستش اور پوجا ہونے لگی۔ جب اس کی علحدگی کی نوبت پہنچی، تو اکثر ہندو اس کام میں مزاحم ہوئے۔ لیکن حکومت نے ان کی دلجوئی کی خاطر، پہلے پہل یہ حکم دیا کہ "پتھر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ پھر بھی ان لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی حکومت آصفی نے اپنی قدیم رواداری او شہرۂ آفاق رعیت پروری کا ثبوت دیتے ہوئے، اور راستے کی بدنمائی پسند کرتے ہوئے، اپنے اس سرکاری) پتھر کو اور دیولوں کے عمارات کی طرح، ویسے ہی رکھ چھوڑنے کا حکم دیا، جس کو اب بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

ہم یہاں ایک بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ اکثر اہل ملک کا خصوصاً ان میں ہندو حضرات کا اس نیچے کے سیندور زدہ پتھر کو دیکھ کر یہ خیال ہے کہ شاید اوپر (چار مینار پر) بھی کوئی دیول ہو لیکن یہ ایک محض غلط واہمہ ہے، چنانچہ ہم کو رجب ۱۳۴۹ھ کی بیسویں تاریخ اس مشہور عمارت پر جبکہ وائسرائے بہادر تشریف لیجا چکے تھے، اور روشنی وغیرہ کا سامان نکالا جا رہا تھا، مجھے اپنے ایک شفیق دوست جناب حبیب جعفر صاحب الکاف کے ساتھ چڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم دونوں نے خاص طور پر اس بات کی تحقیق کی، لیکن کہیں کچھ نشان تھا نہ مقام، نہ کوئی ایسی جگہ ملی کہ جہاں پر کچھ شائبہ بھی گزر سکے۔

صولتِ[1] عثمانی کے مولف کا یہ بیان ہے کہ، مہاراجہ چندو لعل کے عہد وزارت میں چارمینار کے اطراف و بابچیلی تو ہندوؤں نے اس عمارت کے سامنے بکروں کو لاکر ذبح کرنا شروع کیا۔ یہ واقعات اکثر مسلمانوں کو ناگوار گزرے، چنانچہ حافظ محمد علی خیرآبادی کے مریدوں نے اس کے جنوب مشرقی کونے کے مینار میں حضرت غوث اعظم رح کا چلہ قائم کردیا جس سے ہندو اس کام سے باز رہے۔

جب سے کہ شہر آراستہ و پیراستہ کیا جارہا ہے، اس کا منظر نہایت ہی قابل دید ہے۔ اس عروس البلاد کی آرائش، جس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو اس وقت یہ عمارت شہر کے حسن میں اور چار چاند لگائے گی، جس کا منظر، بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھے گا۔ لیکن تاہم اب بھی دور سے ایک طرف تو عثمانیہ دواخانہ اور ہائیکورٹ وسٹی کالج اور دوسرے طرف چارمینار و مکہ مسجد اپنے عجیب و غریب منظر کے لحاظ سے بڑے ہی دلفریب ودلکش نظر آتے ہیں، جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ یہ نئی عمارتیں خاندان آصفیہ کے جم مرتبہ شاہ والا قدر سلطان العلوم اعلیحضرت نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی بے نظیر یادگاریں ہیں جو اپنا بلاد ہند میں جواب نہیں رکھتیں۔

اس عمارت پر بڑے بڑے موقعوں میں روشنی کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اعلیحضرت میر محبوب علی خان بہادر غفران مکان کے مبارک جشن تسمیہ خوانی میں اس پر روشنی کی گئی تھی جس وقت اکثر متبرک دنوں میں یا بڑی بڑی سرکاری تقاریب میں اس کو رنگ برنگ کی برقی روشنی سے سجایا جاتا ہے تو بس اس خوبصورت شہر میں یہ عمارت بقعۂ نور نظر آتی ہے۔ اور جس کی بہار اور خوبصورتی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کی اندرونی سطح پر ایک حوض بنایا گیا ہے جس میں رات دن، پانی بھرا رہتا ہے۔ تاکہ متعین شدہ فوجی دستہ کو حصول آب میں آسانی ہو۔

اس عمارت کا نقشہ ہمارے چاندی اور سونے کے سکوں پر ہوا کرتا ہے۔ جو اس کی عظمت وبزرگی پر دال ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو صولت عثمانی، صفحہ (۴۴۵)، مؤلفہ قاضی ابوالفتح محمد امیر اللہ صاحب۔

غزل

از

جناب صفی اورنگ آبادی

چل دیا وہ رشکِ مہ گھر اپنا سونا ہو گیا
"چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا ہو گیا!"

پوچھتے کیا ہو کہ تیرا حال یہ کیا ہو گیا؟
تم نہ جانو تو خدا جانے مجھے کیا ہو گیا!

عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا!
قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا!

ان کا دامن کیا چھٹا اک حشر برپا ہو گیا
اپنا قصہ "قصۂ یوسف زلیخا" ہو گیا!

قابل حیرت نہ ٹھہری زندگی تیرے بغیر
میرا مرنا یار لوگوں کو اچنبھا ہو گیا!

جس کو پہلے پہلے دل آزار ہم سمجھا کئے
رفتہ رفتہ اب وہی دل کی تمنا ہو گیا!

ان کو دیکھو، وہ نظر آیا کئے ہر رنگ میں
مجھ کو دیکھو، دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا!

میری آنکھیں تو لگی تھیں شوخئ رفتار پر
اور وہ چلتے ہوئے دل لے کے چلتا ہو گیا!

وہ سراپا ناز ہے مجھ سے بُرا تو کیا کروں!
"چار نے اچھا کہا جس کو وہ اچھا ہو گیا"

اپنے دل کا خون کر ڈالوں تو شاید چین ہو!
یہ تو جس کا ہوگیا کم بخت اس کا ہوگیا!

تابِ نظارہ رہے ہر ایک کو ممکن نہیں
ان کا بے پردہ نکل آنا ہی پردہ ہوگیا

وقت بے وقت آئے، بیشک آئے، لاکھوں بار آئیں
دھوپ میں پھرنے سے دیکھو رنگ کالا ہوگیا!

لے کے دل الزام دیتے ہو، غنیمت ہے یہی
"مال کا مول آگیا اُدلے کو بدلا ہوگیا"

دل کی گھبراہٹ نسیمِ صبحدم سے کم ہوئی
"تم نہ آئے تو غیب سے سامان پیدا ہوگیا"

چاہنے والوں کو دیوانہ بنایا آپ نے
"اور بن پیسے کا لوگوں کو تماشا ہوگیا"

عاشقی میں نام اگر درکار ہے، بدنام ہو!
دیکھ سب کچھ ہوگیا جب قیس رسوا ہوگیا!

کچھ نہ کچھ میں بھی تو سن لوں اپنے دل کی واردات
یا کسی کو دے دیا، گم ہوگیا، کیا ہوگیا؟

عاشقی میں نیک و بد پر آنکھ پڑتی ہی نہیں
اس بلا نے آلیا جس کو وہ اندھا ہوگیا!

کیا یہی ہے شرم تیرے بھولپن کے میں نثار
منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لینے سے پردہ ہوگیا!

میری ہر اک بات قانونِ محبت ہے، مگر
اے صفی! میں شاعری کرنے سے جھوٹا ہوگیا!

سُرخرو

از

(فرانکو ساشتی)

مترجمہ جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔اے

بوکاشیو کا یہ ہمعہد و معاصر ہے۔ سیاسی معاملات میں اس کی بڑی شہرت تھی لیکن دراصل وہ شاعر اور مصنف تھا۔ اس کی تصنیف "نویلیرو" تین سو قصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بہترین وہ ہیں جن میں (شوخی اور حسن بیان سے ظرافت اور فکاہت اس کی تحریروں کا خاص جوہر ہیں۔ اپنے زمانے میں ادنیٰ طبقوں کی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قصہ میں بڑی نزاکت آمود ظرافت ہے۔ اپنے عام قصوں کے برخلاف اس میں مصنف نے اصلیت پیدا کر کے کرداروں کو زندہ بنا دیا ہے۔

(مدیر)

جس زمانہ میں شہر آرزو پادری گائیڈو کے زیر حکومت تھا شہر کیسن ٹینو کے باشندوں نے پادری موصوف کے ہاں اپنے دو سفیر بھیجے اور اس سے استدعا کی کہ بعض اشیا جن کی انہیں خواہش ہے عطا کئے جائیں۔ اس پیام کی اطلاع دیجانے کے بعد قاصدوں سے کہا گیا کہ کل صبح روانگی کے لئے تیار رہیں۔ صبح اپنا سفری سامان عجلت سے تیار کر کے دونوں قاصد روانہ ہوئے اور ابھی وہ بہت دور نہیں گئے تھے کہ ایک نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا "کیا تمہیں تفصیلی پیام یاد ہے؟" ساتھی نے جواب دیا کہ "یاد نہیں کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ تھا" اس پر دوسرے نے کہا "اور میں نے تم پر بھروسہ کیا تھا"۔ آخر دونوں نے کہا "پھر تو ہم بڑی کشمکش میں ہیں، اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" یہ سنکر ایک نے کہا: "آؤ ذرا مسافر خانہ میں چلیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ کیا کیا جائے غالباً کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں اچھی طرح سب یاد آجائے گا" ساتھی نے کہا "تم نے یہ خوب کہی" یہ کہکر دونوں نیم بیدار اور نیم خوابیدہ حالت میں تین بجے مسافر خانہ میں پہنچے۔ پہلے کھانے کا آرڈر دیکر کھانا آنے تک

دونوں فراموش شدہ پیام کو یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ کھانا آنے کے بعد دونوں میز پر بیٹھے اور خوش قسمتی سے انہیں عمدہ شراب میسر آئی کہ جس سے انہیں اپنے پیام کے فراموش کر جانے کا کچھ افسوس نہ ہوا حقیقت میں شراب ایسی عمدہ تھی کہ وہ جام پر جام چڑھاتے گئے۔ اور قریب قریب وہ مدہوش ہو گئے اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ کھانے کے بعد اپنا پیام یاد کرنا تو درکنار وہ یہ بات بھی نہ کہہ سکے اور انہیں اس بات کا تک علم نہ تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں؟ اسی حالت نشہ میں دونوں سو گئے۔

بیدار ہونے پر ایک نے دوسرے سے سوال کیا کہ آیا اسکو پیام یاد آیا کہ نہیں؟ دوسرے نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں لیکن ایسی عمدہ شراب میں نے آج تک نوش جان نہیں کی تھی کھانا کھانے کے بعد میں نے پیام کا مطلق خیال نہیں کیا۔ اب مجھے یہ بھی علم نہیں کہ اس وقت ہم کہاں ہیں" پہلے نے کہا: میرا بھی یہی حال رہا" خدا ہی جانتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے بہرحال آج کا روز اور شب ہم یہیں قیام کریں گے کیونکہ شب کا وقت حافظے کے لئے موزوں ہوا کرتا ہے اور ہم اپنا پیام یاد کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اس پر ساتھی بھی رضامند ہو گیا اور تمام دن وہ وہاں ٹھہرے ہوئے شراب اڑاتے رہے اور کبھی کبھی زیر بحث لاتے تھے لیکن پیام یاد نہ آیا پر نہ آیا۔ رات کے کھانے کے وقت بھی شراب نوشی ہوئی اور پھر وہ سو گئے صبح ناشتہ کے وقت انہوں نے پیام یاد کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ انہیں جتنی توقع تھی اس قدر پیام کے الفاظ یاد نہ آئے۔ آخر ایک نے کہا "دو ساری خرابی شراب میں ہے اب ہمیں آگے چلکر دیکھنا چاہیئے کہ کیا افتاد پڑتی ہے۔ شاید راہ میں پیام ہم کو یاد آجائے" یہ کہکر دونوں روانہ ہوئے اور وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے پیام کے متعلق سوال کیا کرتے تھے اسی حالت میں سفر کرتے ہوئے آخر وہ شہر ارزو پہنچ گئے۔ جہاں وہ پہلے ہوٹل میں اترے۔ اپنے دماغوں کو آرام دینے کی غرض سے وہ ایک خانگی حجرہ میں گئے کیونکہ اب انہیں اپنے پیام کو یاد کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن افسوس ان کی ساری کوشش بے فائدہ ہوئی۔ اور وہ بالکل مایوس ہو گئے۔ ایک نے کہا "اب ہمیں جانا چاہیئے خدا ہماری مدد کرے گا" دوسرے نے کہا "کیا خدا ہماری مدد کرے گا! پادری گاگیٹارو سے اب ہم کیا کہیں ہمیں اصل مطلب کیا یاد رہا؟ تاہم ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے"۔ اس طرح تقدیر پہ بھروسہ کئے ہوئے انہوں نے پادری سے ملنے کی استدعا کی اور بیان کیا کہ انہیں کوئی ضروری خبر بادشاہ کو سنانی ہے۔ جب وہ پادری

کے سامنے پہنچے تو نہایت ادب سے سلام کر کے خاموش کھڑے رہنے پر پادری خود ان کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر خیر مقدم کرنے کے بعد دریافت کیا: "تم کیا خبر لائے ہو؟ دونوں قاصد ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر ایک دوسرے کو بادشاہ کے جواب کے لئے کہنے لگا۔ آخر کار ان دونوں میں سے جو قاصد دلیر تھا اس نے پادری سے مخاطب ہو کر کہا: "خداوند! ہم آپ کے خادمین یعنے شہر کیسن ٹینو کے باشندوں کی جانب سے بطور سفیر حاضر ہوے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمیں بھیجنے والے اور ہم دونوں یکساں آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں لیکن ہم سب کہنے بہت کم ہیں لیکن کرتے بہت ہیں۔ ہمیں ایک پیام عجلت میں دیا گیا تھا اور خواہ اس کا کوئی موقع ہو یا تو مجلس نے ہمیں غلط اطلاع دی یا ہمیں اس کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی بہر حال ہم تمام آپ کی عنایت کے متمنی ہیں۔ اگرچہ ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ ہمارے یہاں بھیجنے کا کیا مقصد تھا"۔ پادری نے ایک عقلمند کی طرح صرف ان کی پیٹھ تھپک کر کہا: "ہاں۔ تمہارا کہنا درست ہے۔ واپس جاؤ اور میرے پیارے بچوں سے کہو کہ میں ہمیشہ خوشی سے ہر طرح ان کی خدمت کرنے تیار رہوں اور یہ کہ آئندہ سے انہیں میرے دربار تک سفرا بھیجنے کے مصارف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے خط و کتابت کیا کریں اور میں بخوشی ان کے سوالات کا جواب دیا کروں گا"۔

یہ کہکر پادری رخصت ہوا اور قاصدوں نے گھر کی راہ لی اثنائے راہ میں کہنے لگے "واپس ہونے کے بعد ہمیں پہلے کی طرح غلطی نہ کرنی چاہیئے" اس پر ایک نے کہا: "ہم یہ کام بہ آسانی نہیں کر سکتے ہمیں کچھ یاد نہیں ہے" دوسرے نے جواب دیا "تاہم ہمیں اپنی عقل کو سلامت رکھنا چاہیئے کیوں کہ ہم سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے کیا پیام پہنچایا اور پادری نے کیا جواب دیا۔ اس لئے کہ باشندگان شہر کو اگر اس بات کا شبہ ہو جائے کہ ان کے قاصدوں نے دیگر قاصدوں کی طرح محض مذاق کیا تو دوبارہ ہم سے یہ کام نہ لیا جائے گا اور ہمارے پیشے کا خدا ہی حافظ ہے؟" یہ سنکر جو قاصد زیادہ ہوشیار تھا اس نے کہا: "اس کو مجھ پر چھوڑ دو ہمارا کام چلتا رہے گا پیام کی نسبت میں انہیں ایسا افسانہ سنا دونگا جو انہیں تو خیر بڑے بڑے عقلمندوں کو بھی حیران کر دے گا۔ پادری نے ایسی عمدہ باتیں کہی ہیں کہ انہیں سنکر وہ بہت خوش ہو جائیں گے۔ میں انہیں خط و کتابت کا حال سنا دوں گا نیز یہ کہ اتحاد و دوستی کو پادری اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے"۔ دوسرے نے کہا:

"خوب سوجھی ۔ اب ہمیں تھوڑی دور چلنا چاہیئے تاکہ ہم سابق کے مسافر خانہ میں ٹھیک وقت پر کھانے کے لیئے پہنچ جائیں"۔ ساتھی نے کہا "تمہارا خیال درست ہے" یہ کہکر افتاں و خیزاں مسافر خانہ کو پہنچے اور کھانے کے انتظار کے بغیر شراب طلب کی ۔ مسافر خانہ کے ملازم نے کہا "جناب پہلے سے زیادہ عمدہ شراب موجود ہے ۔ ملازم فوراً شیشے خالی کرکے شراب دیتا گیا لیکن تھوڑی دیر میں سارے خم خالی ہو گئے ۔ اس بات پر غصہ ہوکر دونوں قاصد وہاں سے گھوڑوں پر روانہ ہوئے اور دو ایک منزل طے کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچے ۔ اصل واقعات ان کے ذہن سے فراموش ہو چکے تھے لیکن فرضی اور جھوٹ حالات کہنا بہت آسان تھا۔ انہوں نے باشندگان شہر کو ایسی باتیں کہیں کہ وہ اپنی سفارت کی کامیابی پر بیحد خوش ہو گئے ۔ اور شہر کا شہران کی شکرگزاری میں رطب اللسان تھا ۔ فوراً اعلی عہدوں پر انہیں ترقی دی گئی ۔

یہ امر تعجب کے قابل نہیں کیونکہ جب ہم خود اپنے ملک کے اعلی عہدہ داروں کا محاسبہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہدہ کے اس سے زیادہ موزوں نہیں جتنے کہ وہ معمولی سپاہی، جو فوج میں ابھی ابھی بھرتی کئے گئے ہوں، اپنے کام کے موزوں ہوتے ہیں ۔ لیکن اس پر بھی یہ خالی ظرف، اس قدر بلند آہنگی سے عوام اور حکومت کو مرعوب کرتے رہتے ہیں کہ، خواہ مخواہ انہیں بلند سے بلند تر عہدے ملتے جاتے ہیں ۔

یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے جس کا خمیازہ ملک اور قوم کو بھگتنا پڑتا ہے !!

جذباتِ عالیہ

از

جنابِ ابوالاعظم مولانا امجد حیدرآبادی

کام، کب حسبِ مدعا نہ ہوا
اُس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ہم تو اک بار اُس کے ہوجائیں
وہ، ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا

ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اُس کو
اک نفس مجھ سے جو جدا نہ ہوا

اب سویرے حضور جاگے ہیں
قافلہ، رات ہی روانہ ہوا

کیا مِلا وحدتِ وجودی سے
بندہ، بندہ رہا خدا نہ ہوا

اب بسے آقا کا ہے غلام امجدؔ
جس کے مانند دوسرا نہ ہوا

ایک گڈریا اپنی محبوبہ سے

از

جناب اجمل حیدر آبادی

آ! میرے ہمراہ چل! اور میری محبوبہ بن کر رہ!
ہم ان تمام مسرتوں سے لطف اندوز ہوں گے ....
... جو اونچے ٹیلوں، نیچی وادیوں، وسیع میدانوں سبز کھیتوں کے ....
.. اور کالے کالے پہاڑوں سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔
ہم پہاڑ کی چوٹیوں سے چراگاہ میں گلہ بانوں کی بھیڑیں چرانے کا تماشہ کریں گے۔
پایاب ندی کے کنارے جس کے ہر نغمے سے آبشار پر خوش الحان چڑیاں روح افزا نغمے الاپ رہی ہوں ....
... میں تیرے لئے ایک سیج بناؤں گا، گلاب کی ....
... ایسے مقام پر جو گوناگوں خوشبوؤں سے مہک رہا ہو، عطر بیز فضا میں۔
پھولوں کا ایک خوشنما تاج اور ایک ملبوس جو حنا کی پتیوں اور پھولوں سے مزین ہو
.... ایک لبادہ جو عمدہ ترین اون سے بنا ہوا ہو ....
..... اس نرم و نازک اون سے جو خوبصورت بھیڑوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسم سے تراشی جاتی ہو ....
.... سرد زمین کے مضر اثرات سے تجھے بچانے کے لئے۔
دلفریب نقش و نگار کی مخملیں پاپوش جس کے بکل خالص سونے کے ہوں۔
... عشق پیچاں کی کلیوں اور پتیوں کا ایک کمربند ....

.... جس پر عنبر کے تکمہ لگے ہوں ....

...... اگر ان چیزوں میں تیرے لئے کچھ دلکشی ہے ....

.... تو آ ! میرے ساتھ چل ! اور میری محبوبہ بن کر رہ !

تیرے دسترخوان کی چاندی سونے کی قابیں، ....

.... جو لذیذ ترین تازہ بتازہ اغذیہ و اشربہ سے پُر ہوں، ....

..... ایسی بیش بہا ہوں کے دیوتاؤں کے خاصہ کے قابل ....

.... ہاتھی دانت کی میز پر چنی ہوئی ہوں۔

تیرا دل بہلنے کے لئے مئی کے خوشگوار مہینہ کی ہر صبح، ....

... نوجوان سادہ لوح چرواہے تجھے ناچ گا کر خوش کریں گے ....

... اگر ان چیزوں سے تجھے دلچسپی ہے، ....

.... تو پھر آ ! میرے ساتھ چل ! اور میری محبوبہ بن کر رہ !　　(ماخوذ)

علّامہ بحرالعلوم شمسی

از

جناب نواب محمد بہادر خاں صاحب ضیغم نواب نصیب یار جنگ بہادر

تمہید علمائے متقدمین میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے سے کم درجہ اور کم علم افراد کو شہرت حاصل کرتے دیکھا لیکن باوجود علم و فضل کے ان کے اپنے دل میں کبھی شہرت طلبی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس بیسویں صدی عیسوی میں جس کو اشتہار بازی و شہرت طلبی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی مثال صرف علامۂ بحرالعلوم اشرف العلما مولوی سید اشرف شمسی برد اللہ مضجعہ کی ذات ہی میں مل سکتی تھی۔ ہندوستان کے ان تمام اخبارات و رسایل میں جو گذشتہ ستر سال سے چھپتے اور شایع ہوتے رہے ہیں غالباً مجلۂ مکتبہ وہ پہلا رسالہ ہے جس کو علامۂ مرحوم کے حالات زندگی کلام اور تصانیف کا تذکرہ ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

نام نسب بچپن سید اشرف نام تھا۔ ابو التشریف کنیت۔ شمسی تخلص فرماتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید علی صاحب اور دادا کا نام نامی سید اشرف عرف عالم اچھا میاں صاحب تھا۔ آپ گروہ مہدویہ کے ایک مشہور دودمان سیادت "یداللہی" کے چشم و چراغ تھے سنہ ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر تھی کہ والد بزرگوار نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد علامۂ مرحوم نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمود مرحوم و مغفور کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔

تحصیل علوم ذوق علم ورثہ میں ملا تھا۔ ابتدائے تعلیم برادر بزرگوار سے حاصل کی، پھر حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ اور مولانا سید داؤد صاحب قبلہ مشائخین مہدویہ سے فارسی کی تکمیل فرمائی۔ فطرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں طغرائے ظہوری اور چہار عنصر بیدل جیسی کتابیں پڑھ لیں۔

عربی کا شوق ہوا تو آپ کے برادر محترم نے اپنے استاد علامہ عباس علی خاں مرحوم کی خدمت میں حاضر کیا۔ شاگرد رشید کی غیر معمولی ذہانت و محنت نے آپ کو استاد علام خاص عنایات و الطاف کا مورد بنادیا۔ دس سال کی کوشش کے بعد ۲۵ سال کی عمر میں جب علامہ مرحوم فارغ التحصیل ہوئے تو علامہ عباس علی خاں مرحوم نے مکہ مسجد کے ایک عظیم الشان جلسہ میں دستار بندی فرمائی۔ اور علامہ مرحوم کو اپنے ساتھیوں میں یہ امتیاز بخشا کہ سند حدیث میں آپ کو بحر العلوم کے خطاب سے مخاطب کیا اور سر مجلس اپنی قبا اتار کر اپنے ہاتھوں سے علامہ مرحوم کو پہنائی۔

اس دستار بندی و سند حدیث نے علامہ مرحوم کی تشنگی علم کو بجھا نہیں دیا اس کے بعد علوم ریاضی کی تکمیل علامہ عبدالصمد خاں صاحب قندھاری سے فرمائی اور زمانۂ ملازمت میں حضرت سید اللہ بخش صاحب قبلہ مشایخ مہدویہ سے علم نجوم حاصل کیا۔ مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب سے قرات سبعہ کی تحصیل کی اور اپنے برادر بزرگوار سے علم تصوف و سلوک کی تعلیم پائی۔

علامہ مرحوم کے برادر محترم فن شمشیر زنی او بنوٹ میں یکتائے روزگار تھے۔ علامہ مرحوم نے ان سے اس فن کو تمام و کمال حاصل فرمایا تھا اور اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

علامہ مرحوم کی تحصیل علم طالبان علم کے لئے درس عبرت ہے۔ وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے وہ متوکل فقراء مہدویہ کا گھرانہ تھا۔ جن کا توکل آج بھی بے نظیر ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ یومیہ اور وظیفہ کو عار اور جاگیر و منصب کو ننگ سمجھا۔ اور جو ہر وقت "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ" کی مصداق رہے۔ جن کے مسلک میں ذریعہ معاش کا تعین ناجائز اور اپنے باپ اور بھائی کے سامنے بھی دست سوال دراز کرنا حرام تھا۔ دو دو روز تک کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ پھٹے پرانے کپڑے جسم پر ہوتے۔ رات کو چراغ کے لئے تیل نہ ہوتا۔ لیکن شوق علم میں کبھی فرق نہ آتا۔ اگر کبھی ان تکالیف نے ہمت پست بھی کی تو بڑے بھائی کے صبر و رضا نے ہاتھ تھام لیا جن کو دیکھتے تھے کہ تیسرے دن کا فاقہ ہے اور معتقدین سے مسکرا مسکرا کر ہم کلام ہیں۔ دستار بندی کے جلسہ کے روز حیدرآباد کے چھوٹوں اور بڑوں سے

کی مسجد بھری ہوئی ہے اور حیدر آباد کا یہ قابل فخر فرزند اس میں بغیر شیروانی و عمامہ کے جلسہ میں شریک ہوتا ہے، جسم پر ایک پھٹا ہوا کرتا ہے اور سر پر عمامہ کی بجائے ایک دستی لپیٹی ہوئی۔ غرض یہ کہ اس حالت گدائی اور ان تکالیف و مصائب کے باوجود حضرت مرحوم نے جن علوم میں کمال حاصل کیا وہ حسب ذیل ہیں :۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، معانی و بیان، صرف و نحو، عروض و قافیہ، ادب عربی و فارسی، منطق و علم کلام، تاریخ و مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، فلسفۂ قدیم۔

ذریعہ معاش۔ ملازمت حضرت علامۂ مرحوم بھی اس تذکرہ کو ناپسند فرماتے تھے اور میں بھی اس کو قلمبند کرتے ہوئے رنج و ملال محسوس کرتا ہوں کیونکہ حضرت علامہ نے فراغت تحصیل کے بعد حصول ملازمت تک اپنے جگر گوشوں اور دل کے ٹکڑوں یعنی تصانیف کو فروخت کرکر کے قوت لا یموت کا سامان حاصل کیا۔ ایک دو مثنویاں اور علوم معقول و منقول میں کئی تصانیف جو ان کے معاصرین کے ناموں سے منسوب ہیں اگر اس خانہ خراب تنگ دستی نے ان کو مجبور نہ کیا ہوتا تو آج حضرت علامۂ مرحوم کی تصانیف کے ساتھ ان کے نام گنائے جا سکتے۔

ابتدائی ملازمت علاقۂ صرف خاص مبارک میں اختیار کی۔ پھر صدر محاسبی سرکار عالی میں کام کرتے رہے۔ اور بالآخر مدرسۂ دار العلوم میں جو اس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا کالج تھا، پروفیسر مقرر کئے گئے۔ یہاں علامۂ مرحوم کے ذمہ مولوی فاضل و کامل کی جماعتوں کی تعلیم رہی۔ جب مدرسۂ دار العلوم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں ضم ہوا تو مولانا کی خدمات بھی وہیں منتقل ہوگئیں۔ اور یہاں ملک و اہل ملک کی ناقدر شناسی اور حضرت علامہ کی غیور و خوددار طبیعت نے جو عہدہ داران وقت کی چاپلوسی اور آستان بوسی کو کبھی گوارا نہ کر سکتی تھی نہ صرف ان کو مددگار پروفیسر کی جگہ دی بلکہ ایک ایسا مضمون فارسی جدید ان کے سپرد کیا گیا جس میں ان کو اپنے کمالات علمی کے اظہار کا بہت کم موقعہ تھا اور جو ان کے تلامذہ کے لئے بھی قابل التفات چیز نہ تھی۔ لیکن کبھی حضرت علامہ نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ فرمائی۔ بلکہ اس دلچسپی اور دلدہی سے پڑھایا کہ ان کے شاگرد ان کو کبھی نہیں بھلا سکتے

اسی محنت، فرض شناسی، پابندی وقت اور دلدہی کا نتیجہ تھا کہ بلا درخواست مسلسل پانچ سال تک ان کی توسیع سرکار سے منظور ہوتی رہی اور اپنے انتقال سے صرف تین سال قبل وہ وظیفہ حسن خدمت کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش کیے گئے۔

اشاعت علم حضرت علامہ مرحوم کا مقصد حیات صرف ایک تھا یعنی "اشاعت علم" اپنی عمر کے ۲۵ سال حصول علم میں صرف کیے تھے باقی ۴۴ سال اس کی اشاعت میں گذارے اور اس فرض کو جو "ورثۃ الانبیاء" کا منصب اولین ہے، حیات مستعار کا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ادا کیا۔ جن جن علوم کی تحصیل کی تھی وہ سب مستحضر تھے۔ ان کو بلا کسی تیاری کے وہ اس طرح پڑھاتے کہ طالب علم سیر ہو جاتا۔ مولانا کا دولت کدہ طالبان علم کا کعبہ تھا اوقات مدرسہ کے سوا ہر وقت طلبار کا مجمع رہتا۔ دن اور رات کے شاید ہی چند گھنٹے مولانا کو آرام ملتا تھا۔ نماز فجر کے بعد ہی درس شروع ہو جاتے۔ جب مدرسہ کا وقت آتا تو کوئی ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے جھٹکہ پر سامنے کی جانب بیٹھ جاتا۔ مدرسہ پہنچنے تک راستہ میں درس ہو رہا ہے۔ کالج میں بھی جن فرایض کو انجام دیتے تھے وہ اشاعت علم ہی سے متعلق تھے۔ واپسی میں بھی جھٹکہ میں ایک آدھ طالب علم کا ساتھ ہوتا۔ گھر پہنچتے اور تلامذہ کو منتظر پاتے۔ رات کو گیارہ گیارہ بجے تک اسی میں مصروف۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب جن کو کسی اور وقت میں فرصت نہ ہوتی تھی رات کو ۲ بجے حدیث پڑھنے کے لیے آتے اور مولانا کو مستعد پاتے۔ کبھی آپ نے اپنے پڑھے ہوئے علوم میں سے کسی کے پڑھانے میں تامل نہیں کیا۔ ایک مبتدی میزان ومنشعب کے پڑھنے کی خواہش کرتا تو اس کو بھی پڑھا دیتے اور منتہی تلامذہ فصوص الحکم وشمس بازغہ کے درس کی درخواست کرتے تو وہ بھی رد نہ ہوتی۔ حلقۂ درس میں امیر وغریب میں امتیاز نہ تھا۔ نواب کاظم علی خان فرزند نواب شوکت جنگ بہادر۔ نواب سردار علی خان خلف نواب سردار یار جنگ مرحوم اور نواب معین الدین خان خلف صادق جنگ مرحوم کو بھی اسی بوریہ پر بٹھا کر پڑھایا جس پر ان سے قبل ایک گدائے گوشہ نشین کا فرزند بیٹھا بیٹھ کر پڑھ چکا تھا۔

سررشتۂ تعلیمات ودیگر دفاتر سرکار عالی میں جو نوعمر حیدرآبادی افاضل علوم شرقیہ ہیں

احصا کیا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا نکلے گا جس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت علامۂ مرحوم کے چشمۂ فیض سے سیرابی کا موقع نہ ملا ہو۔ اپنے اور بیگانے کا کبھی خیال نہ کیا۔ سب کو شفقت اور دلچسپی سے تعلیم دی۔

اگر کوئی ذہین و محنتی طالب علم ملجاتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے کوئی خزانہ ان کو ملگیا ہے۔ اگر ایک دن کے لئے بھی اس کا سبق ناغہ ہوتا تو دوسرے روز حضرت علامہ کالج سے واپس ہوتے ہوئے اس کے گھر پر موجود ہو جاتے اور مزاج پرسی کے بعد وجہ غیر حاضری دریافت فرماتے۔ پابندیٔ سبق کی نسبت نصیحت کر کے واپس تشریف لاتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس نے ایک دفعہ ان سے پڑھ لیا اس نے پھر کوئی دوسرا دروازہ نہ دیکھا۔

سوائے ملازمت سرکاری اور زمانۂ ابتدائی کی دو چار خانگی ملازمتوں کے کسی کو معاوضہ لیکر نہ پڑھایا۔ مجھے چودہ سال تک حضرت کی قدمبوسی کا شرف حاصل رہا ہے۔ حضرت قبلہ گاہی مرحوم کو تمنا ہی رہی کہ مجھے مولانا جو درس دیتے تھے اس کے معاوضہ میں کچھ قبول فرمائیں لیکن تنخواہ یا مشاہرہ تو کیا کبھی کوئی تحفہ و ہدیہ تک بھی قبول فرمانا گوارا نہ کیا۔

شاعری زبان فارسی کے پرگو شاعر تھے طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ ایک ایک نشست میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر لکھ دینا بڑی بات نہ تھی۔ تمام اصناف سخن پر قادر تھے۔ لیکن غزل اور قصیدے زیادہ کہے ہیں۔ کسی امیر و بادشاہ کی شان میں شعر کہنا ان کی طبع غیور کے خلاف تھا۔ اکثر قصیدے نعت یا منقبت بزرگان دین میں کہے ہیں ابتدائی کلام میں بیدل کا انداز تھا، آخر میں حکیمانہ اور ناصحانہ طریقہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور برجستہ کہتے تھے۔ ان کے دواوین میں کئی عربی قصیدے موجود ہیں۔ اردو میں پانچ دس سے زیادہ شعر نہیں۔

دو تین ضخیم جلدیں علامۂ مرحوم کے کلام سے پُرہیں اور یہ وہ کلام ہے جو اس بیاض کے سپرد آب ہونے کے کئی سال بعد جس میں دس ہزار ابیات تھیں مرتب ہوا اور جس کو علامۂ مرحوم نے ایک امیر سے شعراء کی تنقیص سنکر اور یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں قدر سخن نہیں ہے باولی میں پھینک دیا تھا۔

اگرچہ آپ کا تخلص آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا مگر شاعری علامہ مرحوم کا اصلی فن نہیں تھا۔ اس کو انہوں نے محض اوقات فرصت میں دل بہلانے کے لئے اختیار فرمایا تھا۔ اور واقعہ ہے کہ جب وہ اپنے مشاغل علمیہ سے فارغ ہوجاتے یا علیل ہوتے اور کوئی کام نہ کرسکتے تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے۔

چند قصاید متفرق طور پر اور ایک مختصر مجموعہ انتخاب قصاید شمسی کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔

اخلاق و عادات علامہ مرحوم میں بہت سی اخلاقی خوبیاں جمع تھیں جس کسی نے آپ سے ایک دفعہ ملاقات کی پھر وہ آپ کا گرویدہ ہوگیا۔ حد درجہ بامروت، خلیق، نرم مزاج اور حلیم تھے۔ خودداری اور غیرت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے اپنی کسی غرض کے لئے ہاتھ نہ پھیلایا۔ عہدہ داران وحکام سرکاری کی چاپلوسی وخوشامد کو ہمیشہ عار سمجھا کئے۔ اگر کسی شاگرد نے کوئی خدمت کردی (مالی خدمت تو کبھی قبول ہی نہیں کی)، تو جب تک اس کے ساتھ علاوہ تعلیم وتدریس کے کوئی اور اچھا سلوک نہ کردیا آرام نہ لیا۔

حسن معاملہ میں بے نظیر تھے۔ اگر کسی کا قرض ہوجاتا تو اس کی ادائی تک کچھ عجیب بیقراری مولانا کو رہتی اور جب ادا کردیتے تو شکر خدا بجالاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے موٹر اجازت پر منگوائی معلوم ہوا نواب کاظم علی خان صاحب سے اپنے صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ صاحب کی پہلی شادی کے لئے کچھ قرض لیا تھا اس کی ادائی کے لئے کوہ مولا کو جانا ہے جہاں نواب صاحب اس زمانہ میں رہتے تھے۔ میں نے موٹر بھیجی اور ایک عریضہ میں گلہ کیا کہ میرے ہوتے آپ نے اپنی ضرورت پر دوسروں سے قرض حاصل کیا۔ جواب میں تحریر فرمایا مجھے اندیشہ تھا تم روپیہ دیکر واپس نہ لوگے۔ میں جانتا تھا کہ ساڑھے چار سو کی تنخواہ ان کے یہاں بیس روز سے زیادہ کافی نہ ہوتی تھی۔ خرچ تو پچاس پون سو ہی کا ہے لیکن خیرات میں سب اٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی قرضہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس لئے وعدہ کرلیا کہ ایک روپیہ اگر آپ بطور قرض لیکر واپس کردیں گے تو لے لوں گا۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ مجھ سے قرض حاصل کیا مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ تنخواہ یا وظیفہ انہوں نے

کالج یا خزانہ سے اٹھایا ہو اور میرا قرض ادا کئے بغیر گھر گئے ہوں ۔

سادگی اس بلا کی کہ اچھے کپڑے، اچھے کھانے، اچھے لباس کا کبھی خیال نہ کیا ۔ جب میں نے پہلی دفعہ سبق کے لئے حاضر ہونا شروع کیا تھا تو صرف ایک بوریا پر جو اکثر جگہ سے پھٹا ہوا تھا ۔ بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے ۔ جب باہر کے کمرے بنکر تیار ہوگئے تو ان میں ایک دری بچھادی گئی تھی ۔ اسی کمرہ کے ایک گوشے میں ۔ حضرت مولانا تشریف فرما ہیں ۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں ۔ قمیص کے [illegible] ہوئے ہیں ۔ پاندان ایک طرف رکھا ہے اور دوسری طرف کتابوں کے انبار ایک چھوٹا سا ڈسک جس پر ایک دوات قلم بھی ہے سامنے رکھا ہے اور حضرت مولانا مصروف درس ہیں ۔

مختصر یہ کہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے حضرت مولانا علما ر متقدمین کا ایک مکمّل نمونہ تھے جس کا اس زمانہ میں پھر نظر آنا دشوار ہے ۔

تصانیف اشاعت علم کے عنوان سے میں نے ان صفحات پر جو کچھ لکھا وہ نامکمل ہے ۔ جب تک مولانا رمرحوم کی تصانیف کا تذکرہ نہ کیا جائے صرف درس و تدریس ہی کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اشاعت نہیں کی بلکہ اپنے بعد تمام اصناف علوم پر تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف کا ایک بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ۔ جو وقت مدرسہ اور درس و تدریس کے اوقات سے بچ جاتا اس میں تصنیف و تالیف کا شغل رہتا ۔ نہ اُن کو تمنا تھی نہ ان کی تقدیر نے اپنی زندگی میں ان کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے شادکام ہونے کا موقع دیا ۔ چند چھوٹے چھوٹے رسالوں کے سوا باقی سب کتابیں اب تک طبع نہیں ہوسکیں ۔ ۲۰ سال کی محنت میں قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان میں لکھی جو کئی ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے ۔ علم نحو میں ایک (۸۰۰) صفحہ کا رسالہ لکھا ۔ جو اپنی آپ نظیر ہے اور جس میں ان تمام مسایل تجوید پر جو علما ر متقدمین میں مختلف فیہ رہے ہیں نہایت مبسوط بحث کی ہے ۔ منطق، علم کلام، تصوف، قراءت، نجوم، عقاید، اصول حدیث اصول فقہ اور علم اخلاق میں کئی رسالے تصنیف فرمائے جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے ۔

میری درخواست پر اپنے آخری ایام حیات میں تفسیر لوامع البیان کا مقدمہ

تحریر فرمانا شروع کیا تھا جس کے ساڑھے پانچ سو صفحات لکھے گئے تھے اور عبادات کا باب شروع ہوا تھا کہ حضرت علامہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور انتقال فرمایا۔ یہ حضرت مرحوم کی آخری تصنیف ہے۔

اہل و عیال علامۂ مرحوم نے اپنی زندگی میں اولاد کے بہت داغ اُٹھائے۔ آپ کو دو صاحبزادے اور کئی لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے فرزند مولوی سید علی مرحوم جن کو حضرت علامہ نے بڑی محنت سے تعلیم دی تھی اور جنہوں نے نوعمری میں اپنے آپ کو باپ کی جانشینی کے قابل ثابت کردیا تھا عین اس وقت انتقال کیا جبکہ مولوی فاضل و کامل کے امتحانات میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب اور صاحبِ تصانیف ہو چکے تھے۔ ان کی تصانیف کے منجملہ "شرح دیوان زہیر" چھپ گئی ہے عربی میں نہایت برجستہ شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو کلام بھی بہت اچھا تھا۔ یہ داغ کچھ کم نہ تھا کہ مسلسل کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ سب سے بڑی اور نہایت قابل صاحبزادی کا انتقال حضرت علامہ کی وفات سے صرف ۶ ماہ قبل ہوا تھا جنہوں نے کئی چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بعد چھوڑے۔ زمانۂ مرض الموت میں ایک دفعہ فرمایا۔ میاں جو زخم دل میں تھے وہ پیٹھ میں نکل آئے ہیں۔

اب صرف ایک صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ ان کی یادگار ہیں اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت بی، اے میں زیرِ تعلیم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور حضرت علامۂ مرحوم کا سچا جانشین بنائے۔

علماء و کاملین کی صلبی اولاد کے ساتھ ان کی روحانی اولاد بھی قابل ذکر ہے جو ان کے نزدیک اول الذکر سے کچھ کم عزیز نہیں۔ یوں تو حضرت علامہ کے تلامذہ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا گنوانا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن قابل ذکر حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جانشین علامۂ مرحوم جناب مولانا مولوی محمد سعادت اللہ خان صاحب ہوش مولوی فاضل و کامل و متکلم اول مددگار پرنسپل مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم سرکار عالی

(۲) حضرت مولانا مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ فرزند حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ رح

جو اکابر مشائخین ہندو یہ سے ہیں۔

(۴۹) حضرت مولانا سید سالم صاحب مولوی فاضل وکامل امل چین ٹپن علاقہ میسور۔

(۵۰) حضرت مولانا سید مرتضیٰ صاحب۔

(۵۱) حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب افضل العلماء۔

. . . .

خدا ان سب کے فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے جو درحقیقت حضرت علامہ کے فیوض و برکات عظمیٰ ہیں۔

وفات اوائل ذیحجہ ۱۳۴۸ھ میں مرض سرطان میں حضرت علامہ مبتلا ہو گئے۔ ابتدا میں یہ مرض پہچانا نہ گیا۔ اور مختلف علاج کئے گئے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب سے یہ مرض شروع ہوا تھا حضرت مرحوم کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ عشرہ محرم میں اپنے عقاید کے بموجب ترک دنیا کی اور وظیفہ حسن خدمت سے دست برداری فرمائی۔

جب مرض نے ترقی کی تو پھر میرے مجبور کرنے پر دواخانہ عثمانیہ میں علاج کروانے پر راضی ہوئے۔ ایک خاص کمرہ لیکر اس میں رکھا گیا اور عمل جراحی ہوا۔ لیکن مرض بڑھتا ہی گیا۔ ۲۵ محرم ۱۳۴۹ھ کو مکان واپس لایا گیا اور ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۹ھ روز سہ شنبہ کو صبح طلوع فجر کے وقت ۶۹ سال کی عمر میں تقدیر الٰہی کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس مرض میں حضرت علامہ کی قوتِ برداشت کے اندازہ کا موقع ملا۔ ہوشیار ہیں اور پیٹھ زخموں سے بھری ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کتر کتر کر علیحدہ کر رہے ہیں لیکن پیشانی پر بل ہے نہ چہرے پر زردی۔ میں نے جب تسلی کے الفاظ کہے تو ارشاد ہوا کہ ہماری زندگی میں مسرت و آرام کے ایام اور مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں سو اور دس کی نسبت ہے لیکن انسان کتنا ناشکر گذار ہے کہ دس دن کی مصیبت کے لئے سو دن کے آرام کو بھول جاتا ہے۔

غرض حضرت علامہ کئی حیثیتوں سے اپنی آپ نظیر تھے۔ اب وہ آفتاب علم کہاں جو پچاس برس سے حیدرآباد پر ضیا پاش تھا۔ وہ دریائے علم کہاں جس نے ہزاروں تشنہ کامان علم کو سیراب کیا تھا۔ اب چنچل گوڑہ کا وہ مشرقی اور سنسان کنارہ جس کی پگڈنڈی کے راستوں پر صبح و شام ہر وقت طالبان علم کتابیں بغل میں دبائے قلم ہاتھ میں لئے سر جھکائے یا ایک دوسرے سے چپکے چپکے گفتگو کرتے ہوئے گذرتے نظر آتے تھے آج ویران پڑا ہے۔ وہ حجرہ جس کی میلی شطرنجی پر بیٹھنے سے قلب کو نور اور دماغ کو روشنی ملتی تھی شمع علم سے خالی ہے۔ آہ شمسی آنکھ تمہارے دیکھنے کو کان تمہاری آواز کے سننے کو اور قلب و دماغ تمہارے زبان سے نکلے ہوئے مسایل علمیہ و دینیہ کے سمجھنے کو بیقرار ہیں تم اپنے وقت پر گئے مگر ہم کو بے وقت چھوڑا۔ خدا تمہارے درجات بلند کرے۔ تم کو اپنے دیدار سے سرفراز کرے اور جنتیوں میں تم اسی عزت سے رہو جس عزت سے یہاں تھے۔ تم کو زمانہ نے تمہارے بعد یاد کیا ہے لیکن اب بھلا نہیں سکتا۔ تمہاری تصانیف تم کو زندہ رکھیں گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے!

اگر پہلے عدد کے اجزا نکالے جائیں اور پھر ان کو جمع کریں تو دوسرے عدد کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے اور اگر دوسرے عدد کے اجزا نکالے اور جمع کئے جائیں تو ان سے بھی پہلے عدد کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے۔

حکما نے اس قاعدے کی اس طرح توضیح کی ہے کہ واحد یعنی (۱) میں وحدت حقیقی ہے اور یہی وحدت حقیقی اصل ہے۔ جب اس وحدت کے ساتھ ایک مرتبہ یا کئی مرتبوں کا اعتبار کیا جاتا ہے تو اس اعتبار سے کثرت پیدا ہوتی ہے پس کثرت امر اعتباری ہے۔ یہ بات ان کے پاس بہت بڑی چیز اور اصل کلی ہے جس سے انہوں نے سینکڑوں مجہول چیزوں کو معلوم کیا ہے، علم ارثماطیقی میں بھی یہی اصل اعظم ہے اور بیان کیا ہے کہ جب واحد (۱) کے ساتھ دوسرے مرتبہ کا اعتبار کیا گیا تو (۲) حاصل ہوئے اور جب اس کے ساتھ تیسرے مرتبہ کا اعتبار کیا گیا تو (۳) حاصل ہوئے پس (۲) واحد کا زوج اور (۴) زوج الزوج ہے۔ کیونکہ اس میں چار اکائیاں ہیں یعنے وحدت اصلی کا تین بار اعتبار کیا گیا ہے ان چار اکائیوں کو انہوں نے اس طرح لکھا ہے (۱۱۱۱) ان میں سے پہلی اکائی کو مرتبہ آتش قرار دیا ہے کیونکہ واحد حقیقی اور بسیط ہے۔ دوسری اکائی کو مرتبۂ ہوا قرار دیا ہے کیونکہ اس نے دوسرے مرتبہ کے ساتھ ترکیب کھائی ہے، تیسری اکائی کو مرتبۂ آب قرار دیا ہے کیونکہ اس نے دوسرے مرتبہ کے ساتھ ترکیب کھائی ہے اور چوتھی اکائی کو مرتبہ خاک قرار دیا ہے کیونکہ اس نے تین مرتبوں کے ساتھ ترکیب پائی ہے۔ ان میں سے پہلی اکائی آتشی ہے، دوسری ہوائی، تیسری آبی اور چوتھی خاکی پس آتش مبدأ حرارت ہوئی اور ہوا مبدأ رطوبت، پانی مبدأ برودت اور مٹی مبدأ یبوست کیونکہ چوتھی اکائی پر کیفیات اولیہ پورے ہو جاتے ہیں اس لئے چار کو عدد کامل کہتے ہیں۔ اخلاط میں بھی انہوں نے اسی ترکیب کا اعتبار کیا ہے پہلی اکائی سے صفرا کو دوسری سے خون کو تیسری سے بلغم کو اور چوتھی سے سودا کو تشبیہ دی ہے۔ غرض چار کیفیتوں چار طبیعتوں اور چار خلطوں میں اسی اکائی تک اعتبار کیا گیا ہے بہت سے امور حقیقیہ و اعتباریہ میں اسی عدد سے کام لیا گیا ہے۔ اہل علم الحروف نے اپنے

اصول صناعیہ میں اسی اصل طبعی کا اعتبار کیا ہے اور ان اعداد کے مقابلہ میں ا ب ج د کو ٹھہرایا۔

اہل محبت و غلبہ نے اعداد متحابہ کے استخراج میں ان ہی اکائیوں اور اسی عدد سے مدد لی ہے۔

واضح ہو کہ اعداد متحابہ یعنی (۲۸۴) اور (۲۲۰) کے دریافت کرنے کا یہ قاعدہ ہے کہ پہلے عدد واحد یعنی (۱) زوج لیا جائے اور وہ (۴) ہیں جب چار کو تیسرے مرتبہ میں جو مرتبۂ آب ہے اور صفت میلان سے موصوف ہے ضرب دیا جائے تو (۱۲) حاصل ہوں گے اور پھر اس کو[1] (۳) کے نصف یعنی ۱½ میں اس وجہ سے ضرب دیا جائے کہ عدد (۳) جس میں مرتبہ میلان ہے محبوب و محب میں مشترک ہے جب اس[2] کی تنصیف کیجائے گی تو ہر ایک کا حصہ نصف ہوگا اور اس عمل ضرب سے (۶) حاصل ہوں گے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ (۱۲)(۶) کے مرتبۂ اثنینیت[3] میں ہیں یعنی دونوں عدد خود زوج ہیں اور عاشق و معشوق میں سے ہر اک فرد ہے پس اعداد اور معدود میں نسبت تضاد ہے اور اس تضاد کو رفع کرنے اور مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے کہ (۱۲) میں سے (۱) اور (۶) میں سے (۱) کی تفریق کیجائے تو (۱۱) اور (۵) باقی رہ جائیں گے۔ اس تفریق کے بعد محب کے عدد بھی فرد ہونگے اور معدود و عدد میں مناسبت ہوگی۔ جب ان دونوں میں ازدواج پیدا کرنے کے لئے ضرب دیا جائے گا ۵۵ حاصل ہوں گے اور جب اس کو (۴) میں ضرب دیا جائیگا تو (۲۲۰) حاصل ہو جائیں گے یہ عدد محبوب کے لئے ہے۔ محب کے اعداد اس طرح نکالے جائیں: پہلے (۱۱) و (۵) میں ضرب دیا جائے تو (۵۵) حاصل ہوں گے۔ پھر حاصل جمع[4] (۱۶) کو حاصل ضرب[5] (۵۵) کے ساتھ جمع کیا جائے تو (۷۱) حاصل

---

[1] یعنی چار کو۔ [2] یعنی تین کی۔ [3] یعنی ایک عدد دوسرے کا ضعف ہے ایک عدد جو کم ہے (۲) میں ضرب کھانے سے دوسرے عدد کے برابر ہو جاتا ہے۔ [4] یعنی گیارہ اور پانچ کے حاصل جمع کو جو سولہ ہوتا ہے۔
[5] یعنی گیارہ اور پانچ کے حاصل ضرب کے ساتھ جو پچپن ہوتا ہے۔

ہوں گے۔ پھر (۷۱) کو زوج الزوج یعنے چار میں ضرب دیا جائے گا تو (۲۸۴) حاصل ہوجائیں گے یہ اعداد محب ہیں۔ ہماری تقریر سے ظاہر ہے کہ دونوں عددوں کی اصل عدد کامل یعنے (۴) ہے۔ حکما کہتے ہیں کہ ان دو عددوں میں سے بڑا عدد (۲۲۰) ہے اور چھوٹا (۲۸۴) کیونکہ بڑے عدد کی انہوں نے یہ تعریف کی ہے کہ وہ عدد بڑا ہے جس کے اجزا کا مجموعہ چھوٹے عدد سے بڑھ جائے چھوٹا عدد وہ ہے جس کے اجزا کا مجموعہ بڑے عدد سے گھٹ جائے۔ (۲۲۰) کو اس وجہ سے بڑا کہا ہے کہ جب اس کے اجزا نکال کر ان کا مجموعہ بنایا جاتا ہے تو یہ مجموعہ (۲۲۰) سے بڑھ جاتا ہے اور پورے (۲۸۴) نکلتے ہیں اور یہ عدد محب ہے۔ اسی طرح جب (۲۸۴) کے اجزا نکالے جاتے ہیں تو (۲۲۰) نکلتے ہیں اور یہ عدد محبوب ہے۔ (۲۲۰) کے اجزا یہ ہیں ۱۱۰ و ۵۵ و ۴۴ و ۲۲ و ۲۰ و ۱۱ و ۱۰ و ۵ و ۴ و ۲ و ۱۔ کیونکہ ہماری تقریر سابق سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان اعداد کے ارکان یہ ہیں ۴ و ۵ و ۱۱۔ جب ان میں سے (۵) اور (۱۱) کو باہم ضرب دیا گیا تو ۵۵ حاصل ہوئے[1] اور (۴) اور (۱۱) کو ضرب دیا گیا تو (۴۴) حاصل ہوئے۔ جب (۵) اور (۴) کو ضرب دیا گیا تو (۲۰) حاصل ہوئے (۴۴) کا نصف (۲۲) ہے اور اس کا نصف (۱۱) ہے اور (۲۰) کا نصف (۱۰) ہے اور (۱۰) کا نصف (۵) ہے اور (۴) جو زوج الزوج ہے اس کا نصف (۲) ہے اور اس کا نصف (۱) ہے ان سب اجزا کا مجموعہ (۲۸۴) ہوئے[2] اور (۲۸۴) کے یہ اجزا ہیں ۱۴۲ و ۷۱ و ۴ و ۲ و ۱ جب عدد (۷۱) ۵ و ۱۱ کے مجموعہ اور ۵ و ۱۱ کے ضرب[3] اور حاصل جمع و حاصل ضرب کے مجموعہ[4] سے حاصل ہوا ہے تو اس میں پھر ضرب کی ضرورت نہیں[5]۔ اس لئے ان اجزا کے مجموعہ سے (۲۲۰) حاصل ہوتے ہیں[6]۔ غرض عدد محبوب سے عدد محب اور عدد محب سے عدد محبوب نکلتے ہیں اسی وجہ سے ان کو اعدادِ متحابہ کہتے ہیں۔

---

[1] (۵۵) کو ۲ میں ضرب دینے سے (۱۱۰) حاصل ہوئے۔ [2] یعنی (۱۶) [3] یعنی (۵۵)، [4] یعنی ۴ کو ۲ سے باہم ضرب دیجئے سوائے کسی اور عدد سے ضرب دینے کی ضرورت نہیں [5] اس طرح کہ ۷۱ × ۲ = ۱۴۲ + ۷۱ + ۴ + ۲ + ۱ = (۲۲۰)

محقق دوانی نے اخلاق جلالی میں اعداد متحابہ کا ذکر او ان کے خواص کو بیان کیا ہے کہ ان اعداد کا تعویذ بنا کر جب انسان ساتھ رکھتا ہے تو محبت کا ہیجان ہوجاتا ہے اور محب و محبوب میں محبت ہوجاتی ہے ۔ مگر ان اعدادِ متحابہ کا استخراج اور ان کے اجزا کو دریافت کرنے کی کیفیت نہیں لکھی ۔ اسی واسطے ہم نے ان اعداد اور ان کے اجزا کو اصولِ ارثماطیقی کے موافق دریافت کیا ہے اور اس مختصر رسالہ میں ان کے استخراج کے قواعد لکھدئے گئے ہیں تا طالبان علم کو ان کے استخراج کی کیفیت معلوم ہوجائے ۔ حکماء الہیین نے ان اعداد سے عشق و محبت کے معاملات میں بہت کام لیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ان اعداد کی مشق سے روح کی تنویر ہوتی ہے واضح ہو کہ اس تقریر و توضیح کا یہ مناسب موقع نہیں ہے بلکہ اس کا موقع مناسب بیان محبت ہے مگر جب دیگر علما نے علاج عشق میں یہ تقریر کی ہے تو ہم نے بھی ان کی تقلید کی ہے ۔

علامہ شمسی کا تبحر علمی

از
جناب محمد سعادۃ اللہ خاں صاحب ہوش منشی فاضل و مولوی کامل
اول مددگار فوقانیہ دار العلوم بلدہ سرکار عالی

تمہید — دنیا ناپائیدار ہے! یہ ایک ایسا مقدمہ ہے جس کو برہان سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ روزمرّہ کے مشاہدات و حالات نے اس کو ایک امر بدیہی بنا دیا ہے۔ اس ناپائیدار دنیا میں بقا و دوام کے وجود کا خیال امور متضادہ کے اجتماع کے تصور سے کم نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اعتبارات کی دنیا میں یہ نظریہ غلط اور یہ قضیہ غیر صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کو ایک اعتبار سے اچھی اور پاک کہتے ہیں تو پھر اسی چیز کو دوسرے اعتبار سے بری اور ناپاک قرار دیتے ہیں نفس ہی کو لیجئے حقیقت میں ایک ہے لیکن اس اعتبار سے کہ اس سے افعال نیک صادر ہوتے ہیں مطمئنہ کا لقب پاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ اس سے برائیاں سرزد ہوتی ہیں امّارہ کہلاتا ہے اسی طرح بقا و فنا بھی ہیں کہ دونوں ایک شئے کی صفت بن سکتی ہیں حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے اس شعر سے ہمارے مقصد پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے سہ

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت — نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

اسی طرح دنیا کی پاک ہستیاں گو اس عالم فانی سے نقل کرتی ہیں لیکن ان کے اعمال و اخلاق کے کارنامے دنیا میں رہ جاتے ہیں جو ان کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھتے ہیں۔

حافظ شیرازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت علامہ بحر العلوم مولانا سید اشرف صاحب شمسی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ

ان پاک ہستیوں میں سے تھے جو مرنے کے بعد صاحب اعمال صالحہ و حسنات جاریہ اور منبع برکات ہونے کی حیثیت سے زندہ جاوید ہیں جب تک حضرت مرحوم کی تصنیفات و تالیفات کے چشمے ابلتے رہینگے۔ آپ کی حیات بعد الممات کے چمن زار سرسبز رہیں گے اور آپ کی یاد کی روئیدگیاں زمین قلوب پر "ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام" کا منظر پیش کرتی رہینگی۔ مولانا کی زندگی کی مبارک گھڑیاں یا تعلیم و تدریس میں صرف ہوتی تھیں یا تصنیف و تالیف میں رات اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چند ساعتیں آرام کی تھیں اسی محنت شاقہ نے آپ کو حقیقی معنوں میں بحر العلوم بنا دیا۔ مولانا مرحوم کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر تبصرہ کرنے اور آپ کے تبحر علمی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے ایک طویل مدت، ایک بڑی واقفیت اور کافی دیدہ ریزی کی ضرورت ہے نیز اس امر کی ضرورت ہے کہ علامہ مرحوم کے تبحر علمی کا اجمالی طور پر ذکر کر کے کم از کم آپ کی علمی صحبتوں کی یاد تازہ کریں۔

تبحر علمی کا لفظ دیسے تو بولنے کے لئے مختصر اور لکھنے کے لئے چند حروف کا مجموعہ ہے لیکن اس صفت سے متصف ہونے کے لئے جن مصیبتوں کو جھیلنا پڑتا اور جن مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان کا تفصیلی علم اسی کو ہو سکتا ہے جو اس صفت سے متصف ہو۔

تبحر علم علمی زندگی کے دو شعبوں میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کا نام ہے:
(۱) ایک تدریس و تعلیم (۲) دوسرا تصنیف و تالیف۔ تدریس و تعلیم کی کامیابی یہ ہے کہ علوم و فنون متداولہ کی درسی کتابوں پر اتنا عبور ہو کہ تشفی بخش طریقہ پر ان کی تفہیم کر سکے اور معرکۃ الآرا مسائل کے مالہا و ما علیہا بیان کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے سے ان کے عقدوں کو کھول دے اور الجھنوں کو سلجھا دے۔ کامیاب تصنیف و تالیف یہ ہے کہ علمی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص خاص مسائل یا فنون پر جن کے تفہم و تفہیم میں دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ایسا تبصرہ کرے کہ مسائل کا انکشاف ہو جائے اور طالبین فنون کی راہ طلب میں کوئی دقت حائل نہ ہو۔ الحمد للہ ہمارے بحر العلوم کو علمی زندگی کے ان ہر دو شعبوں میں وہ شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کے فیضان علم کے چشمے ابل ابل کر تشنگان علوم و فنون کی پیاس ہمیشہ بجھاتے ہیں اور بجھاتے رہیں گے۔ علوم مشرقیہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جنہیں مولانا کا شرف

تلمذ حاصل رہا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا کا طریقہ تعلیم کیسا تھا اور کس قدر کامیابی کے ساتھ آپ تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ کامیابی انسان کی زندگی کے آخری لمحوں تک اس کا ساتھ دیتی ہے اس کے بعد اس کا طریقہ تعلیم اس کی چلتی ہوئی زبان کے سکوت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن تصنیف و تالیف کی کامیابی مصنف و مولف کی یاد قیامت تک باقی رکھ سکتی ہے۔ دیکھئے امام غزالی، امام رازی، سعدی رحمہم اللہ کو اس دارِ فانی سے گئے ہوئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کی تصانیف نے ان کو آج تک زندہ رکھا ہے اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

اگرچہ مولانا کی تصانیف پر تبصرہ کرنے کے لئے خواہ اجمالی کیوں نہ ہو کافی وقت اور محنت کی ضرورت ہے تاہم یہاں ہم صرف تصانیف کا شمار کرانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان پر تھوڑی سی روشنی ڈال کر قارئین کو ان سے روشناس کرائیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بارش کے مہینوں میں جس طرح بادل یکساں نہیں آتے، ایک ہی قسم کی بارش نہیں برساتے اور سمندر کی موجیں ایک ہی قسم کی نہیں ہوتیں اسی طرح صفتِ علمی کا ظہور بمصداق کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ مختلف رنگوں اور گوناگوں جلووں کے ساتھ ہوتا ہے جس کی افادیت ہمیشہ رہے گی لیکن جامعیت والی ہستیاں صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت علامہ مرحوم کے نام کے ساتھ علامہ متبحر لکھنا شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے آپ کی تصانیف و تالیفات شاہد صادق ہیں جن جن علوم و فنون میں آپ نے تعلیم پائی اس میں اتنی مشق پیدا کی کہ اچھے خاصے مصنف بن گئے۔

نحو علم نحو میں ایک ضخیم کتاب موسوم بہ تلخیص النحو تالیف فرمائی جو تمام مسائل نحو کی جامع ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیش بہا تالیف کے وقت علم نحو کی معرکۃ الآرا کتابیں مولانا کے پیش نظر تھیں کیونکہ جا بجا مغنی اللبیب مفصل اور مفصل کی متعدد شروح شیخ نجم الدین رضی کی شرح کافیہ اور کتاب سیبویہ کا حوالہ دیا ہے ہر مسئلہ کے تحت اشعار جاہلیت اور فصحاء عرب کے مشہور کلام اور کہیں آیات قرآنی کے متعلق نہایت

اُن پاک ہستیوں میں سے تھے جو مرنے کے بعد صاحب اعمال صالحہ و حسنات جاریہ اور منبع برکات ہونے کی حیثیت سے زندہ جاوید ہیں جب تک حضرت مرحوم کی تصنیفات و تالیفات کے چشمے ابلتے رہینگے۔ آپ کی حیات بعد الممات کے چمن زار سرسبز رہیں گے اور آپ کی یاد کی روئیدگیاں زمین قلوب پر "ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم" کا منظر پیش کرتی رہینگی۔ مولانا کی زندگی کی مبارک گھڑیاں یا تعلیم و تدریس میں صرف ہوتی تھیں یا تصنیف و تالیف میں رات اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چند ساعتیں آرام کی تھیں اسی محنت شاقہ نے آپ کو حقیقی معنوں میں بحر العلوم بنا دیا۔ مولانا مرحوم کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر تبصرہ کرنے اور آپ کے تبحر علمی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے ایک طویل مدت ایک بڑی واقفیت اور کافی دیدہ ریزی کی ضرورت ہے نیز اس امر کی ضرورت ہے کہ علامہ مرحوم کے تبحر علمی کا اجمالی طور پر ذکر کر کے کم از کم آپ کی علمی صحبتوں کی یاد تازہ کریں۔

تبحر علمی کا لفظ دیسے تو بولنے کے لئے مختصر اور لکھنے کے لئے چند حروف کا مجموعہ ہے لیکن اس صفت سے متصف ہونے کے لئے جن مصیبتوں کو جھیلنا پڑتا اور جن مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان کا تفصیلی علم اسی کو ہو سکتا ہے جو اس صفت سے متصف ہو۔

تبحر علمی علمی زندگی کے دو شعبوں میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کا نام ہے:

(۱) ایک تدریس و تعلیم (۲) دوسرا تصنیف و تالیف۔ تدریس و تعلیم کی کامیابی یہ ہے کہ علوم و فنون متداولہ کی درسی کتابوں پر اتنا عبور ہو کہ تشفی بخش طریقہ پر ان کی تفہیم کر سکے اور معرکۃ الآرا مسائل کے مالہا و ما علیہا بیان کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے سے ان کے عقدوں کو کھول دے اور الجھنوں کو سلجھا دے کامیاب تصنیف و تالیف یہ ہے کہ علمی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص خاص مسائل یا فنون پر جن کے تفہیم و تفہیم میں دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ایسا تبصرہ کرے کہ مسائل کا انکشاف ہو جائے اور طالبین فنون کی راہ طلب میں کوئی دقت حائل نہ ہو الحمد للہ ہمارے بحر العلوم کو علمی زندگی کے ان ہر دو شعبوں میں وہ شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کے فیضان علم کے چشمے ابل ابل کر تشنگان علوم و فنون کی پیاس ہمیشہ بجھاتے ہیں اور بجھاتے رہیں گے۔ علوم شرقیہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد جنہیں مولانا کا شرف

تلمذ حاصل رہا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا کا طریقہ تعلیم کیسا تھا اور کس قدر کامیابی کے ساتھ آپ تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ کامیابی انسان کی زندگی کے آخری لمحوں تک اس کا ساتھ دیتی ہے اس کے بعد اس کا طریقہ تعلیم اس کی چلتی ہوئی زبان کے سکوت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن تصنیف و تالیف کی کامیابی مصنف و مولف کی یاد قیامت تک باقی رکھ سکتی ہے۔ دیکھئے امام غزالی، امام رازی، سعدی رحمہم اللہ کو اس دارِفانی سے گئے ہوئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کی تصانیف نے ان کو آج تک زندہ رکھا ہے اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

اگرچہ مولانا کی تصانیف پر تبصرہ کرنے کے لئے خواہ اجمالی کیوں نہ ہو کافی وقت اور محنت کی ضرورت ہے تاہم یہاں ہم صرف تصانیف کا شمار کرانا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان پر تھوڑی سی روشنی ڈال کر قارئین کو ان سے روشناس کرائیںگے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بارش کے مہینوں میں جس طرح بادل یکساں نہیں آتے، ایک ہی قسم کی بارش نہیں برساتے اور سمندر کی موجیں ایک ہی قسم کی نہیں ہوتیں اسی طرح صفت علمی کا ظہور بمصداق کل یوم ھو فی شان مختلف رنگوں اور گوناگوں جلووں کے ساتھ ہوتا ہے جس کی افادیت ہمیشہ رہے گی لیکن جامعیت والی ہستیاں صدیوں میں ایک دو ہی پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت علامہ مرحوم کے نام کے ساتھ علامہ متبحر لکھنا شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے آپ کی تصانیف و تالیفات شاہد صادق ہیں جن جن علوم و فنون میں آپ نے تعلیم پائی اس میں اتنی مشق پیدا کی کہ اچھے خاصے مصنف بن گئے۔

نحو علم نحو میں ایک ضخیم کتاب موسوم بہ "تلخیص النحو" تالیف فرمائی جو تمام مسائل نحو کی جامع ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیش بہا تالیف کے وقت علم نحو کی معرکۃ الآرا کتابیں مولانا کے پیش نظر تھیں کیونکہ جابجا مغنی اللبیب مفصّل اور مفصّل کی متعدد شروح شیخ نجم الدین رضی کی شرح کافیہ اور کتاب سیبویہ کا حوالہ دیا ہے ہر مسئلہ کے تحت اشعار جاہلیت اور فصحاء عرب کے مشہور کلام اور کہیں آیات قرآنی کے متعلق نہایت

جملہ کتب
تفصیل کے ساتھ بحث فرمائی ہے ہر عنوان کے تحت نحوی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس خوبی سے علم نحو کی تمام کتب متداولہ کا نچوڑ ضبط قلم فرمایا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا پھر کسی علم نحو کی کتاب کا محتاج نہیں رہتا۔ جو مسائل کافیہ میں آپ کو نہ ملیں گے وہ اس کتاب میں موجود ہیں مثلاً علامہ نے اس کتاب کے آخر میں ہائے سکت کا باب قائم فرمایا ہے جس کی تحت تحریر فرماتے ہیں "اس مسئلہ کا شیخ ابن حاجب نے کافیہ میں ذکر نہیں کیا بلکہ علامہ جار اللہ زمخشری مفصل میں اور شیخ نجم الدین رضی نے شرح کافیہ کے آخر میں لکھا ہے کہ کتاب سیبویہ رحمہ اللہ میں یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔"

راقم سے حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ تفسیر کی تالیف کے زمانے میں علم نحو کے وہ نادر مسائل میرے علم میں آئے جن کا کتب درسی میں کہیں بھی پتہ نہیں چلتا اور جن کو میں علیحدہ ضبط قلم کرتا گیا۔ اسی طرح علم نحو کے نایاب جواہر جو بحر تفسیر کی غواصی کے وقت مولانا کے ہاتھ لگے تھے وہ تمام کے تمام تلخیص النحو کے زرین قلمدان میں محفوظ ہیں۔ کتاب کی ضخامت خود اس کے دامنِ مسائل کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ کتاب (۸۰۸) صفحات پر ختم ہوئی ہے دیباچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے فرزند رشید مولوی سید علی صاحب مرحوم منشی فاضل و مولوی فاضل کی تعلیم نصاب کامل کے زمانہ یعنی ۱۳۳۵ھ میں اس کی بنیاد پڑی تھی اور ۱۹ شعبان ۱۳۴۱ھ روز پنجشنبہ کو ختم ہوئی

منطق | منطق میں مولانا کو خاصی دستگاہ حاصل تھی مسلم اور اس کے معرکۃ الآرا شروح قاضی حمد اللہ و بحر العلوم نہایت صفائی سے پڑھایا کرتے تھے دارالعلوم کی معلمی کے زمانہ میں مولانا کو یہ خیال ہوا کہ کوئی ایسا متن منطق میں لکھا جانا چاہیے کہ جس میں مضامین سلیس پیرایہ میں بیان کئے جائیں اور متعلم کو تفہیم میں کوئی دقت نہ ہو چنانچہ مولانا اپنے ارادہ میں کامیاب ہوئے۔ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ کو "کشف المنطق" کے نام سے ایک رسالہ لکھنا شروع کیا اور ۹ محرم ۱۳۳۳ھ کو ختم فرمایا۔ اس رسالہ کا ماخذ شمسیہ ہے لیکن مسائل کی توضیح میں مطالع سے مدد لی گئی ہے گویا یہ رسالہ شمسیہ اور مطالع کے مسائل کا خلاصہ ہے مولانا کے قلم سے باریک خط میں (۴۳) صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ مولانا نے قضایائے شرطیہ اور قضایائے موجہات مرکبہ اور مباحث عکس مستوی و عکس نقیض کی جہاں بحث کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوحِ مسائل میں مرقاۃ سے

کچھ زیادہ ہی ہے اس کا اردو ترجمہ ہو جائے تو مرقاۃ کے اردو ترجمے سے زیادہ طالبین کو فائدہ پہونچے گا۔ ایک اور رسالہ عربی زبان میں فوائد کے نام سے لکھا ہے۔ اس رسالہ کا ماخذ قطبی اور سعدیہ ہے اس رسالہ کے تبصرہ میں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یہ قطبی اور سعدیہ جیسی کتابوں کی تلخیص ہے۔ اس کے سوا ایک اور رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا نام توضیح المنطق ہے۔ یہ رسالہ سعدیہ و قطبی کا پورا پورا خلاصہ ہے۔ اس کا حجم ۱۰۰ صفحوں تک ہے اور زبان اردو میں لکھا گیا ہے۔ اسی فن میں مولانا نے ایک اور کام شروع کیا تھا یعنی سلّم کی تلخیص لکھ رہے تھے تصورات کی تلخیص فرمالی تھی، تصدیقات میں وجود محال کی مشہور بحث تک پہنچے تھے نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر تصدیقات کی تکمیل نہ فرما سکے۔ اس رسالہ کا نام اسلم تلخیص سلّم رکھا ہے۔ اس رسالہ سے واضح ہے کہ تلخیص کے وقت منطق کی مشہور کتابیں اور سلّم کی تمام شروح اور شفا بو علی سینا پیش نظر رہی ہے۔ مشکل مسائل کو آسان بنانے اور سلیس عبارت میں مفہوم ادا کرنے کی سعی فرمائی ہے گو یہ رسالہ ناتمام ہے لیکن تصورات کا حصّہ کامل ہونے کی حیثیت سے ایک حد تک مکمل سمجھا جا سکتا ہے!

فلسفہ مولانا کو فلسفہ قدیم پر بڑا عبور تھا صدرا اور شرح اشارات جیسی ادق کتابیں طلبہ آپ سے پڑھا کرتے تھے۔ صدرا کی ثناۃ بالتکریر کے مباحث جو عسیر التفہیم مشہور ہیں آپ سے پڑھنے کے بعد سہل الحصول ہو جاتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ علم ہندسہ سے مولانا کو خاصی دلچسپی تھی اور اس قسم کے مباحث وہی شخص اچھی طرح پڑھا سکتا ہے جس کی ریاضی بھی اچھی ہو۔ حضرت علامہ رحمہ اللہ نے ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق کی تلخیص اردو زبان میں کی ہے اور اس کا نام "حکمت عملیہ" رکھا ہے۔ فن اخلاق میں اردو زبان کا نہایت مفید رسالہ ہے۔ علم الاخلاق میں معرکۃ الآرا بحث مسئلہ محبت پر کیجاتی ہے جلال الدین محقق دوانی نے اپنی کتاب اخلاق جلالی میں اس عنوان پر بحث کرتے ہوا عداد متحابہ کی طرف اشارہ کیا ہے اخلاق جلالی میں یہی ایک مقام عسیر الفہم ہے لیکن علامہ مرحوم نے اپنی کتاب حکمتہ عملیہ میں اس مسئلہ کو نہایت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ کو وہی شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے جو علم ارثماطیقی سے واقف ہو اس رسالہ کا حجم (۲۲۰) صفحات ہے کیا ہی اچھا ہو تا کہ یہ رسالہ سلسلہ تعلیم

جامعہ عثمانیہ میں علم الاخلاق کی تعلیم کے لئے منتخب ہوتا۔

طب اس فن میں مولانا کی تصانیف تلخیص الشفاء، تلخیص مبادی، تلخیص شرح اشارات کا بھی ہونا تنویر الہدایہ کی فہرست سے ظاہر ہے لیکن ہماری نظر سے یہ کتابیں نہیں گزریں۔

اس فن میں حیات بعد الممات کے عنوان پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا ماخذ شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات امام رازی کی تحریرات اور احادیث نبویہ ہیں یہ رسالہ (۷۹) صفحہ پر ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ جو چار ابواب اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔

قرأت علامہ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ہونے سے پہلے جناب مولوی قاری محمد ابراہیم صاحب مرحوم سے قرأت سبعہ کی تعلیم پائی تھی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد قرأت حفص رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر "المفید فی التجوید" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے۔

قاری صاحب نے مولانا کو قرأت کی سند دیتے ہوئے اس میں اس رسالہ کا بھی ذکر فرمایا ہے مضمون سند یہ ہے:

"میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بلدۂ حیدرآباد میں مجھ سے صدہا اشخاص نے قرأت سبعہ پڑھی مگر وہ پہلی ہی منزل میں رہ گئے لیکن خدا نے ان کو اس فن شریف میں کامیاب فرمایا قرأت سبعہ کی تحصیل کے بعد اردو زبان میں ایک رسالہ القول المفید فی التجوید لکھا جب میں نے اس رسالہ پر نظر ڈالی تو اس کو کتاب جزری کا ملخص پایا اور مولانا سے کہا کہ ضرور اس کو طبع کرایئے کم استعداد بچوں کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگا۔" قرأت عشرہ پر بھی ایک رسالہ لکھنا شروع فرمایا تھا جس میں حسب ذیل فصول لکھی ہیں:-

فصل اول۔ روایت قالون میں **فصل دوم** روایت ورش میں **فصل سوم** روایت امام ابن کثیر میں **فصل چہارم** قواعد امام ابوعمرو بصری میں **فصل پنجم** ابن عامر شامی کے بیان میں **فصل ششم** روایت امام عاصم کوفی کے بیان میں **فصل ہفتم**۔ روایت امام حمزہ کوفی کے بیان میں **فصل ہشتم** روایت قواعد قرأت امام کسائی کے بیان میں لکھی، آٹھویں فصل ناتمام ہے باقی دو قراءتوں کے بیان کی تکمیل کر دی جائے تو اردو زبان میں قرأت عشرہ کا ایک اچھا مختصر رسالہ ہو جائیگا۔ یہ رسالہ (۲۶) صفحوں پر مشتمل ہوا ہے۔

اصول فقہ و فقہ

مولانا اصول فقہ کے ایک زبردست عالم تھے اور اکثر فرماتے کہ ادبیات میں علم نحو اور دینیات میں اصول فقہ بڑے گہرے فن ہیں - اس فن میں علامہ ابن حاجب رحمہ اللہ اور امام غزالی رحمہ اللہ کی بڑی تعریف فرماتے - خود آپ نے بھی ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور چند ابواب بھی تحریر فرمائے تھے - اس وقت جتنی بھی تحریر موجود ہے اس میں وجوہ نظم کی چار اقسام سے دو قسموں یعنی خاص و عام پر کافی بحث موجود ہے - یہ تحریر عربی زبان میں (۱۰۷) صفحات پر لکھی گئی ہے افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے مولانا کا جام حیات لبریز ہو چکا تھا ورنہ اس فن شریف میں یہ کتاب مولانا سے ایک بڑی اور بہترین یادگار رہتی -

ایک اور مختصر رسالہ "القول المختصر فی رکعت الفجر" بزبان اردو فقہ میں لکھا ہے جس میں بعد اقامت سنت فجر کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، اور علماء محدثین اور فقہاء مجتہدین کے اقوال اور احادیث شریفہ کے حوالے ہیں یہ رسالہ (۲۲) صفحات پر ختم ہوا ہے -

"قراءۃ الفاتحہ خلف الامام" کے عنوان پر ایک رسالہ توضیح المرام تحریر فرمایا ہے جس میں فقہی اصول پر بحث کی گئی ہے یہ رسالہ مولانا کے قلم سے (۴۲) صفحوں پر ختم ہوا ہے جو ماہ شوال ۱۳۲۹ھ ہجری میں لکھا گیا ہے -

نیز ایک رسالہ بنام رسالہ دعا فقہی انداز میں تحریر فرمایا ہے -

علم الکلام | علامہ مرحوم نے علم الکلام کے مطالعہ اور اس کی تعلیم و تدریس میں عمر کا ایک حصہ صرف کیا ہے - علم کلام کی متداول کتب شرح مواقف شرح مقاصد شرح تجرید علامہ قوشجی وغیرہ جس وقت آپ پڑھانے بیٹھتے تو معلوم ہوتا کہ خود مصنف اپنا کلام آپ سمجھا رہے ہیں - آپ کا بیان صاف اور سلجھا ہوا ہوتا تھا - آپ کے علم کلام کا تبحر آپ کی مولفہ کتاب "القول الاظہر فی شرح الفقہ الاکبر" سے ظاہر ہوتا ہے - فقہ اکبر حضرت امام اعظم کی تالیف ہے مولانا نے اس کی فاضلانہ شرح عربی زبان میں فرمائی ہے یہ شرح (۲۱۷) صفحات پر ختم ہوئی ہے

اسی فن میں ایک اور کتاب "تقریر الفوائد فی تحریر العقائد" تالیف فرمائی ہے یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے، اس کتاب کے (۲۳۲) صفحات میری نظر سے گزرے جن میں

امور عامہ اور الٰہیات کے مسائل درج ہیں مولانائے مرحوم کے تلمیذ رشید مولوی سید احمد صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ اسکے (۲۴۲) صفحات بتبیضہ کئے ہوئے ہیں تبییض طلب حصّہ اس سے کہیں زیادہ باقی ہے۔ غالباً یہ حصّہ اور تبئیض طلب حصّہ مل کر ایک کامل کتاب ہوگی۔ اس کتاب کے متعدد مقامات میں سنے دیکھے ہر مسئلہ کو سلیس عبارت میں بیان فرمایا ہے جہاں مولانا کی تحقیق علمائے فن کی آرا رسے مخالف ہوتی ہے ان پر نقض یا منع جیسی صورت ہو پیش فرماتے ہیں۔ دلیل گزاری کا انداز وہی ہے جو علمائے متقدمین کا تھا۔

ایک اور رسالہ عقائد کے نام سے جماعت مولوی وجماعت عالم کے افادہ کی غرض سے تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے مسائل نہایت سہل اور آسان طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ (۹۰) صفحات پرختم ہوا ہے اور اس میں الٰہیات اور مسائل رسالت ونبوّت اور دیگر عقائد اسلامی کا ذکر ہے زیادہ تر براہین نقلیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس رسالہ سے کالج کے شعبہ دینیات کے طلبہ مستفید ہو سکتے ہیں اور ایک رسالہ بنام "رسالہ معراج" تحریر فرمایا جس میں موافق اصول اہل سنت کے مسئلہ معراج پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور معراج جسمانی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن میں حسب ذیل کتب عقائد وروایات مہدویہ سے متعلق تحریر فرمائی ہیں جن میں منقولات شرعیہ پر بحث کی گئی ہے اور جن کے منجملہ ایک "تنویر الہدایہ" ہے۔ یہ کتاب طبع ہوچکی اور ۱۵۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ دوسری کتاب الواح الذہب ہے جو کتاب معدن الادب مولفہ حضرت مجتہد المہدویہ علیہ الرحمۃ کی شرح ہے یہ شرح ۱۵۰ صفحوں پرختم ہوئی ہے اس کی تاریخ اختتام ۶ ہر ذیقعدہ ۱۳۲۴ھ ہے۔ تیسری "العقائد" حصّہ سوم وچہارم ہے۔ یہ دونوں حصّے ۱۲۲ صفحوں پر ختم ہوئے ہیں۔ چوتھی الدیانۃ فی بیان الامانۃ ہے جو ۲۴ صفحوں پرختم ہوئی ہے۔ اس تالیف کی تاریخ اختتام غرہ محرم ۱۳۴۰ھ ہے پانچویں "ایضاحات" ہے۔ یہ تالیف ۲ صفحوں پرختم ہوئی ہے ۱۳۲۰ھ میں اس کا مسودہ لکھا گیا اور ۱۵ رجب ۱۳۴۷ھ میں اس کی تبئیض ہوئی اس کے علاوہ ایک اور معرکۃ الارا رسالہ اصلاح الظنون فی جواب ابن خلدون ہے۔ اس رسالہ میں مولانا نے ابن خلدون کے ان شکوک وظنون کو رفع فرمایا ہے جو علامہ مذکور نے

روات احادیث متعلق مسئلہ مہدی میں ذکر کئے ہیں اس رسالہ کا تعلق نہ صرف مہدویہ سے بلکہ دنیا کے ان تمام مسلمانوں سے ہے جو بھی مہدی کو ضروری سمجھتے ہیں اس رسالہ کی تاریخ اختتام ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ بروز چہارشنبہ ہے پتلے اوراق پر لکھا ہوا ہے جو بہت بوسیدہ ہوگئے ہیں ایک اور رسالہ بنام "ایصال ثواب" عام مسلمانوں کے افادہ کی غرض سے مولانا سید جلال الدین توفیق کی استدعا پر تالیف فرمایا جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے صحت ایصال ثواب پر استدلال کیا گیا ہے اس رسالہ کی تاریخ اختتام معلوم نہ ہو سکی البتہ اوراق کی کہنگی اور بوسیدگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو لکھے ہوئے ۱۵ یا ۲۰ سال ہوئے ہونگے۔ "المہدی" ایک رسالہ ہے جس میں وہ احادیث شریفہ ہیں جن کا تعلق بھی مہدی سے ہے۔ یہ رسالہ فہرست کی شکل میں ہے بظاہر غیر مکمل معلوم ہوتا ہے۔ ایک ور رسالہ بنام "الشہادة" (۳۸) صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ ایک اور معرکۃ الآرا شرح بنام انوار رحمانی شرح مکتوب ملتانی لکھی ہے مکتوب ملتانی قبلہ ارباب یقین قدوۃ اصحاب تمکین حضرت بندگی صدیق خوندمیر صدیق ولایت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تالیف انیف ہے جس کو حضرت ممدوح نے تبلیغ مذہب کے لئے ملتان روانہ کیا تھا اس کے علاوہ اور بھی مذہبی کتب مثلاً جلاء العینین فی تسویۃ السیدین بنیان الہدایہ قول الاتم وغیرہ ہیں جو تخمیناً دس سے زیادہ ہیں۔

تصوف تصوف علامہ مرحوم کا خاندانی فن ہے اس فن کی تعلیم آپ نے اپنے برادر معظم مولانا سید محمود رحمہ اللہ سے پائی تھی علم تصوف میں آپ کے معلومات نہایت وسیع تھے۔ اس کا اندازہ آپ کی مولفہ کتاب "اللوامع المشارقہ" سے ہوسکتا ہے یہ کتاب حضرت محی الدین ابن عربی علیہ الرحمتہ کے رسالہ وحدت مطلقہ کی شرح ہے ۱۰ صفر ۱۳۲۹ھ میں اس تالیف کو ختم فرمایا تھا اس کا حجم (۱۹۴) صفحوں کا ہے۔ ایک اور رسالہ بنام "تبیان الحقائق" اپنے فرزند رشید مولوی سید علی مرحوم کی یادداشت کے لئے تحریر فرمایا تھا جس میں تصوف کے ضروری مسائل درج ہیں اس رسالہ کی تاریخ آغاز ۱۰ شعبان ۱۳۳۴ھ روز دوشنبہ ہے۔ اس رسالہ کا ماخذ زیادہ تر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تحریرات ہیں اور جابجا متکلمین کے مذہب کا ذکر کیا گیا ہے۔ فلاسفہ کے خیالات اور ان کی آراء پر بحث کی گئی ہے اس رسالہ کی

تحریر ۹۶ صفحات تک پہونچی ہے اور وہ نامکمل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سید علی مرحوم کے انتقال کے بعد اس کا سلسلۂ تحریر حضرت علامہ نے جاری نہ رکھا جس قدر بھی اس وقت تک ضبطِ قلم ہو چکا ہے ایک حد تک کافی ہے اسماء و صفات باری پر اچھی طرح بحث کی گئی ہے۔

اصولِ حدیث اصول حدیث کی مشق برسوں رہی۔ حدیث کا درس جاری رہا کرتا تھا اس کے ساتھ ساتھ آپ اصولِ حدیث کی طرف رہنمائی فرماتے جاتے تھے۔ اس فن میں کوئی خاص کتاب یادگار نہیں ہے لیکن "تنویر الدرایۃ فی شرح اصول الروایۃ" مولانا کی تالیف ہے جس کا مقدمہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ علامۃ العصر مولانا سید نصرت علیہ الرحمہ کی مولفہ کتاب اصول الروایۃ کی شرح لکھی ہے اصول الروایۃ کا ماخذ اصول حدیث ہی ہے علامہ سید نصرت رحمہ اللہ کو اس میں اولیت حاصل ہے۔ کہ روایات مہدویہ کو اصول حدیث پر منطبق کر کے اس کو ایک فن کی حیثیت عطا فرمائی۔ اس کتاب کے دیکھنے سے علامہ ممدوح کے اصولی زبردست معلومات کا پتہ چلتا ہے طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

علم العروض مولانا جس وقت مدرسہ دارالعلوم میں مدرس تھے ناچیز کی درخواست پر اردو زبان میں علم العروض پر ایک رسالہ لکھا دیباچے کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کی تالیف کے وقت علم العروض کی تمام متداول کتابیں مولانا کے پیش نظر تھیں اس رسالہ کے آخر کی عبارت اس کے ناتمام رہ جانے پر دلالت کرتی ہے۔

نجوم و رمل نجوم و رمل کی تعلیم مولانا نے حضرت مولانا سید مصطفی صاحب مشائخ مہدویہ سے پائی تھی اس فن میں ایک رسالہ بنام رسالۂ نجوم" تحریر فرمایا جس کا پتہ فہرست مندرجہ تنویر الہدایہ سے چلتا ہے۔ لیکن یہ رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا نجوم میں آپ کو ایسی مہارت تھی کہ زائچہ بآسانی نکال لیتے تھے۔

خوش نویسی علماء عموماً بہت کم خوشنویس ہوتے ہیں لیکن مولانا باوجود عالم متبحر ہونے کے اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے مولانا کی قلمی کتابیں ہمارے بیان کی شاہد صادق ہیں۔

قیافہ شناسی علم قیافہ میں بڑی مہارت حاصل تھی قیافہ سے جب کسی کے متعلق حکم لگاتے تو تجربہ کے بعد صحیح نکلتا۔ایک طالب علم مولانا کے پاس آیا آپ نے قیافہ دیکھ کر فرمایا کہ یہ تیز طبیعت سبک خیال ہے۔اس کی طبیعت میں استقلال نہیں ہے چند روز تعلیم پانے کے بعد چھوڑ دیگا۔چنانچہ آپ نے اس کو نہیں پڑھایا بلکہ میرے پاس روانہ فرمایا میں نے ایک عرصہ تک تعلیم دی جتنی باتیں مولانا نے فرمائی تھیں صحیح نکلیں۔

انشار ایک مکتوب بنام مکتوب دلپذیر" اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے جس میں تفاسیر متداولہ کا تذکرہ اور ان پر مختصر تبصرہ فرماتے ہوئے ضرورت تفسیر پر کافی بحث فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ مفسر کو کن کن علوم میں مہارت کی ضرورت ہے یہ مکتوب (۲۴) صفحات پر ختم ہوا ہے۔تاریخ مکتوب ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ ہے۔یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت علامہ مرحوم نے سورہ فاتحہ و پارہ عم کی تفسیر ختم کر کے سورۂ بقر کی تفسیر لکھنا شروع فرمایا تھا۔

"لوامع البیان" مولانائے مرحوم کی ایک بیش بہا تالیف ہے۔یعنی قرآن شریف کی تفسیر عربی زبان میں ہے مولانا نے اس میں حسب ذیل امور پیش نظر رکھے ہیں:-

(۱) اول یہ کہ تفسیر اصول اہل سنت کے مطابق ہو۔

(۲) دوم یہ کہ ان مقامات میں تاویل نہو جہاں فلسفہ کو قرآن مجید کے مضامین سے مخالفت ہے۔

(۳) سوم یہ کہ اصول فقہ کی پابندی نہ چھوٹے یعنی

(الف) مجمل آیتوں کی تفسیر کے وقت حدیث کی طرف رجوع کرے اور رواۃ میں غور کرے۔

(ب) آیات متشابہ کو حق جاننے ان کی معانی میں چوں و چرا نہ کرے۔

(ج) مجاز کی تفسیر اس وقت کرے جب کہ قرینہ موجود ہو۔قرینہ موجود نہو تو تفسیر کرنے میں احتیاط سے کام لے۔

(د) حقیقی معنی جہاں متروک یا دشوار ہوتے ہیں تو مجبوراً مجازی معنی کرنا پڑتا ہے پس اس

صورت میں معنی متروک یا دشوار ہیں بے انتہا غور کرے۔

(۴) مطلق کی تفسیر بحالت اطلاق رکھ کر کرے۔ اور وہی آیت کہیں قرآن شریف میں مقید ہو کر مذکور ہوئی ہے تو اس کو مقید سمجھے لیکن مولانا اپنی تفسیر میں جس معنی میں عزیمت معلوم ہوتی ہے اسی کو لیتے ہیں اور اکثر جگہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب میں عزیمت سمجھتے ہیں۔

(ہ) کسی آیت میں حکم صریح ہو اور اس کے الفاظ حقیقی و لغوی معنی میں مستعمل ہوں یا مجازی معنی میں تو مفسر کمی یا زیادتی تبدیل و تاویل نہ کرے۔

(ز) کسی آیت میں حکم صریح نہ ہو۔ اور کنایہ یا اشارہ کسی خاص حکم پر دلالت کرتا ہے تو اس حکم کے بیان کرنے میں کسی مجتہد کی پیروی کرے۔

(ح) اخبار گذشتہ کی تفسیر میں معتبر تواریخ کا قدر مشترک بیان کرے۔ اخبار آئندہ میں چونکہ انسان کی حق طلبی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے الفاظ لغوی معانی پر دلالت نہیں کرتے۔ بلکہ مجاز و استعارہ یا کنایہ کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے لہذا ان کی تفسیر میں بہت احتیاط سے کام لے۔

مولانا ان اصول کی پابندی کرتے ہوئے جا بجا اپنی تفسیر میں علماء اسلاف کے اقوال و آرا نقل فرماتے ہیں کسی کا سوق دلیل کمزور پاتے ہیں تو اس پر نہایت آزادی سے بحث فرماتے ہیں چنانچہ آیۃ: حتی اذا ادرکہ الغرق قال اٰمنت انہ لا الٰہ الا الذی اٰمنت بہ بنوا اسرائیل و انا من المسلمین آلآن و قد عصیت قبل و کنت من المفسدین ۵ کے تحت علمانے توبہ فرعون کے مقبول ہونے یا مقبول نہ ہونے پر بحث کی ہے۔ جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ فرعون کی توبہ مقبول نہیں ہے اس کے متعلق انہوں نے عدم قبولیت توبہ کے متعلق جو وجوہ بیان کئے ہیں مولانا انکو تفصیل سے لکھتے ہیں۔ جو وجہ قوی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق لکھ دیتے ہیں کہ یہ وجہ قوی ہے۔ اور جو وجہ ضعیف ہوتی ہے اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کی وجہ ضعف ظاہر فرما دیتے ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:-

واختلف في ايمانه هل هو مقبول ام لا؟ فقال جمهور العلماء انه غير مقبول بوجوه الاول انه لم يقل ذالك الا بعد معاينة العذاب وهو الغرق وذالك لقوله تعالى فلم يك ينفعهم ايمانهم لما راؤا باسنا واذا كان كذالك فكيف يقبل ايمانه وهذا هو الوجه القوي -

فرعون کے ایمان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ کہ آیا وہ مقبول ہے یا نہیں جمہور علماء نے کہا ہے کہ وہ غیر مقبول ہے کئی وجہوں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا مگر عذاب کے معائنہ کے بعد اور وہ عذاب غرق تھا اور یہ اس وجہ سے اللہ تعالی فرماتا ہے ان کا ایمان ان کے حق میں نفع بخش نہ ہوا جب کہ دیکھا انہوں نے ہمارے عذاب کو اور جب ایسا ہے تو اس کا ایمان کسطرح مقبول ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں یہ وہ وجہ ہے جو قوی ہے۔

والثاني انه لم يؤمن حقيقة الا انه قال هذا القول لينجو عن الغرق اقول وهذا الوجه باطل لان كلماته تدل على انه امن ثلاث مرات كما يدل عليه قوله امنت وقوله لا اله الا الذي امنت به بنو اسرائيل وقوله انا من المسلمين الآن فلا يعقل من هذه الاقوال الا كونه مومنا ولا يعقل منها انه قال للنجاة عن الغرق ولا يدل عليه الاية لا صراحته ولا كنايته

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت ایمان نہ لایا صرف غرق سے نجات پانے کے لئے امنت الخ کے الفاظ کہدئے مولانا مرحوم فرماتے ہیں۔ میری رائے میں یہ وجہ باطل ہے۔ کیونکہ اس کے کلمات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نے تین بار ایمان کے کلمات کہے چنانچہ پہلے امنت کہا اس کے بعد لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرائیل کہا اس کے بعد انا من المسلمین کا اعتراف کیا اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ مومن تھا۔ اس سے کبھی یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اس نے غرق سے نجات پانے کے لئے کہا تھا نہ صراحتہ اس کا پتہ چلتا ہے نہ کنایتہ۔

الثالث ان ذالك الاقرار

تیسری وجہ یہ ہے کہ فرعون کا اقرار بطور حقیقت

ما كان على وجه التحقيق بل كان
على محض التقليد
فلذلك لم يقبل اقول ان
هذا الوجه باطل لانه كان
امن بالله واقر بوحدانية
بعد ما رأى من موسى ع
آيات شتى باهرة دالة
على نبوة موسى عليه السلام
وشفقة ما دعا اليه وبعد
مشاهدة هذه الآيات
العظيمة والمعجزات الفخيمة
كيف يكون ايمانه لا على وجه
التحقيق لاسيما في حين كان
يدركه الغرق۔

کے نہ تھا بلکہ محض تقلید کے طور پر تھا
اس لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ مولانا فرماتے
ہیں یہ وجہ بھی باطل ہے کیونکہ فرعون
نے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت
کرنے والے متعدد معجزات باہرہ
دیکھنے کے بعد یہ کلمات کہے تھے خصوصاً
وہ اس معجزہ کو بھی دیکھ رہا تھا جو اس کے غرق
سے متعلق تھا پھر اس کا ایمان لا علی وجہ
التحقیق کس طرح ہو سکتا ہے ؟

الرابع ما قال الامام الرازي
اني رأيت في بعض الكتب ان
بعض اقول من بني اسرائيل
لما جاوز البحر اشتغلوا
بعبادة العجل فلما قال فرعون
امنت انه لا اله الا الذي
امنت به بنوا اسرائيل
انصرف ذلك الى العجل
الذي امنت به بنوا اسرائيل

چوتھی وجہ وہ ہے جو امام رازی علیہ الرحمہ نے
فرمائی ہے کہ میں نے ایک کتاب میں یہ
دیکھا ہے کہ بنی اسرائیل جب دریا کے
پار ہو گئے تو پھر گوسالہ پرستی میں مشغول ہو گئے
فرعون نے جب امنت لا الٰہ الا الذی
امنت بہ بنوا اسرائیل کہا تو
اس کا یہ کہنا گوسالہ پرستی کی طرف
عود کرتا
ہے

فکانت ھذہ الکلمة فی حقه سبباً لزیادة الکفر اقول من ھذا الامام الاعلم کیف ذکر ھذا الوجه فی سلسلة الوجوه لان عبادة العجل لم تصدر من بنی اسرائیل الا بعد عبورھم عن البحر وغرق فرعون فکیف یمکن ان یقال ان فرعون اراده بایمانه باللہ تعالیٰ الایمان بالعجل۔

اور یہ اس کے حق میں زیادتی کفر کا سبب ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں تعجب ہے کہ امام رازی جیسے زبردست عالم نے اس وجہ کا سلسلہ وجوہ میں کس لئے ذکر فرمایا؟ کیونکہ جس کتاب کو امام رازی نے معائنہ فرمایا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھر گوسالہ پرستی بنو اسرائیل میں ان کے دریا کے عبور کرجانے اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد آغاز ہوئی تھی پھر کس طرح ممکن ہے کہ فرعون کے اس قول کو اس کے ڈوب جانیکے بعد کے واقعہ سے متعلق کیا جائے؟

ان وجوہ کے سلسلہ میں اور تین وجہوں کو بیان کرکے مولانا نے ان کی تردید فرمائی ہے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ان وجوہ کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے لیکن اقوی وجہ وہی ہے جس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ اس کے بعد شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا قول نقل فرمایا ہے وہ فرعون کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ غرق سے پہلے ثبات عقل و حواس کے ساتھ اقرار توحید کیا ہے شیخ اکبر علیہ الرحمتہ کے قول کو ضعیف ٹھہراتے ہوئے مفسرین کے اس قول کو نقل کیا ہے جو فرعون کے منہ کو اقرار ایمان نکرنیکی غرض سے جبرئیل علیہ السلام نے مٹی سے بھر دیا تھا۔ اس کے بعد امام رازی کی ان چار وجہوں کو نقل کیا ہے۔ جو قول مذکور کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں پھر اس اعتراض کو نقل کیا ہے جو صاحب تفسیر لباب نے امام رازی کے بیان کردہ دلایل پر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

واعترض علیه صاحب اللباب وقال ان الحدیث الذی ذکر فیه ان جبرئیل ملاء فم فرعون

مولانا فرماتے صاحب لباب نے امام پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حدیث جس میں یہ مذکور ہے کہ جبرئیل نے

بالطين لئلا يتوب حديث صحيح ثبت من النبي صلى الله عليه وسلم

فرعون کے منہ کو کیچڑ سے بھر دیا تھا تاکہ توبہ نہ کر سکے، حدیث صحیح ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے۔

لہٰذا اس پر کوئی اعتراض اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد مولانا نے خود صاحب لباب کی رائے پر اصولِ روایت حدیث کے مدنظر اعتراض کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اقول ان هذا القول مردود لانه لم يوثق هذا الحديث من طريق الرواية مع ان هذا الحديث قد عارضه كتاب الله لان فرعون قد تكلم وتاب وقال امنت انه لا اله الخ ان كان خبراً واحداً يجب تركه او يأول فيه على مقتضى الكتاب ليطابقه وذلك لانه قال عليه السلام ستكثر لكم الاحاديث من بعدي فاعرضوها على كتاب الله فان وافقه فاقبلوها والا فردوها وهذا الحديث لما لم يوافقه الكتاب فيجب رده كما هو فحوى قول النبي صلى الله عليه وآله وسلم والله اعلم۔

میری رائے میں صاحب لباب کا قول قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیث طریقہ روایت سے درجہ وثوق کو نہیں پہنچی حالانکہ اس کا معارضہ کتاب اللہ سے بھی ہو چکا ہے اس وجہ سے کہ فرعون نے کلام کیا اور توبہ کی اور کہا امنت انہ لا الہ الخ اگر یہ حدیث خبر واحد ہے تو قرآن کے مقابلہ میں اس کا چھوڑنا واجب ہے یا مقتضی ہے تو کتاب کے موافق اس میں تاویل کرنی ہوگی تاکہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جائے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "میرے بعد تمہارے لئے اکثرت سی حدیثیں ہو جائینگی تم ان کو کتاب اللہ پر پیش کرو اگر اس کے موافق ہیں تو قبول کرو ورنہ رد کردو۔" یہ حدیث چونکہ کتاب اللہ کے موافق نہیں ہے اس لئے اس کا رد کرنا واجب ہے چنانچہ حدیث نبوی کا منشا یہی ہے واللہ اعلم۔

یہ تفسیر چار ضخیم جلدوں میں ہے جو تقریباً (۲۰۰۰) صفحات پر ختم ہوئی ہے اور ہر صفحہ مولانا کے

قلم سے باریک خط میں لکھا ہوا ہے۔ جو معمولی خط سے لکھا جائے تو تقریباً ہر صفحے میں تین صفحے ہو نگے تنویر الہدایہ میں جو فہرست دی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ تالیفاتِ متذکرہ کے علاوہ مولانا کی اور بھی تالیفات ہیں جن کے دیکھنے کی سعادت ابتک حاصل نہیں ہوئی ان کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

(۱) تلخیص الشفاء (۲) الاجماع (۳) حاشیۂ عقائد جلالی (۴) شرح مصباح العرفان (۵) شرح میزان العقائد (۶) شرح عقیدۂ شریفہ (۷) رسالہ اشراقات (۸) فرہنگ سفرنامہ شاہ ایران (۹) رسالہ نجوم (۱۰) ترجمہ قول المحمود (۱۱) القول السدید (۱۲) سوانح فارابی (۱۳) السّماع (۱۴) رسالۂ ضرورت مہدی (۱۵) حاشیۂ کحل الجواہر (۱۶) تلخیص میبذی (۱۷) تلخیص شرحِ اشارات (۱۸) التنقید

کتب متذکرہ کے اسماء سے ان کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

شاعری مولانا بڑے پرگو شاعر تھے۔ آپ کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ قلمبند کرنے کیلئے وقت کی ضرورت ہے۔ اگر شعراء متقدمین خاقانی، انوری، عرفی، بیدل وغیرہم اور مولانا کے دواوین اس وقت مجھے ملتے اور کافی وقت میسّر ہوتا تو میں متقدمین اور مولانا کے کلام کا توازن پیش کرسکتا جس سے ناظرین پر مولانا کی بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا اندازہ ہو جاتا۔ فی الوقت میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تین ضخیم جلدیں آپ کی شاعری سے بھری پڑی ہیں۔ فارسی کلام زیادہ ہے عربی میں بھی آپ کو شعر گوئی کا خاص سلیقہ تھا اردو میں بھی شعر فرمایا کرتے تھے۔

الغرض مولانا تمام علوم متداولہ میں ماہر تھے اور علوم وفنون مثلاً نحو، منطق، فلسفہ، قراۃ، اصول فقہ، فقہ، علم الکلام، تصوف، اصولِ حدیث، علم العروض، نجوم اور علم التفسیر میں بیش بہا تصنیف وتالیف کرکے علمی دنیا پر ایسا احسان کیا ہے کہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

کلامِ شمسی

استاد مرحوم علامہ شمسی جس طرح بحرِ علوم و فنون کے شناور تھے، میدانِ شاعری کے بھی وہ تیز رفتار شہسوار ہیں کہ بہت کم لوگ ان کی گرد کو پہنچ سکتے ہیں۔ شاعری اس عالمِ بے بدل کی فہرستِ کمالات میں حقیر درجہ رکھتی ہے اور خود علامۂ مرحوم نے بھی اس کو کبھی اپنے کمالات کا طرۂ امتیاز بناکر پیش نہیں کیا بلکہ اس کے علی الرغم وہ اپنے اس ذوقِ فطری کے اظہار میں قدرے بخل سے کام لیتے تھے۔ وہ قدرتی طور پر شاعر اور بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے تھے مگر درس و تدریس کو اپنا مقصدِ حیات بناکر علم کی شمع برداری میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ اس طرف خاطر خواہ متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔ پھر بھی طبیعت کا فطری لگاؤ شعر گوئی پر مجبور کرتا رہا۔ ایک دفعہ زمانہ شباب میں نواب محسن الملک بہادر مرحوم کی زبان سے شاعری کی مذمت سنکر اپنا ضخیم دیوان جو کئی برس کی جگر کاوی کا نتیجہ تھا، کنویں کی نذر کردیا اور ایک عرصہ تک شعر گوئی سے مجتنب رہے۔ مگر فطرت کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہوکر پھر اس کوچے میں قدم رکھنا پڑا۔

علامہ مرحوم کا موجودہ کلام جو تین دیوانوں پر مشتمل ہے، اس کے بعد ہی کا کہا ہوا ہے۔ درس و تدریس کی روزانہ مشغولیات اس قدر زیادہ تھیں کہ انہیں بمشکل اتنا وقت مل سکتا تھا کہ فکرِ سخن کرسکیں، مگر طبیعت کی روانی اور برّاقی کا یہ عالم تھا کہ جب ذرا فرصت ملی یا علالت وغیرہ کی وجہ سے درس و تدریس کے کام سے کچھ نجات حاصل ہوئی تو پھر وہ شعر کہنے لگے اور ایک ایک نشست میں سینکڑوں شعر کہہ ڈالے۔

علامہ مرحوم کا کلام کم و بیش ہر صنف کے اشعار پر مشتمل ہے مگر زیادہ مقدار قصائد و غزلیات کے حصوں کی ہے۔ ان کا مسلکِ حیات، دنیاوی جاہ و ثروت اور حصولِ دولت ہرگز نہیں تھا اس لئے ہم ان کے کلام میں اربابِ حکومت اور امرا کے دولت کی مدح [illegible] کچھ نہیں پاتے

تقریباً تمام قصائد حضور دو عالم صلعم کی نعت، باب العلم سیدنا حضرت علی رضؓ کی منقبت اور دوسرے بزرگان دین کی توصیف میں ہیں۔ شاعر اساتذہ سلف خاقانی، انوری اور عرفی کا ذوق سخن رکھتا ہے اور انہی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے کہتا ہے۔ قصاید کا زورِ بیان مضامین کی بلندی اور الفاظ کا درو بست اس شان کا ہے کہ پڑھنے والا شبہے میں پڑجاتا ہے کہ آیا یہ کلام کسی ہندی یا دکنی کا ہے؟ علامہ مرحوم کے انتقال کے چند دن بعد ہی اُن کے ایک شاگرد جناب دولت خان صاحب شہرؔ نے ان کے قصاید کا ایک چھوٹا سا انتخاب شائع کیا ہے اگرچہ ذیل میں قصائد کا کچھ انتخاب دیا جاتا ہے مگر یہ مشتے نمونہ از خروارے بھی نہیں کہا جاسکتا۔

غزلیات کا حصہ بہت ہی ضخیم ہے۔ اور اگر بہ امعانِ نظر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایسے کثیر التعداد جواہر پارے نظر آئیں گے جو فارسی شاعری میں انمول قرار پا سکتے ہیں۔

نثر من است رازنمائے کمالِ عقل — نظم من است آئینہ دارِ ہنروری

ہمیں اس کا افسوس ہے کہ اپنی آرزو کے موافق استاد مرحوم کے کلام کے تنقیدی مطالعہ اور انتخاب کی فرصت نہیں ملی اور اس کو کسی آیندہ فرصت کے لیے اٹھا رکھنا پڑا۔ فی الوقت تبرکاً قصیدہ اور غزل دونوں اصناف کے چند شعر دیئے جاتے ہیں۔ غزلیں بھی وہی ہیں جو بڑے بڑے اساتذۂ غزل کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔

قصائد

(۱)
نعت

دل آئینۂ حجلۂ ناز است صنم را — این برق بلا کرد صنم خانہ حرم را
آں فتنہ کہ از عشوہ گریہائے تو آموخت — با غمزۂ فلک دوختہ پیوند ستم را
ننگم ز دمِ معجز جاں بخشِ مسیح است — چشمت کہ زہد [illegible] من ذوق ستم را
زیں بیش کماں لیشت کہ بہر عشوہ دو نگیست — [illegible]

آں کم نگہی شیشۂ دل را شکست است — از سنگِ فلاخن زدہ قندیلِ حرم را
آشفتۂ گیسوئے خیالت نگزارد — چوں قیس زلف حلقۂ سودائے الم را
تو جلوہ نمائی و پردرنگ ز ہوشم — خورشید بسوزد نگہ دیدۂ نم را
آں نالہ کہ از پردۂ عشق تو شرر ریخت — نگزاشتہ در پردۂ دل زیر و نہ بم را
ہر زخم دل از فیض تمنائے تو دارد — در ہر گل داغش چمنستانِ ارم را
از خندہ زلب آب بقا را بچکانی — از غمزہ گر آہیختۂ تیغ دو دم را
مستی کہ ز چشمت بدلم ریخت تجلّی — با توبہ شکست است بہم ساغر جم را
ایں بارقۂ حُسن کہ ریزد ز جبینت — آئینۂ برقیست کہ افروخت ظلم را
برقیست کہ از وادیِ ایمن شرر انداخت — بر طور کہ مید اشت بدل خرمن عم را
وز تاب و تب افگند روانِ ارنی گوئے — واں سوختہ کامانِ سیہ بخت و دژم را
آں برق دگر بر سر فاراں بدرخشید — وز نور خود افروخت عرب را و عجم را
بر نکہ بتابید دگر از سر فاراں — تا نور فزاید نگہِ چشم حرم را
نور عرب و مہر عجم آنکہ فروغش — رخشندہ چراغیست شبستانِ قدم را
سلطان رسل احمدِ مرسل کہ بہارش — پیرایہ دہد گلشنِ بطحا و حرم را
نامش کہ نویسید بصفا خانۂ ہستی — پیش از ہمہ آراست قضا لوح و قلم را
آں شاہد یکتا کہ کمند خم زلفش — در رشتۂ وحدت کشد اصنافِ امم را
اورنگ نشینے کہ ز ایوان جلالش — تا کنگرۂ عرش نشانید خدم را
خورشید رکابیکہ فلک پیش سپاہش — در دست زر اندود سحر داد علم را
نگزاشتہ در دامن کہسار ز عدلش — ہر شیرِ عریں گوشۂ آغوش غنم را
از برہ پس پشت اسد ترک فلک رفت — تا دید کمانداریِ آں ابروئے خم را
نورشید لقائیکہ بیاضِ رخ صافش — از صفحۂ دل ریختہ سودائے ظلم را
آں صدر نشینیکہ فلک بہر قبایش — از انجم رخشاں زند اوتاد خیم را
گر فکرِ مہندس شدہ آئینۂ رائش — از ہر عدد افگند بروں جذر اصم را

ناقوس بت و نعرهٔ تکبیر نشنود
دیوانهٔ کویش چه کند دیر و حرم را

از جود وجودش که وجوبست عیان
جز وهم نه شد آئینه اطلاق اعم را

چون ابر که بارید گهر در مه نیسان
موج نفسش ریخته دریائے قدم را

آئینهٔ امکان شود از پرتو رایش
هر ذره بسر سنگ زند ساغر جم را

گر جلوه کشاید نگهش شوق رمیدن
پیکان شکند پائے غزالان ارم را

شاهے که سریرش بسر عرش برین ست
بگرفت ملک بر در او جائے خدم را

خواهم که نگه را بسراپرده گذارم
چون در دل و در جان زند اوتادِ خیم را

آن بحر نوالیکه در آتشکدهٔ حشر
جودش پئے هر تشنه دهد قلزم و یم را

شمسی بدل از یاد رخ لمعه فشانش
در بتکده افروخته قندیل حرم را

شاها ملکا جز تو ضمان دار کسے نیست
در داوری روز جزا جمله امم را

از مطلع اعجاز تو هر یکه درخشید
شمع سحری ساخت نوامیس حکم را

این نغمه شراریکه ز داغ جگر افروخت
چون موجه آئینه کند موجهٔ یم را

زان لب که بخورشید از و کوثر و تسنیم
زان دم که از و جوش بهار است ارم را

یک نفحه کرامت کن و یک رشحه بیفشان
این جان دل افسرده و این سوخته دم را

چشم کرمے هم بسگ کوئے خود افکن
زان لطف که بنواخته ارباب کرم را

(۲)

نعت

حسن جو بانیکه در اشباح امکان دیده اند
جلوهٔ هر ذره را آئینه سامان دیده اند

موج عرفانیکه جوشد از فروغستان قدس
قطره را آئینه دار بحر عمان دیده اند

زان نسیم روح افزائیکه از مینو وزید
غنچهٔ دل حیرت چیدن گلستان دیده اند

دیدگان چون بیند جلوهٔ هائے ماه و مهر
وان دلے کو کاند روشن پرتوستان دیده اند

چون نمی باشد به بزم آن دیده هائے حسن بین
هم تحیر پرده دار روئے جانان دیده اند

گرچه چون آئینه باشد دیدهٔ حیرت فزا
لیک چون نرگس نه چیزے در گلستان دیده اند

میحر د صد عشوه اما رنگ رعنائی ترحبت
صد نیاز اینجا برنگ ناز پنهان دیده اند

می تپم از کوری خفاش چشمان درون
صورت آیینگان دل را کعبهٔ جان دیده اند

یاوه یار ارازهاے نغز خود پند اشنفتند
تُرّهات هرزه را طامات اخوان دیده اند

سیر اقلیم قدم دانند این کوران شوم
گر هوس را کوچه گرد ملک امکان دیده اند

پند دانا بهتر از چاودین گنجشک نیست
خویشتن را عندلیب باغ رضوان دیده اند

لخت لخت دل اگر چشم فشاند دور نیست
بر دلم از روزگار آجیده سوهان دیده اند

همت پاکان عنان زدیده است از کاروان
راه دل در حلقهٔ زلف پریشان دیده اند

سینه کابیدند داغ درد را کم یافتند
پارهٔ سنگ سیه در زیر پیکان دیده اند

دل تپا بستان در دمن که می سوزد هنوز
اخگر هر ناله بر انبار دهگان دیده اند

بهر یان افشرده زخم دل درون چشم من
در صدف جائے گهر صد شاخ مرجان دیده اند

درد یاران را که افروزد دل غمخوار من
اخگرے را در میان جاش پنهان دیده اند

دل نهان دارد ـ اره در گنج داغ آرزو
اندرین زندان گلستان در گلستان دیده اند

دل بجا لائے گران رحم هزاران ناز داشت
پرده چون برداشتند آشفته سامان دیده اند

سینه آذر صفت بے طلعت یوسف وشان
چون دل یعقوب محزون بیت احزان دیده اند

شد نهان نظاره بازیهاے مشتاقان مست
کاندرو خیل پری را عشوه سامان دیده اند

لیکن آن پاکان که چشم جان بمعنی دوختند
جلوه کونین در آئینهٔ جان دیده اند

سرمه از خاک دری در چشم دل افشانده اند
انچه بر طور است بر بالاے فاران دیده اند

دیدگانے کز ازل دارند نور معرفت
گوشهٔ غار حرا را خاورستان دیده اند

گاه در اقصاش بشنیدند آواز ملک
گاه بر بالاش سالار سروشان دیده اند

گاه شاه نوریان با فرزمان کردگار
همزبان با خسرو اقلیم امکان دیده اند

بوسه گاه روحیان و سجده گاه نوریان
احمد مرسل که جان نور یزدان دیده اند

عتبهٔ سالار کونین است یا عرش برین
بر درش بهنام فرخ زاد دربان دیده اند

معجزش تا رنگ صورت بست در کون و مکان — یک هیولی را بهر شکلی نمایان دیده اند
جلوه ریزان موکب سلطان حسن آمد ببین — همرهش فرخ سروشان را شتابان دیده اند
برفراز دل بیا کین است اوج واقصه — محرمان عشق زینجا کعبهٔ جان دیده اند
کعبهٔ جان و زیارتگاه پاکانِ قدیم — آستانش را که زیر چرخ گردان دیده اند
برفراز عالم دل رو که بینی رفعتش — بی رصد که چرخ گردان را پرشکان دیده اند
مطلعی گویم به نعت آن فروغ چشم قدس — آنکه در سر منزلش صد مهر رخشان دیده اند

کوکب ذات تو تا در دهر تابان دیده اند — ذره را آئینهٔ انوار یزدان دیده اند
باغ امکان راست رونق از رخ گلرنگ تو — از گلی آرایش چندین گلستان دیده اند
راز تو تا بست در حرف تو رنگ انعقاد — عقل کل را در تماشایش حیران دیده اند
شوق همرنگی سرشت آخشیجان را نبود — الفت را ارتباط چار ارکان دیده اند
سهم تو گر پنجهٔ نیرو کشا اندر نبرد — شیر قالین بهتر از شیر نیستان دیده اند
خلق تو نسرین فروش حله های دوستان — قهرت آتش جوش از خفتان خصمان دیده اند
چشم راحت تکیه گاه دهر شد از عدل تو — فتنه همخواب عدم بر طاق نسیان دیده اند
خوبی رای تو آرایش ده ملک دلست — رونق بند تو نظمِ کشور جان دیده اند
منطقت را رودبار آب کوثر یافتند — پنجه ات را جویبارِ بحر عمان دیده اند
از شمیم نفحهٔ خلق تو از بدوِ ازل — مایهٔ آرائش گلزار رضوان دیده اند
مصحف حکم تو تا شد قهرمانِ ملک و دین — شرع را از نیروی رای تو فرقان دیده اند
با لب پاکت دم عیسی مگر همراز بود — تا بحرفش جویبار آب حیوان دیده اند
گر ز فیضان تو گلشن گشت بزمِ خاکیان — هم ز جامت رونق بزم سروشان دیده اند
شد چو نور وحدتت آئینه تمثال دار — جلوهٔ چندین صور در بزم امکان دیده اند
یک نگه بر بندهٔ شمسی فگن از مهر خویش — کین سهی را ذرهٔ آن مهر تابان دیده اند
بنده ام بشمار و لطفی چو خداوندان بکن — فر و تاب بندگان از شاهان دیده اند
نی غلط گفتم که اندر شارسان بخردی — فر و تاب شاهی از فروشانان دیده اند

سرمہ از خاک درت خواہم کہ می بینم ترا — ورنہ بر رویت مرا موسیِ عمران دیدہ اند
چنبر گردون کہ ہردم دست و پایم بستہ است — پیکرم را حلقۂ زنجیر مطران دیدہ اند
در بلاغت سنجیِ رنگین نواہائے خیال — بر دلِ من پرتو نظام شروان دیدہ اند
مریم آسا صد مسیح آورد از عذرائے فکر — در دلِ او پرتو فرنوش رخشان دیدہ اند
من کجا و آن حقایق سنجیِ معنیٰ کجا — تابش این نظم از ان خورشید تابان دیدہ اند
گر بجود بالم مرا بالیدن من می سزد — چون ستایش خوان آن دستور یزدان دیدہ اند
دانش شمسی نہ بگزارد بروز رستخیز — کاندران پیچید و صد مینوئے رضوان دیدہ اند

(۳)
منقبت

بلرزز شوق روئے بتان سمن بری — یکرہ بخویش بین کہ جہان جلوہ بنگری
در دامِ آہوانِ ختن پیچ و تاب نیست — وز آب رنگ لالہ رخان داغ پروری
بنگر کہ در کمند ترا گلرخانِ ناز — پنہان ہمی کشند اگر نیک بنگری
در ذوق یاد لعل لبان سمن عذار — تا کے بسینہ معدن یاقوت پروری
تا کے در آرزوئے بتان سجدہ ریزیت — مثل کشیش دیر در آہنگ تنگری
بر روئے ساقیان گل اندام و گلعذار — مشتاق جرعہ نوشیِ مینائے احمری
تا کے جگر فگاریت از عشوہ ہائے ناز — تا کے جنون خیالیت از دیدۂ پری
از جوش وحشتیکہ بصحرا کشد دلت — طاؤس وار از چمن قدس می پری
تا چند در کمینگہ شوق جگر فگار — جان باز دلبران باداہائے کافری
تا چند حیلہ ہائے فریب سمن زنان — تا چند عذر حلقۂ گیسوئے عنبری
اے دل فریب دیدۂ فتان مخور کہ خود — موسائی ار رہی ز طلسمات سامری
زنہار در صنمکدۂ ظاہری مرو — معنیٰ طلب کہ جلوۂ او لم بنگری
آئینہ ات بعالم رنگ است پرغبار — باشد سحاب تیرہ بخورشید خاوری
زنگے ز روئے آئینۂ خویش برفشان — وز دیدہ نیز پردۂ صورت بدر بری

زین نکته جوش موجهٔ خون است در دلم — دل هست یا که معدن کبریت احمری
سیماب وار می تپم از آتشین رخان — بال خس ست مدعی شعله پروری
إِنْ كَانَ ذَابَ قَلْبُ عَمِيدٍ بِلَوْعَةٍ — إِنْ سَالَ دَمْعَهُ بِدَمِ المَاقِ أَحْمَرَ
تَاللهِ لَا يَلِينُ بِهِ قَلْبُ جَلْمَدٍ — لَوْ صَبَّتِ السَّمَاءُ شَآبِيبَ هَامِرٍ
صد لاله زار این دل پرخون نشانده است — هر داغ را سزد دهم یاقوت پروری
من پاسبان باب علومم ز من مپرس — رازی که یافتم ز رموز پیمبری
این باد سنجی که بنظم فرو چکد ق — وین هرزه جوششی که لبم ریخت سرسری
زیبد بذره گر بزند جوشش آفتاب — زانجا که نسبتی است کهی را بمهتری
برآستان منقبت مصر حکمتم — شکرفشان چو طوطیم اندر نواگری
پیش گزیده که به تعظیم قبه اش — پیوسته پشت خم شده افلاک اخضری
سلطان دین علی که بتاج ولایتش — پیداست جلوه هاے فروغ پیمبری
نور احد جلال خدا ضوء سرمدی — سرّ قضا ضمیر هدی فرّ داوری
رَأْسُ الهُدَى أَسْرَى أُولِي الفَضْلِ وَالتُّقَى — كَهْفُ الوَرَى إِمَامُ جَمِيعِ الأَكَابِرِ
إِصْلِيتُهُ يُجَوِّدُ نُسُورًا أَقْشَاعِمًا — أَرْمَاحُهُ تُضِيفُ بُطُونَ المَقَابِرِ
حَارَ المَلِيكُ فَوْقَ سَمَاءٍ بِفَارِسٍ — إِذْ فَرَّقَ الفَيَالِقَ بَيْنَ العَسَاكِرِ
كَالنُّورِ لِلأَحِبَّةِ لٰكِنْ لِلعِدَى — حَدُّ السُّيُوفِ طَرْفُ رِمَاحٍ شَوَاجِرِ
أَعْطَى الرَّسُولُ رَايَةَ فَتْحٍ غَضَنْفَرًا — رَأْسَ المُدَجَّجِينَ حِمَامَ العَسَاكِرِ
بَيْنَ الوَرَى هُمَامُ شُعُوبٍ أَكَارِمٍ — فِي الأَتْقِيَا إِمَامُ جُمُوعٍ أَكَابِرِ
إِذْ كَرَّ فِي المَعَامِعِ كَالبَرْقِ خَاطِفًا — وَالقَاعُ أَحْمَتْ بِقِدَاحِ الحَوَافِرِ
يَفْرِي كُلَى فَوَارِسِ جَيْشٍ عَرَمْرَمٍ — بِالذَّابِلِ المُثَقَّفِ تَحْتَ الخَوَاصِرِ
اے آفتاب چرخ جلالت که یکنفس — بر ذره هاے خویش بکن سایه گستری
شاها ز نور روے تو خورشید ذره ایست — هم بحر قلزم از کف جودت بود تری
از لطف خویش لمعه فگن تا عیان شود — قلب سیاه من چو رخ مهر خاوری

گر از صفائے خاطر پاکت نمی چکد | از روئے ژالہ جلوہ کند تاب گوہری
بر اوج بارگاہ مدیحت ستادہ ام | چون کعب نغمہ سنج بہ نعت پیمبری

دارد امید با تو روان حزین من
تا بر سرم ز لطف و کرم سایہ گستری

غزلیات

(۱)

بی رخ رنگین نگہ در چشم دیدن داغ شد | بی لب نوشین سخنہا در شنیدن داغ شد
بر طپیدن ہائے خود داریم پاس زندگی | چون شرار این نقطۂ دل در آرمیدن داغ شد
پرتو آئینۂ تاب رخ زیبائے کیست | اشک مژگانم کہ ہنگام چکیدن داغ شد
نازم از شادابی دل کز نسیم عشوہ اش | شاخ سبزے این گلستان را دمیدن داغ شد
در چمن افسانۂ طرز خرام نازکیست | سرو از آرایش قامت کشیدن داغ شد

این جواب آن غزل شمسی کہ بیدل گفتہ است
تا جدا شد دل ز آغوش طپیدن داغ شد

(۲)

خالی از خویشم و صد آفت جانم دادند | ہیچو نی زندگی از آہ و فغانم دادند
تلخی تیرگی از ذوق دلم بیرون رفت | ساغر جم ز کف پیر مغانم دادند
شمع سان خامشیم روشنی دل افزود | چون زبان راہ بریدند بیانم دادند
چشم بستن خضر منزل مقصود دل است | در شب این جرعۂ آب حیوانم دادند
صورت نغمہ بہر پردۂ آہنگ یکیست | ذوق تسبیح بنا قوس بتانم دادند
نالہ از تیرگی بخت ز من کس نشنید | سرمہ در کام فشاندند و فغانم دادند
شمع راز دل من رنگ ز اظہار نبست | کہ بیانم بربودند و زبانم دادند

سینہ ام ہر نفس آئینۂ صد برق بلاست | دل نہ دادند مگر آفتِ جانم دادند
فارغ از تاب وتب وغصہ اغیار شدم | دل ربودند وز آزار امانم دادند

از سخن زندہ جاوید بنام شمسی
دل نہ دادند کہ آبِ حیوانم دادند

(۳)

اضطراب دل بسوز درشتہ تدبیر را | بر ہدف کے میرساند دست لرزان تیر را
یک نفس دیوانۂ زلف توگر پامی نہد | نالہ از وحشت گزارد حلقۂ زنجیر را
شوخی دل دامنش بگرفت وخشم آلود رفت | ہرکس افشاند ز دامن خار دامنگیر را
زلف بر دوش آن غزال شوخ می آید بدست | دام آہو میکشد صیاد آہو گیر را
کس چہ می داند کہ دارد خون فرہادی بسر | بامدادان می نماید صبح جوئے شیر را
کشتۂ نازت کہ زینسان ہرہ گرود ہر نفس | می شمارد موجۂ آبِ بقا شمشیر را

قصر شمسی راکہ بر عمرِ رواں بربستہ اند
نقش بر موج روان کردند این تعمیر را

سید محمد

مبادی فلسفہ

از

مولوی میر حسن الدین صاحب بی، اے، ال ال بی، وکیل عدالت عالیہ

ایک تعزیتی مشاعرہ

ذیل کی نظمیں حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں جو حضرت شمسیؔ کی وفات حسرت آیات کی تعزیت میں تسکین صاحب کے مکان واقع کاچی گوڑہ پر منعقد ہوا تھا۔ بانی مشاعرہ بھی یہی بزرگ تھے فارسی کا طرح مصرع "ای اہل ملک شمسی شیریں بیاں کجا است" اور اردو "زیر زمیں غروب ہوا آفتاب علم" تھا شعرا اور اہل علم کا کافی مجمع تھا۔ اکثر نظمیں (جن کا انتخاب ذیل میں پیش کیا گیا ہے) پُر درد و موثر تھیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔

(مجلہ مکتبہ)

شمسی شیریں بیاں کجا است!

(از جناب مولوی مسعود علی صاحب محوی بی۔ اے)

تا زیر پا زمین است فراغ از زمان کجا است — آنجا کہ نیست بر سر ما آسمان کجا است
ہر کس نشیمن از ستم سقف اختر است — آن رستمے کہ سر کند این ہفت خوان کجا است
بحر جہاں مقام ثبات و قرار نیست — لنگر بہ بار کشتی عمر رواں کجا است
اے تشنگان بادہ الفت نشان دہید — آن ساقی کہ بود بما مہربان کجا است
اے عندلیب بستہ زبان ماجرا بگو — آن گل کہ بود رونق این گلستان کجا است
یعنی بگو کہ طوطی شکر شکن چہ شد — یعنی بگو کہ شمسی شیریں بیان کجا است
گم کردہ اند راہ ہمہ طالبان علم — آن رہنما و راہبر طالبان کجا است
صد عقدہائے علم و ہنر نا کشودہ ماند — آنکس کہ می کشاد بہ ہر فن زبان کجا است
جز شاخسار سدرہ و جز گلستان قدس — اے عندلیب علم ترا آشیاں کجا است
شمسی ز خوان بخشش و رحمت نصیب برد — یارب نصیب محوی افسردہ جان کجا است

وفات شمسی پر خونناپہ فشاں اشک ریزی

(از جناب سید محمود صاحب صفیؔ دار آرائش ملیہ)

(۱)

اک طلسم بزم پر اسرار حکمت علم ہے — اک رہِ منزل مقصود قدرت علم ہے
اہل بینش کے لئے شمع ہدایت علم ہے — رہنمائے کاروانِ نقش فطرت علم ہے
علم ہی میں ہے جو کچھ ہے رازِ تفصیلِ حیات
علم ہے وہ ہی کتابِ شرحِ تکمیلِ حیات

ملتیں جو بامِ رفعت پر نظر آتی ہیں آج — باوجودِ اختلافِ رنگ و ترکیبِ مزاج
ہند کا سوراج ہو یا چین کا آزاد راج — زیر بارِ علم ہیں سب ملک سارے تخت و تاج
آسمانی رازِ حکمت کا خلاصہ علم ہے
اوج بامِ اوجِ فطرت کا سراپا علم ہے

ہو نشاطِ لطفِ منظر یا سرورِ مے کشاں — ہیں چمن کے رنگ پر موقوف ساری مستیاں
پھول جب ہوتے ہیں نذرانہ صد گلستاں — آبیاری گر کرے اک ماہرِ فن باغباں
پتہ پتہ سے ٹپکتی ہے بہارِ رنگ و بو
ہر شگوفہ اس کا ہوتا ہے شرارِ رنگ و بو

آہ اے شمسی وجودِ فیض بخش نازِ علم! — اے سراپا نغمۂ تارِ رباب و سازِ علم!
اے نگارِ بزم فن اے شاہدِ جانبازِ علم! — ملک پر تو نے کئے ہیں منکشف وہ رازِ علم!
ہو گئی انسانیت پیدا سلیقہ آ گیا
فیضِ صحبت سے ترے کس کس کو کیا کیا آ گیا

آج تو گم ہے مگر دنیا میں تیرا نام ہے — تیری علمی خدمتوں کا واہ کیا انجام ہے
تو مٹا ہے اور نہ مٹنا تیرا آساں کام ہے — موت تیری خود بقائے زیست کا پیغام ہے
تو کبھی جب تک کہ ہے تغییر مر سکتا نہیں
تجھ کو آسانی سے عالم محو کر سکتا نہیں

مل گیا تھا قوم کو قسمت سے ایسا اک گہر — کارنامہ جس کا ہے خورشید سے تابندہ تر

قوم وہ خوش بخت ہے جس میں رہا ہے باہنر — مفتخر وہ ملک پیدا جس میں ہوں ایسے بشر

تھی سراپا اک ہدایت کا ورق اس کی حیات
اہلِ دل کو تھی بصیرت کا سبق اس کی حیات

ہو گیا ہے خاک میں دفن آج اک فخرِ زمیں — وقفِ اجزائے پریشاں ہے وجودِ علم و فن
یاد آتی ہے وہ بزمِ عشرتِ عہدِ کہن — اب نہ وہ ہے اور نہ وہ آباد اس کی انجمن

وہ نہیں لیکن ہیں باقی اس کی عظمت کے نشاں
تذکرے اس کے رہیں گے مدتوں وردِ زباں

اے علمبردارِ شانِ حسنِ احکامِ عمل — تھا تری صورت سے ظاہر تیرا انجامِ عمل
سازِ تیرے نطق کا گویا تھا اک الہامِ عمل — اب بھی نغمے پھر رہے ہیں لے کے پیغامِ عمل

گا کے مطرب ساز رکھ دیتا ہے جب زیرِ فلک
گونجتا رہتا ہے اک نغمہ فضا میں دیر تک

تابشِ خورشید کہیے یا کمالِ نورِ علم — یا چراغِ زیرِ دامانِ جمالِ طورِ علم
رہگذارِ جلوۂ مستانۂ منشورِ علم — یا معارف آشنائے جذبۂ منصورِ علم

ذرہ ذرہ اس کا تھا کیفیتِ جذباتِ علم
گوشہ گوشہ اس کا تھا طوفانِ محسوساتِ علم

اے کمالِ بزمِ عرفانِ سلف کی یادگار — تجھ سے تازہ تھی بہارِ یادِ دورِ خوشگوار
وہ مروت وہ محبت وہ ترا اخلاص پیار — کون تھا جو تیرے احساں کا نہیں تھا زیرِ بار

حبِ جاہ و مال سے فطرت تری بیگانہ تھی..
ہستیِ دنیا ترے نزدیک اک افسانہ تھی

کتنے ذرے اس کے نورِ علم سے پرنور ہیں — بادۂ علمی سے کتنے آج دل مخمور ہیں
کتنے سینے آج اس کے فیض سے معمور ہیں — کتنے ہیں جو اس کی نسبت سے یہاں مشہور ہیں

فیض اس کا عام تھا تھی سب پہ چشمِ التفات
جمع تھے محمود اس میں سب بحمد اللّٰہی صفات

نالۂ فراق شمسی

(۲)

امید کے خلاف یہ کیسا سماں ہے آج — کہیئے کہاں وہ شمسیِ شیریں بیاں ہے آج
خواب و خیال ہوگئی وہ بزم علم و فن — اب وہ زمیں رہی ہے نہ وہ آسماں ہے آج
وہ چارہ گر بجا ہے مسیحا اگر کہیں — وہ دردمند قوم کا درماں کہاں ہے آج
وہ مصدرِ فنون و کمالاتِ علمیہ — سرمستِ فیض عالمِ عرفاں کہاں ہے آج
تھا مست جس کے ذوق سے ہر شعبہ علم کا — وہ رمز دانِ معرفتِ حق کہاں ہے آج
کیا انقلاب قوم بتاؤں میں ہم نشیں — گردش میں خود ہی گردشِ دورِ جہاں ہے آج
اے ناسپاس قوم ترا ضبطِ مستقل! — کیوں زیرِ بارِ نالہ و آہ و فغاں ہے آج

یہ صاف آرہا ہے نظر انقلاب علم
دکھلا گئی آج ہے بس قوم خواب علم

وہ فخرِ قوم عالمِ دوراں کدھر گیا — کیا ہوگئی وہ بزم وہ ساماں کدھر گیا
کل تک تھی دھوم جس کے فضائل کی چار سو — تھا قوم میں جو ایک ہی انساں کدھر گیا
وہ صدر بجوم نازشِ اربابِ علم و فن — دریائے فیض منبعِ احسان کدھر گیا
تھا نور بار جس سے جہانِ فروغِ علم — وہ شمسِ قوم شمسیِ تاباں کدھر گیا
اے شمع تو بھی رات کو سرگرمِ رقص تھی — بتلا وہ تیری بزم کا مہماں کدھر گیا
کیا ہوگیا وہ مرشدِ اربابِ باصفا — نورِ چراغِ جادۂ ایماں کدھر گیا
آبا و صالحین کی ظاہر تھی جس سے شان — آنکھیں ہیں جستجو میں وہ ذیشاں کدھر گیا

یا یوں برس رہا تھا ابرِ سحابِ علم
یا منقطع ہے سلسلۂ اکتسابِ علم

غروبِ آفتابِ علم

(از جناب سید عبدالکریم صاحب)

کیوں آج ہو رہا ہے بپا انقلاب علم — آنکھوں میں پھر رہا ہے زوال شباب علم

تاریک ہو رہا ہے جہاں کیوں نگاہ میں — وہ کون تھا جو ڈوب گیا آفتاب علم
آواز دی یہ دل نے کہ علامۂ جہاں — شمس العلوم اشرف عالی جناب علم
جس کی خوشی علامت خوشنودی علوم — تھا جس کا اک خطاب کمال خطاب علم
جس کا خیال آئینۂ جلوۂ کمال — جس کے کمال تاب دہ آب و تاب علم
تھا گرچہ وہ ضعیف ہماری نگاہ میں — پر تھا اسی کے دم سے عروج شباب علم
اے آسمان علم و فضیلت ترے نثار — پیدا کیے ہیں تو نے کئی آفتاب علم
یوں چھپ گیا ترا تن مجروح خاک میں — پارینہ جس طرح تبرک کتاب علم
افسوس تیرے بعد کہاں سن سکیں گے ہم — اب وہ مناظرے وہ سوال و جواب علم
تھی فیض بخش علم و ہنر تیری زندگی — گویا برس رہا تھا دکن پر سحاب علم
بحر العلوم و اشرف و علامۂ زماں — زیبا ہر ایک تیرے لیے تھا خطاب علم
صحبت کا تیری جس کو میسر ہوا شرف — ناکامیاب علم ہوا کامیاب علم
بیکسی وہ تفقہ و توکل وہ ذوق شوق — کن آفتوں سے تو نے کیا اکتساب علم
میت پہ تیری اہل فضیلت تھے بیقرار — مرنے پہ تیرے دیکھ لیا پیچ و تاب علم
جس نے کیا تھا ضیغم پنجاب کو خموش — خاموش کیوں ہے آج وہ حاضر جواب علم
ہر سو شمیم فیض کی اٹھتی ہیں عطر بیزیاں — کھنچتا تھا تیری بزم میں عطر گلاب علم

اے نور اس کا کرتا ہے دشمن بھی اعتراف
کہتا ہے گر کوئی وہی کو باب علم

یاد شمسی

از مولوی محمد سعادۃ اللہ خان ہوش مولوی کامل

بحر العلوم عارف سر کتاب علم — علامہ اشرف العلماء آفتاب علم
دیکھی ہوئی تھی نقشہ معارف کا جس کی آنکھ — گزرا ہوا تھا جس کی نظر سے نصاب علم
تعلیم جس کی وہ کہ جھڑی اک لگی ہوئی — فیضان جس کا وہ کہ برستا سحاب علم
دروازے مسلک کے تھے جس سے کھلے ہوئے — ملتی تھی جس کے در سے ہمیشہ شراب علم

کس کی زمینِ دل پہ شعاعیں نہیں پڑیں — پرتو فگن کہاں نہ ہوا آفتابِ علم
چھو ہی لیا ترے یدِ طولیٰ نے آفریں — گو آسمان سے بھی تھی اونچی جنابِ علم
ہمت نے تیری دوشِ اشاعت پہ رکھ دیا — رکھی ہوئی تھی طاق پہ کب سے کتابِ علم
تحقیق تیری صدر نشینِ کمال و فضل — تیرا بیان مصرعِ موزونِ بابِ علم
کھیتوں کو لہلہا دیا دریا بہا دیئے — کیا ہی امنڈ امنڈ کے برسا سحابِ علم
لاکھوں میں ایک اور ہزاروں میں انتخاب — تجھ پر بھی اس لئے نظرِ انتخابِ علم
تفسیر تیری شاہدِ رعنائے معرفت — تاویل تیری محملِ سلسلۂ دابِ علم
جس کا ہر ایک لفظ ہے یاقوتِ آبدار — نقطہ ہر ایک لفظ کا دُرِّ خوشابِ علم
جس کا ہر اک ورق ہے نہالِ رموزِ دیں — جس کی ہر ایک سطر ہے شاخِ گلابِ علم
بہتا رہے گا چشمۂ فیضانِ علم و فن — جاری رہیں گے یوں تو دروسِ کتابِ علم
لیکن وہ تیری بات کہاں جامع الکمال — گو ہستیاں بہت ہیں فضائل مآبِ علم
مرقد پہ تیری رحمتِ باری کا ہو نزول — جب تک کہ طالبین کریں اکتسابِ علم
رویا کرے گا ہوش ترے افتراق میں — جب تک رہے گی سامنے اس کے کتابِ علم!

آہ مولانا شمسی!

از جناب نواب محمد بہادر خان صاحب خلق جاگیردار

ہم کس کو تیرے بعد کہیں آفتابِ علم — اے فخرِ قوم شمسیِ عالیجنابِ علم
سینہ میں تیرے سرِّ معارف تھے بے شمار — گنتی کہاں کی اور کہاں کا حسابِ علم
ساقی کا اپنے سب پہ برابر رہا کرم — بٹتی رہی ہے سب میں برابر شرابِ علم
دنیائے علم میں ہے قیامت کا اضطراب — مشرق میں ہو رہا ہے غروبِ آفتابِ علم!
کیوں زیر و بم سے خالی فضائے کمال ہے — کیا تیرے ہاتھ ہی کے لئے تھا ربابِ علم!
تجھ میں علوم ظاہر و باطن ہوئے تھے جمع — لاریب تیری ذات تھی لبِ لبابِ علم!
بے ہوش ہم میں ماہ صفت جلوہ گر مگر — تجھ کو کہاں سے پائیں ہم اے آفتابِ علم

اب خلق کس کے سامنے پھیلائے جا کے ہاتھ
ہے تین پشت سے وہ ترا فیضیابِ علم

حضرت شمسی کا طرزِ اصلاح

از

جناب سید مودود احمد صاحب تشنہ وخفائی۔

اِن آنکھوں نے کیا کیا تماشا نہ دیکھا۔ داغ

حال ہی کی بات ہے کہ ایرانی گلی اور کوچہ نسیم میں جو جمگھٹے رہتے تھے۔ وہ خواب وخیال ہوگئے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ اُس مجلس میں بیٹھنے والے، ان بزرگوں کے دیکھنے والے، غرض۔ اب ان پر ماتم کرنے والے، ایک ہم اور ایک میر رحمت علی رفیقؔ باقی رہ گئے ۔ اور بس۔ سچ ہے
ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ہماری فارسی شاعری کی ابتدا ۱۳۴۰ھ سے ہوئی۔ اور ایک ایسے مقام میں جہاں روشن خیالی نیچریت، اور روشن ضمیری دہریت، اور وسیع النظری لامذہبی کے مترادف تھی۔ وہاں بیک وقت ایک ہی جلسے میں اتفاقاً دو غزلیں ہوگئیں مقطع میں تخلص کی نئی اپچ پر غور کرتے رہے۔ سوائے خاقیؔ۔ خفیؔ۔ مخفیؔ۔ چوتھا یاد نہ آتا تھا کہ اتفاقاً غالبؔ کا شعر زبان پر جاری ہوگیا ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ ۔۔۔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ہم نے اس کو فال نیک سمجھا اور جانا کہ خود غالبؔ ہدایت فرما رہے ہیں کہ خفائی تخلص کرنا اور یوں بھی شہرت سے پہلے ظہوری۔ خفائی ہی تھے۔ بس یہی اختیار کیا۔

تخلص کی منزل طے ہوجانے کے بعد، اُستاد کی تلاش رستم واسفندیار کے ہفت خواں سے کچھ کم دشوار نہیں تھی، مگر ہم نے تو مولانا سید اشرف شمسیؔ کو منتخب کیا اور وہ دونوں غزلیں انہی کی خدمت میں روانہ کردیں۔ اور عرض کی یہ پہلی کوشش ہے اگر تخلص اس کے علاوہ دوسرا مرحمت ہو تو سرفرازی ہوگی۔

مولانا نے تو اصلاح فرمادی لیکن تخلص وہی برقرار رکھا۔ ایک عرصے کے بعد بلدہ آنا ہوا اور

موقع بموقع غزلیں پیش کی جاتی رہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ۔ روزانہ ایک غزل اگر چھ مہینے تک دکھلاتے رہو گے تو تم کو اصلاح کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں نے عرض کی کہ یہ ناممکن ہے۔ بہر حال جب کبھی پرچہ پیش کیا جاتا تھا۔ محبت اور بزرگانہ نوازش سے ملاحظہ فرماتے۔ افسوس ہے کہ سرمایۂ موجودہ میں صرف دو غزلیں اور چند متفرق اشعار رہ گئے جو اصلاح پا نہ سکے۔ اب سوچ رہے ہیں کہ اس بے تکلفی سے ہم کس کے پاس جائیں۔ اور کون محبت و نوازش سے ہمارے اشعار بنانے والا ہے ہماری اضلاع کی شترگردی، جو حضرت موصوف کے انتقال سے کچھ عرصے بعد ختم ہو گئی اسے سوء اتفاق نہ کہیں تو کیا کہیں شمسی نمبر کی اطلاع کپل میں ملی۔ اور پھر تبادلہ ہو جانے سے وہاں کچھ بھی لکھ نہ سکے۔ اب معلوم ہوا۔ تو رواروی میں یہ چند سطریں حاضر ہیں۔ معزز قارئین معاف فرمائیں۔

ذیل میں چند اشعار اصل و اصلاح شدہ پیش ہیں جن کے ملاحظہ سے ہمارے نقشِ تخیل اور حضرت مرحوم کے طرزِ اصلاح کا بخوبی اندازہ ہوگا۔ وہو ہٰذا:

غزل

(۱)

اصل	اصلاح
نیست جز یادِ تو کارِ دلِ من	ہست تا یادِ تو یارِ دلِ من
نام تو ہست قرارِ دلِ من	
زان کہ در ہر دو جہان کارے نیست	
گشت مذکورِ تو کارِ دلِ من	ہر نفس یادِ تو کارِ دلِ من
جلوۂ طور دگر بار کلیم	
گشتہ است دار و مدارِ دلِ من	بو کہ بیند بشرارِ دلِ من

اصل	اصلاح
	(۲)
ناخوش وخوش روزگارے داشتم حسرتِ پروردگارے داشتم	برمشیت طرحِ کارے داشتم
یاد ایامے کہ یارے داشتم ہم نوائے ہم کنارے داشتم	دل نوازے غمگسارے داشتم
ازچہ پرسی وصف جانان بوالہوس گلعذارے غمگسارے داشتم	رشکِ گلرویان نگارے داشتم
گرد اسیر عمر صیاد ازل خوش بہ طوبیٰ شاخسارے داشتم	ورنہ بر طوبیٰ قرارے داشتم
التہاب سوزشِ عشقم بسوخت طبع موسیقا روارے داشتم	چون سمندر صد شرارے داشتم
درکنارِ یار جنت بودہ است ہاعجب باغ وبہارے داشتم	درکنارِ یار بودم دربہشت
باز آمد موسمِ گل ساقیا توکجائی ازتو کارے داشتم	توکجائی باتو کارے داشتم
شد خفائی آن دل ومدت گزشت خاکسارے جان نثارے داشتم	آن دلِ مونس خفائی ہم نماند

تنقیدیں

مبادیات سائنس از مولوی محمد عبدالحفیظ صاحب بی، اے، بی ٹی، مددگار سٹی کالج۔ درسی تقطیع ضخامت (۱۲۸) صفحات، قیمت (۱۲/) ۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ ابراھیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ۔

مولفِ کتاب ہذا جناب محمد عبدالحفیظ صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبہ سائنس کے طیلسانی اور ایک تجربہ کار مدرسِ سائنس ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے دیباچے میں بتایا ہے مختلف مدارس فوقانیہ میں انہیں سائنس کی تعلیم دینے کے بعد جو تجربات حاصل ہوے ان کے پیش نظر انہوں نے یہ مفید اور دلچسپ کتاب تالیف کی۔ اس میں سائنس کے مبتدیوں کے لیے خاصہ مواد جمع کیا گیا ہے۔ اور سائنس کے ابتدائی اصول و مبادیات ایک ایک کر کے جدید طریقۂ تعلیم پر سمجھے تفہیم کرائے گئے ہیں۔ اردو میں خالص علمی اور سائنٹفک کتابوں کا جس قدر فقدان ہے اس کے مدنظر جناب حفیظ صاحب کی یہ کوشش نہ صرف طلبہ کے لیے غیر معمولی طور پر کار آمد بلکہ بطور خود بھی لایق تحسین ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام سائنس کی متعدد اعلیٰ درسی کتابوں کا ترجمہ ہوا اور اس مضمون سے متعلق اصطلاحات بھی اردو میں ترجمہ کرلی گئیں مگر نہ اربابِ جامعہ اور نہ متعلمینِ شعبۂ سائنس نے ان اصطلاحوں کو عام کرنے کی کوشش کی اور آج جامعہ عثمانیہ قایم ہوکر کوئی پندرہ برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر جامعہ میں ترجمہ ہوچکی ہیں مگر جامعہ کی چار دیواری کے باہر ان سے کوئی واقف نہیں۔ ہندوستان کے کسی صوبے میں جائیے بمشکل کوئی ادارہ ایسا ملے گا جسے جامعہ عثمانیہ کی ان کوششوں کا علم ہو۔ مختلف صوبجات ہند میں سائنس اور دیگر مضامین اردو میں پڑھائے جانے لگے ہیں مگر وہاں کے مدرسین اور اہل علم بھی اس کوشش سے قطعاً ناآشنا ہیں جو یہاں سرکار عالی کی بے نظیر فیاضی سے عمل میں آرہی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولفِ مبادیات سائنس نے بڑا کام کیا ہے۔

حافظ شیراز از مولوی سید یوشع صاحب بی، اے، (علیگ) درسی تقطیع ضخامت (۔) صفحات

قیمت (۸ر) ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن ۔

خواجہ حافظ مشرق کے وہ مقبولِ انام شاعر ہیں جن کی شہرت مشرق سے گزر کر آج سارے مغرب میں بھی پھیل گئی ہے۔ مشرق کی ان چیدہ ہستیوں میں جن کے افکار صدیوں سے اہل عالم کے قلوب مسخر کیے ہوئے ہیں، ایک خواجہ صاحب بھی ہیں جن کا دیوان ہر ملک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی طور پر قبولیت رکھتا ہے۔ اردو میں بھی دیوان حافظ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ کئی سوانح عمریاں تالیف ہوئیں۔ انگریزی اور فرانسیسی سے بھی اس عنوان پر بعض مضامین کے ترجمے شایع ہوئے۔ یہ ایک نئی اور تخلیقی چیز ہے جو جناب یوشع صاحب نے پیش کی ہے۔ مقالہ نگار نے اس امر کی کامیاب کوشش کی ہے کہ شاعر کو صرف اُس کے کلام کی روشنی میں پیش کیا جائے جیسا کہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "حافظ اپنی شاعری میں مبالغہ بھی کر جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اصل حقیقت کی طرف رہنمائی میں دقت پیش آتی ہے" مولف کے بعض افکار و خیالات کلام کی روشنی میں تو بالکل صحیح مگر تاریخ و سیر کی روشنی میں محتاجِ توثیق رہ جاتے ہیں۔ مولف مقالہ نے بڑی دلچسپ کوشش کی ہے اور کلامِ حافظ کا متجسسانہ مطالعہ کر کے بڑی کار آمد باتیں نکالی ہیں۔

مضامین فرحت حصۂ دوم

از مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی مددگار دفترِ معتمدی امور عامہ حیدر آباد ڈیڑھی تقطیع ضخامت (۱۹۱) صفحات قیمت (عاں) ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن ۔

مرزا الم نشرح (مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب) اردو دنیا میں اپنے ظریفانہ نیز محققانہ مضامین کے ذریعہ خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کے نئے اور پرانے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ابتدا و انتہا کی دو تمہیدی و اختتامی سرخیوں سے قطع نظر بارہ ۱۲ مضمون ہیں۔ ان میں حکیم آغا جان عیش دہلوی والا مضمون بڑی علمی تحقیق کا نتیجہ ہے "بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر" اور "ایک وصیت کی تعمیل" اسلوب بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے بڑے مقبول مضمون ہیں۔ باقی مضامین ان کے بعد ہیں مگر بعض فی نفسہ بہت اچھے ہیں ۔

ہندوستان کا سب سے سستا، دلچسپ، مفید، مشہور و معروف ماہوار رسالہ

باتصویر

نیرنگ دہلی

جسکے اعلیٰ و دلکش افسانوں، روح افزا ڈراموں، پرکیف نظموں اور مفید علمی مضامین اور حسین و رنگین تصاویر کو ملاحظہ فرما کر اکابرینِ ادب کا فیصلہ ہے کہ ؎

"نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!!"

لیکن ہم اس اصول کے خلاف احتجاجی طور پر خدمتِ زبان و ادب کو ملحوظ رکھکر بالکل جدید فیصلہ کر چکے ہیں۔ اسوقت نیرنگ کی اشاعت اُسکے معاونین کی توجہ و عنایات سے اسقدر ہے کہ خرچ اور آمدنی کا حساب برابر ہو جاتا ہے چونکہ ہمارے لائحہ عمل میں صرف خدمتِ زبان و ادب شامل ہے، تجارت نہیں۔ ہم اشاعت کے اضافہ کیساتھ خوبیوں کا اضافہ کر کے چندہ بڑھانے کے اصول کو نظر انداز کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ضخامت، اعلیٰ سے اعلیٰ طباعت و کتابت اور دلکشی اور دلچسپی کے مرغوب سامان پیدا کر کے کم سے کم چندہ میں رسالہ پیش کرنا خدمتِ ادب سمجھتے ہیں۔ کہ اشاعت کی زیادتی سے خرچ کی کمی کو پورا کیا جائے۔ اور عوام و خواص برابر کا فائدہ علم و ادب سے اٹھا سکیں۔ اسلئے یہ انقلابی پروگرام مرتب کیا گیا ہے کہ ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء سے نیرنگ کا سالانہ چندہ تین روپیہ آٹھ آنہ کی بجائے صرف دو روپیہ جسکی ضخامت تقریباً چار جزو ہے، پانچ چھ دلربا تصاویر، رنگین ٹائٹل اور عام فہم روح افزا مضامین آئندہ ان تمام خوبیوں میں کافی اضافہ منظور کیا جا رہا ہے۔ اور سائز بھی بڑھائے جانے کا فیصلہ ہے۔

سال میں کئی خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ جلد چندہ بھیجئے نمونہ کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ بھیج کر منگائیے۔ اور جلد سے جلد اس عجیب و غریب مژدہ سے فائدہ اٹھائیے۔

خادمِ ادب
انچارج
جنرل منیجر نیرنگ دہلی

دو ضروری اعلان

تار کا پتہ چاند — متعلقہ — ٹیلیفون نمبر ۱۱

چاند (اردو ایڈیشن)

ایڈیٹر منشی کنھیا لال ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ

۱- چاند کا خاص ایڈیٹر نمبر نومبر اور دسمبر کا یکجائی نمبر ہوگا

یہ نمبر ہر حیثیت سے ایک قابل قدر نمبر ہوگا۔ مختلف زبانوں کے ایڈیٹر صاحبان نے اپنے مضامین افسانے اور نظمیں بھیجی ہیں۔ علاوہ ان کے متعدد رنگین اور سادی تصویریں اور کارٹون بھی شامل کیے جائیں گے۔

اس نمبر کی قیمت صرف تین روپیہ ہوگی مگر مستقل سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا۔ یہ رعایت نئے ششماہی خریداروں کے ساتھ نہیں کی جا سکتی

۲- چاند کے سالانہ چندے میں خاص رعایت

چاند کی کثیر اشاعت کو اور بھی بڑھانے کی غرض سے اور بہت سے حضرات کے خاطر ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جو لوگ فوراً چاند کی خریداری منظور فرمائیں گے ان سے صرف ... لیا جائے گا۔ "چاند" کی کسی خصوصیت میں کمی نہیں ہوگی

دیر نہ کیجیے۔ اپنا نام فہرست خریداران میں فوراً درج کروا لیجیے

منیجر چاند چندر چوک الہ آباد

وچھیاں بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ بیرونی استعمال کے لیے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اس کو سالہا سال کے تجربے اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھاتا ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس، تشنج مفاصل، دمہ، درد سر، درد سول، بچھو کے زہر کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو سہلائیں اور صاف کر کے صاف ... صاحب بغرض امتحان طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔ **نوٹ:-** ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی دواؤں کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیے جاتے ہیں۔ **المشتہر حکیم سید نیاز احمد حکیمی وسینگ کمپنی قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن**

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ
(٦٥)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ
(۰۰۹۰۰۰۰)

مجلّہ مکتبہ

جلد (٦) شمارہ (١)

بابتہ ماہ آذر ۱۳۴۰ف م اکتوبر ۱۹۳۰ء

تصاویر

(١) حضرت امجد حیدرآبادی (٢) محمد سراج الدین صاحب بی، ایس سی آنرز انجنیئر
(٣) سید یٰسین علی خان صاحب، بی، اے (عثمانیہ) بی، ایس، سی، (آنرز) لندن

فہرست

شذرات

اگرچہ مکتبہ ابراہیمیہ کی بنیاد اب سے پندرہ برس قبل رکھی گئی تھی مگر وہ ابتداً مولوی حاجی مظفر بیگ صاحب کا ذاتی کاروبار تھا اور صرف ان کی تنہا کوشش اور سرمائے سے ترقی پذیر طریقے پر چل رہا تھا۔ بعد کو موصوف نے اپنے نفع کثیر کا ایثار کرکے علم کی خدمت گزاری کے شوق میں اس کو انجمن امداد باہمی (کواپریٹیو سوسائٹی) کی صورت میں بدل دیا۔ اس کی دوسری زندگی کا بحمداللہ چوتھا سال ختم ہوگیا اور اب اس نے پانچویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اس وقت اس کے کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہیں:۔(۱) شعبہ تجارت (۲) شعبہ طباعت (۳) شعبہ اشاعت۔

شعبہ تجارت میں مکتبے کی اپنی مطبوعات کے علاوہ اردو کی تقریباً مطبوعہ قدیم و جدید کتب کتب درسی اور آلات تعلیمی وغیرہ کا اسٹاک رہتا ہے اور اس کا بک ڈپو اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں، کتابوں کی کثرت اور سربراہی کے معقول انتظام کی وجہ سے اس وقت نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان میں بھی اپنی نوعیت کا واحد اردو بک ڈپو ہے اور شہر کے ایسے پر رونق، آباد اور موقع کی جگہ واقع ہے کہ اہل علم بہ آسانی آکر اس کا معاینہ کرسکتے اور اپنی مطلوبہ کتب حاصل کرسکتے ہیں۔

شعبہ طباعت میں اس وقت چند دستی پریس اور برقی پریس جاری ہیں اور جلد بندی اور شیرازہ بندی وغیرہ کا کام بھی ہوتا ہے۔ مکتبے کی اپنی مطبوعات کے علاوہ بیرونی طباعت کا بھی بہت کچھ کام ہوتا ہے۔ اور کثرت فرمایشات کے مدنظر موجودہ پریس ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ قریب میں امید ہے کہ اور مشین پریس اور کتب تراشی اور بلاک سازی کی مشینیں بھی آجائیں گی۔
شعبہ اشاعت جس سے یہ ماہوار رسالہ شایع ہوتا ہے، اس وقت تک تقریباً ایک سو علمی، ادبی اور درسی کتابیں شایع کرچکا ہے۔ سال گزشتہ اس نے حسب ذیل کتابیں شایع کیں۔ ان میں سے ایک کتاب جغرافیہ ریاست حیدرآباد کا چھٹا ایڈیشن ہے اور باقی سب پہلی دفعہ چھپی ہیں۔

(۱) اردو شہ پارے جلد اول مولفہ ڈاکٹر زور (۲) قدیم افسانے مرتبہ سروری (۳) کردار اور افسانہ مولفہ سروری (۴) قاموس الاغلاط مولفہ مولانا مختار احمد صاحب و مولانا غلام مصطفیٰ صاحب ذہین - (۵) گلشن گفتار مرتبہ سید محمد ام، اے (۶) نیلگری مولفہ مولوی حمید اللہ صاحب ام، اے ال ال بی، (۷) قاعدہ فارسی مولوی محسن خان صاحب متین (۸) عمل ہندسہ عملی مولفہ مولوی نیر الدین صاحب بی، اے (۹) جبر و مقابلہ مولفہ مولوی سید انوار حسین صاحب بی، اے (۱۰) طریقہ املا نویسی مولفہ مولوی مظفر الدین صاحب (۱۱) حل پرچہ جات ریاضی مرتبہ مولوی نیر الدین صاحب بی، اے (۱۲) جغرافیہ ریاست حیدرآباد مولفہ مولوی غلام قادر صاحب بی، اے و مولوی غلام رسول صاحب (۱۳) جغرافی گر مولفہ مولوی غیاث الدین صاحب -

سال حال جو کتابیں زیر طبع ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم قبل ازیں شذرات میں کر چکے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے متعلق آیندہ اشاعتوں میں ذکر کیا جائے گا۔

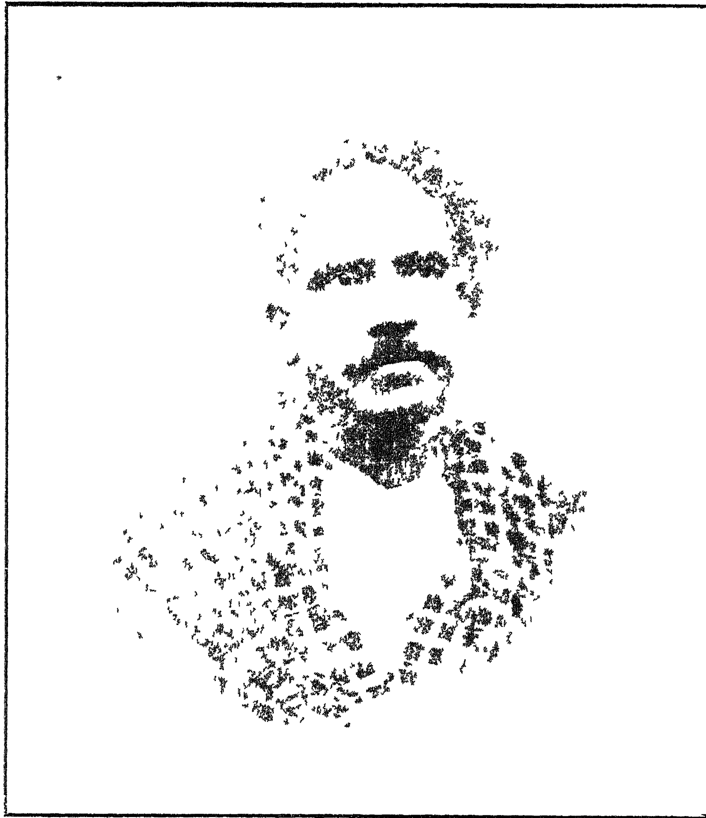
اس نمبر میں ہم حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر حضرت امجد کی لائف اور شاعری پر مولوی ظفریاب خان صاحب کا جو حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق اہل قلم اور مشہور جرنلسٹ ہیں ایک سیر حاصل مقالہ شایع کر رہے ہیں - اس کے ساتھ حضرت امجد کی تصویر بھی دی جا رہی ہے حضرت امجد کا دل پذیر کلام ہندوستان کے تقریباً تمام چوٹی کے رسالوں میں شایع ہوتا رہتا ہے لیکن آپ کی تصویر آج تک کسی رسالے میں شایع نہیں ہوئی - یہ امتیاز اس وقت صرف مجلہ مکتبہ کے اس نمبر کو حاصل ہو رہا ہے کہ وہ آپ کی تصویر اور آپ کے حالات و مقالات کے ساتھ شایع ہو رہا ہے -

دوسری دو تصویروں میں ایک سید یسین علی خان صاحب، بی، اے (عثمانیہ) بی، ایس، سی، (آنرز) (لندن)، کی ہے - جو چار سال قبل سرکار عالی سے وظیفہ یورپ پاکر انجنیری کی تعلیم کے لئے لندن گئے تھے انہوں نے جامعہ لندن کے سیول اور بلدیاتی (میونی سی پل)، انجینیری کے آخری امتحان میں فرسٹ کلاس آنرز کی ڈگری حاصل کی اور بارہ مضامین میں (۹۲) فی صد نمبر لیے اور جامعہ لندن کا امتیازی انعام اور تمغہ (شیڈوک میڈل اور پرایز) کے مستحق قرار پائے - وائی کونٹ چمسفورڈ نے جو صدر ہیں

اس کامیابی پر حیدرآباد کو مبارک باد دی ۔ دوسری تصویر محمد سراج الدین صاحب ام، ایس سی (طبیعیات)، بی، ایس سی آنرز (انجنیری) اے، آر، سی، پی، ئی سے ہے جو ڈاکٹر محی الدین شریف صاحب وظیفہ یاب سیول سرجن کے فرزند اور نواب رحمٰن یار جنگ مرحوم معتمد دفتر ملکی کے برادرزادہ ہیں ۔ یہ اب سے کوئی اٹھارہ برس قبل یورپی وظیفہ لیکر انجنیری کی تعلیم کے لیے لندن گئے کامیابی کے بعد حیدرآباد آکر پھر مزید تحقیقات کے لیے عازم یورپ ہوے اور اس وقت کیمبرج کے ایک مشہور کارپوریشن میں ریسرچ فزیسٹ (محقق طبیعیات) کی حیثیت سے مامور ہیں ۔طبیعیات اور انجنیری پر ان کے متعدد مقالے یورپ کے مشہور رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں ۔ ادارہ میکانکی انجنیری لندن (انسٹی ٹیوشن آف میکانیکل انجنیرس لندن) سے ٹامس ہاکسلے کا موسومہ اعزاز ملا اور ان کے سوا غیرانگریزوں میں یہ اعزاز ساری سلطنت برطانیہ میں صرف ایک اور صاحب کو ملا ہے جو اس وقت جامعہ مدراس میں انجنیری کے پروفیسر ہیں ۔یٰسین علی خان صاحب و سراج الدین صاحب دونوں حیدرآباد کے مایۂ ناز فرزند ہیں ان کی کامیابی و اعزاز ملک کے لیے باعث صد فخر و مباہات ہے ۔

گزشتہ نمبر میں جو علامہ بحرالعلوم حضرت شمسی مرحوم کے متعلق سلسلہ مقالات شایع ہوا ہے وہ عجلت اور جلدا جلدی میں مرتب ہوا تھا مولانا سعادت اللہ خان صاحب کے مضمون میں ایک جگہ ایک سرخی طب کی بالکل زاید اور غلط چھپ گئی ۔ ناظرین تصحیح فرمالیں ۔

شش ماہی پنجم کی مجموعی فہرست مضامین جو اس نمبر کے ساتھ شایع ہونی چاہیئے تھی، عدم گنجایش کی وجہ سے نہ دی جاسکی ، اگلے نمبر میں اس کو شریک کردیا جائے گا ۔



ابوالاعظم سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

حضرت امجد حیدر آبادی

از

جناب مولوی محمد ظفریاب خان صاحب سابق مدیر رسالہ ادیب حیدرآباد

حضرت امجد اُن مشاہیر ملک سے ہیں جن کو زمانہ آسانی کے ساتھ پیدا نہیں کرسکتا۔

"دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بوسعید اندر خراساں یا اویس اندر قرن"

میرے اکثر احباب ایک زمانہ سے اس بات کے متقاضی تھے کہ حضرتِ موصوف کے مختصر حالات اور اُن کے پُر از حقایق و معارف کلام کا انتخاب عامۃ الناس کے استفادہ کی غرض سے کسی مقامی پرچہ میں شایع کیا جائے۔ خیال تھا کہ اس پر قلم اُٹھانے کے لئے کسی ایسی بزرگ ہستی کو آمادہ کیا جائے جس کا پایہ ادب و شاعری کے علاوہ فلسفۂ الٰہیات میں بھی بلند ہو لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو مجبوراً مجھے اپنے ہی آپ کو مجبور کرنا پڑا۔

نام و نسب ابو الاعظم کنیت، سید احمد حسین نام، امجد تخلص، صوفی سید رحیم علی مرحوم حیدر آبادی کے اکلوتے فرزند ہیں۔ ابھی آغوشِ مادر ہی میں تھے کہ قضا و قدر نے محبتِ پدری سے محروم کر دیا اور شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھالیا۔ شفیق ماں نے ہمتِ مردانہ سے کام لیا اور محنت و مشقت برداشت کر کے اس دُرِ یتیم کی پرورش کی۔ سنِ ولادت غالباً سنہ ۱۲۰۴ ھ ہے۔

حلیہ رنگ گندم گوں، متوسط القامت، فراخ پیشانی، مختصر سی خشخشی ڈاڑھی، جسم اوسط درجہ کا عمر تخمیناً ۴۸ سال۔

تعلیم و تربیت ہوش سنبھالنے پر گھر ہی میں ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا اور قرآن مجید ختم کرنے پر مدرسۂ نظامیہ میں شریک کئے گئے جہاں تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بانیِ مدرسہ مولوی محمد امیر اللہ الدین مرحوم اور سرپرستوں میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ

مدرسہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ کچھ طلبہ مولانا انوار اللہ خان بہادر (فضیلت جنگ مرحوم) کی سرپرستی میں شبلی گنج چلے گئے اور کچھ بدستور مدرسۂ قدیم میں رہے۔ موخرالذکر مدرسہ میں حضرت امجد شریک رہے۔ بانیٔ مدرسہ جیسے مجسم ایثار اور فدائے ملت بزرگ کی بے وقت موت نے مدرسہ کے تمام انتظامات درہم و برہم کردئے جس کی وجہ طلبہ کو بھی منتشر ہونا پڑا۔ اس کے بعد حضرت امجد نے اپنے طور پر سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ مدرسہ میں مولوی سعید الدین صاحب سہارنپوری اور مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے اور بیرون مدرسہ بعض مشاہیر ملک یعنی مولنا نادر الدین[ع۲] اور نواب سناد الملک آغا سید[ع۳] علی شوستری جیسے استادان کامل سے عربی اور فارسی میں بہت کچھ بصیرت حاصل کی۔

شادی سن رشد کو پہنچنے پر شفیق ماں نے ایک شریف گھرانے میں ان کی شادی کی۔ شادی کے دو سال بعد لڑکی تولد ہوئی جس کا نام اعظم النساء رکھا گیا۔ اس معصومہ نے ابھی تیسرے ہی سال میں قدم رکھا تھا کہ ۱۹۰۸ء میں طغیانیِ رود موسیٰ کا مشہور ہولناک اور قیامت خیز حادثہ پیش آیا جس میں دیگر افرادِ خاندان کی طرح ننھی معصومہ بھی نذرِ سیلاب ہوگئی۔

ع۱ خدا بخشے محمد امیر الدین کو مرحوم بانی مدرسۂ نظامیہ قصبۂ پونیر تعلقہ منچلے گاؤں ضلع بیڑ کے قاضی اور بڑی خوبیوں کے آدمی تھے ان کو مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی بغیر کسی ذریعہ اور وسیلہ کے محض تائید غیبی کے بھروسہ پر محلہ چار محل میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ڈالی جس میں اکثر نادار اور مفلوک الحال یتیم لڑکے تعلیم پاتے تھے لڑکوں کے کھانے اور رہنے سہنے کا انتظام منجانب مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسہ کا انتظام ایک انتظامی کمیٹی کے زیر نگرانی تھا جس کے سرپرست مولنا انوار اللہ خان بہادر فضیلت جنگ مرحوم تھے۔ ع۲ مولنا نادر الدین مرحوم درۂ کلکان یا کاگان علاقہ افغانستان کے باشندے تھے چھوٹی عمر میں وطن سے نکل کر ریاست رام پور آئے اور یہیں رہ پڑے مولنا عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ دار العلوم میں منطق و فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ مولنا عبدالقدیر پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ مولنا جمال الدین نوری مرحوم اور مولنا مرتضیٰ مرحوم کے استاد تھے تبحر علمی کے ساتھ انتہا درجہ کے نیک اور صوفی منش انسان تھے ۱۳۲۳ھ میں وفات پائی۔ ع۳ نواب سناد الملک آغا سید علی مرحوم شوستر کے باشندے تھے ان کو اعلیحضرت غفران مکان کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ بڑے سخی فیاض اور علم دوست انسان تھے۔ دامن کوہ مولا میں قیام تھا۔ اکثر تشنگان علم استفادہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے تبحر علمی سے سیراب ہوا کرتے تھے دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ عمر طبعی کو پہنچکر انتقال فرمایا۔ عربی اور فارسی کے لاجواب ادیب اور [illegible] تھے [illegible] بہادر آپ کے فرزند ہیں۔

طغیانی رود موسی

طغیانی کے ایام میں حضرت امجد اور اُن کے سسرال کے لوگ محلہ چار محل میں رہتے تھے جو ندی کے قریب واقع تھا اور جس کے ایک حصہ میں اب عثمانیہ ہائی کورٹ کی عالیشان عمارت ہے۔ گو دن ہی سے پانی بڑھنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس خیال سے کہ ہمیشہ کی طرح اب کی دفعہ بھی اس کا زور بتدریج کم ہو جائے گا کسی کو تخلیہ کا خیال نہیں ہوا۔ رات کی تاریکی میں بارہ بجے کے بعد جب پانی کا سیلاب فصیل توڑ کر گھر میں گھس آیا تو سب کے حواس غائب ہو گئے اور ایسے وقت بھاگنے کی سوجھی جب ہر طرف سیلاب نے قبضہ جما لیا تھا۔ حضرت امجد بھی دوسروں کی طرح اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے اپنے ساتھ ضعیف والدہ، بیوی اور کمسن لڑکی کو لیکر نکلے۔ پانی ہر لحظہ بڑھتا چلا جا تا تھا۔ موسلا دھار بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بریں ہم کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد ٹوٹے ہوئے مکانوں کے سہارے ان مصیبت زدوں نے چار محل کے سنگ بستہ نالہ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے آگے راستہ مسدود نظر آیا کیونکہ پانی قدِ آدم سے زیادہ اور اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی جس کی وجہ سے یہ بیکس اور بے بس خاندان ایک معصوم لڑکی کو گود میں لئے ہوئے اس امید میں کئی گھنٹہ گلے برابر پانی اور موسلا دھار بارش میں نالہ کی منڈیر پر کھڑا رہا کہ شاید طغیانی کم ہو جائے اور نجات کی کوئی راہ نکل آئے لیکن موسلا دھار بارش اور سیلاب میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

"اب بھی گریہ سے نہیں فرصت مجھے فوارہ وار گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں"

صبح ہوتے تمام سہاروں نے جواب دیدیا اور پانی سر سے گزرنے کی نوبت آئی تو دور سے ایک چھپر بہتا ہوا نظر آیا اور جب وہ قریب پہنچا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوا اور اس پر سب نے اس خیال سے پناہ لی کہ شاید اس بیچارگی میں یہ کشتی نوح ثابت ہو اور طوفان سے باہر نکال دے لیکن افسوس ہے کہ دو تین منٹ کے بعد اس نے سرد مہری دکھائی اور اپنے ساتھ تین انسانی ہستیوں کو لے ڈوبا۔ اسی سلسلہ میں حضرت امجد ڈوبتے تیرتے زنانہ شفاخانہ کے قریب پہنچے۔ عمارت کی چھت پر شفاخانہ کی عورتیں پناہ گزین تھیں انہیں دیکھ کر رحم آیا اور ان میں سے بعض نے ان کی طرف دوپٹہ پھینکا اور اس کے سہارے اوپر کھینچ لیا۔ طغیانی کا زور کم ہونے پر خستہ اور پر اندوہ حالت میں نیچے اُترے اور ایک عزیز کے مکان میں پناہ لی۔

اس اندوہناک اور قیامت خیز داستان کا فوٹو حضرت امجد نے اپنی ابتدائی اور مشہور نظم ''قیامتِ صغریٰ'' میں جس کا اقتباس درج ہے اس طرح کھینچا ہے :-

میں موردِ حرماں و گرفتارِ بلا ہوں
ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچوں سے جدا ہوں
گہ محوِ فغاں ہوں کبھی مصروفِ بکا ہوں
معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں
بیہوش کبھی ہوں کبھی ہو جاتا ہے سکتا
وہ عالمِ حیرت ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

جو ہم نے سہا ہے نہ سہا ہوگا کسی نے
دیکھا ہے جو کچھ ہم نے وہ دشمن بھی نہ دیکھے
کچھ ایسے دئے چرخِ ستمگار نے چرکے
یک لخت ہوے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے
لختے برد از دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

اے وائے تقدیر میں دنیا میں جب آیا
چالیسویں دن ہی نہ رہا باپ کا سایہ
جو باقی تھے دریا نے کیا ان کا صفایا
کمبخت نے اک دم میں عزیزوں سے چھڑایا
زخمِ دلِ صد چاک ہم اب کس کو دکھائیں
افسانۂ شوریدہ سری کس کو سنائیں

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں۔
بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرتا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں
وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا
سیلابِ فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا
آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدۂ پُرنم
بھائی کہیں دیدی کہیں قوت تھی نہ دم

عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم[1]
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

کس جا سے میں ڈوبی ہوئی نعشوں کو نکالوں بیٹی کا پتا کیا ہے۔ کہاں بی بی کو پاؤں
دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں
ہے ہے ہدف رنج و محن کر گئیں اماں
افسوس کہ بے گور و کفن مر گئیں اماں

جب انجمن عیش و طرب ہو گئی برباد افسردہ بھلا کیوں نہ رہے خاطر ناشاد
تنہائی میں آتی ہے عزیزوں کی اگر یاد بے ساختہ کرتا ہے دل غمزدہ فریاد
اشک آنکھوں سے جاری ہیں کبھی لب پہ فغاں ہے
مرنے کے لئے مرتے ہیں پر موت کہاں ہے

للہ یہ بگڑی ہوئی تقدیر بنا لو ۔۔ ہیں خاک پہ گرنے کو ہوں لو! جلد سنبھالو
امجد کو بھی۔ اعظم کی طرح پاس بلا لو اک بار ذرا پھر مجھے چھاتی سے لگا لو
دل میں مرے اب صبر کی طاقت نہیں اماں
دنیا میں بغیر آپ کے راحت نہیں اماں

حضرت امجد کو بیوی اور لڑکی سے زیادہ شفیق اور مہربان ماں کے ڈوبنے کا صدمہ ہوا مندرجۂ بالا نظم کے علاوہ ایک رباعی میں بھی اپنے دردِ دل کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہوں میں
پامالِ زمانہ صورتِ مور ہوں میں
اماں نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش ہوں
تم ہو بے گور، زندہ در گور ہوں میں

---

[1] مراد از اعظم النساء دختر حضرت امجد۔

طغیانی کے بعد کا زمانہ طغیانی کے بعد بلدہ کے مشہور شیخ طریقت حضرت سید محمد اصغر حسینی مرحوم سجادہ درگاہ حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمہ نے حضرت امجد کو اپنے فرزند حضرت سید محمد صابر حسینی سجادۂ درگاہ موصوف کی جو اس زمانہ میں کم سن تھے تعلیم وتربیت سپرد فرمائی ۔

حضرت امجد پر خانہ برباد طغیانی کا اس قدر صدمہ تھا کہ آپ ایک مدت تک حالتِ خود فراموشی میں رہے ۔ اسی حالت میں سرکاری فرائض کی انجام دہی کے بعد فرصت کے وقت مولانا نادر الدین مرحوم سے کچھ پڑھ لیا کرتے تھے ۔

عقدِ ثانی آخر چھ سال کے بعد مولانا ے مرحوم ہی کی تحریک پر ان کی بڑی صاحبزادی جمال النساء سے جو حسن صورت اور حسن سیرت میں فرد روزگار تھیں ۵؍ جمادی الآخرہ سنہ ۳۳ھ روز جمعہ کو عقد ہوا ۔ حضرت امجد نے انہیں سلمیٰ کا لقب دیا ۔ عقد کے بعد چھ سال معمولی حالات میں گزرے اس کے بعد جو کیفیت ہوئی وہ حضرت امجد ہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

تبریک زندگی کے علمی اور روحانی کمالات پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا ۔ نہ کہیں جانے کی ضرورت ہوئی نہ آنے کی ۔ وقت آگیا ۔ رحمت الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلتے گئے ۔ مولانا مرحوم کی دعا کا اثر شروع ہو گیا ، خدا اور رسول کی محبت کے آثار سلمیٰ کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے ۔ سروسینہ میں دل و دماغ کے دبے ہوئے بیج ایک طاقتور پودے کی طرح پھولنے پھلنے لگے ۔ غیر معمولی دوربینی ، دقیقہ رسی ، ذہانت ، ادراک ، غور و فکر کا ملکہ ترقی کرتا چلا ۔ دماغ کی مخفی لہروں میں بڑھتے بڑھتے سمندر کی سی طوفان خیز ، حیرت انگیز طاقت پیدا ہوتی چلی ۔ منہ سے جو بات نکلتی ، عجیب ہوتی جو گفتگو ہوتی حیرت خیز ہوتی وہ کہنے کے لئے تھیں ہم سمجھنے کے لئے تھے "۔

ہماری حیرانی ، اُن کی مسرت کا سبب ، ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا ۔

اے جان تو شاد از گرانجانیٔ ما
اے جمع دل تو از پریشانیٔ ما

ہر جلوۂ تو بہ بحر حیرت افگند
آخر غرضت چیست ز حیرانی ما

اگر ہم یہ کہیں یہ کوئی بیرونی چیز نہیں تھی بلکہ ہماری ہی قوت دماغی کا انعکاس تھا، جو دوسری طرف مرتسم ہو رہا تھا اور یہ ہماری ہی تقدیروں کا اثر تھا جو نئے رنگ میں ظہور پذیر تھا تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ لطائف و نکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آئے تھے ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ انھوں نے کوئی بات کہی اور ہم نے حیرت سے منہ کھول دیا، وہ تقریر کرنے لگیں ہم مبہوت سے بنے ہوئے سنتے رہے، کبھی کبھی انہیں بحثوں اور مکالموں میں آدھی آدھی رات گزر جاتی۔ کبھی کبھی پکانے کے لئے بھی وقت نہ ملتا، بازار سے روٹی لاکر کھالیتے اکل و شرب کی تمام لذتیں، روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں، اکثر کہا کرتیں۔

زندگی باید مرا نام و نشاں درکار نیست
لذتِ جاں باید م ذوق زباں درکار نیست

افسوس ہے کہ اس فرد روزگار ہستی یعنی جمال النساء سلمیٰ[عہ] کا وصال حج سے واپسی کے ڈھائی مہینے بعد ۳۳ سال کی عمر میں ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ روز جمعہ کو صبح کے وقت ہوا۔ اور احاطۂ درگاہ حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمۃ میں حضرت امجد ہی کے مزار میں جسکو انھوں نے اپنے لئے تیار کرایا تھا پیوند خاک ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ان کے علمی اور روحانی کمالات کی تفصیل "جمال امجد" میں ملاحظہ ہو۔

عہ علامہ نادرالدین مرحوم کی نور نظر ہونے کے لحاظ سے مرحومہ جمال النساء سلمیٰ میں جو روحانی اور علمی کمالات تھے اس کے مجمل واقعات ملاحظہ فرما چکے ان کے علاوہ کبھی کبھی عالم خاص میں ان کی زبان پر اشعار بھی جاری ہو جایا کرتے تھے جن کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو:۔ غزل

نہ ہو کوئی ہمرہ یہی ہمرہی ہے — رہوں بے خبر میں یہی آگہی ہے
کبھی ہے قیام اور کسی وقت سجدہ — کبھی سرکشی ہے کبھی عاجزی ہے
کبھی ٹیس دل میں کبھی لب پہ آہیں — مری جان کچھ آگ نہ اک دل لگی ہے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

شاعری کی ابتدا

حضرت امجد میں شاعری کا ذوق فطری ہے جب کچھ ہوش سنبھالا اور تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تو شاعری کی جانب غیر معمولی رجحان پیدا ہوا۔ غزل سے ابتدا ہوئی اور دلی جذبات کا اظہار اردو، فارسی زبانوں میں ہونے لگا ان کے قلم سے سب سے پہلے یہ اردو شعر نکلا:۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب نہ ہو نا مہرباں وہ مہرباں اپنا

اور فارسی میں یہ شعر:۔

بسان سایۂ نصف النہارم پیش پا افتد
اگر خورشید محشر را نظر بر داغ ما افتد

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱

نہ میری سنیں گے نہ بولیں گے مجھ سے
عجب بیکسی ہے عجب خامشی ہے

عجب ہے کہ شاخیں تو ہیں آسماں پر
جو جڑ ہے وہ مٹی کے اندر دبی ہے

نہ معلوم جب تجھ کو دیکھوں تو کیا ہو
ترے نام ہی میں مجھے بیخودی ہے

ہے سلمیٰ دل و جان سے امجد کی لونڈی ہے
اور امجد غلامِ نبی ہے

متفرق اشعار

کبھی حسن ہے تو کبھی عشق ہے تو
کبھی کھینچتا ہے کبھی کھنچ رہا ہے

ایک مدت سے پڑی ہے مری سوتی نگری
اپنی بستی مری ہستی میں بسالے آجا

نشاں را مبیں کیں نشاں بے نشان است
مکان صد ہزار و مکیں لامکان است

قطعہ

زندگی کی موت سے تکمیل ہے
موت کیا ہے حکم کی تعمیل ہے

حکم کیا روح و روانِ زندگی
زندگی کیا اپنے رب کی بندگی

مخمس

وہ یوسف گم گشتہ کس جائے نہاں ہوگا
کس پہلو میں پوشیدہ وہ راحت جاں ہوگا

یہ عالم کثرت کب توحید نشاں ہوگا۔
اس جسم کی مسجد میں کب شورِ اذاں ہوگا

مرا غیرِ آقا اللہ! کہاں ہوگا۔

کچھ دنوں اردو غزل کی حد تک حضرت حبیب[۱] کنتوری سے اور فارسی میں جناب ترکی[۲] سے مشورت کرتے رہے لیکن تھوڑی مدت میں اس سے بے نیاز ہوگئے اور اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے۔ حضرت امجد کا کلام ان کے شاگرد یا احباب شہر کے مشہور اور نامی مشاعروں میں سنا کر حاضرین سے خراج تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں ان کی غزل کے اس مقطع کی۔

منہ کھولتا ہے تاکہ پلا دے کوئی شراب
امجد جمائیاں نہیں لینا خمار میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲

جنگل میں بھٹکتی ہوں اب راہ دکھا دیجئے
ہاں دامن سلمیٰ کو کانٹوں سے چھڑا دیجئے

بچھڑی ہوئی لونڈی کو آقا سے ملا دیجئے
یا سیدنا صدیق کچھ آپ بتا دیجئے

مرا عربی آقا اللہ کہاں ہوگا

رباعیات

خالی ہے مکاں مکین پیدا کردے
دل میں میرے دل نشین پیدا کردے

اے مردہ دلوں کے زندہ کرنے والے
شکی دل میں یقین پیدا کردے

تن میرا ترا رین بسیرا ہو جائے
سونی نگری میں ایک پھیرا ہو جائے

میں اپنے لئے ذرا بھی باقی نہ رہوں
میرا سارا وجود تیرا ہو جائے

جب راکھ نکل گئی دہک کر اٹھے
سورج کی طرح چہک دمک کر اٹھے

یوں موت نے صاف کردیا دامن روح
جس طرح کوئی گرد جھٹک کر اٹھے

اب روح قدم قدم پہ اتراتی ہے
ہر سانس میں تازہ زندگی پاتی ہے

اک روز قدم حضور کے چومے تھے
اب تک میرے منہ سے بوئے عطر آتی ہے

۱؎ مشہور شاعر ہیں۔ سید محمد کاظم نام حبیب تخلص تھا کنتور کے رہنے والے تھے۔ مکرمی حضرت ضامن کنتوری کے والد ماجد اور مولانا تصدق حسین مرحوم مہتمم کتب خانہ آصفیہ کے بہنوئی۔ غالباً دفتر صوبہ داری ضلع ورنگل کی سررشتہ داری پر مامور تھے قیام بلدہ میں ان کے گھر ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا جس میں اساتذہ وقت اپنا کلام سناتے تھے انتقال کو (۲۰، ۲۲) سال ہوئے بلدہ میں ان کے اکثر شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔

۲؎ ترک علی شاہ نام ترکی تخلص تھا نور محل (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مولانا غلام قادر گرامی مرحوم

حضرت میکش[۱۵] تھانوی مرحوم نے بہت داد دی اور فرمایا امجدؔ کی جگہ میکشؔ ہوتا تو اس میں اور چار چاند لگ جاتے ۔

راقم اور حضرت امجد سے ۱۳۱۲ف سے ملاقات ہے ۔ ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک موقع پر مولانا نے چند اردو، فارسی رباعیاں سنائیں جو اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین پر مبنی تھیں ۔ میں نے اشاعت کی غرض سے اور رباعیاں کہنے کی جانب توجہ دلائی جس کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی سی مدت میں اردو اور فارسی رباعیوں کا مجموعہ ترتیب پا گیا جسے میں نے مطبع شمسی آگرہ میں طبع کرا کے شائع کیا ۔ اس مجموعہ کو ملک نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا ۔ مقامی اخبارات اور مشاہیر ہند علی الخصوص شمس العلما مولانا حالی، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اور مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم نے دکن کے ایک نوجوان شاعر کا کلام نہایت تعجب سے پڑھا اور اس پر حوصلہ افزا تقریظیں لکھیں ۔ سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کے متعدد نسخے خرید کئے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ان کے برادر نسبتی تھے ۔ حضرت ترکی درباری شاعر اور مہاراجہ بہادر کے مصاحبِ خاص تھے ۔ مشاعرہ میں غزل سناتے وقت کئی کئی گز آگے نکل جاتے تھے ۔ آدمی نہایت زندہ دل تھے ۔ اردو اور فارسی میں صاحب دیوان ہیں عمرِ طبعی کو پہنچکر انتقال کیا ۔

[۱۵] تھانہ بھون کے رہنے والے تھے ۔ ان کا نام پنڈت سورج بھان اور میکش تخلص تھا ۔ بلدہ میں آنے کے بعد تھانہ بھون کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ امداد علی علوی خلیفہ حضرت مرزا سردار بیگ رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، پہلے نام کی مناسبت سے اسلامی نام شمس الحق رکھا گیا ۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے ۔ حیدرآباد کے اکثر نوجوان ان کے شاگرد تھے ۔ حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم کو بھی ابتدا میں انہیں سے تلمذ تھا بعد ازاں حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے ۔ حضرت میکش مشاعرہ میں اپنی غزل نہایت دردناک لہجہ میں سناتے تھے پندرہ سال ہوئے سرزمین حیدرآباد میں پیوند خاک ہوئے ۔

تصانیف حضرت امجد کی نظم و نثر میں متعدد تصانیف ہیں جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

(۱) "رباعیات امجد" حصہ اول - اس مجموعہ میں چھوٹی بڑی (۴۲) نظمیں ہیں جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں اور جس میں بقول مولانا سید عبدالغنی وارثی مرحوم "جوش رحمت" "دنیا اور انسان" "ماں اور بچی" "میری قبر" "اسنو ہیلنا" اور "قیامت صغریٰ" خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین اور لائق داد ہے"

(۲) "ریاض امجد" حصہ دوم - اس میں بھی مختلف عنوانوں کے تحت چھوٹی بڑی (۴۴) نظمیں ہیں اور سب کی سب پسندیدہ اور شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں -

(۳) "خرقہ امجد" (سی پیوند) جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس میں ایک مقدمہ کے علاوہ جو حضرت امجد کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے فلسفہ الہیات پر (۳۰) نظمیں ہیں جو مختلف عنوانوں کے تحت لکھی گئی ہیں اور اکثر و بیشتر رباعی کے وزن پر ہیں - ان نظموں میں جن اعلیٰ خیالات کا اظہار ہوا ہے ان کے سمجھنے کے لئے لیاقت علمی کے علاوہ فلسفۂ تصوف سے دلچسپی اور معلومات کی بھی ضرورت ہے - الغرض یہ نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔

(۴) "نذر امجد" اس میں ہجرت کے واقعات شستہ زبان، بہترین اسلوب اور والہانہ جذبات کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں - اس مسدس کے (۳۴) بند ہیں حیدرآباد اور بیرون ملک کے اکثر خاندان کی مسلمان لڑکیاں اس کو خوش الحانی کے ساتھ مزے لے لیکر پڑھتی اور قلوب کو نور ایمان سے منور کرتی ہیں -

(۵) "رباعیات امجد" حصہ اول - اس میں (۶۸) اردو اور (۳۰) فارسی رباعیات ہیں - اس پر مولانا عبداللہ العمادی ناظر مذہبی و رکن دارالترجمہ نے اپنے خصوصی انداز میں مقدمہ لکھا ہے - فرماتے ہیں :-

معراج سخن میں شاہد معنی کو ہر صفت دیکھنا ہو تو "رباعیات امجد" کو دیکھئے جس کے جلووں میں خدا کی شان نظر آتی ہے اور جس کی حکیمانہ ابداع اس مبدع اعظم کی قدرت کاملہ کا نشان بتاتی ہے - . . . .

یہ واحد و حید یہ فرد فرید ابوالاعظم سید احمد حسین صاحب امجد کی آیت کمال ہے

جن کی تلاوتِ کلام پر عجب نہیں اہلِ حال سجدہ جائز سمجھیں اور جبینِ سجود حبابِ الٰہی میں عرضِ خضوع کرے کہ:-

قایم بہ عبادت تو کہسار بدشت — مصروف رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا ز حباب سبحہ درکف دارد — انگشت شہادت است ہر خار بدشت

ان رباعیوں میں قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت یا حدیث شریف کے کسی نہ کسی مفہوم کی جانب ایک خاص دل آویز و دل نشیں انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس حصہ کی اکثر رباعیاں شاعری کے ابتدائی زمانہ کی ہیں۔

(6) "رباعیات امجد" حصہ دوم (76) اردو اور (4) فارسی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک دلچسپ مقدمہ کے ساتھ "معلومات امجد" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ (20) رباعیات کا مجموعہ ہے۔

(7) "جمال امجد"۔ یہ دلچسپ کتاب (11) نوشتوں اور (244) صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت امجد کی اعلیٰ اور انوکھی نثر نگاری کا نمونہ ہے اس میں حضرت امجد نے اپنے اور اپنی شریک و رفیق زندگی جمال النساء سلمیٰ بنت مولانا نادر الدین مرحوم کے حالات و حکیمانہ اقوال نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں اور موقع و محل پر رباعیات اور قطعات کا جوڑ سونے پر سہاگہ ہو گیا ہے۔

(8) "حج امجد"۔ اس میں حضرت امجد نے سفرِ حجاز کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ سفر جو فریضۂ حج کی تکمیل پر مبنی تھا حضرت امجد نے 1347ھ میں اپنی رفیق زندگی سلمیٰ مرحومہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے مختلف عنوان ہیں اور ہر ایک کی تکمیل نہایت والہانہ انداز میں ہوئی ہے اور لفظ لفظ سے اسلامی اور مذہبی جذبات عیاں ہوتے ہیں۔

کلام پر ایک نظر حضرت امجد کی حقیقی شاعری کا اظہار ان کی رباعیوں سے ہوتا ہے وہ پبلک میں روشناس بھی زیادہ تر رباعی گو شاعر کی حیثیت سے ہیں۔ اگرچہ وہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ عمر خیام، سحابی نجفی اور سرمد کا سا دل و دماغ رکھ کر غزل گو شعرا کی صف میں جگہ پائیں

اور ان کے قدیم طرز کے کلام کا کچھ وجود بھی دنیا میں باقی رہے چنانچہ اردو فارسی مجموعہ غزلیات اور متفرق کلام جس قدر بھی تھا سب کا سب نذر سیلاب ہوگیا۔

حضرت امجد چونکہ رباعی گو شاعر ہیں اور اس صنف میں انہیں خاص ذوق ہے لہذا ناظرین کی دلچسپی کے لئے سب سے پہلے اسی صنف کو لیا گیا ہے۔

رباعیات پر مشاہیر ہندو دکن کے خیالات

قبل اس کے کہ رباعیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جائے ان کی اہمیت کے لحاظ سے بعض مشاہیر ہند کے خیالات درج کئے جاتے ہیں:-

علامہ عمادی ناظر دار الترجمہ۔ "معراج سخن میں شاہد معنی کو ہر ہفت دیکھنا ہو تو رباعیات امجد کو دیکھئے۔

مولانا عبد القدیر پروفیسر۔ "ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت"۔

مولانا جمال الدین نوری مرحوم۔ "رباعیات امجد بے مثل ہیں"

مولانا عبد الواسع پروفیسر۔ "ہر رباعی مضامین کا ایک دفتر ہے اور ہر مصرعہ دلکشی کا ایک بے بہا گوہر۔

مولانا علی حیدر طباطبائی۔ "رباعیات امجد کی داد دینا سخن شناسی کا اقتضا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی۔ "حضرت امجد ہندوستان کے ان شعرا میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر سر اقبال۔ "ہر رباعی قابل داد ہے ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے"

مولوی محمد الحق پٹنہ۔ "ہر رباعی ضرب المثل ہونے کے قابل ہے"

مولوی عبد الماجد بی، اے۔ "رباعیات امجد معنویت کی بلندی اور طرز ادا دونوں حیثیت سے قابل داد ہیں۔

مولوی عظمت اللہ خان بی، اے مرحوم۔ "رباعیات امجد زندگی کی اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہیں اور بہ لحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہے"

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم - "امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں - مبصرین کی رائے میں اس وقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہے"

مولوی الیاس برنی پروفیسر "وہ ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ "وشاعری جزویست از پیغمبری"

مولانا غلام قادر گرامی مرحوم :-

"امجد بہ رباعی است فرد امجد کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز روح سرمد بگفت امجد، امجد"

نمونہ رباعیات اس مضمون کو، کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے ذیل کی رباعی میں کس قدر دلنشیں انداز میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

"قایم بہ عبادت تو کہسار بدشت مصروف رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا زحباب سبحہ درکف دارد انگشت شہادت است ہر خار بدشت"

یہ مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا اس کی توجیہات قدیم و جدید شعراء نے مختلف طریقہ پر کی ہیں اور اس بارہ میں بہت کچھ نازک خیالی سے کام لیا ہے - اس مضمون کو حضرت امجد نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے :-

اے آنکہ خیال تست پیدا در دل آثار محبتت ہویدا در دل
دانی کہ چہ شد سیاہی سایۂ تو؟ درچشم سواد شد سویدا در دل

دنیا میں اکثر ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ جن کو اپنے زہد پر ناز اور عبادت پر غرور ہوا کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ زہد و ریاضت تزکیہ نفس اور صفائی قلب کا باعث ہو اس سے اُلٹی تاریکی چھا جاتی ہے - اس واقعہ کو پیش کرتے ہوے مثال میں تھر کا عمل بتاتے ہیں کہ ایک ہی سجدہ میں اس پر سے تو سیاہی دور ہو جاتی ہے لیکن تعجب ہے کہ نماز کے سیکڑوں سجدے بھی انسانی قلب کی صفائی کا موجب نہ ہوں!

"مسکن جان ہست مکین تاریکی شد در دل تیرہ دل نشین تاریکی

دل صاف نشد بصد نماز م افسوس یک سجدہ ببرد از نگین تاریکی

اس خیال کو کہ حریص انسان دولت پانے سے اور زیادہ حریص ہوتا اور حرص کے چکر میں پڑجاتا ہے کس قدر قریب الفہم اور عمدہ مثال دے کر قوی کردیا گیا ہے ۔

ممسک پے مال چون گدا می گردد برزر، بہزار جان فدا می گردد

طامع، زحصول مال، طماع شود چون دانہ بیابد آسیا می گردد

وعظ سننے سے مقصد یہ ہے کہ غفلت اور جہل و نادانی دور ہو جائے لیکن جو انسان فطرۃً بدخصلت ہو اس پر اس کا اچھا اثر مترتب نہیں ہوتا بلکہ اس کی غفلت اور بڑھ جاتی ہے جس طرح کہ گہوارے کا ہلنا بچہ کے لئے نیند کا باعث ہوتا ہے ۔

نادان بہ شنا در تہ گرداب رود خودسر بے رہ چونیز پرتاب رود

بدخو از وعظ، بیش غفلت ورزد از جنبش مہد، طفل در خواب رود

بخیل کا وجود سوسائٹی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے اس کا مال نہ اس کی ذات کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ سوسائٹی کے کام آتا ہے ۔ انسان کے لئے یہ مصیبت بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کو مال و دولت سے بہرہ ور فرمائے لیکن بخل اس کو اس کے استفادہ سے محروم رکھے اس کی مثال اس سے بہتر نہیں ہوسکتی کہ سانپ خزانہ پر مسلط ہے ہونے کے باوجود اس سے استفادہ نہ کرسکے اور صرف خاک پر قناعت کرے ۔

ممسک، ہمہ خونِ دل صد چاک خورد یک لقمہ بصد نالۂ غمناک خورد

بدبخت، زکسب مال نفعے نہ برد افعی، بر گنج ماند و خاک خورد

وہ مذہبی پیشوا جنہوں نے محض دنیا طلبی کی خاطر قبا و عبا اختیار کررکھی ہے اور تسبیح کے ذریعہ سے اپنے تقدس کا سکہ عوام کے دلوں پر بٹھا کر اُلّو سیدھا کیا کرتے ہیں ان کا راز اس طرح فاش کیا گیا ہے ۔

سررشتۂ ننگ و نام در کف دارند این مقتدیان امام درکف دارند

منگر بہ لباس دلق پوشان کاینان از دانۂ سبحہ دام درکف دارند

فی زمانا ہندوستان اور خاص کر دکن میں قبر پرستی کا جس قدر زور ہے اور اکثر مسلمانوں نے اس میں احکام شریعت کے خلاف جیسا کچھ مسلک اختیار کر رکھا ہے ان کی اصلاح کی بیحد ضرورت ہے۔ حضرت امجد نے اس کی روک تھام کے لئے مثال میں نماز میت کو پیش کر کے بتایا ہے کہ اس نماز میں سجدہ اسی لئے ممنوع ہے کہ عوام اس کو قبر پرستی کا بہانہ نہ بنالیں۔

از جادۂ شرع پیش دستی نہ کنند　　در محفل دین پاک مستی نہ کنند
سجدہ بہ نماز میت آمد ممنوع　　تا مردہ دلان قبر پرستی نہ کنند

کمینہ اور سفلہ منش لوگوں کے عروج پاجانے سے شریف اور نیک نہاد لوگوں کو جیسی کچھ مشکلات پیش آتی ہیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ حضرت امجد نے روزمرہ پیش آنے والے واقعات میں سے ایک ایسے واقعہ کو مثال میں پیش کرتے ہوئے اس فتنہ سے بچنے کا مشورہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح گرد کے بلند ہونے پر اس سے بچنے کے لئے انسان کو آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اسی طرح کسی سفلہ کے صاحب جاہ ہونے پر اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا یا دور بھاگنا مناسب ہے۔

از دہر اگر دست دہد چشم بہ بند　　تا چشمت اجل بند کند چشم بہ بند
گر سفلہ رسد بجاہ۔ بگریز از و　　چون گرد بر آسمان رود چشم بہ بند

خادم قوم مخدوم اور بیکسوں کی ہمدردی کرنے والا کبھی نہ کبھی مراتب اعلیٰ پر فائز ہوتا ہے اس فلسفہ کو ذیل کی رباعی میں ایک عمدہ مثال کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے:۔

از خدمت خلق بندہ اعلیٰ گردد　　مستوجب فضل حق تعالیٰ گردد
ہمدردی بیکسان رساند بہ شرف　　آتش چو بہ خس گرفت بالا گردد

شبان عہد موسیٰ علیہ السلام کے ان دلی جذبات کو جو جناب باری میں عرض کئے گئے تھے اور جو مثنوی مولانا روم کے صفحات کی زینت ہیں جس اختصار کے ساتھ رباعی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جانان را بہ سر زلف تو بستن ہوس است　　دل را سر راہ تو شکستن ہوس است

سر بر قدمت نہادہ با عجز و نیاز   پائے تو ز آب دیدہ شستن ہوس ست

فارسی کی چند رباعیوں کو بطور نمونہ درج کرنے کے بعد اب ہم ....

---- اردو کی رباعیوں کا انتخاب پیش کرتے ہیں جو ہندوستانی قوم کی مشترکہ زبان ہے، عرض و طول ہند میں ہر جگہ بولی یا سمجھی جاتی ہے اور دیگر بلاد ایشیا و یورپ میں اس کے قدردان موجود ہیں۔

اردو زبان نے جب سے کہ جنم لیا ہے رباعی گو شعراء میں صرف دو ہی شاعر انیسؔ و دبیرؔ گزرے ہیں جنہوں نے شاعری کی اس اعلیٰ صنف کو اوجِ کمال پر پہنچایا۔ نصف صدی کے بعد اب اس کے مرد میدان صرف حضرت امجدؔ ہی ہیں جن کی سحر طرازیوں اور معجز نمائیوں کا اعتراف اس دورِ ترقی کے جملہ اکابر کرتے اور ہر مصرعہ پر سر دھنتے ہیں۔ ذیل کے انتخاب میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے بھی روحانی مسرتوں کا خوان بچھایا جاتا ہے:۔

جب انسان حصول مقصد کے لئے در بدر گردش اور غیر معمولی کوشش کر کے تھک جاتا اور ناکام رہتا ہے تو اپنے معاملات کو حوالۂ تقدیر کر کے صبر اختیار کر لیتا ہے۔ ذیل کی رباعی میں کس موثر انداز سے اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے:۔

ناحق پھر پھر کے سر پھرایا میں نے   اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے
طوفان میں ہے کشتی امید مری   لے تو ہی سنبھال ہاتھ اُٹھایا میں نے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم معجزات میں دیگر معجزات کے علاوہ حضور کی ذات اقدس کا بے سایہ ہونا، چاند کا ٹکڑے ہونا اور معراج کا ہونا بھی داخل ہے لیکن حضور اقدس کے علو مرتبت کے مقابل ان حیرت خیز امور کو معمولی باتیں قرار دے کر فرماتے ہیں:۔

حیرت نہیں، بے سایہ اگر ذات ہوئی   ٹکڑے کیا چاند کیا کرامات ہوئی
دن رات تھا جلوۂ خدا پیش نظر   معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی

اکثر انسانوں کی دعائیں جو تقویٰ اور طہارت کے باوجود بیکار جاتی اور کوئی اثر

نہیں دکھاتی ہیں حضرت امجد کے خیال میں اس کی بڑی وجہ اکل حلال کا فقدان ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی مریض دوا تو کھائے لیکن بد پرہیزی کرکے امید صحت رکھے اس قسم کے انسانی اعمال کا ذیل کی رباعی آئینہ ہے :۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

وحدۃ الوجود تصوف میں ایک معرکتہ الآراء مسئلہ ہے اور اس پر بڑی بڑی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت امجد نے اس مسئلہ کو جس آسان اور دل نشیں پیرایہ میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے انہیں کا حصہ ہے ملاحظہ ہو :۔

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے وحدت میں دوئی کا وہم، نادانی ہے
دھوکہ ہے نظر کا۔ ورنہ ہر شئے ہمہ اوست گرداب، حباب، موج سب پانی ہے

انسان کے لئے یہ بڑی بات ہے کہ وہ متمول ہونے یا جاہ و مرتبت حاصل کرنے کے بعد اپنے ہم جنسوں کے ساتھ انکسار و شرافت سے پیش آئے اور اس عارضی کامیابی پر فراعنہ کی روش اختیار نہ کرے لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ بخت و اتفاق سے جب کوئی کم مایہ شخص دولتمند یا صاحب جاہ ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اکڑنا شروع کرتا اور اپنے ہم جنسوں کے لئے مصیبت ہو جاتا ہے۔ ذیل کی رباعی ایسے ہی لوگوں پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے :۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذراسی بات میں فخر خسیس تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

انسان اور اس کی کائنات یہ ہے کہ وہ دنیا میں ننگا آنا۔ راحت یا تکلیف سے زندگی کے دن گزارتا اور مرنے پر صرف چند گز کفن میں لپٹا ہوا آخری منزل کی راہ لیتا ہے۔ حضرت امجد نے ذیل کی رباعی میں دنیا کو بازار فنا قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں انسان صرف کفن لینے کے لئے آیا ہے :۔

بحر متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دم طرف لحد کھنچا جاتا ہوں
بازار فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے میں صرف کفن لیکے چلا جاتا ہوں

انسان کا مآل زندگی یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا جینا اور مرنا دونوں خدا کے لئے ہو اور اس کا کوئی قدم حق کے خلاف نہ اٹھے ۔ اللہ اکبر ذیل کی رباعی کتنے بڑے مضمون کی حامل ہے :-

غم میں ترے زندگی بسر کرتا ہوں
زندہ ہوں، مگر تیرے لئے مرتا ہوں
تیری ہی طرف ہر اک قدم اٹھتا ہے
ہر سانس کے ساتھ تیرا دم بھرتا ہوں

وحملہا الانسان انہٗ کان ظلوماً جہولا کی تفسیر جس نرالے انداز میں ذیل کی رباعی میں کی گئی ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے ۔ پڑھیئے اور روحانی لذت حاصل کیجئے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی،
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

ذیل کی رباعی میں مسئلہ وحدۃ الوجود اور لاموجودُ الا اللہ کو جس مستانہ انداز اور دل کش پیرایہ میں حضرت امجد نے بیان فرمایا ہے حق یہ ہے کہ انہیں کا حصہ تھا اور انہیں جیسے بزرگ کے لئے جائز بھی ہے ۔ مضمون کے علاوہ زور بیان کا یہ حال ہے کہ پڑھنے والا بیخود ہو جاتا ہے :-

ہیں مست مے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعی نمود، تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود، تو بھی میں بھی

وجود باری تعالیٰ کے ثبوت میں ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو :-

خالق ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے
اَنْتَ کے لئے اپنا اَنا شاہد ہے
اس پر بھی اگر کوئی نہ مانے نہ سہی
خود، اپنے وجود پر، خدا شاہد ہے

افراد قوم میں بحالت موجودہ جو دنائت اور فرومایگی پائی جاتی ہے اور اپنی خود داری کے خلاف محض چند ٹکے سیدھے کرنے کی خاطر جیسے ناقابل بیان طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان سے احتراز کرنے اور صرف اسی ذات واحد کی طرف رجوع ہونے اور اس سے لو لگانے کے لئے جو ارض و سما کا مالک ہے ذیل میں کیسا اچھا سبق دیا گیا ہے :-

ہر چیز مسبّب سبب سے مانگو
منّت سے خوشامد سے ادب سے مانگو

کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

نفی و اثبات میں ذیل کی رباعی سے بہتر اردو میں کوئی رباعی دیکھی نہیں گئی؛

اس پھول کا رنگ اُڑ کے بو رہ جائے سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات میں اتنا مٹوں کہ صرف تو رہ جائے

ذیل کی صدا کیسی درد بھرے دل سے کیسے مستانہ انداز میں نکلی ہے کہ پڑھنے والے پر بیخودی طاری ہو جاتی ہے :-

جھولی بندہ کی بندہ پرور بھر دے کشکول میں مقصود کے گوہر بھر دے
صدقہ تیرے میخانے کے میخواروں کا اے ساقی کوثر مرا ساغر بھر دے

حضرت انسان کی کوتہ بینی ذیل کے دل کش الفاظ میں کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے :-

یاں جو آتا ہے بے ہنر آتا ہے ہر فرد بشر بہرہ بشر آتا ہے
میری آنکھوں کی تنگ چشمی دیکھو صورت میں فقط خال نظر آتا ہے

ہر ایسے درد میں راحت مل سکتی ہے جس کے زخم میں رخ مقصود کی جھلک دکھائی دے مصائب زندگی کو آسان بنانے کے لئے یہ کیا خوب فلسفہ ہے۔ ذیل کی رباعی اس درد راحت کا آئینہ ہے :-

غم میں، رخ مقصود نظر آتا ہے جلتی ہوی شاخ میں ثمر آتا ہے
ہے زخم جگر میں تیری ہنستی صورت ہر چوٹ کے ساتھ تو اُبھر آتا ہے

ایسا شکستہ دل کس قدر قابل رشک ہے جس میں عرش نشین کی منزل ہو۔ اس جام میں بقول حضرت امجد یہ عجیب بات ہے کہ وہ ٹوٹ کر بھرتا ہے۔

ٹوٹا ہوا دل یاد خدا کرتا ہے عاشق ہی ادائے ناز پر مرتا ہے
رہتا ہے دل شکستہ میں عرش نشیں یہ جام عجب ہے ٹوٹ کر بھرتا ہے

خاموش مقابلہ میں ظالم ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور مظلوم کامیاب۔ ایسی شکست کا نتیجہ ہمیشہ فتح و ظفر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام مظلوم قوموں کی داستانیں

ایسی ہی فتح و شکست سے بھری پڑی ہیں۔ اس خاموش مقابلہ کا سماں ذیل کی رباعی میں دیکھیے:۔

جی اس کا بھی بھر آیا رُلا کر مجھ کو ٹھنڈا نہ رہا خود بھی، جلا کر مجھ کو
خود مل گیا، خاک میں ملا کر آخر کیا فتح ہوئی شکست پا کر مجھ کو

دل کی حرکت کا لطف ذیل کی رباعی میں اُٹھائیے:۔

تن کی رگ رگ سے جو ئے خوں جاری ہے اک عالمِ کرب روح پر طاری ہے
ہر وقت کھٹک دل کی چلی جاتی ہے اللہ، اللہ، اس کو بیماری ہے

کنتُ کنزاً مخفیاً کی لوٹ کے لئے شاعر نے ان الفاظ میں صلائے عام دی ہے:۔

وہ پردہ سے حسن جاودانہ نکلا دل ہاتھ میں لیکے اک زمانہ نکلا
اے جوہریانِ عشق لوٹو، لوٹو برسوں کا دبا ہوا خزانہ نکلا

ذیل کی رباعی میں عقدِ محبت کی کشش کو دیکھئے کن الفاظ میں اس کی بندش ہوئی ہے:۔

بجتا ہے شکستہ ہو کے ارگن میرا شاداب خزاں میں بھی ہے گلشن میرا
کھنچتا ترا اور کھینچتا ہے مجھ کو دامن سے ترے بندھا ہے دامن میرا

خودنمائی کی مسابقت کا فوٹو اس رباعی میں کس عمدگی سے کھنچا ہے:۔

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہار کمال میں ہر اک کامل ہے سب کی ہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

ذیل کی رباعی مقصدِ زیست پر موزوں کی گئی ہے:۔

ہر وقت ہے لب پہ گفتگوئے مقصود لیکن نظر آتا نہیں روئے مقصود
کیا تم کو بتاؤں زندگی کا مقصد ہے مقصد زیست، جستجوئے مقصود

انسان کی بقا صرف سانس کے آنے جانے پر ہے لیکن اس کو اس کا بھی علم نہیں کہ جو سانس جا رہی ہے وہ واپس آئے گی بھی یا نہیں:۔

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

ہر شئے کی لم دریافت کرنا اور بات بات میں چوں و چرا سے کام لینا انسان کی فطرت میں داخل ہے حالانکہ بقول حضرت امجد اس کو ہمیشہ منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ ایسے ہی قماش کے لوگوں پر یہ رباعی صادق آتی ہے :۔

کھیتی مرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منھ کی لیکن پھر بھی یہ کیا، وہ کیوں سے عقل تھکتی ہی نہیں

ذیل کی رباعی میں اسلام کے حسن معنی کو ظاہر کیا گیا ہے :۔

بندہ ہے تو بندگی پہ قایم ہوجا مخدوم نہ بن کسی کا خادم ہوجا
مومن ہے تو ڈھونڈھ لے کوئی امن کی جا مسلم ہے تو سر جھکا کے نادم ہوجا

اس مادہ پرستی کے دور میں جب کہ بندے خدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں حضرت امجد نے ذیل کی رباعی میں اس حالت کے دور ہونے اور اپنے دوستوں کے لئے خالق سے لو لگانے کی کیسی مخلصانہ دعا فرمائی ہے :۔

تو تجھ سے لگائے میرا ملنے والا عالم کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا! مرے ہر دوست کو اپنا کرلے تجھ سے ملجائے میرا ملنے والا

"معلومات امجد" کے تحت بیس رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ چند قابل ملاحظہ ہیں:۔

تعریف شب فراق معلوم نہیں کیفیت اشتیاق معلوم نہیں
کس طرح پسند عام ہو میرا کلام ہر ایک کا مجھے مذاق معلوم نہیں

دونوں موجود کوئی معدوم نہیں دونوں ہیں یقینی کوئی موہوم نہیں
ہے ایک وجود باوجود من و تو تو مجھ میں ہے؟ میں تجھ میں ہوں معلوم نہیں

کس متن کی تفسیر ہوں معلوم نہیں کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں
میں ہوں کہ مرے پردے میں ہے اور کوئی صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

عالم کا حساب کیا ہے معلوم نہیں
اس فن کا نصاب کیا ہے معلوم نہیں
کہتی ہے ہمیشہ عقل یہ کیوں وہ کیوں
اس کیوں کا جواب کیا ہے معلوم نہیں

میں کس لئے مسرور ہوں معلوم نہیں
کس بات پہ مغرور ہوں معلوم نہیں
بندہ ہوں تو مجھ میں کبریائی کیوں ہے
کس نشہ میں مخمور ہوں معلوم نہیں

مختلف اصنافِ سخن

حضرت امجد اگرچہ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے طول و عرض ہند میں مشہور ہیں لیکن ان کی نظمیں، قطعات، مخمس، مسدس، اور ترجیع بند بھی کچھ کم قابلِ تحسین اور لایقِ داد نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا اقتباس کیا جاتا ہے ذیل کی نظم ہند و دکن کی مجالسِ سماع میں الاپی اور گلی کوچوں میں گائی جاتی ہے:-

(۱)

کس بات کی کمی ہے مولا تری گلی میں
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جامِ سفال اُس کا تاجِ شہنشہی ہو
آجائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے
تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
اک آفتابِ وحدت ہے جلوہ بخشِ کثرت
نکلی ہوئی ہیں گلیاں صدہا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں
بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
سورج تجلیوں کا ہر دم چمک رہا ہے
دیکھا نہیں کسی دن سایہ تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لئے ہیں
مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں

امجد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اس کا پایا تری گلی میں

---

(۲)

سوز مٹا دیا گیا میرے شکستہ ساز سے
نغمہ کی آتی ہے صدا نالہ دل گداز سے

اب تو مری نظر میں ہے حسن ہی حسن ہر طرف
خلعتِ عشق مل گیا بارگہِ حجاز سے

حاصلِ عمر مل گیا قلبِ فسردہ کھل گیا
پڑ گئی زندگی میں جاں ان کی نگاہِ ناز سے

برسوں کے بچھڑے مل گئے داغ دلوں کے دھل گئے
لپٹی ہے ان کی خاکِ پا میرے سرِ نیاز سے

بیٹھے تھے اک زمانہ سے نورِ قدم کے منتظر
نکلے ہیں سجدے سینکڑوں اب تو سرِ نیاز سے

صلّ کا نکتہ راہ ہو گیا قابلِ عمل
رفعِ یدین کر سکے، کون اب اس نماز سے

دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رخِ حسین اس درِ نیم باز سے

حالتِ وجد و ذوق میں دل سے یہ کہہ رہا ہے درد
ہم نے ملا دیا تجھے لے ترے چارہ ساز سے

امجدِ نیم جاں کی جاں، جانِ جہاں کو پا گئی
بربطِ روح بھر گیا نغمۂ دل نواز سے

---

(۳) طالب و مطلوب

مثل و مثال سے بری حدِ مثال میں بھی آ
جاہ و جلال کے خدا شانِ جمال میں بھی آ

خسروِ بارگاہِ ناز لطفِ نیاز بھی تو دیکھ
اے مرے شاہبازِ حسن عشق کے جال میں بھی آ

قسمتِ بد کو نیک کر ظاہر و باطن ایک کر
تو مرے قال میں بھی آ تو مرے حال میں بھی آ

تو ہے جہاں میں ہر جگہ پھر بھی نہیں کسی جگہ
نورِ زمین و آسمان چشمِ خیال میں بھی آ

مردہ دلی نکال دے۔ جان میں جان ڈال دے
چشمۂ آبِ زندگی جامِ سفال میں بھی آ

جواب

صبحِ سرور کے حریص شامِ ملال میں بھی آ
طالبِ ملکِ سروری شانِ سوال میں بھی آ

ذوقِ شنید تا کجا دید کا لطف بھی تو دیکھ
لذتِ قال ترک کر عالمِ حال میں بھی آ

نقدِ شکستگی یہاں لعل و گہر سے ہے گراں
بامِ کمال سے اتر حدِ زوال میں بھی آ

رشتۂ عبدیت نہ توڑ شیوۂ عاجزی نہ چھوڑ
بو لہبی بہت ہوئی رنگِ بلالؓ میں بھی آ

جامۂ کبر چاک کر، خود کو خودی سے پاک کر
امجدا منزلتِ طلب صفِ نعال میں بھی آ

---

(۴)

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا — کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا — مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر — کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں — دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں، نہیں اپنے — جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اُس کے اے امجدؔ
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

دنیائے شاعری میں بعض اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جو بیت الغزل ہی نہیں بلکہ دیوان کا جواب کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں چنانچہ غنی کشمیری کے اس شعر کے متعلق :-

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

میرزا صائب کہا کرتے تھے کہ میرے تمام اشعار کے معاوضہ میں اس ایک شعر کو دیدیا جائے تو میں بطیب خاطر منظور کرلوں گا۔ اسی طرح مومن کے اس شعر کی نسبت :-

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب فرمایا کرتے تھے کہ ایک دیوان کا جواب ہے۔
محفل احباب میں کسی نے جناب ذوقؔ کا یہ شعر پڑھا :-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرزا غالب نے پوچھا کس کا شعر ہے۔ کہا ذوق کا، مکرر پڑھوایا اور دیر تک سر دُھنتے رہے۔

غفران مکان حضرت آصف نے اس مضمون کو کہ جنت میں جاکر بھی جی نہ بہلے تو پھر کیا ہوگا؟ کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔ اس میں لطف یہ ہے کہ ایک فرماں روا کی شانِ تمکین کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

پھر کہاں جائیں گے الٰہی ہم خلد میں بھی اگر بسر نہ ہوئی

اسی طرح حضرت امجد کی مندرجۂ بالا غزلوں سے بھی حضرت امجد کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اصلی رنگ کے ساتھ خوبیٔ بندش، بلندیٔ مضمون اور کمالِ شاعری کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ ان میں کے بھی بعض اشعار ایسے ہیں کہ ایک دیوان کا جواب ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ شعر:۔

جو نظر آتے ہیں، نہیں اپنے جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

اور یہ شعر بھی:۔

دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں

حضرت بیان ویزدانی میرٹھی مرحوم کی مشہور نعتیہ غزل پر ذیل کی تضمین جو افکار نوجوانی کا نتیجہ ہے کس قدر جذبات سے لبریز ہے:۔

راحت دل دلِ بیتاب میں جالے آجا بخت خفتہ کو بھی اک بار جگالے آجا
اے مرے چاند مرے گھر کے اُجالے آجا خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹالے آجا
بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

شدت درد سے اب لب پہ ہیں نالے آجا دیکھ تو زخم جگر ہو گئے آلے آجا
داغ فرقت سے پڑے جان کے لالے آجا بیکسی پر مری خون روتے ہیں چھالے آجا
راہ میں چھوڑ گئے قافلے والے آجا

رحمت عالمیاں کون ہوا تیرے سوا کس کی تعریف میں ہے آیۂ لولاک لما
چاند دو ٹکڑے بھلا کس کے اشارے سے ہوا کون ہے ماہ عرب، کون ہے محبوب خدا
اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

طاقت و ہوش تب غم نے اڑا رکھا ہے عقل کو طاق پہ نسیاں کے اٹھا رکھا ہے

بس سوا سانس کے اب جسم میں کیا رکھا ہے دم تری دید کو آنکھوں میں لگا رکھا ہے
لے رہے ہیں ترے بیمار سنبھالے آجا

نوک کی لے رہے ہیں خارِ مغیلانِ صرا پاؤں کٹ کٹ کے ہوئے جاتے ہیں قربانِ صرا
دو قدم طے نہیں ہو سکتا ہے میدانِ صرا دیکھتے ہیں تجھے پھر پھر کے ضعیفانِ صرا
ڈگمگاتے ہیں قدم کون سنبھالے آجا

تیری کیا بات ہے کیا شان ہے اللہ غنی تو ازل سے ہوا گنجور رموزِ احدی
گنج اسرار کی ہے ہاتھ میں تیرے کنجی وقف ہے تیرے لئے دولتِ کنزِ مخفی
کھل گئے ہفت سماوات کے تالے آجا

گھر سے وہ ماہِ عرب جب شبِ معراج چلا راہ میں آنکھیں بچھائے تھے فرشتے ہر جا
کر کے سب منزلیں طے جب بمقامِ ادنیٰ پہنچا محبوب، تو مشاطۂ رحمت نے کہا
خلوتِ راز میں اے ناز کے پالے آجا

تری تسلیم کو خم گردنِ افلاک ہوئی فخر کے ساتھ زمیں نے تری پابوسی کی
ہاتھ میں تیرے دو عالم کی حکومت دیدی ہم نے خوش ہو کے تجھے ساری خدائی بخشی
اپنے بندوں کو کیا تیرے حوالے آجا

اس بیاباں میں نہیں خارِ من و تو کا نشاں کفر سے کوئی غرض ہے نہ خیالِ ایماں
یاں نہ کثرت کی جگہ ہے، نہ دوئی کا امکاں رنگ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں
اے گلِ گلشنِ لولاک لما، لے آجا

دھیان میں میرے گناہوں کو اگر لاتے ہیں کاتب نامۂ اعمال بھی شرماتے ہیں
کیا کفن خاک احبا مجھے پہناتے ہیں ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں
کملی والے! مجھے کملی میں چھپا لے آجا

دیکھیں کب تک ابھی قسمت میں ہے آنسو پینا اے مسیحا نفس اب ہو گیا مشکل جینا
ٹکڑے ٹکڑے دلِ امجد ہے بر رنگِ مینا صورتِ لالہ ہے پُر داغ بیاں کا سینا
پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا

چند بند مسدس کے بھی ملاحظہ ہوں اس میں غیر قانع انسانوں کی تنبیہ کے لئے کیسے اعلیٰ اور حکیمانہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں:۔

مبتلائے حرصِ بیجا آج خاص و عام ہے   فکر جمع مال و زر کمبخت صبح و شام ہے
مفت بیچاری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے   ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

اپنے ہاتھوں آپ اے نادان ذلیل و خوار ہے   کچھ بھی غیرت ہے تجھے ناداں ذرا بھی عار ہے
جس قدر ہے، وہ بھی جان ناتواں پر بار ہے   اے ہوس پیشہ تجھے اب اور کیا درکار ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

لیمپ برقی چاہیئے نازوں کے پالے کیلئے   بیکسوں کو چاندنی بس ہے اجالے کے لئے
کملی والو! مر رہے ہو کیوں دوشالے کے لئے   ہے جو کچھ وہ بھی بہت ہے مرنے والے کیلئے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

اے حریص مال و زر اے صاحب صد گونہ زور   تنگ چشمت را قناعت پر کند یا خاک گور
تا کجا حرص و ہوا ئے مالک اسپ و ستور   دانہ دانہ می کنی انبار تا کے مثل مور
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

ذیل کے قطعہ میں کیسا اچھوتا خیال ظاہر کیا گیا ہے:۔

مطلق ہوا مقید واجب ہوا ہے ممکن   میں لامکان والا قید اس مکان میں ہوں
زندہ نہ سمجھو مجھ کو دنیا کے رہنے والو   تن کا کفن پہن کر دفن اس جہان میں ہوں

ذرا مثنوی کا بھی رنگ ملاحظہ ہو۔ ذیل کی نظم "فریاد مجنوں" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے

جیسا عنوان ہے ویسے ہی پردرد اشعار ہیں :۔

عرض کی مجنون نے حق سے ایک رات
اے مرے مالک خدائے شش جہات

اپنی نظروں سے گرایا کیوں مجھے
عاشق لیلیٰ بنایا کیوں مجھے

سوز غم نے دل مرا خوں کر دیا
قیس کو الفت نے مجنون کردیا

کوئے جاناں عرش ہے میرے لئے
خار صحرا فرش ہے میرے لئے

جامۂ دل شرک سے میلا ہوا
تیرا بندہ ، بندۂ لیلیٰ ہوا

مل گئیں سب آرزوئیں خاک میں
رہ گئی الفت دل صدچاک میں

اے مرے فریاد رس پروردگار
رحم کے قابل ہے میرا حال زار

اشک خون کب تک بہاؤں آہ آہ
خاک میں کب تک اڑاؤں آہ آہ

تجھ کو بھاتی ہے پریشانی مری
ہے تجھے منظور حیرانی مری

زندگانی کیوں مری برباد کی
داد بھی کچھ ہے مری فریاد کی؟

ناگہاں اک غیب سے آئی ندا
میرے مجنوں بس نہ کر اتنا گلا

تو سراپا کشتۂ بیداد ہے
رحم کے قابل تری فریاد ہے

وصل لیلیٰ سے تجھے گر یاس ہے
غم نہ کر رب تیرا تیرے پاس ہے

رہتے ہیں ہر وقت ہم تیرے قریں
سنتے ہیں ہم تیری آواز حزیں

سوز تیرا ایک دل کش ساز ہے
درد کی آواز میں انداز ہے

ہے اثر تیرے دل ناشاد میں
لطف ملتا ہے تری فریاد میں

خوش نماید نالۂ شبہائے تو
ذوقہا دارم بہ یارب ہائے تو

مولوی عظمت اللہ خان مرحوم سے حضرت امجد کے مخلصانہ تعلقات تھے۔
ان کی جواں مرگی پر (۱۶) بند کا ایک پردرد مستزاد کہا ہے۔ چند بند ملاحظہ طلب ہیں۔

تقدیر نے دکھلایا عجب واقعہ جانکاہ
العظمت للہ

بجلی سی گری خرمن امید پہ ناگاہ
العظمت للہ

رخصت ہوا دنیا سے عجب دوست ہمارا | تھا آنکھ کا تارا
ہر دوست کا دل شدت غم سے ہوا پارا | العظمت للہ
وہ جس کو کبھی چیں بہ جبیں ہم نے نہ دیکھا | اخلاق کا پتلا
کیا آن تھی، کیا شان تھی، کیا صورت زیبا | العظمت للہ
رو دھو کے تجھے کر دیا مولا کے حوالے | اے خوبیوں والے
اللہ تجھے کیوں قرب میں اپنے نہ بلا لے | العظمت للہ

مرحومہ جمال النسا سلمٰی کے انتقال کے بعد جب میں حضرت امجد کے مکان پر گیا جو محلہ میں دو چمن کے نام سے مشہور ہے تو منزل گاہ سلمٰی میں یہ شعر جلی قلم سے لکھا ہوا دیکھا جس کے لفظ لفظ سے حقیقی واقعات آورد ی صدمات کا اظہار ہوتا ہے۔

وہ گھر جو کل تک تھا چمن اب کوئی دیکھے قبر ہے پہلے محل شکر تھا اور اب مقام صبر ہے

نثر کا نمونہ

شعراء میں عموماً یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ نظم میں غیر معمولی انہماک کی وجہ سے فن انشا و ادب میں وہ ترقی نہیں کر سکتے لیکن حضرت امجد اپنے ذہن خدا داد سے اس میں بھی بازی لے گئے ان کی نثر میں خاص قسم کی فصاحت و بلاغت ہے۔ ان کی مختلف تصانیف سے بطور نمونہ چند سطریں پیش کی جاتی ہیں:-

شعر ہو یا راگ جب تک سامع کو بیخود نہ کر دے، بارد فطرت میں حرارت نہ پیدا کر دے، قدیم کافر کو مسلمان نہ بنا دے، کثیف مادے میں لطیف روح نہ پھونک دے، فنون لطیفہ میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتا ہے جس طرح تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطع نظر تناسب اور توازن بھی ضروری اور لازمی ہے اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کر دی جائے تو تعداد اجزا کے اعتبار سے تصویر مکمل تو ہو گی مگر مضحکہ خیز۔ اسی طرح موزوں نظم بھی اپنی بدنظمی اور غیر مناسب

اور ثقیل الفاظ اور دور از فہم استعارات و تلمیحات کی وجہ سے "شعر گفتن چہ ضرور بود" کا مصداق ہوجاتی ہے۔ ....

....

مست کی نشان یہ ہے کہ سرود ستار سے بے خبر رہے۔ جس قدر سرود ستار کی طرف توجہ ہوگی اس کے کمال مستی میں اسی قدر فرق آجائے گا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک شاعر بشرطیکہ وہ شاعر ہو اظہار جذبات میں مجذوب صفت ہوجاتا ہے اس میں ایک خاص جوہر ہوتا ہے جس کو وہ خود بھی نہیں سمجھتا کیونکہ ان کی معانی کی مبیّن کوئی اور ہی قوت ہوتی ہے جو اسے ایسا کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کوئی قرشتہ ہوتا ہے جو اپنی کیفیت کو ایک انوکھے راگ میں گاتا ہے اور اپنے دُکھ درد کو ایک مبہم زبان میں ادا کرتا ہے ....

....

صورت گر پتھر تراش کر بت نہیں بناتا بلکہ بت اس میں پہلے سے موجود ہوتا ہے مجسمہ ساز پتھر کی عارضی چادر کو اس کے چہرہ سے اٹھا دیتا ہے اسی طرح خرقۂ امجد میں بھی کوئی فلک اطلس کا پیوند نہیں ہے علی العموم وہی پھٹے پرانے، بوسیدہ، گرے پڑے ٹکڑے ہیں جن کو جوڑ جوڑ کر میں نے گدڑی بنالی ہے ایمان کی سرد مہری کے وقت کبھی اوڑھ لیتا ہوں کبھی بچھا لیتا ہوں اور اپنے سچے دوستوں کو بھی اس میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں کہ "وہ درویش در گلیمے بخسپند، محبت اور صداقت کا ایک سوکھا ٹکڑا ابھی تکلف کے الوان نعمت سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے اور مصنوعی اظہار محبت کی بہ نسبت ایک خاموش مایوس نگاہ بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔"

(ماخوذ از مقدمہ خرقہ امجد)

سگان طیبہ "کُتّے" ہر شہر میں ہوتے ہیں اور یہاں بھی ہیں مگر کیسے کتے کہ بر شیران شرف دارند، اسی وجہ سے، جامی، خسرو، حافظ، جیسے باکمال انسان بھی، سگ مدینہ ہونے کی آرزو کرتے رہے، جب کبھی یہاں کے کتوں کو دیکھتا حافظ کا یہ شعر ضرور یاد آتا۔

شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ می بخشی   چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رسنے

یوں تو اس مضمون میں بہت شعر سنے ہیں، مگر حافظ کے اس شعر سے دل پر جو اثر ہوتا تھا اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی کتے بھی عجب صفت کے ہیں، تمام دن سڑکوں پر ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ کوئی اُن پر قدم ہی کیوں نہ رکھ دے، کاٹنے کا تو کیا ذکر آنکھ تک کھول کر نہیں دیکھتے۔ جہاں رات ہوئی سب شب بیدار کیا مجال کہ صبح ہونے تک ذرا بھی پلک جھپک جائے۔ نہیں معلوم ہوتا کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں، کسی کے گھر جاتے نہیں، کوئی کھلاتا نہیں، ہمیشہ فرش خاک پر، سڑکوں پر، راستوں پر اطمینان قلبی کے ساتھ مستو کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ ہزاروں اجنبی روز آتے ہیں، مگر کوئی کتا کسی کو بھونکتا نہیں۔ کسی لباس میں آئیں، کسی رنگ میں آئیں مگر وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ عاشق مدینہ آیا ہے کوئی غیر نہیں ہے۔

اپنے مولا کے در کا دربان تو ہو کچھ بھی نہ سہی، سگ صفت انسان تو ہو
ہر رنگ میں پہچانتا ہے مالک کو امجد! بندے میں اتنا عرفان تو ہو

. . . .

ہم نے بھی چاہا تھا کہ کتا بن کر یہیں کسی کے گھر پڑ رہیں، مگر جواب ایسا ملا کہ کتا بننے کی ہمت نہ ہوئی:-

میں نے کہا مجھ کو رکھ لے ایجان گھر میں مل جائے گا اک تابع فرماں گھر میں
کتا ہی سمجھ لے اپنے گھر کا، تو کہا کتا رکھتے نہیں مسلماں گھر میں"

(حج امجد)

طائران حرم | حرم کعبہ میں نہیں معلوم کتنے ہزار کبوتر ہیں اور کب سے ہیں حرم میں پانی کا ایک قطرہ نصیب نہیں، ہوتا غلہ کا ایک دانہ نہیں ملتا۔ مگر اطمینان سے ہر وقت صحن حرم میں کبک دری کی چال سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کبوتر ہزاروں مہجوروں اور مشتاقوں کے بھیجے ہوئے قاصد ہیں، جواب لیکر واپس جانے کی جگہ، اطمینان اور سکینت بخش جگہ دیکھ کر یہیں کے ہو رہے ہیں۔
اتنے کثیر تعداد میں کبوتر ہیں کہ جب ایک ساتھ مل کر اڑتے ہیں۔ دھوپ میں نماز

پڑھنے والے نمازیوں پر تھوڑی دیر کے لیے سایہ ہوجاتا ہے۔ عید الفطر کی نماز میں تو یہ حالت تھی کہ ہزاروں نمازی جگہ کی تنگی کی وجہ سے دھوپ میں نماز پڑھ رہے تھے، طائران حرم آہستہ آہستہ چکر لگاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نمازیوں پر اپنے پروں کا سایہ ڈالتے جاتے تھے۔

ان کبوتروں کا یہ قصہ بھی عجیب ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں رات دن حرم ہی میں رہا کرتے ہیں مگر ان کی بیٹ کہیں نظر نہیں آتی۔ تمام حرم ہمیشہ پاک صاف رہتا ہے۔

باب الکعبہ کے پردے پر جو نصف پردہ لپٹا ہوا رہتا ہے ہمیشہ دو کبوتر ضرور رہا کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ فرشتے ہیں، شاید یوں ہی ہو۔ حج کے زمانے میں مکے والوں کے ساتھ ان کی بھی عید ہوتی ہے حجاج کثرت سے دانہ ڈالا کرتے ہیں دانہ دیکھ کر سارے حرم کے کبوتر سمٹ کر ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں دانہ ڈالنے والے کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ کچھ سروں پر منڈلاتے ہیں کچھ پاؤں میں لپٹتے ہیں کچھ بائیں طرف سے حملہ کرتے ہیں کچھ داہنی طرف سے آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر میں جھولی چھین لیں گے۔

اگرچہ سب جنگلی کبوتر ہیں مگر وحشت کا نام نہیں سمجھتے ہیں کہ حرم کعبہ میں کوئی ہم کو ستائیگا نہیں من دخلہ کان امنا پر پورا یقین ہے ہماری طرح نہیں کہ ذراسی گھبراہٹ میں حرم سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ؎

اس دل میں ذرا یقین کی شان نہیں — کہنے کو تو زندہ ہیں مگر جان نہیں
ہے اور نہیں، کے درمیان ہے دن رات — جگنو کی چمک ہے، مرا ایمان نہیں"

(حج امجد)

نظم و نثر کا جو اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اُس کو وہ مشتے نمونہ از خروارے، سمجھنا چاہیئے ورنہ تفصیل کی صورت میں ایک ضخیم کتاب مدون ہوسکتی ہے۔

ان مختصر حالات سے آئندہ نسلیں یہ سبق حاصل کرسکتی ہیں کہ ایک یتیم و بیکس لڑکا جس کے سر سے باپ کا سایہ دنیا میں آنے کے کچھ دنوں بعد ہی اُٹھ گیا ہو اور جس کی تعلیم و تربیت کا انتظام بظاہر بالکل ہی معمولی ہو محض اپنی خداداد قابلیت اور ذاتی سعی و کوشش سے دنیا میں کس طرح ایک نامور انسان اور قوم کا مایۂ ناز فرزند ہوسکتا ہے۔

طفلی

از

جناب سیّد علی اختر صاحب اختؔر

رواں ہے کنج میں پھولوں کے چشمۂ شیریں
تبسم لبِ گلشن، رباب موج صبا
نشاط روح کا اک دل نشین پیام لئے
کسی کے خندۂ نازک کی شہد بار صدا
بہشتِ حسنِ سماعت، وہ نغمۂ بیدار
کہ نہ سے ساز کی اُٹھا دلوں میں ڈوب گیا
ہجومِ فکر میں، یک لمحہ فرصتِ آزاد
غمِ خمار میں، یک جرعہ، لرزشِ صہبا
عجیب چیز ہے اختؔر جمالِ طفلی بھی
ضیائے محفلِ ہستی خلاصۂ دنیا

بچارا قلی

از

جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

شام کا وقت تھا ، افریقہ کے ڈربن شہر میں دو آدمی ایک بڑی دکان کے سامنے برآمدہ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔ ایک ہندوستانی تھا ، رام لال ۔ دوسرا جو تھا جیکب ۔

رام لال کہہ رہا تھا ۔ جیکب کل سویرے ہندوستان کا جہاز جائے گا ۔

جیکب بولا ۔ ہاں جائے گا تو ، پھر ؟

"میں بھی جاؤں گا"

جیکب نے حیرت سے پوچھا ۔ کیسے جاؤ گے ؟ پاسپورٹ تو ہے نہیں ۔

"چوری سے جاؤں گا"

"اور جو پکڑے گئے ؟"

"پکڑے گئے تو دیکھا جائے گا"

"رام لال ، یہ کام ٹھیک نہیں ہے"

رام لال بولا ۔ جیکب میں اب یہاں نہیں رہ سکتا ۔ میں ہندوستان جاؤں گا ۔

"تم نہیں جاسکو گے رام لال !"

"یقینی جاؤں گا ۔ میں نہیں جاسکوں گا تو میری روح جائے گی"

جیکب استعجاب کی نظر سے رام لال کی طرف دیکھنے لگا ۔ رام لال جیکب کا ہاتھ پکڑ کر بولا جیکب تم میرے دوست ہو نا ؟ جیکب رام لال کا ہاتھ محبت سے دبا کر بولا ۔ بے شک !

"اس وقت میری کچھ مدد کرو گے ؟"

"کل کوئی ایسی ترکیب نکال سکتے ہو کہ صاحب دن بھر مجھے نہ پوچھیں ۔ اگر کل کا دن

نکل جائے، تو پھر میں ہندوستان پہنچ جاؤں گا،،

"وہ کل کیا، میں ایسی چال چل سکتا ہوں کہ صاحب تمھیں دو تین دن تک نہ پوچھیں، لیکن س سے کیا ہوگا؟ تم جا نہیں سکو گے۔ پکڑے جاؤ گے،،

"خیر وہ جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا، مگر میں کوشش ضرور کروں گا،،

"رام لال، تم غلطی کر رہے ہو،،

"اس طرح یہاں وطن کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مرنے سے وطن پہنچنے کی کوشش میں جان گنوانا کہیں طمانیت بخش ہوگا۔ تمھارا وطن گو یہاں ہے، پھر بھی تمھیں اس کی یاد کبھی کبھی کتنی بے چین کر دیتی ہے۔ جیکب!،،

جیکب جو لولینڈ میں رہنے کے باوجود اپنے وطن کو یاد کرتے ہوئے بولا۔ ٹھیک کہتے ہو رام لال! وطن کی یاد آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے،،

"اور پھر ایسی حالت میں جب کہ میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہو اور میری ماں میری یاد میں تڑپ رہی ہو،، اتنا کہتے ہوئے رام لال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جیکب رام لال کی بات سے متاثر ہو کر بولا۔ "اچھی بات ہے، کوشش کرو۔ رام لال! مجھ سے جو امداد چاہو وہ میں دینے کو تیار ہوں"

"بس، میں اتنی ہی مدد چاہتا ہوں جتنی میں کہہ چکا ہوں،،

(۲)

رات کے دس بجے کے قریب جیکب اپنے چھوٹے سے مکان میں رام لال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک میں سونے کے لئے جگہ تھی اور دوسرے میں کھانا کھانے، بیٹھنے اٹھنے کے لئے اس دوسرے کمرے کے بیچ میں ایک ٹوٹی میز اور اس کی چاروں طرف چار پانچ پرانی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر جیکب بیٹھا تھا۔ دوسری کرسی پر اس کی بیوی۔ اس کے سامنے میز کی دوسری طرف ایک اور جو لو بیٹھا تھا۔ اس شخص کی پوشاک ڈھیلی ڈھالی ایک عجیب قسم کی تھی۔ اس کے سر پہ ایک ٹوپی تھی جس میں پرندوں کے کچھ پر اور بیل کے دو لمبے سینگ لگے ہوئے تھے۔ جیکب بیچ بیچ میں دروازے کی طرف

دیکھتا تھا۔ تھوڑی دیر میں رام لال کمرے کے اندر آیا۔ جیکب اُسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولا۔ آگئے!
رام لال جیکب کے بغل میں کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا "ہاں۔ اپنے ہم وطنوں سے رخصت ہو کر آیا ہوں۔"

جیکب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "کھانا لاؤ!"

جیکب کی بیوی اٹھ کر کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ ادھر جیکب رام لال سے بولا "رام لال تمھارے کام کے لیئے میں نے اپنے اس دوست کو ٹھیک کیا ہے"

یہ کہ کر اس نے سامنے بیٹھے ہوئے جُولُو کی طرف اشارہ کیا۔ رام لال اس کی طرف دیکھ کر بولا "اچھی بات ہے۔"

جیکب نے کہا "یہ رکشا چلاتا ہے۔ بس سویرے یہ صاحب سے جا کر کہے گا۔ کہ رام لال بیمار ہو گیا ہے۔ آج نہیں آ سکے گا۔"

رام لال خوشنودی کا اظہار کر کے بولا "یہ ترکیب تم نے اچھی سوچی۔ اب میں بے فکر ہو گیا۔"

اُسی وقت جیکب کی بیوی نے چینی کی ایک رکابی لا کر تینوں آدمیوں کے سامنے رکھ دی، تینوں کھانا کھانے لگے۔

جیکب بولا "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تم خیر و عافیت سے اپنے وطن پہنچ جاؤ۔ گو مجھے شک ہے کہ تم نہ پہنچ سکو گے"

"جو کچھ بھی ہو۔ کوشش پوری کروں گا"

"آخر تم نے کیا انتظام کیا ہے؟"

رام لال بولا "میں رات میں جہاز پر جا کر چھپ رہوں گا۔ میرا ایک ہم وطن ہندوستان جا رہا ہے وہ مجھے چپکے سے کھانا پہنچاتا رہے گا۔ یہ جہاز کراچی جائے گا۔ وہاں بھی رات میں جہاز سے نکل کر کنارے پر پہنچ جاؤں گا۔ بس پھر کوئی کھٹکا نہیں۔"

"خدا تمھاری مدد کرے"

کھانا کھا چکنے کے بعد رام لال بولا "اچھا تو دوست جیکب اب مجھے اجازت دو۔ میں تمھارا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔"

جیکب نے رام لال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "احسان یاد رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن مجھے یاد ضرور رکھنا۔ بھول نہ جانا۔"

رام لال نے کہا۔ "جیکب تم میرے ساتھ وہ نیکی کر رہے ہو کہ میں تمہیں اگر بھولنا بھی چاہوں گا تو نہ بھول سکوں گا۔ اور تم مجھے نہ بھولو، اس کے لئے میں تمہیں یہ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر رام لال نے اپنی انگلی سے سونے کی انگشتری اوتار کر جیکب کے ہاتھ میں دیدی۔

رام لال آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "جیکب میں غریب آدمی ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں اس امداد کے عوض کوئی انعام دے رہا ہوں۔ میں تمہیں اپنی نشانی دیتا ہوں۔ اس سے تمہیں میری یاد آتی رہے گی۔" اتنا کہہ کر رام لال جیکب سے ہاتھ ملا کر جلدی سے مکان کے باہر ہو گیا۔ جیکب بت کی مانند کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔

(۳)

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسی وقت رام لال ڈیک پر پہنچا۔ اُس کے ہاتھ میں موم جامہ میں لپٹی ہوئی ایک گٹھڑی تھی۔ ڈیک پر مختلف چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ رام لال ہندوستان جانے والے جہاز کو دن میں دیکھ گیا تھا۔ رام لال اُس جہاز کے روبرو جا کر پہلے کچھ لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا۔ جہاز کے ڈیک پر اُس وقت سناٹا تھا۔ صرف کیبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ رام لال گٹھڑی کو پیٹھ سے باندھ کر چپ چاپ پانی میں اتر پڑا۔ بہت ہی آہستہ آہستہ تیر کر وہ جہاز کی دوسری طرف پہنچا۔ اُس طرف دو تین موٹے موٹے رسّے لٹک رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک کو پکڑ کر رام لال چڑھ گیا اور ڈیک پر پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر اُس نے پہلے گٹھڑی کھول کر خشک کپڑے نکالے اور پہن لئے۔ بھیگے کپڑے اس نے موم جامے میں لپیٹ کر پانی میں پھینک دیئے۔ اس کے بعد وہ چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنے لگا۔ ڈیک پر سٹرن (پچھلے حصہ) کی طرف بہت سے لکڑی کے بکس اور پیپے رکھے ہوئے تھے۔ رام لال نے اُن کو غور سے دیکھا۔ پہلے تو اس کا خیال ہوا کہ انہیں کے بیچ میں چھپ رہے مگر پھر اُس نے سوچا کہ دن میں وہ اس مقام پر بخوبی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ دبے پاؤں زینے سے نیچے اترنے لگا۔ کئی زینے اترنے کے بعد وہ جہاز کے دہولڈ، (اسباب رکھنے کا مقام)

میں پہنچا۔ ہولڈ میں بالکل اندھیرا تھا۔ رام لال نے اپنے کوٹ کی جیب سے موم بتی اور دیاسلائی نکال کر روشنی کی۔ ہولڈ میں لکڑی کے مختلف اقسام کے صندوقوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رام لال انہیں صندوقوں کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور موم بتی بجھا دی۔ رام لال پڑا سو رہا تھا۔ یکایک کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ہولڈ میں بجلی کی روشنی ہو رہی ہے اور کچھ قلی بکس اور ٹرنک وغیرہ لا کر رکھ رہے ہیں۔ رام لال سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اوجالا ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ قلیوں کی آمد و رفت دیکھتا رہا۔ وہ ان کا تماشا دیکھنے میں اتنا محو ہو گیا کہ یکایک اُسے ایک زور کی چھینک آ گئی۔ قلی بکس رکھ کر لوٹ رہے تھے۔ لیکن چھینک کی آواز سنتے ہی ٹھٹک گئے۔ ایک نے پوچھا۔ یہ کس نے چھینکا؟ سب نے چھینکنے سے انکار کیا۔ پہلا قلی بولا۔ تب تو یہاں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔ اس کی تلاش ہونی چاہیئے۔ جاؤ۔ ایک آدمی میٹ یا کپتان صاحب سے جا کر بولو۔ ہم سب یہیں کھڑے ہیں۔ ایک آدمی اوپر چلا گیا۔ باقی سب وہیں کھڑے رہے۔

ادھر رام لال کا لہو پانی ہو گیا۔ خوف کے مارے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ دم سادھ کر چپ چاپ دبک رہا۔ اپنے بچاؤ کے لیئے خدا سے التجائیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک یوروپین معمولی پوشاک میں نیچے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ (مشعل) تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔ کیا ہے؟

ایک قلی بولا۔ صاحب، یہاں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔

"ٹھیک بولتے ہو؟ تمھیں شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں صاحب، شک نہیں ہوا۔ آدمی یہاں ضرور ہے"

"اچھا ہم ابھی ڈھونڈھ لیتے ہیں"

اتنا کہہ کر یوروپین ملاح اپنی ٹارچ لے کر آگے بڑھا۔ اور چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنے لگا، اگرچہ بجلی کی بتی جل رہی تھی، مگر اس کی روشنی بکسوں کے پیچھے نہیں پہنچتی تھی۔ یہاں پر رام لال چھپا ہوا تھا۔ وہاں پر بھی بالکل اندھیرا تھا۔ ملاح اور قلی

ڈھونڈھتے ہوئے اس مقام پر آئے۔ یکایک ٹارچ کی چمکدار روشنی رام لال کے چہرے پر پڑی۔ بول اٹھا۔ یہ بیٹھا ہے۔ اس کے بعد اس نے رام لال سے کہا۔ چلونا۔ نکلو۔ تمھارا کھیل ختم ہوگیا۔

رام لال کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا، وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ صاحب کے اشارہ کرنے پر دو قلیوں نے اس کی دونوں باہیں پکڑلیں اور اُسے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے چلے۔ پیچھے پیچھے یوروپین بھی چلا۔ سب لوگ ڈیک پر آئے ڈیک پر سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف جہاز کا کپتان کھڑا ہوا دو یوروپین مسافروں سے گفتگو کررہا تھا۔ رام لال کپتان کے سامنے لایا گیا۔ کپتان نے رام لال کو دیکھ کر یوروپین ملاح سے پوچھا۔ کیا معاملہ ہے؟

"یہ آدمی ہولڈ میں چھپا ہوا تھا۔"

کپتان نے رام لال کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بعد ازاں مسکرا کر پوچھا۔ کیوں۔ آفریقہ چھوڑنے کا ارادہ ہے کیا؟

پاس کھڑا ہوا ایک یوروپین مسافر بولا۔ ہاں۔ آفریقہ گرم ملک ہے۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ رام لال بچارا چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔

کپتان نے یوروپین ملاح سے کہا۔ اسے پولیس کے حوالہ کرو۔

(۴)

شام ہوچکی ہے۔ رام لال ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے پاس ایک ہندی عورت بیٹھی ہے اس کی آنکھیں بند ہیں۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلتی ہے۔ اسی وقت ایک ہندی کمرے کے اندر آیا اور کپڑے اتار کر ایک کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے بولا۔ کہو ہوش آیا؟

عورت بولی۔ کبھی کبھی آنکھ کھول دیتے ہیں۔ ہوش میں نہیں ہیں۔ ڈاڑھی والے نے اس بری طرح سے مارا ہے کہ ہڈی پسلی چور ہوگئی ہے۔ بچنا مشکل معلوم ہوتا ہے ہندی ایک لمبی سانس چھوڑ کر بولا۔ کیا کریں۔ یہاں ہم لوگوں کی فریاد سننے والا ہے کون؟ خون کا

گھونٹ پی کر رہ جانا پڑتا ہے۔ اور میں نے اسے منع کیا تھا کہ یہ کام نہ کرو۔ یہ کام تمہارے بوتے کا نہیں ہے۔ پر نہ مانا!

"وہ کیا کرے بیچارا۔ اُدھر باپ مر گیا۔ ماں اکیلی تڑپ رہی ہے۔ اس لئے جان پر کھیل گیا۔ اپنے ہی کو دیکھ لو۔ جب دیس کی یاد آتی ہے تو کتنے بے کل ہو جاتے ہو"

"وہاں بات تو یہی ہے، جس وقت ہندوستان کی یاد آتی ہے۔ اس وقت دل بُرا بے چین ہونے لگتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ جانا اپنے ہاتھ کی بات تھوڑے ہی ہے"

"وہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے! کوئی اپنے وطن جانا چاہے۔ تو اسے جانے کیوں نہیں دیتے؟"

"بدمعاشی! ہم ہندوستانی غلام ملک کے آدمی سمجھے جاتے ہیں ہماری کوئی قدر ہے؟ ہمیں تو کتے بلی سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔"

اسی وقت رام لال نے آنکھیں کھول کر کہا۔ پانی!

عورت نے جھٹ پٹ پانی کا گلاس اوٹھا کر اس کے منہ سے لگایا۔ رام لال نے پانی پیا۔ بعد ازاں پھر آنکھیں بند کر لیں۔

دوسرے شخص نے اُس کے سرہانے جا کر پکارا۔ رام لال!

رام لال نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس شخص نے پوچھا۔ کیا حال ہے؟

رام لال بڑی مشکل سے بولا۔ اچھا نہیں ہے۔ چھاتی میں بڑا درد ہے۔ عورت آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ بڑی چوٹ لگی ہے۔ بیچارے کو بڑی تکلیف ہے۔ اسی وقت جیکب کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا۔ کیوں، ہوش آیا؟

ہندی نے جواب دیا۔ ہاں کچھ ہوش تو آیا ہے۔ لیکن تکلیف بہت ہے۔

جیکب بولا۔ مار ابھی کیا تھوڑا ہے۔ ہم لوگ بچا نہ لیتے۔ تو وہیں مر جاتا۔

یہ کہہ کر وہ رام لال کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا "رام لال" رام لال نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جیکب کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خشک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

جیکب بولا۔ رام لال میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ پر تم نہ مانے۔ میں جانتا تھا کہ تم

پکڑے جاؤ گے ۔ آخر وہی ہوا۔
رام لال بولا ۔ بھائی جیکب جو قسمت میں بدا تھا ۔ وہ ہوا ۔ اس طرح نہیں جا سکا تو اب دوسری طرح جاتا ہوں ۔ میرے جسم کو انہوں نے جانے نہیں دیا ۔ لیکن میری روح کو جانے سے کون روک سکتا ہے ؟ اُسے پاسپورٹ اور جہاز کی ضرورت نہیں ہے جیکب !
جیکب کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اُس نے کہا ۔ ایسی باتیں مت کرو بھائی ۔ تم جلد اچھے ہو جاوگے ۔ اور اب کے تم جسم سمیت جاوگے ۔ اب کے میں تمھیں اپنے وطن جو ہولینڈ کی طرف سے بھیجوں گا ۔ وہاں سے تم آسانی سے نکل جا سکو گے ۔
"نہیں جیکب ۔ میری روح ہندوستان ۔ اپنے پیارے وطن ۔ کے لئے تڑپ رہی ہے اب وہ نہیں رکیگی ۔ جیکب تم نے ہندوستان نہیں دیکھا ۔ ایسا ملک دنیا کے پردے پر کوئی نہیں ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اُسے کیوں چھوڑا تھا ! ہوش سنبھالنے کے بعد سے سیر و سیاحت کی چاٹ میں چلا آیا ۔ گھر سے لڑکر آیا تھا ، اسی کا پھل آج ملا ۔ اس وقت اس کی مٹی تک کو دل تڑپ رہا ہے ۔ اگر جسم اسی مٹی میں مل سکتا ہے ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ! ایسی قسمت کہاں ؟ "
رام لال چپ ہو گیا ۔ ادھر تینوں آدمیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ۔
رام لال پھر بڑبڑانے لگا ۔ میرے گھر پر مہوے کا درخت ہے ۔ اس کے لال لال پتے شام کے وقت کے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کے پڑنے سے کس قدر خوبصورت دکھائی دیتے ہیں ۔ جب وہ پھولتا ہے ۔ تو اس کی بھینی بھینی خوشبو ، آہ ! کیا بتاؤں ۔ اس کے پھول ۔ کتنے خوش ذائقہ ہوتے ہیں ۔ ایسا مزہ میں نے کسی چیز میں نہیں پایا ۔ وہاں اس کی شراب بنتی ہے وہ ہندوستان کا انگور سمجھا جاتا ہے ۔ آہ ! پانی ۔ ۔ ۔
عورت نے پانی کا گلاس رام لال کے منہ سے لگایا ۔ پانی پی کر رام لال کچھ دیر خاموش رہا اس کے بعد پھر بولا ۔ ہمارے گاؤں سے گنگا دو کوس ہے جیکب ۔ ایسا دریا دنیا میں نہیں ہم لوگ اُسے دیوی کی طرح پوجتے ہیں ۔ اُس کا پانی کتنا ٹھنڈا ، کتنا ذائقہ دار ! مہینوں بند کر کے رکھو کبھی نہیں سڑے گا ۔ سڑے کیسے ، وہ تو دیوی کا پانی ہے آہ ! اگر یہ ہڈیاں گنگا ماتا کی گود

میں پہنچ سکتیں، تو...... رام لال کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

بارہ بجے رات تک رام لال کی یہی حالت رہی۔ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا۔ بارہ بجے کے بعد اُس نے پانی مانگا۔ پانی پینے کے دو منٹ بعد وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ماں میں آتا ہوں آتا ہوں...... آہ! ہندوستان......"

اتنا کہہ کر وہ پھر گر پڑا۔ جیکب اور ہندی نے اس کو سنبھال کر اٹھانا چاہا۔ لیکن رام لال کی روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ (ہنس بنارس)

مرقع عبرت

از
جناب مولوی میرزا علی رضا صاحب ماہر لکچرار فارسی سٹی کالج

ہاں اے دلِ نخوت بیں کیوں ہوتا ہے دیوانہ
دنیا جسے سمجھا ہے عبرت کا ہے کاشانہ

یاں عشرتِ صد سالہ اک خواب ہے دوشینہ
ہر بات یہاں کی ہے بھولا ہوا افسانہ

ہو قصۂ فریدوں میں اے دل جو گزر تیرا
پڑھ فاعتبروا غافل اور چھوڑ دے اترانا

یاں پریوں کی جھرمٹ میں تھا ایک سلیماں وش
اندر کا اکھاڑا تھا دربار تھا شاہانہ

گھیرے ہوئے رہتے تھے اس ماہ کو سب تارے
سرداروں کی چہلیں تھیں بروقت ظریفانہ

کوس لمن الملکی بجتا تھا یہاں ہر دم
دربار کی فردیں تھیں سب عاقل و فرزانہ

ہر ایک زمانے کا بقراط و ارسطو تھا
افعال کریمانہ اقوال حکیمانہ

تھی مدِ نظر ان کے بہبود و فلاحِ ملک
مالک پہ فدا ہوتے جوں شمع پہ پروانہ

ہمت میں دلیری میں ایک ایک سے بڑھکر تھا
چوٹیں تھیں برابر کی آپس میں حریفانہ

آئیں جو سخاوت پر حاتم کو بھی شرمائیں
بھڑ جائیں تہمتن سے وہ ہمت مردانہ

فردوس کا دھوکا تھا ہر کاخ شبستاں پر
مہ رویوں سے ہر دم تھا آباد پریخانہ

جاں سوز ادائیں تھیں دلدوز نگاہیں تھیں
دنیائے تمنا تھی ہر جلوۂ جانانہ

میخواروں کا مستی میں خوش وقت ترنم تھا
آباد رہے ساقی دائم ترا میخانہ

آزاد ہوائیں تھیں سرسبز تھا سب گلشن
دن عید تھی اور راتیں عشرت کی تھیں روزانہ

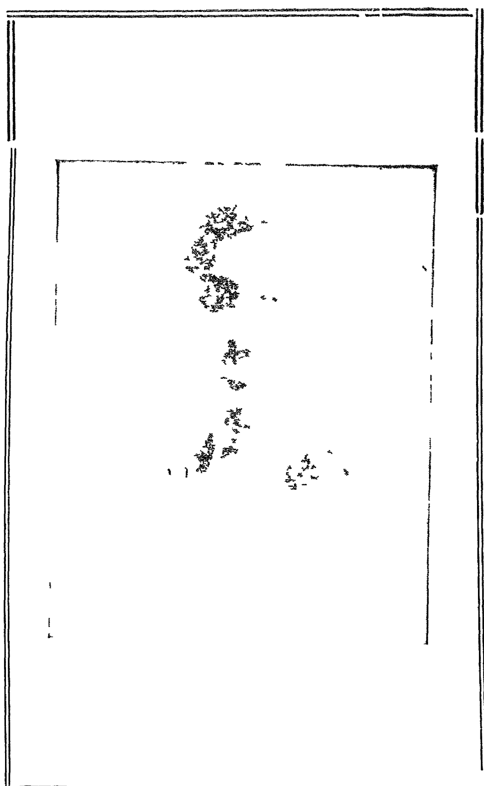
گل رویوں کے بازو تھے گل تکیہ بچھونے پر
صہبائے تنعم سے لبریز تھا پیمانہ

پھولوں کو کبھی چوما غنچوں کو کبھی چھیڑا
ہر سمت ہواؤں میں انداز تھے مستانہ

کی چرخ ستمگر نے آخر کو تنک ظرفی
نظروں میں کھٹکتی تھی وہ محفل رندانہ

گردش نے زمانے کی کام اپنا کیا پورا
پامال ہوئے گلشن سب ہو گیا ویرانہ

مٹی میں ملے سارے ارمان خود آرائی
اندھیر ہے مرقد میں ہے گوشۂ تنہائی



سید یوسف علی خاں بی-اے (عثمانیہ) بی-ایس-سی
(آنرز) (لندن)



محمد سراج الدین بی ایس-سی (آنرز)
(عثمانیہ)

مردوں کی سرپرستی میں عورتوں کے حقوق و تعلیم

جناب غلام رسول صاحب متعلم بی اے، جامعہ عثمانیہ

انسان ہمیشہ قوت ہی کا احترام کرتا اور قوت ہی کے سامنے سر جھکاتا رہا ہے اور یہ اس کا ایک طبعی خاصہ ہے۔ چونکہ عورت کمزور تھی اس لئے مرد نے اس کے تمام حقوق پامال کر ڈالے اور نہایت تحقیر اور توہین کے ساتھ اس سے برتاؤ کرنے لگا۔ ہمارے ہاں کی تمام عورتیں اپنے خاندان کے مردوں کی مطیع اور فرمانبردار رہنے پر صرف اس وجہ سے مجبور ہیں کہ وہ مرد ہیں اور یہ عورتیں۔ مردوں کی ہستی کے مقابلہ میں انہوں نے اپنی ہستی کو بالکل فنا کر دیا ہے اور تمام مخلوقات اور کائنات میں صرف گھر کی چار دیواری ان کی قسمت میں لکھی ہے جس میں وہ دوامًا محبوس اور جہالت و تاریکی کے پردوں میں چھپی رہتی ہیں۔ مردوں نے ان کو لذت نفس کے حصول کا سامان تصور کر لیا ہے۔ اور جب چاہتے ہیں ان کے ساتھ لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مردوں کے لئے آزادی ہے اور عورتوں کے لئے غلامی۔ اُن کے لئے علم اور ان کے لئے جہالت۔ ان کے لئے فراست اور ان کے لئے حماقت۔ اُن کے لئے امر و نہی کے احکام صادر کرنے کا اختیار اور ان کے لئے اس کا اتباع اور صبر۔ غرض ان کے لئے دنیا کی تمام چیزیں ہیں اور ان جملہ چیزوں میں سے ایک چیز عورت بھی ہے جس کے وہ مالک ہیں۔

یہ عورت کی تحقیر ہے کہ مرد گوری یا کالی لونڈیوں سے گھر بھر لیتا اور متعدد بیویاں کر لیتا ہے جب کہ اس میں عدل و انصاف کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ اگر وہ عادل اور منصف مزاج ہو تو بھی وہ چار سے زیادہ کا مستحق نہیں جب کہ ضرورت شدید لاحق ہو۔ لیکن اس سے وہ خواہش نفسانی کا مطیع و منقاد ہو کر عیش پرستی میں مستغرق اور منہمک ہو جاتا ہے۔ اور میانہ روی اور انصاف کی جس کو مذہب نے فرض گردانا ہے بالکل پروا نہیں کرتا۔

یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ شوہر اپنی عورت کو بے سبب طلاق دے کر اس کی آئندہ زندگی

کو تلخ بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے ماتھے پر مطلقہ کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے لگ جاتا ہے۔
یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ اکثر مرد علی الاعلان کہتے ہیں کہ عورتوں کی امانت داری پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا چاہئیے۔
یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ اس کو عام زندگی اور ان تمام کاموں سے جو اس کے متعلق ہوں روکا جاتا ہے، نہ معاملات میں اس کی کوئی رائے ہے اور نہ فنون کا اس کو مذاق ہے۔ نہ مذہبی اعتقادات میں اس کو کچھ دخل ہے اور نہ قومی معاملات سے اس کو کچھ سروکار۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ممالک میں مردوں کو اپنی عورتوں پر بھروسہ اور ان کی امانت داری پر اطمینان حاصل ہو گیا ہے جو عورتوں کے لئے باعث عزت ہے۔ گویہ تغیر و تبدل جو بالفعل ان کی حالت میں نمودار ہوا ہے وہ اعتراض اور نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ اس نکتہ چینی کا باعث نفس تغیر ہو سکتا ہے بلکہ اس کے گرد و پیش کے حالات ہیں جن کی بنیاد نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ اور انہی حالات میں سے ایک تربیت کا نقص اور پردہ کی رسم کا استحکام بھی ہے۔ بخلاف اس کے اگر عورتوں کی مذہبی اور اخلاقی تربیت درجہ تکمیل کو پہنچ جائے اور پردہ کے رواج کو اس حد اعتدال پر لایا جائے جو اسلامی مذہب میں مقرر کیا گیا ہے تو یہ اعتراضات اور نکتہ چینیاں رفع ہو سکتی ہیں اور قوم اپنے تمام افراد (عورتوں اور مردوں) کی متحدہ قوت سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

عورتیں بھی مردوں کی طرح انسان کی جنس میں داخل ہیں اگر دونوں کی جسمانی ساخت پر غور کرو تو صاف معلوم ہو گا کہ اعضاء، حواس، عقل و فکر، جذبات اور خیالات نیز ان تمام خیالات کے لحاظ سے جو انسان ہونے کے لئے درکار ہیں دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

موجودہ حالت میں جسمانی اور روحانی قوتوں کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر جو فوقیت اور فضیلت حاصل ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مرد ہزاروں برس سے علمی اور عملی ترقیوں کے میدان میں برابر دوڑ رہے ہیں اور عورتیں ان قوتوں کے استعمال سے ہمیشہ محروم رہی ہیں۔ اور ایسی پست حالت میں رہنے پر مجبور کی گئی ہیں جو بلحاظ مختلف زمانوں اور ملکوں کے مختلف رہی ہے۔

کوئی عورت گھر کا انتظام نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کو عقلی اور اخلاقی علوم میں ایک خاص حد تک دستگاہ نہ ہو اس لیے ضروری ہے کہ اس کو ابتدا میں کم سے کم اتنی تعلیم دی جائے جتنی کہ لڑکوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ علوم سے سرسری واقفیت اس کو حاصل ہو جائے اور جب کبھی وہ چاہے اپنے مذاق کے موافق کسی علمی شعبہ کو پسند کر کے اس کو درجہ کمال تک پہنچا سکے۔

جو لوگ عورتوں کو تربیت دینا چاہیں ان پر فرض ہے کہ بچپن سے ان کو ایسے عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کا خوگر بنائیں جن کا اثر انسان کی ذات پر خاندان کے لوگوں پر اور تمام قوم پر ہوتا ہے تاکہ وہ اخلاق ان کے دل میں جگہ پکڑیں اور ان کا نقش گہرا بنجائے۔ یہ مطلب زبانی ہدایتوں کے سننے، عمدہ اور نیک مثالوں کے دیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ گھر کی عورتیں تربیت یافتہ ہوں۔ اور بچپن ہی وہ زمانہ ہے جب کہ بہت جلد اس کے دل میں بہترین صفات گھر کر لیتی ہیں اور پاکیزہ عادات و اخلاق کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور آئندہ یہی شجر بہترین اور عمدہ ثمر پیدا کرتے ہیں عورت بغیر اس قسم کی تربیت کے ان فرائض کو ہرگز ادا نہیں کرسکتی جو قومی اور خانگی لحاظ سے اس کی گردن پر ڈالے گئے ہیں۔

ہر شہر میں عورتیں کم از کم نصف آبادی کے برابر ہیں ان کے جاہل رہنے کا نتیجہ یہی ہے کہ قوم کے آدھے افراد کے کام کرنے سے جو فائدے پہنچ سکتے ہیں ان سے قوم بالکل محروم ہے اور صریح طور پر ہم کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو زندوں کے مجمع میں لائیں۔ زندوں کے سے کام کرنا سکھائیں۔ ان کی جسمانی اور عقلی قوتوں میں جنبش پیدا کریں تو وہ بھی مردوں کی طرح جاندار اور کام کرنے والی نظر آئیں۔ وہ جس قدر قوم کی دولت کو اب برباد کرتی ہیں اسی قدر پیدا کرنے لگیں اور دوسروں کے سہارے اور امداد پر زندگی بسر کرنا چھوڑ دیں۔

ہماری مثال آج کل ایسی ہے جیسے کوئی شخص مال کثیر پیدا کرے اور اس کو صندوق میں بند کر کے رکھ چھوڑے اور ہر روز صندوق کھولکر سونے اور چاندی کو دیکھا کرے اگر وہ اقتصادی اصول سے واقف ہوتا تو اس دولت کو استعمال میں لاتا اور اس سے نفع اٹھاتا لیکن اس کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کو نقصان اٹھانا نہ پڑے اور یہی ایک ایسا خیال ہے جو اس کو کثیر نفع سے روکتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے ہاں مرد، عورتوں کو تعلیم دلانے کے خیال ہی سے چونکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کہیں عورتیں تعلیم پا کر بد اطوار اور بدکردار نہ بنجائیں۔ لکھانے کا فن تو عورت کے حق میں سم قاتل خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اگر کوئی عورت لکھنا جانتی ہے تو اس کے قطعی معنی یہ ہونگے کہ وہ ضرور غیر مردوں سے خط و کتابت کے ذریعہ راہ و رسم پیدا کرے گی یا یوں کہیئے کہ ان سے معاشقہ شروع کردے گی۔ غالباً آپ خیال کریں گے کہ شاید یہ معاشقہ یورپین طرز پر ہوتا ہوگا، نہیں بلکہ

صرف خطوط کی حد تک اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ اس قسم کی کوئی زندہ مثال موجود ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ بد اطواری اور بدچلنی کے اثرات صرف لکھنے اور پڑھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی فرض کر لیا جائے تو ہم کو اس کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ایسے واقعات غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی موجود ہیں یا نہیں ؟ تو معلوم ہوگا کہ مشاہدات اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں پیام وسلام کا ذریعہ ایک مُردہ اور بے حس شئے خط ہے اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ اس حصول کے لئے حیوان ناطق میں سے کسی مرد منقطع یا اپنے ہی میں سے کسی کو بطور پیامبر کے مقرر کر لیتا ہے۔ بہر حال نفسانی خواہشات کی تحریک دونوں طبقوں میں ہوتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شئے دونوں میں پہلے سے موجود تھی لیکن ایک نے تعلیم پاکر اس کو مہذب طریقہ سے ظاہر کیا اور دوسرے نے اسی کو غیر مہذب طریقہ سے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیم نے اس خواہش کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنا ہاتھ آگ سے جلاکر آگ کو برا بھلا کہتا ہے اور اس پر نفریں اور لعنت ملامت بھیجتا ہے اور پھر اس کا یہ کہنا کہ آگ بری اور مضرت رساں شئے ہے۔ کیا یہ درست ہے ؟ ہرگز نہیں ! یہ قصور آگ کا نہیں بلکہ اس شخص کا ہے جس نے اس کا استعمال ٹھیک طور پر نہیں کیا۔ بلکہ اگر وہ آگ کا ٹھیک استعمال جانتا یعنی غذا (جو اس کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے)، اور شیرینیوں کی تیاری کی غرض سے جلانے میں استعمال کرتا تو بجائے اس کے کہ اس کو نقصان پہنچے اس کو ہزار گنا زیادہ فائدہ پہنچتا۔

سب سے بڑا سبب قوم کی پستی اور تباہی کا یہ ہے کہ اس کے افراد کا ایک بڑا حصہ عضو معطل، بیکار اور قوم کے ذمہ بار ہو۔ وہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے کوئی کام نہ کرتا اور اگر کوئی کام کرے بھی تو مثل ایک بے زبان جانور یا بے شعور مشین کے یہ بھی نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کرتا ہے، اور اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟

ہماری قوم میں عورتوں کی حالت اس قدر زبون اور پست ہوگئی ہے کہ جب ہم اس کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی ہمارے ذہن میں گذرنا لازمی ہے کہ اس کا کوئی ولی اور سرپرست ایسا ہو جو اس کی حاجتوں کو پورا کرے، اور اس کی ضرورتوں اور خواہشوں کو انجام دے

گویا ولی اور سرپرست کا ہونا ایک ایسا امر ہے جو ہر حال میں ضروری ہے حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ بہتیری عورتوں کے لئے کوئی ولی یا سرپرست نہیں ہوتا مثلاً وہ لڑکی جس کے رشتہ دار نہ ہوں یا جو نا کتخدا ہو۔ وہ عورت جو مطلقہ ہو۔ وہ عورت جس کا شوہر دنیا سے گذر گیا ہو وہ ماں جس کی اولاد میں کوئی لڑکا نہ ہو اور اگر ہو تو کم سن اور نابالغ ہو۔ یہ سب صورتیں ایسی ہیں جن میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی اولاد یا خود اپنی زندگی کے لئے معاش پیدا کر سکیں۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں گی تو وہ معاش کے ناجائز ذریعے اختیار کریں گی۔ یا ان کو کسی فیاض خاندان کے سہارے زندگی بسر کرنی ہوگی۔

اگر ہم اس بات کی تلاش کریں جس سے رات کی تاریکی میں بیکس اور نادار عورتوں کو شیطان سیرت نوجوانوں کے جذبات کا شکار ہونا پڑتا ہے تو معلوم ہوگا کہ اکثر صورتوں میں اس ذلت کے قبول کرنے اور ایک گناہ کبیرہ کے بے تھاہ گڑھے میں گرنے کا باعث لذائذ نفسانی کے حاصل کرنے کی امنگ نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا روم فرماتے ہیں

آنکہ شیران را کند روباہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

اکثر خاندان ایسے ہیں جن کے ذمہ ان کثیر التعداد عورتوں کا نان ونفقہ ہے جو زمانہ کی گردش سے مفلس ہوگئی ہیں اور اپنی معاش پیدا کرنے کے لئے کوئی کام کرنا نہیں جانتیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اکثر خاندان اسی باعث کفایت شعاری کے پابند نہیں رہ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر خاندانوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ جب ایک شخص جو اپنی ذات اور اولاد کے لئے محنت کرتا ہے۔ تو وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ اپنے رشتہ داروں یا دوستوں یا ایسے شخص پر صرف کرتا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے انسانی ہمدردی اس کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی کمائی میں سے تھوڑا سا ان لوگوں پر بھی صرف کرے تاکہ وہ بھوک سے نہ مر جائیں۔ مگر وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق اس کی گردن پر ہے اور وہ اس حق کو پورا کرتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی محنت کر کے معاش پیدا کریں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو استعمال کرنا نہیں جانتیں جو قدرت نے ان کو عطا کی ہیں اس کا باعث صرف یہی ہے کہ وہ تربیت سے محروم ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی عورت کا شوہر یا سرپرست بھی موجود ہے جو اپنی کمائی سے

اس کو مدد دے سکتا ہے۔ تاہم یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو تربیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر عورت تربیت یافتہ ہو اور اس کا شوہر یا سرپرست محتاج ہو تو وہ اس کی مدد کر سکتی ہے اور اس کے بوجھ کو ہلکا کر سکتی ہے

اگر عورت بذات خود مالدار ہو (اگرچہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے) اور اس کے پاس جائداد ہو تو کیا اس جائداد کا انتظام کرنے، اپنی دولت کو محفوظ رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے اس کو تعلیم کی ضرورت ہوگی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی عورتیں اپنا روپیہ کسی رشتہ دار یا غیر آدمی کے سپرد کر دینے پر مجبور ہوتی ہیں اور ان کو اپنے معاملات میں مختار کر لیتی ہیں۔ یہ مختار بہ نسبت ان کے معاملات کے اپنے کاموں میں زیادہ مشغول رہتے ہیں اور ان جائدادوں کی پرواہ نہیں کرتے یا مالک جائداد کو نااہل سمجھ کر خوب روپیہ بٹورنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختار چند روز میں مالدار ہو جاتے ہیں اور صاحب جائداد عورتیں افلاس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنے شوہر یا رشتہ دار یا مختار کی چالاکی اور مکاری سے اپنے قانونی حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں تو ایسا واقعہ ظہور میں نہ آتا۔

بہرحال تعلیم بذات خود ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر حالت میں ضرورت ہے کیونکہ وہ آج کل انسانی زندگی کی ضروریات میں شامل ہوگئی ہے اور جس قوم میں تمدن اور شائستگی نے قدم رکھا ہے اس کی سب سے مقدم ضرورت علم ہے۔ علم ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے لئے ہر انسان مصروف کوشش ہے اور اسی پر روحانی اور جسمانی ترقیوں کا مدار ہے۔ تنہا علم ہی اس بات کا ذریعہ ہے کہ انسان پستی اور تنزل کے درجہ سے گذر کر فضیلت اور شرافت کے بلند مرتبہ تک ترقی کرے اور ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کو اس حد تک پہنچائے جہاں تک اس کی قابلیت اجازت دے۔

تمام ربانی شریعتیں اور انسانی قوانین مردوں اور عورتوں سے یکساں طور پر خطاب کرتی ہیں کہ۔ فنون لطیفہ، فلسفہ عالیہ۔ ایجادات و اختراعات کا دروازہ ہر عورت کے لئے اسی طرح کھلا ہے جس طرح مردوں کے لئے ایسا کون انسان ہے جو علوم و فنون کے مطالعہ کا شوق نہیں رکھتا اور دنیا و آخرت کی کامیابی اور حقائق کا سراغ لگانے کے لئے قدرت کے خزانوں سے

مستفید ہونا نہیں چاہتا ؟ یہ امنگ جو قدرتی طور پر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کیا فرق ہے ؟ ایسا کون جاندار ہے جس میں روح اور عقل ہو اور وہ اس بات پر راضی ہو کہ اس کے بازو توڑ دئے جائیں اور اس کو ایک پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ سر جھکائے آنکھیں بند کئے اُس میں پڑا رہے اور اس کے سامنے ایک وسیع اور پر فضا میدان ہو جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کے سر پر آسمان کا نیلگوں شامیانہ ہو۔ ستارے اس کی نظروں کے سامنے کھیلتے اور اپنا جلوہ دکھا دکھا کر اوجھل ہو جاتے ہوں۔ کائنات کی روحیں اس کو امیدوں اور آرزوؤں کی طرف کھینچے لئے جاتی ہوں حالانکہ قدرت نے اپنے خزانے کھول دئے ہیں کہ وہ ان پر قبضہ کرے اور ان سے متمتع ہو۔ ؟

شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر مکلّف قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عقل و دانش مرد کو عطا کی گئی ہے وہی عورت کو عطا کی گئی ہے کیا کوئی شخص جس کو خود غرضی نے اندھا نہ کیا ہو خیال کر سکتا ہے کہ خدا نے جو عقل و درایت انسان کو عطا کی ہے وہ بیکار ہے اور جو حواس اور جو قوتیں اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ ان کو ہمیشہ معطل رہنے دیا جائے ؟ اس خیال کے مطابق عورتوں کو جاہل رکھنا گویا آدھی دنیا کے قوائے دماغی کو بیکار کرنا اور اس حکیم صانع کی صنعت کو لغو ٹھہرانا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ عورتیں پردہ نشین اور گھر کی زینت ہیں ان کے فرائض گھر کی حد تک محدود ہیں مگر یاد رہے کہ یہ خیال صرف ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور جن کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلا فرض جو عورت کے ذمہ ہے یہ ہے کہ وہ بذات خود اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے جس کے نہ ہونے سے اس کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ جب تمام خانگی معاملات میں مرد ہی جواب وہی کرتا ہے اور اُسی سے بازپرس کی جاتی ہے تو اس کی نظر میں عورت کی اتنی ہی وقعت ہوگی جتنی کسی جانور کی ہوتی ہے جس طرح کسی جانور کا مالک اس کے لئے چارہ مہیا کرتا ہے اسی طرح مرد عورت کے لئے معاش کا بندوبست کرتا ہے۔

صدیوں سے عورتیں مردوں کے حکم کے سامنے گردن جھکاتی اور ان کے ظلم و ستم کا نشانہ ہوتی رہی ہیں۔ مردوں نے ان کی آزادی چھین لی ہے اور عورتوں کے لیے یہی بات ہمیشہ پسند کی ہے کہ وہ ان کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کے اشاروں پر چلتی رہیں۔ طرفہ یہ کہ ان پر روزی حاصل کرنے اور معاش پیدا کرنے کے تمام دروازے بند کر دئیے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اب بذات خود معاش پیدا کرنے سے عاجز ہیں اور اس بات پر مجبور ہیں (بلکہ عادی ہو گئے ہیں) کہ شوہر کی کمائی پر گذر کریں یا ناجائز طریقوں سے معاش پیدا کریں۔

عورتوں کے دماغ کے لئے چونکہ غور و فکر کا کوئی میدان باقی نہیں رہا ہے اس لئے زندگی کے مفید کاموں کی ذرا بھی وقعت ان کی نظر میں نہیں رہی۔ ان کا مشغلہ لے دے کے یہی رہ گیا ہے کہ وہ مردوں کی دلجوئی کریں اور مرد جس طرح چاہیں ان کو اپنے نفسانی خواہشات کا تختۂ مشق بنائیں۔ اسی لئے عورتوں نے اپنی تمام قوتیں اس کوشش میں صرف کر دی ہیں کہ شوہروں کی دلجوئی کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں اور ان کی خواہشوں اور ارادوں کا پتا چلا کر کٹ پتلیوں کی طرح ان کے اشاروں پر چلیں۔

تیرا بھکاری

(از جناب پنڈت و نشی دھرو دیا النکار لکچرار اورنگ آباد کالج)

(۱)

محلوں سے لے کر چھپر تک — نیچے سے لے کر اوپر تک
کیا پھولوں میں کیا کانٹوں میں — گھور تمر[1] میں یا تاروں میں
اس دنیا میں کیا ہے میرا — سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۲)

جو دیتا ہے لے لیتا ہے — اور کسی کو دے دیتا ہے
سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے — نہیں خزانہ یہ گھٹتا ہے
کہوں کیسے پھر یہ ہے میرا — سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا،
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۳)

اپنے سارے ساتھی سنگی — وسودھا[2] جن سے پیاری لگتی
ان کی سمرتی[3] بھی مٹ جاتی — انت شونیے[4] میں مل جاتی
موہ[5] بندھے کہ دیتے میرا — سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۴)

خالی آئے خالی جاتے — جیسے تھے ویسے ہی جاتے
جب آتے ایسے ایسے ہی جاتے — لے کر ساتھ نہ کچھ بھی جاتے
کیا ہے میرا، کیا ہے میرا — سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

---

[1] اندھیرا۔ [2] زمین [3] نشانی۔ یادگار [4] فنا [5] محبت والے دنیادار۔

شکسپیر کا ایک شاہکار ڈراما

(بسلسلہ سابقہ)

از جناب سید صغیر حسن صاحب میرٹھی

چودھواں سین

اسکندریہ۔ کلیوپیٹرا کے محل کا دوسرا کمرہ

اینٹنی اور ایراس کا داخلہ

اینٹنی۔ ایراس کیا تجھ کو یقین ہے کہ اب بھی تو مجھ کو میری اصلی شکل میں دیکھ رہا ہے۔

ایراس۔ جی ہاں حضور۔

اینٹنی۔ بسا اوقات ایک بادل کے ٹکڑے کو ہم بصورت اژدر دیکھتے ہیں۔ کبھی بخار بشکل خرس یا شیر ببر نظر آتا ہے۔ کبھی سربلند قلعہ بینار دار۔ کبھی ایک معلق چٹان کبھی متعدد چوٹیوں والا پہاڑ یا آسمانی رنگ کی راس جس پر درخت اُگے ہوں جو دنیا کی طرف تعظیماً خمیدہ ہوتے ہیں اور ہماری آنکھوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ تمام اشجار ہوا سے جھکے ہوئے ہیں۔ تو نے ایسے علامات کا مشاہدہ کیا ہے؟ ایسے منظر اکثر شام کے دھندلکے میں پیش نظر ہوتے ہیں۔

ایراس۔ جی ہاں حضور۔

اینٹنی۔ ابھی جو بادل کا ٹکڑا گھوڑے کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ بسرعت خیال کرہ بالا کی ہوائیں اس کو مٹا دیتی ہیں اور ایسا ناقابل شناخت بنا دیتی ہیں جیسے سمندر میں قطرہ۔

ایراس۔ حضور ایسا ہی ہوتا ہے۔

اینٹنی۔ میرے اچھے خدمتگار ایراس اس وقت تیرا سردار بھی بعینہ یہی صورت رکھتا ہے

اس وقت میں تجھ کو انیتھنی معلوم ہوتا ہوں لیکن یہ ظاہری شکل تا دیر قایم نہیں رہ سکتی۔ ملکۂ مصر کا طرفدار ہو کر میں نے اس جنگ میں حصّہ لیا۔ وہ ملکہ جس کا دل مجھ کو خیال تھا کہ میرے دام محبت میں گرفتار ہے کیونکہ میرا دل اُس کے پاس تھا اور جب وہ میرا تھا اس سے لاکھوں دوسرے قلوب وابستہ ہو گئے تھے مگر اس وقت سب جدا ہو گئے ہیں۔ ایراس اسی ملکہ نے قسمت کے گنجفہ کی تقسیم اس طرح پر کی کہ جان بوجھکر بڑے بڑے پتے سیزر کو دیدیئے اور مجھ کو دھوکہ دیا۔ میں نے اپنی شان وشوکت بازی میں لگا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو فتح ہوتی۔ نہیں اے نرم دل ایراس اشکباری نہ کر۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلینا تو ابھی ہمارے اختیار میں ہے

(مارڈین کا آنا)

انیتھنی۔ افسوس ہے تیری ذلیل مالکہ پر۔ اُس نے مکر و فریب سے میری تلوار کو بیکار کر دیا۔

مارڈین۔ نہیں انیتھنی۔ میری مالکہ کو آپ سے عشق تھا اور ان کی تقدیر آپ کی قسمت میں قطعی طور پر مخلوط تھی۔

انیتھنی او دریدہ دہن خواجہ سرا دور ہو۔ گرسُن۔ اُس نے مجھ کو دھوکہ سے شکست دلوائی اس لئے اس کا قصاص اس کو اپنے خون سے دینا ہوگا۔

مارڈین۔ ایک شخص کی موت کا خون صرف ایک ہی مرتبہ دیا جاسکتا ہے اور کلیوپٹرا اس کو ادا کر چکی۔ آپ کی تمنّا اسی طرح برآئی جس طرح آپ خود یہ کام کرتے۔ آخری جملہ جو ان کے منہ سے نکلا وہ "انیتھنی نہایت شریف انیتھنی" تھا اور جس وقت یہ الفاظ وہ کہہ رہی تھیں ایک آہ جگرخراش نے انیتھنی کے نام کو پورے طور پر ادا کرنے سے قاصر رکھا اور دل وزبان کے درمیان اس کو قطع کر دیا۔ انہوں نے آپ کے نام کو اس طرح پر اپنے دل میں دفن کیا اور جان بحق تسلیم ہوگئیں۔

انیتھنی۔ تو وہ مرگئی

مارڈین۔ جی ہاں ختم ہوگئیں۔

انیتھنی۔ ایراس میرے اسلحہ جنگ اتار دے۔ طول طویل دن کا کام ختم ہوچکا۔ اب ہم کو سونا چاہیے

(مارڈین سے) جا تیری زحمت کا یہی کافی صلہ ہے۔ کہ تو یہاں سے صحیح سلامت واپس جاتا ہے۔

(مارڈین کا جانا)

اتارو۔ اسلحہ نوچ کر پھینکدو۔ ایجکس کی ہفت تہ سپر بھی میری حرکت قلب کو نہیں روک سکتی۔ اے میرے پہلو و شگافتہ ہو جاؤ۔ اے قلب ایک بار اس قدر مضبوط ہو جا کہ اس ناپائدار صندوق کو توڑ دے جس میں تو بند ہے۔ جا۔ ایراس۔ جا۔ اب میں سپاہی نہیں رہا۔ اے میری زرہ کے زخم خوردہ ٹکڑو۔ خدا حافظ۔ اب تک تم بڑی شان کے ساتھ میرے زیب جسم رہے ہو۔ ایراس تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس سے چلا جا۔

(ایراس کا جانا)

کلیوپیٹرا! میں ابھی تیرے پاس پہنچتا ہوں اور عفو تقصیر کے لئے گریۂ وزاری کروں گا بس اب ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ زندگی کی مزید طوالت اب عذاب جان ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ تیری راہ نما مشعل خاموش ہو گئی اس لئے اینٹنی تو بھی آرام کر اور تاریکی میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھر۔ اب تو جو کام بھی محنت شاقہ سے کیا جاتا ہے وہی بگڑتا ہے۔ اس لئے مجھے ان تمام جھگڑوں کو سر بمہر کر کے ختم کر دینا چاہیئے۔ ایراس کو پکارتا ہے) ایراس! (ملکہ کی روح سے) اے میری ملکہ میں ابھی حاضر ہوا (ایراس! (پھر ملکہ کی روح سے) میرا انتظار کرو۔ ہم دونوں دست بہ دست اس مقام پر چہل قدمی کریں گے۔ جہاں روحیں پھولوں کے فرش پر آرام کرتی ہیں۔ او ہم اپنی شاندار رفتار سے ان کو مجبور کریں گے کہ وہ ہم کو بہ نظر حیرت دیکھیں۔ عالم ارواح میں ڈائیڈو اور اینیس کے چاہنے والے گروہ ان کو چھوڑ دیں گے اور تمام روحیں ہماری گرویدہ ہو جائیں گی۔ ادھر آ۔ ایراس! ایراس!!

(ایراس کا آنا)

ایراس۔ میرے آقا کیا حکم ہے۔

اینٹنی۔ جب سے کلیوپیٹرا کا انتقال ہوا ہے میں ایسی بے وقعت زندگی بسر کر رہا ہوں کہ دیوتا

میرے کمینہ پن کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں میں جس نے حسب دلخواہ اپنی شمشیر آبدار سے دنیا کے ٹکڑے کر دئیے اور سبز سمندروں پر جہازوں میں شہر کے شہر آباد کر دئیے اپنے آپ کو ایک عورت کے برابر بھی جرأت نہ رکھنے کا مجرم قرار دیتا ہوں میرا دماغ اس کے دماغ سے کہیں زیادہ تنگ ہے جس نے خودکشی کر کے سیزر سے کہہ دیا کہ "میں ہی اپنی فاتح ہوں" ایراس تو نے قسم کھائی تھی کہ جب کوئی وقت آن پڑے گا اور جب میں اپنے پس پشت رسوائی اور خوف کا ناگزیر تعاقب دیکھوں گا جو درحقیقت اس وقت آگیا ہے تو اس وقت تو میرا حکم پاتے ہی مجھ کو قتل کر دے گا۔ پس اپنا کام کر۔ وہی وقت آگیا ہے۔ تو مجھ کو قتل نہیں کرے گا۔ بلکہ سیزر کو ناامید کرے گا۔ اپنے چہرہ پر اس اہم کام کی ہمت اور استقلال کے خون کی جھلک پیدا کر لے۔

ایراس۔ دیوتا مجھے باز رکھیں۔ کیا حضور مجھ سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو تمام پارتھیا کے تیر نہ کر سکے اور باوجود دشمن ہونے کے نشانے خطا کر گئے۔

اینٹنی۔ ایراس کیا تو یہ چاہتا ہے کہ عظیم الشان روم کے کسی محل کی کھڑکی میں کھڑا ہو اور اپنے آقا کو اس طرح بحالت مایوسی سینہ پر اپنے بازوؤں کو تہہ کئے ہوئے، اپنی کبھی نہ جھکنے والی گردن خم کئے ہوئے اور اس کے چہرہ سے روح فرسا شرم کی ترجمانی ہوتے ہوئے دیکھے۔ جب کہ خوش نصیب سیزر کے جلوس کی پیش رو گاڑی اپنے پیچھے پیچھے آنے والے کی پوری پوری ذلت پر مہر شہادت لگا رہی ہو۔

ایراس۔ میں ہرگز یہ دیکھنا نہیں چاہتا۔

اینٹنی۔ بس تو آ۔ کیونکہ اب میرے درد کا درمان ایک ہی زخم سے ہونا لازمی ہے۔ اپنی راست باز شمشیر کو میان سے کھینچ جس کو افادۂ ملک کے لئے تو نے نہایت کارآمد طریقہ پر ہمیشہ زیب کمر رکھا ہے۔

ایراس۔ افسوس حضور مجھ کو فرمائیں۔

اینٹنی۔ جب میں نے تجھ کو آزاد کیا تھا تو کیا تو نے میرا حکم بجا لانے کی قسم نہیں کھائی تھی چل

فوراً میرے حکم کی تعمیل کرو ورنہ میں تیری تمام گذشتہ خدمات کو محض اتفاقی اور بے مقصد تصور کروں گا۔ تلوار کھینچ اور میرے قریب آ۔

ایراس۔ اچھا تو میری جانب سے یہ شریف چہرہ پھیر لیجیے جس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی کل جہان پرستش کرتا ہے۔

اینٹنی۔ اچھا لے۔ (ایراس کی طرف پشت کرکے کھڑا ہوتا ہے)

ایراس۔ میری تلوار کھنچ چکی ہے۔

اینٹنی۔ تو فوراً اس کو وہ کام کرنے دے جس کے لئے تو نے اسے میان سے نکالا ہے۔

ایراس۔ میرے پیارے آقا۔ میرے سردار اور میرے شہنشاہ مجھ کو اجازت دیجیے کہ یہ بے رحم ضرب لگانے سے پیشتر میں وداعی خدا حافظ کہہ لوں۔

اینٹنی۔ ارے بس کہہ چکا۔ اچھا خدا حافظ۔

ایراس۔ عالیشان سردار خدا حافظ۔ کیا اب میں وار کروں۔

اینٹنی۔ ہاں ایراس۔ اسی وقت۔

ایراس۔ اچھا یہ لیجیے۔ اس طور پر میں اینٹنی کی موت کے غم سے بچتا ہوں۔

(خودکشی کر لیتا ہے)

اینٹنی۔ تو مجھ سے سہ چند عالی منش ہے۔ اے بہادر ایراس تو مجھ کو ایسے کام کی تعلیم دیتا ہے جو مجھ کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور میں نہ کر سکا۔ میری ملکہ اور ایراس اپنی بہادری کی مثال پیش کرکے کارناموں کی فہرست میں میری شرافت پر سبقت لے گئے۔ مگر میں بھی اسی خوشی سے جان دوں گا جو ایک نوشاہ کو ہوتی ہے اور آغوش مرگ میں اس انبساط سے دوڑ کر جاؤں گا جیسے کوئی معشوق کے بستر پر جاتا ہے۔ اچھا لے۔ ایراس تیرا مالک تیرے شاگرد کی حیثیت سے مرتا ہے۔ یہ کام اس طرح پر انجام دینا میں نے تجھ سے سیکھا ہے

(اپنی تلوار پر گر جاتا ہے)

پہلا نگہبان۔ یہ شور کیسا ہے؟

اینٹنی۔ دوستو میں نے اپنا کام بری طرح انجام دیا۔ آہ جس کام کا میں نے آغاز کیا اسے تم لوگ

اختتام کو پہنچا دو۔
دوسرا نگہبان۔ ستارہ ٹوٹ گیا۔
پہلا نگہبان۔ اور زمانہ اپنے اختتام پر ہے۔
تمام نگہبان۔ افسوس، ہزار افسوس۔
اینٹنی۔ جس کو مجھ سے محبت ہے وہ میرا کام تمام کردے۔
پہلا نگہبان۔ مجھ سے تو یہ نہ ہوگا۔
دوسرا نگہبان۔ اور نہ مجھ سے۔
تیسرا نگہبان۔ کوئی نہیں کرسکتا۔

(سب نگہبان بھاگ جاتے ہیں)

ڈرکیٹاس۔ تیری موت اور تیری بدبختی کو دیکھ کر تیرے ہمراہی فرار ہو رہے ہیں۔

(اینٹنی کی تلوار لے کر)

اس خبر کے ساتھ سیزر کو اس تلوار کا محض دکھلا دینا مجھ کو اس کا مقرب بارگاہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

(ڈالومیڈیز کا آنا)

ڈالومیڈیز۔ اینٹنی کس طرف ہیں؟
ڈرکیٹاس۔ ادھر دیکھو۔ ڈالومیڈیز اس طرف۔
ڈالومیڈیز۔ کیا وہ زندہ ہیں؟ اے شخص کیا تو جواب نہ دے گا۔

(ڈرکیٹاس کا جانا)

اینٹنی۔ ڈالومیڈیز کیا تو ہے؟ اپنی تلوار کھینچ اور میرا خاتمہ کر دینے کے لئے کافی ضربیں لگا
ڈالومیڈیز۔ اے مختار کل سردار میری مالکہ کلیوپیٹرا نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔
اینٹنی۔ انہوں نے کس وقت بھیجا تھا؟
ڈالومیڈیز۔ حضور ابھی اسی وقت۔
اینٹنی۔ وہ کہاں ہیں؟

ڈالومیڈیز۔ مقبرہ میں پناہ گزیں ہیں۔ جو کچھ ظہور پذیر ہوا ہے اس کا ان کو پہلے ہی سے کچھ اندیشہ ہوگیا تھا کیونکہ جب انہوں نے دیکھا کہ آپ کو شک ہوگیا ہے کہ انہوں نے سیزر سے سازش کر لی کہ جو بالکل بے بنیاد ہے اور کبھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور نیز یہ کہ آپ کا غصہ فرو نہ ہوگا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن یہ اندیشہ کر کے کہ خدا جانے اس سے آپ پر کیا اثر ہوا ہو۔ انہوں نے مجھ کو اظہار حقیقت کے لئے بھیجا ہے مگر مجھے خوف ہے کہ میں بعد از وقت آیا ہوں۔

اینٹنی۔ نیک دل ڈالومیڈیز بے شک تو بعد از وقت پہنچا۔ مہربانی کر کے میرے نگہبانوں کو آواز دے۔

ڈالومیڈیز۔ اے شہنشاہ کے نگہبانو ادھر آؤ۔ پہرہ دارو کدھر ہو۔ تمھارا مالک تم کو طلب کرتا ہے

اینٹنی۔ میرے اچھے دوستو مجھ کو اٹھا کر کلیوپیٹرا کی قیام گاہ پر لے چلو۔ یہ آخری خدمت ہے جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں۔

پہلا سپاہی۔ حضور ہم لوگ بدبخت اور منحوس ہیں کہ آپ اپنے جان نثاروں کو خدمت لے کر چور چور کرنے کے لئے شاید اب زندہ نہ رہیں۔

سب سپاہی۔ آج سے زیادہ رنج والم کا دن کوئی نہ ہوگا۔

اینٹنی۔ نہیں اے میرے نیک دل رفیقو بے رحم تقدیر کو اپنے بیش بہا تاسفات سے عزت بخش کر خوش نہ کرو۔ اگر کوئی چیز ہم کو نقصان پہنچانے کی غرض سے آئے اور ہم نہایت خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کریں تو گویا اس کی آمد کو ہم بے اعتنائی کی نظر سے دیکھتے ہیں جس سے خود اس کو شرمندہ کر کے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مجھ کو اٹھاؤ۔ میں تم لوگوں کو بارہا میدانوں میں لے گیا ہوں جس کے معاوضہ میں استدعا کرتا ہوں کہ اس وقت تم مجھ کو لے چلو اور اپنی زحمتوں کے صلہ میں میرا شکریہ قبول کرو۔

(سب لوگوں کا اینٹنی کو لے کر جانا)

تنقیدیں

انتخاب سودا | مرتبہ مولوی سید ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۴۴) صفحات قیمت (۸عہ) سکہ کلدار یا (۹عہ) سکہ حالی مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی یا مکتبہ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے طلب فرمائیے ۔

عام ادبیات اور بالخصوص شاعری میں انتخاب کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا آج انگریزی شاعری محض انتخابات کی بدولت خاص و عام پر روشن ہے ۔ بدقسمتی سے اردو شاعری میں عمدہ انتخابات بہت ہی کم پائے جاتے ہیں ۔ ہر شاعر ایک بڑے دیوان کا مالک ہے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہوتا ہے اس میں رطب و یابس جواہر پارے اور خذف ریزے ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ کرنے اور اس کے محاسن کو پرکھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔ چند سال سے شعرا کے دیوان شایع کرنے کی بجائے ان کے پورے کلام سے پاکیزہ انتخابات پیش کرنے کا شوق زیادہ ہو گیا ہے اور اب کئی شاعروں کے انتخابات کلام کے چھوٹے چھوٹے مجموعے تیار ہو گئے ہیں جو نہ صرف درسی ضروریات بلکہ عام قارئین کیلئے بھی مفید ہیں اور غیر ضروری گراں باری سے خالی ہوتے ہیں انتخاب سودا بھی ایک ایسا پاکیزہ مجموعہ ہے اس کے شروع میں مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے جس میں سودا کی لایف کے علاوہ ان کی شاعری کی خوبیاں و خصوصیات واضح کی گئی ہیں ۔ یہ انتخاب صرف غزلیات اور رباعیات کا ہے قصاید اور مثنویاں اس میں شریک نہیں غزلیں تقریباً تمام منتخب اور چیدہ غزلیں ہیں اور مرتب کے حسن مذاق کا ثبوت ہیں ۔ مناسب ہوتا کہ اس میں "علیمیات" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے سودا کے متعلق تمام متعلقہ کتابیں انتخاب سودا کے پڑھنے کے افادے کا باعث ہوتیں نیز سودا کی تصویر سے بھی اس کو مزین کیا جاتا تو کیا اچھا ہوتا ۔

چار یار | مولفہ مولوی احمد الیاس صاحب مجیبی چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۶۰) صفحات قیمت (۱۲) سکہ کلدار یا (۱عہ) سکہ حالی ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

یہ خلفائے راشدین کی مفید اور سبق آموز سوانح عمریوں کا مجموعہ ہے جو کم سن بچوں کے مطالعے کے لئے لکھا گیا ہے ۔ اس کا طرز بیان نہایت سلیس اور دل پذیر ہے ۔ واقعات و روایات ثقہ اور مسلمہ پیش کی گئی ہیں اور حتی المقدور ایسی کوئی بات اس میں درج نہیں کی گئی جو کمسن قاریوں کو متنازع مسائل میں الجھا دے ۔ مسلمان بچوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا

دو نئے رسالے

اس مہینے میں تبصرے کے لیے دو رسالے وصول ہوئے ہیں جو ہمارے ہی شہر حیدرآباد سے شائع ہونے لگے ہیں۔ ایک "کاشتکار" ہے اور دوسرا "حیات سخن"۔ اول الذکر حیدرآباد کے مشہور زمیندار مولوی احمد اللہ [illegible] صاحب [illegible] نے اور ملک کی زراعتی اغراض و مفاد کو فروغ دینے کی غرض سے جاری کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح حیدرآباد بھی ایک زراعتی علاقہ ہونے کے باوجود اب تک اس طرف کوئی خاطر خواہ توجہ ایسی نہیں کی گئی کہ [illegible] میں بڑی تبدیلی پیدا ہو جاتی۔ اگرچہ ہمارے ہاں محکمہ زراعت قائم ہے اور عرصے سے قائم ہے لیکن اب تک اس کی نوعیت زراعتی مشیر کی سی رہی ہے۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ کچھ طلبہ زراعت کے لیے بیرون ملک بھیجے گئے ہیں اور خود سررشتے کی طرف سے بھی مظاہراتی مزرعے وغیرہ قائم کر کے شوق زراعت و توفیر پیداوار کی کوشش کی جانے لگی ہے۔ ہنوز ملک میں کوئی زراعتی کالج یا فوقانیہ مدرسہ بھی وجود میں نہیں آیا مگر اب کیا سرکار اور کیا رعایا دونوں پہلے سے زیادہ متوجہ ہیں۔ اس سے قبل ایک رسالہ ریاست ہی سے "مشیر اہل دہ" کے نام سے جاری ہوا اور بفضلہ چل رہا ہے۔ بسمل صاحب کی یہ نئی کوشش ملک کی ضروریات کے مدنظر قابل حوصلہ افزائی ہے۔ رسالہ کی طباعت و کتابت بڑی پاکیزہ ہے۔ زراعت سے متعلق تصاویر بھی ہیں۔ ایک اور بات جو خاص اس رسالے سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ کاشتکار کا ایک حصہ تلنگی میں ہے جو ملک کی بہت وسیع آبادی کی زبان ہے۔ کاشتکار کا سالانہ چندہ للعہ ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے جاری نہیں ہو سکتا۔ بسمل صاحب بیرون دبیر پورہ سے مراسلت کی جائے۔

حیات سخن ایک ماہوار رسالہ ہے اردو فارسی شاعری کا اگرچہ اس کے ایڈیٹر حلیم عرشی صاحب و منشی محمد جہانگیر صاحب مجید ہیں لیکن ان کے علاوہ (۱۱) مشہور و معروف شاعر و ادیب اس کی مجلس ادارت کے ارکان ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ (۱) علامہ مفتی ضیا یار جنگ بہادر (۲) حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی (۳) فصاحت جنگ بہادر جلیل (۴) عزیز یار جنگ بہادر (۵) اصغر یار جنگ بہادر (۶) ادیب یار جنگ بہادر (۷) اختر یار جنگ بہادر (۸) مولوی عبداللہ صاحب عمادی (۹) مولوی مسعود علی صاحب محوی بی، اے (۱۰) نواب منور علی خان بہادر عالی (۱۱) آغا محمد علی صاحب پروفیسر فارسی نظام کالج۔ پہلا پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے اس میں اردو میں ع ملی ہے عرش کی زنجیر سے زنجیر میخانہ اور فارسی میں ع صدائے قلقل مینا شدہ تکبیر میخانہ طرحیں دی گئی ہیں۔ اردو میں (۱۳۸) اور فارسی میں (۴۴) اچھے، برے، چھوٹے بڑے سب ہی شاعروں کی غزلیں ہیں۔ جن شاعروں پختہ کار اور مسلم الثبوت ہیں کہ جن کی سارے ہندوستان میں شہرت ہے اور بعض ابھی نو مشق اور خام ہیں کہ ان کے پختہ ہونے کے لیے "بسیار سفر" کی ضرورت ہے۔ ان طرحی غزلوں کے علاوہ "عطر میخانہ" کے عنوان سے ایک مشاعرے کی غزلوں کا نچوڑ دیا گیا ہے جو اب سے پندرہ سولہ سال قبل حیدرآباد کے رسالہ "نظارہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولوی عمادی صاحب کا مضمون "شعر العرب" کی [illegible] سے شروع ہوتا ہے مگر وہ ابھی [illegible] صرف دو صفحے

صفحے پر [illegible] کا تو قصہ ہی [illegible] ہوگیا ہے۔

حیاتِ سخن، قدیم مذاقِ شعری اور فنِ غزل گوئی کی بقا و احیا اور شاعری پر تنقیدی و تحقیقی مضامین کی اشاعت کے بہت اچھے مقصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا چاہے تو یہ رسالہ شعرا کی فکری اور مالی امداد باہمی سے خوب چلے گا۔ ہم اپنے معاصر کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہوئے چند امور کی طرف توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتے اول حصہ نثر کی تنگ دامانی اور شعر العرب سے مضمون اول اس کی دو صفحے گنجائش ضرور مضحکہ خیز ہے۔ اگر اس کے لیے زیادہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی تو کم سے کم (۲۴) صفحات کا وقف کیا جانا ضروری اور بہت مفید ہوگا۔ اس میں شاعری پر تنقیدی و تحقیقی مضامین تذکرۃ الشعرا جو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں، شعرائے ماضی و حال کے مختصر سے حالات دوران کے محاسن شاعری، نیز لوازمات شعر عروض و بیان، صنایع بدایع وغیرہ پر مقالات شایع کیے جائیں۔ ان عنوانات پر لکھنے والوں کی صرف حیدرآباد میں بھی کمی نہیں۔ باہر کا ذکر غیر ضروری ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف ہم اربابِ "حیاتِ سخن" کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ طرحی غزلوں میں انتخاب شعر ہے۔ اگرچہ رسالے کے قواعد میں ہر غزل کے لیے زیادہ سے زیادہ (۹) شعروں کی تحدید ہے لیکن یہ مسلمہ سی بات ہے کہ ہر خوش فکر شاعر کے نو کے نو شعر اچھے اور بلند پایہ نہیں ہو سکتے۔ ادبیات میں انتخاب کی جس قدر ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے ہمارے مشاہیر شعرا کی عمروں کی کمائیاں کس مپرسی کی حالت میں ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ لوگ ضخیم دیوانوں کو دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں کہ ان بیچاروں کے شہ پارے بھی بے قدری کے ساتھ صرف زیبِ کتب خانہ رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں معتمد صاحبان رسالہ کے جن قابل اور نقادانِ سخن پر مجلس ادارت مشتمل ہے، وہ مرسلہ غزلوں کو پڑھ کر ایسا انتخاب بہ آسانی سے صرف صاد لگا کر دے سکتے ہیں کہ عطر مجموعہ کی طرح بہترین اشعار کا مجموعہ ہو۔ اس طریقے سے نہ صرف رسالے کا معیار ہی بلند ہو جائے گا بلکہ دوسرے مضامین اور نظموں کے لیے بھی خاصی جگہ نکل آئے گی۔

طرحی غزلوں کے ساتھ اگر ہر ماہ ایک خاص عنوان تجویز کر کے اس پر نظمیں طلب کی جائیں اور منتخبہ نظمیں بھی شائع ہوں تو جدید مذاق کے شعرا بھی اس محفل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ نیز شعرا کی تصاویر سے اس کو مزین کیا جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان مشوروں کو قبول کیا جائے تو حیاتِ سخن کا مستقبل نہایت شاندار ہو جائے گا اور اربابِ حیاتِ سخن کی مساعی بہ احسن الوجوہ مشکور ثابت ہوں گی۔ اس کی سالانہ قیمت عام خریداروں سے (عہ) اور شعرا سے (للعہ) ہے۔ مراسلت مولوی ابو الشرف مجید صاحب آغائی معتمد "حیاتِ سخن" کوٹلہ عالی جاہ حیدرآباد سے کی جائے۔ — س س م

کتب موصولہ

ان مطبوعات پر آئندہ نمبروں میں ریویو کیا جائے گا۔

(۱) تاریخ مغربی یورپ۔ (۲) سیرت نبوی اور مستشرقین۔ (۳) دیوان ماثر (۴) الکشافہ (۵) طائر خیال (۶) مبشرات مولود۔ (۷) رسالہ روح ادب (۸) کانفرنس گزٹ

رجسٹرڈ نستان ٹپہ سرکار آصفیہ
(۶۵)

رجسٹرڈ نستان ٹپہ انگلشیہ
(........)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۶) بابتہ ماہ ذی سنہ ۱۳۴۹ ف م نومبر سنہ ۱۹۳۰ عیسوی شمارہ (۲)

تصاویر :- نواب بہادر یار جنگ بہادر - جناب ابوالفاضل راز چاندپوری

فہرست مضامین

شذرات

یہ امر کارپردازان انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کے لیے خاص طور پر باعث مسرت و مباہات ہے کہ پیشگاہ عالم پناہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ سے اس کے ہر دلعزیز صدر نواب محمد بہادر خان صاحب کو بہادر یار جنگ بہادر کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ نواب صاحب مکتبے کے علاوہ مجلس تشریعی حیدرآباد (لیجس لیٹیو کونسل) میں طبقہ جاگیرداران کے نمایندے اور انجمن جاگیرداران کے سرگرم معتمد ہیں۔ آپ حیدرآباد کے ایک قدیم جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ، خاندانی امیر اور موروثی جمعدار (کماندار فوج) اور صاحب علم و فضیلت نوجوان ہیں۔ آپ کی قومی سرگرمیوں اور معاشرتی خدمتوں سے حیدرآباد کا ہر شخص واقف ہے۔ حیدرآباد کے مذہبی جلسے، تعلیمی کانفرنس، مجلس تشریعی، اصلاح امرا و جاگیرداران کے کاموں میں آپ کی پر زور تقاریر اور پرجوش سرگرمی نے آپ کو سارے ملک میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے انہی اعلیٰ خدمات اور علمی فضیلت کے صلے میں ہمارے علم پرور اور معارف نواز آقائے ولی نعمت نے آپ کو بتقریب سالگرہ مبارک خطاب سے سربلند فرمایا ہے۔ ہم نواب صاحب معز کو اس اعزاز پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کی توجہ اصلاح ملک و خدمت مالک میں بیش از بیش ہو جائے گی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی یادگار ہر سال اساتذہ و طلبہ کلیہ بہت دلچسپ طریقے پر منایا کرتے ہیں۔ اب کی دفعہ بھی یوم کلیہ منایا گیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ انگریزی اردو تقاریر کی مسابقتوں، کھیلوں کے مقابلوں کے علاوہ بڑے پیمانہ پر معاشرتی جلسے، نمایش سائنس سالانہ جلسہ تقسیم انعامات، عصرانے اور ڈنر کا انتظام بھی کیا گیا اور ہر ایک تقریب خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ مشاعرے میں طرحی غزلوں کے علاوہ "شباب" کے رومانوی عنوان پر نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ کالج کے "جوان سال" "قدیم طالب علم" جناب بدر الدین صاحب بدر کی نظم بہت پسند کی گئی۔ ان کے علاوہ طلبہ قدیم میں سے بعض شاعروں نے اچھی اچھی

نظمیں سنائیں اور خوب لطف محفل رہا۔ سائنس کی نمائش بھی قابل دید تھی۔ موجودہ زمانے کی متعدد سائنٹفک نیرنگیوں اور ایجادوں کا بہت اچھا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ کالج کے صدر جناب مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب اور دیگر اساتذہ اور طلبہ حال و قدیم کے تعاون و اشتراک عمل سے یہ سالانہ تقریب بہت کامیاب رہی۔

سال حال طبعیات کے لیے نوبل انعام جو ایک عالمگیر شہرت کا اعزاز اور بین الاقوامی اعتراف فضیلت علمی ہے ایک ہندی عالم سائنس سر سی وی رامن کو عطا ہوا ہے۔ سر رامن موجودہ نسل کے بہت بڑے سائنس داں اور ہندوستان کے قابل صد فخر و مباہات فرزند ہیں۔ گزشتہ سال انہیں اسی علمی فضیلت کے صلے میں سر کا خطاب دیا گیا۔ نوبل انعام کے ساتھ ملک معظم نے رائل سوسائٹی کی جانب سے ہیوز انعام بھی مرحمت فرمایا۔ سر رامن غالباً سب سے کم عمر ہندوستانی ہیں جنہیں (۴۱) برس کی عمر میں سر کا خطاب اور (۴۲) میں نوبل انعام ملا ہے انہوں نے پریزیڈنسی کالج مدراس میں تعلیم پائی اور امتیازات کے ساتھ جامعہ کے امتحان پاس کر کے ۱۹۰۷ء میں مالیاتی سیول سرویس میں داخل ہوئے۔ سائنس سے ان کے طبعی لگاؤ اور سائنٹفک رسالوں میں ان کے بلند پایہ و محققانہ مضامین نے سر آسوتوش مکرجی آنجہانی کو جو بنگال کے مشہور عالم علم دوست گزرے ہیں، اپنی طرف اس طرح متوجہ کیا کہ آنجہانی نے انہیں دولت و ثروت کے ایثار سے علم کی منفعت برداری کی ترغیب دی اور ان کے اصرار پر بیش مواجب سیول سروس چھوڑ کر جامعہ کلکتہ میں پروفیسر ہوئے۔ یہاں طبعیات میں تحقیقات کا خوب موقع ملا اور چند ہی سال میں ان کی علمی فضیلت نے نہ صرف سارے ہندوستان بلکہ یورپ و امریکہ میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ ۱۹۲۴ء میں جامعات کناڈا (امریکہ) کی دعوت پر وہاں گئے۔ پھر اٹلی کا سفر کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ہندوستانی سائنس کانگرس کی صدارت فرمائی۔ ہندوستان کی متعدد جامعات نے بہ حیثیت خصوصی پروفیسر ان کی علمی فضیلت سے فیض پایا۔ اور وہ اس وقت جامعہ کلکتہ میں پروفیسر طبعیات ہیں۔ اس کے علاوہ اعزازی طور پر جامعہ ہنود بنارس میں بھی اس مضمون کی پروفیسری کے فرائض ادا کرتے ہیں۔

پیوستہ اور گزشتہ نمبروں میں علامہ شمسی مرحوم اور حضرت امجد کے متعلق جو دلچسپ اور مفید مضامین اور تصاویر مجلّہ مکتبہ میں شایع ہوے انہیں قارئین کرام نے بہت پسند کیا اور ہماری کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سرزمین حیدرآباد کی متعدد دیگر علمی شخصیتوں کو جن کے کارنامے بلحاظ افادہ وعظمت ہر طرح لائق تعارف و مستحق تحسین ہیں، اسی طرح روشناس کرائیں۔ حیدرآباد میں ایسی کئی ہستیاں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے علم و کمال سے ملک کو فائدہ پہنچایا مگر اہل ملک کی غفلت و بے توجہی سے پھر بھی گوشہ گمنامی میں رہے۔ ہم ان کے متعلق ضروری مواد اور ان کی تصویریں فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ بہت جلد ہماری یہ مساعی بارور ثابت ہوں گی۔

اس نمبر میں ہم صدر مکتبہ ابراہیمیہ نواب بہادر یار جنگ کی جو تصویر شایع کر رہے ہیں وہ قدیم خاندانی درباری لباس میں ہے جو نواب صاحب معز کا فوجی امتیاز ہے۔ دوسری تصویر جناب راز چاند پوری کی ہے جو اس دور کے ایک خوش گو اور مقبول خاص و عام شاعر ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک خوبصورت مجموعہ "دنیائے راز" کے نام سے ابھی شایع ہوا ہے۔ اس نمبر میں اس پر تبصرہ بھی ہے۔



نواب بہادر یار جنگ بہادر ایم۔ ایل۔ سی (حیدرآباد)

و صدر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ

ذاتی اخلاق

(مسٹر سالٹر کے مضمون PERSONAL MORALITY کا ترجمہ)

از جناب رشید احمد صاحب حیدرآبادی

ذاتی ذمہ داری سے بڑھکر کوئی حیرت انگیز خیال نہیں اس خیال کا تعلق خاص ہماری ذات اور ہمارے ارادے سے ہے۔ ایک آواز غیب ہم سے کہتی ہے کہ اے انسان تجھے ایک کام دیا گیا ہے۔ تو اوروں کے ساتھ شامل نہیں۔ تو علیحدہ ہے۔ تیری ہستی وہ ہے جس کے مثل دنیا میں دوسری ہستی نہیں۔ تجھے وہ کام کرنا ہے جو دنیا میں دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ دنیا کے پردہ پر تیری ذات برگزیدہ ہے۔ پس تو اپنا آپ احترام کر۔ اپنا فریضہ بجالا۔ بغیر تیرے تیرا فریضہ کوئی نہیں بجالاسکتا۔

ذاتی اخلاق کا اولین سبق اپنی آپ عزت کرنا ہے۔ اخلاق کی تعریف بعض اوقات دوسروں کی ہمدردی اور خیال پر مبنی ہے لیکن جیسا کہ ماں، باپ، بہن، بیوی اور دوست احباب کا احترام ہم پر فرض ہے ویسا ہی اپنا احترام بھی ہم پر فرض ہے۔ اور جو وجوہ ان کے احترام و عزت کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں وہی ہمارے اپنے احترام و عزت کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں مجھے یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ کوئی میری عزت کرے جبکہ میں اپنی عزت آپ نہ کروں اور اپنے رکھ رکھاؤ اور آداب سے یہ ظاہر نہ کروں کہ مجھ پر اپنی ذمہ داری کس قدر ہے۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے اس کو ملحوظ رکھیں اور اپنی ذات کے متعلق اس امر کو نظر انداز کردیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم اپنی ذات کی حد تک جو چاہیں کر سکتے ہیں کیونکہ اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ جو شخص اپنی ذات کے متعلق ایسا خیال کرتا ہے کچھ عجب نہیں اگر وہ دوسروں کے متعلق بھی ایسا ہی خیال کرے کیونکہ دوسرے بھی تو اس کے مثل انسان ہیں اور جب وہ اپنی ذات کو فرائض سے بری الذمہ خیال کرتا ہے تو دوسروں کی ذات کو بھی ایسا ہی سمجھے حقیقت الامر یہ ہے کہ تمام انسان واجب الاحترام ہیں۔ ہر شخص کو ایک فریضہ سپرد کیا گیا ہے۔ بیشک ہر شخص کو انفرادی اور خصوصی طور پر اور اس طرح پر کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، یہ فریضہ بالکل علیحدہ اور انفرادی طور پر انجام دینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا امور ہیں جن کے لئے ہم اپنی ذات سے ذمہ دار ہیں اور جو خاص ہمارے

منشا کے تحت ہیں پہلی چیز ہماری اپنی عادات ہیں اور ان عادتوں سے سوائے ہمارے کوئی دوسرا واقف نہ ہو لیکن ہم ان کے لیے ایسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے تمام دنیا ان سے واقف ہو۔ ہماری ذمہ داری محض اس لئے نہیں ہے کہ ان کے اثرات دوسروں پر پڑتے ہیں بلکہ اس لئے کہ خود ہم ان کے زیر اثر ہو جاتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ عمدہ عادات اختیار کریں کہ یہ انسان کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اپنی آپ نگرانی کریں اپنے نفس کو قابو میں رکھیں اور اپنے جسم اور روح، ظاہر و باطن، دونوں کو پاکیزہ رکھیں۔ مجھے کسی شخص کی عادات ظاہری و باطنی معلوم ہوں تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ شخص واقعی اپنا اپنی عزت کرتا ہے یا نہیں۔ اور جو اخلاق وہ برت رہا ہے محض نمایشی ہیں یا خود اس کی سرشت بن گئے ہیں۔ ایک شخص کے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ وہ تنہا بھی اگر دستر خوان پر بیٹھتا تو انہیں آداب کو ملحوظ رکھتا جنہیں وہ اپنے دوستوں کی موجودگی میں بجا لاتا۔ اس کی یہ عادت درست تھی۔ کیونکہ ان موقعوں پر جو آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں وہ بحیثیت بنی انسان دستر خوان پر بیٹھنے کے ہوتے ہیں اور ان کی تعداد کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ ہماری عادات ہماری انسانیت کو ظاہر کرنے والے ہوں ہم کو چاہیئے کہ زیادہ کھانے پینے سے پرہیز کریں کہ یہ حیوانیت ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی اشتہاؤں کو قابو میں رکھیں کہ ثبات عقل انہیں سے ہے۔ جسم کی عزت کریں کہ ہمارا جسم ہماری انسانیت کا گہوارہ ہے۔ ہمارے ہر برے فعل، ہر اظہار جذبات، زندگی کی ہر افراط و تفریط اور جسم و روح کی عدم پرداخت سے اس عمدہ انسانیت کی جو ہم میں موجود رہتی ہے اور جو ہماری ذات اور رویے سے ظاہر ہونی چاہیئے تذلیل ہوتی ہے۔ اور ہم بحیثیت انسان انسانیت کے درجے پر پہنچنے کے بہائم کے درجے میں تنزل کر جاتے ہیں۔

دوسری چیز جس پر ہمیں اختیار حاصل ہے وہ ہماری زندگی کے مقاصد ہیں۔ اچھے مقصد اور برے مقصد کے انتخاب کا دارومدار ہمیں پر ہے۔ گو ہمارے افعال ظاہری مجبوری کے تحت ہوں لیکن ہماری شخصیت کا قلعہ اور مرکز ہماری قوت ارادی ہے جس کے ہمیں ہم مالک و مختار ہیں۔ ایسی زبردست قوت کو اپنے قبضے میں رکھ کر چاہیں تو ہم اعلیٰ و ارفع مقاصد کی طرف رجوع ہوں یا ادنیٰ و اسفل کی طرف۔ یا اگر چاہیں تو کوئی ارادہ ہی نہ رکھیں۔ اور صرف زندگی کی رو میں بہے چلیں۔ لیکن کسی ایک مقصد کے ہو رہنا بغیر مقصد کے رہنے سے اچھا ہے۔ اور اعلیٰ مقصد ہی انسان کے لیے زیبا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینا ہے۔ دوسرے جوابات جو عموماً دیئے جاتے ہیں وہ یا تو خیالی ہیں یا لایعنی ایک جواب اپنی روح کی نجات ہے لیکن کون کہے گا کہ یہ اعلیٰ مقصد ہو سکتا ہے۔

ایک جواب خدا کی تمجید اور اس کی محویت ہے لیکن یہ جواب ناقابل عمل نظر آتا ہے۔ ایک جواب فرمان خدا کی تعمیل ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فرمان خدا کیا ہے۔ فرمان خدا کی تعمیل مذہبی تاریخ میں اعلیٰ ادنیٰ، شیطانی اور خدائی تمام مقاصد پر محیط ہے۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینا البتہ ایک مقصد ہے جس کو انسان اپنا مطمح نظر قرار دے سکتا ہے۔ سب کو اپنی زندگی سے محبت ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اسی اعلیٰ منزلت پر دیکھیں۔ ہم کو اپنی زندگی سے خالص محبت ہے اس اعتبار سے نہیں کہ جو کچھ وہ ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینے کا مقصد ایسا ہے جو تاجر، وکیل، ڈاکٹر، ماں، بچے، مزدور وغیرہ سب سے ممکن ہے۔ گو اس مقصد کی سعی میں بالکل قلیل حصہ لیا جاتا ہے لیکن اس کو واجب العمل بنایا جا سکتا ہے۔ مقصد ہی ایسی چیز ہے جس کے لیے ہم ذمہ دار ہیں اور جس کی بدولت ہم اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کو اہمیت دے سکتے اور اپنی بے اثر کوششوں کو مقبول بنا سکتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ اپنی مصروفیتوں پر وقتاً فوقتاً نظر ڈالتے رہیں اور دیکھیں کہ یہ مقصد ہماری مصروفیتوں میں کس قدر حصہ لے رہا ہے۔ کیا وہ کام جو ہم کر رہے ہیں اور وہ زندگی جو ہم کر رہے ہیں انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام کی طرف لیجا رہی ہے اور آیا ہمارے کام اور ہماری زندگی پر سب لوگ عمل پیرا ہوں تو زندگی کا اعلیٰ نظام ممکن الحصول ہے۔ تاجر خود سے سوال کرے کہ تجارت کے اصول کیا ہیں اور اگر یہ اصول وہ نہیں ہیں جو ہونے چاہیئیں تو کیا وہ ان اصول کو نہ بدل کر ان کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے یا بدلنے کی کوشش میں ہے وکیل اور ڈاکٹر اپنے پیشوں کے متعلق خود سے سوال کریں کہ اعلیٰ مقصد ان کو برائیوں سے بچا کر ان کے پیشوں کو ہر ممکن طریقہ سے اعلیٰ و ارفع بنانے میں مدد دے رہا ہے یا نہیں۔ ماں خود سے سوال کرے کہ آیا وہ اپنے بچے کی تربیت اس طریقے پر کر رہی ہے کہ وہ دنیا میں بڑا ہو کر ایک نئی ہستی ہوگا یا یہ کہ قدیم رسم و رواج منافرت اور ریاکاریوں میں حصہ لے گا۔ بچہ بھی وفاداری اور بہادری کے کارناموں سے سبق حاصل کرے اور خود سے سوال کرے کہ کیا وہ بھی کوئی نئی بات پیدا کر سکتا اور کیا مصیبت اور اہل دنیا کی تحقیر پر صبر سے کام لے سکتا ہے۔ مزدور خود سے سوال کرے کہ اس کی اصل غرض کیا ہے اور اگر اس غرض پر عام طور پر عمل پیرا ہو جائیں تو کیا زندگی کا اعلیٰ نظام حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا وہ صرف اجرت کی خاطر کام کر رہا ہے یا یہ کہ اس کو اپنے بے لاگ باضابطہ کام سے دلچسپی ہے اس کا صرف دنیا کی تبدیلیوں بلکہ تبدیلیوں سے بھی بڑھکر انقلابات کا مطالبہ محض انصاف کے خیال پر مبنی ہے۔ یا انتقام و حسد کی خاطر بے روزگار مزدور

بھی اس مقصد سے آپ کو باہر نہیں کر سکتا۔ کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی وہ صبر سے کام لے کر آپ کو ارتکاب جرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ گو لوگ اس کی توہین و حقارت کریں وہ ان کی توہین و حقارت نہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک کرنے پر موت کو ترجیح دے۔ ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے یہ مقصد کارآمد ہے بڑوں کو یہ انکسار کا سبق دیتا ہے چھوٹوں کو حصول عزت کا۔ اور ان دوسرے مقاصد جو بالکل گرے ہوئے ہیں اور جن پر آسانی سے کاربند ہو سکتے ہیں بلند تر ہے۔ اگر لوگوں کا مقصد زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے واسطے کمائیں تو اس مقصد میں انسانیت نہیں ہے حیوانوں کا بھی یہی مقصد ہے۔ آدمی صاحب عقل صاحب شعور اور صاحب اخلاق ہے اور انصاف کی علمداری کے لئے کوشاں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے اعزاز و مرتبہ کو بھول جائے مساعی سے منھ پھیر لے ضمیر کو بدل ڈالے بلند خیالات سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اعلیٰ وارفع فہم و ادراک کو صرف اپنے لئے کما لینے پر محدود کرے۔ اور اس نفس پروری اور سفاوت سے بیوی بچوں کا بھی لحاظ نہ کرے۔ اے دوست تو اپنے خیالات کو اس قعر مذلت سے نکال اور سوچ تو سہی کہ تو کیا ہے۔ اپنے دل اپنے خیال اور اپنے ضمیر کو بلند مقصد سے منور کر کہ باوجود قارون کا خزانہ جمع کرنے کے تو خود کو تباہ کر رہا ہے۔ اور بجائے بلندی کی طرف جانے کے پستی کی طرف جا رہا ہے ہمیشہ جوان رہنے کے بیر فرتوت بن رہا ہے۔ اور اپنی زندگی کو سود و زیاں کی حد تک محدود کیے ہوئے ہے جبکہ وہ بلند کام اور نیک امور کی بجا آوری میں صرف کیجا سکتی ہے۔

قدیم مذہب کا ایک لطیف جملہ ہے "تو پھر پیدا ہوگا" یہ مذہبی عقیدہ جو اس جملہ سے اخذ کیا گیا ہے بے معنی اور عجیب و غریب نہیں بلکہ اس کے اندر ایک بڑی سچائی مضمر ہے اس جملہ سے مقصد اعمال کی اصلاح ہیں اور نہ فلاں فلاں عادت کا اختیار کرنا اور نہ کوئی ظاہری تبدیلی ہے بلکہ زندگی کے سرچشموں کی جدید قوت ہے نئے اور جدید ارادے کی فتح خیالات کی تبدیلی اور جدید عزم کا انقلاب ہے۔ اس عزم سے ہمارے جملہ فرائض قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ یہاں قدیم مذہب سے تفاوت صرف اس قدر ہے کہ قدیم مذہب کی رو سے یہ عزم خدا کی دین ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عزم ہمیں خود کرنا چاہیئے۔ ہم اس کے لیے رجوع و سجود نہیں اختیار کرتے بلکہ ہم کمر باندھتے اور عزم بالجزم کرتے ہیں۔ گو ہماری پرانی فطرت کو ہم میں ودیعت ہے فوراً آمادہ ہو اور ہماری قدیم خامیاں اور قدیم عادات مورچے نہ چھوڑیں لیکن بتدریج ہم ابھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس قدر تعلق سے جس کا تسلط تمام دنیا پر ہے اور جو

انسان کی مدد کرتا ہے ہمارا تعلق صرف اس عقیدہ کی حد تک ہے کہ وہ ہمارے اوپر نیچے آگے پیچھے سب طرف سے اور اپنی قوت ہم کو دے رہا ہے۔ ہم اپنے امکان کی حد تک جو چاہیں خود ذات سے کر سکتے ہیں ہماری زندگی کا اہم ترین مقصد یہی نہیں بلکہ ہمارے افعال میں ہماری نیت بھی ہمارے تابع ہے۔ اور اس کی اصلاح کے ہم ذمہ دار ہیں۔ یہاں اس اخلاقیات کو جس کی بنا محض افعال کے نتائج پر قایم کی جاتی ہے ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک کام کے نتائج ایک ہی ہوں لیکن کبھی اس میں اخلاقی خوبی پنہاں رہتی ہے کبھی نہیں۔ ایک غریب آدمی کو اگر ایک ڈالر دیا جائے تو وہ اس کے آذوقہ کے لئے کام آئے گا خواہ وہ ڈالر محض اس کو ٹالنے کے لئے دیا جائے یا اس کی ہمدردی کی غرض سے اگر ٹالنے کے لئے دیا گیا ہے تو اس میں اخلاقی خوبی کہاں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہماری اخلاقی خوبی کہاں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہماری اخلاقی خوبی سوائے ہمارے تمام دنیا سے پوشیدہ رہی ہے لیکن اس کا اثر ہمارے تمام خیالات پر پڑتا ہے۔ نظریۂ اخلاقیات میں میں نتائج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے افعال محض ظاہری اخلاق کی حد تک نہیں بلکہ ان میں نیت بھی راست رہنی چاہیئے کیونکہ راستی اور عدم رہتی سے افعال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ایک کام راست وہ ہے جو بنی انسان کے لئے مفید ہو اور جس کے نتائج عملی طور پر فایدہ مند ہوں۔ اخلاقی خوبی کا کام وہ ہے جس میں نیت بھی بنی انسان کی بھلائی کی رہے۔ خالی راستی پر رہنا کافی نہیں بلکہ ہماری نیت بھی راست رہنی چاہیئے۔ اور اسی پر ہمارے اخلاق کا دارومدار ہے۔ انسان کی اصلی زندگی نمایشی نہیں بلکہ پوشیدہ ہے جو کچھ ہم ظاہر میں دیکھتے ہیں وہ نتائج ہوتے ہیں۔ اصل اسباب ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ دنیا ظاہر کو دیکھتی اور اس پر مطمئن ہوجاتی ہے اور ہم خود بھی دنیا کے معیار کو آسانی کے ساتھ قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن جب حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا معیار سطحی ہے۔ گو ہمارے ناپاک خیالات، ہمارے عنادات، رشک وحسد، کم ظرفی، تنگ خیالی وغیرہ سے کوئی نہیں واقف ہوتا لیکن دراصل یہی خرابی کا باعث ہیں۔ ہاں دل اور باطن پاک رہے۔ اور ہم اپنی نظر میں ایسے ہی پاک باطن نظر آئیں جیسے ہم دنیا کو بتانا چاہتے ہیں۔ خود غرضی ہم سے دور اور دنیا کی محبت دل میں معمور ہو۔ اور اگر ہم دوسروں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں تو یہ غصہ کی بنا پر ہو۔ اگر وہ ہم سے برائی کریں تو ہم کو ان سے عداوت نہ رہے اور اگر وہ ہم کو ستائیں تو ہم انہیں پلٹ کر نہ ستائیں۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ سب سے بڑھکر احتیاط و نگرانی اپنی ذات کی کرے کیونکہ کسی کے دل کے اندر کوئی دیکھنے نہیں آتا، میرا خیال ہے کہ ہر شخص صبح اٹھ کر کہے "آج میرا دل

نیک خیالات کا خیر مقدم کرتا ہے۔ میرا ہر کام انہیں کی اتباع میں ہوگا۔ میں عداوت، حسد، مکروفریب اور حرص کو اپنے سے دور کرتا ہوں۔ کوئی لفظ میری زبان سے ایسا نہ نکلے گا اور کوئی کام میں ایسا نہ کروں گا جس کی صداقت، محبت اور عزت اجازت نہ دے۔" بہ نسبت نیت کے افعال پر ہم آسانی کے ساتھ قابو پا سکتے ہیں۔ ایک نادرست خیال کو دماغ میں آتے ہی فوراً دور کرنے اور ایک ناپاک ارادہ کو فوری دبانے کے لئے بڑی جدوجہد احتیاط اور مشق کی ضرورت ہے۔ اور جب تک کہ ارادہ قوی اور طبیعت پر قابو نہ ہو یہ ممکن نہیں لیکن یہ ہمارا فرض ہونا چاہئے اور یہ یاد رہے کہ آسانی کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا بڑی بات نہیں۔ عاجز ہو کر زبردست کا مقابلہ کرنا اور پیہم شکست کھا کر ہمت نہ ہارنا یہ مردانگی کا شیوہ ہے۔ گو جسم کمزور اور دل ناتوان ہے لیکن ارادہ قوی ہے تو یہ عالی ہمتی ہے۔ اور ایسی لڑائی پر ملائک خود حیرت اور تعجب کریں تو جائے تعجب نہیں۔ ہیسیاڈ کہتا ہے کہ نیکی کے مندر کے سامنے امرٹ دیوتاؤں نے مشقت کو کھڑا کر دیا ہے اور صفت کا راستہ بہت دشوار اور لمبا رکھا۔ دنیا میں کوئی اچھی چیز ایسی نہیں جو مانگتے ہی مل جائے۔ ہمارا وجود شاہد ہے کہ ہم نامکمل بنائے گئے۔ تکمیل ہمارے ہاتھ ہے۔

یہ خالی از تعجب نہیں کہ ماضی کی ہر مذہبی تحریک ذاتی راستبازی کے ایک نئے خیال کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے۔ چنانچہ قدیم عبرانیوں میں اصل مذہب وجود میں آیا تو ان کے پیامبر کی دعا یہ تھی۔ "مجھے ایک صاف دل عطا کیجیو اور مجھے راستی کی طرف ہدایت کیجیو۔" عیسیٰ کی دعا اپنے زمانے کے دیگر مذاہب کے مقابلے میں اور زیادہ درستی کے لئے تھی۔ لوتھر نے جب آپ کو مذہب ماضی کی جکڑ بندی سے آزاد کیا اور ضمیر کو شمع ہدایت بنایا تو اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ نیک کام بھی بد ہو جاتا ہے اگر نیت بری رہے۔ تو آج حریت سے ایک مذہب کی ابتدا ہونے کے امکان میں مجھے شک صرف اس وجہ سے ہے کہ فرقہ احرار کی توجہ انسانی حقوق پر ہے۔ انسانی فرائض پر نہیں۔ سوسائٹی کی اصلاح اس کے پیش نظر ہے۔ اپنی اصلاح پیش نظر نہیں۔ ایمرسن کا یہ قول وہ بھولے ہوئے ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر نفس خود اپنی اصلاح نہ کرے۔ جان سی لرنڈ کہتا ہے کہ وہ لوگ جو خود غلطی پر ہیں برائیوں کی اصلاح نہیں کر سکتے ہمیں چاہیئے کہ آپ کو سدھاریں۔ دنیا پر نظر نہ کریں بلکہ خود سے سوال کریں کہ ہم کیسے ہیں۔ اور اگر ہم سیہ کار ناپاک، حاسد، تنگ حوصلہ، غیر متحمل، دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والے ہیں تو دنیا کی اصلاح کو چھوڑ کر پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

لیکن زندگی عمل ہی عمل اور فریضہ کی جدوجہد کا نام نہیں بسا اوقات صبر و تحمل اور شکیبائی میں جدوجہد ہے

ہم کو شدید معرکہ آرائیاں اپنی بے صبری اور ان مصائب سے کرنی پڑتی ہیں جنہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اکثر ان مصائب میں ہم تنہا ہوتے ہیں۔ ہمارا ہمدم و غمخوار کوئی نہیں ہوتا۔ اور ہم ان کے متعلق کسی کو کہہ بھی نہیں سکتے۔

میرا خیال ہے کہ زندگی میں ہم پر جو کچھ بیتا پڑتی ہے وہ ہماری برداشت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بظاہر ہمیں مصیبت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن ہم اسے برداشت کر سکتے ہیں۔ گو ہمیشہ صحت و تندرستی ہمارے بس کی نہیں لیکن طبیعت ہمارے بس کی ہے۔ ہم دوستوں کی وفات کا غم سہہ سکتے ہیں۔ ہم ان کی بے وفائی اور احسان فراموشی برداشت کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہماری امیدیں بر نہ آئیں۔ تو اس کو بھی ہم بغیر تلخی اور ترشروئی کے فراخ حوصلگی کے ساتھ سہہ سکتے ہیں۔ ہمارے وجود کی علت غائی ان چیزوں میں نہیں جو ہم سے جدا کر لی جائیں۔ خوشحالی میں یہ مضمر نہیں اور نہ دوستوں کی صحبت، اعزاز، منزلت اور گھر دار کے تعلقات میں اس کی بجا آوری لازمی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ مصیبتوں کے باوجود بھی اس کی تکمیل کی جا سکتی ہے

اے انسان۔ تیری قابلیت تیرے اندر پوشیدہ ہے۔ ہاں تیرے صابر نفس تیرے مصمم ارادے اور تیرے اس کام کو پامردی و ایمانداری کے ساتھ بجا لانے میں جو تجھے دیا گیا ہے خواہ اس کی بجا آوری میں تجھ کو رنج اور مصیبتوں سے سابقہ پڑے یا مسرت و راحت سے بس یہی ہمارا امید ان کل ہے۔ سقراط سے پوچھا ہم نہیں جانتے کہ ہمارا انجام کیا ہونا چاہیئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے بہترین کیا چیز ہے ہم نہیں جانتے کہ وہ کونسی شئے ہے جو اوصاف الوہیت کو باہر رکھ سکتی ہے۔ غریب گارفیلڈ کا قول ہے کہ کامل صحت اور کامل مسرت ہم کو نہیں رہتے۔ اور جیسا کہ جزر سے ساحل کی اصلی علامات اور سمندر کے دامن کا حال معلوم ہوتا ہے ویسا ہی دکھ بیماری اور کمزوری میں انسان کے اصلی کیریکٹر کا پتہ چلتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ اپنے ایک دوست کے متعلق لکھتا ہے۔

اس کا جسم کمزور تھا۔ اور اس کی طبیعت پست۔ میں نے اس کے لئے صحت، کامیابی اور شہرت کی دعا کی لیکن میں اب نہیں چاہتا۔ کیونکہ یہ خود آپ اپنا صلہ ہیں اور ان سے نیکی کی توقع نہیں۔ یہ ہم کو زلاتے اور ہم میں شقاوت پیدا کر دیتے اور ہماری حیا اور صاف طینتی اور نرم دلی کو کم کر دیتے ہیں۔ ایمرسن تو یہاں تک کہتا ہے "مصیبت نام ہے بڑے آدمیوں کی ترقی کا" اور اگر یہ بات ہم پر شاق گزرتی ہے تو ہم کسی حوصلہ مند مرد یا عورت کو جوانمردی اور صبر کے ساتھ مصیبتوں کا مقابلہ کرتے دیکھیں پھر اس کو شاق محسوس نہیں کریں گے۔ اے دوست اگر تو پریشانی میں ہے اور زمانہ تیرا مساعد نہیں۔ اور تیرا مدعا تجھ سے دور ہے

تو ناامید نہ ہوجیو۔ اور یہ باور نہ کریجو کہ تو قسمت کے راستے پر نہیں اور دنیا نے تیرے لئے کوئی راستہ چلنے کے لئے نہیں بنایا۔ پیشتر سے بنایا ہوا راستہ ادائی فریضہ کا تیرے لئے موجود ہے۔ گو جدوجہد کی ضرورت اس میں نہ ہو بلکہ تیری برداشت کا امتحان ہو تو اپنی انتہائی پامردی سے برداشت کے جوہر دکھا۔ اس وقت تجھ سے بڑھکر فریضہ کی ادائی میں مرد میدان کوئی نہ ہوگا۔ (باقی)

لا الیٰ ھٰؤلاء ولا الیٰ ھٰؤلاء

از

حضرت امجد حیدر آبادی

کامل نہ جہالت ہے، نہ آگاہی ہے
سودا ہے گدائی، نہ سرِ شاہی ہے
سر ڈھانکتا ہوں، تو پاؤں کھل جاتے ہیں
کیا جامۂ زندگی کی کوتاہی ہے
یہ نقشِ حیات، موت سے بدتر ہے
ہر سانس میں اک چھپا ہوا خنجر ہے

رباعی

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے
دن رات، یہ شمع زندگی جلتی ہے
ہے وجہ حیات، آمد و رفت نفس
یا عمر کے حلق پہ چھری چلتی ہے؟

عارف کو قدم قدم پہ حیرانی ہے
کیا مقصد زندگی پریشانی ہے
کس سے کہوں، آہ کیا پریشانی ہے
اس راہ میں عقل بھی تو دیوانی ہے
ہر شام عبث تھی، ہر سحر لا حاصل
ہر کسب، فضول، ہر ہنر لا حاصل
افسوس کہ زندگی کا حاصل نہ ملا
زندہ رہے ہے، عمر بھر، مگر لا حاصل

ہر وقت دل ستم زدہ طوف میں ہے
اک پاؤں اُمید میں ہے، اک خوف میں ہے
ہم ٹوٹ ہی سکتے ہیں، نہ جڑ سکتے ہیں
گڑ سکتے ہیں قبر میں، نہ اُڑ سکتے ہیں
اس دو عملی میں زندگانی ہے تباہ
لب پر کبھی لا الٰہ، کبھی الا اللہ
منزل ہی نہیں یہاں اقامت کے لئے
بستر ہی نہیں ہے، خواب راحت کے لئے
کہتا ہے ہر اک مقام، آگے بڑھئے
سمجھے نہ کہیں قیام، آگے بڑھئے

رباعی

حاصل نہیں جس کا، وہ تگ و تاز ہے یہ کھلتا نہیں، کھل کر بھی، عجب راز ہے یہ
ملتا نہیں کوئی انتہائی نقطہ کہتا ہے ہر انجام، کہ آغاز ہے یہ

رباعی

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں، کوئی مسافر کے لئے سمجھا تھا جسے مقام، رستہ نکلا
اتیھر کی طرح، فضا میں آوارہ ہوں ضدی بچے کا گویا گہوارہ ہوں

ہر آن چلا جاتا ہے ہنسنا رونا ممکن ہی نہیں ہے ایک کروٹ سونا
معجون سرور و دردمندی ہوں میں مجموئہ پستی و بلندی ہوں میں
بیداری و خواب میں مذبذب ہوں میں موت اور حیات سے مرکب ہوں میں
گاہے در صحو، گہہ مستی ہستم گہہ رُو بعُلو، گاہ بہ پستی ہستم
یک پا بہ سفر دارم، یک پا بہ بہشت من خیر بہ شر عجیب ہستی ہستم

منزل نہیں معلوم، مگر چلتا ہوں قالب کی خبر نہیں، مگر ڈھلتا ہوں
دل، سینے میں بے سبب دہل جاتا ہے چپکے سے کلیجہ کوئی مل جاتا ہے
ہر دم، کروٹ دل تپاں لیتا ہے یہ کون، جگر میں چٹکیاں لیتا ہے

رباعی

سوتا ہوں، تو چپکے سے جگا دیتا ہے جب جاگ اُٹھتا ہوں، پھر سُلا دیتا ہے
ہنستے کو رُلا دیتا ہے، چٹکی لیکر روتا ہوں، تو پھر ہنس کے، ہنسا دیتا ہے
اس کی میری موافقت مشکل ہے رباعی عبد اور رب میں مناسبت مشکل ہے
ہے جس کا کمال، کُلّ یومٍ فی شان ایسے مالک کی عبدیت مشکل ہے
شکوہ اس کے غضب کا کرتا بھی ہوں رباعی ہر سانس میں پھر دم اس کا بھرتا بھی ہوں
مالک میں مرے، مہر بھی ہے قہر بھی ہے مرتا بھی ہوں اُس پہ، اُس سے ڈرتا بھی ہوں

مذاق کی قیمت

از

جناب محمد باقر صاحب کرمانی متعلم نظام کالج

یوسف محکمہ تفتیش کا ایک زبردست سراغ رسان تھا۔ دس سال ہوئے اس نے دفعتہً ملازمت ترک کردی تھی۔ اور اپنے پیشے سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ اٹھا لیا تھا پبلک کو اس کا بہت افسوس ہوا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یوسف جیسے سراغرسان کی کمی قابل تاسف ضرور تھی۔ تین چار سال سے محمد عالم سے اس کی دوستی ہوگئی اور اب وہ ایک دوسرے کے دلی دوست اور دلی ہمدرد تھے۔

"بھائی یوسف" محمد عالم نے کہا: "تمہارا ملازمت سے یکایک علحدہ ہوجانا ایک ایسا مسئلہ ہے جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور میری ہی سمجھ پر کیا موقوف ہے ہر ایک کو پریشان کر رکھا ہے"۔

"عالم۔ تمہارا یہ سوال" یوسف نے کہا "زمانہ گذشتہ کی دل دکھا دینے والی یاد کو تازہ کردیتا ہے"۔

"تم ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا کرتے ہو" عالم نے اصرار کرتے ہوئے کہا "مگر آج تمہیں ضرور بتانا ہوگا"

"تم کیوں اصرار کرتے ہو" یوسف نے کہا: "اس کا سبب ایسا ہے کہ اس کے سننے سے تمہارا دل دہل جائے گا"

"نہیں نہیں۔ تم ضرور بیان کرو" عالم نے کہا۔

"اچھا! جب تم اس قدر مصر ہو تو خیر میں اس خون چکاں داستان کو بیان کئے دیتا ہوں" یوسف نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"گو آج تک میں نے اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کیا تھا مگر چونکہ مجھے تم پر کامل بھروسہ ہے اس لئے کہے دیتا ہوں سنو"۔

"میں جب کالج میں تعلیم پا رہا تھا" یوسف نے کہنا شروع کیا "میرے دو ہم جماعت تھے۔ نیاز اور بشیر۔ ہم تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ ہم مڈل اسکول سے باہم پڑھتے آرہے تھے۔ ہماری دوستی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ اور لڑکے ہم کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کالج کا زمانہ یوں توں کرکے گذر گیا جب ہم نے

عملی دنیا میں قدم رکھا اور معاش کی فکر دامنگیر ہوئی تو بشیر اور میں یہیں ملازم ہو گئے۔ مگر افسوس کہ نیاز کو کوئی ملازمت نہیں ملی اور وہ مجبوراً ہم سے جدا ہو کر لکھنو روانہ ہو گیا۔ اس کو کئی سال گذر گئے۔ چونکہ مجھے سراغرسانی کا بہت شوق تھا میں نے جاسوسی کا پیشہ اختیار کر لیا اور بشیر ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ ایک دن میں مکان پر تھا کہ مجھے ایک خط ملا۔ یہ خط اسی زمانے کے میرے بچھڑے ہوئے دوست نیاز کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ اب لاہور لوٹ آیا ہے بشیر اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

یوسف نے جیب سے دو سگار نکالے ایک عالم کو دیا اور دوسرا خود سلگا کر دو تین کش لئے اور پھر کہنا شروع کیا۔

"میں اس خط کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ بچپن کا ساتھی دلی دوست اور پھر ایک زمانہ کا بچھڑا ہوا لوٹ آیا تھا بہر حال میں اسی وقت بشیر کے مکان پہنچا۔ بشیر کو بھی ایک خط اسی مضمون کا وصول ہوا تھا۔ ہم دونوں خوش خوش اس کے خود نوشتہ پتہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ مکان شہر سے بالکل علیحدہ تھا۔ آبادی سے دور ایک مقام پر اس نے ایک عالی شان مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مکان نہایت وسیع تھا۔ ملازم بھی کئی تھے۔ آخر کار ہم نے خبر دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ باہر آیا اور ہم سے گلے ملا۔ گو وہ مجھ سے چھوٹا تھا مگر اب وہ مجھ سے زیادہ ضعیف معلوم ہو رہا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے واقعات بیان کئے۔ نیاز نے کہا کہ وہ یہاں سے لکھنو روانہ ہوا تھا۔ وہاں پر اس نے ایک کان میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے اپنی دیانت داری اور سچائی سے اس کان کے مالک کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ کان کا منیجر بن گیا۔ اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں بعد کان کا مالک انتقال کر گیا اور وہ خود اس کان کا مالک ہو گیا۔ اس نے وہاں پر شادی کی تھی مگر اس کی بی بی بہت جلد مر گئی کوئی اولاد نہ تھی اس کے بعد اس نے اور شادی نہ کی۔ اب وہ بہت بڑا مالدار آدمی تھا۔ کان کو ایک منیجر کے حوالے کر کے وہ یہاں چلا آیا تھا۔ اور اپنے زندگی کے دن آرام و راحت میں بسر کرنے لگا۔"

یوسف اتنا کہہ کر رک گیا۔ اُس کی آواز بھر آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر کہنا شروع کیا:

"بشیر اور میں اکثر اوقات سارا سارا دن اس کے پاس گذار دیتے تھے۔ مجھے گو فرصت ملتی ہی بہت کم تھی مگر پھر بھی فرصت کا زیادہ وقت اس کے مکان پر گذارتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک واقعہ بیان کیا جب نیاز نے شروع شروع ترقی کرکے زینے چڑھ رہا تھا تو اس کی اور اس کے ایک اعلیٰ بالادست عہدہ دار کی ان بن ہو گئی۔ اُس نے چاہا کہ نیاز کو علیحدہ کر دے مگر مالک کی نظرِ عنایت اس کے شاملِ حال تھی،

کچھ نہ کر سکا جب نیاز میجر بنا تو اس نے اپنا بدلہ لینا چاہا۔ موقع پا کر اس کو پولیس کے ہاتھوں پھنسا دیا جب وہ قید سے چھوٹا تو وہ بھی موقع کا منتظر تھا۔ ایک مرتبہ نیاز کو تنہا پا کر اس نے حملہ کر دیا مگر نیاز بال بال بچ گیا اور اتفاق سے ایک پولیس انسپکٹر اس طرف آنکلا اور اس نے حملہ آور کو گرفتار کر لیا چونکہ وہ ایک مشہور آدمی تھا لہٰذا اس کے لئے دوبارہ تین سال کی قید بامشقت تجویز کی گئی اور وہ قید کر دیا گیا۔ گو اس واقعہ کو آج چار سال ہو چکے تھے مگر اب بھی نیاز اس کے نام سے کانپنے لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "اگر وہ چھوٹ جائے اور اس کو پاسکے تو پھر اس کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اکثر جب کبھی اس کا نام لیا جاتا تو نیاز کے دل اس پژمردہ ہو جاتے اور رنگ زرد ہو جاتا۔" یوسف دم لینے کے لئے رک گیا۔ پھر اپنی تقریر کو یوں جاری کیا۔

زمانہ گزرتا گیا اور ہم ہنسی خوشی سے رہا کرتے تھے۔ صرف اس کا ہی ایک ایسا خیال تھا جو نیاز کو پریشان کرتا تھا۔ ہم اس شخص کے نام سے خوف زدہ ہوتے چلے تھے۔ ہم نے عبدالستار کو جو ہمارا دوست تھا نیاز کا معتمد بنا دیا۔ ایک صبح میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ملازمہ نے ایک خط لا کر نیاز کے حوالے کیا۔ میں نے دیکھا لفافہ کے ایک سرے پر "اشد ضروری" لکھا تھا۔ نیاز تھوڑی دیر خط کو گھورتا رہا۔ خطوط اس کے پاس بہت کم آیا کرتے تھے اس لئے جلد جلد لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا۔ میں اس کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ میں بہوش اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ آخرکار اس نے رومال سے پسینہ پونچھا اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے خط کو میری طرف بڑھا دیا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔

اعظم ..... کے پاس سے۔ نہیں، ناممکن ہے وہ اب تک مر چکا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے وہ ضرور انتقام لے گا۔ ..... اور شریر ..... بدمعاش ..

میں نے خط پڑھا۔ مضمون یہ تھا:

"تم نے میری جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اب میری باری ہے۔ میں نے تمہاری تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھانی۔ آخاہ۔ اب تم مل گئے۔ ایک مدت سے انتقام کی آگ میرے سینے میں مشتعل تھی۔ اب اس کے ٹھنڈا کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کل رات کے ..... دس بجے ..... تم ..... مار ڈالے جاؤ گے۔ کیسی ہی کوشش کرو مگر اب میرے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ خوب جان لو کہ فیصلہ اٹل ہے۔" "اعظم"

یہ وہی نام تھا جس سے نیاز کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور روح فنا ہو جاتی تھی۔ میں نے خط کو میز پر رکھ دیا۔ نیاز مٹھیاں کسے کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ سر نیچے کی طرف جھکا ہوا اور چہرے سے پریشانی اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے آخر اس کو دلاسا دینے کے لئے کہا:

"ممکن ہے کہ یہ صرف ایک دھمکی ہو اور سرمایہ دار حقیقت نہ ہو" مگر اس نے سر ہلایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ دھن کا پکا اور بات کا دھنی ہے۔

یوسف دم لینے کے لئے رک گیا۔ دو تین گھونٹ پانی کے پئے پھر اپنی تقریر کا سلسلہ یوں شروع کیا (عالم خاموش بیٹھا اس داستان کو سن رہا تھا)

"اس وقت وہ بیخودی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے خیر تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ ضرور رنگ لائے گا۔ میں ایک نہ ایک دن اس کا بدلہ لونگا۔ ہاں میں خاموش رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں اس کا بدلہ لونگا اور ضرور لونگا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کے الفاظ تھے جو وہ پریشانی کی حالت میں دہرا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی اور تشفی دی اور کہا کہ اس کا سب کچھ انتظام ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

مجھے اس وقت ایک ضروری کام پر جانا تھا اس لئے میں نیاز سے شام میں ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل اداس تھا اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں شام میں بشیر کے ساتھ نیاز کے مکان پہنچا۔ نیاز کے معتمد عبدالقادر سے ملاقات ہوئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ نیاز سارا دن گھر سے باہر نہیں گیا۔ مغموم اور محزون کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ہم اس کمرے میں داخل ہوئے۔ میز کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھے وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا ہم نے بہت کچھ تسلی او تشفی دی۔ کھانا بھی ہم نے اسی کے ساتھ کھایا۔ اس کی خوابگاہ میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ گھڑی نے دس بجائے۔ نیاز اس آواز سے چونک اٹھا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ بیساختہ نکل گئے۔

"اُف میری زندگی کے اور صرف چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے۔ ابھی ہم کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ وہی ملازمہ پھر داخل ہوئی اور اس بے وقت آنے کی معافی چاہتے ہوئے ایک خط نیاز کی طرف بڑھا دیا۔ نیاز نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا جلد جلد اس کو پڑھنے لگا۔ اس وقت اس کے

چہرے پر مردنی کے آثار ظاہر تھے۔ خط اسی شخص نے دوبارہ لکھا تھا۔ مضمون یہ تھا:

میں نے تمہیں دوبارہ یاد دلانا مناسب جانا۔ کل . . . رات کے . . . دس بجے . . . تم . . . مار ڈالے جاؤ گے۔

"اعظم"

نیاز کرسی پر آگے کی طرف جھک گیا۔ دونوں ہاتھوں پر سر رکھ کر غرق خیالات ہو گیا۔

"یہ خط اس وقت کون لے آیا؟" میں نے ملازمہ سے پوچھا۔

"ایک لڑکا ہے اور میں نے اس کو روک رکھا ہے" ملازمہ نے کہا:

"اچھا تو اس کو یہاں بلاؤ" میں نے ملازمہ سے کہا:

"لڑکے سے میں نے خط کے بارے میں چند سوالات کئے۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کو کسی نقاب پوش نے خط دیا تھا۔ اور یہاں پہنچانے کے لئے آٹھ آنے انعام دئیے تھے۔ ہم نے اس کو بہت کچھ تسلی دی اور کل شام ہی سے اس کے پاس آنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گئے۔ نیاز نے مجھ سے مدد مانگی چونکہ وہ چند وجوہ سے اس واقعہ کی پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس آڑے وقت میں اس کے ضرور کام آؤں۔ دوسرے دن شام کے چھ بجے میں اپنے کام سے فارغ ہو کر سیدھا اس کے مکان روانہ ہوا۔ جب میں اس کے کمرہ میں داخل ہوا تو نیاز اور اس کا معتمد بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی جب میں ان کے قریب گیا تو سامنے کی میز پر ایک خط رکھا ہوا تھا۔ اس کے اطراف سیاہ خط کھینچے ہوئے تھے۔ نیاز نے خط کی طرف اشارہ کیا اور میں نے اس کو کھولا۔ ایک کاغذ کے پرزے پر یہ الفاظ تھے:

آج . . . . . دس بجے رات"

"مجھے ابھی ابھی وصول ہوا ہے" نیاز نے کہا جب میں نے خط بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

"نہیں کوئی بات نہیں" میں نے اطمینان بخش لہجہ میں کہا: "ہم تمہاری مدد کے لئے موجود ہیں۔ کوئی خطرہ کی بات نہیں"

نیاز نے کہا کہ بشیر کا مزاج یکایک ناساز ہو گیا ہے اور وہ اس لئے نہیں آ سکا اور اس کی اطلاع اس نے ٹیلیفون کے ذریعہ دیدی تھی" ہم یہاں سے اٹھ کر اس کے خاص کمرہ میں چلے گئے۔ اس کمرہ کے

وسط میں ایک میز تھی اور اس کے اطراف چند کرسیاں۔ ایک بجلی کا چراغ وسط کمرہ میں لٹک رہا تھا۔"

"ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک دروازہ تھا جس سے ہم داخل ہوئے تھے۔ ایک اور دروازہ بالکل ہمارے عقب میں تھا۔ اسی دروازے سے راستہ مکان کے پچھلے حصہ میں جاتا تھا۔ ہم نے اس کا دل بہلانے کے لیئے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ قریب آٹھ بجے ہم نے کھانا کھایا۔ پھر اس کمرے میں آ بیٹھے۔ اتفاق سے سکریٹری نے خط کا مضمون چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر دھمکی تھی۔ آج کل کوئی ایسے واقعات پیش نہیں آتے۔ اور پھر ہماری موجودگی میں کون اس کمرے میں داخل ہونے کی جرات کرسکتا تھا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں" نیاز نے چونک کر کہا "وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔ وہ ضرور کر کے رہے گا۔ ... مستقل مزاج اور عزم کا پکا ہے .... اُف وہ ضرور انتقام لے کر ہی رہے گا۔"

عالم خاموش بیٹھا اس قصہ کو سن رہا تھا۔ کہنے لگا:

"یہ قصہ البتہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے مگر تمہاری ترک ملازمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا"

"نہیں۔ اگر تم اس کا اصلی سبب سننا چاہتے ہو تو چپ چاپ سنتے جاؤ۔ پھر تم خود ہی جان لوگے"

یوسف نے کہا۔ پھر اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے:

"میں نے دروازے کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا وہ بند تھا یا نہیں۔ نیاز نے سر کے اشارہ سے اثبات میں جواب دیا۔ انہیں باتوں میں نو بج گئے۔ پھر گھڑیال نے آدھا بھی بجایا۔ اب کمرہ میں خاموشی۔ ایک عجیب خاموشی۔ قبرستان کے خوفناک سناٹے سے ملتی ہوئی کمرے میں چھائی ہوئی تھی۔ کوئی آہٹ، کوئی آواز، مہرِ سکوت کو توڑنے والی کانوں میں نہ آتی تھی۔ اب وہ وقت جس کی دہشت نیاز کا دل دہلانے والی تھی قریب تھا۔ نیاز کے دل میں موت کا بھیانک اور ڈراونی خیال جاگزیں ہوگیا تھا۔ دنیا کی ساری چیزوں میں موت کا خیال سب سے زیادہ ہیبت ناک اور باعث تحلیل روح ہے۔ مرنے کے نام سے انسان کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ پہلے تو انسان یہ نہیں چاہتا کہ دنیا کی تمام نعمتیں اس سے چھین لی جائیں اور پھر آیندہ کا خیال کر کے گھبرا جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اب دس بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے...... دس ... پانچ ... چار ... تین ... دو ...... ایک گھڑیال نے دس بار اس خوفناک وقت کی آمد کا اعلان کرنا

شروع کردیا۔ ابھی دس پورے بجنے نہیں پائے تھے کہ ایک قہر کی آواز آئی اور کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا اور ساتھ ہی کسی چیز کے گر کر ٹوٹنے اور کسی کے چیخ مارنے کی آواز آئی۔ عبدالقادر نے فوراً جیب سے برقی لیمپ نکالکر بٹن دبا دیا۔ بٹن کے دباتے ہی کمرہ روشن ہو گیا۔ ہمارے سامنے عقب کے دروازے کی طرف بشیر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ میری نظر فوراً نیاز پر پڑی اور منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔"

نیاز ہمارے سامنے زمین پر بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہمارے حواس اڑ گئے۔ عبدالقادر غش کے خیال سے اس کو ہوا دینے لگا۔ بشیر کے بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھکر نبض دیکھی حرکت رک چکی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ زمین پیر تلے سے نکلتی معلوم ہوئی۔ میں کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ بشیر نے اس کو ہلا کر جگانے کی کوشش کی مگر بے سود "کیا مر گیا؟ بشیر نے بیساختہ چلایا۔

"افسوس۔ اس نے ہیبت ہی میں جان دیدی" میں نے کہا۔

وہ اب ایسی نیند سو چکا تھا کہ کسی کے جگائے جگ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں سے کوئی نہیں پلٹا۔ اس وقت زندہ انسان کی بجائے بیجان مٹی کا ڈھیر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اف آدمی کے برابر کوئی دلیر نہیں اور نہ اس سے زیادہ بزدل کوئی مخلوق"

"عبدالقادر کبھی مجھ کو اور کبھی بشیر کو متحیر نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ بشیر نے اس کو ڈاکٹر کے فی الفور بلانے کے لئے کہا۔ مگر میں نے اس کو روک دیا۔ اب نیاز کی ہستی طبیب اور ڈاکٹر کے دسترس سے باہر تھی۔ بشیر سکتے کی حالت میں کھڑا ہوا تھا آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کیسا روح فرسا منظر تھا جس کے تصور سے اس وقت میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہمارے بچپن کا دوست اور برسوں کا ساتھی ہمارے سامنے مردہ پڑا تھا۔ پھر کیونکر؟"

"یوسف" عالم نے حیرت سے اس کو روک کر کہا "میں نہیں سمجھا کہ وہ بیمار دوست بشیر وہاں کیونکر آگیا اور دروازہ کس نے کھولا۔ اور فیر کس نے کیا"

"میں کہتا ہوں۔ تم سنتے جاؤ" یوسف نے بھرآئی ہوئی آواز سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ "اکثر اوقات نیاز اعظم کے نام سے بہت گھبرایا کرتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس کا خوف مذاق کے پیرایہ میں نکال دیں۔ میں چونکہ سر اغرسان تھا۔ اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ اعظم کے نام سے اس کو خط بھیجے جائیں اور موت کی دھمکی دیجائے۔ اس مقررہ وقت کے لئے ہم نے بشیر کو بیماری کے بہانے

روک لیا۔ صرف عبدالقادر اور میں اس کے ساتھ رہے۔ ہم نے جعلی کنجی کے ذریعہ سے بشیر کو اس بازو کے کمرے میں پہنچا دیا اور اس دروازے کی جعلی کنجی اس کے حوالے کر دی۔ دس بجے بشیر سے دروازہ کھولکر چراغ پر فیر کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ چراغ گل ہو جائے۔ اور فیر کی آواز آئے چنانچہ تم نے سنا۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ مگر آہ ہماری تجویز کس قدر غلط ثابت ہوئی اور ہمارے مذاق کا کس قدر خوفناک انجام ہوا۔"

"دوسرے دن ہم نے یہ خبر مشہور کر دی کہ نیاز قلب کی حرکت رک جانے سے مر گیا چونکہ مرحوم کی جائداد کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے ہم نے اس کا تمام سامان فروخت کر ڈالا اور اس رقم سے ایک مسافرخانہ اور ایک یتیم خانہ کی بنیاد ڈالی۔"

"اے میرے دوست" اس نے دفعتہً پرجوش لہجہ میں کہنا شروع کیا "داستان غم اب قریب الختم ہے تم یقیناً مجھ پر لعنت بھیجو گے۔ میں کہتا ہوں بھیجو اور جی کھولکر بھیجو۔ . . اس ناعاقبت اندیش پر، جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ایک ہستی بیگناہ کے انجام ناکام کی داستان حسرت بیان کر رہا ہے۔ افسوس" "ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال"۔ . . . . . اب اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ پھر بھرآئی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ انسان بایں ہمہ دعویٰ ہمہ دانی واقعات مستقبل سے کس قدر لاعلم رہتا ہے . . . . . کسے معلوم تھا کہ ہم کو اپنے مذاق کی قیمت . . . . . ابدی رنج و غم اور دائمی اشک ندامت سے ادا کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس سے انکار ہو نہیں سکتا کہ وہ . . . آغوش لحد کی تاریکی میں سونے والا نیاز ہماری ناعاقبت اندیشی کا مقتول اور ہم اس کے نادانستہ قاتل۔ . . . . ."

دن خورشید کا زرنگار تاج پہنے ہوئے آئیں گے اور گذر جائیں گے۔ راتیں زلف سیاہ دوش ہستی پر بکھرائے ہوئے آئیں گی اور شبنم کے آنسو بہاتے ہوئے چلی جائیں گی لیکن نیاز . . . . . . وہ مجسمہ خلوص و محبت . . مٹی کے کئی من ڈھیر میں دبا ہوا نیاز . . . . . کہاں! اور ہمارا ضمیر . . . آلودہ گناہ ضمیر کو ملامت سے فراغ کہاں! بسا اوقات کنج تنہائی اور خیالات کی پریشانی سے اکتا کر میں پاس والے دریا کے کنارے چلا جاتا ہوں مگر . . . محمد عالم کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا جی بہلجاتا ہوگا؟ . . . . نہیں بالکل نہیں . . . . . آج چار سال کا عرصہ اس واقعہ جانکاہ کو گزرے ہوئے ہوتا ہے لیکن اس طویل مدت میں کوئی ساعت کوئی گھڑی ایسی نہ گذری ہوگی جس میں جنت نصیب نیاز یاد نہ آیا ہو۔ جب سحر کا دست بے باک رات کی قبائے سیاہ کو چاک کرنے لگتا ہے اور جب ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد روشعاعیں فلک بوس پہاڑوں کو آخری

بوسہ دیتی ہیں، جب بادِ خزاں کے جھونکے سبزہ برگ و گل کی رنگینیوں کو جبراً چھین لیتے ہیں، جب فصلِ بہار کی آمد آمد کا دِ خشک میں روح تازہ پھونکنے لگتی ہے۔ اس وقت بھی اس کی یاد . . . ہر وقت تازہ رہنے والی یاد . . . دل سے فراموش نہیں ہوتی"۔

"دریائی ہوا۔ موجوں کے نغمہ زا شور ہر وقت اسی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے سنائی دیتے ہیں"۔

نیاز کے الم ناک انجام کے بعد ہی میں نے ملازمت ترک کردی اور دنیا کے شور و غل سے الگ بنی نوع انسان کی صحبت سے دور اس عزلت گاہ میں صدائے ضمیر کی جگر خراشیاں محسوس کرتے چلا آیا ہوں بشیر کو بھی بہت صدمہ ہوا۔ اس نے بھی جلد دنیا سے منہ موڑ لیا اور اپنے ضمیر کی لعنت و ملامت سے جلد نجات پاگیا۔ عبدالقادر کا حال معلوم نہیں کہ اس کا وفورِ غم اس سے کن بیابانوں کی خاک چھنوا رہا ہے ۔ داستان ختم ہوئی"۔

محمد عالم چپ چاپ اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ دونوں دوست آہستہ آہستہ دروازے تک آئے۔ محمد عالم نے اشک آلود نظریں اوپر اٹھاکر یوسف کو انداز رحم سے دیکھتے ہوئے رخصتی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد رخصت ہوگیا۔

یوسف بہت ضعیف ہوگیا ہے۔ کمر جھکنے لگی ہے اور ہاتھ پاؤں میں خفیف سا لرزہ عارض ہوگیا ہے پھر بھی صبح و شام کی نماز مکان کے پاس والے دریا کے کنارے آکر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرتا ہے اور ہر نماز کے ختم پر نیاز کی روح پر سورۂ فاتحہ پڑھکر بخشتا ہے"۔

رموز و نکات

از

جناب ابوالفاضل راز چاندپوری۔

(۱)

میخانۂ دہر کے مناظر، توبہ! بیخود ہیں تمام اہلِ ظاہر توبہ!
واقف نہیں رازِ بیخودی سے کوئی کافر ہیں یہ مے پرست کافر توبہ!

(۲)

لاریب کہ رہنمائے دوراں تو ہے گم کردۂ راہ کا نگہباں تو ہے
قربان اس ادعائے خوش فہمی کے! دنیا کافر ہے اک مسلماں تو ہے

(۳)

رونق دہ بزمِ نازِ دنیا تو ہے شیدائے جمالِ شمعِ عقبیٰ تو ہے
کیا دیدِ رخِ حبیب ہوگی اے رازؔ بیگانۂ جلوہائے معنیٰ تو ہے

(۴)

اے سالکِ راہِ کوئے جاناں ہشیار! وہ دیکھ، وہی ہے یوسفستاں ہشیار!
دس بیس قدم ہے اور منزل تیری رستے میں مگر ہے چاہِ کنعاں ہشیار!



ابوالفاضل راز چاندپوری

وہی آیا نظر کثرت میں مجھ کو تھا جو وحدت میں

از

جناب مولوی محمد حبیب الدین صاحب صغیرؔ تلمیذ حضرت علویؔ و مبکشؔ

نظر کیوں کر نہ آئے اس کی صورت میری صورت میں
میں وہ صنعت ہوں صانع ہے نہاں خود اپنی صنعت میں

کہوں کیا ہائے تجھ سے کیا مزا ہے تیری الفت میں
بتاؤں کیا تجھے میں کیا نہاں ہے تیری صورت میں

خدا رکھے تصور کو کہ ہے تکلیف میں راحت
مجھے ہر آن لطف وصل بھی حاصل ہے فرقت میں

یہ کیسا بے خودی میں خود نمائی کا خیال آیا
یہ کیسی بزم آرائی کی سوجھی تجھ کو خلوت میں

میری معدومیت بھی تیری ہستی میں ہے پوشیدہ
مری گمنامیاں بھی تو نہاں ہیں تیری شہرت میں

ہوئی شوق نمایش سے تری بے پردگی ورنہ
نہ آتا حجلۂ وحدت سے تو میدان شہرت میں

حقیقت میں دوئی بھی شان یکتائی کی مظہر ہے
وہی آیا نظر کثرت میں مجھ کو تھا جو وحدت میں

ہے میری نیستی اس ہستی موہوم میں پنہاں
مری بے صورتی کا بھی ہے جلوہ میری صورت میں

فقط اک نام کا اصل و مثنیٰ میں تفاوت ہے
نہیں ہے فرق کوئی اُس کی صورت میری صورت میں

ہے تیرا حسن ہی خود طالب دیدار کا طالب
نہاں ہے جلوۂ شوق نمایش تیری صورت میں

نہ تھی کچھ لن ترانی اُس کی بے جا حضرت موسیٰؑ
نہ ہو جب غیر پھر آئے نظر وہ کس کی صورت میں

تیرے جو دیکھنے والے ہیں تجھ کو دیکھ لیتے ہیں
تری صورت نظر آتی ہے ہر ذرہ کی صورت میں

بجز صورت کے کوئی شئے نظر آتی نہیں ہرگز
بہر صورت اگر ہو شوق دیکھو اس کو صورت میں

حقیقت میں مری صورت پرستی حق پرستی ہے
نہیں ہے جس کی صورت وہ نظر آتی ہے صورت میں

ہزاروں راہ رو تھک کر سرِ رہ بیٹھ جاتے ہیں
نشان منزل کا ملتا ہی نہیں راہ حقیقت میں

صغیرؔ دردکش کو کیوں نہ ہو ذوق مئے عرفاں
کہ وہ برسوں رہا ہے علویؔ و مبکشؔ کی خدمت میں

شاعری

از

جناب سلیمی متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

شاعری کی لوگوں نے مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ آج تک ہمیں کوئی ایسی تعریف نہیں ملی جس کو ہر لحاظ سے جامع و مانع کہا جا سکے۔ جذبۂ الفت کے مانند شاعری بھی ایک تاثرِ ذہنی ہے جس کو ہم اس کے خصائص و تاثرات کی بدولت جانتے تو ہیں لیکن اس کی صحیح صحیح تعریف نہیں کر سکتے۔

شاعری کی سیدھی سادھی تعریف یہ ہے کہ جب ہم اپنے تاثرات ذہنی (جذبات و احساسات) کو ایسی اثر انگیز زبان میں ادا کریں کہ سامعین کے دل میں بھی ویسے ہی جذبات موجزن ہو جائیں اور وہ ہمارے ادا کردہ خیالات کو اپنے خیالات کی ترجمانی خیال کرے تو یہ شاعری حقیقی شاعری ہوگی۔

وسیع معنوں میں تو ہر وہ شخص جو جذبات رکھتا اور ان کو دوسروں پر ظاہر کر سکتا ہے شاعر ہے لیکن محدود معنوں میں شاعری کا لفظ صرف انہی معدودے چند ہستیوں کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے جو ذکی الحس ہوں اور اپنے جذبات کو نہایت موثر اور دلکش طریقے سے بیان کر سکیں اور یہی ایک چیز ہے جو شاعر اور ایک عامی کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔

شاعر ذکی الحس اور متخیل ہوتا ہے۔ ہر وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان اُمنڈتا رہتا ہے۔ وہ اظہار جذبات پر پوری طرح قادر ہوتا ہے۔ وہ خود غرض نہیں ہوتا بلکہ نہایت کشادہ دلی سے اپنے پرسوز کلام کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کو گرماتا اور اکساتا رہتا ہے تاکہ وہ بھی اس کی معیت میں کائنات و عالم کی گوناگوں دلچسپیوں سے مستفید ہو سکیں۔

شاعر کے تخیل کی پرواز بلند ہوتی ہے وہ دنیوی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے تخیل کی پیدا کردہ دنیا کی سیر کرتا ہے۔ اس کی بلند و بالا آواز پورے عالم پر چھا جاتی ہے۔ وہ جب اپنے روح پرور اور حیات بخش نغمے الاپتا ہے تو ایسا ساحر معلوم ہوتا ہے جس نے تمام دنیا کو اپنے پنجۂ اقتدار میں لے لیا ہو۔

ہم اس کم بصر شخص کی مانند ہیں جس کو درخشاں روشنی بھی دھندلی معلوم ہوتی ہے اور جو ایک وادی پر پھیلے

ابرِ باراں اور گلہائے خوشنما کے حسنِ جاں نواز کا پورا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن شاعر جب انہی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اپنی خبر نہیں ہوتی۔ اور فرطِ مسرت سے بیخود ہو کر اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک شیریں و دلکش نغمے کی صورت میں کرتا ہے جسے عرفِ عام میں "شعر" کہتے ہیں۔ ہم کس طرح ایک بہرے سے زیادہ نہیں۔ اگر وہ صرف آوازوں کا احساس کر سکتا ہے تو ہم بھی موسیقی کو روانیٔ آب سے زیادہ نہیں سمجھتے لیکن شاعر "روحِ موسیقی" سے لطف اندوز ہوتا ہے آواز کے زیر و بم میں تمیز کرتا ہے اور ہم کو بھی پیامِ کیف آور میں مطلع کرتا ہے کہ اگر "روحِ نغمہ" سے محظوظ ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو موسیقی میں گم کر دو۔

ستاروں کو ہم سب دیکھتے ہیں اور ان کی پرعظمت اور پر اسرار حقیقت پر متعجب ہوتے ہیں لیکن شاعر جب انہیں دیکھتا ہے تو نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ ان کے آگے جھک جاتا ہے اور زاہد پاکباز کی طرح ہم سے بھی استدعا کرتا ہے کہ آؤ ہم سب مل کر عالمِ بالا کی سیر کریں اور سب مل کر ایک ایسا نغمہ گائیں جو اس آسمانی مملکت کے شایانِ شان ہو۔

ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ ہم ان کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے لیکن شاعر کی نگاہ انہی گمنام چیزوں کی متلاشی ہوتی ہے وہ حسنِ سادہ پر جان دیتا ہے۔ اور اس کی تعریف میں ایسے ایسے غیر فانی نغمے الاپتا ہے کہ یہی نغمے جب ہم تک پہنچتے ہیں تو ہم اس حسنِ سادہ کی سحر کاری سے بیخود ہو کر اپنی سابقہ حماقت پر متاسف ہوتے ہیں۔

سموئیل ٹیلر کہتا ہے "اگر موجدانِ مشنری نے ہم میں غیر جسمانی اعضا کا اضافہ کر دیا ہے تو شاعروں نے اس سے بھی گراں قدر عطیہ نوعِ انسان کو بخشا ہے انہوں نے ہماری روح میں بہت سے نئے ابواب کھول دیے ہیں۔"

سب سے بڑا شاعر وہی ہے جس کے دل میں سارے جہان کا درد ہو جو کسی مخصوص قوم کا نہیں بلکہ پورے عالم کا ترجمان ہو۔ جو ایسے اشعار کہتا ہے جن سے دوسروں کے دلوں میں گداز، نرمی اور ہمدردی کا مادہ پیدا ہو اسی بنا پر ہم شکسپیر کو سب سے بڑا شاعر اور "مثلِ خدا" GODLIKE کے مقدس اور پُر احترام الفاظ سے پکارتے ہیں۔

صرف جذبات کا نام ہی شاعری نہیں۔ شاعری کے اور بھی بہت سے لوازمات ہیں۔ جیسے

اثر و تاثرات اسی وقت شاعری کے زمرے میں آسکتے ہیں جب وہ دلکش انداز میں بیان کئے جائیں یہاں پر ہر ایک مجہول شئے کا سامنا ہے جس کی تعریف آسان نہیں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ بعض آدمی اظہار جذبات پر قادر ہوتے ہیں اور اپنے تاثرات وکیفیات کو ایسے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ سامعین کے دل میں ہیجان برپا ہوجاتا ہے اور اس قوت بیان کو آرٹ (صنعت) موسیقی مصوری مجسمہ سازی اور اداکاری (ACTING) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

جذبات شاعری کی جان ہیں ان کو ہم سامعہ نواز موسیقی اور حسین وجمیل تصاویر میں ادا کر سکتے ہیں شاعر جب کسی المناک یا خوفناک واقعہ بیان کرتا ہے تو اس میں حسن پیدا کر دیتا ہے دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا سب سے بڑا راز واقعات کو دلکش اور موثر طریقے سے پیش کرنا ہے۔

جب ہمارا طرز بیان غیر مائل حسن یا غیر دلکش ہو تو اسے ہم شاعری نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف شاعری کی نقالی یا صدائے بازگشت ہوگی لیکن بعض وقت یہی صدائے بازگشت اصل سے اتنی مشابہ ہوتی ہے کہ ماہرین فن بھی مشکل سے امتیاز کر سکتے ہیں۔

تصنع آمیز شاعری ہمارے جذبات میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کا اثر بالکل عارضی اور زود رو ہوتا ہے لیکن حقیقی شاعری ایک چلتا ہوا جادو ہے جس کا وجد آفریں اثر ہمارے رگ وریشے میں سرایت کرجاتا ہے شاعری بقول والٹر "حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانا"، اور بقول سسر "روح کی پرورش کرنا ہے" لیکن شاعری کو محض گندہ جذبات کی آماجگاہ بنانا اور غیر ناقدانہ روش سے اس پر گامزن ہونا شراب آتشین سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

شاعر مصوری وموسیقی کا موجد ہوتا ہے۔ وہ رنگ آمیزی کا کام الفاظ سے لیتا ہے جب وہ بےخود ہو کر درد دل بیان کرتا ہے تو لوگ اسے شعر اور موسیقی کا نام دیتے ہیں وہ زبان کا بھی موجد ہوتا ہے جب اس کا وسیع تخیل مقررہ الفاظ کے جامہ میں نہیں سما سکتا تو وہ بت تراش کے مانند نئے نئے الفاظ اور تشبیہیں تراشتا ہے۔

شاعری کی دنیا جذبات کی دنیا ہے وہ جذبات سے کھیلتا اور فطرت کے دلکش مناظر سے اپنا دل بہلاتا ہے۔ شاعر فطرت کا ترجمان ہوتا ہے وہ اپنے غیر فانی نغمات کے ذریعے تمام عالم پر چھا جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو اس کا نام صفحہ عالم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے جیسا کہ حافظ مرحوم فرماتے ہیں

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" ـــــ (ترجمہ)

تجلیاتِ فروغ

از

جناب محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم

مرتے دم تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی
کچھ مرے جینے کی صورت نکل آئی ہوتی

داورِ حشر کو کچھ اور گماں ہو جاتا
تم نے محشر میں اگر دیر لگائی ہوتی

ہو کے برہم صفتِ ابر رُلایا برسوں
ہنس کے بجلی دلِ عاشق پہ گرائی ہوتی

دل انسان سے نکل کر وہ سماتا اس میں
عرش میں گر دل انسان کی سمائی ہوتی

لاش پر میری بناوٹ سے وہ روتے اے کاش
جھوٹی الفت ہی بس مرگ جتائی ہوتی

ساقیا جام کی تکلیف تھی کم ظرفوں کو
سب کے بدلے مجھے چلو سے پلائی ہوتی

دل کسی رشکِ مہِ نو سے لگاتے نہ اگر
کبھی عالم میں نہ انگشت نمائی ہوتی

دل مرا تیرِ ادا سے ترے ہوتا زخمی
ناوکِ ناز کی گر چوٹ بچائی ہوتی

کیا کروں کان تک اسکے نہیں جاتے یارب
عرش تک ہے مرے نالوں کی رسائی ہوتی

دل سے دل مل گیا اب آنکھ لڑاتے کیوں ہو؟
صلح کے بعد کسی جا ہے لڑائی ہوتی

ہجر کی شب مجھے مرنے کی تمنا تھی فروغ
کاش قسمت میں مری موت پرائی ہوتی

شہیدانِ محبت

از

جناب سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی

شام ہو چکی تھی۔ باغ کے پھولوں کے ایک جھرمٹ میں چڑیاں جمع ہو رہی تھیں کیونکہ آج گل و بلبل کے درمیان محبت کا مقابلہ ٹھنا تھا۔ ان کی چہک سے ایک شور مچا تھا۔ پتے اور ڈالیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ اور ہوا، حلقہ ڈالے سنسنا رہی تھی۔ سبزہ بھی سننے کے لئے جاگ اٹھا تھا کہ دیکھیں آج کون بازی لے جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد خاموشی چھا گئی۔

پہلے بلبل نے ایک محبت کا دردناک گیت گایا جس سے سب پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے گل سے کہنا شروع کیا۔ "اے گل تو جانتا ہے کہ مجھے تجھ سے عشق ہے۔ میں تیری ہی محبت کا گیت الاپتا رہتا ہوں۔ اسی لئے میں دنیا میں ایک سچا عاشق مشہور ہوں۔ شعرا میری محبت میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ میں محبت کا پرستار ہوں بلکہ میں محبت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اور میری دنیا محبت ہے۔ اے نادان پھول! تجھ میں سوائے خوشنمائی و خوشبو کے بوئے وفا نہیں۔ تجھ میں محبت کا نام نہیں۔ سنتا ہوں کہ معشوق بے وفا ہوتے ہیں۔ سمجھتا ہوں کہ سچ ہے کیونکہ میں نے تیری محبت میں کیا کیا نہ تکلیفیں جھیلیں، دن رات تیری محبت میں تڑپتا رہا۔ تیرے صدقے پھرتا رہا۔ ناز اٹھاتا رہا۔ مگر آہ سوائے سینہ کوبی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہ کی۔"

یہ کہتے کہتے بلبل کے آنسو نکل پڑے۔ چڑیوں کے بھی دل بھر آئے اور سب نے چلا کر کہا۔ "اے بے وفا پھول تجھے شرم نہیں آتی کہ تیرا عاشق صادق تجھ پر جان قربان کرے اور تجھے ذرا بھی اثر نہ ہو"

تمام ہمسایہ پھولوں نے سر جھکائے۔ اور گلاب کو آہستہ سے طعنے دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ گلاب کے رخساروں پر شرم سے نمی آ گئی۔ آخر کار اس نے زبان کھولی اور کہا: "اے بلبل! تو سچ کہتا ہے مگر تو میرے دل سے کیا واقف۔ تجھے کیا معلوم کہ اس دل میں فقط تیری محبت بسی ہوئی ہے۔ اے چڑیو! ننھے پھولو! میں تم سب کو گواہ کر کے اپنا رازِ محبت کھول رہا ہوں اور اس کے بعد تم مجھے مرجھایا ہوا پاؤ۔

کیونکہ میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوں اب تاب ضبط باقی نہیں۔ یہ ضبط و صبر ہی کا نتیجہ ہے کہ میں بدنام ہو کر اف تک نہیں کرتا۔ بلبل کی طرح کمینہ نہیں ہوں جو ہر ایک سے اپنی محبت کا اظہار کرتا پھروں خود رسوا ہوں اور دوسرے کو بھی رسوا کروں۔ حسرت بھری خاموش آہوں سے زبانیں باہر نکل آئی ہیں۔ اور ان پر کانٹے آئے ہیں آہ! عشق نے دل میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ صبر ـــ ایک طویل صبر کی وجہ سے میرا خون خشک ہو چکا اور میں سفید پڑ گیا ہوں۔ اے اندھے عاشق آنکھیں کھول اور دیکھ کہ میں خود کو تیری محبت میں فنا کر کے کانٹوں کے احاطے میں گزر رہا ہوں۔ اور اب میرا باغ جوانی برباد ہو چکا۔ تو نہیں سمجھ سکتا کہ میری مصیبتیں تجھ سے کتنی بڑھی ہوئی ہے۔

اے بلبل! اگر تجھ کو مجھ سے حقیقی محبت ہے تو آ میرے ساتھ خود کو فنا کر دے۔ یہ تیرا آخری امتحان محبت ہے ـــ گلاب کی آواز رک گئی۔ بلبل کے دل پر ایک سخت صدمہ ہوا۔ وہ بے تابی سے اس کے قریب اڑا ایک دلدوز کانٹا اس کے دل میں چبھا۔ مگر اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ بلبل نے گلاب پر سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "میرے گلاب۔ پیارے گلاب"۔ اس نے آخری دردانگیز آواز میں کہا۔ اس کے دل کا خون گلاب پر ابل رہا تھا۔ اور گلاب سرخ پڑ گیا۔ مگر وہ مرجھا کر نڈھال ہو چکا تھا۔ بلبل کی روح نکل رہی تھی۔ مگر وہ ان آخری لمحات عشق میں اس قدر سرشار تھا کہ اس نے درد تک محسوس نہ کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاک پر مردہ پڑا تھا۔

گلاب کی پتیاں ایک ایک کر کے اپنے عاشق صادق پر گرنے لگیں۔ اور خاک نے ان شہیدان محبت کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔

چڑیاں بصد حسرت بلبل کے مدفن پر نگاہ ڈالتی ہوئیں یکے بعد دیگرے اڑ گئیں۔ لیکن پھولوں نے اس کی مجاوری میں ہمیشہ کے لئے سر جھکا لیا۔

افق میں ایک گہری سرخی نمایاں تھی۔ اور آسمان نے بھی سیاہ چادر اوڑھ لی۔

غزل

از

جناب حکیم آزاد انصاری صاحب

وہ دل کہاں سے لاؤں شکیبا کہیں جسے
باقی بھی ہو شکیب کا یارا کہیں جسے

وہ درد دے کہ درد تمنا کہیں جسے
وہ دکھ عطا ہو، عین مداوا کہیں جسے

سن مجھ سے سن، وہ کیا ہے؟ فقط ربط حسن و عشق
اس دہر کی حقیقت کبری کہیں جسے

اے مرکز امید! خبر لے، کہ مٹ چلی
وہ آس زندگی کا سہارا کہیں جسے

تیرے نثار، تو نے مجھے دل عطا کیا
اور دل وہ دل کہ شوق سراپا کہیں جسے

دیدار حسن دوست کی حسرت بجا، مگر
وہ دیدہ لا کہ دیدۂ بینا کہیں جسے

تکمیل ربط مرکز اعلیٰ کی دیر ہے
خود کھینچ لے گا مرکز اعلیٰ کہیں جسے

اب میں کہاں ہوں جلوہ گہ حسن دوست میں
اب میں وہاں ہوں حسن کی دنیا کہیں جسے

اک ہم کہ بندگان تمنا میں بھی ذلیل
اک تم کہ سب خدائے تمنا کہیں جسے

تدبیر کیا ہے، آپ کی جانب سے حکم کار
تقدیر کیا ہے آپ کا منشا کہیں جسے

اے جستجوئے منزلِ عالی! ادب، ادب
زیر قدم ہے عرش معلیٰ کہیں جسے

اے فیلسوفِ خام تجھے یہ خبر نہیں
خود فلسفہ ہے عشق کا سودا کہیں جسے

پیری میں شغلِ بادہ و شاہد وہ شغل ہے
لطف شباب رفتہ کا احیا کہیں جسے

نادان! جا، تمام بروں کو برا نہ کہہ
اچھا وہی نہیں ہے سب اچھا کہیں جسے

کیا آپ جانتے نہیں؟ آزاد کون ہے
بندہ نواز! آپ کا بندہ کہیں جسے

ناکام امتحان

از
جناب اقبال حسین خان صاحب سابق متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

"ابجی تم نے تو کہا تھا کہ آج مجھ کو کپڑے دلوانے ساتھ لے چلونگا۔ شوفر کو میں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ کہیں نہ جائے۔"

"آج تو معاف کرو کل ضرور چلیں گے کیونکہ آج مجھے چار بجے پروفیسر فیض کے ہاں ایٹ ہوم میں شریک ہونا ہے۔" یہ تھے پروفیسر محمد بخش کے الفاظ جو اپنی بیوی محترمہ غ بیگم کے سامنے صلاحیت سے ارشاد فرما رہے تھے۔

بیگم۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہے ہر روز اسی طرح کی ٹال کہ مجھے یہاں اور مجھے وہاں جانا ہے آپ تو روز ایٹ ہوم اڑائیں کھا جائیں اور ہمیں کپڑے دلوانے بھی نہ لیجائیں۔"

پروفیسر "میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ کل پر آج کی بات رکھو۔"

بیگم (مچل کر) "نہیں ایسا نہیں ہونے کا۔"

پروفیسر "بڑی آفت میں جان ہے۔ سچ کہا ہے کہ عورتیں کافی ناقص العقل ہوتی ہیں ضروری اور غیر ضروری کام کبھی نہیں دیکھتیں۔ بس حکم دے دیا کہ نہیں ہونے کا۔"

بیگم۔ (تنک کر) "دیکھو جی میں خون کے گھونٹ پیکر چپ ہوں۔ آپ ہیں کہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اب تو اللہ کی شان آپ ایل فیل پر اُتر آئے ہیں۔

پروفیسر (نہایت آہستہ سے) میں نے کب تم کو بُرا بھلا کہا"۔

بیگم اللہ ری دیدہ دلیلی کہ کہتے ہیں اور پھر مکرتے ہیں ذرا ہوش کے ناخن لو۔ منہ سنبھال کر بولو۔"

پروفیسر "یہ بھی کوئی بگڑنے کی بات ہے" یہ الفاظ صلح کن لہجہ میں ارشاد فرمائے۔

بیگم۔ (روٹھنے کی ادا سے) "بس مجھے اب کچھ نہ بولو۔ اب تک تو بہت سہا، لیکن اب صبر نہیں ہو سکتا" پروفسر محمد بخش نہایت سنجیدہ آدمی بھی تھے اور معاملہ فہم بھی سمجھ گئے۔ بیوی کا تھرما میٹر چڑھ گیا ہے

اگر اوپر بیٹھیں تو جان پر بن آئیگی ۔ چاہتے تھے کہ کسی صورت سے سبھالیں لیکن ایک پیش نہ گئی ۔ جانا ضروری تھا جتنی وعدہ کیا تھا کہ ایٹ ہوم میں شریک ہوں گے اب جو بیوی کو بگڑتے دیکھا تو سٹی بھول گئے ۔ سوچنے لگے کہ کیا کریں آخر یہ ترکیب سوجھی کہ باہر چلیے چلو واپسی پر دیکھا جائے گا ۔ بسم اللہ کہہ کر آہستہ سے باہر چل دیئے ۔ بیوی غضب ناک نگاہوں سے تکتی رہیں ۔ جب مولانا ڈیوڑھی سے باہر ہوئے تو بیگم نے چلّا کر آواز دی "گل بہار ! اری وہ گل بہار ! جہنم جلی کہاں مرگئی ۔" غریب گل بہار ڈرتی مرتی بیگم کے روبرو لرزتی زمین دیکھتی کھڑی ہوگئی ۔ پہلے ہی سے بیگم کا غصہ جانتی تھی آج تو حالت ہی آپے سے باہر دیکھی سمجھی کہ آج ضرور شامت ہے ۔

بیگم ۔ جا مردار شوفر نگوڑے سے کہدے کہ اگر آج تو سرکار کو باہر لے گیا تو بلا تنخواہ دیئے نکال دوں گی ۔"

گل بہار دوڑی ہوئی گئی اور بیگم کا حکم سنا دیا شوفر پہلے ہی سے اپنے گھر جانے کے لئے بیچین تھا صرف بیگم کے حکم کی وجہ مجبوراً رکا ہوا تھا ۔ خوشی خوشی شیروانی پہنی ٹوپی اوڑھ روانہ ہا شد پر پروفیسر صاحب بہت بیچین ہوئے لیکن کرتے کیا مجبوراً دم سادھ کر خاموش ہو رہے ۔ مولانا کو کوفت تھی بہت ۔ جانا تھا ضروری لیکن کچھ کرتے دھرتے نہ بن آئی ۔ آخر ڈرائینگ روم میں مجبوراً تشریف لے گئے ۔ نہایت مغموم آرام کرسی کے دستے پر ہی بیٹھ گئے ۔ بہت دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے کہ کیا کریں کیسے جائیں ۔ جب کچھ نہ سوجھی تو ادھر اُدھر دیکھنے لگے ۔ پہلی نظر جناب کی اپنی قد آدم تصویر پر پڑی یہ جوانی کے وقت کی تھی بہت دیر تک تکتے رہے کچھ عہد ماضی کا دھیان جوانی کی امنگوں اور شادی کے قبل کی آزادی و بے فکری کا خیال دل پر ایک سانپ سا لہرانے لگا ۔ اب کیا تھا بیٹھے بیٹھے بغیر ارادہ کے ہر چیز کا جائزہ لینے لگے ۔ اِس کو دیکھا اُس کو دیکھا دل ہی دل میں اس چیز کی تعریف کی اُس چیز پر تنقیدی نظر ڈالی ۔ جب کمرے کے تمام اشیاء کا جائزہ لے چکے تو میز کی باری آئی ۔ بہت دیر تک گھورا کئے یکایک جناب کی نظر ایک اگری رنگ کے لفافہ سے ٹکرا کر رہ گئی جو میز پر دھرا ہوا تھا ۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے خراماں خراماں میز تک تشریف لے گئے بغیر ہاتھ لگائے پڑھنے لگے پہلے اپنا نام پڑھا ۔ پھر لفافہ کے ایک جانب لکھا دیکھا از دفتر مسجل یونیورسٹی ۔ لفافہ کو ہاتھ میں اٹھالیا اور فوراً چاک کر کے پڑھنے لگے ۔ لکھا تھا کہ "امتحانات کے پرچے فوراً جانچکر روانہ فرمائیے نتیجہ بہت جلد شایع کیا جائے گا ۔" پروفیسر صاحب تیار ہو گئے کہ چلو اس فرصت میں تھوڑے پرچے ہی دیکھ ڈالیں کوئی اور کام تو ہے نہیں ۔ کرسی کھینچ کر میز کے سامنے جا بیٹھے کلاہ شریف بازو رکھ دی ۔" لگے میز کا خانہ کھینچنے ۔ نہ کھلنے پر ایک زور کا جھٹکہ دیا تب بھی نہ کھلا ۔ پھر کیا تھا جھٹکوں کا تانتا بندھ گیا ۔ اس کشمکش میں دوات اوندھی ہو گئی تمام ٹیبل پر سیاہی ہی سیاہی ہو گئی اب کیا تھا غصہ سے چہرا لال انگارہ ہو گیا ۔

تھوڑی دیر خاموش کھڑے کھڑے میز کو گھورا کیے خیال آیا کہ خانہ مقفل ہے بڑی خفت ہوئی قفل کھولا پرچے نکال میز پر رکھنا چاہتے تھے کہ سیاہی کا خیال آیا۔ پھر کیا تھا چلا کر نوکر کو آواز دی۔ غریب مصطفیٰ ڈرتا سہمتا ہوا روم میں داخل ہوا۔ پروفیسر صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر صاحب پہلے تو مصطفیٰ کو سر سے پیر تک غصہ سے گھورتے رہے گویا کہ یہ اس کا اپنا ہی قصور تھا پھر بھرٹ آواز میں حکم صادر فرمایا "میز صاف کر" "جی حضور" "پھر جلد پیپر ٹیک کرو" "فوراً" غریب مصطفیٰ نے جلدی جلدی میز کو صاف کر دیا اور ہمارے یہاں پروفیسر پرچوں کا پلندہ لیئے کھڑے رہے جب میز صاف کیا جا چکا تو صاحب نے پرچوں کو زور سے میز پر پٹخ دیا۔ اور کرسی کھینچ کر میز کے مقابل جم گئے اب کیا تھا بیچارے غریب طالب العلموں کے قسمتوں کا فیصلہ ہونے لگا۔

(۲)

"ہاں! تو تمہارے تمام انتظامات لندن جانے کے ہو چکے نا"، ناصر نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے محمود سے پوچھا۔

"بھائی ہو تو گئے مگر نتیجہ کا انتظار ہے بغیر کامیاب ہوئے جانا کیسا ہو گا خدا کرے کہ کامیاب ہو جاؤں" محمود نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کامیابی میں شک ہی کیا ہے مٹھائی کی تیاری کرو اس سال تو تم کامیاب ہو کر ہی رہو گے اتنی سخت محنت کرنے کے بعد آخر ناکامیابی کیا معنے؟"

"یہ تو نہ کہو پہلے اور دوسرے سال بھی تو میں نے کوشش کی تھی لیکن نتیجہ معلوم۔ امتحان قسمت بازی ہے محنت ...."

"نہیں محمود اس سال تو تم ضرور کامیاب ہو گے تمہاری انتہائی بدقسمتی تھی کہ دو سال سے فیل ہو رہے ہو آخر کب تک۔ خدا رحیم ہے اس سال تو ویسا نہ ہو گا۔ بس اب مٹھائی کی تیاری کرو۔" ناصر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر قسمت میں ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہو کر ہی رہوں گا نتیجہ تو نکلنے دو پھر جس قدر کھا سکتے ہو کھاؤ" محمود نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم تو اسی وقت کھائیں گے جس بات کا یقین ہو اس میں اول کیا اور بعد کیا"۔

"اسقدر عجلت نہ کرو دو تین دن صبر سے کام لو نتیجہ شایع ہوتے ہی کھلا دوں گا امید تو ہے کامیاب ہو جاؤں گا"

اس سال میں نے بہت اچھے جوابات لکھے ہیں کاش سال گذشتہ ہی کامیاب ہوجاتا تو آج میں عزیز کے ساتھ لندن میں ہوتا۔ سال اول کی تکمیل ہو چکی مگر قسمت بری تھی کہ دو نشانات سے انگریزی میں اور ایک نشان سے ریاضی میں فیل کر دیا گیا" محمود نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"خیر گذشتہ ناکامیابیوں کا نعم البدل ہوجائے گا تم کو تو فرسٹ کلاس میں کامیابی کی توقع ہے نا" ناصر نے محمود سے استفسار کیا۔

"بھائی فرسٹ ورسٹ تو رہنے دو صرف کامیاب . . . . "

محمود نے فقرہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ دو چار اور دوست آ دھمکے بہت دیر تک امتحان اور اس کے متعلقات پر آپس میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ محمود امتحانات کے معاملہ میں بہت بد قسمت تھا دو سال سے پروفیسر کو تعجب تھا کہ محمود کیوں ناکامیاب ہوا۔ کلاس میں اچھی حالت تھی لیکن اس سال تو غریب کو یقین کامل تھا کہ ضرور کامیاب ہوگا۔ قیصر جرمنی کو آغاز جنگ کے زمانہ میں اپنی فوجوں کے پیرس اور وارسا کے آگے دن قریب تر ہوتے جاتے سے جیسی خوشی ہوتی ہوگی ویسی ہی اس وقت محمود کو تھی جب کہ تمام دوست احباب قبل از قبل مبارکباد دیرہے تھے کوئی کہتا تھا کہ درجہ اول میں کامیاب ہوگا کوئی کہتا تھا کہ درجہ دوم تو یقینی ہے۔ جس طرح قیصر کو پیرس میں ناشتہ کرنے اور وارسا میں شام کھانے کی امید قوی تھی اسی طرح محمود کے تمام دوستوں کو اس کی کامیابی کا یقین تھا۔

محمود خوش حال گھرانے کا لڑکا تھا والدین کو اس کی تعلیم کی بہت کم فکر تھی۔ ۱۶ سال تک تو غریب نے ابجد تک ختم نہیں کی تھی ایک مولوی صاحب اخلاقی کمزوری کہئیے یا سراپا انکساری ہمیشہ اپنے شاگردوں سے دب کر رہنے کے عادی تھے وہی محمود کو پڑھایا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے کچھ ایسی فضا میں محمود کی بسر ہوئی تھی کہ جس میں محمود کے تعلیم پانے کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی اس پر طرہ مولوی ممدوح کی تعلیم سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی تھی۔ مولوی صاحب تعدد ازدواج کے مؤید اکثر فرمایا کرتے "بھائی میرا تو یہ مقولہ ہے کہ جہاں خدا نے آمدنی میں پانچ روپے کا اضافہ کیا ایک نئی شادی کر لو" مولوی صاحب نہ صرف یہ فرمایا کرتے بلکہ اس پر شدت سے کاربند بھی تھے۔ باوجود دو بیبیوں کی سنبھال مشکل ہونے کے پھر تیسری کی تلاش میں سرگرم و کوشاں تھے۔ سال ہی کا ذکر ہے کہ انہوں نے بہت سستے میں ایک اور تازہ عقد کر لیا تھا سچ کہا ہے کہ "جوئندہ یابندہ" اب یہ حال کہ مولوی صاحب بہت کم محمود کو پڑھانے آنے لگے لیکن محمود کے

اکثر تقاضا فرمایا کرتے کہ بھائی تمہارے والد سے کہو ہماری تنخواہ میں اضافہ کرادو آخر ہمارے اخراجات بھی تو ہیں تمہاری نئی استانی کا خیال ہے ورنہ ہم کبھی تم سے ایسا نہ کہتے۔"

محمود کے والد نے جب مولوی صاحب کی یہ حالت دیکھی تو محمود کو سرکاری مدرسہ میں شریک کروادیا۔ محمود کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی بغیر امتحان مڈل کلاس میں شریک کرلیا گیا۔ مولوی ممدوح نے تو صرف بغدادی قاعدہ اور پارہ عم بچے کی زبان ختم کروائی تھی محمود کا مڈل کلاس میں اچانک چلنا نہایت مشکل تھا استاد کے سوال کا جواب تو کیا دیتا برابر سوال تک نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر کلاس ٹیچر صاحب اُس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے جن کے خوف سے محمود اپنے والد کو کہہ کر کلاس ٹیچر صاحب کو خانگی تعلیم کے لئے مقرر کروالیا۔ اب نئے استاد صاحب قبلہ اگلی سی سختی نہیں فرمایا کرتے۔ دوسرے ساتھیوں کو دیکھ کر محمود کو بھی تعلیم کے شوق نے اکسایا۔ محمود اب تعلیم میں گہری دلچسپی لینے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال میں سرکاری جانب سے مڈل کے امتحان میں شریک کروادیا گیا لیکن دو سال میں ابجد سے بڑھ کر مڈل میں کامیابی حاصل کرنا مشکل تھا اس لئے محمود ناکامیاب رہا اُس کے والد نے دوستوں کی رائے سے محمود کو منشی کے امتحان میں شریک کروادو اس طرح لڑکا فارسی بھی پڑھ لے گا ورنہ پھر اردو زبان سیکھنے کی نوبت بھی نہ آنے کی۔ ایسا ہی کیا گیا محمود کو ایک ہمدرد فارسی کے لائق استاد پڑھانے لگے انہوں نے بہت شفقت سے تعلیم دی پہلے آمدن، کریما، اور نگار دانش کی چند حکایات پڑھائیں۔ شاگرد ذہین تھا بہت جلد فارسی میں چل نکلا دو سال کی محنت شاقہ کے بعد دیوان حافظ، صائب، سکندر نامہ اور رقعات عالمگیری وغیرہ ختم کی اور منشی کے امتحان میں درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔

نئے مولوی صاحب کی رائے سے محمود دوبارہ سرکاری مدرسہ میں شریک کروادیا گیا۔ پرانی دقتیں دوبارہ عود کر آئیں محمود کلاس میں مشکل سے ہی چل سکتا تھا صرف مڈل میں تھوڑی بہت انگریزی پڑھی تھی لیکن بہت جلد ہی انگریزی میں ترقی کرنے لگا۔ دو سال کی سخت کاوش کے بعد میٹرک کے انگریزی پرچہ میں امتحان دینے کے قابل ہو گیا۔ محمود سرکاری طور پر امتحان میٹرک میں شریک کروادیا گیا لیکن ابھی تک محمود میں بعض کمزوریاں باقی تھیں نتیجہ کے طور پر امتحان میں ناکامیاب رہا۔ لیکن دوسرے سال میٹرک کامیاب کرلیا۔ اس وقت محمود کی مسرتوں کی کوئی حد نہ تھی۔ محمود نے انٹر میں اختیاری مضامین سائنس اور ریاضی لئے۔ غریب ریاضی بہت کم جانتا تھا لیکن اس قدر محنت کی کہ پہلے سال سالانہ امتحان دوم میں بھی ترقی مل گئی۔ دوسرے سال انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لئے بھیج دیا گیا۔ اب محمود کی حالت اچھی خاصی بدل گئی تھی محنت کا بھی کافی

عادی ہوگیا تھا کلاس میں حالت اچھی تھی پروفیسروں کو اس کی کامیابی کا یقین تھا مگر قسمت ہیٹی تھی کہ محمود کی ابتدائی تعلیم کے نقصان کا بدل ہونے کے بجائے محمود صرف تین نشانات سے ریاضی میں ناکامیاب کردیا گیا جس سے اس کی ہمت پست ہونے لگی تمام خیالات تھربھر ہو گئے۔ یہ سبھا تھا کہ دو سال میں کسی صورت سے بی، اے ہوکر انگلستان چلا جائے اور وہاں پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن قسمت سے پیش نہ گئی۔ غریب نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا دوبارہ محنت شروع کردی اور اپنے والدین سے لڑجھگڑ کر انٹرمیڈیٹ کامیاب ہوتے ہی انگلستان جانے کے کل انتظامات مکمل کروالیا جو اس کے لئے آسان کام نہ تھا۔ یوں بھی محمود کے والدین انگلستان جانے کے قائل نہ تھے کہتے تھے کہ "قسمت میں ہے تو انسان بغیر لندن گئے یہاں بھی ترقی کرسکتا ہے"۔ دوسرے محمود کو چاہتے بھی بہت تھے اس لئے دریاپار اپنے لڑکے کو بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے اور کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے لیکن محمود نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ انگلستان جاکر ہی رہے گا۔ والدین کو اس قدر مجبور کیا کہ ان کو خواہ مخواہ ہاں بھرنی پڑی دوسرا سبب محمود کی بےچینی کا انگلستان جانے کے لئے یہ بھی تھا کہ اس کا ایک دوست سال حال تعلیم کی غرض سے انگلستان جارہا تھا وہ چاہتا تھا کہ ان کے ہمراہ روانہ ہوجائے۔

محمود دوبارہ امتحان دے چکا تھا پرچوں کے جوابات اطمینان بخش حالت میں لکھے تھے صرف نتیجہ کا انتظار تھا۔ نتیجہ شایع ہوگیا مگر کیسا نتیجہ محمود کے امیدوں پر پانی پھیر دینے والا اس کے تمناؤں کو خاک میں ملا دینے والا اب محمود بالکل ناامید ہوگیا یہ سمجھنے لگا کہ اس کی قسمت میں کامیاب ہونا نہیں لکھا ہے استقلال ہاتھ سے جاتا رہا لیکن اُس کے مخلص دوست اُس کو آہستہ آہستہ راستی پر لے آئے ہر قسم کی تسلی اور تشفی کرتے رہے آخر محمود نے دوبارہ امتحان کے لئے تیاری شروع کردی محمود نے کالج بھی بدل دیا اور اب کے سال نہایت شد و مد کے ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ یہ تیسرا وقت کہ محمود امتحان میں شریک ہوا پرچے نہایت اطمینان بخش حالت میں لکھے۔ دوبارہ نتیجہ کا انتظار تھا دوسرے لندن جانے کے لئے بےچین عزیز لندن جاچکے تھے لیکن ہر خط میں محمود کو جلد آنے کے لئے لکھتے تھے۔

(۳)

(وہی پروفیسر صاحب کا برانگیختہ مزاج)

پہلا پرچہ۔ خط دیکھو بالکل بچوں سا۔ بہت زشت۔ جواب کو سلجھا کر لکھا ہے۔ (غور کر کے) اچھا یہ

یہ مطلب ہے۔ بات تو وہی ہے جو ہونی تھی۔ ٹھیک بالکل ٹھیک (اپنے ہیجان سے متاثر ہوکر) نہیں نہیں سراپا غلط۔ ایک دو کا جواب صاف صاف ہے مگر الفاظ پڑھے نہیں جاتے۔ فکرے طالب العلم نے اندھا کا سنڈھ لکھ مارا ہے (شمار کر کے) نمبر تو کم بخت کو خاصے کامیابی کے آئے ہیں لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا زشت خطی کی تعزیر گول مول لکھنے کی سرزنش بھی تو چاہیئے (وقفہ لیکر) انھ کچھ بھی سہی سب ایک قلم غلط.....

.... لغو (پرچہ کو الٹ کر)

دوسرا پرچہ - یہ بھی اسی انداز میں لکھا ہے۔ کیا کیا . . اچھا یہ بات ہے...... وہی طرز اتنی ہم خیالی...... ناممکن (برہم ہوکر) ضرور کاپی کی ہوگی (نمبر دیتے ہوئے) ستائش! ہا ستائش!

تیسرا پرچہ - صاف خط ہے عبارت صریح ذہنی منکھرٹ معلوم ہوتی ہے۔ عمل بھی صحیح نہیں۔ صرف ترتیب میں صفائی ہے (۵۵) نمبر ارے چوک ہوگئی (۵۰) کا ہندسہ پڑ گیا.. . اُنھ باشد باشد۔ کون کانٹ چھانٹ کرے۔ رعایت معلوم ہوگی (آپ ہی آپ) کون اتنی چوکسی کرتے چلا ہے لیکن نمبر کی صحت پر اعداد کی شکل بگڑ جائے گی۔ غالباً احتمالی خیال پیدا ہوگا کہ بے جا اعانت کی گئی ہے.... . خیر رہنے دو صحیح بالکل صحیح -

چوتھا پرچہ - اخاہ نمبر ۱۔ ریاضی کا پرچہ۔ اُس نے کہہ تو دیا تھا جواب گول مول ہے۔ کم بخت نے مطلق محنت نہیں کی ہے (بڑبڑاتے ہوئے) جواب اناپ شناپ لکھ مارا ہے فضول بالکل من گھڑت اب کے زمانہ کے طالب العلم ایسے ہی پھسڈی ہوتے ہیں۔ کسی کام پر جی نہیں لگاتے (غور کر کے) کامیابی کے نمبر بالکل نہیں آئے۔ بد نصیب ہے (اندیشہ کرتے ہوئے) بیگم خفا ہوں گی (قلم اٹھاکر) کامیاب بے شک کامیاب -

(بعد ہی سارے کے سارے پرچوں کو سرسری طور پر اُلٹ پلٹ کر)

کون دیکھے دردسری محض دردسری۔ وقت کی خرابی کے سوائے کچھ حاصل نہ فایدہ۔ لکھت واہیات۔ کس قدر رات آگئی (گھڑی دیکھ کر) بہت وقت گزر گیا کب تک جانچ کروں۔ ہاتھ شل ہو گئے دماغ تھک گیا۔ (پیچھے پنکھا دیکھ کر) بہت بگڑ گئیں دسترخوان تک نہیں چھوا یا دھوک۔ سے بے چین ہوکر) کمبخت ختم ہی نہیں ہوتے۔ بس تو یہ ہی بات ہوتی چاہیئے۔ ادھر بیگم الگ اونٹ رہی ہوں گی۔ ان کی کٹ حجتی سے الگ ناک میں دم ہے۔ اور اس معلمانہ زندگی سے الگ -

اب پروفیسر صاحب پنجاب میل اوڑانے لگے ایک آدھ سطر پڑھ کر کسی پر کامیابی کے نمبر ڈال دیتے اور کسی پر ناکامیابی کے۔ اس ردوکد میں پروفیسر صاحب بچارے محمود کے نوشتے امتحانی جوابات پر بلا سوچے سمجھے خط قسمت کی طرح ناکامیابی کے نمبر ڈال دیئے۔ حالانکہ محمود کے خیالات وعمل سے مستفیض ہونے والے طلبہ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی (سچ پوچھو تو یہ سود محض ان کی اتفاقی خوش نصیبی سے ان کے ہاتھ آگیا تھا) گویا بیوی کے بگاڑ کا نزلہ پروفیسر صاحب نے قلم غفلت رقم سے اسی طرح ٹپکا دیا کہ ناکامیاب طلبہ نے امید کے خلاف کامیابی کی صورت دیکھی اور باوصف جچی تلی کامیابی کے طلبہ کو ناکامیابی کی منزل ہی میں ہیٹا ہوکر رہنا پڑا۔

(۴)

ٹپک اے شمع آنسو بنکے پروانہ کی آنکھوں سے سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

محمود بےچین برآمدے میں ٹہل رہا تھا جبر اڑی تھی کہ آج نتیجہ شایع ہونے والا ہے۔ محمود کا عزیز دوست ناصر۔ رجسٹرار آفس نتیجہ دیکھنے گیا ہوا تھا۔ محمود کو اس کا سخت انتظار تھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ ابھی تک ناصر نہیں لوٹا۔ محمود سمجھ رہا تھا کہ ناصر کا نہیں آنا خالی از علت نہیں۔ بقول "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" محمود ناصر کی تاخیر کے کئی اسباب سوچ رہا تھا۔ "آہ کیا ہوگا اگر میں اس سال بھی ناکامیاب ہوجاؤں"۔ اس نے سلسلہ خیالات جاری رکھتے ہوئے کہا اب اس میں انتظار کی تاب باقی نہ تھی۔ دامن صبر ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا۔ محمود کے لئے یہ چند لمحے وہ ناقابل برداشت لمحے تھے جو کسی اوسط درجے کے انسان کو اس کی زندگی میں بہت کم پیش آتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں تو صدیوں لمبے ہوجاتے ہیں۔

پاؤں کی آہٹ نے اس کو چونکا دیا اس کا سلسلہ تخیل منقطع ہوگیا۔ ناصر سامنے کھڑا تھا لیکن اس نے ناصر کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کیا ہوا۔ "ناصر سچ کہو کہ کیا ہوا" محمود نے دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا "توقعات کے خلاف" ناصر نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

خبر کیا تھی ایک برق بلا تھی کہ خرمن مسرت اور راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کرگئی۔ جب انسان اپنی توقعات کے خلاف خود کو ناکام دیکھتا ہے تو وہ مغموم ہوجاتا ہے، اس کی زندگی تاریک۔

اس طرح "مسرت کی تلاش کا حاصل غم اور خوشی کے تمنا کا نتیجہ رنج ہوتا ہے" شدید صدمہ تھا۔ محمود کھویا ہوا تھا۔ دنیا کی تمام دلفریبیاں اس کے لیے کوئی دلکشی نہ رکھتے تھے۔ ناصر محمود کا سچا دوست

اس کا رنج والم کم کرنے کی ہر چند کوشش کی کہ محمود کی طبیعت کو بہلائے لیکن ناصر کی کوششیں پوری نہ ہو سکیں۔

نتیجہ شائع ہو کر تین دن ہو چکے ہیں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا محمود کی اُداسی میں اضافہ ہوتا چلا تھا۔ کھانے کی اشتہا باقی نہ تھی۔ نیند اس سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ دنیا ایک تاریک شئے نظر آ رہی تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے محمود میز کے قریب بیٹھا ہوا کچھ ایسے خیالات میں محو تھا کہ اُسے دنیا اور مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ چراغ کی روشنی اس کے گول چہرہ پر پڑ رہی تھی اس کے چہرہ کا تغیر اس کے اندرونی احساسات کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سفید پڑ جاتا تھا اور کبھی سُرخ۔ کبھی "مرقع یاس" بن جاتا تھا اور کبھی تصویر حیرت۔ پیشانی پر ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کے قطرات جمع ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں پُر نم تھیں اور وہ اپنے آپ یوں بڑبڑا رہا تھا۔ شعر ؂

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو اپنا

محمود پر دوبارہ خموشی طاری تھی لیکن دماغ کچھ سوچ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کے خیالات خطرناک حد تک آزاد ہوتے جا رہے تھے۔ چہرہ کا اُتار چڑھاؤ ہاتھ پیر کی بے معنی حرکتیں آنکھوں کی مجنونانہ چمک اس بات کا ثبوت دے رہی تھی کہ وہ اس وقت کسی فیصلہ آخر پر پہنچنا چاہتا ہے آخرکار اس نے فیصلہ کر ہی لیا کیسا فیصلہ نہایت ہی خوفناک فیصلہ۔ ایسا فیصلہ جو حسرت اور یاس کی انتہائی گہرائیوں میں بھی ڈوبنے کے بعد انسان کرتے ہوئے لرزتا ہے۔ محمود کے چہرہ پر یکایک اُداسی چھا گئی اس نے اپنے دراز پاؤں کو جو کانپ رہے تھے نزدیک کھینچا۔ پھر کھینچا۔ آخرکار اٹھا۔ ایک ایسے پرندے کی مانند جس کے پر نوچ لئے گئے ہوں جو قید کی بندشوں کو توڑ کر اڑ جانا چاہتا ہو۔ محمود دروازے کی طرف بڑھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بمشکل دروازہ کھولا۔ آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُترتا ہوا صحن میں داخل ہو گیا۔ پھر یکایک دوڑنے لگا۔ تقدیر معلوم نہیں اس کو کہاں کشاں کشاں لیجا رہی تھی۔ ہر تیسرے پانچویں قدم پر پلٹ پلٹ کر حسرتناک نظروں سے گھر کی طرف دیکھتا جاتا تھا اور پھر دوڑتا جاتا تھا۔

تین ماہ ہو چکے ہیں محمود لاپتہ ہے۔ اُس کے والدین اس کی تلاش سے عاجز آ گئے۔ اور ان کی تمام محنتیں اکارت گئیں۔ محمود کے دوستوں کو بھی محمود کی جدائی کا بڑا ہی قلق رہا۔

تسکین قلب

(شیکسپیر کی ایک مشہور عالم نظم کا سلیس ترجمہ)

از

جناب شبیر احمد صاحب حیدرآبادی

نگاہیں دہر کی پلٹی ہوئی رہتی ہیں جب ہم سے
دکھائی دیتے ہیں آثار جب اپنی خرابی کے

مقدر سے بگڑ جاتے ہیں جب سب کام بن بن کر
مصیبت پر مصیبت آتی ہے جب آفت پہ آفت

سفینہ جب کہ گھر جاتا ہے طوفان مصائب میں
محبت ہوتی ہے مفقود جب خویش و اقارب میں

ترقی کی ہوس جب باعث آزار ہوتی ہے
فلاکت سے بہت جب زندگی دشوار ہوتی ہے

رہائی جب نہیں ہوتی غم و اندوہ و حرماں سے
بکھیڑے زندگی کے تنگ کر دیتے ہیں جب جاں سے

مجھے جب دوسروں کی زندگی پر رشک ہوتا ہے
تمناؤں پہ اپنی جب دل ناکام روتا ہے

تو ان اوقات میں تیری محبت یاد آتی ہے
محبت یاد آتے ہی مصیبت منہ چھپاتی ہے

تاریخ ادب کی خصوصیات

از

جناب سید شاہ محمد صاحب بی، اے عثمانیہ

تاریخ ادب سے کسی زبان کی ادبی کتابوں کا بلحاظ ترتیب زمانی مطالعہ مراد ہے۔ لیکن چونکہ کسی کتاب کے خیال کے ساتھ اس کے مصنف کے خیال کو بھی مربوط کیا جاتا ہے۔ اس لیے تاریخ ادب میں کتابوں اور ان کے مصنفین کا احوال ہوتا ہے۔

یہاں تک تو تاریخ ادب کی تعریف ہوئی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تاریخ ادب کی خصوصیات کیا ہیں؟ سب سے پہلے شخصی عنصر (PERSONAL ELEMENT) کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ کوئی کتاب اپنے مصنف کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر ہر کتاب خود ہمیں مصنف کی شخصیت کی طرف لیجاتی ہے۔ اسی کے ذہن و ذکاوت کی وہ پیداوار ہوتی ہے اور اسی کے خیالات و حسیات کا مجسمہ۔ اس لحاظ سے تاریخ ادب میں ہماری توجہ ان شخصیتوں پر ہونی چاہیے جنہوں نے ادب کی ساخت و تشکیل میں حصہ لیا۔ ایک مختصر کتاب میں ہم ان کی حیات، تجربات و کردار کی پوری تفصیل ظاہر نہیں کر سکتے۔ تاہم ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ مختلف اشخاص (یا مصنفین) میں ذکاوت کے لحاظ سے فرق و امتیاز کریں۔ ذکاوت کا مفہوم نہایت وسیع ہے لیکن ادبی دنیا میں شخصی قوت اور جدت مراد ہے کیا خوب کہا گیا ہے کہ ہر بڑا مصنف دنیا میں ایک بالکل نئی چیز لاتا ہے یعنی خود اپنی ذات۔ اور یہ صحیح ہے کیونکہ وہ اپنی تحریرات میں خود کو منتقل کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا بیان اپنا ایک مخصوص اور ممتاز رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اور دوسرے اشخاص کے بیان سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ہر شاہکار کے مطالعہ میں شخصی عنصر جزو لاینفک ہے کسی تاریخی مطالعہ میں گو وہ کتنا ہی مختصر اور غیر تفصیلی کیوں نہ ہو اس عنصر کو احتیاط سے پیش نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ فلاں مصنف کو اپنی قوم کے ادبیات میں یہ درجہ کیوں ملا ہے؟ اس نقطہ نظر سے تاریخ ادب کا اہم کام یہ ہے کہ ہر مصنف نے شخصی طور پر جو خاص سرمایہ اپنے ادب میں چھوڑا ہے اس کی نوعیت اور قدر کو واضح کیا جائے لیکن یہ کام اس کے فرائض کا چھوٹا سا حصہ ہے کیونکہ مصنفین اور ان کی تصنیفات کی محض ایک فہرست

کو تاریخ ادب نہیں قرار دیسکتے۔ ادب بحیثیت مجموعی بلحاظ مرورِ ادوار نشوونما پاتا اور بدلتا رہتا ہے۔ تاریخ کا کام یہ بتانا ہے کہ اس دفتر میں ہر مصنف کی جگہ کیا ہے اور اس کا تعلق اپنے متقدمین و متاخرین کے ساتھ کس طرح رہا۔ ایک غیر معمولی شخصیت والا مصنف یقیناً اپنے عہد کے ادب پر اپنا اثر چھوڑتا ہے اور بہت سے متاخرین ارادۃً یا بلا ارادۃً اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں اس طرح سے "درسگاہیں" اور "تحریکات" وجود میں آتی ہیں، یہ ایک خاص عرصے تک قائم رہتی ہیں اور مذاق و حالات کی تبدیلی کے ساتھ دوسری "درسگاہیں" اور "تحریکیں" ان کی جگہ لیتی ہیں مثلاً انگریزی ادب میں پوپ کا مدرسہ۔ رومانی تحریک وغیرہ اس قسم کی درسگاہیں اور تحریکیں ہمیشہ ارتقائے ادب میں بڑا حصہ لیتی ہیں اور متعلم کے لئے انفرادی مصنفین کی سی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے زیادہ بلند پایہ مصنف بھی اپنا ذہنی سلسلہ و میراث رکھتا اور تحریک و مثال کے باعث دوسروں کا مرہون منت ہوتا ہے۔

ابھی ابھی پوپ کے مدرسہ کا ذکر کیا گیا لیکن اس کا خاص انداز بیاں اس کا اپنا تراشیدہ نہیں تھا البتہ اس کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ انداز بیان ایک طولانی ادبی تحریک کا نتیجہ تھا جس کی ایک بڑی پیداوار پوپ کا پیشرو ڈرائڈن تھا۔ اسی طرح رومانی تحریک کا حال ہے جس کا زبردست معلم و حامی سر والٹر سکاٹ تھا۔ لیکن رومانی درسگاہ کا معلم بننے سے پہلے اسکاٹ کو اپنے پیشرووں سے اس مدرسہ میں تعلیم پانا پڑا۔ تاریخ ادب میں ان تمام امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ مصنفین اور گروہوں کے درمیان تعلقات کو واضح کرنا چاہیئے۔ درسگاہوں اور تحریکوں کی پیدائش، ترقی و زوال سے بحث کرنا چاہیئے اور اگر کوئی مصنف ان کی پیدائش یا ترقی کا باعث ہوا ہو تو اس کے اثر کو بھی ظاہر کر دینا چاہیئے۔

لیکن ہمارا کام یہیں ختم نہیں ہوتا۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ادب بحیثیت مجموعی حسب مرور ادوار بڑھتا اور بدلتا رہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر عہد کی دلچسپیاں اور اشیاء سے متعلق خیالات مخصوص ہوتے ہیں اس لحاظ سے اس عہد کا ادب ایک خاص مذاق کی پیداوار ہوتا ہے یہ مذاق ایک خاص عرصہ تک قائم رہتا ہے اور ایک عہد کا مذاق عموماً دوسرے عہد سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے لئے ہم عہد وکٹوریا کو لے سکتے ہیں جس کو گزرے تھوڑا سا عرصہ ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس طرح اس زمانہ کی بعض رسوم و رواج ہمارے لئے اجنبی ہیں، اسی طرح اس عہد کے ادب کی بعض باتوں کا حال ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عہد سپنسر (SPENSER) میں فیری کوئین (FARIE QUEEN) کی اور عہد پوپ میں ریپ آف دی لاک (RAPE OF THE LOCKE)

کی اور عہد اسکاٹ میں لیڈی آف دی لیک (LADY OF THE LAKE) کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی بہت زیادہ تھی اس اعتبار سے تاریخ ادب کا اہم کام یہ بھی ہے کہ ایک عہد سے دوسرے عہد تک ادب کی تبدیلیوں کو واضح کرے اور ان کے اسباب کی چھان بین کرے۔

ان اسباب میں سب سے پہلے افراد انسانی کا اثر قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ ایک بڑا مصنف ایک نیا مذاق پیدا کرتا اور ادب میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ہر صاحب ذکاوت اپنے گردوپیش کے حالات اس کی تہذیب، خیالات اور دماغی واخلاقی رجحانات سے لازماً متاثر ہوتا ہے اس لئے اس کی تحریرات کی خصوصیت پر ان باتوں سے روشنی پڑتی ہے اگر ایک زبردست شخصیت والا مصنف اپنے عہد پر اپنا ایک نقش بٹھاتا ہے تو ساتھ ہی وہ اپنے عہد سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بیان کی قبولیت عموماً ملک کی دلچسپی و مذاق کے مطابق ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے ہم ہر مصنف کو اپنے عہد کی پیداوار سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس زمانہ کے ان اثرات کی تلاش کریں گے جنہوں نے اس کے خیال و مذاق کی رہبری میں حصہ لیکر اس کے کلام میں امتیازی رنگ پیدا کر دیا۔

اس قسم کی تحقیق بہت وسیع ہوتی ہے۔ کبھی زیر بحث اثرات خالص "ادبی" ہوتے ہیں یعنی وہ بعض کتب وادبیات کے مطالعہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایلزبتھی ادب پر غور کر سکتے ہیں نشاۃ جدیدہ نے اس عہد میں یونانی اور لاطینی ادب عالیہ (CLASSICS) کے مطالعہ کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور اسی ذوق نے انگریزی ادب کے ہر باب میں شاندار نتائج پیدا کئے۔ اسی طرح سترھویں صدی کے اختتام پر فرانسیسی ادب کا اثر انگریزی ادب پر غالب تھا اور ایک سو سال بعد یہ جگہ جرمن ادب نے لے لی۔ مگر اکثر دفعہ یہ اثرات "غیر ادبی" ہوتے ہیں اور عموماً حیات، سیاسیات اور اجتماعیت کی وجہ رونما ہوتے ہیں۔ کسی عہد کی زندگی میں جو چیزیں نئی دلچسپیوں اور خیالات کا باعث ہوئیں یا جو چیزیں اس کے خیالات وجذبات کی متغیر تشکیل کا سبب ہوئیں یا جو باتیں اشیاء واشخاص سے متعلق اس عہد کے زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا باعث ہوئیں۔ ان تمام کو اس عہد کے ادب کی پیدائش میں جزو لازمی سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے ہر کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے مثلاً تحریک اصلاح (REFORMATION) انقلاب فرانس انیسویں صدی میں ترقی سائنس۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عام تاریخ اور تاریخ ادب میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔

آخر میں ہم تاریخ ادب کے فرائض کا خلاصہ کر سکتے ہیں۔ اس کا بڑا مقصد ارتقائے ادب کی چھان بین

ایک عہد سے لیکر دوسرے عہد تک اس کی تبدیلیوں کی تحقیق اور اس کے مواد و صورت میں واقع ہونے والے تغیرات کی توضیح ہے۔ اس کے بعد ان تغیرات کے اسباب و علل سے بحث کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف اشخاص اور ان کے ادبی سرمایہ کی تاریخ ہو جاتی ہے بلکہ ان شخصی اور غیر شخصی قوتوں کی بھی جو ان کے کام میں ممد ہو جائیں۔

(ماخوذ از ہڈسن)

حافظ شیراز

رسالہ نگار کی رائے:-

اس کتاب میں مولوی سید یوشع بی، اے، نے جو متوسلین دکن میں سے ہیں، حافظ کی شاعری پر خود اس کے شعروں سے مدد لیکر تنقید کی ہے یعنے انہوں نے ظاہر کیا ہے کہ حافظ خود اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا یہ مقالہ اسلوب بیان و ندرت گفتگو کے لحاظ سے اچھا ہے...... طباعت کتابت نہایت پاکیزہ، قیمت (۸/)

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد

خانہ برباد

از

جناب سید علی شبیر صاحب صدر منتظم عدالت عالیہ

وہی دھوپ ہے وہی چھاؤں ہے　　　یہ تو ہو نہ ہو میرا گاؤں ہے
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہی گلیاں ہیں یہ جہاں کبھی　　　پھرا کرتا تھا میں خوشی خوشی
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

یہ درخت ہے وہی نیم کا　　　میں تو جھولا جس میں تھا ڈالتا
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

یہی ہاں وہ توتے کا تال ہے　　　میں یاں تیرتا تھا خیال ہے
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہ مکان اگلے اُجڑ گئے　　　یہ تمام گھر ہیں نئے نئے
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

میرے گھر کا نقشہ بدل گیا۔　　　کوئی اور اس میں ہے آ رہا
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہ مکاں رہا نہ مکیں رہے　　　میرے ساتھی ہائے کہاں گئے
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

مرا رہنا سہنا اے بام و در　　　تمھیں یاد ہو کہ نہ ہو مگر
مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

دیاسلائی

از

جناب ناکارہ حیدر آبادی

تمہید بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی شخص سے رستہ میں ایک آدھ دیا سلائی مانگ لینا ایک نہایت ہی سہل کام ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال نہایت مضحکہ خیز ہے۔ میں یہاں دلائل و براہین سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اپنی خاص ڈائری سے میرا اپنا ایک "تلخ تجربہ" نقل کئے دیتا ہوں جسے آپ لوگ جھوٹ سمجھ کر پڑھیں تو زیادہ بہتر ہوگا اسے پڑھنے کے بعد بھی اگر بعض ناظرین کو اختلاف رائے ہو یا شکوک باقی رہ گئے ہوں تو وہ بالمشافہ یا خط و کتابت کے ذریعہ مجھ سے سوال کر سکتے ہیں اور اپنے شبہات دور کر سکتے ہیں۔ آخر میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔

"اتر جاؤ!" ایک سیاہ پوش شخص نے جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا، پکارا۔

میں نے اپنے دل کو تسلی دے لی کہ یقیناً میں اس شخص کا مخاطب نہیں۔ اور برابر بائیسکل کے پڈل مارتا گیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی نہ پروا کہ پولیس کا سپاہی کس بدنصیب کو اتر جانے کا حکم دے رہا ہے۔ مگر پھر آواز آئی "لیمپ جلاؤ! ... فُر فُر فُر!"

میں نے اپنے لیمپ کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر سپاہی کو دیکھا۔ غریب اپنے ہاتھ زور سے ادھر اُدھر دائیں بائیں آگے پیچھے ہلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ناچ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یا تو کسی افریقی رقص کا مظاہرہ کر رہا ہے یا قواعد کر رہا ہے۔ مجھے اس کی اس حالت بےکسی و بےبسی پر بڑا ترس آیا۔ میں فوراً اپنی بائیسکل پر سے اتر پڑا۔ ممکن تھا کہ ایسا کرنے کے بجائے سپاہی کی چیخ پکار

کی پرواہ کرکے میں تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نکل جاتا مگر پھر مجھے فوراً ہی یاد آگیا کہ قریب ہی میں ایک تھانہ ہے۔ اس وقت بائیسکل کا لیمپ جلا لینا ہی مناسب معلوم ہوا چنانچہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دیا سلائی کی ڈبیہ ندارد۔ میں نے کہا چلو۔ دو پیسوں کی قربانی ہی سہی مگر پھر خیال آیا کہ دو پیسے ہاں چارپائی، جی ہاں ایک دو نہیں۔ اچھے چارپائی، محض ایک دیا سلائی کے واسطے خرچ کرنا اسراف نہیں تو اور کیا ہے۔ ان دو پیسوں کا اس سے بہتر مصرف ہو سکتا ہے۔ آج جمعرات کا دن ہے اور شہر میں فقیروں کی کمی نہیں۔ اس طرح کیوں نہ ثواب کمایا جائے؟ کسی رہرو سے کیوں نہ دیا سلائی مانگ لی جائے؟

مجھے زیادہ دیر ٹھہرنا نہ پڑا۔ میں نے پہلے گذرنے والے سے پوچھا: "کیا آپ کی جیب سے ایک آدھ دیا سلائی برآمد ہو سکے گی؟"

چونکہ سوال ذرا پیچیدہ اور ٹیڑھا تھا اس لئے اسے سمجھنے میں ذرا دیر ہوئی۔ "نہیں ہے ناجی حجرت!" اس نے ایک منٹ میرا منہ تکنے کے بعد کہا۔ اور وہاں سے اس طرح دفع ہوا گویا میں اس پر پل پڑنے والا ہی ہوں۔

کچھ دیر بعد ایک اور آدم کے بیٹے کا اُدھر سے گذر ہوا۔ میں سد راہ ہو گیا۔ "آپ پاس دیا سلائی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دیا سلائی چاہیئے؟" آپ کہنے لگے "ابھی حاضر کرتا ہوں" اور ساتھ ہی ساتھ شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالنے اور نکالنے کا عمل شروع ہو گیا۔ "مجھے خوب یاد ہے" آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ میں نے ایک ڈبیہ کل ہی خرید کے اس شیروانی میں رکھی تھی۔ اللہ کی قسم وہ ڈبیہ پیچھے کی جیب میں کل سے پڑی تھی —— یا ہاں بہت ممکن ہے کہ اوپر کی جیب میں ہو۔ ٹھہرئیے ٹھہرئیے۔ ذرا ان پارسلوں کو تھام لیجئے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" میں بولا۔ "خواہ مخواہ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں کسی اور شخص سے مانگ لوں گا۔"

کہنے لگے "واہ تکلیف کی کونسی بات ہے؟ ابھی ایک منٹ کے اندر مل جاتی ہے۔" اور پھر آپ کی لمبی لمبی انگلیاں ان کی اپنی جیبوں کی گہرائیوں میں غوطے لگانے لگیں۔ پھر یہ وہ شیروانی نہیں جو میں عموماً . . . . . "

میں نے دیکھا کہ آپ کا جوش وخروش لمحہ دوگنی تا تیہ چوگنی ترقی پر ہے ۔ اُسے ٹھنڈا کرنا ہی بہتر معلوم ہوا۔ "خیر جانے دیجئے" میں نے کہا "اگر یہ شیروانی وہ نہیں جو آپ عموماً . . . تو خیر جانے دیجئے ۔ کوئی مضائقہ نہیں" مگر شاید انہوں نے نہیں سنا ۔ بولے ۔ٹھہرو ۔ ٹھہرو ۔ ڈبیہ کہیں نہ کہیں ضرور ہونا چاہئے شاید اس میں ہو۔ نہیں، اس میں بھی نہیں ۔ ٹھہرو ذرا اپنی واسکوٹ کو دیکھ تو لوں ۔ اگر وہ حرامخور درزی جانتا کہ شریف آدمیوں کی جیبیں کس طرف لگائی جاتی ہیں . . . . ."

میں نے سوچا کہ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا۔ اس وقت تک اس کی حالت عجیب وغریب ہوگئی تھی ۔ اس نے جھنجلا کر اپنی چھڑی ایک طرف کو پھینک دی ۔ "یہ سب میرے ناخلف لونڈے کا کیا دھرا ہے ۔" اس نے اپنی خشخشی ڈاڑھی کے بال نوچتے ہوئے کہا "یہ معاش ہر وقت ٹٹولتا رہتا ہے ۔ جب دیکھو میری شیروانی سے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے ۔ گھر چلکر اس نامراد کی کھال نہ ادھیڑ ڈالی اور اسے کچا نہ چبا ڈالا تو کچھ نہ کیا۔" معاً میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میرے شریف کی صورت آنکھوں میں پھر گئی ۔

"آہ ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں !" میں کہنے لگا "خدا کے لئے (بقول آپ کے) اپنے ناخلف لخت جگر نور نظر کو اس لہجہ میں نہ کوسئے ۔ ہے ہے ! مجھے آپ کی اس خشخشی ڈاڑھی پر بڑا ترس آرہا ہے ۔ کیوں آپ اس بیچاری کے بال نوچ رہے ہیں ! اور یہ آپ نے کیا فرمایا کہ گھر پہنچکر اپنے ہی لونڈے کو کچا کھا جاؤنگا خدانخواستہ آپ مردم خوار کی نسل سے تھوڑے ہی ہیں جو ایسا کرنے چلے ۔" مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ نہیں سن رہا ہے ۔

ارے ہاں ! ذرا صبر سے کام لیجئے" وہ کہہ رہا تھا "پتلون کی جیب میں دیکھتا ہوں ۔ آپ میری شیروانی کا دامن . . . . . . "

میں نے خیال کیا کہ سب سے بہتر ایک مختصر مگر موثر تقریر کرنا ہوگا ۔ "جناب آپ خواہ مخواہ زحمت مت فرمائیے ۔ ڈبیہ نہ ملی نہ ملی ۔ کوئی مضائقہ نہیں ۔ نہیں نہیں ۔ آپ کو اپنی شیروانی اتارنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ آپ یہ کاغذات ایسی بے دردی سے کیوں پھینک رہے ہیں ؟ ازراہ کرم اپنے پارسل واپس دے کر بندہ کو ممنون ومشکور فرمائیے ــــ اور آہ ! آپ اپنے کپڑے اس بے رحمی سے پھاڑنے کی کیوں کوشش کر رہے ہیں ؟ کیا آپ کا دھوبی اس کا اہل نہیں ؟ اور یہ آپ . . "

یکایک اس کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ، خوشی کی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالا "میں نے پالیا! میں نے پالیا! یہ لیجیے!" وہ چلایا، اسی طرح جس طرح ارشمیدس اپنے تجربہ کو کامیاب ہوتے دیکھ کر مارے خوشی کے چلایا ہوگا مگر فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ سائنس داں بالکل ننگ دھڑنگ تھا۔ جی چاہا کہ اپنے آپ کو اس فرشتہ خصلت شخص کی لمبی گردن پر ڈال دوں میں نے کہا چلو اتنی دیر کی محنت اکارت تو نہیں گئی۔ کچھ ہو آخر ڈبیہ مل تو گئی۔ میں نے ڈبیہ اس کے ہاتھ سے لے لی، اس کا شکریہ ادا کیا اور کھول کر دیکھا۔

دیا سلائی کی ڈبیہ خالی تھی! ــــ یکایک میرے بہیمانہ جذبات بیدار ہو گئے۔ میں نے اس شخص کو ایک گذرنے والی موٹر کے سامنے ڈھکیل دیا اور جو ہو سو ہو کہکر اپنی رفیق حیات (بائیسکل) پر سوار ہو "ہوں میرا بھائی" ہو گیا ــــ اس روز سے لیکر آج تک مجھے پھر کسی سے دیا سلائی مانگنے کی خواہش ہوئی ہے نہ ہمت۔

وفورِ اضطراب

از

جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری

رہے گی چیرہ دستی تا کجا تارِ گریباں پر — جنوں کو دسترس اے کاش ہوتی رشتۂ جاں پر

وفورِ اضطراب و جوششِ وحشت معاذ اللہ — کہ ہوتا ہے گمانِ صبحِ محشر شامِ ہجراں پر

ترے ذوقِ خلش کی اے دلِ مجروح کچھ حد بھی — کہ دم آنکھوں میں ہے حسرت بھری نظریں نمکداں پر

کوئی شوریدہ سر کیا آج ہی کل میں رہا ہوگا — قیامت کی اداسی ہے در و دیوارِ زنداں پر

طریقِ حسن میں یہ بھی مگر ہے طرزِ غمخواری — کوئی رہ رہ کے ہنستا ہے مرے حالِ پریشاں پر

یہ چھیڑ اے آرزو اب کشتۂ تیغِ تغافل کو — وہ بت اور آئے بہرِ فاتحہ گورِ غریباں پر

مدد اے شانِ وحدت المدد اے ذوقِ نظارہ! — پڑے ہیں جلوۂ کثرت کے پردے چشمِ حیراں پر

ضرورت ہے کہ وا ہو دیدۂ عبرت نظر کوکب — عجب عالم ہے ہنگامِ سحر شمعِ شبستاں پر

حکیم قاآنی

(میرزا حبیب شیرازی)

از

جناب عبدالقوی صاحب فانی، ایم، اے (علیگ) لکچرار فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

پروفیسر فانی، حکیم قاآنی کی سوانح حیات اور تنقید کلام پر ایک بسیط محققانہ مقالہ لکھ رہے ہیں جس کے مختلف حصے بعض رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر پروفیسر صاحب موصوف کا ایک مضمون "مکتبہ" کے ذریعہ ہدیہ ناظرین کیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون درحقیقت اس سے پہلے شائع ہونا چاہیے تھا لیکن پریس کی منزلوں میں ایسا چھپا رہا کہ آج تک دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ امید ہے کہ قارئین کرام خصوصاً فارسی ادب کے متعلق اس کو بڑی دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں گے۔ (مکتبہ)

خاندان اور پیدائش

سرزمین ایران کے اس سدابہار چمنستان میں جہاں بلبل شیراز[۱] اور لسان الغیب[۲] نے شاخسار سخن پر جلوہ افروز ہو کر زمزمہ سنجی کی تھی اور ساری دنیا کو محو کر دیا تھا میرزا محمد علی گلشن[۳] کے آشیانہ میں خیابان کلام کے ایک اور ہزار داستان کا ظہور ہوا جس کی چہک اور نوا سنجیوں نے چار دانگ عالم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ شکرستان فصاحت کا یہ طوطی اور گلستان بلاغت کا یہ بلبل میرزا حبیب قاآنی تھا۔ شیراز میں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ اپنی کتاب[۴] "پریشان" کے آخر میں جو میرزا حبیب نے سعدی کی گلستان کے طرز پر تصنیف کی تھی لکھتا ہے:۔

شکر کہ از یاریِ یزدانِ من　　جمع شد اوراق پریشانِ من

. . . .

رفتہ زماہِ رجب ایام بیست　　پنجہ و دو سال و ہزار و دویست
کم بود از سی دو سہ مہ سالِ من　　لیک بسے خستہ بود حالِ من

---

(۱) شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین سعدی شیرازی۔ (۲) خواجہ محمد شمس الدین حافظ شیرازی (۳) مجمع الفصحا جلد ۲ (۴) پریشان صفحہ ۸ مطبوعہ بمبئی

کہتا ہے شکر ہے کہ خدا کی مدد سے میری کتاب پریشان ۲۰ رجب المرجب ۱۲۵۲ھ (مطابق یکم نومبر ۱۸۳۶ء) کو جبکہ میری عمر ۳۰ سال ہونے میں دو تین ماہ کم تھی ختم ہوئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاآنی کا سنہ پیدائش ۱۲۲۲ھ (مطابق ۱۸۰۷ء) تھا۔

جس خاندان سے اس رنگین مزاج شاعر کا تعلق تھا اس کا نام زنگنہ تھا۔ میرزا حبیب کے والد میرزا محمد علی جن کا تخلص گلشن تھا خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کی نسبت مؤلف مجمع الفصحا[۱] لکھتے ہیں۔

"در ایام شبیب اوکہ زمان شباب مولف بود مکرر در شیراز صحبتش دست می داد۔ . . . . سیاق اشعارش پسندیدہ فصحای زماں بنفتاد۔"

بچپن اور یتیمی

قدرت نے ذہانت اور حافظہ کا عطیہ میرزا حبیب کو نہایت فیاضی سے عطا کیا تھا۔ جو باتیں اور بچے مدتوں میں سیکھتے وہ بہت جلد سیکھ لیتا۔ والدین کو اس ہونہار فرزند سے بہت محبت تھی۔ یہ اللہ آمین کی اولاد ناز و نعم میں پرورش پاتی رہی اور باپ کی تربیت آموز نظر کچھ کم گیارہ برس تک اتالیق کا کام دیتی رہیں۔

زمانہ کی گردش نے اس گوہر شاہوار کو بہت جلد دریتیم کر دیا اور وہ محبت بھری آنکھیں جو میرزا حبیب کے جمال کو دیکھ کر روشن رہتی تھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں یعنے شفیق باپ کا سایہ میرزا حبیب کے سر سے اٹھ گیا۔

میرزا طاہر جو ناصر الدین شاہ کے زمانہ کا ایک اچھا شاعر اور ادیب تھا گنج شایگاں[۲] میں لکھتا ہے:

"در سن ہفت سالگی از پدر مرحومش میرزا ابوالحسن کہ متخلص بہ گلشن بود و طبعش گلشن فصاحت را چشمۂ روشن خلف ماند"

لیکن خود میرزا حبیب اپنی کتاب[۳] پریشان میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"یازدہ سالہ بودم کہ پدرم گلشن را کہ شمع کمال بنور جمالش روشن بود خارے در پا رفت وہنوز

۱؎ مجمع الفصحا جلد ۲ صفحہ ۲۶

۲؎ دیوان حکیم قاآنی مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۷ھ کی ابتدا میں جو مختصر حال قاآنی کا لکھا ہے وہ گنج شایگاں سے منقول ہے۔

۳؎ کتاب پریشاں صفحہ ۱۹ مطبوعہ بمبئی۔

خارش در پا بود کہ کارش از دست شد۔ چہ بمقتضائی ہرم[۱] ازاں خارش در پا ورمی حادث شد کہ طبیبان بدرمانش درماندند و آیہ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ[۲] لَا يَسْتَقْدِمُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَأْخِرُونَ فروخواندند۔ درآں حالت کہ اجلش فرا رسید ... وصید جانش از قید تن رمیدن گرفت۔"

بہرحال میرزا حبیب کا سن ابھی اس قابل نہ تھا کہ اس پر یتیمی کا کوہ گراں اور پریشانیوں کا آسمان اس طرح یک لخت ٹوٹ پڑتا۔ یہی عمر پڑھنے لکھنے کی تھی اور یہی عمر کھانے پینے اور نشو و نما پانے کی۔ آخر کار یہی صلاح ٹھیری۔ میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس بچہ نے علوم و فنون کی تحصیل کر کے باپ کے گلشن میں وہ خیابان کاریاں اور تختہ بندیاں کیں کہ گل و ریاحین کی کثرت سے گلشن مرحوم کی روح باغ باغ ہو گئی اور اس کا لگایا ہوا نونہال ایران کے چمن زار میں اس طرح پھلا پھولا کہ اس کے رنگ و بو پر خود فصاحت شیدا اور بلاغت فریفتہ تھی۔ اس کے غنچے بڑے بڑے شہزادوں اور اُمرا کے طُرۂ امتیاز کی زینت اور اس کے پھول شاہان کجکلاہ قاچار کے تاج و دیہیم کی زیبائش تھے۔

خراسان کا سفر، تعلیم اور شاعری کی ابتدا

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، جامعہ الازہر قاہرہ (مصر) اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی طرح خراسان[۳] کا دارالحکومت مشہد مقدس بھی اس زمانہ میں ایک زبردست دارالعلوم کا حکم رکھتا تھا جہاں چاروں طرف سے شائقین علوم و فنون آتے تھے اور اس سرچشمۂ علم و فضل سے سیراب ہوتے تھے جس طرح مدرسۃ العلوم دیوبند میں علاوہ تعلیم مفت ہونے کے نادار طلبا کے خورد و نوش اور کتابوں کے مصارف کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح مشہد مقدس میں بھی طلبا کی ہر طرح کفالت ہوتی تھی۔ میرزا حبیب نے بھی خدا پر بھروسہ کر کے بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا[۴] کہا اور بقول میرزا طاہر[۵]

"بحکم فطانت فطری و لیاقت جبلی از برائے تکمیل علوم و تحصیل فنون رای مسافرت کرد و راہ خراسان گرفت۔"

---

۱ بڑھاپا۔　۲ جب موت کا وقت آجاتا ہے نہ ایک گھڑی آگے ٹلتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے۔

۳ اس شہر کا اصلی اور قدیم نام طوس ہے۔ چونکہ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کا مزار یہاں ہے اس لئے یہ مشہد مقدس کہلاتا ہے۔　۴ اللہ ہی کے نام سے اس کشتی کی روانگی اور اس کی لنگر اندازی ہے۔ یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔

۵ دیوان قاآنی۔ دیباچہ۔

اس وقت نہ تو وہاں ریل کا سلسلہ تھا اور نہ موٹروں کا کوئی نظام تھا۔ قافلہ بندی کر کے سفر کرنا پڑتا تھا اور اس جادہ پیمائی کے ساتھ آبلہ پائی کا بھی شرف اکثر حاصل ہو جاتا تھا۔ میرزا حبیب بھی خدا کا نام لیکر چل کھڑا ہوا اور منزلیں مارتا ہوا امام ضامن وثامن کے آستانہ پر جا پہنچا۔ اور اپنی تعلیم کی جدوجہد میں مصروف ہوا۔ بقول[1] مصنف گنج شائگاں۔

"و در ارض مقدس کہ مدرس محصّلین علوم و مرجع مستعدین ہر مرز و بوم است بار اقامت نہاد و باب استفادت کشود۔"

چونکہ تحصیل علوم کی لو دل کو لگی تھی میرزا حبیب نے نہایت محنت سے علوم متداولہ میں دستگاہ حاصل کرنا شروع کی۔ اوائل عمر ہی میں جب کہ ابھی درسیات کی تحصیل جاری تھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور لوگوں میں اس کا چرچا پھیلنے لگا تھا۔ میرزا طاہر کا بیان ہے۔

"ہم در آن عہد صبی و آوان صغر ۔ ۔ ۔ بگفتن شعر پرداخت و از اشعار شیرین نمکین شوری در شہر انداخت۔"

فطری ذہانت، خداداد شوخی طبیعت، طبعی موزونی اور ادب کے نکات و معانی کے ادراک کی قدرتی قابلیت نے لڑکپن ہی سے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ بقول[2] رضا قلی ہدایت۔

"طبعش از صغر سن موزوں بود رفتہ رفتہ ترقی نمود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و در شاعری بمقامات اعلیٰ واصل آمد۔"

مشق سخن کے شروع ہوتے ہی وہ نفیس اشعار اور وہ رنگین قصیدے فصاحت کے سانچے میں ڈھلکر نکلنے لگے جن سے میرزا حبیب کی شہرت تمام نواح میں پھیل گئی۔ چنانچہ گنج شائگاں کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

گروہے کاناو کامل وانبوہے دانا و جاہل وانواع مختلفہ انام از خواص و عوام ۔ ۔ ۔ بر و گرد آمدند واز خردی سال و بزرگی سخن وے بشگفت ماندند زائش طبع و تراوش خاطرش را باقہر و جبر بے رنگ و صبر از یک دیگر گرفتہ دست بدست می بردند تا در تمامی شہر مشہور شد۔"

حضرت لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی اور حضرت امیر خسرو دہلوی کی نسبت مشہور ہے کہ

---

[1] دیوان قاآنی - دیباچہ - [2] مجمع الفصحا صفحہ ۴۲۰ جلد دوم -

یہ حضرات اگرچہ ہمہ وقت فضائے شعر و سخن میں سانس لیتے تھے اور رات دن اسی چرچے میں بسر کرتے تھے ان کو علی الترتیب حضرت بابائے کوہی کے مزار او حضرت نظام الدین اولیا کے فیض سے مستفید ہونے کے بعد شعر و سخن کے میدان میں بازی لیجانے کا موقع ملا تھا۔ اسی طرح میرزا حبیب بھی گو مبدء فیاض سے موزوں طبیعت لیکر آئے تھے مگر چونکہ ان کو اہل بیت رسول سے دلی عقیدت تھی ائمۂ اطہار کی منقبت گوئی نے اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْم کے فیوض و برکات کی ایسی بارش کی اور علیؑ بابھا کے اسرار و رموز کی ایسی باب کشائی کی کہ فصاحت کی گنگا جمنا اور بلاغت کے جیحون و سیحون بہ گئے اور

۱؎ حضرت خواجہ حافظ شیراز ابتدا میں اچھے شعر نہ کہتے تھے۔ محض تفریح طبع کے لئے لوگ اپنی صحبتوں میں ان کو بلاتے تھے اور ان کے بے تکے اشعار سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ دو سال کے بعد جب خواجہ صاحب کو بھی اس تمسخر اور مذاق کا احساس ہوا تو ایک دن بہت غمگین ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جاکر خوب روئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور ان کو ایک لقمہ کھلایا اور کہا کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھتے ہی یہ غزل لکھی۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔ وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند۔

لوگوں کو اس غزل پر بڑا اچنبھا ہوا۔ جب امتحاناً حافظ کو طرح دیگئی اور اس میں بھی انہوں نے عمدہ غزل لکھی تب جاکر اطمینان ہوا اور حافظ کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ (تفصیل کے لیے تذکرہ میخانہ مرتبہ عبدالنبی فخرالزمانی ملاحظہ ہو)

۲؎ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین محمد سلطان الاولیا کے مرید تھے۔ مولانا سید محمد کرمانی المعروف بامیر خرد جو امیر خسرو کے معاصر اور حضرت سلطان الاولیا کے مرید و خلیفہ ہیں اپنی کتاب سیر الاولیا میں لکھتے ہیں :-

"روزے در مدح سلطان المشائخ پیش سلطان المشائخ شعرے گذرانید۔ فرمان شد کہ آن طاس شکر کہ زیر کہٹ است بیار و سر خود نثار کن و قدرے ازاں بخور۔ امیر خسرو ہمچناں کرد لاجرم شیرینی سخن او شرق و غرب عالم گرفت۔"

لیکن خود امیر خسرو مثنوی نہ سپہر میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

من از دو سے لعاب دہاں یافتم ۔ کزان گونہ آب دہاں یافتم

دو قطرہ ازاں در دوات افگنم ۔ تطلم در آب حیات افگنم

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی جامعیت حلاوت سخن اور زور کلام حضرت نظام المشائخ کے

چار دانگ عالم میں ان کی سخن وری کا ڈنکا بج گیا۔ ہم اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں اس مشہور قصیدہ کے چند شعر پیش کرتے ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

بگردون تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

یہ قصیدہ میرزا حبیب نے حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ التحیۃ والثناء کی شان مبارک میں کہا ہے۔ ذیل کے اشعار میں اس معجز بیان شاعر نے "تا حاصل برد فردا" کے فیض کی امید میں "دہقان" بنکر "مزرع ثنا" میں "تخم سخن" کی کاشت کی ہے اور اپنی "سخندانی" کا پورا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

زہے اے نخل باغ دین کہ اندر دیدۂ حق بین نماید خوشۂ پرویں کم از یک دانہ خرما

در اوصاف تو قاآنی دہد داد سخن دانی کند امروز دہقانی کہ تا حاصل برد فردا

سخن تخم است، او دہقان، ثنا مزرع، امل باراں فشاند دانہ در میزاں کہ چیند خوشہ در جوزا

میرزا کی انہیں عقیدتمندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آگے چلکر ایسا بے عدیل شاعر اور بے مثیل سخن سنج ہو جاتا ہے کہ بالفاظ صاحب گنج شائگاں "باتفاق سخن شناساں عصر و دقیقہ یابان نظم و نثر۔ دانشمندے بدیں عذوبت نطق و سلاست بیاں و قدرت طبع و طلاقت لساں مادر ایام نادر زاد و روزگار کمتر از عدم بوجود و از غیب بشہود آورد"

قاآنی کے تخلص کی وجہ اور شاہزادہ نواب شجاع السلطنت کے دربار میں رسائی

چونکہ میرزا کا نام حبیب تھا اس لئے شاعری کے ابتدائی دور میں حبیب ہی تخلص تھا اور اُس زمانہ کی بہت سی نظمیں اسی نام سے لکھی گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک دوسرا شاعر میرزا عباس بسطامی بھی ان کا رفیق طریق تھا جو مسکین تخلص کیا کرتا تھا۔

جب تحصیل علم کے دوران میں میرزا حبیب کا قیام خراسان میں تھا فتح علی شاہ قاچار کا تیسرا لڑکا شہزادہ اعظم شجاع السلطنت حسن علی میرزا خراساں اور کرمان کا گورنر تھا۔ چونکہ شاہزادہ خود صاحب علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷) فیض و برکت اور دعا کا نتیجہ ہے جیسے خود امیر خسرو علی الاعلان کہتے ہیں۔

۵۳ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے متعلق ایک حدیث ہے جس میں جناب رسالتمآب صلعم ارشاد فرماتے ہیں۔ انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازہ ہیں۔

وفضل تھا اور مذاق سخن بھی رکھتا تھا جب میرزا کی شاعری کی شہرت شہزادہ کے کانوں تک پہنچی اس نے میرزا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میرزا نے حسب الحکم قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

گرفت خیمۂ گیتی شمیم عنبر ناب — گرد خاکِ سمرکو ےسپہر عرش جناب

شہزادہ کو یہ قصیدہ بہت پسند آیا اور اس نے میرزا کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا اور اس کی تربیت میں مصروف ہوا۔ چنانچہ بقول میرزا طاہر:

"پس از ادراک سعادت حضور بموجب ظہور نہایت ادراک در ہماں خردسالی در جرگ ندمائے سال خوردِ بشرفِ منادمت بزم خاص اختصاص یافت۔"[۱]

میرزا عباس بسطامی مسکین اور مرزا حبیب دونوں نواب شجاع السلطنت کے مدح گو تھے۔ اس کے دربار میں ایک مدت تک دادِ سخنوری دیتے رہے۔ شجاع السلطنت کے دو بیٹے اوکتا قاآن اور فروغ الدولہ تھے جن سے شہزادہ کو نہایت محبت تھی۔ میرزا حبیب اور میرزا عباس بسطامی مسکین کے جو گہرے تعلقات شاہزادہ سے تھے اور اس کی مربیانہ شفقت جس قدر ان دونوں پر تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہزادہ نے میرزا حبیب کا تخلص قاآن کے نام پر قاآنی اور میرزا عباس کا تخلص فروغ الدولہ کی نسبت سے فروغی قرار دیا۔ چنانچہ ایک قصیدہ[۲] میں خود قاآنی اسی کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے۔

جہاندارا منم آن سخن سنج ہنر پرور — کہ از قاآن دو ران نم لقب گردیدہ قاآنی

---

[۱] مجمع الفصحا ص ۳۹۴ جلد دوم

[۲] دیوان قاآنی ص ۳۴۶

غزل

از

جناب قادر محی الدین صاحب ارماںؔ منشی فاضل

مری آنکھوں سے پردہ کرتے ہو میری نظر ہو کر
بنے ہو سنگ دل پتھر میں چھپتے ہو شرر ہو کر

الٰہی مطلب مشکل کا بر آنا ہوا مشکل
نکلتی ہے مرے دل سے دعا بھی بے اثر ہو کر

سمندِ عمر اک دن منزل آخر پہ پہنچے گا
منازل ہو رہیں گے طے یوں ہی شام و سحر ہو کر

خوشی سے میں بھی پھر زخم جگر اپنے دکھاؤں گا
مگر یہ شرط ہے پوچھو کبھی تم چارہ گر ہو کر

زمانہ قیسؔ کو دیوانہ کہتا ہے تعجب ہے
خبر رکھتا تھا لیلیٰ کی ہمیشہ بے خبر ہو کر

جوانی میں غرور انسان کو زیبا نہیں سچ ہے
شجر گلشن میں ہوتے ہیں خمیدہ بارور ہو کر

کہاں کی فاتحہ ٹھوکر لگانے کاش آجاتے
ہماری خاک اُڑتی کچھ اِدھر اور کچھ اُدھر ہو کر

تمنا ہے عوض نامہ کے اپنی جان ہی دیدوں
چلا ہے کوئے دلبر دل میرا جب نامہ بر ہو کر

مقدر پر شہیدان چمن کے رشک آتا ہے
بہا لیتی ہے شبنم ان پہ آنسو نوحہ گر ہو کر

کہاں ہے کوئے دلبر اے دل بیتاب حیرت ہے
ارادہ اور اتنی دور کا بے بال و پر ہو کر

محبت کا نتیجہ آج کچھ نکلے گا اے ارماںؔ
مری رودادِ غم وہ سن رہے ہیں دادگر ہو کر

تنقیدیں

دنیائے راز

ازجناب رازؔ چاندپوری چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۱۲) قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

یہ جناب راز صاحب چاندپوری کا پاکیزہ مجموعہ کلام ہے جو بڑی خوبی اور نفاست سے مرتب اور طبع کیا گیا ہے ابتدا میں مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کا ایک مقدمہ ہے جس میں کلام راز کے محاسن پیش کئے گئے ہیں۔ راز صاحب ایک قدرتی شاعر اور اعلیٰ درجے کے حسن کار ہیں۔ ان کی نظمیں ہندوستان کے اکثر و بیشتر ادبی رسالوں میں کئی برس سے شایع اور مقبول خاص و عام ہوتی رہی ہیں۔ تخیل کی بلندی، خیالات کی گہرائی اور مناسب جوش و سادگی ان کے کلام کی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کا کلام تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ہر صاحب ذوق اس کو پڑھ کر مزے لینے لگتا ہے۔ دنیائے راز میں کلام کو مختلف سرخیوں کے تحت درج کیا گیا ہے جو ان نظموں پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہید و تحمید، تخیلات و تصورات، مشاہدات و واقعات سرد لبراں وغیرہ۔ راز کی دل افروز شاعری کی مقبولیت کے مدنظر ہمیں امید ہے کہ دنیائے راز ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور جدید شاعری کے شیدائی اس مجموعے میں اپنی مرغوب طبع چیز پائیں گے۔

سالگرہ نمبر صبح دکن

مرتبہ مولوی احمد عارف صاحب مدیر قیمت قسم اول عہ قسم دوم عہ دفتر صبح دکن افضل گنج روڈ یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

ابتدائے تہذیب سے ہر ملک کی وفا شعار رعایا اپنے بادشاہ، مالک یا قاید اعظم کی سالگرہ کی تقریب مناتی اور اپنی عقیدت مندی اور دلی مسرت کا اظہار کرتی رہی ہے۔ ہمارے ملک میں زمانہ قدیم سے جہاں مختلف طور پر مختلف طبقات رعایا و برایا اپنے بادشاہ ذی جاہ کی تقریب سالگرہ منایا کرتے ہیں، اخبارات ملک بھی اس مبارک دن اپنی عقیدت مندی سے تبریک و تہنیت کے مضامین اور نظموں سے مزین اور خوش رنگ شایع ہوتے ہیں۔ اس خصوص میں حیدرآباد کے مشہور روزنامہ صبح دکن کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولوی احمد عارف صاحب پچھلے دو تین سال سے بڑے اہتمام اور کوشش سے اپنے اخبار کا سالگرہ نمبر شایع کرتے

ہیں۔ جو ایک طرف سالگرہ نمبر بھی ہوتا ہے اور دوسری طرف سالنامہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اب کی دفعہ صبح دکن کا یہ نمبر بڑی آب و تاب سے شایع ہوا ہے اور سچ یہ ہے کہ نہ صرف پچھلے تمام سالگرہ نمبروں سے بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اردو صحافت میں اپنی خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول اعلیٰحضرت آقائے ولی نعمت کے کلام فخر سلاطین، شاہانہ مجوزہ طرح پر غزلوں، مدحیہ نظموں اور قصیدوں کے علاوہ ذات شاہانہ کے عہد کی ترقیوں، سیرت و کردار شاہانہ کے متعلق دلچسپ مضامین سے مزین ہے۔ دوسرے حصے میں متعدد علمی ادبی تاریخی اور سیاسی دلچسپی کے مضامین اور متعدد اعلیٰ نظمیں شریک ہیں۔ دونوں حصوں کے مضامین نہایت دلچسپ اور بلند پایہ ہیں اور نظمیں اکثر و بیشتر عمدہ تخیلات اور اچھے احساسات کا نمونہ ہیں۔ حصہ دوم میں ایک مضمون "متفقیت اور وحدت اسلامیہ" جو جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ام، اے رکن دارالترجمہ کا ہے بلاشبہ مفید اور ایک نہایت معتبر سیاسی کتاب پر مبنی ہے مگر طرز بیان اور اصطلاحات کی پیچیدگی کی وجہ سے بہت مغلق اور عسیر الفہم ہو گیا ہے۔ قاضی صاحب نے فیڈرلزم کے لئے جو اس دور گول میز کانفرنس میں بہت عام ہو گیا ہے متفقیت کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ خود بہت مغلق ہے۔ اس کے لئے وفاقیت نہ صرف سہل اور اچھی اصطلاح ہے بلکہ مقبول خاص و عام بھی ہے۔ اسی مضمون میں انہوں نے کمیونزم کے لئے بار بار مشترکیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے لئے اشتراکیت کئی برس سے سارے ہندوستان میں رایج ہے۔ قاضی صاحب کے الفاظ کے مقابلے میں یہ دونوں لفظ نہ صرف بولنے میں سہل ہیں بلکہ صحیح اصول پر وضع ہوئے ہیں۔ وفاق اور اشتراک سے اسم مصدر وفاقیت اور اشتراکیت ہی بنینگے نہ کہ متفقیت و مشترکیت۔ اسم فاعل سے اسم مصدر بنانے کا طریقہ کلیہ نہیں بلکہ استثنائیہ ہے۔ مضامین نظم و نثر کے علاوہ سالگرہ نمبر حضور بندگان عالی، حضرت ولیعہد کی نئی تصویروں کے علاوہ ملک کے متعدد ادیبوں شاعروں اور عہدہ داروں کی تصویروں سے بھی آراستہ ہے۔

دیوان اثر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے (علیگ) معتمد انجمن ترقی اردو ضخامت (۸۰) صفحات مجلد قیمت ۱۲/ عہ حالی یا ۱۲/ عہ کلدار دفتر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)، یا مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن سٹرک حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

یہ خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کا نہایت مختصر دیوان ہے جسے انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے ابتدا میں حسب معمول مرتب کا مقدمہ ہے مگر طویل نہیں بلکہ بالکل مختصر۔ ایک دو صفحات میں شاعر کا ذکر

ایک دو میں اس کی شاعری پر رائے اور باقی تین جا صفحات میں انتخاب کلام اور مقدمہ ختم، محقق مرتب کا کہنا ہے کہ شاعر کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر تذکروں میں بہت کم حالات مندرج ہیں بریں ہمہ اگر پورے طور پر داد تحقیق دیجائے تو مختلف ذرایع اور ایک حد تک شاعر کے کلام سے بہت کچھ ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میر اثر کی شاعری زبان کی سادگی اور اثر کی خوبیاں بدرجہ اتم رکھتی ہے اور اس خصوص میں وہ اردو کے تقریباً تمام شاعروں میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ نظام کالج حیدرآباد کی بزم ادب کی جانب سے بھی میر اثر کا ایک دیوان قبل ازیں شایع ہوچکا ہے۔ زیر نظر دیوان اور اس دیوان میں اشعار کا تھوڑا سا فرق ہے یہ نامناسب نہیں کہ دیوان اثر جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ میں دیوان درد کی بجائے شریک نصاب کیا جائے کیونکہ ادبیات کے نصاب میں ہمیشہ اسی قسم کا ردوبدل مستحسن ہے اس سے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لئے تنوع کے علاوہ ایک ہی کتاب کے کئی سال تک رہنے سے جو بیزاری، بے لطفی و بے توجہی پیدا ہوجاتی ہے وہ رفع ہوجائیگی۔

تاریخ مغربی یورپ جلد اول مترجمہ مولوی یحیٰ صاحب تنہا بی، اے، ال ال بی وکیل عدالت عالیہ بڑی تقطیع ضخامت (۲۸۲) صفحات قیمت ۲ روپے حالی یا عالی کلدار جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی یا مکتبہ ابراہیمیہ سے طلب کی جائے۔

ڈاکٹر راین سن کی تاریخ مغربی یورپ ایک مشہور اور متداول کتاب ہے اور ہندوستان کی کئی جامعات میں بی، اے کے نصاب تاریخ میں شریک رہ چکی ہے۔ مولوی تنہا صاحب نے اس کی جلد اول کو صفائی اور خوبی کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے حالات زندگی کے اضافے اور کچھ حواشی کے ساتھ اسے اصل سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے۔ اردو میں ایسی اعلیٰ درجے کی محققانہ کتابوں کے ترجمے کی بہت ضرورت ہے اور اگرچہ حیدرآباد میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ بہت سی عمدہ کتابوں کا ترجمہ کرچکا ہے لیکن اس کا دایرہ افادہ متعدد غیر تجارتی طریقوں کی وجہ سے نہایت ہی محدود ہے۔ کتابیں اس قدر گراں پڑتی ہیں کہ عام مطالعہ کرنے والے تو کیا طلبہ جامعہ بھی انہیں نہیں خریدتے۔ اس کے برخلاف جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈمی کی طرف سے بعض ایسی عمدہ کتابیں بالکل تجارتی اصولوں پر شایع ہوئی ہیں کہ عام طور پر آسانی سے خریدی جاسکتی ہیں۔ تاریخ مغربی یورپ کا بھی یہی حال ہے کتاب نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ اس پر قیمت بھی نہایت واجبی اور مناسب ہے امید ہے کہ اہل علم اور بالخصوص تاریخی

مذاق رکھنے والے حضرات اس کتاب سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔

الکشافہ مرتبہ مولوی محمد حمید اللہ صاحب ایم، اے، ال ال بی (عثمانیہ) شاہی ۱۰ وقیمت سالانہ (۱۲)، حجم (۲۲) صفحات ملنے کا پتہ دفتر بوائے اسکائوٹ سیف آباد (حیدرآباد)۔

یہ حیدرآباد کے پرانے اسکاؤٹوں کا ایک چھوٹا سا ماہوار رسالہ ہے جو مولوی حمید اللہ صاحب سے پرجوش روور اور سرگرم اہل علم کی ادارت میں شایع ہونے لگا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مضامین دلچسپ اور اسکاؤٹنگ (کشافی) سے متعلق مفید معلومات کے حامل ہوتے ہیں۔

کانفرنس گزٹ یہ ایک پندرہ روزہ تعلیمی اخبار ہے جو اکرام اللہ خاں صاحب مولف وقار حیات کی ادارت میں کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی طرف سے شایع ہونے لگا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق دلچسپ معلومات اور مضامین شایع کرتا ہے۔ سالانہ چندہ (۱۲) ہے اور جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کے پتے سے ملتا ہے۔

کتب موصولہ

۱۔ تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی قیمت ۱۲ حالی

۲۔ خزینہ تاریخ مرتبہ سید یوسف الدین صاحب قیمت ۱۲

۳۔ سفر انگلستان مرتبہ رشید احمد صاحب قیمت ۱۵ر حالی

۴۔ بچوں کی تربیت از محمد عبدالغفار صاحب خیری قیمت ۱۲ر حالی

۵۔ بچھڑی بیٹی از جناب خاتون اکرم صاحبہ قیمت ۱۰ر حالی

۶۔ موہنی از جناب صغرا ہمایوں مرزا صاحب قیمت ۱۵ر حالی

۷۔ تحریر النسا " " قیمت ۱۵ر حالی

۸۔ عصمتی گردشیں از جناب فاطمہ بیگم صاحبہ قیمت ۱۲ حالی

۹۔ عصمتی کشیدہ از جناب آمنہ نازلی صاحبہ قیمت ۱۲ حالی

یہ سب کتابیں عرابیش پر مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک سے مل سکتی ہیں۔

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد پنجم)

تمت

بتقریب سالگرہ ہمایونی اعلیحضرت بندگانعالی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

روزنامہ صبح دکن کا سالگرہ نمبر

شایع ہوگیا ہے

بہ اعتبار مضامین و تصاویر اس سال کے ہندوستان بھر سے شایع ہونیوالے سالنامونمیں یکا امتیازی شان کا مالک ہے

حضرت ظل سبحانی خسرو دکن کے تازہ ترین کلام کے علاوہ حضور پرنور کے عنایت کردہ مصرعہ طرح پر شعراء دکن کی غزلیں ہیں

(مقالات) دکن کے مایۂ ناز مستند اہل قلم حضرات

نواب سر نظامت جنگ بہادر۔ علامہ عمادی ناظر مذہبی۔ ڈاکٹر عبد الطیف پی ایچ ڈی، نواب اکبر جنگ بہادر۔ قاضی تلمذ حسین رکن دار الترجمہ۔ ڈاکٹر سیادت علی، ام اے ال ال بی، ڈی فل۔ سر ولیم بارٹن سابق ریذیڈنٹ مولوی سید ابوالاعلی مودودی۔ ڈاکٹر ولی الدین ام اے ال ال بی پی ایچ ڈی مولوی سید ابو الخیر مودودی رکن دار الترجمہ۔ وغیرہم

کے سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، تاریخی، ادبی، تمدنی، شاہکار اور (حصہ نظم) ملک کے بلند پایہ نازک خیال شعرا

استاد جلیل۔ نواب فصاحت جنگ بہادر۔ حضرت جوش۔ نواب شبیر حسن ملیح آبادی۔ حضرت اختر، نواب اختر یار جنگ بہادر یادگار امیر۔ جناب اختر مولوی سید علی اختر۔ حضرت عفو مولانا سید شاہ ابراہیم۔ جناب بدر (ابو الکلام محمد بدر الدین) حضرت عالی۔ علامہ وحید الدین۔ جناب کامل (مولوی عبد اللہ خان) حضرت ضیا (علامہ ضیا یار جنگ بہادر)۔ جناب شہرت (کیپٹن اعجاز علی) وغیرہم۔

کے افکار نادرہ و خیالات عالیہ سے مزین ہے۔

تصاویر ان معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن و دلفریبی کو بھی متعدد ہاف ٹون بلاک کی تصویروں نے مکمل کر دیا ہے۔ خسرو دکن کی دو تازہ ترین تصویریں جو خاص اسی موقع کے لئے ہم نے بہ صرف زر کثیر تیار کرائی ہیں اور جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئیں۔ شہزادہ عالی قدر نواب ولیعہد بہادر کے دو نایاب تازہ ہاف ٹون بلاک فوٹو حیدرآبادی نمایندگان گول میز کانفرنس کا گروپ و رفد مشاہیر ہیں۔ نواب سر سالار جنگ اعظم اور نواب میر عالم کے علاوہ اس نمبر کے مضمون نگار حضرات کی تصویریں شایع کی گئی ہیں۔ اس طرح کل تصاویر کی تعداد پینتیس ہے

قیمت قسم اول ۸ قسم دوم عہ

خریداران صبح دکن سے علاوہ محصولڈاک عہ ۴ و ۱۲ ر ۴ ر

رجسٹرڈ نشان پتہ سرکار آصفیہ
(۶۰)

رجسٹرڈ نشان پتہ انگلشیہ
(.........)

مجلّۂ مکتبہ

جلد ۶ | بابتہ ماہ بہمن سنہ ۱۳۴۰ ف مطابق دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء | شمارہ (۳)

تصاویر

(۱) جناب ایم اسلم صاحب (۲) جناب سید علی اختر صاحب اختر (۳) علامہ عبدالجبار خاں آصفی مرحوم (۴) حکیم وحید الدین عالی مرحوم

فہرست مضامین

شذرات

معارف کے شذرات میں ایک دو مہینے قبل مدیر صاحب نے اس امر پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی جامع بک ڈپو نہیں، جس میں اردو کی کل مطبوعات موجود ہوں اور جو شائقین اردو کی ضرورت کی بروقت اور خاطر خواہ سربراہی کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ساتھ جہاں اور معاملات میں اہل ہندوستان نے باوجود اس کو ہندوستان کی ایک بہت بڑی اور متعدد صوبوں کی مادری اور کل ہند اہمیت کی زبان سمجھنے کے، بے اعتنائی برتی ہے، اردو بک ڈپوؤں کے قیام میں بھی ایسی کوتاہی دکھائی کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہر (حقیقی معنوں میں) اردو بک ڈپو سے خالی ہیں، لاہور، دہلی اور صوبجات متحدہ کے بعض شہر اردو کتابوں کے بڑے مرکز اشاعت ہیں لیکن ان شہروں میں واقعی شایان شان اردو بک ڈپو تقریباً مفقود ہیں۔
حیدرآباد بھی ایک عرصہ تک اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھا، مگر بحمد اللہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کے اہتمام اور کارکنان انجمن کی کئی سال کی محنت سے حیدرآباد میں ایسا اردو بک ڈپو قایم اور جاری ہے جو حیدرآباد کے عام تاجران کتب کی طرح صرف درسی کتابوں کی تجارت نہیں کرتا بلکہ اردو کی تمام مطبوعات بشرطیکہ وہ اوٹ آف پرنٹ نہ ہو گئی ہوں ہر وقت مہیا کرتا ہے کتابوں کے علاوہ اردو کے تقریباً تمام مشہور علمی، ادبی اور دیگر فنی رسالے بھی اس میں ہر وقت تازہ بہ تازہ موجود رہتے ہیں۔

حیدرآباد جیسی وسعت و اہمیت کے شہر میں بعض اور بھی بک ڈپو ہیں جن میں خاص طور پر حیدرآباد بک ڈپو قابل ذکر ہے لیکن یہ انگریزی کتابوں کی تجارت کرتا ہے اور انہی کتابوں اور رسالوں کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ دیگر بک ڈپو عموماً تعلیمی اور درسی کتابیں مہیا کرتے ہیں خواہ وہ انگریزی کی ہوں یا اردو اور فارسی کی **مکتبہ ابراہیمیہ** علاوہ تعلیمی و درسی کتابوں کے ہر مذاق کی اردو کتابوں کی اپ ٹو ڈیٹ طریقہ پر سربراہی و تجارت کرتا ہے۔ بیرون دکن کے جن معزز اصحاب نے حیدرآباد آکر اس کا معاینہ کیا ہے۔ انہوں نے اس کے طریقے اور انتظام کو نہایت پسند فرمایا، اور ہم اہل ذوق حضرات کو یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر حیدرآباد تشریف لائیں تو ایک بار ضرور اس اردو بک ڈپو کو ملاحظہ فرمائیں۔
حیدرآباد میں شاید ہی کوئی علمی ذوق رکھنے والا ایسا ہو جس نے اس کو نہ دیکھا ہو۔ شہر کے ایک

پر رونق اور موقع محل کے لحاظ سے نہایت عمدہ مقام یعنے اسٹیشن روڈ پر یہ بک ڈپو ہر ارد و داں آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ ہم انشاء اللہ آئندہ اس کے متعلق بعض بڑے بڑے اردو اہل قلم حضرات کی رائیں پیش کریں گے۔

یہ امر نہایت موجب مسرت ہے کہ جناب سدرشن صاحب کی ادارت میں لاہور سے ایک نیا رسالہ "چندن" کے رومانوی نام سے جنوری ۱۹۳۱ء سے شائع ہونے والا ہے، ہمیں جو اطلاع ملی ہے اس کے بموجب "اس کے ہر نمبر میں ملک کے بہترین افسانہ نویسوں کے کئی کئی افسانے ہونگے، رنگین بیان شعراء کے پاکیزہ اور روح کو وجد میں لانے والی نظمیں ہونگی، مشہور ادیبوں کے زبردست مضامین ہونگے اور حالات حاضرہ پر بے لاگ رائے زنی ہوگی، لکھائی چھپائی کے نسبت بھی اطمینان دلایا گیا ہو کہ "نہایت پیاری اور بے داغ ہوگی" کچھ دنوں قبل جناب پریم چند صاحب نے بھی ہنس کے نام سے ایک ایسا ہی رسالہ ہندی زبان میں جاری کیا، اس کے مقاصد بھی یہی تھے اردو میں باوجود افسانوں سے بھرے ہوئے رسالوں کے جو کئی ہیں ایک ایسے رسالے کی ضرورت ہی جو حقیقی معنوں میں عمدہ افسانے شائع کرے، ہم جناب سدرشن صاحب کو اس ارادے پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ انکی توجہ اور دیگر ارباب قلم کے تعاون سے ان کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔

اس مہینے کے دوسرے دو ہفتے میں پٹنہ متعدد مستشرقین اور دیگر اہل علم و فضل حضرات کا مرجع بنا رہا، حسن اتفاق سے اب کی دفعہ ہندوستان کی دو مشہور علمی بزمیں یعنے کل ہند مستشرقی کانفرنس (آل انڈیا اورینٹل کانفرنس) اور مجلس اسنادات تاریخ ہند (انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن) بھی منعقد ہوئیں، اول الذکر کی شرکت کے لئے یورپ کی بعض مشہور جامعات کے مشاہیر پروفیسر بھی دور دراز سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ حیدرآباد سے حسب معمول جامعہ عثمانیہ کے کئی پروفیسروں نے نمایندگی کی اس کانفرنس میں اب کی دفعہ نہایت اچھے اور بلند پایہ محققانہ مضامین پڑھے گئے۔ ان میں خاص طور پر شمس العلماء سر جے۔ جے موڈی۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف کے مضامین قابل ذکر ہیں، سر موڈی نے قدیم اسناد کے حوالے سے بتایا ہی کہ ہندوستان قدیم پر ایران کے کیا عظیم الشان اثرات اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما تھے اور بالخصوص چندر گپت اور اشوک موریا، فرمانروایان ہند کے متعلق ان کی تحقیقات ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہیں۔ اسی طرح

مولانا سلیمان ندوی نے عمر خیام پر قدیم و معاصرانہ شہادتوں کی بنا، پر جو نئی روشنی ڈالی اور اپنی تحقیقات سے اس کے متعلق جن چیزوں کی تردید و توضیح کی ہے وہ بھی بڑی بصیرت افروز ہے۔ اور بھی کئی مقالے قابل تحسین ہیں۔

دوسری مجلس میں بھی سالحال حسب عادت مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر اسناد ات تاریخی نے حیدر آباد کی نمایندگی فرمائی اور اپنے دفتر میں سال بھر میں جو نئے اور خلاص اہمیت کے کاغذات برآمد ہوئے اور جن پر کام کیا گیا، ان کی نسبت کمیشن کے اجلاس خصوصی میں جو صرف مقررہ ارکان پر مشتمل ہوتا ہے پیش کئے۔ اس مجلس کے ساتھ حسب سابق بڑی عمدہ تاریخی نمایش بھی ہوئی، حیدر آباد سے اب کی دفعہ بعض نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب نے بھی جن کا تعلق دفتر اسناد ات تاریخی سے ہی مولوی صاحب موصوف کی کوشش سے شرکت کی۔

اس نمبر میں جو تصویریں شائع ہو رہی ہیں ان میں ایک علامہ عبدالجبار خان آصفی مرحوم کی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر اور پرزور انشا پرداز تھے، متعدد فارسی اور اردو کتابیں ان کی یادگار ہیں دوسری تصویر مولانا حکیم وحیدالدین صاحب عالیؔ مرحوم کی ہے۔ مرحوم حیدر آباد کے ایک حاذق حکیم عربی اور فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے، اردو میں بھی ان کا کلام خاصا بلند پایہ ہے جس کو ہم وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے ہیں۔ تیسری تصویر جناب میاں اسلم صاحب کی ہے جو پنجاب کے مشہور افسانہ نویس اور کئی دلچسپ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتابیں اسقدر شہرت حاصل کر چکی ہیں کہ باوجود عدم تشہیر کے اکثر کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ چوتھی تصویر جناب سید علی اختر صاحب اخترؔ کی ہے جن کی دلاویز نظمیں نگار، مجلۂ مکتبہ، ہمایون وغیرہ اور اکثر ممتاز ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں پاکیزہ تخیل، اچھوتے خیالات اور دلکش ترکیب جو ان کے کلام کی خصوصیات ہیں ناظرین رسائل سے پوشیدہ نہیں۔ کلام کی مقبولیت خداداد ہے۔ مجلۂ مکتبہ پر بھی آپ کی خاص عنایت ہے۔ اور اکثر اپنا گراں قدر کلام دیتے رہتے ہیں۔

میر تقی میر پر ایک نظر

از

جناب محمد باقر رضا صاحب کرمانی

میر گیارہ سو پچیس ہجری میں عالم ارواح سے دنیائے اجسام میں آئے، اکبرآباد کو میر کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن ابھی میر کا عہد طفولیت یہاں گزرا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، میر مجبوراً دہلی روانہ ہو گئے، دہلی میں انہوں نے خان آرزو کے پاس جو ان کے رشتہ دار تھے، پرورش پائی۔ میر قدرت کی طرف سے ایک خاص ذوق شاعری لائے تھے، اور فطرت نے غزل گوی کا سہرا ان کے سر باندھا تھا۔ اس پر خان آرزو کی صحبت اور تربیت نے ان کی شاعری میں چار چاند لگا دئے، میر نے فن شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ صدر نشین بزم شعرائے اردو کہلائے اور آسمان سخن پر آفتاب ہو کر چمکے۔ جب مکرر دہلیات اور متواتر نزول آفات سے دہلی خراب ہوی تو ۱۱۹۵ھ میں دہلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ چلے گئے۔ میر صاحب کے کلام کی شہرت لکھنؤ کی فضا میں پہلے ہی سے پھیل چکی تھی، ان کا مشاعروں میں شریک ہونا تھا کہ ان کے کلام نے خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرنا اور قبولیت عام کا تمغہ پانے لگا رفتہ رفتہ میر کے کلام کی شہرت نواب آصف الدولہ نے بھی سنی، اور انہوں نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔

میر کمال درجہ بد دماغ، نازک مزاج، اور خود پسند واقع ہوئے تھے۔ فقر کے نشہ میں ایسے مست تھے کہ امیر و غریب، شاہ و گدا کسی کی ایک نہ مانتے تھے، اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور خود فرماتے ہیں۔

حیف بندے ہوئے خدا نہوے　　　سر کسو سے فرو نہیں ہوتا

ان کی نازک مزاجی نے ان کو نواب صاحب سے ایک ذرا سی بات پر قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا، اور صاحب موصوف کے لطف و کرم سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ بقائے دوام

اور شہرت عام کے دربار میں شریک تو ہوئے مگر "بدماغی اور بے پرواہی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے، شعر پڑھتے اور منہ پھیر لیتے" میر صاحب کو اپنی بدماغی کا حال خوب معلوم تھا لکھتے ہیں۔

دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ — حالت یہ ہے مجھکو غموں سے نہیں فراغ

ہے نام مجلسوں میں مرا میر بد دماغ — سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ

از بسکہ بدماغی نے پایا ہے اشتہار

میر صاحب کے کلام کی خوبی اور زبان کی شیرینی نے ان کی خود پسندی اور بدماغی کی پردہ پوشی کی اور صاحبان فہم نے ان کے کلام کی خوبیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی بد دماغی کو نظر انداز کر دیا۔ میر کو انتقال کئے سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن آج بھی ہم ان کی خود داری اور بے نیازی پر فخر کرتے ہیں، اور ان کی کتاب زندگی کا فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

میر صاحب کے چھ دیوان غزلوں کے ہیں، چند رباعیات، مستزاد اور مخمس بھی ہیں۔ چار قصیدے منقبت میں اور ایک آصف الدولہ کی تعریف میں قصیدے میں میر سودا کو نہیں پہنچ سکتے اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ ان کی خود داری اور خود پسندی گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں یا ایں کہ یہ ان کی قسمت میں نہ تھا اور صرف سودا ہی کا حصہ تھا میر صاحب ایسے متوکل اور قانع انسان واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے ہر طرح کے دنیاوی مصائب و آلام جھیلے لیکن کبھی کسی کے سامنے دستِ مدعا پیش نہ کیا اور نہ کبھی سر حاجت خم کیا، انہوں نے دنیا کے مال و دولت کو ہیچ سمجھا اور خاطر میں نہ لایا، نکات الشعراء اور فیض میر بھی انہیں کی تصنیفات سے ہیں مگر آخر الذکر نایاب ہے۔

میر صاحب کی مثنویاں البتہ قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ میر کے زمانے میں غزل کی زبان منجھ گئی تھی لیکن مثنوی کی زبان کے سنورنے کے لئے ابھی مدت دراز درکار تھی، لیکن وہ میر ہی کا حق تھا کہ انہوں نے اپنی سادہ زبان، دلکش و دلپذیر پیرایہ، برجستہ مصرعوں اور چستہ ترکیبوں سے مثنوی کو ترقی کے کئی زینہ آگے بڑھا دیا، حالی صاحب میر کی مثنویوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "جس زمانہ میں میر نے مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اردو زبان پر فارسیت

غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً نہ تھا اور اگر نمونہ موجود تھا بھی تو اس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔" اور آگے لکھتے ہیں۔

"جس وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اس سے بہتر مثنوی لکھنا امکان سے خارج تھا بایں ہمہ میر کی مثنویاں اکثر عبارات سے امتیاز رکھتی ہیں، باوجودیکہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے، مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انہوں نے کہیں ہاتھ سے جانے نہ دیا۔"

میر صاحب کی مثنویاں کل تین قسم پر منقسم ہیں (۱) عاشقانہ (۲) جو نواب صاحب موصوف کے متعلق ہیں (۳) جو خانگی اشیاء پر لکھی گئی ہیں میر صاحب کی مثنویوں میں عاشقانہ مثنویوں نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی زبان بھی اور مثنویوں کی زبان کی بہ نسبت بہت صاف اور شستہ ہے۔ گو میر صاحب بہت گھریلو واقع ہوئے تھے اور انہیں قدرتی مناظر اور بیرونی مطالعہ کا زیادہ موقع ہاتھ نہ لگا، مگر بقول ورڈس ورتھ "شاعر کے خیال کے لئے موضوع ہر جگہ موجود ہے۔" میر نے انہیں گھریلو اشیاء پر طبع آزمائی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شروع کی چونکہ میر کو جانوروں کا عام طور پر بہت شوق تھا اس لئے انہوں نے، بندر بلی، بکری وغیرہ پر مثنویاں لکھیں، اور خوب لکھی ہیں۔

جس وقت میر صاحب کے مکان کی دیوار مزدور کا بارمنت نہ اٹھا سکی اور گر پڑی تو کتے وغیرہ فراغت سے میر صاحب کے مکان میں داخل ہوئے اور چین کرنے لگے، میر صاحب بہت پریشان ہوئے۔ اس کا حال انہوں نے یوں ضبط تحریر کیا۔

دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ　　کاش جنگل میں میں جا کے بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دھتکاروں　　ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں　　چار عف عف سے جان کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں میں حال نغز　　کتوں سا میں کہاں سے لاؤں مغز

اسی مثنوی میں انہوں نے کھٹملوں کا غضب ڈھانا بھی اس طرح بیان کیا ہے:-

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا | پر مجھے کھٹلوں نے مل مارا
ملتے راتیں کو گھس گئی پوریں | ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیہ پر گہہ بچھونے | پر گہہ چادر کے کونے کونے پر
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ تھمئے | کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

میر صاحب نے ایک مثنوی میں مرغوں کا لڑنا اور ان کے مالکوں کی حرکات کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں | سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے وہ بپھرنے لگے | ان نے کی نوک یہ اکڑنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج | ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج وج
مرغ کی ایک شے پر فشانی ہے | ان کی سو رنگ بد زبانی ہے

میر صاحب کی دوسرے قسم کی مثنویاں کل چھ ہیں سب سے بڑی مثنوی شکار نامہ ہے، جب نواب صاحب شکار کے لئے جنگل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو جانوروں کی خوف و دہشت کے مارے جو حالت ہوتی ہے اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار | نہا دبیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوی فوج دریا کے رنگ | لگے کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانہ سے جانے لگے، | وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

اسی سلسلہ کی اور بھی مثنویاں ہیں، مثلاً نواب صاحب کا ہولی کھیلنا۔ نواب صاحب کی کدخدائی اور ساقی نامہ۔

میر صاحب کی وہ مثنویاں جو عشق و محبت سے تعلق رکھتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔
شعلہ عشق، دریائے عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، معاملات عشق، اور عشق افغان پسر
ان مثنویوں میں سے بعض کے وہ اشعار جو عشق و محبت کی تعریف میں ہیں مشتی نمونہ از خروارے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔
مثنوی شعلہ عشق میں محبت کی یوں تعریف فرمائی ہے ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور | نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور
محبت سبب محبت سبب | محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت ہی اس کارخانہ میں ہے | محبت سے سب کچھ زمانہ میں ہے
محبت عجب خواب خونریز ہے | محبت بلائے دل آویز ہے
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ | محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
محبت سے پروانہ آتش بجاں | محبت سے بلبل ہے گرم فغاں
محبت سے ہے انتظام جہاں | محبت سے گردش میں ہے آسماں

جب ایک جوان رعنا، اور ایک مہ پارہ کی نگاہیں دوچار ہوتی ہیں تو اس وقت اس جوان کا جو حال ہوا اس کا نقشہ "دریائے عشق" میں یوں کھینچا ہے۔

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ | صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی | تاب و طاقت نے بے وفائی کی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز | رنگ چہرہ کا کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک | چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ | رابطہ آہ آتشیں کے ساتھ
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے | رو دیا ان نے ایک حسرت سے

میر کا کلام

ملا طغرا جو عروضیین کے صدر ہیں فرماتے ہیں "کیف در صہبائے کلامیست کہ بے تلاش فکر بساغر نطق درآید وانچہ آورد را جا دہد نے کلام را تازگی بخشد دماغ راشگفتگی"۔ علامہ حالی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو"۔ بالکل یہی حال میر کی شاعری کا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ماضی و حال کا سرتاج میر کو صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے برجستہ اور سلیس اشعار بغیر مشکل سمجھ میں آجاتے ہیں اور شاعری کی جان بھی یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا | آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اور ایک مقام پہ فرماتے ہیں۔

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

ملک الشعراء ٹینیسن (Tennyson) لکھتا ہے کہ "قابل غور یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ کس طرح کہہ رہے ہیں"۔ اسی طرح میر کا کلام بلحاظ معنی نہایت اعلیٰ ہے، لیکن بلحاظ زبان بھی خاص امتیاز رکھتا ہے، سادگی اُن کے کلام کا جزو اعظم ہے۔ لیکن سادگی میں بھی ہر وقت ایک نیا اسلوب ایک نیا پیرایہ اور ایک نیا انداز ہوتا ہے۔ شبلی نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ "جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں وہ شعر ہے"۔ اگر میر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اشعار شبلی نعمانی کی رائے کے مطابق عقل سلیم کی ترازو میں وزن کئے جائیں تو معلوم ہو گا کہ میر کے اشعار نہ صرف جذبات کے مظہر ہیں بلکہ سامعین کے جذبات کو اُبھارنے والے اور ان کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرنے والے ہیں اور یہی شعر کی معراج ہے۔ دلی کیفیات اور قلبی واردات کو سادہ شیریں اور خوشنما الفاظ کا لباس پہنا کر اس خوبی سے پیش کرتے ہیں، کر اس پہ سے ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں، فرماتے ہیں،

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے
دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
کھول کر میر کا کفن دیکھا

جب میر صاحب نازک خیالی کو سلاست کے ساتھ ملا دیتے ہیں تو ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے فرماتے ہیں۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اسی ہی بیخودی کے مضمون کو غالب نے بھی باندھا ہے اور میر نے بھی غالب صاحب فرماتے ہیں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر صاحب فرماتے ہیں۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا۔

غالب نے اپنی ذات کو دو مقام پر فرض کیا ہے۔ لیکن میر بیخودی میں اپنے آپ کو ایسے

بھول جاتے ہیں کہ دیر سے انتظار کیا جاتا ہے۔"

میر کا کلام دریائے فصاحت میں غرق ہوتا ہے، جس مضمون کو بھی باندھتے ہیں سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، جب تصوف میں کچھ فرمانا چاہتے ہیں سلاست کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہے کہ سمجھنے والے کو تکلیف نہ ہو فرماتے ہیں

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خودمختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جب کبھی ان کے کلام میں بلاغت پائی جاتی ہے تو وہی سلاست کا بھیس لئے ہوئے!

نشانہ باز ایسے ہیں قدر انداز اتنے ہیں   ادھر چٹکی سے چھوٹا تیر مٹھی سے کماں کھدی

ایک مقام پر میر نے نیم باز آنکھوں کی تعریف اپنے خاص رنگ میں کی ہے، فرماتے ہیں:-

میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

میر کے زمانہ میں فارسیت اردو پر بہت غالب تھی اور ان کے کلام میں بھی فارسیت کا رنگ بہت ہے، اور کیوں نہ ہو زمانہ کا تقاضہ یہی تھا، چنانچہ خود نکات الشعراء میں فرماتے ہیں۔ "اگر ترکیب فارسی موافق ریختہ بود مضائقہ ندارد" میر صاحب کے چند اشعار جن میں فارسیت کا رنگ غالب ہے نمونتاً درج کئے جاتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا   پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا

یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے بہار کی   ٹھہرو بقدر ایک مژہ اس مکان میں

اپنے ہی دل کو نہ ہو وا تو کیا حاصل نسیم   گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

یاد ایام کہ یاں ترک شکیبائی تھا   ہر گلی کوچہ مجھے کوچۂ رسوائی تھا

علامہ نظم طباطبائی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "ایجاز مخل از اطناب ممل ناموزوں تر است" مگر حقیقت یہ ہے کہ میر کے پاس نہ ایجاز مخل ہے نہ اطناب ممل، جو کچھ

بیان کرتے ہیں وہ صاف اور سیدھی سادی اردو ہے، فرماتے ہیں :-

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں۔ "شاعری کی معراج کمال یہ ہے کہ اس کا عام کلام ہموار اور اُصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے، البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے عام اشعار خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا اس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔"

بس یہی حال میرؔ کے کلام کا ہے۔ شاعری آسان اس حیثیت سے ہے کہ صرف اس کو قافیہ سمائی کی حد تک رکھیں مگر مشکل اور مشکل تر ہو جاتی ہے، جب جذبات فطرت کا صحیح مُرقع اور مناظر قدرت کا سچا خاکہ کھینچا جاتا ہے، بیمار پڑنا، نرگس بیمار کا طالب رہنا، نزع کی ہچکیوں کا آنا اور مسیحا کا انتظار، عاشق زار کی قبر پر صرصر کا خاک اڑانا اور قمری کا نوحہ کرنا، ان سب باتوں کے بتلانے کے لئے ایک ایسے معجز نما شاعر کی ضرورت تھی جو ساری مسیحائی ایک شعر پر ختم کر دے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اکثر مقامات پر تصنیف مصنف کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح شاعر کا کلام بعض بعض جگہ اس کے حالات زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، اور اس کی زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ پس میرؔ کا کلام حسرت و ناکامی، غم و اندوہ کا جو میرؔ کے مونس و غمخوار تھے سچا اور حقیقی مرقع ہے، ان کا کلام زبانِ حال سے گویا ہے میں جس دل سے نکلا ہوں وہ حرماں و یاس کا پتلا اور ناکامی اور نامرادی کا مجسمہ ہے، خود فرماتے ہیں :-

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان ہوا

میرؔ کا رونا سب کو ہنساتا ہے، جب میرؔ رلاتے ہیں تو سب رونے لگتے ہیں :-

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے درد بے اختیار اٹھتا ہے

میر ہنستے نہیں مگر ایک عجیب اور پُر لطف پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ ظرافت کا مزہ صاف عیاں ہوتا ہے، فرماتے ہیں :۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

رشک کا مضمون کسی شاعر نے نہیں باندھا اور کسی نے اس پر طبع آزمائی نہیں کی اور اس میدان سخن میں تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے، مگر ایک بدیہی بات کے لئے میر نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔

مر گیا غیرت کے مارے دیکھی پروانے کی بات — شمع کو گل گیر چھیڑے تھی یہی مرجانے کی بات

اسی طرح گریبان کا چاک کرنا ہر شاعر نے ضروری سمجھا ہے اور اس کو اپنے پرواز تخیل کا اعلیٰ نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن میر کا جنوں اس طرح گریبان چاک کرتا ہے کہ اس کا جواب شعراء اپنی متعدد کوشش کے بعد بھی نہیں دے سکے، فرماتے ہیں :۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

غزل گوئی میں امام ہونے کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں وہ طبع آزمائی کی ہے کہ داد دیے بغیر نہیں بن پڑتی ۔ نہ غالب کا عقیدۂ تعجب خیز ہے اور نہ ناسخ کا قول حیرت انگیز اگرچہ ذوق نے غزل گوئی میں بہت زور مارا، مگر میر کا انداز نصیب نہ ہوا۔

اس شاعر شیریں مقال کو سعدی گلستان فصاحت کہیں تو درست، بلبل بوستاں سلاست کہیں تو زیبا ہے، خدائے سخن کہیں تو مناسب اور سرتاج الشعراء کہیں تو بجا ہے میر نے چمنستان اردو میں وہ پھول کھلائے جن پر آب حیات شبنم ہو کر برسا، جن کی شمیم نے فضائے عالم میں پھیل کر شہرت عام حاصل کی، اور جن کی شادابی اور تروتازگی میں امتداد زمانہ اور مرور ایام کے ہاتھوں کبھی فرق نہیں آسکتا ۔ اس عندلیب گلشن اردو کی شستہ بیانی اور شیریں بیانی، چستی عبارات اور سلاست کلمات نے اردو کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک نئی جان ڈال دی پس اس جگہ پر یہ لکھنا بیجا نہ ہوگا، کہ میر صاحب کا ادعاء۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نامناسب نہیں ۔

انجامِ غم

از جناب سید علی اختر صاحب اختر

بہت غمگینیوں سے روح جب بیتاب ہوتی ہے
عروسِ شادمانی آشنائے خواب ہوتی ہے

دھواں سا پھیل جاتا ہے فضائے آسمانی میں
کوئی لذت نہیں ملتی سرودِ شادمانی میں

ہر اک جنبش سے دل کی، درد کی آواز آتی ہے
نہ جانے کیوں مگر نبضِ تمنا ڈوب جاتی ہے

غم افزا کاوشیں رگ رگ میں گویا بیدار ہوتی ہیں
عمل کی قوتیں، گہرائیوں میں دل کی سوتی ہیں

دماغِ جستجو پر، نا امیدی، مسکراتی ہے
چراغِ فکر کی نور آفریں لو تھرتھراتی ہے

حیاتِ دہر کی ہر سانس حشر خیز ہوتی ہے
فضا اک ظلمتِ "مغموم" سے لبریز ہوتی ہے

لرزتا ہے فلک اس بارشِ آلام پیہم پر
پہنچ جاتا ہے جب مجبور روحِ دل اس نقطۂ غم پر

یکایک قفل کھل جاتا ہے زندانِ مصیبت کا
جبینِ دہر پہ ملتا ہے اک پیغام راحت کا

عجب انداز سے اس وقت ہر شے مسکراتی ہے
نقابِ راز فطرت اپنے چہرے سے اٹھاتی ہے

فضائیں نور کی موجِ رواں معلوم ہوتی ہیں
ہوائیں ہر قدم پر گلفشاں معلوم ہوتی ہیں

ہر اک ذرے سے چشمہ پھوٹتا ہے آبِ حیواں کا
ہر اک غنچہ میں ملتا ہے تبسم حسنِ پنہاں کا

بہارِ تازہ آجاتی ہے ہر برگِ خزانی پر
کوئی پردہ نہیں رہتا حریمِ شادمانی پر

"MAKTABA"



مولوی سید علی اختر صاحب اختر

K. P. P., Hyd.



ادیم اسلام صاحب

زمیں پر جاودانی حسن کے دریا ابلتے ہیں
ربابِ زندگی سے سرمدی نغمے نکلتے ہیں

نگاہوں پر حجابِ دل شکن باقی نہیں رہتا
فضا میں ابرِ تاریکی کفن باقی نہیں رہتا

ہر اک شئے اپنے اصلی حسن کی تکمیل ہوتی ہے
حقیقت بے نیازِ پردۂ تمثیل ہوتی ہے

گزر جاتا ہے دل اندیشۂ دورِ خرابی سے
بدل جاتی ہے ہر ناکامگاری کامیابی سے

تہِ دامانِ راحت، زندگی آرام پاتی ہے
یہ پھر گہرائیوں سے روح کی آواز آتی ہے

کہ یہ بیداریٔ احساسِ اصلِ زندگانی ہے
یہی انجامِ غم "یعنی نشاطِ جاودانی" ہے

گوہر زمین

ــــ از ــــ

جناب ایم اسلم صاحب

جمیلہ اور خورشید دونوں سگی بہنیں تھیں۔ ان کے والد متوسط درجے کے لوگ تھے۔ گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جمیلہ کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو شہر میں کاروبار کرتا تھا۔ اور خورشید قاسم نام ایک زمیندار کے پلے پڑی۔ شادی کو برسوں گزر چکے تھے۔ دونوں بہنیں اپنی اپنی جگہ خوش تھیں، اور ایام زیست آسودگی اور آرام سے بسر کر رہی تھیں۔

ایک روز جمیلہ کو اپنی ماں جائی بہن یاد آئی۔ چنانچہ وہ اپنے خاوند کے ہمراہ خورشید سے ملنے آئی، خورشید نے اپنے عزیز مہمانوں کی بہت آؤ بھگت کی دو چار روز بعد ایک روز جمیلہ نے خورشید سے پوچھا۔

"کہو خورشید کیسی کٹتی ہے؟"

"تم دیکھتی ہو۔" خورشید مویشیوں کے تھان کی طرف دیکھکر بولی "خیر سے دو بھینسیں بندھی ہیں دو جوڑی بیل ہیں تیس چالیس ایکڑ زمین ہے، ایک آدہ کارندا بھی ہے۔ دودھ مکھن گھر کا ہے گیہوں بھی باہر سے آجاتے ہیں، اور موسم کی ترکاری بھی، اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔" "تو گویا تم اس زندگی کو پسند کرتی ہو!" جمیلہ طنزاً بولی "کچا مکان، گھاس پھوس کی چھت، یہاں گوبر، وہاں گوبر، نہ پہننے کو اچھا لباس نہ کھانے کو عمدہ خوراک نہ سونے کو علیحدہ کمرہ نہ بیٹھنے کو ستھری جگہ۔ اے جمیلہ برا نہ مانو تو صاف کہہ دوں۔ مجھے تمھاری محبت نے یہاں بٹھا رکھا ہے، ورنہ میں تو ایسے گھر میں ایک روز بھی نہ کاٹ سکوں،

جمیلہ بولی:۔

"یہاں سکھ اور چین کی زندگی بسر کرنے کی کونسی چیز موجود نہیں"؟

"چین اور سکھ یہاں۔ اس گھر میں"، جمیلہ نے ادھر ادھر نفرت سے دیکھ کر کہا۔ "خورشید

تم کیا جانو چین اور سکھ کس جانور کا نام ہے کبھی میرے پاس چلکر دیکھو کیا کیا سامان جمع کر رکھے ہیں" سب دولت کے کھیل ہیں۔" خورشید بولی۔ لیکن میں ناشکری کیوں کروں اللہ میاں نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔"

جمیلہ اور خورشید کا خاوند دونو پاس ہی کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، قاسم جو دونوں بہنوں کی باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا بولا!۔

جمیلہ سچ تو کہتی ہیں۔ ہم لوگوں کو چین اور سکھ کہاں میسر، گنواروں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔" "کیوں ناشکری کرتے ہو" خورشید اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔" یہاں کس چیز کی ہے!۔" "اور یہاں رکھا ہی کیا ہے!"۔ قاسم مڑ کر بولا۔" خورشید چکی پیسو۔ روٹی کھاؤ بس یہ ہے ہماری خوشی کی ابتداء اور انتہا۔"

جمیلہ کا خاوند ابھی تک چپکے بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ ایک دوبار کھانس کر بولا! "آپس میں الجھتے کیوں ہو۔ اور زمین حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہاں نہیں تو کسی اور جگہ جاکر تلاش کرو، یوں اپاہجوں کی طرح گھر بیٹھ رہنے سے تو کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

قاسم۔" کہتے تو سچ ہو۔ اب کے فصل پک جائے تو ضرور کچھ اور زمین خریدنے کی کوشش کرونگا۔" "دور کیوں جاؤ" جمیلہ کا خاوند بولا۔" یہ ریاست کا علاقہ پاس ہی تو ہے لاکھوں ایکڑ زمین یوں ہی پڑی ہے ہمیائی نہیں روپے ڈالو اور جتنی چاہو لے لو۔"

فصلیں اب کے سال خوب ہوئی تھیں۔ قاسم کے پاس بہت سے روپے غلہ کی فروخت سے جمع ہوگئے تھے اور اب وہ سفر کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن خورشید جسے قدرت سے ایک قانع دل عطا ہوا تھا، اس تجویز کی مخالف تھی، لیکن قاسم جسے دولت کی ہوس بیقرار کر رہی تھی، کب ٹلنے والا تھا، آخر ایک روز وہ گھر سے چل نکلا اور ریاست کے علاقہ میں جا پہنچا۔ اور حسب منشا بہت سی زمیں خرید کر کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ اور چند روز بعد خورشید کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔ قاسم بہت محنتی آدمی تھا، آسودگی اور آسائش بہت جلد

اس کے گھر کی دربان بن گئی۔ لیکن دولت کی فراوانی اس کے لئے اطمینان قلب کا سامان مہیا نہ کر سکی، بلکہ یہی دولت اور آسودگی اس کی حرص و ہوس کے لئے ایک تازیانہ ہو گئی۔ قاسم اب بھی اسی جستجو میں مارا مارا پھرتا تھا کہیں سے اسے اور بھی سستے داموں پر اور بہت سی اراضی مل جائے، اور ایک دو برس ہی میں دولت کا مینہ برسنے لگے، وہ گھر میں بیٹھا اکثر یوں بڑبڑایا کرتا " تف ہے زندگی پر اگر دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔

آخر ایک روز خورشید تنگ آکر کہنے لگی "کبھی اللہ کا شکر بھی کیا کرو۔ اب کونسی تمنا ہے جو باقی رہ گئی"؟

قاسم " اور کونسی آرزو ہے جو پوری ہوئی"۔

خورشید "کیوں کفران کرتے ہو۔ توبہ کرو۔ اصلی دولت تو دل کا اطمینان ہے۔ اگر وہی حاصل نہیں تو پھر زندگی کا لطف کیا"؟

قاسم " تم یونہی فضول باتیں کئے جاؤ گی۔ لو میری سنو کہتے ہیں کہ اس ریاست کے پار پہاڑوں کے سلسلے سے پرے ایسے لوگ آباد ہیں جن کے پاس لاکھوں ایکڑ اراضی پڑی ہے میں نے تو اب وہاں جانے کی ٹھان لی ہے"۔

"اور خورشید پھر دیکھ کہ وہ مینہ برسے گا کہ سب پاپ کٹ جائیں گے"۔

" یہ نگوڑے لوگ کہاں سے آکر تم کو ایسی باتیں سنا دیتے ہیں"۔ خورشید بڑبڑاتی ہوئی بولی

" واہ خوب" قاسم سنکر بولا " خیرخواہوں کو نگوڑا کہتی ہو۔ کہیں عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی"

" میری یا تمہاری"؟ خورشید خاوند کی طرف دیکھکر بولی "سنا نہیں۔ گھر کی آدھی پردیس کی ساری سے اچھی ہے"

" اجی دیس پردیس کی کیا بات ہے" قاسم بولا۔ "پائے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست"

ہٹ کا پکا اور ضد کا پورا قاسم آخر ایک روز اپنے طویل سفر کے لئے خورشید سے رخصت ہوا۔ خادم ساتھ تھا، اور روپے بھی کافی موجود تھے، آخر منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا وہ پہاڑوں سے

بار ایک ایسے ملک میں جا نکلا جہاں میلوں تک سرسبز چراگاہیں اور زرخیز زمینیں غیر آباد پڑی تھیں۔ اس جگہ کے باشندے بہت مہمان نواز تھے۔ ایک دو روز میں جب درماندگی اور سفر کی کوفت جاتی رہی تو قاسم ایک ایسے شخص کے پاس جو ان وسیع زمینوں کا مالک تھا سودا کرنے کے لئے گیا۔ اور پوچھا

"آپ زمین کس نرخ پر دیں گے؟"

"آپ کو کتنی درکار ہے؟"

"قاسم:۔ جتنی بھی آپ دیدیں۔"

"یہاں دینے کا سوال نہیں۔ جس قدر لے سکیں لے لیں"

قاسم:۔ "اور دام!"

زمینوں کے مالک نے چاندی کا ایک پیالہ نکالا اور کہا۔

"آپ اسے چاندی کے سکوں سے بھر دیں اور ایک مقام پر رکھدیں، اور پھر صبح سے شام تک آپ جس قدر زمین کے گرد گھوم لیں۔ وہ سب آپ کی ہوگی۔"

"آپ تو مذاق کرنے لگے" قاسم مسکرا کر بولا۔

"واللہ ہرگز نہیں"

"تو اچھا منظور" قاسم نے ہمیانی سے روپے نکال کر چاندی کا پیالہ بھر دیا، زمینوں کا مالک بولا ایک شرط اور بھی ہے"۔

"فرمائیے"

"جس جگہ سے آپ چلنا شروع کریں گے، غروبِ آفتاب سے پیشتر آپ کو اسی جگہ پہنچ جانا ہوگا۔ ورنہ آپ کو روپے واپس ملیں گے اور نہ زمین"۔

قاسم:۔ "یونہی سہی، لیکن جو زمین میں پسند کروں گا اس کی حد بندی کیسی ہوگی۔"

"آپ بیفکر رہیں" زمینوں کا مالک بولا۔ "میرے آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کے ساتھ جائیں گے، جہاں آپ کہیں گے وہاں سرخ جھنڈیاں لگاتے جائیں گے۔ ان جھنڈیوں کے اندر جس قدر رقبہ ہوگا وہ سب آپ کی ملکیت ہوگا۔"

قاسم کل صبح پر معاملہ رہنے دیں"۔

اگلے روز الصبح قاسم لوگوں کے ساتھ میدانوں میں آیا۔ اس کے پاس پانی کی ایک چھاگل تھوڑا سا پنیر اور روٹی تھی۔ ایک مقام پر ایک سرخ جھنڈی نصب کر دی گئی، اور قاسم جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلنے لگا اور اپنی مرضی کے مطابق جگہ بہ جگہ جھنڈیاں نصب کرواتا گیا۔

ہلکے ہلکے نیلے بادلوں کے عقب میں سے آفتاب کی سنہری کرنیں نمودار ہو چکی تھیں قاسم نے ٹھنڈے ٹھنڈے وقت میں بہت سا فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن کیا مجال جو ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر دیکھا ہو۔ اسے زمین حاصل کرنے کا شوق تھا کہ نہ اسے بھوک تھی اور نہ پیاس، گو اب دھوپ بہت تیز ہو رہی تھی لیکن حرص ہوس کا بندہ گرمی کو کب خاطر میں لاتا تھا، اسی طرح وہ دوپہر تک چلتا رہا۔ اور جب بھوک اور پیاس اور تپش بہت تنگ کرنے لگیں تو اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر پنیر کے ساتھ روٹی کھالی اور چھاگل سے منہ لگا کر ٹھنڈا پانی پی کر پھر چل کھڑا ہوا۔

اب سائے ڈھلنے لگے تھے اور قاسم بھی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ پھر بھی قدم آگے ہی اٹھائے چلا جاتا تھا، چلتے چلتے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے، اس نے جوتیاں اتار کر پھینک دیں، کچھ دیر بعد چھاگل بھی بوجھل معلوم ہونے لگی۔ ٹھنڈا پانی پی کر قاسم نے چھاگل بھی اتار کر پھینک دی۔ اور پھر آگے چل کھڑا ہوا۔

جب طیور صحرا کے قافلے دن بھر چرنے چگنے کے بعد بستی کی جانب سے پہاڑوں کو لوٹنے لگے قاسم کو بھی واپس جانے کا خیال آیا۔ اس نے ایک بار للچائی ہوئی نگاہوں سے ان سرسبز چراگاہوں کو جو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی دیکھا اور پھر واپس لوٹنے لگا۔ اس کے ہمراہی جہاں جہاں وہ کہتا سرخ جھنڈیاں گاڑتے جاتے تھے،

لیکن اب اس کی حالت بہت خراب تھی۔ آبلوں سے خون نکل رہا تھا زبان سوکھ کر حلق میں کانٹا ہو رہی تھی۔ بھوک سے جان عذاب میں آگئی تھی، قدم اٹھائے اٹھتا نہ تھا۔ لیکن قاسم کو تو زمین کی پڑی تھی۔ اب اس کی منزل مقصود بہت دور تھی، اس لئے وہ اپنی رہی سہی طاقت کے ساتھ بھاگنے لگا۔ آفتاب ایک نازمعشوقہ کے ساتھ مغرب کی گھاٹیوں

کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اب قاسم کو وہ سُرخ جھنڈا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا نظر آنے لگا تھا۔ جھنڈے کے پاس جو لوگ تماشہ دیکھنے کی غرض سے آکر جمع ہوگئے تھے رومال ہلا ہلا کر اس کی ہمت بندھا رہے تھے۔ آخر اِدھر آفتاب نے مشرق کے مکینوں کو الوداع کہا اور اِدھر قاسم جھنڈے کے پاس پہنچ کر زمین پر گرا۔ لیکن جب لوگوں نے اسے اٹھایا تو وہ ایک جسم بے جان تھا۔

ملک کے دستور کے مطابق زمین کے مالک نے اس کے خادم کو صرف اس قدر جگہ دی جو قاسم کے قبر کے لئے کافی ہو سکے۔

رُباعیات

از

از جناب محمد عباس علی صاحب قاصر گورکھپوری

(۱)

تسلیم ہے عادت اُنکی جو ہیں کامل
راضی برضا رہتے ہیں مردِ عاقل
کیا رنج و ملال اور کیا عیش و نشاط
وہ ہر ایک حال میں ہیں خوش دل

(۲)

سب لیتے ہیں یوں تو منہ سے نامِ عباس
پتا نہیں کسی کو منصبِ مقامِ عباس
تشبیرِ عمر آ دیکھ تو اے قاصر
دنیا ہے دو روزہ یہ تمامِ عباس

غزل

از علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر

بادۂ عشق اگر بوالہوساں نوش کنند — آنچہ از ہوش بیاد است فراموش کنند

صحبتِ اہلِ غرض عاقبت افسانہ شود — شمع رامی برند از بزم چوں خاموش کنند

نشّہ از بیخبری ترکِ تعلق نہ کند — سرخوشاں کے رہِ میخانہ فراموش کنند

آید آن روز کہ آہ از دلِ کوثر خیزد — تشنہ کامانِ تو گر بادۂ غم نوش کنند

چند پرسی ز نماز یکہ بسکر انجامد — سورۂ فاتحہ صد جائے فراموش کنند

پند شایستہ خزف بیش نہ باشد امروز — گوہری نیست کہ تا زیبِ بناگوش کنند

صد زباں شعلۂ فریادِ عنادل دارد — آتشِ خرمنِ گل نیست کہ خاموش کنند

از دو چشمِ تو کجا فتنہ رہائی یابد — گہ ز آغوش جدا گاہ ہم آغوش کنند

یارِ دل را نتواں برد بجز دستِ دعا — این نہ رختیست کہ از پشتِ سرِ دوش کنند

خارِ حسرت مژۂ چشمِ تماشا گردد — ہر کجا تاخت کہ ترکانِ زرہ پوش کنند

غنچہ ہا را بچمن کیست نواسنج ضیا
دردِ دل را کہ بیاں از لبِ خاموش کنند

بدیسی ریل

اجی حضرت! کیا پوچھتے ہو، مولانا شوکت تھانوی کی طرح ہم سودیشی ریل 'کا' خواب تھوڑے ہی دیکھ رہے ہیں، جو مزے سے خیالی گھوڑے دوڑاتے بیٹھ جائیں۔ سودیشی ریل تو جب بنیگی، تب بنیگی، اب تو آنکھوں دیکھا، ہاں آنکھوں دیکھا، 'بدیسی ریل' کا حال سن لو، سن کیا لو، جانتے تم خود بھی سب کچھ ہو۔ بدیسی ریل میں بیٹھتے بیٹھتے ادھ بڑھ ہو گئے تو کیا پھر بھی تمہیں اس کا حال سننے کی ضرورت ہے۔

اچھا سنو، غور سے سنو! طبیعت کا پنڈولم (رقاصہ)، تھام کر بدیسی ریل کی باتیں سنو ہاں تو گھر کی چار دیواری یا گاؤں کی سرحد کو پار کر ایک دن اپنے رام کے دماغ میں بھی سیر کی سنک سوار ہوئی۔ عمر بھر کی گاڑھی کمائی سے جو تھوڑی بہت پونجی جمع ہوئی تھی، وہ گانٹھ میں باندھی اور چل پڑے سیدھے شاہدرے کی طرف، ہمارا سفر ہی کونسا لمبا چوڑا تھا، جس کے لئے بڑی پونجی درکار ہوتی، روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینا، پھر بھی کاٹ کباڑ کر تیرتھ جاترا کے لئے دو سو روپے تو جمع ہو گئے تھے، خیر ہم نے پہلے ریل کبھی نہیں دیکھی تھی نہ اسٹیشن سے پالا پڑا تھا، ہاں' اتنا ضرور سن رکھا تھا کہ ریل میں بیٹھ کر مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے، آرام بھی خوب ملتا ہے، ہم نے کہا۔ مرتی جاتی دنیا ہے، چلو ہاتھ پیر چلتے پھرتے ایک بار تیرتھ جاترا تو کر لیں۔ پھر نہ جانے کیا ہو؟ بس یہی خیالات اپنے رام کو ریل تک گھسیٹ لائے پوچھتے پوچھتے اسٹیشن پر پہنچے۔ مسافر خانہ مسافروں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا، بہتیرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن کوئی بھی شناسا نہ دکھائی دیا، تھوڑی دیر میں ایک مسافر اور آیا۔ میں سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے جھک کر سلام کیا میں نے خوش ہو کر سلام کا جواب دیا۔

"کہئے وشو لبھ جی کہاں جانے کا ارادہ ہے" میں نے اشتیاق سے پوچھا "مہاراج میں پریاگ (الہ آباد) جا رہا ہوں، ہردوار تو کئی بار آشنان کیے۔ 'اب کی بار

پرماتما کی دیا ہوی تو تروینی[1] میں غوطہ لگانے کا خیال ہے، اس تنا سا مسافر نے بڑی نرمی سے کہا:۔

میں بھی گھر سے پریاگ کا ہی ارادہ کرکے چلا تھا، اپنا ایک جان پہچان کا ساتھی پاکر مجھے بڑی خوشی ہوی۔ علی الخصوص اس لئے کہ میں یاترا کرنے کا عادی نہیں تھا۔ جب وشو ولبھ جی کو میرے پریاگ چلنے کی بات معلوم ہوی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور بولے۔ "ضرور چلئے پنڈت جی آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی"

"اچھا۔ پریاگ کی طرف جانے والی گاڑی کب چھوٹتی ہے؟"

"رات کے ساڑے تین بجے" وشو ولبھ جی نے کہا۔

"رات کے ساڑھے تین بجے"، چلو وہ ٹھنڈا وقت ہوگا۔ دن میں تو مارے گرمی کے جی گھبراتا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، گھر سے نکلنے کے بعد آرام تو ہے ہی نہیں پھر دھرم کی راہ ہے، بڑی ہی کٹھن"۔

وشو ولبھ جی سو گئے میں جاگتا رہا۔ مجھے یاترا کرنے کی عادت نہیں تھی، ادھر مسافر خانہ میں اتنی جھک جھک تھی کہ نیند حرام ہوگئی۔ تیسرے درجہ کا مسافر خانہ وہاں بھلا گھڑی کا کیا کام۔ ذرا خاموشی ہونے پر اسٹیشن پر بجنے والا گھنٹہ سنائی دیا، معلوم ہوا کہ تین بج گئے ایک طرف سے آواز آئی "پورب کے جانے والو چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے"، 'بٹ رہا' کا لفظ سن کر میں چونکا۔ 'بٹ' کیا مفت مل رہا ہے۔ ساری عمر طالب علموں کو "سید ھانت کومیدی" رٹانے میں گزری، بات بات میں ویاکرن کے قاعدے نام کے آگے ناچتے تھے، لیکن تھوڑی دیر میں ہی یہ جان کر اطمینان ہوگیا کہ بدیسی ریل کے ٹکٹ بکا نہیں، 'بٹا' کرتے ہیں ان کو بکنا کہنا ریلوے کی ہتک کرنا ہے۔

میں نے وشو ولبھ جی کو جگایا اور کہا۔ "تیار ہو جاؤ تین بج گئے"، وہ بھڑبھڑا کر اٹھے اور آنکھیں ملتے ملتے بولے۔ "لائیے ٹکٹ ٹکٹ لادیں" میں نے انہیں گانٹھ میں سے دام کھول کر دیئے، وہ اپنا اور میرا دونوں کا ٹکٹ خریدنے کو چل دیئے۔

ریل آنے میں مشکل سے بیس منٹ رہ گئے تھے، کھڑکی پر آدمیوں کی بھیڑ جمع تھی، سب

[1] الہ آباد کا وہ مقام جہاں تین دریا گنگا، جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔

ٹکٹ ٹکٹ، چلا رہے تھے، لیکن بدیسی ریل کا " اینگلو انڈین " بابو اپنی آرام کرسی پر پڑا خراٹے ہی لے رہا تھا، پولس کے تین کانسٹیبل ٹکٹ گھر سے باہر گدھ کی طرح منڈلا رہے تھے لوگوں کی چیخ پکار سن کر ٹکٹ بابو جاگا اور اس نے کھڑکی کھولی، مسافرخانے کا دروازہ کھلا دیکھ کر بڑے شوق سے ٹکٹ خریدنے کو لپکے، ادھر سپاہی لوگ بھی چوکنے ہوئے، چوکسی کے لئے، ان مسافروں کی بھلائی کے خیال سے۔ کہاں جاؤ گے بھئی! آؤ ہم ٹکٹ لادیں، وغیرہ باتیں بنا کر مسافروں سے پیسے اینٹھنے شروع کئے جس نے ان سے ٹکٹ منگوایا اسے ہی دو آنے اور پولیس دیوتا کی بھینٹ چڑھانے پڑے۔

کچھ دیر لوگ سیدھے ٹکٹ بابو تک پہنچ گئے، تو انہیں مایوس ہو کر لوٹنا پڑا۔ بابو نے جھڑک کر کہا۔ " کہاں کا ٹکٹ؟ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتا؟ جاؤ روپے کی ریزگاری نہیں ہے۔ نوٹ کے روپے لاؤ، تب ٹکٹ ملیگا، ریل آنے میں پندرہ منٹ رہ گئے لیکن بابو کی چڑھی ہوئی بھویں نہ اتریں وہ برابر سب مسافروں سے ٹرا کر بولتا رہا، ادھر کانسٹیبلوں کی بے ایمانی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ جس نے انہیں دو آنے دے دیئے اسے ہی دوسرے دروازے سے ٹکٹ لادیا گیا، ہمارے ساتھی وشو لیھی نے بھی ایسا ہی کیا، اور بھی بہت سے مسافر اسی طرح ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہوئے، کتنے ہی غریب آدمی چوگنے چنے دام لے کر چلے تھے رہ گئے۔

بڑی جد و جہد کے بعد ٹکٹ کے پلیٹ فارم پر پہنچے، گاڑی کھڑی تھی، ڈبے مسافروں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں اور جائیں تو کدھر جائیں۔ سارے ڈبے دیکھ لئے لیکن تل دھرنے کو جگہ نہ ملی۔ وشو لیھ نے گارڈ سے کہا۔ " دیکھئے صاحب گاڑی میں بیٹھنے کو بالکل............ "

" او پاگل کا ما فوق مٹ بولو، آم کچھ نائیں جانتا، جہنم میں جاؤ، ہٹو ٹرین اسٹارٹ ہوتا ہے "، گارڈ نے بڑی نفرت سے جواب دیا۔ گارڈ کا خشک جواب پاکر ہم لوگ پھر گاڑی کی طرف لپکے، خوش قسمتی سے ایک خالی ڈبہ دکھائی دیا، اسی میں جھٹ سے بیٹھ گئے۔ اس میں دو عورتیں پانچ بچے اور ان کے تین مرد تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی چلنے لگی۔ ہم نے جگہ ملنے پر خدا کا شکریہ ادا کیا اور ان بیسیوں

مسافروں کی حالت زار پر ترس کھایا جو بچارے جگہ نہ ملنے سے پلیٹ فارم ہی پر لڑکھڑاتے رہ گئے۔

تھوڑی دیر میں ہاتھرس جنکشن آیا۔ یہاں "ٹکٹ چیکر" نے اپنی قینچی ہماری کھڑکی سے کھڑکھڑائی، اور لیبل دیکھ کر بولا۔" او، تم لوگ اس ڈبے سے اترے گا، یہ انڈین کے واسطے نائی ہائے۔ ڈیکھو (For Europeans only.) لکھا ہے۔

"صاحب، یہ تو تیسرا درجہ ہے، انگریز لوگ اس میں کیوں بیٹھیں گے؟ گاڑی میں بالکل جگہ نہیں ہے، ہمیں اسی میں بیٹھے رہنے دیجئے، بیوی بچوں کو تکلیف ہو گی۔" مسافروں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"نائیں، بکومت، تم کو ہزار بار اترنا ہو گا، ہم ابھی پولیس بلاتا ہے" ادھر گورے چکر کی دھمکی سے ہم لوگوں نے وہ ڈبہ خالی کر دیا، پلیٹ فارم پر اسباب کا ڈھیر لگ گیا، سوتے ہوئے بچے بڑے پریشان ہوئے، مگر کیا کیا جاتا۔ صاحب کا حکم تھا اس کی تعمیل کرنی ضروری تھی جوں ہی اس گاڑی میں جگہ تلاش کرنے کے لئے ہم ادھر ادھر دیکھنے لگے، اتنے میں گاڑی چل پڑی! اور سب ہاتھ ملتے رہ گئے، ہمارے دیکھتے دیکھتے ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی نکل گئی۔

بڑی مصیبت سارا پروگرام بگڑ گیا، دوسری گاڑی بارہ بجے جائے گی، اب اس کا انتظار کرنا چاہئے، آپس میں صلاح مشورہ ہوا، ابھی تو سوا پانچ گھنٹے کاٹنے ہیں، کہاں کاٹے جائیں؟ اسی چبوترے پر یا باہر، اسی سوال پر غور و خوض کر ہی رہے تھے کہ اچانک پولیس کا سپاہی آیا اور ڈانٹ کر بولا۔" کہاں جاؤ گے؟ چلو باہر، یہ جگہ تمھارے لئے نہیں ہے مسافر خانہ میں پڑو" کانسٹیبل کے یہ جملے سب کو برچھی کی طرح لگے، اسباب بہت تھا اس لئے وشو ولبھ نے مدد گار اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا" آپ اجازت دیدیں تو ہم لوگ کچھ دیر تک یہیں پڑے رہیں"

"نہیں تم لوگوں کو باہر جانا ہو گا، پولس ان لوگوں کو اس جگہ سے ہٹاؤ،" اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

خیر صاحب! قلیوں کو منہ مانگی اجرت دے کر سب لوگ مسافر خانہ میں پہنچے، ہر طرف سے یہی آواز کان میں پڑ رہی تھی بھائی یہاں چوری بہت ہوتی ہے، روزانہ کسی نہ کسی کا ٹرنک

غائب ہوتا ہے، ابھی تین گھنٹے ہوئے، ایک مارواڑی اپنے نقدی کے بکس کے لئے رو رہا تھا۔

رام رام کرکے وقت گزارا، گاڑی کا وقت ہونے پر اسٹیشن پہنچے ٹرین آئی اس میں بھی بھیڑ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بڑی گھس پیٹ کے ساتھ جوں توں کر اس میں بیٹھے، جس بنچ پر جتنے آدمی بیٹھنے چاہیے، اس سے ڈیوڑھے اس پر بیٹھے تھے، نیچے کا فرش اور اسباب رکھنے کے بیچ گھرے ہوئے تھے آدمی سے آدمی کا سر ٹکرا جاتا تھا پسینے کے پرنالے بہہ رہے تھے سانس لینے میں مصیبت معلوم ہوتی تھی۔ دم گھٹا جاتا تھا، اتنے میں گارڈ دکھائی دیا "گارڈ صاحب! مرے جاتے ہیں، جگہ نہیں اپنے اور ڈبے لگوائیے"۔ مسافروں نے کہا۔

"اوہ پاگل کا مافق مت بولو، ٹرین اسٹارٹ ہوتا ہے۔ اب کچھ ہو سکتا نہیں"۔ اس ادھ گورے ملازم نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل پڑی لوگ چیختے پکارتے رہ گئے، بیساکھ کی گرمی نے سب کا ناس نکال دیا۔ پانی پانی کی پکار مچی، مگر پانی کہاں؟ تھوڑی دیر میں ایک اسٹیشن آیا، پانی، پانی، اور پانی! مگر کوئی پانی والا نہیں! معلوم ہوا یہاں ایک پانی والا تو بھی مگر وہ صرف رات کی گاڑیوں پر کبھی کبھی بالٹی لئے دیکھا جاتا ہے۔ باقی وقت میں بابوؤں کی گائے بھینسوں کو چرا لانے اور کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

یہاں سے بھی تالو سے جیب لگا کر آگے بڑھنا پڑا، پانی کا پتہ نہیں پھر ایک اور اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری، یہاں بھی پانی والا ندارد۔ بھلا ہو سیوا سیمتی کے رضاکاروں کا، جنھوں نے بڑی پھرتی اور مستعدی سے پانی پلایا۔ جس نے پانی پیا، اس نے انہیں دعا دی اور سیوا سیمتی کا گن گایا۔

خطرناک بھیڑ اور سخت گرمی کی وجہ سے ہمارے ڈبے میں دو عورتیں اور تین بچے بیہوش ہوگئے ساتھیوں کے چھکے چھوٹنے لگے۔ ایسی گھبراہٹ میں ایک مسافر کو رحم آیا اور اس نے جھٹ ریل کی زنجیر کھینچ دی۔ گاڑی ٹھہر گئی۔ گارڈ غصہ میں آکر بولا کس بدمعاش نے چین کھینچا، "ملڈ ما چلایا جائے گا۔ اچھا ٹکٹ (اگلا) اسٹیشن آنے دو"

"صاحب! یہ عورت بچے گرمی سے پریشان ہیں، ان کے لئے کچھ کیجئے، یہ بیچارے مر

جلتے ہیں، اسی لئے زنجیر کھینچی گئی ہے۔ آپ جو کچھ کر سکتے ہیں ان کے لئے ضرور کریں" اس ڈبے کے کچھ مسافروں نے کہا "تم کچھ نہیں جانتے، مرجانے دو، اچھا چین کس نے کھینچا؟ تم نے؟ اپنا ٹکٹ لاؤ" گارڈ نے نہایت سنگدلی سے کہا۔

اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد گارڈ نے پھر سیٹی بجائی، گاڑی چلی اور اگلے اسٹیشن پر پہنچی۔

ٹونڈلہ پہنچ کر گارڈ نے چین کھینچنے والے صاحب کو پولیس کے حوالہ کیا۔

مسافر "میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا، آپ مجھے کیوں ٹرین سے اتارتے ہیں؟ خطرے کے وقت زنجیر کھینچنا کوئی جرم نہیں!"

گارڈ۔ "نہیں تم نے ہمیں تنگ کرنے کے لئے گاڑی کو غیر ضروری طور پر ٹھہرایا کوئی خطرہ نہیں تھا۔"

مسافر "آپ کیسے کہتے ہیں کہ خطرہ نہیں تھا۔ پانچ آدمی بھیڑ اور گرمی کے سبب اب تک بیہوش ہیں۔ ان کی جان پر آبنی۔ اس سے زیادہ اور خطرہ کیا ہوتا؟"

گارڈ۔ "نہیں ایسی معمولی باتوں کے لئے گاڑی نہیں ٹھہرائی جاتی۔ تم نے بڑا جرم کیا ہے۔ اچھا جو کچھ ہو، عدالت میں اپنی صفائی دینا۔"

پولیس نے ان صاحب کو ٹرین سے اتار لیا۔ وہ بیہوش مسافر بھی اتار لئے گئے۔ گارڈ نے کہا۔ "انہیں ہیضہ ہوا ہے، ایسی حالت میں ٹرین سے وہ نہیں جا سکتے"۔

اسٹیشن ماسٹر نے بھی گارڈ کے بیان پر صاد کیا، بیہوش مسافر اور ان کے ساتھی ٹرین سے اتار لئے گئے، زنجیر کھینچنے والے صاحب پہلے ہی پولیس کے حوالے ہو چکے تھے، لیکن اس پر کسی نے غور نہیں کیا کہ ایسی سخت گرمی میں ریل میں اتنی زیادہ بھیڑ کیوں ہے؟

ایک مسافر دست سے بری طرح تکلیف میں تھا، وہ پاخانہ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا، لیکن پہلے اس نے یہ نہ دیکھا کہ اس پاخانہ کے نل میں پانی ہے کہ نہیں۔ بہتیرے نل کھٹ کھٹایا، پر دو چار بوندیں گریں، اس سے زیادہ پانی نہ نکلا۔ بچارے کی بڑی مشکل میں جان تھی۔ بھلا ہو ارام بابو کا جس نے اپنے لوٹے سے اس مسافر کو پانی دیا اور تب وہ باہر آنے کے قابل ہوا۔ پاخانہ کا یہ حال دیکھ کر اور کسی کی تو ہمت ہی نہیں

نہیں ہوئی کہ ادھر پاخانے کے لئے جانا خیال کرتا۔ یہ تھا اس کڑاکے کی گرمی میں اس پاخانے کے نل کا حال۔

خیر آہستہ آہستہ گاڑی اٹاوہ اسٹیشن پہنچی، یہاں عجیب کیفیت دیکھنے میں آئی، گاڑی کو کھڑے کھڑے تیس منٹ ہوگئے، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سبب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک اسپیشل ٹرین آرہی ہے، اس لئے گاڑی ایک گھنٹہ بعد چلے گی۔ اسٹیشن پر پولس کا سخت پہرہ تھا، گاڑی کے ایک ایک ڈبے سے لگا ہوا ایک ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا، کوئی مسافر نقل وحرکت کر نہیں سکتا تھا، اور نہ کوئی شخص پلیٹ فارم پر ٹہل سکتا تھا، افسروں، پولیس کے سپاہیوں اور اسٹیشن کے ملازمین کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا، اسپیشل کے آنے کے کچھ ہی منٹ پہلے ایک اور تماشا ہوا، ہماری ٹرین کی سب کھڑکیاں بند کرا دی گئیں جس سے کوئی اسپیشل کی شکل بھی نہ دیکھ سکے، اس وقت طبیعت بہت گھبرا رہی تھی، مگر کیا کیا جاتا؟ اپنے بس کی کچھ بات نہیں تھی، تھوڑی دیر میں اسپیشل دھڑ دھڑاتی ہوئی نکل گئی، بند گاڑی میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک طوفان تھا جو آیا اور چلا گیا، اس کے سبب ایک گھنٹہ کی تکلیف ہم کو بھگتنی پڑی۔ اسپیشل کے نکل جانے پر گاڑی کی کھڑکیاں کھولنے کی اجازت ملی۔ جوں توں کرکے پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہماری گاڑی چلی اور اگلے اسٹیشن پر پھر ٹھہر گئی۔ کیوں؟ جب تک پنجاب میل نہ نکل جائے گا، گاڑی آگے نہ بڑھیگی۔ خیر، پون گھنٹہ یہاں بھی انتظار کیا۔ اس اسٹیشن پر تو پانی پانڈے کا پتہ بھی نہ تھا۔ لو پیاس سے بری طرح گھبرا رہے تھے۔ ناک میں دم تھا۔

یہاں ایک اور آفت آئی، ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ دیکھنا شروع کیا، اور سب کے اسباب کو بڑی ٹیڑھی نظر سے دیکھا، کانٹے پر اٹھا اٹھا کر تولا، میرے ایک ساتھی سے چیکر نے کہا۔

"تمھارا اسباب بہت زیادہ ہے۔ ایک روپیہ چودہ آنہ لاؤ۔"

"نہیں نہیں صاحب! ہم تو پہلے ہی ناپ تول کر سامان لائے ہیں، یہ بستر ہے اور وہ کھانے کا توشہ۔ اس ٹرنک میں پہننے کے کپڑے اور کچھ کتابیں ہیں"

"نہیں، نہیں، بکومت ایک روپیہ چودہ آنہ جلد لاؤ، نکالو، ورنہ پولیس کے سپرد

کر دیا جائے گا"

"نہیں، صاحب! آپ تو ...... "

"نو نو، زیادہ مت بکو، دام نکالو دیر ہوتا ہے"

اس بچارے مسافر نے کلاہ پوش چکر کے رعب میں آکر ایک روپیہ نکالا۔

"لیجئے صاحب! ایک روپیہ ہے۔"

"ویل، چودہ آنے اور دیگا۔"

"صاحب! اب نہیں ہے۔ یہی روپیہ بڑی مشکل سے نکلا ہے"

"نہیں، بکتا ہے پاگل مافق، اچھا، بارہ آنہ اور نکالو"

بچارے مسافر نے چوں توں کر آٹھ آنہ اور دیئے اور کہا۔

"لائیے رسید"

"کیسی رسید مانگتا ہے، رسید تو پورے ایک روپیہ چودہ آنہ کی دی جائے گی۔ رسید لینا ہے تو چھ آنے اور نکالو"

غریب مسافر اپنا سامنہ لے کر بیٹھ گیا، پھر رسید کا نام بھی نہ لیا، ایک نہیں اس ٹرین میں کتنے ہی مسافروں کے ساتھ ایسا ہی عمل ہوا، سب نے کچھ نہ کچھ بھینٹ چڑھا کر چکر دیوتا کی بھاگی اور چوں توں کر کے چھٹکارا پایا۔ تھوڑی دیر بعد کانپور سے آگے ایک چھوٹے سے جنکشن پر گاڑی کھڑی ہوئی، اس کا نام اس وقت یاد نہیں رہا۔ یہاں پچیس منٹ ٹھہرنے کا وقت تھا لیکن جب گاڑی روانہ ہونے میں دس منٹ رہ گئے، تب ایک بابو ہمارے پاس آکر بولا "ہٹو ہٹو، جلدی ہٹو، اس میں ڈاک کا دفتر آئے گا، فوراً خالی کرو"

"بابو صاحب! آپ کیا کہتے ہیں، اب ہم کہاں جائیں؟ گاڑی چلنے والی ہے۔ کسی اور ڈبے میں جگہ نہیں ہے"

"ہٹو، ہٹو، ہم نہیں جانتے، سرکاری کام ہے جلد ہٹو، قلیوں سے ان کا اسباب نکال کر پلیٹ فارم پر رکھدو، ان کی حجت میں کہیں ڈاک نہ رہ جائے"۔ بات کی بات میں اسباب کا ایک ڈھیر لگ گیا، پندرہ بیس جتنے مسافر اس ڈبے میں تھے، سب اتار لئے گئے،

اتنے ہی میں انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ ہم لوگوں کو اتنا بھی موقع نہ ملا جو دوسرے ڈبے میں جگہ بھی دیکھ سکتے۔

"اب یہاں سے الہ آباد کو گاڑی کب جائے گی؟- ایک مسافر نے بابو سے پوچھا "چھ گھنٹے کے بعد"

"اس سے پہلے؟"

"کوئی نہیں، میل جائے گا۔ اس سے تم لوگ نہیں جا سکتے، کیوں کہ وہ یہاں کھڑا نہیں ہوتا چھ گھنٹہ تک مسافر خانہ میں پڑے پڑے وقت کاٹا، بڑی مشکل سے گاڑی کا وقت ہوا پھر بھیڑ بکری کی طرح اس میں بھرے جانے کے لئے چلے، گیٹ پر بابو نے ٹکٹ دیکھنے شروع کئے

"او! تمھارا ٹکٹ اب کام نہیں دے سکتا، اس کی میعاد گزر گئی اتنا وقت کہاں لگایا شاہدرہ سے یہاں تک پہنچنے میں اتنا ٹائم۔

"نہیں، اس سے تم نہیں جا سکتے" بابو نے کہا۔

"بابو جی، اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم تو اب تک الہ آباد پہنچ گئے ہوتے" ریل والوں نے ہمیں کئی جگہ فضول کیوں اتارا؟"

"نہیں ہم کچھ نہیں جانتے، تم لوگ دوسرا ٹکٹ خرید و، نہیں تو واپس جاؤ۔ راستہ چھوڑ دو دوسرے مسافروں کو آنے دو" بہت گفت و شنید کیا، پر اس بابو نے ایک نہ سنی کیا کرتے ہم نے یہاں سے الہ آباد کا ایک دوسرا ٹکٹ اور لیا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی آئی، اس میں بھی خوب بھیڑ تھی، لیکن ہم لوگ دل کڑا کر کے بیٹھ ہی گئے، دل میں کہا کہ کب الہ آباد آوے اور کب دوزخ سے نجات ملے،

سخت انتظار اور بڑی مصیبت کے بعد معلوم ہوا کہ الہ آباد اب صرف دس بارہ میل ہے یہ معلوم کر کے جان میں جان آئی، سوچا چلو اب تھوڑی دیر میں اس ریل کی رگڑ سے چھٹی مل گئی۔ الہ آباد اسٹیشن آیا، سب لوگ گنگا جی کی جے بول کر اترے اور گیٹ کے طرف بڑھنے لگے، اتنے میں ایک پولیس کے سپاہی نے آکر کہا۔

"تم سب لوگ یہیں رک جاؤ، اس گاڑی میں ایک مسافر کی چوری ہو گئی ہے اب کی

تلاشی لی جائے گی "

" جمعدار صاحب، ہمیں چوری سے کیا مطلب۔ گنگا اشنان کرنے آئے ہیں چلے جائیں گے ہم تو اپنے ڈبے سے اٹھ کر بھی کہیں نہیں گئے، ہمیں اب کیوں روکتے ہیں؟ "

" نہیں چلو، تھانے کو، وہاں داروغہ جی سے جو کچھ کہنا ہے کہہ لینا، چلو لوٹو، اُدھر ہے ریل کا تھانہ "

" نہیں جمعدار جی ہمارے لئے تو آپ ہی تھانہ دار ہیں، ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ راستہ کی کافی مصیبت برداشت کرچکے ہیں اب اور آفت میں نہ ڈالئے۔ ہمیں تروینی میں غوطہ لگانے دو آپ کو بھی پُن ملیگا "

" نہیں، پُن وُن ہم نہیں جانتے، اٹھاؤ اسباب اور چلو تھانے کو "

" اجی حوالدار، دیکھئے......... "

" کیوں بکتے ہو، کیا زبردستی جانا چاہتے ہو؟ "

ہم اور ہمارے ساتھی اس نئی مصیبت کو دیکھکر بڑے گھبرائے۔ خشک منت وسماجت کا سپاہی پر کچھ اثر نہ ہوا، آخر میں سب نے مل کر دس روپے دے کر اس تکلیف کی مصیبت سے پیچھا چھوڑایا۔

رام رام کرکے اسٹیشن سے باہر نکلے۔ یہاں تانگہ والے، قلیوں اور پنڈوں نے جو درگت بنائی اس کا بیان غیر ضروری اور ناقابل اظہار ہے، ایک یکے پر بیٹھ کر سیدھے تروینی پہنچے خوب نہائے دھوئے اور بھگوان کا سمرن کیا۔ تیرتھ کے ثواب وفضیلت سے ساری حرارت اتر گئی اور طبیعت خوش ہوگئی، پوجا پاٹ کے بعد کھانا کھایا پھر دھرم سالے میں جاکر ایسا سوئے کہ دوسرے دن صبح آٹھ بجے آنکھیں کھلیں۔

دوسرے دن پھر تروینی اشنان کے لئے چل پڑے راستے میں سنا کہ کل گیاسے آگے وہ مسافر گاڑی جس میں ہم آئے تھے، ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی، وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس گاڑی کے گارڈ اور ڈرایور اتنی زیادہ شراب پی گئے تھے کہ ضرورت سے زیادہ پاگل بن گئے۔ اور نشہ کی حالت میں انہیں "لوکن" "لائین کلیر" کا کچھ دھیان نہ رہا

یکایک اُسی لائن کی طرف ٹرین بڑھائی، جس پر مال گاڑی کھڑی ہوئی تھی، مال کے تو انجن اور ڈبوں کا ہی نقصان ہوا ہوگا، لیکن مسافر گاڑی (پاسنجر) کے کتنے ہی مسافر مر گئے اور پچاسوں کو سخت چوٹیں آئیں۔

اس ریل کے حادثہ کو سن کر اپنے رام کا دل دہل گیا، بھگوان کا شکر ادا کیا اور تروینی میں بڑے اعتقاد سے غوطہ لگا کر بھگتی کے جذبہ میں کہا، "گنگا مہارانی! تیرا ہی فضل ہے جو آج ریل کے صدمہ سے ہماری جانیں بچ سکیں، دیوی! تو مبارک ہے، اسی لئے تیری شہرت ساری دنیا میں ہے"۔ (ماخوذ)

غلام رسول (سٹی کالج)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء و ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹفکیٹ عطا کئے، زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ پیٹنٹ شدہ ہے حسب ذیل امراض پر آنا فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ، پلیگ، بخار، پیچش، متلی، کھانسی، دمہ، بواسیر، خارش، سانپ بچھو کے زہر اور اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے، آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے

شیشی نمبر (۱) ۲/ نمبر (۲) ۸/ نمبر (۳) ۴/

ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا

پتہ خط اور تار۔ زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

(پتہ اس مقام کا یاد رکھنا چاہیئے جہاں مال سستا اور اچھا ہے)

اسٹیشنری کی ارزاں دکان

کو نہ بھولئے کیونکہ بہترین اور فیشن ایبل مال کا نیا اسٹاک آیا ہوا ہے، نیز چھاپے کی جملہ سیاہیاں و دیگر سامان بھی موجود ہے، اضلاع پر مال کی روانگی کا خاص انتظام ہے زیادہ مال کے خریدار کو معقول کمیشن بھی دیا جائے گا

خصوصاً طالب علموں کی سہولت کے لئے اکسرسائز بک و روشنائیوں کا خاص انتظام کیا گیا ہے مختلف کارخانوں کے بہترین فونٹین پن ادنیٰ سے اعلیٰ تک واجبی قیمت پر دئے جاتے ہیں

جی بال کرشنیا

چار مینار حیدرآباد دکن نمبر (۲۵۰۰)

زندگی

ایک انگریزی نظم کا معنی خیز ترجمہ

(از)

ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

(۱)

پیش جو آئیں مشکلیں ان کا کرو مقابلہ!　　مردانگی یہی تو ہے ہمت کبھی نہ ہارنا!
بیزار ہو کے موت سے اس کو نہ تم کہو برا!　　اپنے ہی دل میں سوچو تم فائدہ اس سے ہوگا کیا!

(۲)

کیونکہ تمہاری زندگی ایسی تو کچھ بری نہیں　　جیسا اسے سمجھ کے تم رہتے ہو غمزدہ، حزیں!
جب یہ تمہاری زندگی سمجھو بری ہے بالیقیں　　فرض سے کر دے بےخبر دولتِ غفلت آفریں

(۳)

مانا غریبوں کی طرح گو ہے تمہاری زندگی　　خاک میں کیوں ملاتے ہو اپنی یہ پیاری زندگی!
صبر سے، حوصلہ سے گر تم نے گزاری زندگی　　راحت و انبساط میں گزرے گی ساری زندگی!

(۴)

نقدِ قناعت گدا چیز ہے ایسی قیمتی　　سامنے جس کے ہیچ ہے مملکت و تونگری!
ویسی ہی کاٹ سکتے ہو آدمی اسی جھونپڑی میں بھی　　جیسے کسی امیر کے گزرے محل میں زندگی

(۵)

دیکھو! غروبِ مہر کی آخری کرنیں زرفشاں　　گھر پہ غریب و امیر کے یکساں ہیں، فرق ہے کہاں؟
بے زر ہو، یا ہو زر بکف جب پڑیں سخت گرمیاں　　دونوں کے گھر کے سامنے ہوتی ہیں یخ گدازیاں

حجاز کا ایک روسی سیاح

از

جناب سید علی شبیر صاحب صدر منتظم عدالت عالیہ سرکار عالی

ایسے کوئی تیس برس قبل مولوی سید علی شبیر صاحب کی تالیف "حجاز کے فرنگی سیاح" کا نقش اول حیدر آباد کے مشہور ادبی رسالے "افسر" میں "فرنگی حجاج" کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس میں ان فرنگی سیاحوں کے حالات و سفرنامجات پر مختصراً تبصرہ کیا گیا تھا جو مسلمانوں کا بھیس بنا کر مکۂ معظمہ و مدینہ منورہ گئے۔ رسالہ مذکور سے ہندوستان کے بعض دوسرے اخبارات "چودھویں صدی" وغیرہ نے اس مضمون کی نقل کی تھی اس کے کچھ برس بعد لائق مولف نے بعض سیاحوں کے حالات کے اضافہ کے ساتھ حواشی وغیرہ لکھ کر مورخانہ حیثیت سے اس تالیف کو مکمل کر دیا اور پھر اس کے چیدہ چیدہ اجزا سنہ ۱۳۴۱ سے سنہ ۱۳۴۳ تک حیدر آباد کے ادبی رسالے "ترقی" میں شایع ہوتے رہے، جب یہ رسالہ بند ہو گیا تو ربیع الاول سنہ ۱۳۴۴ میں اس مضمون کا سلسلہ حیدر آباد دکن کے ایک دوسرے پرچے "ترجمان" میں شروع ہوا۔ جب اس رسالے کو بھی مرگ مفاجات نے آلیا تو سنہ ۱۳۴۷ میں اس کا کچھ حصہ "مجلۂ مکتبہ" میں شائع ہوا۔

چونکہ ملک میں ان سیاحوں کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جا چکے ہیں اور یہ تالیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لئے تو اس کے باقی ماندہ غیر مطبوعہ اجزا میں سے ایک روسی سیاح حجاز کے حالات اب ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(مکتبہ)

حاجی ولی الدین عرف ڈاکٹر ویلین معاملات مشرق سے بہت دلچسپی اور بھیس بدلنے میں کمال رکھتا تھا جس شرح و بسط سے اس نے عرب کی دوسری سیاحتوں کی کیفیت شایع کی ہے، بعض وجوہ سے وہ.... حرمین الشریفین کے حالات شائع نہ کر سکا۔

ڈاکٹر ویلین سنہ ۱۸۱۱ء میں جزیرہ المنڈ میں جو خلیج بوتھینا کے دہانے پر علاقہ روس میں واقع ہے۔ پیدا ہوا تھا، اس کی ولادت کے کچھ دن بعد اس کے والدین فنلینڈ[1] چلے گئے اور

---

[1] روس کے شمال و مغرب میں صوبۂ فن لینڈ واقع ہے، یہ جھیلوں اور دلدلوں کی سرزمین ہے، یہاں پانچ ہزار

اور اس کو وہیں تعلیم دلائی۔ لڑکپن میں (۱) کی طبیعت سادہ جوشیلی اور آزاد واقع ہوئی تھی، وہ اچھا تیراک اور بہادر ملاح تھا، کھیل اور شرارتوں کے موقعہ پر ہمیشہ اپنے ساتھیوں کا سرغنہ رہا کرتا تھا، ایک مرتبہ کسی شرارت کی سزا میں اس کو ایک گاؤں میں نظربند بھی رکھا گیا تھا، مطالعہ کتب کا اس کو بڑا شوق تھا ۱۸۳۶ء تک پچیس برس کی عمر میں وہ نو زبانوں کا مالک ہو گیا تھا، السنہ مشرقی میں عربی و فارسی کی جانب اس کی توجہ بہت تھی اور فرانسیسی وانگریزی علم ادب میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی تھی ۱۸۴۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ سینٹ پیٹرزبرگ[1] چلا گیا اور وہاں کی مشرقی تعلیم گاہ میں ترکی، عربی و فارسی کی تکمیل کی یہاں اس نے عربی سیاحت کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قایم کیا اور یونیورسٹی کی جانب سے اس کو وہ مدد مل گئی جو سیاحت کے شایق طلباء کو ملا کرتی تھی، اسلامی ممالک میں وہ ایک طبیب کی حیثیت سے سفر کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہ اپنی تعلیم طب ختم کرنے کے لئے فنلینڈ واپس چلا گیا۔ جون ۱۸۴۳ء میں وہ سیاحت عرب کے لئے روانہ ہوا۔ مگر پیرس میں اس کی چوری ہو گئی اور چوروں نے اس پر حملہ کیا جس سے وہ زخمی ہو گیا، اور چھ مہینے تک اس کو مجبوراً یہاں ٹھہرنا پڑا۔ بالآخر جنوری ۱۸۴۴ء میں وہ قاہرہ پہنچا اور مسلمانوں کا بھیس بنا کر رہنے لگا، برس سوا برس میں مسلمانوں کے رسم و رواج سے اچھی طرح واقف ہو کر وہ اپریل ۱۸۴۵ء میں ریگستان کے سفر پر شمالی عرب[2] کی جانب روانہ ہوا، اس کا ارادہ تھا کہ صحرائے نجد[3] طے کرتا ہوا خلیج فارس جائے مگر روپیے کی قلت کی وجہ سے یہ ارادہ ملتوی کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زیادہ جھیلیں ہیں جو ایک دوسرے سے متصل چلی گئی ہیں، اس کا رقبہ کوئی ڈیڑھ لاکھ مربع میل اور آبادی تخمیناً تیس چالیس لاکھ ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد یہ صوبہ خود مختار ہو گیا ہے۔

[1] روس کے مشہور بادشاہ پیٹر نے اسے آباد کیا تھا اور قدیم دارالسلطنت ماسکو کی بجائے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد روسیوں نے جرمنوں کی دشمنی کے باعث اس کا نام تبدیل کر کے پیٹروگریڈ کر دیا یہاں کی آبادی (۲۱) لاکھ ہے،

[2] عرب کا شمالی حصہ ملک حجاز ہے، جس کے مشہور شہر مکہ، مدینہ، جدہ اور طائف ہیں۔

[3] نجد وسط عرب کا ایک زرخیز علاقہ ہے جس میں صوبہ یمامہ قطیف۔ عسیر۔ حائل وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں کے فرمانروا

پڑا۔ وہ حائل[1] سے مصری قافلہ حج کے رستہ پر ہولیا، اور عراقی و ایرانی حاجیوں کے ساتھ مکہ و مدینہ جانے کا ارادہ کرلیا، حائل تک اس نے حالات سفر تفصیل سے لکھے ہیں لیکن حج کے زمانہ میں اس نے مجبوراً لکھنا موقوف کردیا، لوگ کہتے ہیں کہ ویلن کی قابلیت کا آدمی حجاز کے حالات نہایت اچھے لکھ سکتا تھا۔ یہاں کے حالات قلمبند نہ کرنے کے وجوہ یہ بیان کرتا ہے کہ:۔

"حاجیوں کے ساتھ میرا خوفناک پوزیشن (جو بھیس بدلنے کی وجہ سے تھا) تیز اور تھکا دینے والی منزلیں۔ ساتھ والے عربوں کا اکل کھرا پن جو کچھ تو ہر شخص کی ذاتی فکر و غم کی وجہ سے اور کچھ ایرانیوں کی نالائق صحبت کی وجہ سے تھا[2]۔ غرض ان وجوہ نے مجھ کو کسی بات کے لکھنے اور سوال کرنے سے باز رکھا"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن ابن سعود ہیں جن کے زیر نگیں آج کل ملک حجاز بھی ہے، صرف نجد کا رقبہ پانچ لاکھ مربع میل اور آبادی کوئی بیس پچیس لاکھ ہے، یہاں کا پایہ تخت ریاض ہے۔

[1] نجد کے شمال میں علاقہ جبل شمر واقع ہے، جہاں قبیلہ بنی شمر آباد ہے، اس علاقہ کا دارالامارت حائل ہے پیشتر یہاں اس قبیلہ کا شیخ حکمراں بنا پھر ترکوں کے زیر اثر آیا۔ آج کل اہل نجد کی..... حکومت ہے، حائل کی آبادی تخمیناً بیس ہزار ہے۔ یہاں کے باشندے حنبلی مذہب وہابی مشرب ہیں، شہر میں مسجدیں بکثرت ہیں ایک بڑی جامع مسجد ہے، جس میں بہت سے علماء و طلباء رہتے ہیں۔ اس مسجد کے سامنے بڑا بازار ہے، شہر کے گرد فصیل اور وسط میں امیر نجد کا محل ہے، حائل کی آب و ہوا نہایت فرحت بخش ہے، یہاں والوں کا بیان ہے کہ اگر کوئی شخص نہایت بھیڑ کھا کر ایک گلاس پانی پی لے تو ہضم ہو جاتی ہے، عراق و بغداد سے جو راستہ حجاز جاتا ہے اس پر حائل ایک بڑی منزل ہے۔ ایرانی اور عراقی حاجی اسی راہ سے مدینے پہونچتے ہیں، ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ خاتون نے اسی راستے سے حج کیا تھا اس وجہ سے یہ سڑک درب زبیدہ کہلاتی ہے۔ حائل سے مدینہ جانب شمال کوئی دو تین سو میل ہے۔

[2] برٹن اور حاجی ولی کہتے ہیں کہ ایرانی لوگ صحرائی سفر میں بہت ہی بدسلیقہ، تکلیف دہ اور بار خاطر ہوتے ہیں ۱۳۴۵ھ کے سفر حجاز میں تھوڑی دور تک اس فقیر کا بھی ایرانیوں سے ساتھ رہا ہے بعض کو جفاکش پایا اور بعض کو

حائل سے مدینۂ منورہ تک پہنچنے میں اس کے (۸۵) گھنٹے صرف ہوئے۔ یہ خصوصیت کے ساتھ اونٹوں کی تیز رفتاری کا باعث تھا، ولین مدینے سے گئے اور پھر وہاں سے جدے گیا۔

ایرانیوں سے نفرت کرنے میں وہ بڑا متعصب مسلمان تھا۔ جدے سے قاہرہ واپس ہوکر وہ مسلمانوں کے ایک محلہ میں فروکش ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں وہ جزیرہ نمائے سینا[1] کو عبور کرتا ہوا دمشق و بیروت[2] پہونچا ۱۸۴۷ء میں وہ صحرائے نجد کو قطع کرنے کے ارادہ سے پھر روانہ ہوا مگر اس مرتبہ بھی اس کی یہ دیرینہ آرزو پوری نہ ہوئی، اس کے ساتھ والوں کو پتہ لگ گیا کہ حاجی ولی حقیقت میں بھیس بدلا ہوا عیسائی ہے، اس پر اس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ ایران کی سیاحت کے ارادہ سے روانہ ہو گیا۔ بصرے پہونچا یہاں اس نے ایک ہنڈی کا روپیہ وصول کرنا چاہا، مگر روپیہ نہ پٹا اور بڑی مشکل سے اس کو ایک انگریزی کپتان نے بغداد تک پہونچا دیا، ورنہ بھوکوں مرجاتا، وہ یورپ واپس ہوا۔ اور لندن پہنچا۔ کچھ تو

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کو تھوڑی سی تکلیف پر چیخ اٹھنے والا۔ ہمارا قافلہ جب مکہ معظمہ پہنچا ہے تو میں نے ایک ایرانی کو جس کا معلم تھوڑی دیر کے لئے نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا یہ کہتے سنا۔ "خدا لعنت کند بریں معلمان ہمہ دزد، مستند، سارق هستند، حرامی هستند"

[1] جزیرہ نمائے سینا یا کوہ سینا بحر احمر کے ساحل پر قصبۂ سوئز کے قریب ایک پہاڑی مقام ہے، اس کی مشہور دو چوٹیاں جبل قیطران اور جبل موسیٰ ہیں جنکی بلندی سطح سمندر سے علی الترتیب (۸۵۶۲) اور (۷۴۹۸) فٹ ہے۔ جبل موسیٰ کے سامنے ایک چھوٹا سا سطح میدان ہے جسے الراحہ کہتے ہیں اور عموماً یہی جبل سینا کہلاتا ہے۔ حسب روایت توریت شریف بنی اسرائیل نے اسی جگہ ڈیرے ڈالے تھے، جبل موسیٰ کے دامن میں وادی شعیب واقع ہے، یہاں ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ جس میں کلیسائے یونان کے راہب سکونت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی بعض زیارت گاہیں یہاں موجود ہیں جو رب ارنی اور لن ترانی کی داستانیں سناتی ہیں جزیرہ نمائے سینا کی آبادی پندرہ ہزار ہے، زیادہ تر عرب آباد ہیں۔

[2] بیروت شام کا مشہور شہر اور بندرگاہ ہے، تہذیب و تمدن کا تمام سامان یہاں موجود ہے، مدرسے، کالج، کتب خانہ۔ مطبع۔ ہوٹل۔ ٹرام وے، حتیٰ کہ ناچ گھر بھی ہے جس نے اس کو رشک پیرس بنا دیا ہے۔ اب اور کیا

خرابی صحت کی وجہ سے کچھ یورپ والوں کی بے میل طرز معاشرت کے باعث جس کی سالہا سال سے اس کو عادت نہیں رہی تھی، نیز مشرق کی سیر کا اشتیاق جو اس کے دل میں باقی رہ گیا تھا، ان سب باتوں نے اس کی فکروں میں اضافہ کر دیا اور اسے مالیخولیا ہو گیا۔ تاہم وہ اپنے واقعات سفر انگریزی میں لکھتا رہا، جو لکچروں کے طور پر اس نے رایل جیوگرافکل سوسایٹی[۱] میں پڑھے، ان سے اس کی شہرت بحیثیت ایک جری کامیاب سیاح کے بہت کچھ ہو گئی اور علمی دنیا کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں فرانس و جرمنی کی علمی سوسائیٹیوں نے بھی اس کی بڑی قدر کی اور جب سنہ ۱۸۵۰ء میں وہ فنلینڈ واپس گیا تو وہاں اس کو ہلسنگ فورس[۲] یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ تک اس نے اپنے فرایض وہاں انجام دئے، مگر وسیع ریگستانوں کا معاوضہ مدرسہ کی تنگ چار دیواری کوئی اچھا معاوضہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ سرد ملک کا رہنے والا تھا مگر وہ اپنے وطن کی نمی اور کہر کو عرب کے گرم موسم اور وہاں کی سیدھی سادھی طرز معاشرت سے بدلنا چاہتا تھا، اسی تمنا میں خون جوش کھاتے کھاتے اس کو حرارت لپٹ گئی جو آخر کار اس کی موت کا باعث ہوئی سنہ ۱۸۵۱ء میں اس نے سینٹ پیٹرزبرگ کی جیوگرفیکل سوسائٹی[۳] سے معاملہ کر کے پھر سیاحت عرب کی دل میں ٹھانی تاکہ اس ملک کو وہ پوری طرح ۔۔۔ چھان مارے۔ اس نے چھ سال کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) چاہئے۔ آبادی کوئی تین لاکھ ہے (۳) بصرہ ۔ عراق عرب کا مشہور بندرگاہ اور شہر ہے حضرت عمر کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔ شط العرب کے کنارے بسا ہے، بغداد اور بصرہ کے درمیان آج کل ریل بھی چلتی ہے، اور کشتیاں بھی۔ آبادی کوئی ایک لاکھ ہے (۴)

۱۔ جیوگرفیکل سوسائٹی سنہ ۱۸۳۰ء میں بمقام لندن قایم ہوئی تھی جو آج تک اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کے مقاصد جغرافی تحقیقات و انکشافات ہیں:۔

۲۔ صوبۂ فن لینڈ کا پایہ تخت ہے، یہاں کی یونیورسٹی مشہور ہے جس میں تقریباً تین ہزار طالب علم پڑھتے ہیں یہاں کے کتب خانہ میں کوئی ڈھائی لاکھ کتابیں ہیں، علم ہیئت کی تعلیم کے لئے رصدگاہ بھی اچھی بنی ہوی ہے۔ آبادی کوئی دو لاکھ ہے۔

۳۔ وہ انجمن جس کے مقاصد جغرافی تحقیقات اور نامعلوم ملکوں کے حالات دریافت کرنا ہوں۔

کی تنخواہ پیشگی وصول کرنے کی اجازت لے لی، مگر کسی وجہ سے یہ تدبیر ناکام ہوگئی، چونکہ اسلامی ممالک سے اس کو گہری دلچسپی تھی اور یورپ میں اس کا دل نہیں لگتا تھا، اس لئے پھر یہ مصر پہنچ گیا، اور اسکندریہ میں اس نے تجارت کی دکان کر لی۔ وسط ۱۸۵۳ء میں جب برٹن سفر حجاز کی تیاری کے لئے قاہرہ میں مقیم تھا، یہ بھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور دونو ایک ہی مسافر خانہ میں اترے ہوئے تھے، برٹن نے اس کے قیام کی وجہ اپنے سفرنامہ کی پہلی جلد میں یہ تحریر کی ہے کہ حاجی ولی (ویلن) کے ساتھ تجارت میں ایک بدمعاش محمد شفیع نامی نے ساجھا کر لیا تھا، یہ شخص اپنے کو بڑا مالدار ظاہر کرتا تھا، خفیہ طور پر بردہ فروشی بھی کرتا تھا۔ اور جعلسازی ودغابازی اس کا خاص پیشہ تھا، چنانچہ اس نے حاجی ولی پر بھی دو ڈھائی ہزار روپیہ کا دعویٰ قاہرہ کی عدالت میں دایر کر دیا تھا اور حاجی ولی اس کی پیروی کے لئے اسکندریہ سے قاہرہ آیا ہوا تھا۔ یہ مقدمہ برٹن کی حجاز سے واپسی کے بعد بھی اکتوبر ۱۸۵۳ء تک چل ہی رہا تھا۔ برٹن کی حاجی ولی سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی برٹن نے ایک ہندوستانی حکیم کا روپ بھرا، ورنہ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ مرزا عبداللہ بوشہری کے نام سے حجاز میں داخل ہو مگر ویلن نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں ایرانی بڑی نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں[1]۔ تم بھول کر بھی ایرانی مت بنو، ورنہ بڑی مصیبت میں پڑوگے، چنانچہ اسی مشورہ پر عمل کرکے، برٹن نے اپنا نام حکیم عبداللہ خان رکھ لیا تھا اور اپنے کو ہندوستانی ظاہر کیا تھا، برٹن اپنے سفرنامے میں ویلن کو جابجا حاجی ولی کے نام سے یاد کرتا ہے اور وہ مصر میں بھی اسی نام سے مشہور تھا

برٹن نے اس کو نہایت سادہ مزاج، صاف باطن لکھا ہے۔ سفرنامہ برٹن کے دیکھنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ویلن کو شراب نوشی سے سخت پرہیز تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر اس جلسہ مے نوشی کی کیفیت جس میں برٹن اور ترکی بے قاعدہ فوج کے ایک البانی[2] کپتان علی آغا نامی

---

[1] ۔ ایرانی اپنی متعصبانہ حرکات کی وجہ سے حجاز میں بدنام ہیں
[2] ۔ البانیا سلطنت ترکی کا ایک مشہور کوہستانی صوبہ تھا جسے ۱۹۱۲ء میں دول یورپ نے ترکوں کے قبضہ سے

نے ویلن کو دعوت کے سے بلایا تھا، سفرنامہ برٹن سے ترجمہ کرکے درج کردیا جائے ہتاکہ ناظرین خود ڈاکٹر ویلن کے عادات واطوار کا اندازہ کرسکیں ۔ برٹن ۔ علی آغا۔ اور ویلن تینوں ایک ہی مسافرخانہ میں فروکش تھے اور برٹن شراب پینے کے لئے علی آغا کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ وہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"نو بجے رات کو جب کارواں سرائے میں بالکل سناٹا ہوگیا میں نے اپنا حقہ اٹھایا تمباکو کی تھیلی لی، تلوار کمر سے لگائی اور چپکے سے علی آغا کے کمرے میں چلا گیا ۔ یہ اس وقت، زمین پر فرش بچھائے بیٹھا تھا، سامنے چار موم بتیاں جل رہی تھیں ۔ دسترخوان چنا ہوا تھا جسمیں لوہے کے ایک برتن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جس میں عرق (شراب کا) سفید بلوری قرابہ اور عطر کی ایک شیشی پڑی ہوی تھی، علی آغا نے میری بڑی آؤ بھگت کی ۔ اس نے ایک چھوٹا سا گلاس اٹھایا، اچھی طرح دیکھا ۔ انگلیاں ڈالکر اسے صاف کیا، لبالب بھرا اور سلام کرکے مجھے دیا، میں نے جھک کر سلام کیا اور گلاس لے کر ایک سانس میں چڑھا گیا۔ اسی طرح اس نے بھی پی اور دور چلتا رہا ۔ ہر گلاس کے بعد حلق ٹھنڈا کرنے کے لئے ہم ایک ایک گھونٹ پانی کا اور ایک ایک چمچہ گوشت یا کسی اور چیز کا کھاتے رہے ۔ پھر ہم نے اپنے حقے بھرے ۔ اور روزہ داروں کی طرح لمبے لمبے دم لگانے لگے ۔ البانی کپتان نیم مست تھا مگر وہ برابر بھرتا اور پیتا رہا۔ میں بھی مدہوش نہیں ہوا ۔ علی آغا نے عطر کی شیشی اٹھائی اور سیدھی ہتیلی پر عطر ڈالکر میرے منہ پر ملا، میں نے بھی ایسا ہی کیا ۔ لیکن ہماری سرخوشی زیادہ دیر تک نہ ٹھہری ۔ کپتان نے یہ بات نکالی کہ حاجی ولی کو بہکا پھسلا کر اپنے ساتھ یہاں بلا لاؤ اسے بھی زبردستی پلائیں گے ۔ یہ بہت ہی بیہودہ خیال تھا۔ حاجی ولی کو یہاں بلانا گویا قمارخانہ میں محتسب کو دعوت دینا تھا ۔ خیر صاحب ۔ میں حاجی کو بلانے کے لئے دوڑا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) نکال کر ایک علیحدہ عیسائی ریاست قایم کردی ۔ اب بھی اس کے بعض بعض علاقوں میں مسلمان رئیس حکمراں ہیں، یہاں کی آبادی پندرہ سولہ لاکھ ہے۔ جس میں بارہ تیرہ لاکھ مسلمان باقی عیسائی ہیں جنکی خاطر یہاں ایک عیسائی فرمانروا کی ضرورت ہوئی یہاں ایک جنگجو مسلمان قوم آرنوت زیادہ آباد ہے ۔

گیا اور جب اس کو اپنے ساتھ لے کر واپس آیا تو دیکھا کہ علی آغا نے تفریح کا اور بھی سامان تیار کر لیا ہے۔ اس نے سبز پتوں کی ایک شاخ صحن میں کھڑی کر دی اور پانی کا ایک گھڑا اسطرح لٹکا دیا کہ اس میں سے باریک دھار نکلکر سبزی پر سے بہتی بہتی اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ اپنے وطن کے سبزہ زاروں اور بہتے ہوئے چشموں کا تصور کر رہا تھا۔ حاجی ولی کے پہنچتے ہی علی آغا کھڑا ہو گیا اور حاجی کے کندھے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ بڈھا آدمی اس تماشے کو دیکھکر ڈرا۔ کپتان کا نشہ اس وقت زوروں پر تھا، اس نے گلاس بھرا اور حاجی سے پینے کو کہا۔ اس نے قطعی انکار کیا۔ تب علی آغا خود پی گیا۔ ہم نے اپنے ناراض حاجی کو حقہ پلایا اور پھر وہی چھیڑ شروع کی۔ حاجی نے ہماری بہت منت و سماجت کی کہ میں نے یہ گناہ کبیرہ عمر بھر نہیں کیا۔ ایسا ہی ہے۔ تو میں تمھارے ساتھ کل پی لونگا۔ کبھی وہ قرآن کی آیتیں پڑھتا تھا، کبھی خوشامد کرتا تھا۔ کبھی پولیس کو بلانے کی دھمکی دیتا تھا لیکن نہ سنی، آخر مجبور ہو کر وہ بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ اور گھبراہٹ میں اپنا جوتا۔ ٹوپی اور اور حقہ بھی یہیں چھوڑ گیا، علی آغا نے اس بے وفا مہمان کا تعاقب دروازہ تک کیا پھر لوٹ کر اس کے جوتے، ٹوپی اور حقے پر شراب چھڑکی اور جتنی زبانیں اس کو آتی تھیں ان میں حاجی کو گدھا کہا۔ اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور گوارش طعام کے لئے کئی گلاس اور پیئے اور حقوں کے دھوئیں اڑائے، اب علی آغا بڑی شان سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کسی طرح تحفے کو بلاؤ میں اس کا ناچ دیکھکر اپنی آنکھیں سینکونگا۔ میں نے کہا، کاروانسرائے میں رنڈیوں کے آنے کی ممانعت ہے۔ اس نے نشیلی آواز میں پوچھا کس نے ممانعت کر دی ہے، میں نے جواب دیا پادشاہ نے۔ اس پر علی آغا نے آہستہ سے اپنی ٹوپی اتاری، آستین سے اس پر برش کیا اور ذرا آگے کی طرف جھکا کر اسے اپنے سر پہ جمایا۔ اور مونچھوں کو بل دیتے دیتے کلابتو بنا دیا۔ کندھے پر حقے کی نلی رکھی اور دروازے کی طرف چلا اور کہا، خدا کی قسم پادشاہ کو اپنے ساتھ لاکر دروازے کے سامنے نچاؤنگا۔"

اس کے بعد علی آغا نے کاروانسرائے میں بہت غل مچایا اور کئی سوتے ہوئے آدمیوں کو حقے کے نیچے مار مار کر جگا دیا، کسی کو دھکیل دیا۔ کسی کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ بڑی مشکل سے

اس کا ملازم اور برٹن اس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اس کو کمرے میں لائے، وہ چیخ چیخ کر مصریوں کو گالیاں دے رہا تھا، اور پکار پکار کر اپنا قدیمی نعرۂ جنگ لگا رہا تھا کہ "اے مصریو، اے کتے کی اولادو، اے فرعون کے بچو، ہم نے تمام اسکندریہ کو ذلیل کر دیا، تمام قاہرہ کی عزت مٹا دی، تمام سوئز کو بے آبرو کر دیا"۔

برٹن کہتا ہے کہ دوسرے روز حاجی ولی میرے پاس آیا اور طعن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اب خیریت اسی میں ہے کہ تم فوراً حج کو روانہ ہو جاؤ اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ ایک ہفتے تک کاروانسرائے میں البانی کپتان کی شرارت اور ہندوستانی حکیم (برٹن) کی ریاکاری کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

ویلن کی وفات کے متعلق رالی صاحب اپنی کتاب کرسچینز ایٹ مکہ (مکہ میں پیروان مسیح) میں لکھتے ہیں کہ سیاحت عرب کی آخری مہم کے بارہ میں جب اس کی تجویز پوری نہ ہوئی تو اس کو اس قدر صدمہ بیٹھا کہ سنہ ۱۸۵۲ء میں وہ امراض قلب میں مبتلا ہو کر مرگیا۔ دلشکنی اس کی ضرور ہوئی ہوگی اور ممکن ہے کہ وہ مرا بھی امراضِ قلب سے ہو لیکن رالی صاحب نے سن وفات صحیح نہیں لکھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء تک وہ مصر میں موجود تھا، جیسا کہ ہم ابھی سفرنامہ برٹن سے لکھ چکے ہیں غالباً ویلن کا انتقال سنہ ۱۸۵۴ء یا اوائل سنہ ۱۸۵۵ء میں ہوا، جیسا کہ سفرنامۂ برٹن سے مترشح ہے۔

ویلن کے حالات سفر عرب سنہ ۱۸۵۴ء میں رایل جیوگرفی کل سوسائٹی لنڈن کے رسالہ جلد نمبر (۲۴) میں شائع ہوئے ہیں۔

ے۔ آگسٹس رالی صاحب اس کتاب کے مولف ہیں۔ یہ سنہ ۱۹۱۱ء میں تالیف ہوئی ہے، یعنی اس فقیر کے مرتبہ مضمون فرنگی حجاج کے گیارہ برس بعد۔ رالی صاحب چونکہ عرب کے حالات سے بالکل نابلد ہیں اس وجہ سے انہوں نے عیسائی سیاحانِ حجاز کے صرف حالات پر اکتفا کیا ہے۔ ان کے بیان کردہ واقعات سفر پر کوئی تنقیح یا تنقید نہیں کیا۔

قندِ پارسی

(از)

مولانا حکیم محمد وحید الدین عالی مرحوم

کارِ من با ضبطِ سوزِ عشق تا افتادہ است
ہمچو نے در استخوانم شعلہ ہا افتادہ است

از خود آرائی بگزر از جہان طاؤس وار
ہر کسے غافل ز عیبِ پیشِ پا افتادہ است

کس نمی بیند دریں باغم بچشمِ التفات
چوں گلِ پژمردہ کز بادِ صبا افتادہ است

زانقلابِ آسماں آں عہدِ بیمہری رسید
کاشنا در فکرِ قتلِ آشنا افتادہ است

از ہدایت بسکہ رنگیں نغمہ ہا دارم بلب
عندلیبِ سدرہ ہم از نوا افتادہ است

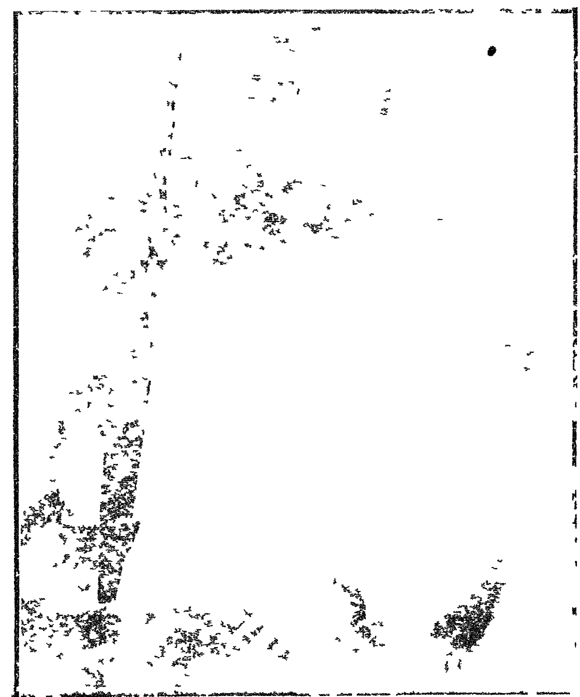
از پئے تمہید نہالے او فریاد میخیزد ز خاک
گر شہیدِ تو بدشتِ کربلا افتادہ است

بیقرارش چوں سپند از خود نمی دارد خبر
کز کجا برخاستہ است و در کجا افتادہ است

عالمے باشد اسیرِ حلقۂ گیسوئے او
از جنوں ہر کس دریں دامِ بلا افتادہ است

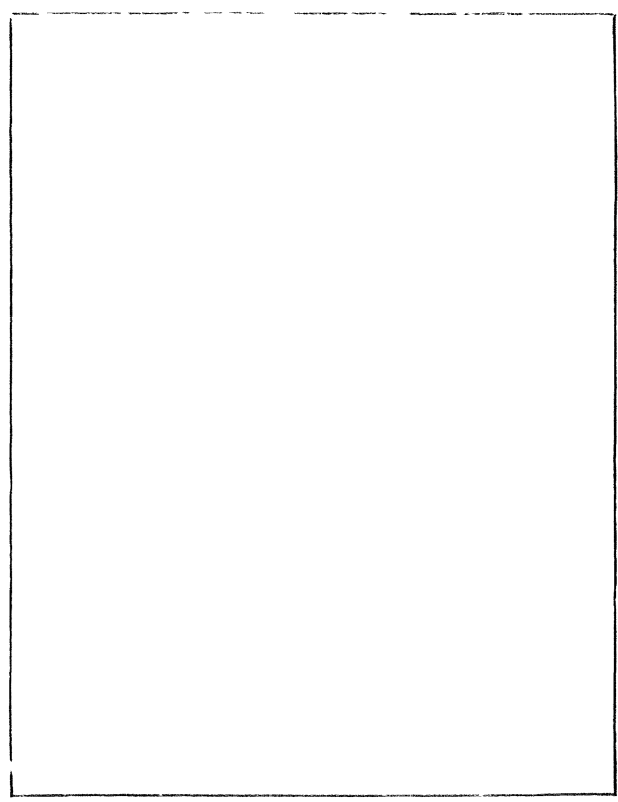
حیرتِ حسنت مرا کرد از دو عالم بے خبر
من نمی دانم کجایم دل کجا افتادہ است

حیف از قحطِ خریداران ببازارِ جہاں
گوہرِ فضلِ تو عالی از بہا افتادہ است



علامہ عبدالجبار خان آصفی نظامی





مولانا حکیم وحیدالدین عالی مرحوم

K P. P Hyd.

محبت و عشق

از جناب شیخ عبدالحمید صاحب شوقؔ۔ بی۔ اے (آنرز)

ذیل کا مضمون شوقؔ صاحب کی کتاب مبادئ نفسیات کے چودھویں باب کا ایک حصہ ہے جو دارالاشاعت مکتبہ کی جانب سے عنقریب شائع ہوگی۔ ہم مصنف کی اجازت سے اس حصہ کو جس میں اصولِ نفسیات کے تحت کافی روشنی ڈالی گئی ہے ناظرین کے ذوق مطالعہ کے لئے شائع کر رہے ہیں
(مکتبہ)

تمام جاندار اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہنے کے فطرۃً خواہشمند ہوتے ہیں اور انسان تو سب سے بڑھ کر مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کی جبلت ہی یہ ہے اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے بغیر اس کو چین نہیں پڑتا اور تنہائی اس کے لئے ایک عذاب عظیم کا حکم رکھتی ہے۔ جانوروں میں بھی اپنی مادہ اور اولاد کی محبت بہت بڑی حد تک پائی جاتی ہے، اور ان میں یہ خصلت جبلی اور وجدانی طور پر (Instinctively or Intuitively) موجود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو جو شئے بذریعہ جبلت وجدان حاصل ہوئی ہے اس کو یہ اپنے نفس مدرکہ کے تصور اور تخیل کی وجہ سے چار چاند لگاتا ہے۔ اسی طرح اس نے محبت اور ہم جلیسی کے تعریف فطری جذبات کو ایسا رنگ دیا ہے کہ ؎

محبت زندۂ جاوید کر دیتی ہے انساں کو ۔۔۔ رہے ہیں لیلیٰ و مجنوں جہاں میں داستاں ہو کر
(شوقؔ)

حضرت انسان محبت فطری کو وحشت عشق تک ترقی دے کر یہ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ۔۔۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لہ۔ ناظرین عشق کی اس تشریح کو وجدان الفت سے متمیز رکھیں۔ وجدان الفت ایک مرکب جذبہ ہے۔ اس میں موردِ الفت کی دلی عزت اس کی یا بعض عادات کی تعریف اپنے ذاتی مفاد کا اس پر انحصار۔ یا اس سے تعلق ایک مدت کی

اگر پوچھا جائے کہ عشق و محبت کیا شئے ہے تو جواب ملتا ہے ؎

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

لیکن حکمائے محققین مثل ڈاکٹر فرائڈ[1] (Dr. Fryde.) اور حکیم محمد حسن قریشی وغیرہ اس کی طبعی اصلیت اور کنہ نکالتے ہیں، ان کی رائے میں محبت حیوانوں میں ہو یا انسانوں میں محض مادہ منویہ کی تہیج کا نام ہے، ہمارے خیال میں یہ رائے مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر نہایت قرین صواب ہے۔

(۱) عام لوگوں میں محبت اولاد و والدین (Filial Love) محبت زوج اور محبت برادران اور ہمشیرگان ہی محبت سمجھی جاتی ہے، ان میں سے اولاد تو ہمارے مادۂ شہوانی کی تہیج کا نتیجہ ہوتی ہے اور ہم خود والدین کی اسی تہیج کا نتیجہ ہیں۔ خاوند اور بیوی کا جو تعلق تہیج سے ہوتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اور بہنیں اور بھائی ایک ہی تہیج کا نتیجہ ہوتے ہیں یہی تہیج یا ہیجانِ فطری اپنے موقع اور محل نیز سوسائٹی کے رسم و رواج کا پابند ہو کر محبت کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔

(۲) اولاد اور والدین کی محبت بھی اگرچہ بعض اوقات بعض خاص وجوہات سے شدت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے قصہ میں، لیکن اصل میں عشق و محبت اسی کو کہتے ہیں۔ جو ان لوگوں کے درمیاں ہو جن میں زن و شوہر کے تعلقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہم جلیس کا اثر وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ (affection) الفت کے مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے محبت ایک حد تک الفت میں داخل ہوتی ہے، لیکن اسکی روز افزوں ترقی اس کو عموماً عشق سے قریب تر رکھتی ہے (affection) الفت کا اثر کو ناظرین اس لفظ کے اس محل استعمال سے متمیز رکھیں۔ مؤلف

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر فرائڈ کی کتاب ۔۔۔ اس کے علاوہ اور بہت سے یورپین محققین کی رائے بھی یہی ہے، چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں:۔

قایم ہو سکتے ہیں۔

(۳) عشق اور محبت سب جوانی کے چونچلے ہیں جب کہ قویٰ شہوانی اپنی طاقت پر ہوتے ہیں اس کے بعد بڑھاپا برودت اور یبوست مزاج میں پیدا کرتا ہے، یعنی رگوں کا خون خشک ہو کر کمزوری اور ضعف شروع ہو جاتا ہے تو پھر

وقتِ پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

(۴) مرد اور عورت میں جب اول اول ملاپ ہوتا ہے تو محبت بہت جوش و خروش پر ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد کمی ہونی شروع ہوتی ہے، اور آخر کار جب اولاد ہو جاتی ہے تو دونوں کی محبت کا زیادہ حصہ بچہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۵) بعض میاں بیوی میں اگر نا اتفاقی رہتی ہو تو بچہ ہونے پر (چونکہ وہ دونوں کی باہمی تہیج کا نتیجہ اور اس لیے دونوں کا مواد محبت ہوتا ہے) وہ ان دونوں کی موافقت کا موجب ہو جاتا ہے اور اس کی پرورش وہ دونوں ایک دل ہو کر کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنی فطری خواہشات میں چونکہ فعلی توجہ بھی شامل کر سکتا ہے اس لیے اس خواہش فطری کے کسی مورد پر جب عملی توجہ مسلسل مبذول ہوتی ہے تو اس کا خیال گویا عادت میں داخل ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے، فعلی توجہ کے علاوہ انسان کو جذبۂ جمالی اور معیار حسن کی دولت بھی ملی ہے، پس انسان اپنی فطری خواہش کا مورد بنانے کے لیے ایسے شخص کو انتخاب کرتا ہے جو اس کے معیارِ حسن پر ٹھیک اترے اور جس کی بابت وہ یہ کہہ سکے کہ:۔

محبوب بھی جیا تو زمانہ میں لاجواب　　قربان جاؤں اس نگہ انتخاب کے

ممکن ہے کہ اس کے انتخاب کو لوگ بھی وہی درجہ نہ دیں جس طرح مشہور ہے کہ ؎ (شوق آ)

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی　　کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہو سکتے۔ شاوٹ وغیرہ لیکن سب سے زیادہ وضاحت اور بلند آہنگی کے ساتھ یہ نظریہ پروفیسر (Prof. Rebos) ایک فرنچ محقق نے پیش کیا ہے، اس کی کتاب کا مطالعہ شہوت کے بارہ میں نہایت عجیب و غریب معلومات کا اضافہ کرتا ہے، فلسفہ جذبات میں مولوی عبدالماجد نے اس میں سے اقتباس کر کے لکھا ہے وہ

اس کا جواب وہی ہو سکتا ہے جو لیلیٰ نے دیا تھا۔

گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

یعنی کہ۔ لیلیٰ را با چشم مجنوں باید دید۔ عاشق کے معیار حسن پر زمانہ میں صرف اس کا محبوب ہی ٹھیک اترتا ہے۔ جب وہ معیار کسی شخص میں موجود مل جاتا ہے تو پھر قوائی فطری اس کو اس سے طلب مواصلت پر بیقرار کر دیتے ہیں۔ لیکن سوسائٹی کی پابندیاں اور قانون۔ مذہب اور اخلاق کے جذبات اس کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں تو ان سب کو توڑنے کی وحشت سر پر سوار ہوتی ہے امید اور یاس کی کیفیات کی وجہ سے

عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ

(حالی)

ایک دفعہ اتفاقی طور پر اپنے محک حسن پر درست شخص مل جانے کے بعد اس کا ہر وقت تخیل اور تصور یہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ:۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(اور)

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی گوشۂ دل میں ہی تصویر یار

تصور اور تخیل کے ساتھ ارتباط خیالات و تصورات کا بیان ہو چکا ہے۔ محبت اور عشق جس میں ہر وقت ایک ہی خیال اور ایک ہی تصور مرکز توجہ میں رہتا ہے۔ دایرۂ ذہن میں اس کے ساتھ ان اشیاء اور اشخاص کا بھی تصور پیدا ہوتا ہے جو محبوب کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یعنی اس کے خیرخواہوں سے دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عزت اور وقار اس طرح کا ہوتا ہے کہ جیسا کہ مشہور ہے۔

کہ مجنوں سگ کوئے لیلیٰ کے پاؤں چوما کرتا تھا۔ لیکن اگر اس کے ساتھ یہ خیال شامل ہو جائے کہ ان میں سے کوئی شخص اس کے محبوب کو خود قابو میں کر کے عاشق کو محروم کر دے گا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ بھی لطف سے خالی نہیں ۔ ۲؎ دیکھو قانون ازدواج کمپلیئے عشرت مصنفہ حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل طبیہ کالج پنجاب یونیورسٹی

تو پھر رقابت کا جذبہ انتقام کی آگ کے ساتھ بھڑکتا ہے، عشق و محبت کے قصے کہانیوں میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ امراء و رؤساء اور بادشاہوں کے عشق ہی کے قصے زبان زد خاص و عام ہوتے ہیں، غربا میں یا تو پابندیاں کم ہونے کی وجہ سے شہوانی خواہشات کے پورا کرنے کی صورت جلد نکل آتی ہے یا چونکہ ان کو اپنی فکر معاش میں نظی توجہ کا موقعہ نہیں ملتا اس لئے ان میں عشق و محبت کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، البتہ دولت مندوں کو خوب تصور اور تخیل کی فرصت ملتی ہے۔ ان کے ہوا خواہ ان کی دولت پر نظر رکھ کر ان کے محبوب کی ہر وقت تعریف و توصیف کرتے ہیں ان کے اختیارات ان کو حوصلہ دلاتے ہیں۔ محبوب کو طاقت۔ لالچ۔ رعب غرض کسی نہ کسی طرح قابو میں لانے کی ان کو امید ہوتی ہے۔ پس خوب خوب چوچلے ہوتے ہیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ ؎

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا   رونا جگر جلانا اور ان کو پیار کرنا

یہ دن کی بیقراری اور شب کی اختر شماری توجہ کی وجہ سے تصور اور تخیل کے باوجود فطری خواہشات فوراً پورا نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب   دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

(غالب)

لیکن بعض وضع کے پابند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ محض حسن پرستی اپنا مشغلہ رکھتے ہیں اور ہر قسم کے مذہبی، اخلاقی، قانونی شبہات سے بچ جاتے ہیں وہ ہر شے کے حسن کو خدا کے طرف منسوب کر کے ع

حسن لیلیٰ عکس رخسار من است

سمجھتے ہیں اور انسانی نظر سے ان کی نگاہ جمال باری پر جاتی ہے اسی کا نام صوفیائی اصطلاح میں عشق مجازی سے عشق حقیقی تک ترقی کرنا ہے، مگر ایسا ہونا انتہائی درجہ کے نیک خصلت اور خدا پرست لوگوں ہی کی حالت میں ممکن ہے، ورنہ عام طور پر تو ؎

شہوت کا نام عشق بناوٹ کا نام حسن   اہل ہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

ـــــ اور ـــــ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے دیدۂ اہلِ نظر گئی

یہ بیان تو ایک جملہ معترضہ ہی سمجھنا چاہیے، نفسیات کے لئے عشق الٰہی کی اہمیت بجز حسن کی طرف انتہائی توجہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ترسیل تخیل کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی طرف انتہائی توجہ کرے تو اس کو بھی کچھ نہ کچھ خیال اپنے چاہنے والے کا ہو جاتا ہے ع

دل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر

اور عاشق کی بیقراری معشوق کو بھی چین لینے نہیں دیتی ہے

الفت کا یہ مزہ ہے کہ ہوں وہ بھی بیقرار   دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے ع   (ظہیر)

مجھ کو ان کا ہے جنوں اور انہیں سودا اپنا

محبوب کو اپنے چاہنے والے سے ایک گونہ نفرت ہوتی ہے وہ اس کی وحشیانہ حرکات سے برافروختہ ہو جاتا ہے اور بقول امیر

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ   مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے معیار حسن پر ٹھیک نہیں اترتا۔ اور وہ کسی اور کو اپنے عشق کے لئے انتخاب کر چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ

غالب ان حسینوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

جذبۂ جمالی کے بیان میں ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ اپنے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے عشاق بہت سی آرائش اپنے جسم اور مکان کی کرتی ہیں۔

ہے تیرے دل میں اگر شوق تمنا نکلی   تو یہ لازم ہے کہ اسے اپنا تمنائی کر

آخر میں اس امر کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ محاورۂ عام میں لفظ محبت کو ایسے مواقع پہ بھی استعمال کر دیتے ہیں یہاں نفسیات تو اس کو دیکھنا ہرگز گوارا نہ کرے گا۔

(۱) اظہار تشکر اور اعتراف عنایت کے طور پر مثلاً کہیں کہ اپنے استاد سے بڑی محبت ہے۔

(۲)۔ خاص رغبت کے معنی ہیں۔ مثلاً مجھے فلاں کھانے سے بڑی محبت ہے۔

(۳)۔ کسی کتے یا گھوڑے کی وفا داری۔ جفاکشی یا اور کسی صفت کی وجہ سے جو لگاؤ اس سے پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کو بھی محبت کہہ دیتے ہیں۔

(۴)۔ کسی کام میں عادتاً آدمی مشغول رہے اور اس میں دلچسپی لے تو بھی محبت کہلاتی ہے مثلاً فلاں شخص کو مطالعہ کتب سے بہت محبت ہے۔

لیکن نفسیات میں اس کے اصطلاحی معنی وہی ہیں جن کی تشریح اوپر بیان ہوئی۔ یعنی عشق صرف انسانوں میں پھر جوان انسانوں میں اور خصوصاً جوان عورت اور مرد میں ہی ہوتا ہے۔

نوٹ۔ لوگ عموماً عشق کو دل سے متعلق سمجھتے ہیں اور عقل کو دماغ سے۔ اور اس لئے عشق کو عقل سے بالکل مبرا خیال کرتے ہیں۔ لیکن نفسیات دونوں کو نفس کی مختلف حالتیں سمجھتا ہے۔ اور مختلف قسم کے ذہنی متغیرات کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ وہی ہے جو ــــ پر کیفیت کے متعلق نوٹ میں بیان ہوئی، عشق و محبت چونکہ انتہائی توجہ کا نام ہے اور توجہ ہمیشہ متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے عشق بھی گوناگوں تاثرات کا تماشا ہوتا ہے۔ تاثر کی لہر تمام جسم میں خون کی برق قوت سے دوڑتی ہے اور چونکہ جسم میں دوران خون کا مرکز دل ہے اس لئے عشق کی تمام کیفیتیں دل میں مرکوز معلوم ہوتی ہیں۔ اور عاشق کو جب خیالِ یار آتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ:-

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے   بیٹھے بیٹھے مجھے کیا جانئے کیا یاد آیا

(۶)۔ جنون۔ ہم باب اول میں بیان کرچکے ہیں کہ۔ اگر دماغ میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو اس کا اثر نفس پر ضرور پڑتا ہے، اور نفس یا ذہن کی تمام خرابیوں کا سبب دماغی عوارض ہوتے ہیں۔ دماغ میں نقص کے چار وجوہ ہوسکتے ہیں۔

(۱)۔ پیدائشی طور پر دماغ خراب ہو۔ جس طرح مادرزاد دیوانوں اور مجذوبوں کا۔

(۲)۔ سر کو سخت چوٹ وغیرہ کا صدمہ پہنچا ہو۔ اور اس کے بعد عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لئے دماغ میں کوئی نقص پیدا ہوگیا ہو۔

(۳)۔ سخت دماغی محنت سے دماغ تھک کر آیندہ کے لئے بالکل بیکار ہوجائے۔

(۴)۔ کسی روحانی صدمہ سے نفس کے انتہائی طور پر متاثر ہونے کی وجہ سے دماغ ناقابلِ تلافی طور پر ناقص ہو جائے۔

ان میں سے کسی وجہ سے دماغ اپنا کام ٹھیک ٹھیک کرنے کے قابل نہ رہنے کو جنون (Insanity) کہتے ہیں اس کی تین صورتیں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا مختصر ذکر ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

توھم (Hallucination.) کی حالت میں انسان کو اپنے سے علاحدہ کوئی ہستی یا شخصیت ہونے کا پختہ یقین ہو جاتا ہے۔ بعض وہمیوں کو اپنے بادشاہ ہونے کا خیال ہو جاتا ہے۔ کوئی خود کو جانور سمجھ لیتا ہے۔

چند دن ہوئے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ اٹلی میں ایک عورت ہے جس کو اپنی بابت مسیحؑ ہونے کا ایسا پختہ گمان ہے کہ ۲۵۔ ڈسمبر کے دن اس کے ہاتھوں پاؤں اور پیشانی سے اسی طرح خون کی دھاریں نکلتی ہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر چڑھانے سے نکلی ہونگی پاگل خانوں میں اکثر لوگ اسی قسم کے جنون میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ عاشق عام طور پر اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۲) سودا (Madness.) کی حالت میں وہی حال ہوتا ہے جو شاعر لوگ اپنے اشعار میں اکثر لکھتے ہیں۔

اب تو وحشت سے ہمارا ساتھ ہے چاک چاک اپنا گریباں ہو چکا

(شوقؔ)

لہ۔ ان تین کے علاوہ دیوانے کتے کے کاٹے کو بھی جو مرض ہو جاتا ہے، وہ بھی دیوانگی ہی کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور اس میں اکثر نشانات بھی اس کے پائے جاتے ہیں، مگر اس کا سبب خون میں زہر کا اثر ہو جانے سے ابخرات کا دماغ کو چڑھ جانا ہو جاتا ہے نیز سخت بخار کی حالت میں سرسام ہو جاتا ہے وہ مالیخولیا سے مشابہ ہوتا ہے، اس کا سبب دماغ کی خشکی بھی ہوتا ہے۔ اگر دونوں کو بھی اقسامِ جنون میں شامل کرلیں تو گویا پانچ مختلف قسموں کا جنون کہنا چاہئے، نیز فلسفۂ جذبات میں عبدالماجد صاحب نے عشق کو بھی جنون کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ جو عام نشانات کے لحاظ سے بہت بڑی حد تک درست ہے۔

سرِ شوریدہ پائے دستِ پیماں شامِ ہجراں تھا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
(غالب)

روحانی صدمات یا عشق میں ناکامی وغیرہ اس قسم کی وارفتگی کے عام طور پر اسباب ہوتے ہیں یہ قسم جنون کی سب سے زبردست اور مشکل سے قابلِ اصلاح ہوتی ہے۔

(۳) مالیخولیا۔ دماغ کی خشکی، اعصاب کی کمزوری، صدمات کی زیادتی سے نفس کا قابو اپنی قوتِ تخیل پر سے اٹھ جاتا ہے، یعنی توجہ کسی خاص طرف نہیں لگ سکتی۔ خیالات پریشاں ہر وقت الفاظ کا جامہ پہن کر منہ سے نکلتے رہتے ہیں۔ اسی حالت کے بابت غالب کہتا ہے:۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

خود بخود باتیں کرنا، گالیاں بکنا، اپنی ناکامی کی داستان ہر وقت بیان کرتے رہنا مالیخولیا کے عام نتائج ہیں۔ مالیخولیا کا مریض عموماً یاس، ناامیدی، چڑچڑے پن سب کا آماجگاہ ہوتا ہے اور بقول اطباء یونانی مزاج میں صفرا اور سوداوی مادہ بڑھ جاتا ہے بڑھاپے میں (جیسا کہ بقول غالب)۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

بہت لوگ اس مرض ہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں بچپن کی سی ضد اور بات بات پر بگڑنا بھی اسی میں داخل ہے، لیکن تندرست بوڑھوں کی بابت جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ درست نہیں۔ ان کی اصابتِ رائے کو جوان کبھی نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ بچپن، ورجوانی کا تجربہ ان کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے کماحقہٗ واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔

(۴) بعض لوگوں کے جنون میں مندرجہ بالا تینوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

غزل

از جناب سید ضمیر الدین احمد صاحب عرشؔ گیاوی شاگرد استاد تسلیم

مرے نالوں سے گل اک دن چراغ آسماں ہوگا
جہاں ہیں کثرتِ ظلمت سے شورِ الاماں ہوگا

نہ جب اہلِ مکاں ہوں گے نہ کوئی بھی مکاں ہوگا
جہاں کا رنگ کیا اس وقت اے اہلِ جہاں ہوگا

جدا ہوتا چلا آیا ہے مسلک عشق والوں کا
ہمارا مقبرہ دیر و حرم کے درمیاں ہوگا

میں وہ گل ہوں نہ فرصت دی خزاں نے جسکو ہنسنے کی
چراغِ قبر بھی جل کر نہ اپنا گلفشاں ہوگا

کروگے جب کسی سے عشق تب دیکھوگے رنگ اس کا
یہ سو پردے میں جھلکیگا یہ چھپ کر بھی عیاں ہوگا

بگولوں کی طرح صحرا میں مارے مارے پھرتے ہیں
ہمارا دکھ وہی سمجھیگا جو بے خانماں ہوگا

نہیں آسان پانا حشر میں یارانِ رفتہ کا
وہاں تو ہر قدم پر کارواں در کارواں ہوگا

کھلیگا حشر میں ناز و نیاز عشق کا عقدہ
میں اس کا میہماں ہونگا وہ میرا میزباں ہوگا

یہی پہچان بحرِ غم میں ہوگی میری کشتی کی
نہ اس پر ناخدا ہوگا نہ اس میں بادباں ہوگا

اسی سے پوچھنا کیا شئے ہے الفت میں پشیمانی
پس دیوار رکھے سر پہ ہاتھ ایک نوجواں ہوگا

عدم کیا حشر میں بھی روئیں گے یارانِ رفتہ کو
کہاں ہم ہوں گے جانیں، قافلہ اپنا کہاں ہوگا

وہ گھر کی راہ لیگا اور عدم کی راہ ہم لیں گے
ہمارا فیصلہ شب درمیاں وقت اذاں ہوگا

جہاں ہیں محوِ نغمہ بلبلیں گل جس میں خنداں ہیں
اسی گلشن میں کل زاغ و زغن کا آشیاں ہوگا

جسے صرصر نے ٹھکرایا تھا جو گر گر پڑا اٹھ کے
وہ اِس کوچے میں میرا ہی غبارِ ناتواں ہوگا

اسی جانب چلے جائیں گے وحشی تیرے بے کھٹکے
جدھر خارِ بیابانِ جنوں دامن کشاں ہوگا

مقامِ امتحاں خالق نے عالم کو بنایا ہے
یہاں جب تک رہیں گے امتحاں ہی امتحاں ہوگا

تلاشِ یار سے فارغ نہ ہوں گے بعد مردن بھی
جدھر جائے گی اپنی روح لاشہ بھی رواں ہوگا

ترے کوچے میں اکثر اک بگولہ خاک اڑتا ہے
مٹایا جس کو تو نے یہ وہی بے خانماں ہوگا

یہی کیا عرشؔ تھا جو بڑھ گیا انداز مومن میں
تھیں ترکیبیں الگ سب سے، وہی جادو بیاں ہوگا

ہنسی

از

جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی اے عثمانیہ

قدما میں وہم پرستی کا مرض عام تھا، اور وہ ہر واقعہ کو کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دیتے تھے چنانچہ گھر سے باہر نکلتے وقت ٹھوکر کا لگ جانا، کسی کام کو جاتے وقت بلی کا آڑے آنا اور دن کے وقت مرغ کا بانگ دینا ـــــــ، غرض اس قسم کے سینکڑوں ایسے واقعات ہیں جن کو منحوس خیال کیا جاتا تھا اور اب بھی بعض لوگ ان پر ایمان لاتے ہیں!) حالانکہ ہمارے باہر نکلنے کو ٹھوکر سے، بلی کو کام سے اور مرغ کی بانگ کو کسی مصیبت سے کیا واسطہ، اعتقادات کی اس کمزوری کی اصل وجہ علم کا فقدان ہے، اسی طرح ہنسی کو بھی قدما نے سال نو سے متعلق کیا ہے، حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے ہنسی کو سال نو سے، بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے، خیر ہمیں ان جھگڑوں میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہم ہنسی کی علمی توجیہ چاہتے ہیں۔

ہنسی کیا ہے؟ جسم کی مختلف رگوں کی تشنجی کیفیت کا نام ہنسی ہے، ہنسنے میں سب سے پہلے آنکھ اور دہن کی رگیں متاثر ہوتی ہیں جس کی وجہ آنکھیں نصف کی قریب بند ہو جاتی ہیں اور ہونٹ کے نیچے اوپر کی طرف حرکت کرنے سے منہ اتنا کھل جاتا ہے کہ دانت صاف طور پر دکھائی دینے لگتے ہیں اس کے بعد تنفسی نظام متاثر ہوتا ہے اور دم پھولنے لگتا ہے اور جب اس کا اثر زیادہ ہو جاتا ہے ...... تو قہقہ کی آواز نکلتی ہے۔ آخر میں بازو یا کندھے متاثر ہو کر حرکت کرنے لگتے ہیں اور انسان پیٹ پکڑتے پکڑتے بے تاب ہو کر زمین پر لوٹنے لگ جاتا ہے، اس دوران میں وہ زور زور سے تالیاں بھی بجاتا ہے۔ کہیں یہ فعل ہنسی سے کوئی راست تعلق نہیں رکھتا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہنسنے والا دوسروں کو اپنے ہنسنے کی وجہ سمجھاتا یا اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے زمین یا میز پر زور سے ہاتھ مارتا یا تالیاں بجانا شروع کرتا ہے، ہنسی ایک ناگہانی فعل ہے، کیونکہ اس کا تعلق ہماری قوت ارادی سے نہیں ہے، لیکن بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنے اعصاب اور عضلات پر پورا قابو ہوتا ہے، اور اس ناگہانی

جذبہ کو اپنے تابع رکھتے ہیں اور اس کیفیت کو روک سکتے ہیں، ہنسی کو باعتبار اس کی طرح کے تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) تبسم (۲) ہنسی (۳) قہقہہ۔ خوشی کے جذبات کا اظہار بلحاظ نوعیت بالعموم انہی سے کیا جاتا ہے۔

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انسان میں ہنسنے کی یہ غیر ارادی صلاحیت کہاں سے آگئی اور ہنسی فی الحقیقت ہے کیا چیز؟ ہنسنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ ہم اپنے خوشی کے جذبات کا اس طرح پر کیوں اظہار کرتے ہیں۔ سیلون کی خارج الوطن قوم تو کبھی نہیں ہنستی، ان کے متعلق نہایت سنجیدگی لیکن کسی قدر غلطی سے یہ کہا گیا ہے کہ ان کے چہرے پر وہ رگیں نہیں ہوتیں جو ہنسی کی محرک ہوتی ہیں۔ ایک روز ایک کسان ان لوگوں میں سے چند کو اپنے کمرہ میں لے گیا تاکہ ان کے خصائل، زبان اور اعتقادات کے متعلق کافی معلومات حاصل کرسکے۔ اس نے سوال کیا "تم ویدلوگ ہنستے نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟" وحشی آدمی نے جواب دیا۔ "یہ بالکل سچ ہے کہ ہم ہنستے نہیں، لیکن یہ تو بتلاؤ کہ ہمیں ہنسانے والی یہاں کونسی ایسی چیز موجود ہے"۔ یہ جواب اداسی اور مردہ دلی کی کس قدر سچی تصویر ہے! بات یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نزدیک ہنسی کی حقیقت دراصل جذبات خوشی کا اظہار ہے، اچھی غذا کا ملنا، دھوپ کا نکلنا، اور موسم کا پرلطف ہونا بھی انسان کو بغیر ہنسائے نہیں رہ سکتا۔

اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل ہنسی کی استثنائی صورتوں کو بیان کر دینا ضروری ہے پہلی صورت وہ ہے جب کہ کوئی میکانی تہیج ہنسی کی تحریک کرے، اس میں کوئی ذہنی جذبہ عمل نہیں کرتا بلکہ خارجی عمل سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے، مثلاً گدگدانے سے آدمی ضرور ہنس دیتا ہے لیکن بعض دفعہ انسان کچھ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس پر گدگدانے کا مطلق اثر نہیں ہوتا، ہم یہاں اس بات کو تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتے کہ گدگدانے سے ہنسی کیوں آتی ہے۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جس طرح کسی مشین کو چلانے کے لئے کسی خاص کل مثلاً اس کے پہیئے کو گردش دیتے ہیں، اسی طرح ہنسی کے آلہ کو جب گدگدانے کے ذریعہ حرکت دیجاتی ہے تو بعض اعضا مثلاً رگ پٹھے وغیرہ حرکت کرنے لگتے ہیں اور ہنسی کی مشین چالو ہوجاتی ہے۔

ہنسی تقلیدی بھی ہوتی ہے، بعض لوگ ہنستے ہیں صرف اس لئے کہ دوسرے ان کے سامنے ہنس رہے ہیں۔ لیکن جانتے نہیں کہ کیوں، اس سے ہنسی کے مفہوم پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ بالکل

تقلیدی ہوتی ہے، یعنی دوسرے کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنا گویا اس کا جواب دینا ہے، شاذ صورتوں میں لوگ تنہائی میں ہنسا کرتے ہیں، بعض باتوں پر لوگ دوسروں کی موجودگی میں خوب ہنستے ہیں۔ اور جی کھول کر قہقہے لگاتے ہیں، لیکن تنہائی میں انہی باتوں پر ان کو ہنسی نہیں آتی برخلاف اس کے بعض سلیم الطبع اور ذہین آدمی تنہائی میں قہقہے لگاتے ہیں اور اس قدر ہنستے ہیں کہ صرف سو جانے کے بعد ان کی ہنسی رک سکتی ہے، اس کے علاوہ ہنسی کی ایک خاص حالت بھی ہے جس کو "خندہ بے اختیار" یا کھلکھلاہٹ کہتے ہیں، اس میں انسان ہزار کوشش کریں اس کی سب کوشش بیکار ہو جاتی ہیں اور ہنسی کھلکھلاہٹ کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ جب انسان کو کسی خاص لفظ یا جملہ کو استعمال کرنے کی ممانعت کی جاتی ہے تو وہ عمداً خواہ مخواہ استعمال کرتا اور ہنستا ہے، قدیم زمانہ سے یہ "ضد" انسان کی فطرت کا جزو ہی ہوتی ہے، انسان ہزار کوشش کرتا ہے کہ اپنے اعصاب پر قابو پا کر ہنسی کی مدافعت کرے لیکن ہمیشہ نتیجہ اس کے خلاف نکلتا ہے، اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتا ہے۔

قدیم زمانے لوگ بھی ہنسا کرتے تھے اور ہنسی ہنسنے والے کے جذبات خوشی کا اظہار ہوتی تھی ہم کسی کے متعلق کوئی خوشی کی خبر سنتے ہیں تو ہماری محبت اور خلوص کا اظہار آنکھ اور کان کے ذریعہ ہنسی کے صورت میں ہوتا ہے، جانوروں کی بھی یہی حالت ہے۔ چنانچہ بندر ہنستے ہیں، اور ان کی ہنسی تو مشہور ہی ہے، جب بندر کے دولت یا شناسائی اس کے قریب آتے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگتا ہے اگر گدگدی کی جائے تو وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے، یہ بات بندروں ہی پر کیا موقوف ہے، کتے بھی ہنسا کرتے ہیں لیکن ان کی ہنسی عام طور پر ظاہر نہیں ہوتی، و کوئی آواز نہیں نکلتی لیکن بعض کتے بچوں اور بوڑھوں کی طرح ہنستے ہیں، بچے ہنستے وقت اچھلتے کودتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کھانا ان کے آگے آتا ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتے اور کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی توجہ منتقل ہو جاتی ہے۔

یوں تو اصل میں ہنسی کسی شخص کی موت یا خوشی کا لوگوں پر اظہار ہے لیکن برخلاف اس کے بعض مواقع ایسے بھی ہیں جبکہ انسان بجائے رونے کے ہنستا ہے۔ اس کی اصل وجہ کسی سرسری تعریف کی مدد سے سمجھانا قدرے مشکل ہے، تاہم اس کو حتی القدور وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔ لوگ

ریل کے کسی حادثہ، زلزلہ یا اسی قسم کے بعض دہشت ناک حادثات کے بعد، جن کی وجہ سے انسان کے ہوش پراں ہو جاتے ہیں، ہنسنے لگتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حادثات کے دھکوں سے عصبی توازن ٹوٹ جاتا ہے اور ان سے ایک قسم کی جو رہائی اور چھٹکارا مل جاتا ہے اور زندگی کی امید بندھ جاتی ہے تو انسان میں خوشی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ہنسنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ فرانس کی کسی کان میں ایک مزدور کو کسی جرم کی پاداش میں بیس دن کی قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی، بیس روز تک اسے ہزار فٹ زمین کے اندر ایک ایسے مقام پر بند کیا تھا جہاں روشنی تمام کو نہیں آتی تھی، اس عرصہ میں اس کو کھانا بھی نہیں دیا گیا۔ لیکن جب مدت گزر جانے کے بعد اس کو باہر نکالا گیا تو وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے باہر آیا، شعراء بھی اکثر ہنسی کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ موسم بہار میں جب پھول کھلتے ہیں تو شاعر کہتا ہے۔ وہ ہنس رہے ہیں، یہ صرف اس لئے کہ ان کو نئی زندگی حاصل ہوئی ہے، اور تبسم یا ہنسی سے اس کا اظہار کر رہے ہیں، قدیم زمانہ میں لوگ اپنے بزرگوں، اپنے ماں باپ کو ان کے گناہوں کے الزام میں قتل کر کے "رسمی ہنسی" ہنستے تھے، یہ بالکل رسمی چیز تھی، حتیٰ کہ جلاد بھی ہنستا تھا، ہندو بیوہ بھی جب جلتی ہے تو وہ آئندہ زندگی کا دلچسپ خواب دیکھکر ہنستی ہے، جون آف آرک اپنے حلفیہ انکار کے بعد ان لوگوں کے سامنے جو اس کو نذر آتش کرنے والے تھے ہنسنے لگی، اس کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اب ایذا رسانی کا خاتمہ ہو گیا اور مستقبل قریب میں حشر کے دن اس کے مخالفین سے بدلہ لیا جائے گا، یہ خیال اس کے لئے باعث مسرت تھا۔

خوشنما مناظر، دلچسپ واقعات، مذاقیہ سوانگ حسد اور کینہ کی ہنسی کی توجیہ کسی قدر مشکل ہے، کسی مشہور آدمی کی مذاقی تصویر کو دیکھکر جاہل اور عالم دونوں ہنس پڑتے ہیں ایک شخص جس کی ٹوپی سر پر رکھی ہو اور اسٹیج پر اس کو ڈھونڈ رہا ہو تو ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ جب کوئی شخص موز کے چھلکے کی وجہ سے پھسل کر زمین پر گر جاتا ہے تو ہم کیوں ہنستے ہیں؟ بات یہ ہے کہ جب ہم ان واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پہلی آن میں ہمیں حیرت اور استعجاب ہوتا ہے، لیکن جب واقعہ کی حقیقت سے آگاہی ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل اتفاقی یا فرضی خبر تھی اور اس سے کسی کو کچھ گزند نہیں پہونچا تو ہمارے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے اور ہم "اطمینانی ہنسی" ہنسنے لگتے ہیں،

ان واقعات سے ہمارا ذہنی توازن ٹوٹ جاتا ہے کسی کو مصنوعی تکلیف میں مبتلا دیکھکر ہم ہنسنے سے باز نہیں آسکتے ۔ چنانچہ تھیٹروں میں مذاقیہ کام کے وقت جب کوئی روتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم کو اس کا رنج ہو ہم ہنستے ہیں ، برخلاف اس کے اگر ان واقعات میں ذرا سی اصلیت ہوتی ہے تو ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ، کسی عجیب و غریب سوانگ یا کسی مہذب آدمی کی مضحکہ خیز تصویر کو ہم انہی اثرات کے تحت ہنستے ہیں جو خلاف قانون کسی کام کو کرنے سے ہمارے ذہن میں مرتب ہوتے ہیں وہ یہ کہ اگر سوسائٹی نے ہمارے لئے سنجیدگی ، متانت خودداری کے خاص خاص اصول بنا دئے ہوں اور ہم ان کی پرواہ نہ کرکے ان کے خلاف عمل کریں تو اس سے لازمی طور پر دوسرے دیکھنے والوں کے دل میں ہماری طرف سے نفرت اور حقارت پیدا ہو جائے گی اور ہمیں ان کے الٹا کرنے سے ہنسی آئے گی اگر اور لوگ بھی ہمارا ساتھ دیں تو بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں ۔

مذاق یا مذمت کی ہنسی فتح و شادمانی کی ہنسی سے بالکل مختلف ہوتی ہے ، یہ عمل انسان کے خاص خاص جذبات کے تحت عمل میں آتا ہے ، ان کے علاوہ بناوٹی ہنسی بھی ہوتی ہے ۔ یعنی یعنی یہ کہ بعض لوگ لڑتے جھگڑنے کے بعد ایک دوسرے کو چڑاتے ہیں اور دانت بتاتے ہیں ، اس میں حسد اور بغض کو زیادہ دخل ہے ۔ کسی شاعر نے اس چیز کو اس طرح ادا کیا ہے ۔

لگے ہو منہ چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

کمالِ ذوقِ نظارہ ہے خود منظور ہو جانا

از جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری

فنا کیا ہے؟ بس احساسِ خودی کا دور ہو جانا — صدائے ہر نفس کا نعرۂ منصور ہو جانا

بنائیں دیدۂ حیراں کو آئینہ تماشائی! — کمالِ ذوقِ نظارہ ہے خود منظور ہو جانا

تصور اور پھر کس کا تصور اے دلِ ناداں — غنیمت ہے یہیں اس کی یاد سے معمور ہو جانا

اگر ہے صرف ترکیبِ عناصر پردۂ حائل — تو کیا مشکل ہے اس کا درمیاں سے دور ہو جانا

اُدھر پیہم کسی کے جلوۂ رنگیں کی ارزانی — اِدھر قیدِ تعین سے مرا مجبور ہو جانا

غضب کی او نگارِ عالم آرا خود نمائی ہے — حجاباتِ مجازی میں ترا مستور ہو جانا

کہاں تسکینِ خاطر ہمدمو! جھوٹی تسلی سے — ہنسی ہے! چارۂ دردِ دلِ رنجور ہو جانا

اثر دکھلائے گا! ہاں اک نہ اک دن رنگ لائے گا! — تغافل کیش! خونِ حسرتِ مہجور ہو جانا

طلسمِ فکر ہے انساں کی نیرنگیِ فطرت — کبھی مختار ہو جانا کبھی مجبور ہو جانا

محبت میں شکستِ اولیں کیا حیرت افزا تھی — نگاہوں کا وہ لڑنا شیشۂ دل چور ہو جانا

نہ ہوں لب آشنا جوش و خروشِ دل سے اے کوکب
کہ آئینِ ادب میں ننگ ہے منصور ہو جانا

تلاش خدا

از
جناب ڈاکٹر محمد عبد الحق صاحب ڈی۔ ایس۔ سی (پیرس) ڈی۔ لٹ۔ پی ایچ (آنرز) لندن وغیرہ

عرصہ مدید سے یورپ میں کئی انسانی زندگیاں عقلیات سے رسیاں تڑا کر تا کش انکار و اقرار اور کشمکش ریب و یقین کی بھول بھلیاں میں پھنس چکی ہیں "مذہب و سائنس" کے عنوان "سے کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ یوروپی دماغ اسبات پر کوشاں ہے کہ ہر دینی و دنیاوی مسئلہ کو بذریعہ تجربات عملی یا مشاہدات ظاہری حل کیا جائے گو اکثر مواقع پر یہ مساعی بار آور ثابت نہیں ہوئی تاہم ان کے نزدیک خدا شناسی، انسانی فہم و ادراک اور طاقت سے باہر نہیں۔

اٹھارویں صدی میں جب سائنس کے حیرت انگیز ایجادات نے مغربی تخیل کو بہت بلند پرواز بنا دیا تو اس وقت حکیمان فرنگ خدا کو بذریعہ مشاہدات عملی ثابت کرنے کے درپے ہوئے۔ کانٹ نے "دنیا کی فطری تاریخ اور آسمان کی حقیقت" Hisise naturelle du monde et-theorie du ciel.) ایک کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ دنیا مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص طریق پر چلنے کے لئے مجبور ہے، اس میں شک نہیں کہ کانٹ جا بجا خدا کی قدرت اور جلالت کا اقرار کرتا ہے، مگر اس کے نزدیک خدا نے دنیا کے لئے قوانین مقرر کر دئے ہیں جو کسی طرح تبدیل نہیں ہوتے۔ اور اب خدائی طاقت ہمیشہ ان قوانین کے زیر اثر عمل پیرا ہوتی ہے، ۱۷۳۵ء میں لینے نے نظام قدرت "Le Systeme de la nature" میں انڈے کی حقیقت کی توضیح کی۔ ۱۸۳۸ء میں شلائیڈن نے اسی مضمون کو وسعت دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جملہ مخلوقات کی ابتدائی صورت انڈا ہی ہے چنانچہ یہ دکھایا گیا کہ انسان، حیوان، پودے وغیرہ ابتدا میں انڈے کی صورت اختیار کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ایک خاص آلہ کے ذریعہ انڈے میں زندگی پیدا ہونے کے اوقات اور وجوہات پر غور و خوض کیا گیا، الغرض اسطرح عقل بلند پرواز فلسفیان فرنگ کو مادہ پرستی کی طرف لے اڑی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کیگئی کہ ابتدائے دنیا ایک ہی طریقے سے ہوئی مگر مادہ پرستوں کے لئے ایک اور اہم مسئلہ درپیش ہوا یعنی ایک ہی مادہ نے کس طرح مذکر و مونث پیدا کر دئے ۱۸۰۹ء میں لامارک

فلاسفی زوالوجی میں حیات کی توضیح اس طرح کی کہ فی الحقیقت ایک مذکر مادہ ہی موجود تھا مگر کئی صدیوں کے بعد بعض ایسے کیمیکل تبدلات وقوع پذیر ہوئے جن سے مونث کی تمیز رونما ہوئی ہکسلے اور ڈارون نے اپنے خیالات کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان بندر سے نسبت دیا جا سکتا ہے، اور اس موضوع پر بے شمار دلائل و براہین اختراع کیں۔ جین مولر، کیٹور اور ریبر نے ڈارون کے اقوال کی تائید کی، حال کی تحقیقات نے عملی تجربات سے بتا دیا کہ ہر ذرہ بجلی کی لہروں سے آباد ہے، بجلی مقناطیس پیدا کر سکتی ہے، مقناطیس بجلی پیدا کر سکتا ہے، بجلی کے ذریعہ سے بولنے والی تصاویر (Televsion) ہزار ہا کوس پر پہنچائی جا سکتی ہیں اور اس قسم کی سینکڑوں حیرت انگیز ایجادات ہیں جن کو زمانہ ماضی میں کرامات کہا جاتا، ان نئے انکشافات نے از سر نو دہریت اور لامذہبیت کے گھروں کو بے چراغ کر دیا ہے اور مغرب کی سائنس داں دنیا یہ خیال کرنے لگی ہے کہ فی الحقیقت ان معجزہ نما قوتوں کے پروردگار اور منتظم کا ہونا ضروری ہے، البتہ ہنوز یہ یقین کامل سمجھا جاتا ہے کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں وہ حقیقت میں ایک "قوت" ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ چند مہینے ہوئے کہ ڈاکٹر میتھو (امریکہ) نے ایک ملاقات کے دوران میں کہا کہ "ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم خدا کو اسی طرح عامۃ الناس کے سامنے پیش کر سکیں جس طرح سائنس کے طلباء کو لیبارٹری میں تجربہ دکھایا جا سکتا ہے" ڈاکٹر میتھو یہ کہتے ہوئے غالباً کسی ایسی "طاقت" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو فی زمانا اکثر حیرت انگیز احکام کے سر انجام دینے کا موجب ٹھیری ہے۔ مگر یہ خیال کس قدر مغلطانہ ہے، جب جمشید کے وقت آگ چقماق کے پتھر سے نکلی تو پارسیوں کے ذہن نارسا میں اس کی حقیقت نہ آسکی اس لئے انہوں نے آگ کو متبرک سمجھ کر حضرت ایزد قرار دیا اور اس کی پرستش شروع کر دی آج یورپ اور امریکہ کے بلند پرواز دماغ بھی اسی قوت کے متلاشی ہیں جو جملہ قوائے ظاہری کے منتظم ہیں اور اس قوت کی تلاش میں سائنس کی لیبارٹری کا چپہ چپہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اے کاش وہ اسے اپنے دل میں ڈھونڈتے ع کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را دیکھئے ایک جگہ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے "دیکھ، دیکھ، تو نے اپنے برباد کن ہاتھوں سے خوشنما چیزوں کو جو ہماری دنیا کی زینت تھیں روئی کے گالوں کی طرح پریشان کر دیا، ہم نے ان کو نیست کا پردہ پہنا دیا، اور اب ان کی کھوئی ہوئی خوبصورتی پر آنسو بہا رہے ہیں مگر ہمت، او زمین کے رہنے والو ہمت، آؤ ایک جہان ظاہری کے تباہ کرنے کے بعد ایک نئی دنیا اپنے سینوں میں آباد کریں" سنٹ آگستون انہی خیالات کا اعادہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر ہم اپنے خیالات کو درون سینہ کی طرف مبذول کریں تو اور بھی رفعت پر پہونچ جائیں یعنی ایک ایسی منزل میں جا اتریں جہاں قلوب مطمئن ہوں" اور سچ یہ ہے کہ ؎

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم ہی، جاہل ہی سہی، نادان ہی سب کچھ ہی سہی تیری بات رکھ لی میں نے

تنقیدیں

منتخبات ہندی کلام

از ڈاکٹر سید جعفر حسین صاحب پی۔ایچ۔ڈی (ہیڈن برگ) پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ عمدہ طباعت خوبصورت جلد یونیہ تقطیع ضخامت (۲۲۵) صفحات قیمت (عا ۱۲) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک یا حیدر آباد بک ڈپو چادرگھاٹ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں ابتدا مولف نے تمہید کے عنوان کے تحت ہندی کی خصوصیات اور ہندی سے مسلمانوں کے تعلق پر بحث کی ہے، پھر جذبات عالیہ، فلسفیانہ مسائل، عاشقانہ تخیلات، عشقیہ دوہے اور متفرقات کے جدا جدا عنوانات سے ہندی کے مختلف مشاہیر شعراء کی چیدہ ابیات ہندی اور اردو دو نو رسم الخط میں دی ہیں، تقریباً تمام ابیات کے مشکل ہندی الفاظ کے اردو میں معنے بیان کئے گئے ہیں اور ہر دوہے اور دیگر ابیات کی اردو میں شرح لکھی ہے اور شاعر کے مضمون کو پھیلا کر بیان کیا ہے کہیں کہیں تشریح بہت مختصر سی ہے۔ اردو دانوں کے آگے ہندی شاعری کو پیش کرنے کی یہ کوشش نہایت پسندیدہ ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر یہ پہلی کوشش نہیں اور اس سے قبل مختلف صورتوں میں کئی لوگوں نے ہندی شاعری کو اردو دنیا میں لانے کی کوشش کی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے جو نام پسند کیا گیا ہے وہ نہ تو روما نوی ہے نہ خالص علمی۔ شاعری اور نظم کے لئے کلام کا لفظ بے شک استعمال ہوتا ہے لیکن اصطلاحی حیثیت سے نہیں بلکہ عرفی اور عام حیثیت سے ہندی شاعری کا میدان نہایت وسیع اور گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے اگر اس طرح اردو دنیا میں اس کو رفتہ رفتہ روشناس کیا گیا تو ہمارے شعراء اس سے خاصا فایدہ اٹھائینگے اور آیندہ کی شاعری پر اس کا خاص اثر بھی پڑ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سیرت نبوی اور مستشرقین

از جناب مولوی عبدالعلیم صاحب اسراری، بڑی تقطیع ضخامت (۱۱۲) صفحات قیمت (عہ/) حالی ملنے کے پتے مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک حیدر آباد دکن۔

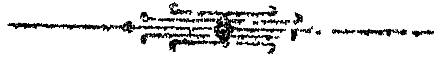
جامعہ ملیہ دہلی کا متعلقہ ادارہ "اردو اکاڈمی" جن مفید کتب کی اشاعت کر رہا ہے ان میں یہ کتاب

یہ کتاب ایک عمدہ اضافہ ہے اور بہت قابل قدر ہے۔ یورپ کے وہ عالم جو عربی زبان اور عربی علوم سے آگاہ ہیں اکثر و بیشتر اسلام اور بالخصوص بانی اسلام صلعم کی ذات مبارک کے خلاف ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہیں اور اس وقت تک اعتراضات کی خاص تعداد جمع ہو گئی ہے۔ اگرچہ سرسید مرحوم سے لیکر موجودہ زمانہ تک متعدد مذہبی مصنفین نے ان کے جواب دئیے، مگر آئے دن ان کے اعتراضات کے مقابلہ میں جواب ناکافی سے رہے ہیں۔ مولوی عبدالعلیم صاحب نے ایک مشہور مستشرق ولہاوزن کے مضمون کا ترجمہ کر کے اس پر حواشی اور مقدمہ کے اضافے کے ساتھ سیرت نبوی پر نہ صرف مستشرقین کے اعتراضوں کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ہر ایک اعتراض کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب اس لیئے خاص طور پر مفید اور قابل قدر ہے کہ اس کے ذریعہ ان اردو دانوں کے لئے جو انگریزی سے ناواقف ہیں یا انگریز معترضین کی کتابوں تک دسترس یا ان سے آگاہی نہیں رکھتے، سیرت نبوی کے تمام یورپی اعتراضات پیش ہو جاتے ہیں۔ اب ان پر ہمارے مفکر علماء کو مدلل جواب لکھنے کا اچھا موقع حاصل ہو جائے گا، مولف صاحب نے اعتراضوں کا جواب دینے کی جو کوشش کی ہے وہ بھی بہت کچھ کامیاب ضرور ہے لیکن اس کا بڑا فائدہ ان لوگوں کے آگے اعتراضات کی نوعیت کا اظہار ہے جو اس کے بغیر اعتراضات ہی سے سرے سے ناواقف تھے

بچھڑی بیٹی از مرحومہ خاتون اکرم پونیہ تقطیع خوبصورت طباعت وکتابت ضخامت (۳۲) صفحات کاغذ بہت پاکیزہ قیمت ۶ ر کلدار دفتر عصمت دہلی یا مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے

خاتون اکرم مولانا راشد الخیری کی بہو، عصمت کی پختہ قلم مضمون نگار اور بڑی نیک خاتون تھیں جو عین عالم جوانی میں نہ صرف بوڑھے خسر اور شوہر کو داغ مفارقت دے گئیں، بلکہ اردو دنیا کو ان کے قلم سے جو توقعات تھیں وہ بھی مٹ گئیں کچھ دنوں قبل ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "جمال ہمنشیں" کے نام سے سوگوار دفتر عصمت نے شایع کیا تھا جو اچھی انشا پردازی کا نمونہ ہے، یہ کتاب "بچھڑی بیٹی" مرحومہ کی دوسری قلمی یادگار ہے اور اچھی لکھی گئی ہے۔ عورتوں کے علاوہ نوعمر لڑکے اس قصہ کو اس کی سلیس زبان اور شستہ طرز بیان کی وجہ آسانی اور لطف سے پڑھ سکتے ہیں۔ (س۔م)

مجلّہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی نادر و نایاب اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا - یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی -

خریدار صاحبین کو چاہئیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اعلان رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں -